عبداللہ حسین
نادار لوگ

عبداللہ حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Abdullah Hussain
Nadaar Loge/ Abdullah Hussain.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2014.
808pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2014ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-0670-7
ISBN-13: 978-969-35-0670-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ناصر جہانگیر

اور

جاوید نیاز مرحوم

کے نام

۱۔ مندرجہ ذیل لوگوں نے اِس کتاب کی تصنیف میں میری مدد کی ہے:

غلام نبی کلّو (صدر، مزدُور کِسان پارٹی)۔ اسلم شاد (بھٹہ مزدُور اتحاد)۔ لیفٹیننٹ کرنل محمُود احمد۔ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) فیض نقوی۔ گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) اَورنگ زیب۔ کے، کے، عزیز (تاریخ دان)۔ یحیٰی امجد (تاریخ دان)۔ محمد رشید (ایڈووکیٹ)۔ فخرزمان (ادیب)۔ احمد سلیم (تاریخ دان)۔ مظفر اقبال (ناول نگار، کیمسٹ)

اِن دوستوں کی معاونت کے بغیر یہ کتاب اِس شکل میں لکھی نہ جاسکتی تھی، جِس کے لئے میں اِن کا دِل سے شُکر گزُار ہُوں۔

۲۔ نقاد و تبصرہ نگار حضرات سے اِستدعا ہے کہ کم از کم چھ ماہ کے عرصے تک اِس کتاب کے بارے میں کچُھ لکھنے سے اجتناب برتیں، تاکہ میرے قارئین کو کِسی مداخلت کے بغیر اِسے پڑھنے کا موقعہ مل سکے۔

۳۔ اِس کِتاب کو کِسی قِسم کے اِنعامی مقابلے میں شامل نہ کیا جائے۔

۴۔ مَیں اکادمی ادبیات پاکستان کا بھی شُکر گزُار ہُوں کہ اُنھوں نے مجھے کچھ عرصے تک اپنے ہاں جگہ دے کر اِس ناول کا مسودہ بنانے کی خاطر تخلیہ مہیا کیا۔

عبداللہ حسین

حِصّہ اوّل

"آدمی کی یاد کا لنگر بھی کیا عجب منظر ہے۔"

باب ۱

ریل گاڑی پُوری رفتار سے جنوب کی جانب بھاگتی جا رہی تھی۔ اِس کے پہیّوں کی گڑگڑاہٹ سے دُوسرے ڈبوں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، مگر اس ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں شور دبا دبا تھا، جیسے اُوپر غلاف چڑھا ہو۔ میجر سرفراز اپنی گدّے دار سیٹ پہ دراز، ہاتھ سَر کی پُشت پہ باندھے، کُھلی کُھلی آنکھوں سے آسمان کو تک رہا تھا، گویا کسی دھیان میں ہو۔ دراصل اُس کا ذہن یکسر خالی تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے، دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اخبار دیکھنے لگا تھا کہ گاڑی کے دھچکوں نے ہلکوروں کا کام کیا اور وہ اُونگھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی چال نے دوبارہ دھچکوں کی صُورت اختیار کرلی تو سرفراز نیند سے بیدار ہوگیا۔ اب وہ ٹھہری ٹھہری بے خیال نظریں کھڑکی کے شیشے پہ جمائے لیٹا تھا۔ اُس کے بدن میں پیچھے، اپنے اعضاء کے اندر ابھی سکون کی حالت میں سوئے پڑے تھے۔ اپنی مختصر اُونگھ کے دوران اُس نے جو متعدد خواب دیکھے تھے اُن کی جھلکیاں بِن بلائے، وقفے وقفے پر اُس کے دماغ میں آگے پیچھے ناچتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ جھلکیوں کے اِس جلُوس میں اُس کا اپنا کوئی دخل نہ تھا۔ جس طرح خواب اُس کے اختیار میں نہ تھے، اُسی طرح اُن کی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑتی ہوئی مدھم سی یاد بھی اُس کے قابو سے باہر تھی۔ اِس بات سے اُس کے دِل کو ایک عجیب سی بے سکونی کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ بات سرفراز کے مزاج کے قطعاً برعکس تھی کہ کوئی شے اُس کے ضبط سے باہر ہو۔ آٹھ نَو برس کی سخت فوجی ٹریننگ نے ایک اٹھارہ انیس سالہ خام نوجوان کو لے کر ایک ایسے ستائیس سالہ پختہ اور بالغ مرد کی شکل میں ڈھال دیا تھا جس کے لئے یہ امر اہم ہو چکا تھا کہ اُس کے روزمرہ کے تمام اندرونی اور بیرونی عناصر اُس کے دائرہ اختیار کے اندر ہوں۔ عہدے کا موزوں استعمال، افسر کی مکمل اطاعت اور ماتحت پہ گرفت، خُوش اخلاقی، راست گوئی، صاف بینی، اصُول پرستی، قوتِ فیصلہ، غرضیکہ سرفراز کی شخصیت کی تمام تر تہذیب کا دارومدار اِس خُود نظمی پہ تھا جس کے ذریعے وہ خُود اپنے اُوپر ہی نہیں بلکہ دُوسروں پر بھی نظم عائد کرنے کا اہل تھا۔ پیشے کی رُو سے وہ حقیقت کی دُنیا میں رہتا تھا اور

اشیاء کے ٹھوس وجود سے ہی دُنیا کا تعین کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ بِن بلائے خیالات اَور احساسات بھی اُس کے ضبطِ نفس میں رخنہ انداز ہوتے تھے۔ خُواب بہر صُورت اُس کے قبضے میں نہ تھے۔

جاگتے خُوابوں کو منظم کرنے کی استطاعت اُس میں تھی، سوتے خُواب اُس کے قابُو سے باہر تھے۔ اِس وَقت ریل گاڑی کی سیٹ پہ لیٹے لیٹے، اُن خُوابوں کی جھلکیوں کو ضبط میں لانے کی آخری کوشش کرتے ہُوئے، سرفراز نے ذہن کو صرف ایک شکل پہ مرکوز کرنے کی سعی کی۔ یہ شکل نسرین کی تھی۔ نسرین جس نے اُس کا ضبط پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔

سرفراز اَپنے گاؤں میں دو روز کی ایمرجنسی چھٹی گزار کر واپس اَپنی یُونٹ کو حیدر آباد لوٹ رہا تھا۔ اِن دو دِنوں میں اُس کی دُنیا اُوپر کی نیچے ہو چکی تھی۔

آخر وہ نسرین کی صُورت کو سامنے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ مقام: شہر کے سب سے بڑے باغ کا ایک کونہ تھا۔

"تُمھیں اِتنی دُور سے آنے کے لئے جلدی جلدی چھٹی کیسے مِل جاتی ہے؟"

"ہمارے ہاتھ کا کمال ہے۔"

"میری خاطر آتے ہو؟"

"ہاں۔"

"جب مَیں نے پہلے روز دیکھا تھا تو سمجھی تھی تُم بیوقُوف فوجی ہو۔"

"ہم نے تُمھاری جان بچائی تھی اِس لئے؟"

"میں نے لِفٹ کے لئے پُوچھا تو تُم خُواہ مخُواہ دُوسری طرف سے اُتر کر باہر کھڑے ہو گئے تھے۔"

"لِفٹ دینے سے پہلے تُمھارا جائزہ نہ لیتا؟ تُمھارے جیسے دہشت گرد دُنیا میں تھوڑے ہیں؟"

"مَیں نے کہا تھا میرا نام نسرین ہے تو اپنا تعارف کرانے کی بجائے گنواروں کی طرح میرا مُنہ دیکھتے رہے تھے۔"

"نام بتانے کا ہوش کسے تھا، مَیں تو تُمھارا مُنہ چُومنا چاہتا تھا۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ مُنہ چُومنے کے لئے ہوش و حواس کی ضرورت نہیں ہوتی؟"

"کوئی عجب نہیں کہ اُس وقت چُوم بھی لیتا۔"

"واہ!"

"تمہارا انداز ہی ایسا تھا۔"

"کیسا انداز تھا؟"

"سینے پہ بازُو باندھ رکھے تھے اَور ہاتھ کندھوں کے ساتھ سیئے ہُوئے تھے جیسے کبھی جُدا نہ ہوں گے۔"

"ذرا جُرأت کرتے تو دیکھتے۔"

"کیا ہوتا؟"

"ہاتھ تمہارے مُنہ کے ساتھ سی دیتی۔"

"ہاہاہا۔۔۔۔"

"ہاہا!"

"اُس وقت چُوم لیتا تو آج اتنی مُصیبت تو نہ کرنی پڑتی۔"

"تمہیں اَپنے زور بازُو پہ بڑا ناز ہے؟!"

"اور کیا۔ یہ دیکھو، ہاتھ لگا کے دیکھو، مسَل ہیں مسَل۔ ارے، اوہ۔۔۔۔ بے ایمان۔"

"کیا ہوا؟ مسل ڈھیلے پڑ گئے؟"

"چڑی جتنی تمہاری جان ہے اَور چٹکی ایسی کاٹتی ہو جیسے چُوہے کا دانت ہو۔"

"میری اُنگلی میں چُوہے کا دانت ہے۔"

"ٹھہرو تمہیں ٹھیک کرتا ہوں۔"

"ارے، ارے رے رے۔۔۔۔ مت کرو سری، خُدا کے لئے، دیکھو لوگ آواز سُن لیں گے۔"

"سُن لیں گے تو سُنتے رہیں۔"

"تمہیں پتا ہے لوگوں کا۔۔۔۔ اب تو قانُون بن گئے ہیں، لوگوں کو اَور بھی شہ ملی

گئی ہے۔"

"قانون ہمارے لئے نہیں ہیں۔"

"اور کس کے لئے ہیں؟"

"محبت کرنے والوں کے لئے کوئی قانون نہیں ہوتا۔"

"ہائے، محبت کا نام بھی جناب کو آگیا ہے۔ ابھی قانون سر پہ آ چڑھے تو پتا چلے۔"

"اِدھر دیکھو، بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"تمہاری تصویر ہے۔ وردی میں جوکر لگ رہے ہو۔"

"نہیں جناب، یہ میرا آئی۔ ڈی ہے۔ اِس کی ایک جھلک ہی قانون والوں کے لئے کافی ہے۔"

"یہ تو ہمیں پتا ہی ہے، شیخیاں کیوں بگھارتے ہو۔ ارے رے رے، کیا کر رہے ہو، مت کرو سرفراز، میں چیخنے لگوں گی تو تمہاری آئی۔ ڈی دھری رہ جائے گی، ٹھہرو ٹھہرو، سُنو، شیر کی آواز۔"

"گھُررررر۔۔۔۔"

"چُپ رہو یار کیا بلّی کی طرح گھُر گھُر کر رہے ہو۔ یہ شیر کی آواز ہے۔"

"گھُرررررر۔۔۔۔"

"سُنو جب میں چھوٹی سی تھی تو یہاں شیر کے دھاڑنے کی آواز سُن کر خوف سے کانپنے لگتی تھی۔ پھر بھی یہ آواز سننے کے لئے یہاں آنے کی ضد کرتی تھی۔ عجیب بات ہے ناں؟"

"تمہاری ہر ایک بات عجیب ہے۔"

"سیریسلی سرفراز، شیر کی آواز میں ایک عجیب و غریب اِسرار ہے۔ چونکا دینے والی آواز تو گدھے کی ہینک میں بھی ہوتی ہے اور ہاتھی کی چنگھاڑ میں بھی۔ مگر گرج کسی اور میں نہیں ہوتی۔"

"تم نے میری گرج نہیں سنی؟"

"شاید تمہاری آواز میں بھی ہو، مگر چھوٹی سی۔۔۔۔ اصلی نہیں ہوگی۔"

"گھُررررر۔۔۔۔"

"سُنو، جب کافی عرصہ گزر گیا تو آہستہ آہستہ میرا خوف جاتا رہا۔ صرف اِس آواز کی کشش باقی رہ گئی۔ اب میرا جی چاہتا ہے اِسے پکڑ لوں۔"

"شیر کو؟"

"نہیں، اِس کی گرج کو۔ جی چاہتا ہے اِسے پکڑ کر بند کر لوں۔"

"گرج کو کیسے پکڑ سکتی ہو؟"

"کیوں، یہ جو ہر روز گانے سُنتے رہے ہو، یہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"وہ؟ وہ تو ٹیپ پر ہوتے ہیں۔"

"ہاہاہا۔"

"ہی ہی نہ کرو۔ تمھیں دُرست کرتا ہوں۔"

"ارے ارے، مت ---- مت کرو سری، ہوش کی دوا کرو۔ جب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو مستی کرنے پر آجاتے ہو۔ جاہل آدمی۔ ارے ---- اوہ ---- آ آ ہوں ں ---- ہنک ہنک۔"

نہ دُوسرا نہ تیسرا نہ چوتھا ---- وہ سب اُس کی یاد سے معدُوم ہو چکے تھے۔ مگر پہلا، نسرین کے لبوں کا وہ اوّلین لمس، سرفراز کے ہونٹوں پہ تازہ کِھلے ہُوئے پُھول کی مانند قائم تھا۔ آج بھی، گو بیچ میں کئی ماہ کا عرصہ پڑتا تھا، اُس بوسے کی خُوشبو، جلد پہ اُس کی جھرجھراہٹ، ریڑھ کی ہڈی میں اُس کی سرسراہٹ موجُود تھی، جیسے کہ وہ ایک بوسہ اُس کے بدن پر سَر سے پاؤں تک رینگتا ہوا چل رہا ہو۔ زبان کی نوک پر اُس کا ذائقہ، حلق کے اندر اُس کا لعاب، اور شیر کی مانند غُرا کر اُن نازک پسلیوں کو دبوچ لینے کی لذت ---- آج بھی اُس ایک سفّاک لمحے کی یاد اُس کے دِل کو بے چین کرتی تھی۔

نسرین کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات:

ہندوستان کی قید سے لوٹنے پر سرفراز کی دو ماہ کی چھُٹی کے آخری دن تھے۔ اُس کا دوست کیپٹن جمال، جس کی یونٹ شہر میں تعینات تھی، اور سرفراز، جمال کی جیپ میں سوار شہر کی مرکزی سڑک پر جا رہے تھے کہ ایک مظاہرے کے بیچ پھنس گئے۔ وہ آرام سے جیپ دوڑائے جا رہے تھے کہ اچانک اُن کا سامنا ایک جمِ غفیر سے ہُوا جو سڑک کے آر پار دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ کئی ہزار کا مجمع تھا۔ انوکھی بات یہ تھی کہ یہ مجمع تمام تر

عورتوں پہ مشتمل تھا۔ بوڑھی، جوان، اَدھیڑ عُمر عورتیں، چادریں اَوڑھے، بُرقع پوش، شلوار قمیض پہنے، ساڑھیاں لپیٹے، امیر عورتیں، غریب عورتیں، ہر نوع کی عورت اِس ہجُوم میں شامل تھی۔ چند ایک کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ اِن جھنڈوں کے آس پاس عورتوں کے گروہ، تنگ تنگ دائروں میں گویا دریا کے اَندر محراب کی مانند گول گول چکّر لگاتے ہُوئے نعرے لگا رہے تھے۔ نعرے لگانے والوں میں زیادہ تر جوان عورتیں تھیں۔ پکی عُمر کی عورتیں گو تماشائیوں کی مانند کھڑی، چہرے اُٹھائے سروں کے اُوپر اُوپر دیکھ رہی تھیں مگر ظاہر تھا کہ جلُوس میں اُن کی حیثیت برابر کے شریک کی سی تھی۔ سڑک پہ اِس ہجُوم کا بند بندھا تھا۔ آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

جمال نے ٹھٹک کر جیپ روک لی۔ دونوں اچنبھے کی حالت میں جیپ کے اَندر بیٹھے اَپنے سامنے یہ ریل پیل دیکھنے لگے۔ عورتوں کا اِتنا بڑا مجمع یُوں کھُلے بندوں دندناتا ہوا اُنھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حیرت اُن کو اِس بات پہ ہو رہی تھی کہ سڑک کا موڑ مڑنے تک اِس جلوس کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تھے۔ رستے میں پولیس کے سپاہیوں کی تعداد روزمرہ سے کچُھ زیادہ تھی، ایک آدھ فوجی گاڑی بھی دیکھنے میں آئی تھی، مگر یہ تو شہر کا معمول ہو چکا تھا۔ اِس کے علاوہ کوئی شور و غُل، بھاگ دوڑ یا تماشائیوں کا غول دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ فروری کا مہینہ ابھی شرُوع ہی ہُوا تھا مگر دھوپ کی رنگت بدلنا شرُوع ہو گئی تھی۔ آسمان کے سبزی مائل نیلے رنگ میں ہلکی سی پیلاہٹ آ چکی تھی۔ ہوا بند تھی اَور درختوں کے جامد پتے دھات سے ڈھلے ہُوئے معلُوم ہوتے تھے۔ چند لمحے پیشتر تک سرفراز اَور جمال کے دِل کے اَندر صرف ایک ہی خیال تھا کہ کیسے وہ جلد سے جلد جمال کے میس میں پہنچیں اَور وہاں آرام دہ صوفوں پر بیٹھ کر گرم گرم کافی کا آرڈر دیں اَور اَپنے ہم پیشہ افراد کے بارے میں تازہ ترین خبروں کا تبادلہ کریں۔ مگر جُونہی جمال سڑک کا موڑ مڑا، سامنے یہ اجتماع نظر آیا جو سارا ٹریفک روکے کھڑا تھا۔

جیپ کے رُکنے پر انجن کا شور کچُھ کم ہوا تو اُن کے کان میں نعروں کی آواز پڑی۔ ہر طرف سَر ہی سَر نظر آ رہے تھے۔ سروں کے اُوپر نعرے بلند کرنے والیوں کی دس دس، بیس بیس بانہیں بار بار گر اَور اُٹھ رہی تھیں۔ جلوس کے گرد اگرد پولیس کے سپاہیوں کا گھیرا تھا جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑی تھیں۔ اُن کے افسروں کی دو جیپیں بھی سڑک

کے کنارے رُکی نظر آ رہی تھیں۔ ایک پولیس کا کُھلا ٹرک سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پر چڑھا کھڑا تھا، جس کے عقبی حصے میں بینچ نُما سیٹوں پر ایک درجن رائفل بردار سپاہی بیٹھے تھے۔ جمال اَور سرفراز کی جیپ کے آگے کئی کاریں، ویگنیں، رکشے اَور ٹرک رُکے کھڑے تھے جن میں سے کئی ایک عادتاً ہارن پر ہارن بجائے جا رہے تھے۔ سرفراز اَور جمال نے ایک ساتھ اَپنے سیاہ چشمے اُتارے اَور دُھوپ کی چمک کے سامنے آنکھیں سُکیڑ کر اِس منظر کو دیکھنے لگے۔ اچنبھے کے عالم میں سرفراز کے ہونٹوں کے بیچ سے ہلکی سی سیٹی نکلی، جیسے کہ کہہ رہا ہو، بھئی واہ، دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے؟

چند ہی منٹ کے اندر اُن کے پیچھے بھی گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں۔ نہ آگے جانے کا رستہ رہا نہ پیچھے۔ یکایک مجمعے میں بھگدڑ مچ گئی۔

اَن گنت سروں کی لہریں، جو کسی سطح دریا کے مانند خم کھا کھا کے اَندر ہی اَندر بہہ رہی تھیں، یک دم ٹوٹ پھوٹ گئیں، جیسے کناروں سے ٹکرا کر ہوا میں قطرہ قطرہ ہو گئی ہوں۔ سروں کے اُوپر اُٹھے ہُوئے جھنڈے گر کر ہجُوم میں غائب ہوگئے۔ نعروں کی جگہ عورتوں کی تیز چیخیں اَور خوفزدہ باریک آوازیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ برقعہ پوشوں نے نقاب اُلٹ دیئے، اَور جب ایک دُوسرے سے ٹکرا کر، ٹھوکر کھا کر گریں تو نقاب اُتر کر غائب ہوگئے۔ دوپٹے اَور چادریں سروں سے گھسیٹی گئیں۔ ہر جانب ننگے سَر نظر آنے لگے۔ سامنے دو عورتیں ایک ہی دوپٹے کو اَپنی اَپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ کپڑوں، بازُوؤں اَور چوٹیوں کی رسّہ کشی جاری تھی، اَور اِس چھینا جھپٹی کے دوران چیخ و پُکار کا طوفان مچا تھا۔

"او مائی گاڈ"، جمال کے مُنہ سے نکلا۔ "پولیس ایکشن!"

دونوں نے مجمعے کے عقب سے سروں کے اُوپر لاٹھیاں اُٹھتی اَور گرتی اَور پھر اُٹھتی ہُوئی دیکھیں۔ عورتوں کا ایک غول گرتا پڑتا اور بھاگتا ہوا کاروں اَور ویگنوں کی جانب بڑھا اور اُن کے بیچوں بیچ، بیچ در بیچ لڑکھڑانے لگا۔ ایک چالیس سالہ بھاری بھرکم عورت، جیسے دَوڑ کا ایک قدم اُٹھائے غالباً بیس برس ہونے کو آئے تھے، بھدے طریقے سے بھاگتی ہُوئی اُن کے پاس سے گزری۔ "ہائے ظالمو، ہائے ظالمو"، وہ روتی ہُوئی پُکارتی جا رہی تھی، جیسے ماتم کر رہی ہو۔

اُس عورت کے پیچھے اچانک ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ ننگے سَر تھی۔ اُس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے جو اکٹھے کر کے پیچھے ربڑ کے دھاگے سے باندھے گئے تھے۔ اُس کے ماتھے پہ ایک معمولی سا زخم تھا جس سے خُون رِس رہا تھا۔ اُس نے ہلکی سویٹر پہن رکھی تھی۔ اوڑھنی کی غیر موجُودگی میں اُس نے دونوں بازُو سینے پر قینچی کی شکل میں باندھ رکھے تھے اَور ہاتھوں سے دونوں شانوں کو پکڑے تھی، جیسے کہ اپنے آپ کو چھپانا اَور ساتھ ہی تھام کر رکھنا چاہتی ہو۔ فوجی جیپ کو دیکھ کر لڑکی چند قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ کئی لمحوں تک وہ جیپ کے شیشے میں سے جمال کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہیں بے خَوف تھیں۔ پھر وہ آگے بڑھی اَور گاڑی کے دروازے کے پاس آ کر رُک گئی۔ اُس کے آس پاس عورتیں روتی چیختی ہُوئی بھاگی جا رہی تھیں۔ لڑکی نے جیپ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی نہ کچھ بولی، بس چُپکی کھڑی رہی۔ اُس کے نازک جسم کے باوجود اُس کے انداز میں دہشت کے کوئی آثار نہ تھے۔ جمال نے دروازہ کھولا اَور چہرہ اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔

"پلیز،" وہ بولی، "آپ مُجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟"

لڑکی کے حلق سے نِکلتی قدرے بھاری، گہری اَور پُرسکون آواز سُن کر جمال اَور سرفراز کو کچھ حیرت سی ہُوئی۔

"آپ کے لئے،" لڑکی پھر بولی، "یہاں سے نکلنا آسان ہو گا۔"

اُس کا لہجہ نہ تحکمانہ تھا نہ عاجزانہ، مگر صاف سپاٹ بھی نہ تھا۔ اُس کے اَندر کوئی ایسا اَن جانا انداز تھا کہ جمال اَور سرفراز، دونوں بِلا تامّل، اپنی اپنی سیٹ سے اُٹھ کر جیپ کے باہر کھڑے ہو گئے۔ پولیس کا ایک سپاہی جو بے دِلی سے دو عورتوں کا پیچھا کر رہا تھا، فوجی گاڑی کو دیکھ کر ٹھٹکا اَور فوراً پلٹ کر دُوسری جانب کو روانہ ہو گیا، جیسے اپنی ڈیوٹی ادا کر چکا ہو۔ جمال نے اگلی سیٹ اُلٹا کر پیچھے نِکلنے کا رستہ بنایا۔ لڑکی بازُو اپنی جگہ سے ہلائے بغیر جھُک کر اندر داخل ہُوئی اَور اِسی طرح پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔

جمال نے آگے پیچھے نظر دوڑا کر ٹریفک کا جائزہ لیا، ہاتھ اُٹھا کر پچھلی دو چار گاڑیوں کو رستہ چھوڑنے کا اشارہ کیا اَور دِل میں گاڑی نکالنے کا کوئی رستہ بنایا۔ وہ جھُک کر اندر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک عُمر رسیدہ دیہاتی عورت اِس بھاگ دَوڑ کے درمیان، کمزور چال

سے چلتی ہوئی آ کر جمال کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے کمر میں تہمد باندھ رکھا تھا اور گلے میں سیاہ ململ کا کھلا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اُس کا سَر مختصر سی دسترخوان نما چادر سے ڈھکا تھا۔ عورت نے جیپ کے بونٹ پر ہاتھ رکھ کر جسم کو سہارا دیا اور منہ اُٹھا کر چند لمحے خاموشی سے جمال کو دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پہ لجاجت پھیلی تھی اور انداز سے ظاہر تھا کہ مدد کی طلب گار ہے۔ جب اُس نے مُنہ کھولا تو اُس کا لہجہ اُسی طرح مسکین تھا، مگر الفاظ قطعی مختلف تھے۔

"پُترّ"، وہ بولی، "تہاڈیاں ماواں نے تُہانوں دُدھ نہیں بخشنا۔"

جمال اُس کی بات سُن کر ایسا ٹھٹکا کہ خالی خالی نظروں سے بوڑھی عورت کو دیکھتا رہا، جیسے کہ اُس کی زُبان گنگ ہو گئی ہو۔ عورت نے جیپ سے ہاتھ اُٹھایا اور آہستہ سے جہاں کھڑی تھی وہیں پر بیٹھ گئی۔ زمین پر بیٹھ کر اُس نے اپنا سَر دونوں ہاتھوں میں لیا، کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکائیں، اور چُپکے چُپکے رونے لگی۔

جمال اپنی جگہ پہ کھڑا حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جلدی سے سرفراز پہ ایک نظر ڈالی اور جھُک کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ سرفراز نے اپنی سیٹ پہ بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ جمال نے آگے سڑک پہ نظر دوڑائی تو رستہ کچھ صاف ہوتا نظر آیا۔ دیہاتی عورت جیپ کے پہیئے کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ جمال نے احتیاط سے سٹیرنگ گھما کر گاڑی آگے بڑھائی۔ ابھی وہ چند ہی گز گیا ہو گا کہ پچھلی سیٹ سے بھروہی گہری، حیرت ناک آواز آئی۔

"حرام زادوں نے میرا دوپٹہ پھاڑ دیا ہے۔"

جمال اور سرفراز ابھی دیہاتی عورت کے وار سے سنبھلنے نہ پائے تھے۔ لڑکی کی بات نے اُن میں غیر معمولی ردِ عمل پیدا کیا۔ جمال نے ایکسیلیٹر پر پاؤں مارا، ہارن پہ ہاتھ رکھ کر دبایا اور دیر تک دبائے رکھا۔ شور مچاتی جیپ نے ایک مختصر سا تیز فراٹا بھرا اور اپنے آگے گاڑیوں، سپاہیوں اور بھاگتی ہوئی عورتوں کو بکھیرتی، راستہ چیرتی ہوئی نکلنے لگی۔ اُسی لمحے سرفراز نے جھٹکے سے مُنہ موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُس کے دِل میں حیرت اور نامعلوم سے غصے کے ملے جلے جذبات تھے۔

بازوؤں سے سینہ ڈھکے اور ہاتھوں سے کندھوں کو تھامے ہوئے لڑکی اُسی صُورت

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اُس کی ہڈی پتلی اور جسم انتہائی دُبلا تھا۔ اُس کا وزن بمشکل ایک من کا ہوگا، مگر اُس کے لہجے کی مانند اُس کے سَر اور چہرے سے بدن کی نزاکت کا کوئی نشان نہ ملتا تھا۔ اُس کا ماتھا چوڑا، رنگ صاف، بڑی بڑی پُراعتماد آنکھیں اور ناک نقشہ موزوں تھا۔ اُس کے ماتھے کی خراش پہ جمتا ہُوا خُون بے اصل سا دکھائی دے رہا تھا۔

"ٹھہریئے ٹھہریئے،" وہ جلدی سے بولی، "ذرا ایک منٹ رُکیئے، پلیز---- میری کتابیں----"

یک دم بریک لگنے سے جیپ ایک دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔ سڑک پر سینکڑوں چھوٹی بڑی اشیاء کے علاوہ کئی کتابیں، کاپیاں، پین اور پنسلیں بکھری پڑی تھیں۔ اب یہاں پہ جلوس کی اِکّا دُکّا عورت رہ گئی تھی جو بوکھلائی ہُوئی بے سمت اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ زیادہ تعداد پولیس کے سپاہیوں کی تھی جو دو دو چار چار کی ٹولیاں بنائے اپنی لاٹھیوں کے سہارے کھڑے تھے۔ سرفراز اپنی سیٹ پہ بیٹھا رہا۔ جمال دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنی سیٹ اوندھی کرکے دروازے پہ کھڑا اِنتظار کرنے لگا۔ لڑکی جھُک کر دروازے سے باہر نکلی۔ اب سرفراز کی نظروں میں تحیّر ہی تحیّر تھا۔ پچھلے چار پانچ منٹ کے دوران، جب سے اُنہوں نے لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا، اُس کے بازو اپنی جگہ نہ ہلے تھے۔ جیپ میں داخل ہوتے ہُوئے، سیٹ پہ بیٹھے ہُوئے، بات کرتے، اور اب جھُک کر باہر نکلتے ہُوئے اُس نے ہاتھ سے نہ ماتھے کے زخم کو چھُوا تھا، نہ کسی شے کا سہارا لیا تھا۔ اب جب کہ وہ سڑک پر چل پھر کر گری پڑی کتابوں اور کاپیوں کو جھُک جھک کر دیکھ رہی تھی تو بھی اُس کے ہاتھ شانوں کو گرفت میں لئے ہُوئے تھے۔ یُوں معلُوم ہوتا تھا گویا پیدا ہی اِس انداز سے ہُوئی ہو۔ اُسی صُورت میں وہ سڑک سے پلٹ آئی۔ جمال کے قریب آکر اُس نے نفی میں سَر ہلایا۔ ایک بار پھر وہ کسی چیز کو چھوئے بغیر، جھُکے جھُکے، اُس تنگ سے راستے سے داخل ہو کر پچھلی سیٹ پہ جا بیٹھی۔

"نہر کو پار کرکے بائیں کو ہولیں تو آپ کی مہربانی،" وہ بولی، "مجھے کینٹ جانا ہے۔"

"میں آپ کو کینٹ میں ہی اپنے ہسپتال لئے چلتا ہوں" جمال نے جواب دیا، "آپ کے زخم کو دکھالیں۔"

"جی کوئی بات نہیں،" لڑکی نے کہا، "معمولی سی خراش ہے۔"

سرفراز نے غیرارادی طور پر مڑ کر اُسے دیکھا۔ مگر لڑکی نے نہ ہاتھ اُٹھا کر ماتھے کو چھوا نہ ہی خُون کے باریک قطروں کو پُونچھنے کی کوشش کی۔ "کسی نہ کسی کو تو دکھانا ہی ہوگا آپ کو،" جمال نے کہا، "یہاں ذرا اچھی طرح سے ڈریسنگ وغیرہ ہو جائے گی۔ جلد فارغ ہو جائیں گے۔ پھر مَیں آپ کو گھر چھوڑ دُوں گا۔"

لڑکی ایک منٹ تک خاموش رہی۔ سرفراز نے تیسری بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لڑکی نے اپنے سَر کو ذرا سا موڑ کر، پہلی بار، سیدھا سرفراز کی آنکھوں میں دیکھا۔ "چلئے، آپ کہتے ہیں تو چلے چلیں،" وہ نظر ہٹائے بغیر بولی، "شکریہ۔"

سرفراز کو لگا جیسے وہ اُس کو دیکھ نہیں رہی بلکہ اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔

"میرا نام نسرین ہے۔" وہ آنکھ جھپکے بغیر بولی۔

سرفراز کی زُبان کو گویا تالا لگ چکا تھا۔ اُس نے محسُوس کیا کہ وہ اپنی نظر کی تار توڑنے سے قاصر تھا۔

"میرا نام جمال ہے،" جمال نے جیپ چلاتے ہُوئے جواباً کہا۔ "یہ کیپٹن سرفراز ہیں۔"

"جی" نسرین بولی۔

سرفراز یک دم گہرا جھینپ گیا۔ دوبارہ مڑ کر بیٹھنے میں اُس کی تمام تر قوت اِرادی صرف ہوگئی۔ "یہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔" اُس نے دِل میں سوچا۔

بعد میں، جب بھی کبھی اُس نے اِس بارے میں سوچا، اُس کا ذہن اِس ایک لمحے پر ہی جا کر اٹکا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اُسے اَچانک، بغیر سوچے سمجھے اَور خیال کئے ہُوئے، اُس انجانی لڑکی سے مُحبت ہوگئی تھی۔

کھڑکی کے شفاف شیشے کی چوکھٹ سے سرفراز کو صرف آسمان نظر آ رہا تھا جس پہ اِس وَقت دوپہر کی تپی ہُوئی سفیدی کچھ ماند پڑ رہی تھی اَور نیلاہٹ اُس کی جگہ اُبھرتی آ

نظر جمائے ہُوئے، اُس کے دِل میں پھر اُسی رہی تھی۔ اپنی سیٹ پہ لیٹے لیٹے، آسمان پہ نامعلوم سی بے چینی نے سر اُٹھایا۔ خوابوں کی بے قابو جھلکیاں اُس کے خیالات کو بکھیرنے پہ مصر تھیں۔ ریل گاڑی واضح طور پر حرکت میں تھی۔ پہیّوں کی گڑگڑاہٹ اور ڈبے کی ہلچل اِس بات کی گواہ تھی کہ گاڑی کئی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حیدر آباد کی جانب رواں تھی۔ مگر کھڑکی میں آسمان کا چوکھٹہ قطعی ساکن اور بے حرکت تھا۔ کبھی کبھار کوئی پرندہ اُونچی پرواز کرتا ہوا اِس چوکھٹے کو کاٹتا تو ریل کی حرکت کا ثبوت ملتا۔ مگر کئی منٹ گزر چکے تھے اور کوئی پرندہ نظر نہ آیا تھا۔ ساکت و جامد آسمان سرفراز کو اِس حرکت سے، جسے وہ اپنے بدن میں محسوس کر رہا تھا، الگ رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ جیسے ہی اُس کی نظر زمین پہ پڑی اُسے محسوس ہوا گویا اُس کا توازن بحال ہو گیا ہو۔ بھورے رنگ کی ریتلی زمین اور اُس پہ اُگے ہوئے مَیالے درخت، پست قد جھاڑ، آموں کے گہرے اندھیرے والے، سیاہی مائل سبز باغ، گندے پانی کے جوہڑ، اُن کے اندر نہاتی ہوئی بھینسیں اور اُن کے کنارے جلی ہوئی جلدوں والے بچے، کہیں کہیں چٹیل میدانوں سے اُٹھتے ہوئے گرد کے بگولے اور سورج کی آگ کے آگے مُنہ سر ڈھکے، پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اِکّا دُکّا مسافر فرّاٹے بھرتے ہوئے پیچھے کی جانب اُڑے جا رہے تھے۔ اُنہیں دیکھتے دیکھتے سرفراز کا دو لخت ذہن یک جا ہونے لگا۔ چند ہی منٹ کے اندر اُس کے دِل کی بے چینی کم ہو گئی۔ آدھ گھنٹے کی ہلکورے لیتی ہوئی نیند اور خوابوں کی بے لگام جھلکیوں نے اُس کے فہم اور بدن کے درمیان جو دراڑ ڈال دی تھی، زمین کی رفتار نے اُسے بھر دیا تھا۔ وہ دوبارہ ہاتھ سر کی پُشت پہ باندھ کر سیدھا سیٹ پر لیٹ گیا۔ زمین ایک بار پھر اُس کی نظر سے غائب ہو گئی۔ مگر آسمان کا جامد ٹکڑا اب اُس کی پریشانی کا باعث نہ بن رہا تھا۔ صرف ایک مکھی ڈبے میں کہیں سے داخل ہو گئی تھی جو شیشے کو آزادی کا رستہ سمجھ کر بار بار اُس کے ساتھ سر پٹک رہی تھی۔ ڈبے کی باقی تین سیٹیں خالی تھیں۔ سرفراز کے علاوہ تین آدمی ـــــ ایک سوداگر (کرتے کے نیچے پھُولی ہوئی جیبوں والی واسکٹ) ایک زمیندار (سفید قمیض شلوار، کالی عینک، لبوں سے تراشی ہوئی، ناک پر چڑھی مونچھیں) اور ایک غالباً سول کا افسر (اٹیچی کیس، پُراعتماد چال، موٹے گال، زردی مائل جلد، چشمہ) ـــــ جو سرفراز کے ساتھ ہی سوار ہوئے تھے، بیچ کے سٹیشنوں پہ اُتر چکے تھے۔ پھر ایک اگلے

سٹیشن سے ایک پیر صاحب اُور اِن کے دو جوان بیٹے ڈبے میں سوار ہُوئے۔ پیر صاحب اُور اُن کا بڑا بیٹا پلیٹ فارم پر اپنے بیسیوں پیروکاروں میں گھرے کھڑے بات چیت کرتے رہے، حتیٰ کہ گارڈ نے سیٹی دے دی۔ پھر مُریدوں نے جھُک جھک کر، پیر صاحب کے ہاتھ چُوم چُوم کر اور گھٹنے چھُو چھُو کر انہیں رُخصت کیا۔ سرفراز اپنی جگہ پر لیٹا خوانچے والوں اُور اخبار رسالے بیچنے والوں کو آتے جاتے اُور پریشان مسافروں کو دوڑ بھاگ کرتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ اِس سارے منظر کے آگے اکلوتی مکھی شیشے پر اپنا سَر پٹختی رہی۔ اِس مکھی کو دیکھ دیکھ کر سرفراز کے دِل میں ہلکی سی بے اطمینانی اُور ساتھ ہی ساتھ ہلکی سی دلچسپی کا احساس اُبھرا۔ اُس نے دوبارہ اپنے خیالات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔

"ہینڈز آف!" بعد میں اُس روز سرفراز نے جمال سے کہا تھا۔

"کچھ شرم کرو" جمال نے جواب دیا تھا۔

"نیور مائنڈ، تُو نے کوئی پیش قدمی کی تو پھر خیر نہیں۔"

"آل رائٹ، آل رائٹ،" جمال نے دونوں ہاتھ ہوا میں اُٹھاتے ہُوئے جواب دیا، "میں دستبردار ہوتا ہُوں۔"

"گڈ" سرفراز نے ہوا میں مُکا چلاتے ہُوئے کہا۔

اِس طرح گویا اُس نے مُہر کی شکل میں نسرین پر اپنا حق ثبت کر دیا تھا۔

بھن، بھن، بھن، بھن۔

مکھی اب سرفراز کے سَر کے گِرد بھنبھنا رہی تھی۔ پہلے اُس کا سَر اُور مُنہ مکھی کے وار سے بچنے کے لئے اِدھر سے اُدھر جھٹک رہا تھا؛ اُس کے بعد ہاتھ اُور بازُو مکھی کو بھگانے اُور پھر اُسے پکڑنے کے لئے ہوا میں چھوٹے چھوٹے چکّر کھانے لگے۔ آہستہ آہستہ اُس کے سارے بدن میں مقید ایک ایک پٹھا نیند سے جاگ اُٹھا۔ جب وہ سکول میں

پڑھتا تھا تو ایک ہی وار میں مکھی کو اپنی مٹھی میں قابو کر لیا کرتا تھا۔ مگر اب یہ گُر اُس کے ہاتھ سے نکل چُکا تھا۔

سرفراز نے اخبار کو دُہرا کیا اَور گول لپیٹ کر اُس کا ڈنڈا بنالیا۔ اب وہ مکھی پر جھپٹنے کے لئے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ پیر صاحب چادر تانے گہری نیند سو رہے تھے۔ اُن کے مہیب خراٹوں کی آواز چادر کے اندر سے برآمد ہو رہی تھی۔ مکھی نے اُس سفید چادر کو گویا اپنی سرزمین بنالیا تھا۔ وہ پھدک کر اُڑتی، ہوا میں دو چار قلانچیں بھرتی، ایسی برق رفتاری سے کمرے کے کونے کونے میں پھرتی کہ نظروں سے غائب ہو جاتی، پھر چشم زدن میں پلٹ کر پیر صاحب کی چادر پر آ بیٹھتی۔ مکھی کی ہر اُڑان کے دوران سرفراز کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کا ڈنڈا مکھی کے تعاقب میں اُلٹی سیدھی بے ترتیب اَور بے توازن حرکات کرتا، فضا کو دائیں اَور بائیں، اُوپر اَور نیچے کاٹتا، پھر یک دم ہوا میں اُٹھا اُٹھا رُک جاتا، جب کہ مکھی آرام سے چادر پہ بیٹھی ہوتی۔ اِسی طرح ہوا میں شمشیر زنی کرتے ہُوئے اُس نے اُوپر نظر اُٹھائی تو بڑا بیٹا لیٹا لیٹا آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت سرفراز کی حالت یہ تھی کہ وہ اخبار کا ڈنڈا ہاتھ میں اُٹھائے، سوئے ہُوئے پیر صاحب کے اُوپر جھکا ہُوا تھا، گویا اُن پر وار کرنے والا ہو۔

"ایک مکھی،" وہ جھینپ کر بولا، "دیر سے تنگ کر رہی ہے۔"

پیر صاحب کے بیٹے نے مشکوک نظروں سے سرفراز کو دیکھا۔ پھر کروٹ بدل لی۔ سرفراز نے دانت پیس کر پیر صاحب کی چادر کے اُوپر اُوپر تلوار چلائی۔ اب مکھی کھڑکی کے شیشے سے سر پٹک رہی تھی۔ سرفراز کی آنکھوں میں ایک اَیسے شکاری کی سی چمک پیدا ہُوئی جس نے شکار کی بُو سونگھ لی ہو۔ مکھی نے ایک بار پھر اپنے آپ کو اُس شفاف، اَن دیکھی دیوار میں قید کر لیا تھا۔ وہ بے معلوم پردہ جس کے آر پار مکھی کی آنکھ دیکھ سکتی تھی، مکھی کو اندھا کر چکا تھا۔ سرفراز کے اندر بدامنی کی جو دیوار کھڑی تھی وہ بھی شیشے کی مانند بے داغ اَور بے معلوم تھی اَور اِس نے سرفراز کی بینائی کو معدوم کر رکھا تھا۔ کئی سیکنڈ تک وہ اکڑا ہوا، چوکس بدن لئے بے حرکت کھڑا نشانہ باندھتا رہا، جیسے وہ مکھی نہیں بلکہ اِس دیوار کو جو پچھلے چوبیس گھنٹے میں اُس کے اندر کھڑی ہو چکی تھی، منہدم کرنا چاہتا ہو۔ آخر اُس نے جھپٹ کر ایک زوردار وار سے مکھی کو جالیا۔ پٹاخے دار آواز بلند ہونے سے

پیر صاحب چونک کر جاگ اُٹھے۔ اُنھوں نے چادر ہٹا کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے سرفراز کو دیکھا۔ سرفراز اُن سے بے خبر کھڑا مکھی کو دیکھ رہا تھا جو اب نیچے فرش پہ ایک سیاہ دھبے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ مڑنے سے پہلے سرفراز نے اپنا پیر اُس پہ رکھا اور بدن کا پُورا بوجھ اُس پہ ڈال کر جوتے کے تلے سے مکھی کو مسل کر رکھ دیا۔ پھر وہ اپنی سیٹ پہ جا بیٹھا۔ اب وہ اُس بے نشان شیشے کے وجُود سے بے خبر باہر زمین کو دیکھ رہا تھا جہاں دُھوپ میں نچڑے ہُوئے کھیت اَور فصلیں اَور مویشی اَور کسان اُلٹے پاؤں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ وَقت کے وجُود سے بے خبر، سرفراز کا دھیان بھی پیچھے کی جانب بھاگتا ہوا دُور تک نِکل گیا۔

دُھوپ۔

ایک برسا برس پُرانی دُھوپ تھی جس کی شکل بھی یہی تھی، مگر اصلیت مختلف تھی۔ پُرانی دُھوپ کی آنکھ میں جادُو تھا۔ اُس قدیم دُھوپ کی عُمر تین سال کی تھی اَور اُس کے بدَن میں جو تناؤ اَور سطح پہ جو چُکا چوند تھی وہ آج کی اِس تازہ دُھوپ میں مفقود تھی۔ سردیوں کی اُس دُھوپ کے اَندر گاؤں کے باہر میدان میں ریچھ اَور جادُو کا کھیل ہو رہا تھا۔ سارے گاؤں کے بچے، کچُھ عورتیں، اَور چند جوان اَور بُوڑھے مرد دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ دائرے کے اَندر ایک بہت بڑا، پہاڑ جتنا کالا ریچھ اَپنی نکیل کی رسّی کے آگے سَر جھکائے، تھوتھنی زمین پہ رکھے لیٹا تھا۔ کالی ڈاڑھی والا فقیر ریچھ کو نچانے سے پہلے کٹورے کے جادُو کا کھیل دکھا رہا تھا۔ پہلے اُس نے زمین کے ایک ہموار حصے پر کپڑا پھیر کر اُسے صاف کیا۔ اُس کے بعد اَپنے تھیلے سے ایک چھوٹی سی رنگ برنگی گیند نکالی اَور اُنگلی اَور انگوٹھے میں اُٹھا کر چاروں طرف لوگوں کو دکھائی، پھر گیند کو زمین پر رکھا اور تیزی سے ایک سلور کا کٹورہ اُوپر اوندھا کر کے گیند کو ڈھانپ دیا۔ اب اُس نے نکیل کی رسّی کھینچ کر ریچھ کو اُٹھایا اَور اَپنی جگہ سے ہلے بغیر، رسّی کی مدد سے ریچھ کو میدان کے چکّر لگوائے۔ اِس دوران وہ رسّی کو ہاتھ پر لپیٹ کر اُس کے طول کو کم کرتا گیا حتیٰ کہ ریچھ کا دائرہ کٹورے کے حلقے

تک محدود ہو کر رہ گیا۔

"انتر جنتر باز قلندر، بچہ جمورہ بول اِک منتر" فقیر نے تان لگائی، "چل بیٹا چل، مہمانوں کو جادُو کا کھیل دکھا۔" اُس نے نکیل کو تنک دی تو سدھے ہُوئے ریچھ نے اپنی تھوتھنی اوندھے کٹورے سے لگا دی۔ ایک منٹ تک وہ اُسی طرح تھوتھنی کو کٹورے پر رکھے کھڑا رہا۔ پھر فقیر نے نکیل کھینچی تو ریچھ سَر اُٹھا کر دوبارہ کٹورے کے گرد چکّر لگانے لگا۔

"بزرگو، نمبردارو، بیبیو اَور بچو نگڑو، دُنیا میں میرا نہ مائی نہ باپ، نہ بی بی نہ اولاد، بس یہ ایک بے زُبان جانور میرا بچہ۔ مہمانو، اِس بچّے کے مُنہ میں زُبان نہیں مگر اِس کا پیٹ کرتب سے ہے بھرا ہوا۔ میرے بھائیو، دیکھو، ہماری تُمھاری آنکھ کے سامنے، ہماری تُمھاری نظر کو مات دے کر، یہ بچہ گیند اُڑا کر اَپنے دیس کو چلا گیا ہے۔ اے ے ے بھائیو اَور بہنو، ہوش سے دیکھو اَور اِس بچّے کے جادُو کی گواہی اَپنی آنکھ سے طلب کرو۔"

یہ کہہ کر فقیر نے جو کٹورہ زمین سے اُٹھایا تو نیچے کچُھ بھی نہ تھا۔ گیند غائب ہو چکی تھی اَور زمین خالی پڑی تھی۔ فقیر نے کٹورہ ہاتھ میں اُٹھایا اَور ایک لوہے کے چمچے سے ٹن ٹن بجاتے ہُوئے گھُوم گھُوم کر لوگوں کو دکھانے لگا۔ کٹورہ خالی کا خالی تھا۔ بچّے تو بچّے، بڑے لوگ ہکّا بکّا رہ گئے۔ کٹورہ بجاتے بجاتے یکایک پھر فقیر نے ایک قلانچ بھری اَور جھُک کر ریچھ کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ ہاتھ مارا۔ جب اُس نے ہاتھ باہر نکالا تو ایک اُنگلی اَور انگوٹھے کے درمیان وہی گیند پکڑی ہُوئی تھی۔ فقیر نے ایک نعرہ لگایا اَور لوگوں کے حلقے کی حد کے ساتھ ساتھ گھُومتے ہُوئے گیند ایک ایک کی آنکھوں کے سامنے لا کر دکھائی۔

"چل بچّے چل،" فقیر اب ہاتھ سَر سے اُوپر لے جا کر نکیل کی رسّی کو تنکیں مارنے لگا۔ "ناچ دکھا دے دریا دلوں کو، ہاتھ پھیلا دے سخیوں کے آگے، رزق کی مالک اللہ کی ذات، چل بچو نگڑے چل۔۔۔۔"

ریچھ اَپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر، اگلی ٹانگوں کے پنجے ہوا میں ڈھیلے چھوڑے، بھونڈے انداز میں ہلنے لگا۔ اُس وَقت تین سالہ بچّے نے اُس دُھوپ میں ریچھ کی ناف سے نیچے لٹکتے ہُوئے کالے بالوں کے اندر اُس کے آلات تناسل دیکھے جو اُس کے بدن کی حرکت کے ساتھ آہستہ آہستہ تھرک رہے تھے۔ معاً بچّے کے دِل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ

جگہ جہاں گول گول چیزیں اُچھل رہی تھیں ریچھ کا جادُو کا بنُوا تھا جس میں اُس نے گیندیں چھپا رکھی تھیں۔ اِس خیال نے پل بھر کے لئے بچّے کے دِل پر ایسا قبضہ جمایا کہ اُسے اپنے آپ کا ہوش نہ رہا۔ چمکتی ہُوئی دُھوپ میں ریچھ چکّر لگاتا ہوا اب اُس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ دُھوپ اُس کے کالے بالوں سے پھسلتی ہُوئی نیچے ساری زمین کو لپیٹ میں لئے ہُوئے تھی۔ بچہ ایک ایک بال کو، اُس کی باریک کالی آنکھوں، اُس کی تھوتھنی، اُس کے لٹکے ہُوئے اگلے پنجوں، اُس کی ناف اور اُس کے بٹوے کو الگ الگ دیکھ سکتا تھا اور اُس درندے کی تیز اجنبی بُو کو سونگھ رہا تھا۔ اُس کو محسُوس ہوا کہ وہ اور ریچھ دونوں تن تنہا اُس سفید دُھوپ کے جال میں ایک دُوسرے کے ساتھ بندھے ہُوئے ہیں اور اِن کے سوا کوئی بندہ بشر اُس میدان میں موجُود نہیں ہے۔ بچّے نے بے اختیار قدم آگے بڑھایا اور ہاتھ سے ریچھ کے بٹوے کو چھُو لیا۔ اپنی ننھی انگلیوں پہ جنگلی جانور کے کھُردرے بالوں کی رگڑ کو اُس نے قرب کی اِس شدت سے محسُوس کیا کہ ایک لمحے کا وہ لمس عمُر بھر کے لئے اُس کے حواس پہ مُہر ہوگیا۔ سارے مجمعے میں سے ایک مختصر ہُوک نُما آواز بلند ہُوئی اور پھر یک دم خاموشی چھاگئی۔ اُس خاموشی کے اندر ریچھ نے ایک جھرجھری لی اور اُس کے بدن سے ایک خوفناک، ٹُوٹی بھوٹی غرّاتی ہُوئی آواز نکلی۔ یکایک بچّے کا سحر ٹُوٹ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اُس کے دِل پہ اب خَوف کا سایہ اندھیرا کئے ہُوئے تھا۔ اُس کی آنکھیں بچی تھیں اور اُسے کچُھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔ تاہم اِس دہشت کے اندر کہیں اُس کا ایک احساس موجُود تھا کہ ایک ہاتھ لپک کر اُسے اٹھالے گا اور اُس کو ڈر سے دُور لے جائے گا۔

اٹھارہ سالہ اعجاز نے لپک کر اپنے تین سالہ بھائی سرفراز کو گود میں اٹھالیا۔ اُس نے بچّے کا چہرہ اپنے سینے میں چھپا کر اُس کا سَر کندھے سے لگالیا اور ہولے ہولے اُس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں بچّے کی چیخیں رُک گئیں۔ اُس کے آنسو تھم چکّے تھے، مگر اُس نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں اور نہ ہی سَر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس چوڑے سینے میں مُنہ چھپا کر بچّے کے دِل کو آرام آنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس سینے سے چمٹ کر سویا رہنا چاہتا تھا۔ تین سالہ احساس میں بس اِتنی سی پہچان تھی کہ اُن بڑے بڑے بازُوؤں، اُس سینے اور اُس چہرے کی حفاظت میں ڈر دُور ہو جاتا تھا۔ بچپن سے لے کر جوان ہونے تک، اور

اُس وقت تک بھی جب وہ قدوقامت میں اَپنے بھائی سے سَر نکال چُکا تھا اور رُتبے میں اُس سے آگے بڑھ گیا تھا، اُس کے دِل میں ہمیشہ ہمیشہ یہ اطمینان بخش احساس قائم رہا کہ اُس کے بھائی کے ہاتھ اُس کی پیٹھ کے پیچھے تھپکی دینے کو موجُود تھے۔

مگر اب دُنیا بدل چکی تھی۔ پچھلے دو دِن کے اَندر وہ سینہ سرفراز سے چھن گیا تھا۔ ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے بیٹھے اب تحفظ کا وہ احساس سرفراز کے دِل میں ایک اٹل عدم موجُودگی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب وہ اِس صُورت سے دوچار تھا کہ کِس طرح وہ اَپنے بھائی کے خیال کو ذہن سے رفع کرے۔ اعجاز کا چہرہ تھا کہ ایک ضِد کی مانِند اُس کی یاد میں آئے چلا جاتا تھا۔ ہیجان کی حالت میں آخر اَپنی قوت ارادی کو بروئے کار لا کر ایک بار پھر اُس نے نسرین کو یاد کرنے کی کوشش کی، جیسے کہ وہ اُس زہر کا تریاق ہو جو سرفراز کے اَندر پھیلتا جا رہا تھا۔

"تمھیں سردیوں میں بھی پسینہ آتا ہے؟"

"کھُلے مساموں والا آدمی ہُوں، تمھاری طرح لپٹا لپٹایا تھوڑا رہتا ہُوں۔ یہ دیکھو۔"

"ہائے کتنے بال ہیں تمھاری چھاتی پہ، ریچھ کی طرح سیاہ کالے، پیٹ تک جا پہنچے ہیں، جلد تک دکھائی نہیں دیتی، کِسی جانور کی نسل سے ہو----"

"اسی لئے تو تمھیں پسند ہوں۔"

"ہٹو پرے۔"

"تم شیر کی آواز پہ کھنچی جاتی تھی کہ نہیں؟"

"وہ تو شیر تھا۔"

"شیر جانور نہیں ہوتا؟"

"شیر تو شیر ہوتا ہے۔"

"اُس کی چھاتی پہ بھی بال ہوتے ہیں۔"

"ہاہاہا---"

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"تم نے شیر دیکھا ہی نہیں۔"

"بنگال میں رہ کر آیا ہوں دیکھا کیسے نہیں؟"

"اوٹ پٹانگ مار رہے ہو۔"

"تم کوئی زو آلوجسٹ ہو؟ شیر کی چھاتی پہ بال ہوتے ہیں۔ مَیں اِس کی گواہی دیتا ہوں۔"

"یہ تمہاری مردوں والی شیخیاں ہیں، حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کیسے نہیں ہے؟"

"شیر دیکھا ہوتا تو ایسی ڈینگ نہ مارتے۔"

"چلو تم بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"شیر کی چھاتی پہ بال نہیں ہوتے؟"

"اونہوں۔ شیر کے بدن پہ باریک پشم اُگی ہوتی ہے، ایسی کہ بس جلد کی جلد ہی لگتی ہے۔ اور ببر شیر کی صرف گردن پر بال ہوتے ہیں۔"

"پھر اصل شیر کی چھاتی پہ بال موئے نا۔"

"گردن گردن ہوتی ہے بیوقوف، چھاتی نہیں ہوتی، شیروں کی چھاتیوں پہ تو ریشم منڈھا ہوتا ہے۔ ہائے کیا چھاتیاں ہوتی ہیں، ریشم کی جلد کے اندر ریشے گتھم متھم کرتے ہیں۔"

"جیسے تمہاری چھاتی میں کرتے ہیں۔"

"شرم کرو۔ کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو ایسی باتوں پہ اُتر آتے ہو۔"

"کیسی باتوں پہ اُتر آتا ہوں؟ یہ دیکھو، گتھم متھم۔۔۔۔"

"سری، ہاتھ مت چلاؤ۔ تمہیں بہت آزادی مل گئی ہے۔"

"میں شرط سے کہتا ہوں کہ تمہاری چھاتی پہ بھی بال ہیں۔"

"ارے جاؤ۔"

"نہیں تو دکھاؤ۔ شرط ہار جاؤں گا۔"

"کیا بیوقوفوں والی باتیں کر رہے ہو۔"

"شرط جیتنا نہیں چاہتیں؟"

"اچھا بولو، کیا شرط لگاتے ہو؟"

"جو بھی چاہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی، ساری دُنیا مانگوں تو مل جائے گی؟"

"جتنی دُنیا میرے ہاتھ میں ہے دے دوں گا۔"

"ہاہاہا یہ خُوب رہی۔"

"کیوں؟"

"تُمہارے ہاتھ میں ہی کتنی دُنیا۔"

"جان تو ہے۔"

"جان دے دو گے؟"

"ہاں۔"

"پھر بڑیں ہانکنے لگے؟"

"شرط پُوری کر کے دیکھ لو۔"

"تُمہیں پتا ہے میں یہ شرط پُوری نہیں کروں گی۔"

"ہار گئی۔"

"واہ جی، خُود ہی وکیل اور خُود ہی جج۔"

"ہاہاہا۔ تُمہیں محاورے بھی ٹھیک سے نہیں آتے۔"

"تُمہیں جو آتے ہیں۔ باتیں کرنے میں بڑے شیر ہو۔"

"ویسے بھی شیر ہوں۔ تُمہیں خُود شرط جیت کر دکھاتا ہوں۔"

"کیسے؟"

"آنکھیں بند کرو۔"

"لو۔ ارے رے رے۔۔۔ ہٹو، سری مت۔۔۔۔ مت کرو۔۔۔۔ شرم کرو۔ دیکھو میں شور مچا دُوں گی۔ اچھا رُکو، ٹھہرو، میرے ہاتھ چھوڑ دو۔ یہ لو۔ دیکھ لیا؟"

"واہ، ایک بٹن سے کیا ہوتا ہے۔ گردن بھی پُوری نظر نہیں آ رہی۔"

"بس، اب شرط پُوری ہو گئی۔"

"کہاں پُوری ہُوئی؟ چاروں بٹن کھولو تو ہو گی۔"

"جی نہیں۔ آپ شرط اپنے پاس رکھیئے۔ سرفراز، اِن حرکتوں سے باز آؤ، ورنہ----"

"ورنہ کیا؟"

"چیخ مار کر لوگوں کو اِکٹھا کرلُوں گی۔ تمہاری کپتنی دھری رہ جائے گی۔"

"چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

"اچھا ہٹو۔ ہاتھ ہٹاؤ، باز آؤ ایک منٹ کے لئے---- باز آؤ ناء۔ یہ لو، دیکھو، صاف جلد ہے، کوئی بال نہیں۔"

"گردن کے گڑھے تک صاف ہے۔ آگے چلو۔"

"جی معاف کرو۔ آگے بھی صاف ہے۔"

"اچھا آنکھیں بند کرو۔"

"جی نہیں۔ میں اب تُمہاری چالوں میں آنے والی نہیں۔"

"یہ دیکھو میرا ہاتھ، دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"پتا ہے اِس کا مطلب کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"اِس طرح ہاتھ اُٹھا کر قسم کھاتے ہیں۔"

"پھر؟"

"قسم کھاتا ہوں ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔"

"تُمہاری قسم کا کیا اعتبار۔"

"میں فوج کا افسر ہوں۔ آفیسر اینڈ اے جنٹل مین۔ ہم لوگ قسم کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔"

"اچھا لو۔ بس؟"

"ارے واہ۔ ایک سیکنڈ سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیا اندھوں کی طرح آنکھیں میچ کر بیٹھ جاؤں؟"

"دس سیکنڈ تک۔"

"دس سیکنڈ؟"

"دس تک گنو پھر آنکھیں کھول دو۔"

"اچھا ایک دو تین چار پانچ چھ۔۔۔۔ ام۔۔۔۔ م م م۔۔۔۔ مم میری سانس۔ خُدا کے لئے، میری سانس بند ہو رہی ہے۔ ہٹو، کیا بیہودہ آدمی ہو۔ یہ قیمت ہے تمہاری قسم کی؟"

"ہاتھ تو نہیں چلایا۔"

"اور کیا کیا ہے؟"

"ہونٹ چلائے ہیں۔ قسم تو نہیں ٹوٹی۔ آ گئی ناہ چال میں؟ اِسے کہتے ہیں ٹیکنیکس۔"

"مکار۔"

"اب قسم ختم ہو گئی۔ اب میں ہاتھ چلاؤں گا۔ چپکی بیٹھی رہو۔"

"ہائے سری اب مجھ میں ہمت نہیں۔"

"ہلو مت۔"

"ہائے مَیں مری۔۔۔"

"یہ دیکھو بال، یہ ایک بال ہے، عین چھاتی کے اُوپر، کھینچ کر توڑ دُوں؟"

"اوہ۔۔۔ ہائے، ظالم درد کرتے ہو؟"

"بڑا پیارا بال ہے۔ کیسی نازک جگہ پہ اُگا ہے۔ یہ تو ہونٹ سے توڑنے کے لائق ہے۔"

"ہائے، ہائے، سری ی ی۔۔۔ میری جان گئی۔۔۔"

لبوں پہ تلخ مسکراہٹ لئے ہُوئے، بدن کو گاڑی کے ہلکوروں کے سپُرد کئے،

سرفراز آہستہ آہستہ نیند کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ خُوابوں کا نقطہ آغاز اُس کے تعین میں نہ تھا، گو نیند ٹُوٹنے پہ اُسے محسُوس ہوا کہ جیسے آنکھ لگتے ہی خُوابوں کی یلغار شُروع ہو گئی ہو۔ البتہ اُن کے اختتام سے فرار ناممکن تھا۔ ایک بدصُورت سا آدمی چھانٹا اُوپر اُٹھائے اُس کے سَر پہ کھڑا تھا اُور سرفراز گھوڑے کی مانند تانگے کے آگے جتا اُسے کھینچتا جا رہا تھا۔ یہ آخری خُواب تھا جس کے دھکّے سے چونک کر وہ جاگ اُٹھا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ پہلے ایک طوطا تھا جس نے ٹیں ٹیں کرتے ہُوئے یکایک اپنی صُورت بدل کر چھانٹا بردار کوچوان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس کالی ڈاڑھی والے کوچوان کی شکل خَوفناک تھی۔ اُس کی آنکھوں سے خُون ٹپک رہا تھا اُور وہ سرفراز کو تانگے کے آگے ہانک رہا تھا۔ سرفراز گھوڑے کی جگہ پہ جتا تیزی سے پاؤں چلاتا جا رہا تھا مگر اُس کے پیروں تلے زمین خُودکار حرکت سے پیچھے ہی پیچھے کو سرکتی جاتی تھی، جس کی وجہ سے راستہ ایک انچ بھی طے نہیں ہو پاتا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتا کہ تیز بھاگے مگر زمین کی پٹی بھی اُلٹے پاؤں تیز تر ہوتی جا رہی تھی، اُور اِس دہشت کے مارے کہ وہ اپنے مقام سے آگے بڑھ نہیں پا رہا اُس کا دِل نُچلا جا رہا تھا اُور سانس بند ہُوئی جاتی تھی، جیسے کہ کوچوان کی مٹھی میں چھانٹا نہیں بلکہ سرفراز کا دِل ہو جسے وہ اپنی مشت میں بھینچ بھینچ کر مسل رہا ہو۔

اسی بے دم حالت میں جب کہ اُس کی سانس سینے کے اندر ایک ہُوک کی مانند اُٹھ رہی تھی، سرفراز کی نیند ٹُوٹ گئی۔ آنکھیں بند کئے، نیم ہوش بدن کو سیٹ پر سنبھالے وہ خُواب کے ہَوکے میں اُسی طرح لیٹا رہا۔ لحظہ لحظہ پُورے ہوش میں سَر نکالتے ہُوئے اُس کے دِل کو یہ جان کر بے اِنتہا طمانیت کا احساس ہُوا کہ اُس نے جو دیکھا وہ اصلیت نہیں تھی، اُور حقیقت حال یُوں تھی کہ وہ، میجر سرفراز، ایئرکنڈیشنڈ کمرے کے اندر آرام سے نرم سیٹ پر لیٹا ریل کا سفر کر رہا تھا، جس کے آخر میں اُس کے استقبال کے لئے اُس کا اُردلی جیپ لئے سٹیشن پر موجُود ہوگا۔ اِس خیال کا سہارا کچھ اِس طرح سے اُس کے احساس میں داخل ہوا جیسے اُس کے جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی ہو۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دِن ختم ہو چکا تھا۔ گاڑی کسی سٹیشن پہ کھڑی تھی۔ سیاہ آسمان کے نیچے بجلی کی روشنیوں میں مسافروں اُور پھیری والوں کے سائے کھڑکی کے باہر مُتحرّک تھے۔ خُوابوں کے بچے کھچے نظارے ابھی تک سرفراز کے ذہن سے لپٹے تھے۔ اُس نے ایک نظر کھڑکی پہ

ڈال کر آنکھیں میچ لیں۔ خُواب ناقابلِ اعتبار تھے، اُس نے سوچا۔ خُواہ میں گھوڑا بن جاؤں، گھوڑا ہاتھی بن جائے، ہاتھی آدمی کی آواز میں مخاطب ہو، آدمی سے بچّے کی آواز نکلے اَور پھر بچہ عورت کا رُوپ دھار لے، برسوں کے مرے ہُوئے زندہ ہو کر بُولنے لگیں، کِسی بات پہ، کِسی واقعہ پر فہم بدگمان نہ ہوتا تھا۔ ہر حال اَور ہر بھیس کو بے چُوں وچرا اس تسلیم کرلیتا تھا۔ بچّے اَور جوان میں تیس سال کا عرصہ ہو یا بیس برس کا، خُواب اِس تنازعے سے بالاتر تھے۔ بچہ اَور جوان، مرد اَور عورت، زندہ اَور مردہ، سب ایک دُوسرے میں مدغم، ایک ہی وَقت میں، ایک ہی جگہ پر موجُود ہوتے تھے، اپنا اپنا کاروکسب، اَپنے اَپنے زمانے لئے، ایک دُوسرے کے زمانوں کے اَندر باہر دندناتے پھرتے تھے۔ خُوابوں کا اپنا ایک الگ فہم تھا۔ صرف ہوش مندی بھروسے کے لائق تھی اَور آدمی کے ذہن کی یادداشت اِس کے لنگر کا کام دیتی تھی۔ جِس مقام پہ یاد کا لنگر ڈال دیا جاتا اُسی نقطے پہ حال کا زمانہ تھم جاتا اَور گزُرے ہُوئے وَقت کا لمحہ لمحہ اپنی اصل خصلت لئے، گرفت میں آجاتا تھا جِس کے نقش ونگار مہینوں اَور برسوں کی دُھند میں مدھم نہ پڑتے تھے۔ کوئی اچنبھا، کوئی اِسرار ان کے ناک نقشے پہ شبے کا سایہ نہ ڈال سکتا تھا۔ نسرین کی آواز تک، اَپنے ہونٹوں کی خم دار ترنگ لئے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی کرن، کھلکھلاتے دانتوں کی کنک، لرزتی ہُوئی سُرخ زُبان کی نم دار حرارت، لمبی سفید اُنگلیوں کی لہر، جلد کی موم کے اَندر بال سے زیادہ مہین شریانوں کا جال جو چھاتی کے تناؤ کے ساتھ زیرو بم ہوتا تھا، یہ ایک ایک جزو سمٹ کر ایک دمکتے ہُوئے منجمد لمحے کی صُورت نظر کے سامنے آرُکتا تھا۔ یاد کا لنگر بھی کیا عجب شے تھی، کہ زمانوں کی آمد و رفت کو گویا مٹھی کی جکڑ میں باندھ کے رکھ دیتا تھا۔

اسی نیم خُواب حالت میں لیٹے لیٹے اَچانک سرفراز کو احساس ہُوا کہ اُس کے آس پاس مکمل سناٹا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ پلیٹ فارم پر پیر صاحب اَور اُن کے بیٹے اَپنے مُریدوں کے ہجُوم میں گھرے کھڑے تھے۔ مُرید ایک دُوسرے کے عقب سے نِکل نِکل کر پیر صاحب کے گھٹنوں اَور پاؤں کو چھُو رہے تھے۔ سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی بتی بجھا دی۔ کوچوان کے چھانٹے کے کڑاکے، اُس نے سوچا، اَور تانگے کے پہیّوں کا شور شاید پیر صاحب کے آنے جانے کی کھڑکھڑاہٹ ہی تھی۔

گارڈ نے سیٹی دے دی۔ ریل جو ساکن لیٹی آہستہ آہستہ سانس لیتی ہُوئی معلوم ہو رہی تھی دھواں کی پھنکار چھوڑ کر حرکت میں آ گئی اور پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ رینگنے لگی۔ چند منٹ میں وہ سٹیشن سے نِکل گئی۔ سرفراز کھسک کر کھڑکی کے پاس ہو بیٹھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کھانا صاحب" آواز آئی۔ سرفراز نے اُونچی آواز سے جواب دیا، "نہیں۔"

اب باہر رات کی سرزمین تھی جہاں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

کبھی کبھی کسی گاؤں کے گھر میں جلتی ہُوئی آگ یا لالٹین کی مدھم سی روشنی اندھیرے میں ایک لکیر کھینچتی ہُوئی کھڑکی کو آر پار کاٹتی اور سیکنڈ کے اندر عقب کی جانب غائب ہو جاتی۔ گھُپ اندھیرے میں دیکھتے ہُوئے ایک دُوسری تاریک کھڑکی سرفراز کی آنکھوں کے آگے اُبھرتی ہُوئی نزدیک آنے لگی۔

یہ کھڑکی گاؤں کے ایک مکان کی تھی جس کی چوگاٹھ پہ ہاتھ رکھے ایک آٹھ سالہ بچہ مبہوت کھڑا باہر کالی رات کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی پُشت پر اُس کا اٹھاون سالہ باپ چارپائی پہ پڑا اپنی زندگی کے آخری لمحوں کے بیچ اٹکا ہُوا تھا۔

"بابا جی،" اعجاز اپنے باپ کا ہاتھ تھامے چارپائی کے کنارے بیٹھا تھا "آپ کی عُمر بڑی لمبی ہے، ایسی باتیں نہ کریں۔"

"مُجھے دلاسا نہ دے،" بُوڑھے نے بمشکل الفاظ ادا کئے۔ "میری بات دھیان سے سُن۔"

"بابا جی، اللہ آپ کا سایہ ہمارے سَر پر ہمیشہ----"

"تیری ماں تو سرفراز کے پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اب وہ تیرے پاس تیری ماں کی امانت ہے۔ زمین گِروی رکھ کر تجھے پڑھایا، تیرا بیاہ کیا۔ پہلے زمین کو چھُڑانا۔"

"بابا جی، چار سال سے نوکری کر رہا ہُوں پیسے جمع کر لئے ہیں، بس تھوڑی کسر رہ گئی ہے۔ سمجھ لو کہ زمین چھُٹ گئی۔"

"پھر سرفراز کو پڑھانا۔"

"بابا جی وہ پڑھ رہا ہے۔"

"بچہ لائق ہے۔ قرضہ لے لینا۔ سرفراز پڑھ لکھ کر اُتار دے گا۔ دُنیا کے کام اِسی طرح چلتے ہیں۔ دادا کا قرضہ باپ کے سر، باپ کا قرضہ بیٹے کے سر، ہماری عمریں اِسی طرح گزری ہیں۔ مگر اب تلیم کا زمانہ ہے۔ میرے جیسے اَن پڑھ کو بھی اِس بات کی خبر ہے۔ تیرے بیاہ کا کوئی پھل آ جاتا تو میرا سانس آسانی سے نکل جاتا۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے کس کا زور ہے۔ شکر کر کہ بھائی احمد سے کرابت داری تھی، اُس نے اپنی سکینہ تجھے دے دی۔ وٹے سٹے کا بندوبست بھی میرے گھر میں نہیں تھا، اللہ کی مرضی سے تیری بہن ہی کوئی نہیں۔"

"بابا جی،" اعجاز نے کہا۔ "سرزاد میرا ایک ہی بھائی ہے۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔"

بُوڑھے نے آنکھ کے اِشارے سے بیٹے کو نزدیک آنے کو کہا۔ "یہ بتا، سکینہ اُسے پیار کرتی ہے؟"

"آپ کو پتا ہی ہے۔"

"نہیں، سچی بات بتا۔ دِل سے پیار کرتی ہے؟"

"بالکل دِل سے کرتی ہے۔ اَپنے بچوں کی طرح جانتی ہے۔ اب آپ سو جائیں، بولنے سے کمزوری ہو جاتی ہے۔"

بُوڑھے نے حلق سے خشک سی ہنسی کی آواز پیدا کی، گو چہرے کی جھریوں میں ذرہ برابر حرکت نہ ہُوئی۔ "سرفراز کہاں ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"یہ سامنے کھڑا ہے۔"

"رات ہوگئی ہے۔" بُوڑھے نے کہا اَور ہولے سے آنکھیں بند کرلیں۔

سرفراز کھڑکی سے اب اُس کچے کمرے کو دیکھ رہا تھا جو صحن میں بنا ہوا تھا۔ جب اُس کے باپ یعقوب اعوان کی بارہ ایکڑ زمین اُس کے قبضے میں ہوا کرتی تھی اُس زمانے میں اِس کمرے کے اَندر گیہوں اَور مکی کی جنس، توڑی، اَور ایک گائے رکھی جاتی تھی۔ سرفراز کے ذہن میں سب سے پُرانی یاد اُس وَقت کی تھی جب وہ اَپنے باپ کے حساب

نے صرف ڈھائی پونے تین برس کا رہا ہو گا۔ صبح مُنہ اندھیرے اُس کی آنکھ کھلی تھی تو باپ اَور بھائی کی چارپائیاں خالی دکھائی دی تھیں۔ وہ اُٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ اِس کمرے سے لالٹین کی روشنی اَور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں گائے عجیب طرح سے ڈکرا رہی تھی۔ جب بچّے نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو انوکھا منظر دیکھا۔ ایک آدمی نے، جو اُن کے ساتھ والے گھر میں رہتا تھا، گائے کی پُونچھ اُوپر اُٹھا رکھی تھی۔ پُونچھ کے عین نیچے گائے کے جسم سے ایک کھلونے کا سا سَر اَور دو ننھی ننھی ٹانگیں باہر نکلی تھیں جن میں ہلکا سا اِرتعاش تھا، جیسے سردی سے کانپ رہی ہوں۔ سرفراز کے باپ اور بھائی نے اُس چھوٹے سے بدَن کو چاروں ہاتھوں سے اُٹھا رکھا تھا اَور ہولے ہولے اُسے کھینچ رہے تھے۔ سرفراز گائے کے مُنہ سے کچھ فاصلے پر جا کر رُک گیا۔ گائے ہوکے بھر بھر کر ڈکرا رہی تھی۔ ہر ہوکے کے ساتھ اُس کا سارا جثہ لرز جاتا تھا۔ سرفراز کی نظریں گائے کے چہرے پر تھیں۔ چہرہ اُسی طرح تھا جیسے ہر روز ہوا کرتا تھا، صرف اُس کی آنکھوں کی صُورت مختلف تھی۔ اُن آنکھوں کی دو شکلیں تھیں۔ ایک شکل بے زُبان دہشت کی تھی، دُوسری نرمی اَور بلاوے کی تھی۔ پہلی سے سرفراز کے دِل میں کھٹکا پیدا ہوتا تھا اَور قدم پیچھے کو اُٹھتے تھے۔ دُوسری سے اُس کا جی چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر گائے کے مُنہ پر ہاتھ پھیرے۔ کمرے میں انسانی اَور حیوانی سانسوں اَور خمیرے آٹے کی سی ملی جلی، گرم مرطوب بُو بھری تھی جو سینے پہ بھاری بیٹھ رہی تھی۔ سرفراز اَپنی جگہ پہ کھڑا دیر تک گائے کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اُس نے نظر ہٹائی تو اُس کا باپ اُس کھلونے کو جو گائے کا بچھڑا تھا گائے کے مُنہ کے نیچے بیچے ہاتھوں کھڑا کر رہا تھا اَور گائے کی پُونچھ کے ساتھ لمبا سا سُرخ گوشت کا لوتھڑا لٹک رہا تھا۔ بھُوسلے رنگ کے بچھڑے کی ٹانگیں اُس کے بوجھ سے بیٹھ بیٹھ جاتی تھیں اَور اُس کے بال یُوں چپکے ہُوئے تھے جیسے نہا کر آیا ہو۔ گائے نے دو ایک بار سَر کو اِدھر اُدھر جھٹکے دیئے، جیسے رسی تڑوانے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اُس نے ہولے سے سَر نیہوڑا کر بچّے کو زُبان سے چاٹنا شرُوع کر دیا۔ سرفراز کو اعجاز گود میں اُٹھا کر کمرے سے نِکل آیا۔ اُس وَقت اِس کمرے کے دروازے اَور کھڑکی کے پٹ ہوا کرتے تھے جنہیں کُنڈی لگتی تھی۔ اگلے برسوں میں زمین گروی چلی گئی اَور اعجاز کی ایف۔اے تک تعلیم مکمل ہُوئی۔ پھر اُس کا بیاہ ہوا۔ کچھ عرصے تک وہ کمرہ بند رہا، پھر بے دھیانی کی

نذر ہوگیا۔ آندھی طوفان میں کُنڈیاں ٹُوٹ گئیں۔ کواڑ کھٹاکھٹ بجتے رہے، پھر اُکھڑ کر گر پڑے۔ آخر میں گائے بھی بِک گئی۔ کمرہ اُجڑ گیا۔ آج بھی، جب آٹھ سالہ سرفراز اپنے تیئں بچپنے سے نِکل کر "بڑا" ہو چُکا تھا اور چھ برسوں میں اِس کمرے کی کئی شکلیں گزر چکی تھیں، اِس کا ایک ہی نقشہ اُس کے ذہن میں موجُود تھا---- باسی سانس اور گائے کی آلائش کی بھاری بُو کے اندر جڑا ہُوا گائے کا دو لخت چہرہ، جس کی آنکھوں سے موت کی دہشت اور پیار کی نرمی بیک وَقت جھانک رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اُس نے اپنے باپ کے چہرے پر وہی کیفیت دیکھی تھی۔ کھِڑکی میں کھڑے کھڑے، تاریک آسمان پر ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کو دیکھتے ہُوئے سرفراز کے اندر اپنی پُرانی گائے کے چہرے کی اَنمٹ وِیرانی کا عکس تھا جس کی چھاپ ڈھائی سال کی عمر میں اُس کے دِل پہ پڑ چکی تھی۔

گھر کے دروازے پہ ایک بَیل گاڑی آکر رُکی جس کے نیچے لالٹین لٹک رہی تھی۔ یہ اُس کی ماسی کا کنبہ تھا۔ اعجاز کی بیوی سکینہ کے علاوہ اُن کا ایک بیٹا جو سرفراز سے ایک سال بڑا، اور سرفراز سے دو برس چھوٹی بیٹی جمیلہ تھی۔ بچوں کے باپ چاچے احمد نے لالٹین اُتار کر ہاتھ میں لی اور بیٹے عباس کو بَیل گاڑی پر چھوڑ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ گھر کے اندر چلا آیا۔ جب سرفراز کی ماسی اُس کا سَر مُنہ چُوم چکی تو وہ چپکا جا کر جمیلہ کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ جمیلہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں بولا، "چل باہر چلیں۔"

دونوں بچوں نے گھر والوں کو دیکھا جو بُوڑھے جان کَن کی چارپائی کے گرد جمع تھے۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے، ایڑیوں کی مدد سے دونوں نے اِنچ اِنچ دروازے کی جانب کھسکنا شرُوع کیا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچ گئے اور پھر بھی کسی نے اُن کی طرف دھیان نہ دیا تو وہ دہلیز ناپ کر باہر صحن میں نِکل آئے۔

"چل اُس کمرے میں چلیں۔" سرفراز نے کہا۔

"نہ جی، وہاں تو جن ہوتے ہیں۔"

"کون کہتا ہے۔"

"باے نے بتایا تھا۔"

"جیلو، تُو ڈرپوک ہے۔ چل، میں آگے آگے چلتا ہوں۔"

جمیلہ سرفراز کا ہاتھ تھامے، پھُونک پھُونک کر قدم رکھتی ہُوئی اُس کے پیچھے کمرے

میں داخل ہوئی۔ رات کالی تھی مگر تاروں کی لَو میں بے پٹ کی کھڑکی کا چوکھٹا مدھم سا دکھائی دے رہا تھا۔ جمیلہ مضبوطی سے سرفراز کا بازو پکڑے اُس کے ساتھ لگ کر کھڑی کھڑکی سے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

"سرفراز،" جمیلہ نے کہا، "تو یہاں آیا کرتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا کرنے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تجھے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں۔"

"مجھے جنوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"تو قرآن مجید پڑھتی ہے؟"

"ہاں۔ بیسویں سپارے پر ہوں۔"

"میں نے ختم کر لیا ہے۔ مولوی جی کہتے ہیں جو قرآن مجید ختم کر لے اُسے جنوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

"میرے دس سپارے رہ گئے ہیں،" جمیلہ نے کہا۔

"وہ دیکھ،" سرفراز نے آسمان کی جانب اُنگلی اٹھا کر کہا۔

"کیا؟"

"ستارہ۔ کبھی غائب ہو جاتا ہے کبھی دکھائی دینے لگتا ہے۔"

"آگے بادل آگیا ہے۔"

"نہیں، آنکھیں جھپک رہا ہے" سرفراز نے کہا۔ "مجھے پتا ہے۔"

"کیسے؟"

"ایک دن مجھے سب کچھ پتا چل جائے گا" سرفراز نے سینہ پھُلا کر کہا۔ "میں کتاب میں پڑھوں گا۔"

"چلو چلیں" جمیلہ نے کمرے میں ہوا کی سرسراہٹ سُن کر مزید قریب سرکتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

"گڈے پر۔"

"میں نہیں جاتا۔"

"کیوں؟"

"باسا مجھے مارتا ہے۔"

"ابا اُسے اندھیرے میں بٹھا کر چلا جاتا ہے، اِس لئے غصہ کرتا ہے۔"

"بن مانس ہے،" سرفراز نے کہا، "مارتا ہے۔"

"تُو میرے ابّے کو بتانا۔"

"تجھے ڈر لگ رہا ہے؟"

"ہاں" جمیلہ بولی۔ "چل چلیں۔"

گھر کے دروازے پر عباس اندھیرے میں بیل گاڑی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ سرفراز اور جمیلہ پچھلے تختے پر ہاتھ جما کر اُچکے اور سوار ہو کر، ساتھ ساتھ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"اوئے سرفرازے، تیرا ابا مر گیا کہ نہیں؟" عباس نے پُوچھا۔

"ابھی نہیں۔" جمیلہ چستی سے بولی، "سانس لے رہا ہے۔"

بیل نے سر جھٹکا تو اُس کے گلے میں لٹکی گھنٹی کی آواز آئی۔

"سرفرازے ٹانگ نہ ہِلا، ڈنگر بے قرار ہوتا ہے۔"

"میں تو نہیں ہلا رہا" سرفراز نے جواب دیا۔

"اور تیرے فرشتے ہِلا رہے ہیں؟ چل اُتر نیچے۔"

سرفراز چھلانگ لگا کر بیل گاڑی سے اُتر گیا۔

"گڈے کے نیچے جا کر بیٹھ" عباس نے حکم دیا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" سرفراز نے کہا۔

"تیرا ڈر نکالوں آ کر؟ چل نیچے بیٹھ۔"

سرفراز چاروں ہاتھ پاؤں پہ چلتا ہوا بیل گاڑی کے نیچے گھس گیا۔

"چل جیلو، تو بھی اُتر" عباس بولا "باسے" جمیلہ نے فریاد کی، "نیچے سانپ ہیں۔"

"چل چل، ابھی تیرے سانپ نکالتا ہوں۔"

جمیلہ بھی رینگتی ہوئی جا کر سرفراز کے پاس بیٹھ گئی۔ عباس کے ڈر کے مارے سرفراز اور جمیلہ بَیل گاڑی کے نیچے، اُس کے پہیئے سے پُشت لگائے ساتھ ساتھ دبکے بیٹھے تھے۔ تاریکی اتنی تھی کہ ایک دُوسرے کی شکل دکھائی نہ دیتی تھی، صرف سانس کے اُتار چڑھاؤ سے جمیلہ کا بدن بار بار سرفراز کے جسم کے ساتھ ہولے سے دبتا تو اُس کے اندر ایک خُوش گوار حرارت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ بَیل گاڑی گلی کی چوڑائی جتنی چوڑی تھی اور پھنس کر گلی میں داخل ہوئی تھی۔ آتے جاتے اِکّا دُکّا لوگ گلی کی دیواروں کے ساتھ گھسٹتے ہوئے نِکل رہے تھے۔ گلی کے بیچ میں بہتی ہوئی نالی میں بَیل کا ایک کھُر ڈوبا تھا جسے وہ بار بار پانی سے باہر نکال کر خشک زمین پہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نالی کے گندے پانی کی بُو سرفراز اور جمیلہ کی ناک میں چڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک اِسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد جمیلہ نے سرفراز کے کان میں کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے۔" سرفراز نے کہا۔

"چپ کر کے بیٹھو" اُوپر سے عباس بولا، "نیچے اُتر کر دونوں کے دانت توڑ دوں گا۔"

گاڑی کے نیچے دونوں پھر دبک گئے۔ اسی خاموشی میں جب کافی دیر گزر گئی تو سرفراز نے جمیلہ کو کہنی مار کر سرگوشی کی، "چل اندر چلیں۔"

دونوں بے آواز طور پہ رینگتے ہوئے دُوسرے پہیئے تک پہنچے، پھر وہاں سے نِکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اندھیرے میں دروازے کی دہلیز سے دونوں کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ صحن میں گر پڑے۔ مگر ڈر کے مارے اُن کی ٹانگیں چلتی رہیں۔ وہ کُود کر اُٹھے اور دوڑتے ہوئے صحن پار کر کے اندر چلے گئے۔

قریب سحری کا وقت ہو گا جب شور سے سرفراز کی آنکھ کھلی۔ وہ چارپائی پہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جمیلہ دُوسری چارپائی پر سو رہی تھی۔ سرفراز چارپائی سے اُتر کر دروازے تک گیا۔ دُوسرے کمرے میں لالٹین کی روشنی کے آگے اُس کی ماسی زمین پر بیٹھی دونوں بانہیں ہوا میں اُٹھائے عجیب سی آواز میں بین کر رہی تھی۔ چارپائی پر، جہاں اُس کا باپ پچھلے دو ماہ سے دراز رہا تھا صرف ایک سفید کھیس بچھا نظر آ رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے

چارپائی خالی ہوگئی ہے، گو سرفراز کو احساس تھا کہ اُس کے باپ کا جسم جو ایک پُرانے کپڑے کی مانند سکڑ کر رہ گیا تھا، کھیس کے نیچے ڈھکا پڑا تھا۔ سرفراز چلتا ہوا جا کر کمرے میں ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ اُس کی نظریں ماسی پر لگی تھیں جِس کے ہاتھ اُوپر اُٹھے تھے اور جو چہرہ چھت کی جانب کئے، مُنہ کھولے آہ و بکا کر رہی تھی۔ سرفراز یُوں کھڑا تھا جیسے ماسی کے اَنداز سے مسحور ہو چکا ہو۔ اُسے ذرہ برابر احساس نہ تھا کہ ماسی رو رہی ہے۔ ماسی کے چہرے پہ پسینے کے باریک قطرے چمک رہے تھے، مگر اُس کی آنکھیں خُشک تھیں۔ سرفراز وہاں کھڑا اِنہماک سے اُس کی آواز کے زیروبم میں کھویا ہُوا تھا۔ چاچا احمد، جو اب تک مُنہ دُوسری جانب کئے حُقّہ گُڑگُڑا رہا تھا، جیسے اُس کا اِس ساری کارروائی سے کوئی تعلق نہ ہو، اَور جِسے دیکھ کر ہمیشہ سرفراز کو ایک بڑے بھاری درخت کا احساس ہوتا تھا، اب کبھی ایک پاؤں پہ اَور کبھی دُوسرے پہ اَپنے جسم کا بوجھ سہارتا ہوا دائیں سے بائیں ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ اِتنے میں ماسی کی نظر بچّے پہ پڑی جو ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بازُو گرا کر اَپنے آپ کو سکینہ سے جُدا کیا جو اُس کے بدَن سے لپٹی ہُوئی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ سیدھی پاؤں پہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اَور جھپٹ کر سرفراز کو بانہوں میں سمیٹنے کے بعد اُسے سینے سے لگا کر دُوسرے کمرے کو لے چلی۔ اعجاز اَپنے باپ کی چارپائی پہ سَر رکھے بے حرکت بیٹھا تھا۔

دُوسرے کمرے میں ماسی سرفراز کو اُس کی چارپائی پہ لٹا کر خُود اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔ پھر وہ سرفراز کو اَپنے بازُوؤں کے حلقے میں سینے سے لگا کر آہستہ آہستہ سسکنے لگی، جیسے درد سے کراہ رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد سرفراز کو اَپنے گال پہ نمی کے قطرے محسُوس ہُوئے۔ اُس نے سَر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے دوبارہ دیکھا۔ ماسی چُپکے چُپکے رو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے، جو بین کرتے ہُوئے خُشک تھیں، اب سچ مُچ کے آنسو رواں تھے۔ سرفراز نے اَپنی ماں کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اُس کی ماسی نے ہی اُسے پالا تھا۔ جب وہ تین سال کا ہوگیا تو اُس کا باپ اُسے اَپنے پاس لے آیا تھا۔ اعجاز سے بیاہ ہو کر سکینہ کی آمد کے بعد وہ دو دو، تین تین ہفتے آ کر اَپنی بیٹی کے پاس ٹھہرنے لگی تھی۔ سرفراز کو وہ وَقت یاد آیا جب ایک بار چاچے احمد نے جھگڑا کر کے ماسی کو گھر سے نکال دیا تھا اَور ماسی اُن کے گھر آ کر تین مہینے رہی تھی۔ سرفراز اُس وَقت چھ سال کا ہوگا۔ گرمیوں

کے دِن تھے۔ ایک روز دوپہر کو سرفراز اپنے باپ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چارپائی پر ماسی کو اپنے باپ کے برابر لیٹے ہُوئے پایا۔ سرفراز کو دیکھتے ہی ماسی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ عجلت میں وہ اپنا گریباں بند کرنا بھی بھول گئی اور جلدی سے سرفراز کے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی۔

"ہائے، بھائی یعقوب کے بدن میں درد اُٹھ رہا ہے" وہ آنکھیں چرا کر بولی، "شاید بخار آنے والا ہے۔"

"تُو یہاں کیا کر رہا ہے سرفرازے" اُس کا باپ غصّے سے بولا، "میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ تیری ماسی سے کہا ہے ذرا دبا دے۔ اور کِس سے کہوں؟ تیری ماں تو تجھے میرے پیچھے ڈال کر چھوڑ کر چلی گئی۔ جا۔" دروازہ بند کر دے، روشنی سے میری آنکھوں میں ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ جا۔"

اب گھر والوں سے الگ ہو کر، اندھیرے کمرے میں ماسی آنسو بہا رہی تھی۔ سرفراز کو احساس تھا کہ اُس کا باپ مر چکا ہے، مگر اُس کے دِل میں رنج کی کوئی شکل پیدا نہ ہو رہی تھی۔ اُس کے دِل کی ایک کیفیت تھی جس سے وہ شروع عمر سے واقف تھا مگر جس کی خصلت اُس کے تئیں بے نام ہی رہی تھی۔ ایک زمانہ گزر گیا تو پھر جا کر اُسے علم ہُوا تھا کہ یہ کیفیت ایک ایسی خواہش کے مطابق تھی کہ جیسے دُور دراز کے خیالوں کے اندر، آس پاس کی چیزوں کے نشان لگانے کی اُمنگ ہو، اور بس۔ اُس وقت ماسی کے ساتھ لیٹے لیٹے اُس کا جی گھبرانے لگا تھا۔ سب سے اوّل اُس کی خواہش تھی کہ وہ ماسی کے بازوؤں کے حلقے سے نِکل کر اُس کے آنسوؤں سے دُور چلا جائے۔ جب وہ ماسی کے جسم سے الگ ہونے میں ناکام رہا تو سسکنے لگا تھا۔ اِسی حالت میں کچھ دیر کے لئے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک اُس نے اپنے کندھے پر ایک مانوس ہاتھ کو محسوس کیا۔ وہ اُچھل کر اُٹھا اور اعجاز کے ہاتھوں سے چمٹ کر اُس کے کندھے سے لگ گیا۔ کافی مُدّت پہلے اُس نے اعجاز کی گود میں چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اِس طرح اُس کے سینے سے چمٹا تھا جیسے آٹھ برس کا پٹھا نہیں بلکہ گھٹنوں چلتا بچہ ہو۔ اُسے اِس سارے ماحول سے، اپنے تاریک کمرے سے، دُوسرے کمرے سے جہاں لالٹین لٹک رہی تھی اور سفید کھیس والی چارپائی بچھی تھی، ماسی کی گرم گرم چھاتیوں اور اُس کے آنسوؤں سے، ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اعجاز کے

کندھے پر سَر رکھ کر اُسے اعتبار آگیا کہ اب کِسی بات کا خَوف دُور دُور تک بھی پھٹکنے والا نہیں۔

باب 2

یعقوب اعوان نے سُن رکھا تھا کہ وقتِ مرگ اِنسان کی آنکھوں کے سامنے سے اُس کی ساری زِندگی لمحے بھر کے وقفے کے اندر گزر جاتی ہے۔ مگر مَوت کو بالمقابل پا کر اُسے صرف دو چار ہی مناظر دکھائی دیئے۔۔۔ جِن کے بیچ سالوں کی مُدّت پڑتی تھی۔

سب سے پہلے اُسے اپنے آبائی گاؤں کا ایک رُخ نظر آیا۔ یہ گاؤں کا ماتھا تھا جس کے ساتھ اُس کی گہری اور طویل آشنائی تھی، کہ اِس طرف اُس کے کھیت پڑتے تھے۔ صُبح اور شام، اپنی پچاس سالہ زِندگی کے ایک ایک دِن۔۔۔۔ صرف جنگ کے تین سال چھوڑ کر۔۔۔۔ یعقوب اعوان نے کھیتوں سے گھر کو لوٹتے ہُوئے گاؤں کا یہ رُخ دیکھا تھا۔ یہ رستہ اُس کے اپنے گھر کی مانِند تھا جہاں اُسے نظر کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ گھُپ اندھیرے میں وہ اندر اور باہر چل پھر سکتا تھا۔ بسترِ مرگ پر سب سے اوّل اُسے یہ منظر دکھائی دیا جس کی کچی دیواروں کا نقشہ ایک جھلی کی مانِند اُس کے دماغ پہ پھیلا تھا۔ یعقوب اعوان پچاس برس کی عُمر کو پہنچا تھا کہ وہ گاؤں جِس میں وہ پیدا ہُوا تھا اُس سے چھُٹ گیا تھا۔ پچھلے آٹھ برس کے عرصے میں اُس نے اپنے گاؤں کی یہ شکل صرف ایک بار دیکھی تھی، اور وہ بھی محض ایک رات کے اندھیرے میں۔ چوروں کی مانِند، تاریکی کے اندر وہ اُس گاؤں میں داخل ہُوا تھا جو اب ایک مختلف سرزمین پہ کھڑا تھا، اور راتوں رات نِکل آیا تھا۔ اس گمشدہ منظر کے ساتھ یعقوب اعوان کے سامنے پھر اپنے باپ کا چہرہ اُبھرنا شرُوع ہُوا۔

ایوب اعوان کے تانبے کی رنگت والے چہرے پر بڑی بڑی پھیلی ہُوئی مونچھیں تھیں اور چوکور ماتھے کے اُوپر بیچ سَر سے چیر نِکلے بالوں کے لمبے لمبے پٹے تھے جنہیں وہ دِن بھر لکڑی کے باریک کنگھے کی مدد سے سَر پہ جماتا رہتا تھا۔ گو بڑھاپے میں پہنچ کر اُس کے بال سفید ہوگئے تھے اور رنگت سانولی پڑ گئی تھی، مگر مرنے والے کو اپنے باپ کی جوانی کی صُورت ہی نظر آئی جو اُس نے بچپن میں دیکھی تھی۔ لمبے اور گٹھے ہُوئے بدَن والا وہ آدمی ایک تناور پیڑ کی مانِند تھا جِس کے بارے میں مشہور تھا کہ جوانی کے دنوں میں سِکھوں کے ایک جتھے میں شامل تھا جو علاقے میں مویشیوں پہ ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ایوب اعوان کی

جوانی کا یہ عالم تھا کہ جوان بچھڑی کو کاندھوں پہ اُٹھا کر کھلیان کی دیوار سے باہر پھینک دیتا تھا اور دُودھ دیتی بھینس کے سینگوں کو ہاتھوں میں دبوچ کر ایک ہی مروڑے سے زمین پہ چت کر دیتا تھا۔ مگر گھر بسانے کے ساتھ ہی قدرت کی طرف سے اُس کی زندگی میں سدھار آگیا تھا اور وہ اپنی آدھا مربع آبائی زمین کی کاشت پر قناعت سے گزر بسر کرنے لگا تھا۔ امرتسر کے نواح میں سکھوں کے اس چھوٹے سے گاؤں، کبیر سنگھ والا میں اعوانوں کا ایک ہی مسلمان گھرانہ تھا۔ کچھ اِس بنا پر اور باقی کچھ اِس وجہ سے کہ اپنی قوم کو نام کا اٹوٹ انگ بنانا اعوانوں کی ریت تھی، دونوں باپ بیٹا ایوب اعوان اور یعقوب اعوان کے پورے پُورے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے یعقوب اعوان کے آہستہ آہستہ سرد ہوتے ہوئے خون میں ایک ہلکی سی لہر پیدا ہوئی۔ اب اُس کو اُس رات کی تصویر نظر آ رہی تھی جس کی صبح کو وہ پہلی بار اپنا گاؤں چھوڑ کر گیا تھا۔

سحری کا وقت تھا اور یعقوب اعوان اپنے بیلی جگت سنگھ کے ساتھ گاؤں کے ایک مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا تھا۔ تیرھویں کے چاند کی رات تھی، گاؤں کی دیواریں اور گلیاں ایک بے اصل سے دُودھیا رنگ میں رنگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ باقی سارے گاؤں پر ہُو کا عالم تھا، سوائے اِس کونے کے، جہاں مکان کے کوٹھے پہ لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا جھرمٹ چاندنی میں بیٹھا تھا۔ اُس گروہ کے بیچ سے اُونچی سرگوشیوں اور کھی کھی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیچے گلی میں جگت سنگھ مدہوش کھڑا، ہاتھ میں کلونت کور کی ایک جُوتی لئے، مُنہ اُٹھائے اُس کی منتیں کر رہا تھا۔ پاس یعقوب اعوان کھڑا ہنس رہا تھا۔

شروع رات سے وہ دونوں جگت سنگھ کے بڑے بھائی بھگت سنگھ کے بیاہ کے میلے میں گاؤں کی گلیوں میں موج اُڑاتے پھرے تھے۔ اِس وقت جب میلہ ختم ہو چکا تھا اور سب لوگ تھک ہار کر سو چکے تھے، جگت سنگھ کو کوٹھے پر کلونت کور کی خبر ملی تھی، اور وہ ایسا جم کر وہاں کھڑا ہو گیا تھا کہ ہلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ دونوں لڑکے مسلسل ایک دِن اور ایک رات کے جاگے ہوئے تھے۔ چوبیس گھنٹے پہلے وہ بارات کے لئے اُٹھے تھے۔ پھر دن چڑھے وہ گھڑ سواروں، تانگوں، بیل گاڑیوں اور پیدلوں کی بارات لے کر گاؤں سے روانہ ہوئے تھے۔

بھگت سنگھ سر پہ کیسری پگڑی باندھے، گلے میں بوسکی کا کُرتہ اور کمر میں سُرخ لاچہ

پہنے، بغل میں کرپان لٹکائے دولہا بنا، سفید گھوڑی پہ سوار بارات کے بیچ مُنہ زور گھوڑی کی باگ کھینچے اُسے قدم قدم چلاتا جا رہا تھا۔ اُس کی پُشت پر اُس کا بارہ سالہ تایا زاد بھائی اُدھم سنگھ ایک ہاتھ میں اپنے جثے جتنی لمبی ننگی تلوار تانے اور دُوسرا ہاتھ بھگت سنگھ کی کمر میں ڈالے اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ آگے آگے دو میراثی ڈھولوں پر مُستقل میلے کی تھاپ دیئے جا رہے تھے جن کی دھمک سے گھوڑی بار بار بدکتی تھی اور اُدھم سنگھ کو تلوار سنبھالنی مشکل ہو رہی تھی۔ ایوب اعوان بھگت سنگھ کے باپ اور اُس کے بھائیوں کے ہمراہ جو اپنی اپنی گھوڑیوں پہ سوار تھے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک تانگے اور ایک بیل گاڑی میں عورتیں رنگین کپڑے، چاندی کے زیور اور تِلّے والے لمبے لمبے چمک دار پراندے پہنے ایک دُوسری سے ٹھس کر بیٹھی تھیں۔ ادھیڑ عُمر عورتیں لڑکیوں پہ نظر رکھے ہُوئے تھیں اور ہر چند منٹ کے بعد اُنھیں سینہ ننگا رکھنے اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے پر سرزنش کر رہی تھیں۔ اِس کے باوجُود لڑکیاں بالیاں جگت سنگھ اور یعقوب اعوان کو دیکھ کر، جو دونوں ایک ہی خچر پہ سوار ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے، اٹھکیلیاں کرنے سے باز نہ آتی تھیں۔ گاؤں کی سب سے سَر نکالتی ہُوئی مُیار کلونت کور وعدے کے باوجُود بارات کے ساتھ نہ آئی تھی۔ جگت سنگھ کلونت کور پہ عاشق تھا اور اُس کی متلاشی آنکھیں بھٹکی پھرتی تھیں۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اُس نے دارو کے چند گھونٹ چڑھائے تھے اور اُن کی مستی میں وہ کبھی کبھی خچر کو ایڑ لگاتا اور بیل گاڑی میں بیٹھی ہُوئی کسی لڑکی کا پراندہ اُچک کر اُسے تنک مارتا۔ لڑکی ہلکی سی چیخ مارتی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا پراندہ کھینچنے لگتی۔ جگت سنگھ پراندہ ہاتھ سے چھوڑتا تو لڑکی اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر ڈھے جاتی۔

"ہائے جگّو مشٹنڈا،" لڑکی سُرخ سُرخ مُنہ سے بولتی، "جا اپنی ماں کا پراندہ پکڑ۔"

"پراندہ ہی ہے، نالا تو نہیں،" جگت سنگھ جواب دیتا، "نالے کو تو جندا لگا کے رکھتی ہو۔"

"ہائے بے شرما۔"

لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنستیں۔ کچھ دیر تک جگت سنگھ پر مستی کی لہر رہتی، پھر وہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اُس کی آنکھیں ایک بار پھر کلونت کور کی تلاش میں وحشی ہو جاتیں۔

چلتے چلتے بارات کے بیچ ہلکی سی کھلبلی مچ گئی۔ دولہے کی گھوڑی بے چین ہو رہی تھی۔

بھگت سنگھ ایک ہاتھ سے باگیں مروڑے، دُوسرے سے گھوڑی کی گردن کو تھپکیاں دے کر رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے پیچھے اُدھم سنگھ گھوڑی کی پیٹھ سے پھسلا ہی چاہتا تھا۔ وہ دیر سے شکایت کر رہا تھا کہ بھاری تلوار اُس سے سنبھالی نہیں جاتی۔ آخر جب گھوڑی دُوسری بار اگلی ٹانگیں ہوا میں اُٹھا کر سیدھی کھڑی ہُوئی تو اُدھم سنگھ نیچے آ گرا۔ جب وہ زمین سے اُٹھا تو اُس نے تلوار ہاتھ سے چھوڑ دی اَور رونے لگا۔ "میرا مونڈھا دُکھ دے رہا ہے۔" اُس نے فریاد کی۔

اُس کے باپ نے بڑھ کر اُسے تھاما۔ "جسونت سیاں، لڑکے کا گٹ سُوج گیا ہے" اُدھم سنگھ کا باپ اپنے چھوٹے بھائی سے بولا، "اِس کی بانہہ نکارہ کرنے کی صلاح ہے؟ لے اپنی تلوار۔"

جسونت سنگھ نے گھوڑی سے اُتر کر تلوار پکڑی اَور اُسے نیام میں ڈال کر اُدھم سنگھ کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "چل اَیسے ہی بیٹھ جا، کوئی بات نہیں۔ ڈھڈی والے پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے پکڑ لینا۔ چل چل، بیاہ کے مَوکے پر رویا نہیں کرتے۔"

ڈھڈی والا دُلہن کے گھر کا گاؤں تھا جو لاہور سے چند کوس اُدھر واقع تھا۔ کچھ بیاہ کی رنگینی کے نشے میں اَور کچھ ڈھولوں کی لہو اُچھالنے والی تھاپ کے زور پر آخر بارات بیس میل کا سفر طے کر کے دوپہر کے وَقت جب سُورج سَر سے ڈھلنے پہ آن لگا تھا لڑکی کے گاؤں میں داخل ہُوئی۔ ڈھول بجانے والوں نے میزبانوں کے گھر کے آگے جم کر ایک تال پر اَیسی دھمک اُٹھائی کہ بُڈھے بُڈھے سِکھ مستی میں آ کر ناچنے لگے۔ گاؤں کے بھانڈوں میراثیوں نے آ کر پنڈال لگایا اَور اپنے ٹُونکے سُنا سُنا کر اَور بارات والوں پر پھبتیاں کس کس کر ویلیں وصُول کیں۔ کھانا لایا گیا تو تھکے ہارے اَور بھوکے باراتی اُس پہ ٹُوٹ پڑے۔ اُس کے بعد شادی کی رسُومات مکمل کی گئیں۔ جب رُخصتی کا وَقت آیا تو حسبِ معمول جھگڑا ہونے لگا۔ جھگڑے کی بنیاد جہیز کے ایک پلنگ کے پائے تھے۔

"تُم نے روغنیوں کی زبان کی تھی،" بھگت سنگھ کا باپ گرجا۔ "قول سے پھر گئے ہو ہَئی مانو؟"

"یہ دیکھ، آنکھوں کے اندھے"، لڑکی کے باپ نے پایوں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "تجھے کیا دکھائی دیتا ہے؟"

"اُوپر ماں کی سُرخی لگا دی تو روغنی ہو گئے؟ ہماری بڑتی ہوئی ہے۔"

"چُپ کر، اُوپر کا بول بولا تو خالی ہاتھ واپس کر دوں گا۔"

بھگت سنگھ لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھا اَور دھم سے ایک گھونسا دلہن کے بھائی کے منہ پر جڑ دیا۔ لڑکے کی ناک سے خُون بہنے لگا۔ دُلہن کے دُوسرے بھائی نے جوابی گھونسا بھگت سنگھ کے منہ پہ رسید کیا، جس سے بھگت سنگھ کی آنکھ پہ دیکھتے ہی دیکھتے سُوجن اُٹھنے لگی۔ چھڑانے بچانے والوں کی افراتفری کے بیچ اُدھم سنگھ عقب میں دبکا کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں اب تلوار کی بجائے ننگی کرپان تھما دی گئی تھی اَور اُس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا اب رویا کہ اب رویا۔ ہاتھا پائی کے دائرے کے باہر لوگ کھڑے ہنس رہے تھے۔ "گھبراؤ نہیں، بھائی جی،" بھگت سنگھ کا چچا ایک بزرگ سکھ مہمان سے، جو شکل و صُورت سے شہر کا باسی دکھائی دیتا تھا، کہہ رہا تھا "یہ ہماری ریت ہے۔"

"یہ کیسی ریت ہے؟"

"بھائی جی، جوان اگر زور بازُو سے پتنی کو لے کر نہ جائے تو اُس کی کیا عزت رہ جائے۔"

دِن ڈھل رہا تھا جب بارات ڈولی لے کر بیس میل کے واپسی سفر پہ روانہ ہوئی۔

رات بھیگ چکی تھی۔ بھگت سنگھ کے باپ کے دالان اَور صحن میں مرد بیٹھے تھے اَور اُس کے بڑے بھائی کے گھر میں عورتیں جمع تھیں۔ بیچ میں ایک دیوار تھی۔ بُڈھے اَور ادھیڑ عمُر کے مرد دِن بھر کی مسافت سے تھک کر ایک دُوسرے کی پُشت سے پُشت لگائے بیٹھے کیکر اَور گڑ کا تند دارو پی رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن میں سے کوئی ایک اچانک واہگرو کا لایعنی سا نعرہ لگا کر اُونگھنے والوں کو چونکا دیتا۔ جو جاگ رہے تھے وہ اُونچی نیچی آوازوں میں کھیتوں کھلیانوں کی باتوں کے بیچ بیچ، گزُری ہوئی جوانیوں کے قصے دُہرا کر اس رات کی رات اپنی زندگی کی للکار کو دوبارہ جگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ جو جوان تھے اُن کے سامنے ایسے وقت کو مُڑ کر دیکھنے کے لئے ابھی عمُر بھر کی مہلت پڑی تھی۔ وہ

اپنی زندگی کی دل فریبی سے یکسر بے خبر، دارُو کی ترنگ، برق رفتار گھوڑیوں کے طلسم اور نوخیز لڑکیوں کے گیتوں کی آوازوں میں گم تھے۔ تیرھویں رات کا چاند بیچ آسمان میں کھڑا تھا۔ دیوار کی دُوسری جانب کا تک کی سرد رات کے اندر چاندنی میں نہائے ہُوئے صحن میں عورتوں کے چھوٹے چھوٹے جمگھٹ بکھرے تھے۔ بُوڑھی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو جانے کی بجائے موٹے موٹے کھیسوں میں لپٹی لپٹائی، سکڑ کر زمین پہ سو رہی تھیں۔ جو اُدھیڑ عُمر تھیں وہ اپنے خاوندوں، بیٹوں اور بیٹیوں کے دیئے ہُوئے دُکھوں سے اٹے ہُوئے چہرے اُٹھائے، سپاٹ آوازوں میں پرانی شادیوں کے شغب کا ذکر کر کر کے دلوں کو تازہ کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔ صرف کچی عُمر کی اور جوان لڑکیاں ٹولیوں میں بٹی، تھکن سے بے نیاز، اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ایک بیباک ٹولی کوٹھے کی دیواروں سے لپٹی، مردانے صحن میں بیٹھے لڑکوں کی ایک ٹولی کو تاک تاک کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھی اور اِکا دُکا اُن میں سے اپنی بانہیں لہرا کر چاند کی روشنی میں چُوڑیاں چمکا رہی تھیں۔ اُن کے نیچے صحن کے ایک کونے میں ایک دُوسری ٹولی ڈھولک لئے بیٹھی تھی۔ جب بھگت سنگھ کی دُلہن گھر میں داخل ہُوئی تھی تو یہ ڈھولک اپنی بہار پر تھی۔ گاؤں کی ماہر ڈھولک نواز عورتیں، جن میں میراثنیں بھی تھیں، باری باری ڈھولک پر قبضہ جما کر شادی اور دُلہا دُلہن کی آمد کے مقبول عام گیت گا رہی تھیں۔ اُس ایک گھنٹے کے دوران ڈھولکی اور لڑکیوں کے گیتوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ مگر رات گہری ہونے کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ ہلکی پڑ چکی تھی اور لڑکیوں کے ابتدائی چیختے چلاتے ہُوئے گیت اب نرم سُروں میں اُٹھ رہے تھے۔ جیسے کہ بیاہ کی گہما گہمی سے گزُر کر ان گیتوں نے اپنا سارا بوجھ جھٹک دیا ہو اور نو عُمر بدنوں کی مانند نکھرے نکھارے ہوئے، اب ان لڑکیوں کی اپنی بے معلوم اُمنگوں کا پیغام دے رہے ہوں۔ ٹھہری ہُوئی سرد رات کی لہروں پر گیت کے بول چھلاووں کی طرح اُبھرتے اور ڈوبتے، اٹھکیلیاں کرتے ہُوئے فضا میں بکھر رہے تھے۔

ساتھ والے صحن میں یعقوب اعوان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے شروع رات میں دارو کے صرف چند گھونٹ ہی چکھے تھے اور اِس وقت پُورے ہوش میں تھا۔ جگت سنگھ کٹورے کے کٹورے چڑھا کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر اُس کے پاس زمین پہ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ دیر تک یعقوب اعوان وہاں بیٹھا ڈھولک کی سُست سی تھاپ اور

لڑکیوں کے ملائم، لمبی لمبی سُروں والے گیتوں کو سنتا رہا جن میں کنوار پنے کی تانوں کے ساتھ ساتھ، مُحبت میں لٹنے والوں کی بے سروسامانی کے راگ تھے۔ اُنہیں سُنتے سُنتے یعقوب اعوان کے دِل میں اچانک ایک ویران سی بے چینی کا احساس پیدا ہُوا۔ اُس نے جگت سنگھ کو کندھے سے جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ جگت سنگھ نیند میں بڑبڑایا اَور کروٹ بدَل کر بے سدھ ہوگیا۔ یعقوب اعوان نے اُسے کیسوں سے پکڑ کر کھینچا۔

"میں گھر جا رہا ہوں،" وہ بولا۔

جگت سنگھ نے پَل کے پَل کو سُرخ سُرخ آنکھیں کھولیں اَور پھر بند کرلیں۔

"گھر جا رہا ہوں۔" یعقوب اعوان نے دُہرا کر کہا۔

"کُوبے،" جگت سنگھ اُس کے کُرتے کا دامن دبوچ کر بولا، "مجھے چھوڑ کے نہ جا۔"

یعقوب اعوان کُرتا اُس کے ہاتھ سے چھڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "پھیرا لگا کر مڑ آوں گا جگو،" وہ بولا، اَور صحن سے نِکل کر باہر آگیا۔

یعقوب اعوان کے گھر کا صحن والا دروازہ اَندر سے بند تھا۔ وہ چند قدم ہٹ کر دوڑا اَور اُچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ وہاں سے اُس نے صحن میں چھلانگ لگادی۔ صحن میں بندھی ہُوئی ان کی گھوڑی رنگیلی زمین پر کُھر مار کر ہنہنائی۔ یعقوب اعوان نے رنگیلی کی گردن اَور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ رنگیلی نے گردن موڑ کر ہونٹوں سے اُس کے کلّن کو گدگدایا۔ یعقوب اعوان صحن کے بیچ آکر رُک گیا اَور چہرہ اُٹھا کر آسمان پر چاند کو دیکھنے لگا۔ ایک طرف اُس کے بدَن کی تکان اُسے اپنے بستر کی جانب کھینچ رہی تھی، دُوسری طرف اُس کے دِل کی چاہ اُسے بیاہ والے گھر کو لئے جاتی تھی۔ وہ دیوار کی طرف بڑھا تو اُس کا جی ٹاپنے کو نہ کیا۔ اُس نے زمین پہ لیٹی ہُوئی لکڑی کی سیڑھی اُٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کی اَور اُس پہ چڑھ کر باہر گلی میں چھلانگ لگادی۔

پُرسکوت چاندنی گاؤں کی گلیوں اَور دیواروں سے لپٹی تھی۔ یعقوب اعوان دیر تک ایک گلی سے دُوسری، اَور دُوسری سے تیسری میں پھرتا رہا۔ گاؤں بھر میں اُسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ گلیاں ایسے ویران پڑی تھیں جیسے اِن کے باسی ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جاچکے ہوں۔ فضا پر گہرے خواب کی مدہوشی طاری تھی۔ آخر تھکن سے چُور ہو کر یعقوب

اعوان نے بھگت سنگھ کے گھر کی راہ لی۔ گھر کے قریب آ کر اُس کے کان میں ایک عورت کے گانے کی ڈوبتی اُبھرتی ہُوئی آواز آئی۔ وہ دہلیز پار کر کے، زمین پر پھیلے ہُوئے جسموں سے بچتا بچاتا جا کر جگت سنگھ کے پاس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دیوار سے کمر ٹیک کر اُس کی پُشت کو بے اِنتہا آرام حاصل ہُوا۔

صحن میں اب سب کے سب مرد اپنی باتیں ختم کر کے وہیں پر لیٹ کر سو چکے تھے۔ دارو کے نشے نے انہیں گہری مگر بے چین نیند کی حالت میں پہنچا رکھا تھا۔ ہر چند منٹ کے بعد کوئی خواب آلود جسم ہِلتا اَور حلق سے ایک مختصر سی، بلند آواز نکال کے دوبارہ ساکت ہو جاتا۔ کوئی دُوسرا بدن کسمساتا، پھر بڑبڑاتا ہُوا آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتا۔ زِندگی کے آثار صرف ساتھ والے گھر میں تھے، جہاں صحن میں ایک عورت ہولے ہولے گا رہی تھی، اور کوٹھے پر لڑکیوں کی ٹولی کی ہمت ابھی قائم تھی۔ یعقوب اعوان دیوار پر سر رکھ کر عورت کے گانے کی آواز سُننے لگا۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُس کے کانوں میں آنے والی آواز کی عجیب صفت تھی۔ گیت کے بول معدوم تھے، الفاظ آواز کی لے میں تحلیل ہو چکے تھے، باقی صرف ایک اکیلی عورت کے حلق کے سُر رہ گئے تھے۔ یعقوب اعوان نے اَندازہ لگایا کہ یہ کوئی نوجوان لڑکی نہ تھی بلکہ اُدھیڑ عُمر عورت تھی، جو گانے کے لئے ڈھولک کی آرائش یا کسی دُوسری آواز کے سہارے کے بغیر، اپنے سینے سے ایک طویل تان کی حلاوت پیدا کر رہی تھی، جس میں نہ رُخصتی کی بکاء تھی نہ آمد کی ترنگ، صرف ایک اِنسانی زِندگی کی خالص پُکار تھی، جیسے کہ وہ زِندگی اپنے آپ کو تن تنہا پا کر دُنیا کو اپنے وجُود کی کوفت کا پتا دے رہی ہو۔ اُسے سُنتے سُنتے یعقوب اعوان کی آنکھ لگ گئی۔

جب دوبارہ اُس کی آنکھ کُھلی تو اوس اَور سردی کی وجہ سے اُس کا بدن اکڑ چلا تھا۔ اُس کی گردن میں ہلکا سا بل پڑ چکا تھا، جسے اُس نے سر گھما گھما کر دُور کرنے کی کوشش کی۔ گانے والی عورت کی آواز بند ہو چکی تھی۔ صرف کوٹھے پر لڑکیوں کے گروہ میں ابھی ہل جل باقی تھی اَور اِکا دُکا آوازیں یعقوب اعوان تک پہنچ رہی تھیں۔ رات ختم ہونے میں گھنٹہ دو گھنٹے باقی تھے۔

یکایک یعقوب اعوان کے کان میں ایک مانُوس آواز پڑی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے جگت سنگھ کے نیم مُردہ جسم کو جھنجھوڑا۔

"جگّو، جگّو،" اُس نے جھُک کر جگت سنگھ کے کان میں کہا۔

"تنگ نہ کر، کوُ بے،" جگت سنگھ نیند میں بولا۔

"جگّو اُٹھ،" یعقوب اعوان نے کہا، "اُٹھ۔ اُٹھ۔ کلونتی۔"

جگت سنگھ مشین کی کل کی مانند جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا "کلونتی؟"

"ہاں۔"

"کہاں ہے؟"

"کوٹھے پر۔"

"تُو نے دیکھی ہے؟"

"ہاں۔"

"اپنی آنکھوں سے؟"

"مجھے آواز آئی ہے۔"

"کوُ بے،" جگت سنگھ اُٹھ کر بھاگا "مذاق ہوا تو تیری چمڑی نکال دوں گا۔" دونوں صحن کے دروازے سے نکِلے اَور گھر کے گرد چکّر کاٹ کر عقب کی گلی میں پہنچ گئے جہاں کوٹھے کا پچھلا رُخ تھا۔

"کلونتی----" جگت سنگھ نے ہولے سے، بے اعتباری لہجے میں آواز دی۔

کوٹھے پر خاموشی ہو گئی۔

"کلونتی----" وہ ذرا اُونچی آواز میں پکارا۔

اُوپر سے کوئی آواز نہ آئی۔

"کلونتیے-----" جگت سنگھ گلا پھاڑ کر چیخا۔

اُوپر سے کلونت کور کا سَر نمودار ہُوا۔ "جگّو، دفعہ ہو جا" وہ بولی۔

"کلونتی، نیچے آ آ----"

"چُپ کر جگّو، میرا بھائیا دلان میں سویا ہے، جاگ پڑا تو تیری چمڑی اُتارے گا۔"

"تو پھر نیچے اُتر کے آ،" جگت سنگھ ہولے سے بولا۔

"میری جُوتی بھی نہیں آتی۔"

"تجھے کیا جن پڑ گئے ہیں کلونتیے۔"

"تو آج برات میں لڑکیوں سے بدمعاشی کرتا رہا ہے۔ مجھے سب پتا ہے۔"

"کلونتی، میں تو تجھے ڈھونڈ رہا تھا۔"

"جھوٹا بے شرما۔"

"کُوبے سے پُوچھ لے۔"

"کُوبے اوانے کا بھی مجھے پتا ہے۔"

"کُوبا تو مُسلا ہے، جھوٹ نہیں بولتا۔ اِنہیں گناہ ہو جاتا ہے۔"

"جھُوٹا بے شرما۔"

"نیچے تو اُتر کے آ۔"

"میری جُوتی بھی نہیں آتی۔"

"چل جُوتی ہی پھینک دے۔"

"واہ، میری نئی جُوتی ہے، تیرے سَر میں بھی نہیں مارتی۔"

"کلونتیے ے ے ۔۔۔۔" جگت سنگھ پھر دھاڑا۔

"چُپ کر جگُو، تیری مَوت آئی ہے؟ میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا جُوتی تو پھینک۔ نہیں تو شور مچا دوں گا۔"

"یہ لے۔"

کلونت کور کی ایک جُوتی اُڑتی ہُوئی آئی، جسے جگت سنگھ نے ہوا میں جھپک لیا۔

"اب ایک جھلک تو دکھا جا۔"

کلونت کور نے ہاتھ کا پنجہ پھیلا کر کھلا دکھا دیا۔

"ظالم نہ بن کلونتیے، لا چاُٹھا کے ایک جھلک دکھا دے،" جگت سنگھ بولا،

"تیرے درشن کو آنکھیں سُوکھ گئی ہیں۔"

"تیری آنکھوں پہ مُوتتی بھی نہیں۔"

"مُوت کے دیکھ۔ پوتر سمجھ کے پی جاؤں گا۔"

اُوپر لڑکیوں میں کھٹ مٹ شرُوع ہوگئی۔ ہائے، اَور آ آ، اَور ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکیاں کلونت کور کو اُکسا رہی تھیں، کلونت کور ہائے اور نہ نہ کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے نیم خاموشی ہوگئی جس کے اندر کھسر پھسر جاری رہی۔ پھر کلونت کور نے

سر نکال کر کہا۔

"مُوت دوں کی سچ مُچ۔"

"چل مُوت۔"

"ڈینگیں مارتے ہو جھوٹے؟"

"سچ بولتا ہوں کلونتے۔"

"سونہہ دو۔"

"واہگرو کی سونہہ۔" دونوں ہاتھوں میں جُوتی تھامے، سر آسمان کو اُٹھائے، جگت سنگھ فریادی بنا کھڑا رہا۔ "تیرا پانی پوتر سمجھ کے پی جاؤں گا۔" میرے پیار کی ازمیش تو کر۔"

لڑکیوں کی کھٹ بٹ، ہنسی، ہلکی ہلکی چیخوں اور شہ دینے کی آوازیں پھر اُٹھیں اور یک دم دب گئیں۔ ایک لمحے کے بعد کلونت کور کی آواز آئی۔ "لے پھر۔۔۔۔ سونہہ توڑی تو تیرا مُنہ کالا کروں گی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھے کے پرنالے سے پیشاب کی کالی لکیر دیوار پر شر شر بہتی ہوئی نیچے گرنے لگی۔ کوٹھے پر چھ سات لڑکیوں کے سروں کی قطار نمودار ہوئی جن کی نظریں پرنالے پر لگی تھیں۔ جگت سنگھ نے تیزی سے بڑھ کر جُوتی کا کنارا پرنالے کی دیوار کے ساتھ دبا دیا، جس پر سے پیشاب بہہ بہہ کر جُوتی کی نوک کے اندر جمع ہونے لگا۔ چند سیکنڈ میں پیشاب کا بہاؤ رُک گیا۔ جُوتی بمشکل بھیگ سکی تھی اور اوک چلو بھر اُس کے اندر جمع ہو گیا تھا۔ جگت سنگ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جُوتی اُوپر اُٹھا کر بولا۔

"دیکھ کلونتے، قول کا پکا ہوں۔" اُس کے ساتھ ہی وہ جُوتی کا کنارا ہونٹوں سے لگا کر غٹ سے پیشاب کا گھونٹ پی گیا۔ "آ ہا ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ تیری ران کا امرت دارو سے میٹھا ہے کلونتے، اب تو نیچے اتر کے آ۔۔۔۔"

کوٹھے پر ہائے اور اُوئی اور چھوٹی موٹی ہنستی ہوئی چیخوں کا شور اُٹھا۔ دیوار سے سروں کی قطار غائب ہو گئی اور بھاگتے ہوئے پاؤں دبڑ دبڑ کرتے سیڑھیاں اُتر کر صحن میں غائب ہو گئے۔

"بھینس کی طرح مُوتتی ہے،" جگت سنگھ نے پرنالے پر پھیلتی ہوئی کالی لکیر کو

دیکھتے ہُوئے کہا۔ پھر وہ مُردہ سی آواز میں یعقوب اعوان سے بولا" "مَوت تو حرام کی راہ ہی گیا۔ چلی گئی ہے' ماں کی ----" اُس نے بُوتی گلی میں پھینکی اور وہیں پر ڈھے گیا۔ یعقوب اعوان بھی اُس کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں کے سَر چھاتیوں پر ڈھلک گئے اور وہیں بیٹھے گہری نیند سو گئے۔ نیند کی حد تک پہنچتے پہنچتے یعقوب اعوان کے کان میں ایک بار پھر اُس اکیلی عورت کے گانے کی مدھم سی آواز اُبھر کر آئی۔ مگر غنودگی کے زور میں اُسے پتا نہ چل سکا کہ یہ تان اُس کے خواب سے پیدا ہو رہی تھی یا کہ فی الحقیقت وہ عورت پچھلے صحن میں نیند سے ماری آنکھیں لئے بیٹھی گا رہی تھی۔ بیاہ کی رات اپنے آخری دموں پہ آ پہنچی تھی۔

جب یعقوب اعوان کی آنکھ کُھلی تو سُورج نِکل آیا تھا۔ جگت سنگھ جا چُکا تھا۔ دِن چڑھنے کے باوجُود گلیوں میں کسی آدمی، عورت یا جانور کی ہلچل دکھائی نہ دیتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے گاؤں کے باسی زیرِ زمین چلے گئے ہوں۔ چوبیس گھنٹے کے بے آرام بدن کو اُٹھائے بھاری قدموں سے یعقوب اعوان اپنے گھر کو جا رہا تھا کہ ایک گلی پار کرتے ہُوئے اُس کی نظر گاؤں کے باہر ایک کھیت پہ جا پڑی۔ وہاں پہ ایک مجمع لگا تھا۔ لگتا تھا جیسے سارے کا سارا گاؤں نِکل کر وہاں جمع ہو گیا ہو۔ یعقوب اعوان مُنہ اُٹھا کر اُس طرف کو چل پڑا۔ لوگوں کا ہجوم ایک دائرے کی شکل میں بے آواز کھڑا تھا۔ دائرے کے اندر ایک خیمہ، چار چھ گھوڑے، اور چند متحرک سَر نظر آ رہے تھے۔ یعقوب اعوان ابھی کچھ دُور ہی تھا کہ ایوب اعوان اُسے دیکھ کر مجمعے سے بھاگتا ہُوا نِکلا اور بیٹے کو اپنے کیم تحیم جثے کی اوٹ میں لے کر اپنے آگے ہانکتا ہُوا پیچھے کو لے چلا۔

"تو کہاں تھا نامُراد،" وہ نیچی آواز میں بولا" "سارے گھر چھان مارے ہیں۔ چل چل، مُنہ سے کچھ نہ بول۔"

"گھر جاؤں؟" یعقوب اعوان نے پُوچھا۔

"نہیں نہیں۔ گھروں کی تلاشی ہوگی۔ اپنے کماد میں جا کر چُھپ جا۔"

"ابا کیا ہو رہا ہے؟"

"بات نہ کر۔ جُھک جا۔ جُھک کے چل، میرے آگے آگے رہ، اِدھر اُدھر نہ ہو، چل چل، کماد میں جا کر بیٹھ جا۔"

ابھی باپ بیٹا چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک پولیس کا سپاہی دوڑتا ہُوا آ کر اُن کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جھُک کر چلتے ہُوئے یعقوب اعوان کو گردن سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

"بچہ معذور ہے حوالدار صاب،" ایوب اعوان نے سپاہی کی منت کی، "اِس کو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، کمر سیدھی نہیں کر سکتا، پیدائشی نقص ہے۔ معذور ہے حوالدار صاب، میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

"سب پتا چل جائے گا چوہدری،" سپاہی بولا، "معذور ہے تو ڈاکٹری کے بعد وصول کر لینا۔" وہ یعقوب اعوان کو بازُو سے پکڑ کر چلاتا ہُوا لے گیا۔

"اسے بخار بھی آتا ہے حوالدار صاب،" ایوب اعوان نے نااُمیدی کی حالت میں آخری کوشش کی۔ "ڈاکٹر صاب کو بتا دینا۔ میرے لائق جو خدمت ہو میں تیار ہوں۔"

ڈاکٹری میں یعقوب اعوان فٹ نِکلا۔ بھرتی کرنے والے قافلے نے علی الصبح اچانک گاؤں میں پہنچ کر خیمہ لگا دیا تھا۔ سرکردگی ضلع کا انگریز افسر کر رہا تھا۔ باقیوں میں ایک ڈاکٹر اور اُس کا عملہ، محکمہ مال کا پٹواری اَور ذیلدار، اَور تھانیدار کے ہمراہ پولیس کی ایک پوری گارد تھی۔ اِس کے علاوہ جہان آباد کا مَلک عالم جہاں اعوان، جو برادری کا بڑا جاگیردار تھا، انگریز افسر کے ساتھ ساتھ تھا۔ مَلک عالم جہان کے باپ صوبیدار جہاں خان کو انگریز حکُومت کی جانب سے مُلک میں مختلف بغاوتیں دبانے کے صلے میں سند، تمغہ، اَور پنشن کے علاوہ بار کے علاقے اَور سندھ میں ملا جلا کر چالیس مربع غیر آباد زمین عطا کی گئی تھی۔ یہ زمین اُس نے آباد کرنے کی بجائے اپنے علاقے میں جہاں کا وہ رہنے والا تھا، پرائیویٹ مالکان سے معاملہ طے کر کے آٹھ مُربعے زرخیز زمین کے بدلے میں دے دی تھی۔ یہاں اُس نے جہان آباد نامی گاؤں کی بنیاد ڈالی تھی۔ صوبیدار جہان خان اَور اُس کی اولاد، گو پنجاب کے بڑے زمینداروں میں شُمار نہ ہوتے تھے، مگر برادری اَور تعلیم کی بنا پر اثر ورسُوخ میں دُور تک پہنچ رکھتے تھے۔ ضلع کی حد تک ہر آنے جانے والے افسر کے ساتھ اُن کا میل جول رہتا تھا۔

گاؤں سے صرف چند نوجوان لڑکے دستیاب ہو سکے تھے، جو ڈاکٹری کے لئے ننگے بدن، صرف جانگیئے پہنے ایک قطار کے اَندر سرد ہوا میں کھڑے کپکپا رہے تھے۔ جب ڈاکٹر

اُن کے جانگیئے گرا کر معائنہ کرنے لگا تو لڑکوں نے مزاحمت کی۔ انگریز افسر نے قریب جا کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے بید کی مدد سے ایک لڑکے کا جانگیہ کمر سے نیچے کیا۔ "ڈاکٹر اس کو،" وہ بید کی نوک سے لڑکے کے آلہ تناسل کو اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے اُردو میں بولا، "کھا نہیں جائے گا۔ ڈر مت کرو۔" ڈاکٹری کے بعد اُن کو اِسی طرح عریاں کھڑے رکھا گیا جب کہ دو گھنٹے تک ایک حکومتی اہلکار اُن کے مختلف کوائف درج کرتا رہا۔ ساتھ ہی اُن کے والدین کی ملکیتوں کی تفصیل معہ رجسٹری وخسرہ نمبر لکھے گئے اور تنبیہہ کی گئی کہ اگر لڑکے اگلے روز فلاں فلاں جگہ پر حاضر نہ ہوئے تو قانون کے مطابق جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔ انگریز افسر پرجس پہنے، اپنا بید ہاتھ میں لہرا کر اُردو بول بول کر گاؤں کے لوگوں کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

"بھاگ گئے۔ چھُپ گئے۔ حرامی۔ تُمہارا اُپنا کا کھیت آگ لگائے گا۔ گھربار منجی پیڑھی اٹھا لے گا۔ نکالو لڑکا لوگ، سرکاری نوکری میں پیسا ملے گا، اِنعام اور تمغہ ملے گا۔۔۔۔" پھر وہ عالم جہاں اعوان سے مخاطب ہوا، "عالم" وہ بولا، "ہم تُمہارے سے کُش نہیں ہے۔ تُم نے بولا پچاس آدمی اور دس گھوڑا دوگے۔ اِدھر بس آٹھ لڑکا لوگ نکلا۔"

"صاحب بہادر،" عالم جہاں اعوان نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا، "ہم وعدے کے مطابق دے گا۔ ابھی اور بہت جگہ ہیں۔ ہم بندے پُورے کرے گا اور دس گھوڑے اپنے پاس سے دے گا۔"

"ورنہ تُمہارا گھوڑی کا مُربع واپس لے گا۔" افسر نے دھمکی دی۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ یعقوب اعوان اُس وقت سترہ برس کا تھا۔ گاؤں سے بھرتی ہونے والے آٹھ لڑکوں میں جگت سنگھ شامل نہ تھا اور یعقوب اعوان سوچ رہا تھا کہ جگّو کہاں جا کر چھپا ہو گا۔ جب بھرتی والے چلے گئے تو جگت سنگھ نے آکر بتایا کہ وہ کسی کھیت میں نہیں بلکہ اپنے کھلیان میں توڑی کے ڈھیر کے اندر چھُپ کر بیٹھا رہا تھا۔ اُس کی ناک کے اندر توڑی کے باریک تیلے بھر گئے تھے جن کی وجہ سے وہ مسلسل چھینکیں مار رہا تھا۔ ایک روز کی مہلت کے بعد جب نوجوان گاؤں سے رُخصت ہوئے تو ماؤں نے بین کئے، بہنوں نے سینے پیٹے، اور گاؤں کی ایک ایک عورت نے آنسو بہائے۔

یعقوب اعوان کے دِل کو کوئی بے چینی نہ لگی۔ اُس وَقت اُسے عِلم نہ تھا کہ وہ تین سال پہ محیط ایک ایسے سفر پہ روانہ ہو رہا تھا جس کے خاتمے پر اُس کی زِندگی کا رُخ بدل چکا ہو گا۔

اب اٹھاون سالہ بُڈھے کو آخری لمحوں میں اپنی جوانی کا وَقت یاد آیا' جو یہ سب مناظر اپنے دامن میں سمیٹے چشم زدن میں اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ اُس کا لہو جو اُس کے پاؤں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کمر تک آ چکا تھا' ایک لمحے کے لئے چھلکا مگر دُور تک مار نہ کر سکا۔ یعقوب اعوان نے آنکھیں میچ لیں۔

آگے بہت سے نظارے ایک کے بعد ایک' دوڑتے بھاگتے ہُوئے گزر گئے۔ فوج کی مشقیں' بحری جہاز کا سفر' ڈبوں کا جما ہُوا مزیدار میٹھا دُودھ' اجنبی مُلک کے میدانِ جنگ' بارُود کی بُو اَور دماغ پھاڑنے والے دھماکے' خندقیں' سردی' خُون' خُون اَور کیچڑ اَور سردی۔ ساتوں سال چلتا ہوا یہ سلسلہ ایک لمحے کے اَندر سکڑ کر ایک اَور خندق کے منظر پہ جا رُکا۔ یہ یعقوب اعوان اَور اُس کے ساتھیوں کی آخری خندق تھی۔ اِس خندق میں رات کے بارہ بجے' دشمن کی تاک میں بیٹھے بیٹھے' اُس کی جان حلق میں آ کر پھنس گئی تھی۔ اُوپر کی سانس اُوپر اَور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ چند ہی سیکنڈ کی تگ و دو کے بعد یعقوب اعوان ہار کر جی چھوڑ بیٹھا۔ کیچڑ کی دلدل میں گرتا پھسلتا' مَوت کے خطرے سے بے نیاز ہو کر وہ خندق سے نِکلا اَور پیچھے کی جانب بھاگ کھڑا ہُوا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہو گا کہ ٹانگیں جواب دے گئیں۔ سینہ اَیسے تھا جیسے منوں بوجھ تلے دبا ہو' اَور اَندر کُچلی ہوئی سانس ہُوک ہُوک کر ختم ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے رات کی سیاہی میں پیلے اَور سُرخ رنگ کی پھلجھڑیاں چھُوٹ رہی تھیں۔ کِسی کے کھیت کی گیلی مٹّی پہ چت لیٹے' ایک اجنبی آسمان کو ٹھہری ہُوئی نظروں سے دیکھتے ہُوئے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے سوچا کہ نہ بدن پہ زخم آیا نہ خُون نِکلا اور مَوت نے آ کر اُس کا سینہ دبوچ لیا ہے۔ "ہائے ماں'" اُس نے فریاد کی۔

جب وہ ہوش میں آیا تو اُسی طرح چت لیٹا تھا اَور ایک وسیع و عریض سفیدی اُس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی تھی۔ اُس کے ذہن کی حالت اَیسی تھی کہ جیسے ایک سفید' بے داغ سرزمین ہو جس پہ یاد کا نام و نشان نہ ہو اَور عُمر کا کوئی سُراغ نہ مِلتا ہو۔ کئی لمحوں تک وہ اِسی سوچ میں رہا کہ وہ کون ہے اَور کہاں پر ہے۔ اُس کا خیال ایک مقام پہ مُعلّق

تھا۔ جس شے نے آخر اُس کی سوچ کو ٹھوکا دیا وہ اُس کی سانس تھی جو اُس کے سینے میں پھنسی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک لمبی سی کانٹے دار شاخ تنگ سے سوراخ میں سے کھینچی جا رہی ہو۔ سانس کی آمد و رفت جو اَن دیکھی اَور اَن جانی صُورت میں رواں رہتی تھی، اب درد کا کاروبار بن چکی تھی جو پھیپھڑوں کو چھلنی کئے جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ، اُس کی یاد عود کر آئی اَور اُس کھیت کی گیلی مٹّی کو اُس نے اپنے ہاتھوں پہ محسوس کیا جہاں لیٹے لیٹے، سیاہ آسمان پہ اُس نے اپنی مَوت کے نقشے کی جھلک دیکھی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے سفیدی ہسپتال کے چھت کی تھی اَور سینے کا درد وہ روگ تھا جو اُس کی جان کے ساتھ عمر بھر رہنے والا تھا۔

نیم بیہوشی کی حالت میں ہی اُسے فیلڈ ہسپتال سے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اُسے علم ہوا کہ وہ، اَور اُس کے ساتھ لیٹے ہُوئے بیسیوں لوگ دشمن کی زہریلی گیس کے حملے کا شکار ہُوئے تھے جس میں نہ بُو تھی نہ رنگ، مگر جو سانس کی نالی میں پتھر بن کر بیٹھ گئی تھی۔ کئی مہینوں کے علاج کے بعد اُسے چند روپوں کی پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔

گاؤں سے جانے والے آٹھ لڑکوں میں یعقوب اعوان اکیلا بچ کر آیا تھا۔ اُس کی آمد پہ دُوسرے سات مرنے اَور جنگ میں لاپتہ ہونے والوں کے کنبوں نے اُس کے سَر پہ ہاتھ پھیرنے کے بعد از سرِ نو ماتم کیا تھا۔ یعقوب اعوان کا سینہ اِس درجہ کمزور ہو چکا تھا کہ وہ کاشت کاری کی مُشقّت کے قابل نہ رہا تھا اَور دِن رات کھانسی کے شدید جھٹکوں کی وجہ سے سانس دھونکنی کی صدا پیدا کرتی تھی۔ خُوش قسمتی سے ایوب اعوان کی جان میں دم خم موجُود تھا اَور جب تک رہا اُس نے بیٹے کو ہتھیلیوں پہ اُٹھائے رکھا۔

گاؤں واپس پہنچ کر یعقوب اعوان نے سب سے پہلے جگت سنگھ کا پتا کیا۔ قریب مرگ پچھیوں کے سامنے اب اُس رات کا منظر آتا ہے جب بھگت سنگھ نے یعقوب اعوان کو اُس کے دوست جگت سنگھ کا قصّہ سنایا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ یعقوب اعوان کمبل اوڑھے، ہُوکے بھرتے ہُوئے سینے کو سنبھالے، بھگت سنگھ کے دالان میں چارپائی پہ بیٹھا تھا۔

"جگو خرمست تھا" بھگت سنگھ بولا، "ہم نے کہا کلونتی کو نکال کر لے جا اَور اپنے بھائی ہمندر سنگھ کے پاس چلا جا۔ مگر وہ کبیرے سے نہ نکلا۔ تُو تو لام پہ چلا گیا تھا یکوب

اوان، تیرے پیچھے ایک سال کے اندر جگو نے ایسی کاٹھی نکال کہ کیکر کے درخت میں اُس کا سر چھپتا تھا۔ پر اُس کی عقل پیروں میں اُتر آئی تھی۔ واردات سے دو دن پہلے اُس نے اپنے دھان کے کھیت کو جلا دیا۔"

"وہ کیسے بھائیا جی؟"

"میں اسی جگہ پر بیٹھا ہُوا تھا جہاں اب تُو بیٹھا ہے کہ میری نظر میں دھوئیں کی ایک لاٹ آئی جو آسمان کو جا رہی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا کہ اپنی تیار مونجی دھڑ دھڑ جل رہی ہے۔ سارے گاؤں نے باٹیاں بھر بھر کے پانی پھینکا تو ایک کونا ہی ٹھنڈا ہُوا۔ اندر سے جگو کلونتی کی بانہہ پکڑے ہوئے نکل کے آیا۔"

"پھر بھائی جی؟"

"پھر کیا ہونا تھا؟ سارا کھیت آگ میں جل کر کوئلہ ہو گیا۔ زمین کی مٹی تک کالی ہو گئی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اِدھر اُدھر کے کھیت خالی تھے، وہ آگ پکڑ لیتے تو گاؤں پہ فاقے آ جاتے۔ تجھے پتا ہے کہ ہم تو سب سے پہلے بیائی کرتے ہیں۔ ہماری نئی فصل سب سے پہلے تیار ہوتی ہے اور بھاؤ اونچا لگتا ہے۔ جگو نے سب غرق کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تُو نے کیا کب کیا، تو بولا کہ بھائیا، میں نے تو اُس کا مُنہ دیکھنے کو تیلی جلائی تھی۔ گرو کی مار، مُنہ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ خرمست کا بچہ بولا بھائیا، تجھے اِن باتوں کی کیا سمجھ؟ سمجھ کیوں نہیں، میں نے کہا، بیاہ کر کے لایا ہوں کہ نہیں؟ کہنے لگا اُس سے کیا ہوتا ہے، میں تو کلونتی پر عاشق ہوں، میرا دل چاہا تھا اُس کا مُنہ دیکھوں۔ اب تو بتا، خرمست نہیں تو کیا تھا؟"

"پھر بھائیا؟"

"جب وہ دونوں کھیت سے بھاگ کر نکلے تو آگے آدھا گاؤں کھڑا تھا۔ بے انت سنگھ نے مُنہ سے کوئی بات نہ کی، بس کلونتی کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گیا۔ مجھے اُسی وقت شک ہو گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ جگو اور کلونتی کا سب کو پتا تھا، بات طریقے سلیقے میں رہتی تو کام چلتا جاتا۔ مگر اُس رات کو سارے گاؤں کے آگے بے انت سنگھ کی پگ اُتر گئی۔ میں نے جگو سے کہا چل امبرسر ہی چلا جا، تھوڑے دن بھاپے کرنیل سنگھ کے پاس گزار آ۔ خرمست تھا، کسی کی ایک نہ سنتا تھا۔ تیسرے دن سویرے میں باہر نکلا تو اُسی

سڑے بوئے کھیت میں جگو اور کلونتی دونوں لگے پڑے تھے۔ گاؤں کے اندر کسی بشر نے اُن کی آواز بھی نہ سُنی تھی۔"

"بے انت سنگھ پکڑا گیا؟"

"ہاں۔ مہینہ حوالات میں مار کھا کر گھر آیا۔ پکا نکلا، پُچھ بکا نہیں، کوئی ثبوت نہ نکلا۔ تجھے پتا ہی ہے، گاؤں میں کون گواہی دیتا ہے؟"

"پھر، بھائیا؟"

"پھر کیا ہے؟ دیکھتا نہیں، آج دو سال ہو گئے ہیں، پگ کو بل نہیں دیا۔ تو دیر لگا ہوں، جس دن ہاتھ پڑ گیا پار کر دوں گا۔ تیرا بھی یار تھا، جب تو گیا تو جگو ہر روز تجھے یاد کرتا تھا۔ مگر دکھائی دیتا ہے کہ تو لام سے نکارہ ہو کر آیا ہے۔ اب یہ میرا کام ہے۔ ٹھیک ہے، غلطی جگو کی تھی، میں کہتا ہوں منہ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں بھائیا، کیا ضرورت تھی۔"

"مگر بدلہ تو بدلہ ہے، یکوب اوان۔"

"ہاں، بھائیا۔"

رات اِس قدر سرد تھی کہ درختوں کی کوکھ چٹاخ پٹاخ ہو رہی تھی اور کہرہ پیروں تلے کڑکڑاتا تھا۔ کسان آلوؤں کی فصل کو کھیسوں ترپالوں سے ڈھانپ رہے تھے۔ یعقوب اعوان کمبل لپیٹے، کپکپاتا ہوا، گاؤں کے کنارے کھڑا اس کھیت کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی دھان کی ایک بھری فصل جگت سنگھ کے عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اُس کھیت میں اب کماد کی فصل کھڑی تھی۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا بھڑ بھڑ کرتی آگ کے تصور کو دماغ میں لئے جگت سنگھ کے خُوش دل چہرے کو تلاش کرتا رہا جو اب ہمیشہ کے لئے فرار ہو چکا تھا۔ پھر اچانک اُسے کھانسی کا ایک جاں کش دورہ پڑا اور وہ وہاں سے لوٹ آیا۔

پھر زمانے نکل گئے۔۔۔ ایک تیز رفتار سفر کے نظاروں جیسی دُھند، سردیوں کی شاموں کا دھواں، گرمیوں کی دُھوپ کے غبار، بے انت سنگھ کا دن دیہاڑے قتل، جگت سنگھ کی قید، سات سال کے بعد رہائی اور اُس کی پگڑی کا نویلا بل، موسموں کے تغیر، یعقوب اعوان کے چھلنی پھیپھڑوں کی جلن، کاشت کاری میں اس کے ہاتھ پاؤں کی بیکاری، ایوب اعوان کی محنت۔ بارہ برس کا عرصہ ایک لمحے کی گرد میں اُڑ گیا۔ ان سارے سالوں میں

یعقوب اعوان باقاعدگی کے ساتھ ہر روز صبح سویرے اپنے کھیتوں کو جاتا اور شام کو واپس آتا۔ کھیتوں پر وہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں، الزوں بیٹا باپ کو دن رات زمین سے خوراک پیدا کرنے کی مشقت کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ زہریلی گیس سے اُس کا سینہ بھر چکا تھا اور اُس کے سامنے یعقوب اعوان نے جی چھوڑ دیا تھا۔ سال در سال زندگی کی اسی ناچاقی کے اندر گزر گئے۔ اُس کی ماں اپنی بہو کی خواہش کرتے کرتے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ علاقے میں ان کی رشتہ داری دُور دُور کی تھی اور مناسب اور میسر لڑکیوں کی تعداد کم تھی۔ جو دستیاب تھیں اُن کے وارث یعقوب اعوان کی کمزور صحت کے پیشِ نظر رشتہ دینے پر رضامند نہ تھے۔ ایک بار یعقوب اعوان بھگت سنگھ کے ہمراہ اُس کے سُسرال ڈھڈی والے گیا تو راجپوت مسلمانوں کے گھر کی ایک چھریری لڑکی سے اُس کی آنکھ لڑ گئی۔ چھاتی کے زہر کے باوجود، جوانی میں یعقوب اعوان جب اپنی سُرخ گیلسوں والی خاکی رنگ کی فوجی پتلون اور پالش سے چمکائے ہوئے کالے بوٹ اور جرابیں پہنتا اور خاکی قمیض پر جنگی سروس کی فیتیاں لگاتا تو گاؤں کے ماحول میں اُس پہ بانکپن کا ایک انداز نکلتا تھا۔ ایوب اعوان اپنی غرض لے کر ڈھڈی والے گیا تو نامُراد لوٹا۔ آخر جب یعقوب اعوان چونتیس برس کا ہو گیا اور ایوب اعوان کی بینائی جواب دینے لگی تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"لڑکی تیرے ساتھ نکل آئے گی؟"

"ہاں، ابا۔"

"نکال کے لے آ۔"

"ابا؟؟؟"

"تو کام کاج کے لائق تو نہیں، پر گھوڑے کی سواری تو کر سکتا ہے ناں؟"

"ہاں، ابا۔"

"اور بندوق بھی چلا لیتا ہے۔"

"ہاں ابا۔"

"تو پھر جا" ایوب اعوان بولا "دیکھا جائے گا۔"

اب وہ بجھتی ہوئی آنکھیں دیئے کی لاٹ کی طرح جھپاکا مار کے ایک لحظے کے لئے چمک اُٹھیں، اور اُس لحظے میں وہ منظر سمٹ آیا جب زمین پہ اس قدر تاریکی چھائی تھی کہ

بندہ کسی شجر کے سائے سے بھی ہلکا نظر آتا تھا۔ رنگیلی کی جوان بچی چنبیلی نے بیس میل کا سفر ایک گھنٹے کے اندر اُس روانی سے طے کیا گویا دِن دیہاڑے بھاگ رہی ہو۔ یعقوب اعوان نے محسوس کیا جیسے چنبیلی کو اس بات کا عِلم ہو کہ یہ سفر راز اور رفتار کی مہم تھی۔ اُس کا کھُر ایک کنکر پہ نہ اٹکا تھا اور ٹاپوں کی آواز ایسی ہلکی کہ جیسے روئی کے گالوں پہ چل رہی ہو۔ چنبیلی کو اُس نے اپنے ہاتھوں میں پالی تھی، مگر اس رات پہلی بار یعقوب اعوان کو پتا چلا کہ خصلت والا اصیل جانور کیسے اپنے مالک کے جسم سے اُس کے خیال کی پہچان کرتا ہے۔ اب ڈوبتی آنکھوں میں یاد کے ایک لمحے کے اندر صرف دو منظر سب سے آگے کھڑے تھے۔ ایک چنبیلی کی رفتار، اور دوسرا زینب کا فرار۔

ہزار راتوں کی ہم بستری کی یاد اُس کے دِل میں ایک دُھندلکے کی شکل میں تھی۔ مگر ان خلوتوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ صرف کھُلے آسمان کے نیچے اُس اوّلین خلوت کی اصلیت اُس کی آنکھوں کے سامنے رہ گئی تھی۔ سفیدے کے نوعمر پیڑ کا سا زینب کا لچک دار بدن جب اپنی کچی دیوار ٹاپ کر یعقوب اعوان کے پیچھے چنبیلی کی پُشت پر آجما تھا اور گھوڑی کی پسلیوں کے گرد اپنی رانوں کی گرفت کو تنگ کر کے زینب نے یعقوب اعوان کی کمر کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیا تھا تو تینوں بدنوں کی یکسوئی کا یہ ایک ایسا اٹل منظر تھا جیسے پتھر سے کاٹ کر اپنے مقام پہ نصب کر دیا گیا ہو اور کبھی اپنی جڑوں سے نہ ہلا ہو۔ اپنے دروازے پہ پہنچ کر چنبیلی رات بھر میں پہلی بار ہنہنائی تھی، جیسے اپنے سفر کے خاتمے پر نہیں بلکہ مالک کی کامیابی پر خُوشی کا اظہار کر رہی ہو۔ صحن کی دیوار کے اندر ایوب اعوان دونالی بندوق میں کارتوس بھرے، تاک لگائے بیٹھا تھا۔

"یہ لے،" وہ بیٹے کو بندوق تھماتے ہُوئے بولا، "میری نظر کام نہیں کرتی۔ تو اِسے سنبھال۔" اور خود جا کر اندر سے ٹوکہ اُٹھا لایا تھا۔ دونوں باپ بیٹا دیوار کے ساتھ کھڑی بانس کی سیڑھی کے پاس رات بھر چوکس بیٹھے رہے۔

دن چڑھے جب زینب کے وارث، ہتھیاروں سے لیس ہو کر، ہوائی فائر کرتے ہوئے پہنچے تو گاؤں والوں کو واقعے کا عِلم ہو چکا تھا۔ کیرے کے سکھ اگلے گاؤں دستگیر چک کے مُسلمان راجپوتوں کے بڑے بُوڑھوں کو ساتھ لئے بیٹھے انتظار میں تھے۔ اُنھوں نے حملہ آوروں کو روکا، منّتیں سماجتیں کر کے اُنہیں تھام کے رکھا اور تصفیئے پر راغب کرنے کی

کوششیں شروع کیں۔ اِسی دوران میں ایوب اعوان نے بیٹے کے ہاتھ سے بندوق چھین کر دو ہوائی فائر کر دیئے۔ نمبرداروں کی ایک پارٹی اُس کے پاس بھی پہنچ گئی۔ زینب کے وارثین کو سمجھایا گیا کہ لڑکی نکل آئی ہے، اب بہتری اِسی میں ہے کہ اِس کا نکاح کر دیا جائے۔ آخر لمبی چوڑی بات چیت کے بعد تصفیہ اِس پہ ہوا کہ زینب کو اُن کے حوالے کر دیا جائے، اَور نکاح کی تاریخ مقرر کر کے معاملے کو شرعی حیثیت دے دی جائے۔ زینب کے وارث گو سِکھوں کے گڑھ میں رہنے والے مُسلمان راجپوت اَور نسلوں سے اپنی حیثیت کی حفاظت کرنے والے بہادر آدمی تھے، مگر شریف لوگ تھے، مان گئے۔

آگے کے ایک لمحے نے ایک سال کو عبور کیا اَور یعقوب اعوان کے پلوٹھی کے بیٹے اعجاز اعوان کی پیدائش پہ جا کر رُکا۔ اِس وَقت گردن موڑنے کی یعقوب اعوان میں سکت نہ تھی، مگر آنکھیں گھُما کر اُس نے اپنے بیٹے کو دیکھا جو اُس کا ہاتھ پکڑے چارپائی سے لگ کر بیٹھا تھا، جیسے باپ کو روک کر رکھنا چاہتا ہو۔ اِس ایک لحظے میں یعقوب اعوان نے اپنے باپ ایوب اعوان کو ایک کہنہ جڑ والے گھنے درخت کی مانند زمانے کی ہوا کے آگے گرتے اَور جہان فانی سے کُوچ کرتے، اپنے بیٹے اعجاز اعوان کو بچپن اور لڑکپن کی حدود سے نِکل کر نوخیز جوان بنتے اَور کاشتکاری سے ہٹ کر تعلیم کی جانب راغب ہوتے، اپنی زمین کو ٹھیکے پر چڑھتے، اَور ایک ہی اولاد کے بعد زینب کی کوکھ کو آہستہ آہستہ سوکھتے ہُوئے دیکھا۔ اب اُن آنکھوں میں جھپکنے کی طاقت بھی زائل ہوتی جا رہی تھی۔ اگلی ساعت میں جو نقشہ نظروں کے آگے آکر ٹھہرا اُس میں ایک زمانہ خیز وَقت کی اُلٹ پلٹ کا سماں تھا۔

مُلک کے بٹوارے کا موقع آن پہنچا تھا۔ سال چڑھا تو افواہیں پھیلنی شروع ہوئیں کہ آبادی کی اول بدل شروع ہو چکی ہے۔ پھر فساد اَور مار دھاڑ کی کہانیاں کانوں تک پہنچنے لگیں۔ کبیر سنگھ والا میں اگرچہ مُسلمانوں کا ایک ہی گھرانا تھا، اَور اُس میں بھی اب فقط تین فرد رہ گئے تھے، مگر جدی پشتی رہائش کے مقام پر ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یعقوب اعوان کو ایک پَل کے لئے بھی اُس بات کا گمان نہ ہوا کہ وہ نقل مکانی کرے، یہاں تک کہ جلسے جلوس اَور نعرے امرتسر کے شہر سے نِکل کر نواح کے قصبوں اَور گاؤں میں سرایت کر آئے۔ پھر کچی سڑکوں پر ہجرت کرتے ہُوئے بدحال قافلے مشرق سے مغرب اَور مغرب

سے مشرق کو آتے ہوئے نظر آنے شروع ہوئے۔ عورتوں بچوں کی چیخ و پکار اور انسانی خُون کے نظاروں نے ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اِس ہوا نے آگ کے شعلے بھڑکائے جو خُون اور آہ و بکاہ کے طوفان میں شامل ہوگئے۔ آدمی کی سرشت میں چھپی ہوئی دیوانگی اس طرح زمین پر پھیلی کہ انسان اور حیوان دونوں کا گزر مشکل ہوگیا۔ یعقوب اعوان کو یاد آیا کہ اُس عجیب وَقت میں جانوروں کے اندر ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی۔ بڑے بڑے خُونخوار کتے، مُنہ زور گھوڑے اور اڑیل مویشی مُنہ اُٹھا کے آسمان کو دیکھتے اور گردن موڑ لیتے تھے۔ ان کی بے زبان نظروں میں مُستقل کھٹکا در آیا تھا اور چال میں پہلو تہی کا انداز آگیا تھا جیسے ان پہ عیاں ہوگیا ہو کہ آدمی کے اندر ایک جان لیوا بیماری کی وبا پھیل گئی ہے، اور جانور کسی ان دیکھی راہ فرار کی تلاش میں ہوں، آدمی کو قریب آتے دیکھ کر بدک جاتے اور آنکھوں میں سہم لئے پرے سرکنے لگتے۔ ایک ایسا وَقت آیا کہ گویا ان بے زبانوں نے اپنی چھٹی حس سے اِس اِنسانی اُفتاد کی پہچان کرلی اور زبانداروں کی برادری کو اچھوت قرار دے دیا۔ آخر وہ دن بھی آیا جب بھگت سنگھ نے آکر کہا۔

"فسادی ہمارے گڑھ تک آپہنچے ہیں۔ اُٹھ کے ہمارے ڈیرے پر آجا۔"

یعقوب اعوان کی چھاتی کمزور تھی، مگر وہ اپنے باپ کے خُون کی بہادری سے عاری نہیں تھا۔ کارتوسوں کی پیٹی پہ ہاتھ مار کر بولا، "جب تک یہ خالی نہیں ہوجاتی، میں اپنی زمین سے پیر نہیں اُٹھاؤں گا۔"

مگر اگلے روز بھگت سنگھ، اُس کے چچا اور بھائی یعقوب اعوان کے گھر پہ آکر بیٹھ گئے۔ "گیرے میں تیرا ایک ہی گھر ہے،" جسونت سنگھ بولا، "سب کی نظر میں ہے۔ اپنی عورت کی حالت دیکھ۔ ضد نہ کر، ہمارے ساتھ چلا چل۔"

یعقوب اعوان کو پہلی بار ان حالات میں اپنی بیوی کا خیال آیا۔ زینب کے بدن میں ایک معجزہ رونما ہوچکا تھا۔ پندرہ برس کی خُشک سالی کے بعد اچانک اُس کی کوکھ ہری ہوگئی تھی۔ آٹھ ماہ کے عرصے سے اُس کے پیٹ میں بچہ پل رہا تھا۔ سینتیس برس کی عمر میں اُسے حمل ٹھہرا تھا، اور جلد کے اندر پانی کے رُکاؤ کی وجہ سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ پیدائش کی گھڑی قریب آرہی تھی اور صورت یہ تھی کہ وہ پل کے پل کو اُٹھ کر کام کاج کرتی اور پھر چارپائی پہ ڈھیر ہوجاتی۔ یعقوب اعوان کی زندگی کی یہ خُوشی ابھی

پروان بھی نہ چڑھی تھی کہ فساد کا جھکڑ ان کے سروں پہ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ جان اور مال کی حفاظت کے جھگڑے میں زینب کی فکر اُس کے ذہن سے قریب قریب اُتر چکی تھی۔

"زمانہ بدل گیا ہے، یکوب،" ارجن سنگھ نے کہا، "اڑیل نہ بن۔ آنکھ کھول کر دیکھ، اپنے ہی گاؤں کے حرام خور فسادیوں سے مِل گئے ہیں۔ چل اُٹھ، خُون خرابہ نہ کرا۔"

آدمی کی رعایت مِل گئی، مگر خُون خرابے کی نہ ملی۔ یعقوب اعوان زینب اور اعجاز کو لے کر گھر سے نِکلا تھا کہ بلوائیوں کی ہاہاکار سنائی دینے لگی۔ ابھی اعوانوں کا قافلہ بھگت سنگھ کے ڈیرے پہ آ کر بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے دھوئیں میں لپٹے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ طویلے سے بھینس اور بچھڑی کے ڈکرانے کی اذیت ناک آوازیں نکلیں اور اُٹھتے اُٹھتے ایسے شور کی صُورت میں بدل گئیں جو پندرہ سالہ اعجاز نے پہلے کبھی نہ سُنا تھا۔ مویشیوں کی چیخیں سارے گاؤں پہ چھا گئیں۔ یعقوب اعوان بھاگ کر اپنے گھر کو پہنچنے کے لئے زور مار رہا تھا، مگر بھگت سنگھ اور اُس کے بچا کی گرفت اُسے ہلنے نہ دیتی تھی۔ آخر وہ ہار کر وہیں کھڑا ویران نظروں سے جلتے ہُوئے گھر کو دیکھنے لگا۔ اب جلتے ہُوئے گوشت کی بُو گاؤں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اِتنے میں انہیں گلی کے اندر گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ اعجاز نے ٹاپوں سے پہچان لیا کہ یہ زور آور تھا۔ چنبیلی کا بیٹا یعقوب اعوان کے ہاتھوں میں اُس رات پیدا ہُوا تھا جس رات کو چنبیلی نے اُسے جنتے ہُوئے اپنی جان دے دی تھی۔ کِسی کو اُمید نہ تھی کہ یہ بچّہ جان میں رہے گا۔ یعقوب اعوان نے اُسے اپنی بھینس نیلی کی بچھڑی کے ہمراہ نیلی کے دُودھ پہ لگا دیا تھا۔ نیلی کی مامتا نے دو دِن کے اندر اس یتیم بچّے کی زبان کو اپنے تھن پر رکھ لیا تھا۔ جب مہینے بھر کے بعد ہی بچّہ صحن میں کلکاریاں بھرنے لگا تو اُس کا نام زور آور رکھ دیا گیا۔ زور آور نے اپنے نام کی لاج رکھی، ایسا زور آور نِکلا کہ اعجاز کو پیٹھ پہ بٹھائے بٹھائے ایک جست میں دیوار پھلانگ جاتا تھا۔ زور آور کو اعجاز نے اپنے ہاتھوں میں پالا تھا۔ اُسے آتے دیکھ کر اعجاز کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ قریب آیا تو اعجاز نے اُسے اپنے مخصوص انداز میں چمکارا۔ اپنی وحشت میں اُڑتے اُڑتے زور آور نے آواز پہچان لی اور چاروں پاؤں زمین میں گاڑ دیئے۔ اعجاز اُس کی رسّی پکڑ کر بھگت سنگھ کے احاطے میں لے آیا، جہاں لالٹین لٹکی تھی۔ اُس وقت اُس کی نظر زور آور

کے پیٹ پر پڑی۔ بلم کے ایک وار سے پھل پیٹ کے آرپار ہوگیا تھا اور دونوں گھاؤ سے خُون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ زور آور کی ٹانگوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی جو اُس کی ساری جلد پہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اِس کی گردن سر کا بوجھ سہارنے سے عاری ہو چلی تھی اور مُنہ ہر پَل زمین کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اِس طرح گردن لٹکائے زور آور چند منٹ تک کھڑا رہا، پھر اُس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ زمین پہ گرا اور اپنے خُون کے کیچڑ میں پہلو کے بل لیٹ کر بے حرکت ہو گیا۔ صرف اُس کی آنکھوں میں ابھی جان باقی تھی۔ اُس کے پہلو کے زخم سے خُون کا بہاؤ اب کم ہو چلا تھا اور جلد کے سوراخ سے ایک کٹی ہُوئی انتڑی کا سرا نظر آ رہا تھا۔ یعقوب اعوان مُنہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اعجاز اُس وقت تک زور آور کو دیکھتا رہا جب تک کہ اُس کی آنکھوں میں مردنی نہ چھا گئی۔ پھر وہ اُس کا سَر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

بلوائی دروازے تک آ پہنچے تھے۔ ایک دو کے ہاتھ میں جلتی ہُوئی مشعلیں تھیں۔ "بھگت سینہاں،" ایک آواز آئی، "تیرے ساتھ کوئی لڑائی نہیں۔ تو اپنا بھائی ہے۔ مُسلوں کو اپنے حوالے کر دے۔"

اَندر سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ دروازے کو اَندر سے کنڈی لگا دی گئی تھی، اور احاطے کی تینوں دیواروں کے ساتھ بھگت سنگھ، اُس کا بھائی سندر سنگھ اور چچا ارجن سنگھ بندوقیں اُٹھائے پہرے پر کھڑے تھے۔

"ارجنے،" ایک بُڈھے کی آواز آئی، "آپاں تیرے دروازے پر کھڑے نہیں رہیں گے۔ اوانوں کو باہر نکال دے۔"

یعقوب اعوان اپنی بندوق اُٹھا کر دروازے کی جانب دوڑ پڑا۔ بھگت سنگھ نے رستے میں ہی اُسے دبوچ لیا اور اُسے کندھے سے پکڑ کر واپس کھینچ لایا۔ بُڈھے بلوائی کے جواب میں ارجن سنگھ نے دو ہوائی فائر کیے۔ بلوائی پیچھے ہٹ کر ایک حلقے میں زمین پر بیٹھ گئے۔ دارو کا دَور چلنے لگا۔ وقفے وقفے پر کوئی ایک اُٹھ کر آگے بڑھتا، مشعل کو اُٹھا کر واہگرو کا نعرہ لگاتا، پھر واپس جا کر بیٹھ جاتا۔ رات بھر بھگت سنگھ کا ہاتھ یعقوب اعوان کے کندھے سے نہ اُٹھا۔

"تُو جگّو کا یار ہے، یکوُب، اور چاچے جوُب کا بیٹا ہے،" بھگت سنگھ نے اُس سے

کہا" اپنے اُوپر تیرا حق ہے۔ میرے ہاتھ کٹ جائیں گے تو پھر تیرے اُوپر کوئی وار ہو گا۔ بے فکر ہو کر بیٹھا رہ۔"

"جوب اوان کی کیا بات تھی،" ارجن سنگھ نے بات شروع کی۔

"دیر کی بات ہے، جوب اوان نے اَور میں نے واردات کی، مال کھولا۔ میری غلطی سے کھڑکا ہو گیا تو مالک جاگ اُٹھے۔ مگر جوب نے اَور میں نے رل کر انہیں ڈھیر کر دیا۔ مجھے پیٹ میں زخم آ گیا تھا۔ جوب اوان نے ساری رات میری رکھوالی کی اَور سویر ہونے سے پہلے مجھے پیٹھ پہ اُٹھا کر گھر لے گیا۔"

"واردات کدھر کو کی تھی بھاپے،" سندر سنگھ نے پُوچھا۔

"یاد نہیں رہا۔ آٹھ دس کوس کا فاصلہ تھا۔ میں جوب اوان کی پیٹھ پر تھا اَور مال کی رسّی اُس کے دانتوں میں تھی۔ میں نے اُس سے کہا، یہ اڑیل مال ہے جوبے، اُس سے خلاصی کرا، اپنی جان بچا کے چلا چل۔ کہنے لگا، بھائیا، اِس مال کے بدلے تیرا خُون نکلا ہے، اِسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔" ارجن سنگھ ہنسا۔ "کیا زمانہ تھا۔ بانہہ میں زور تھا اَور آنکھ میں شرم ہوتی تھی۔ اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میری تو عقل ماری گئی ہے۔"

رات نکلتی جا رہی تھی اَور مستی میں مدہوش بلوائیوں کا نرغہ ٹُوٹنے کی بجائے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر سکھوں کے اِس کنبے نے آپس میں مشورہ کر کے اعوانوں کو اَندر ہی اَندر سے نکالنے کی سکیم بنائی۔ یعقوب اعوان کا ذہن مُعطّل ہو چُکا تھا۔ اُس نے خاموشی سے بات سُنی اَور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اعجاز نے روانہ ہونے سے پہلے ایک بار زور آور کے مُردہ جسم کے پاس جا کر اُس کی گردن پر پیار کا ہاتھ پھیرا اَور واپس آ گیا۔ زینب اور اُس کا سامان تیار کیا گیا، جو ایک گٹھڑی پر مشتمل تھا، جس میں کچھ کپڑے اَور دو ایک گہنے تھے۔ اعجاز اگرچہ میٹرک کا اِمتحان دے چُکا تھا، مگر اپنے گھر سے چلتے وقت اُس نے گٹھڑی میں دو تین کتابیں ٹھونس لی تھیں۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس صرف ایک سائیکل تھی جسے ساتھ لے جانے پر وہ مصر تھا۔ یہ مختصر سا قافلہ کوٹھوں کوٹھوں پہ چلتا، دیواریں ناپتا، لکڑی کے تختوں کی مدد سے گلیاں عبور کرتا ہوا گاؤں کے اَندر تک جا پہنچا۔ وہاں ایک گلی میں دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ایک کی زین پہ زینب جم کر بیٹھ گئی۔ یعقوب اعوان نے بندوق گلے میں لٹکائی اَور زینب کے پیچھے چڑھ بیٹھا۔ جب تک اُس نے ہاتھ آگے

نکال کر گھوڑے کی لگام نہ پکڑلی اُسے یقین نہ آیا کہ وہ اپنے گاؤں سے جا رہا ہے۔
"تیرا گھر گرا کر اپنے سامنے بنواؤں گا، یکوب اوان،" بھگت سنگھ نے اُس سے کہا،
"دو چار دن کی بات ہے، فکر نہ کر۔ تو اُلٹے پیر آئے گا۔"
اعجاز نے اپنی سائیکل کے اندر بازو ڈال کر اُسے پُشت پر جمایا اَور ایک آدمی کی مدد سے زین پر چڑھ بیٹھا۔
"گھوڑے سریندر سنگھ کے پاس چھوڑ دینا،" بھگت سنگھ نے کہا، "اس سے کہنا ان کو دانہ پٹھا ڈال دے۔ اَور ہاں، کہنا کہ اُس کے ساتھ اُوپر کوئی واردات ہو تو خبر کر دے۔ چل اب جا،" اُس نے گھوڑے کو تھپکی دی، "چل جوانا، واگرو کی فتح۔"
دن چڑھنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ اعوانوں کا کنبہ اپنے گاؤں کی حدود سے نِکل گیا۔ سُورج ایک ہاتھ اُوپر آچکا تھا جب وہ زینب کے باپ کے گھر پہنچے۔ دِن بھر زینب اپنے حمل کو سنبھالتی پھری، جو قابو سے باہر ہوا جاتا تھا۔ اُس کے بدن کی بوٹی بوٹی پر مَوت کی کیفیت طاری تھی۔ ڈھڈّی والے کی دائی اُس کے پاس بیٹھی رہی۔ شام کے وَقت اس کی حالت غیر ہو گئی۔ چار کوس دُور نُورپور کا قصبہ تھا جہاں کی ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر موجُود تھا۔ جب تک زینب کا بھائی اپنے ریڑے پر ڈاکٹر کو لے کر آیا، زینب ایک بیٹے کو جنم دے چکی تھی۔ بچّہ تندرست حالت میں تھا، مگر زچہ کی حالت نہ سنبھلی۔ گھر بھر کی نئی پُرانی چادریں بھیگ گئیں اَور اس کا خُون پھر بھی نہ تھما۔ ڈاکٹر نے خُون بند کرنے کی سعی کی، ٹیکہ لگایا، دوائیاں دیں، مگر زینب کی طاقت زائل ہو چکی تھی۔ اپنے خاوند کا گھر چھوڑنے کے بتیس گھنٹے کے بعد، بیہوشی کی حالت میں، زینب کے بدن سے اس کی زِندگی کی آخری سانس خارج ہو گئی۔
یعقوب اعوان کے مُعطّل دماغ کو دِل کی ہلچل کی مدہم سی خبر ہوئی، جیسے دُور کوئی دیا ٹمٹاتا ہو۔ کوئی آدھ گھنٹہ سکوت میں رہنے کے بعد وہ یکایک اُٹھا۔ بازُو لہراتے اَور مُنہ سے جھاگ اُڑاتے ہُوئے اُس نے چیخ چیخ کر زینب کے سوگوار خاندان کو کمرے سے باہر نکال دیا، اَور دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگالی۔ پھر وہ آکر زینب کے بے جان جِسم کے ساتھ لپٹ گیا۔ چارپائی پر بچھا ہوا کھیس زینب کے خُون، پسینے اَور فضلے کی آلایش سے گیلا ہو رہا تھا۔ مگر یعقوب اعوان کی نظریں صرف زینب پہ لگی تھیں۔ وہ اس مُردہ جِسم کو

اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کے حلقے میں لئے دیر تک اُسے ہلکورے دیتا رہا، جیسے اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ اُسے اپنے ساتھ لگائے لگائے سو گیا، گویا روزمرہ کی بات ہو۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ وہ نعش کو سینے سے چمٹائے چارپائی پر لیٹا رہا۔ جب دروازہ ٹوٹنے کے قریب پہنچا تو اس نے اُٹھ کر کنڈی اُتاری۔ باہر گاؤں کا گاؤں اُمڈ آیا تھا۔ یعقوب اعوان ہلکے پیروں چلتا ہجوم کے بیچ سے گزر کر صحن میں آ بیٹھا۔
اگست کی صبح کا سُورج اس کی جلد کو جلا رہا تھا۔ اس حدت میں اس کا ابلتا ہوا ذہن ایک نقطے پہ مرکوز تھا۔ آج زندگی کے اختتام پر بھی، ان بوڑھی نیم وا آنکھوں میں، زینب کے صرف دو رُخ قائم تھے۔ ایک اندھیری رات میں اُس کے فرار کا منظر، اور پھر سالوں بعد اپنے باپ کے گھر میں چارپائی پہ پڑا وہ تیکھے نقوش والا زرد رُو چہرہ جو اس بجھتے ہُوئے دماغ کے دُھندلکے میں ایک ستارے کی مانند چمک رہا تھا۔ عُمر بھر کے اختلاط کے بعد یعقوب اعوان کو صرف وہ رات یاد رہی تھی جب وہ اُس بے دخل جسم کو اپنے ہاتھ پاؤں کی آغوش میں لئے اُس میں اپنی جان کا کوئی حصّہ ڈالنے کی سعی کرتا رہا تھا۔

اب اُس کے آگے نیم اندھیرے کا لمحہ لوٹ کے آیا جس کے اندر مُتعدّد سال فراٹے بھرتے ہُوئے گزر رہے تھے۔ نومولود بچّے کو زینب کی چھوٹی بہن اپنے پاس لے گئی۔ اُس کی پیدائش کے اگلے روز مُلک کا بٹوارہ تکمیل کو پہنچا۔ یعقوب اعوان کے دِل میں محبّت کا جذبہ زوال پا گیا تھا، گو قربانی کا جذبہ برقرار رہا۔ سرفراز کو وہ ایسی شفقت نہ دے سکا جیسی اعجاز کو دی تھی، مگر اس کی پرورش اُس نے بڑے دھیان سے کی۔ جب سرفراز تین سال کا ہوا تو یعقوب اعوان اُسے اپنے پاس لے آیا اور اپنے ہاتھوں میں اسے پالنے لگا۔ بٹوارے کے تین ہی ماہ کے بعد جب اُس کے دِل میں یقین ہو گیا کہ بیس میل دُور اس کا آبائی گاؤں ایک دُوسرا مُلک تھا جہاں اس کا واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا، یعقوب اعوان نے قدم جمانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔ چھ ماہ کے اندر اُسے نُورپور کے قریب موضع شجاع آباد میں ساڑھے بارہ ایکڑ زمین اور ایک ٹُوٹا پھوٹا گھر الاٹ ہو گیا تھا۔ اُس کی چھاتی پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی۔ زمین اُس نے ٹھیکے پر دے دی۔ مگر ایک سال کے بعد ہی جب اعجاز نے شہر کے کالج میں داخلہ لینے کی ضد کی تو آدھی زمین رہن رکھ کر اخراجات پُورے کرنے پڑے۔ اگلا سال گزرنے پر یعقوب اعوان نے اپنے تین سالہ بیٹے

سرفراز کو اپنے گھر لے کر آنے کی ضد کی۔ اب وہ اُور اعجاز مِل جل کر اپنی روٹی ہانڈی کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ پھر اس سے اگلے سال، جب اعجاز نے ایف۔ اے پاس کر لیا، تو اس کی ضد کے باوجُود یعقوب اعوان نے باقی کی آدھی زمین بھی رہن کر کے اعجاز کی شادی اس کی ماسی کی بیٹی سکینہ سے کر دی۔ اب اُن کا گھر بس گیا تھا مگر آمدنی بند ہو گئی تھی۔ اعجاز اپنے گاؤں کے پرائمری سکُول میں ماسٹر ہو گیا۔ سکُول دو سال کے اندر مڈل کے درجے تک بڑھا دیا گیا اُور اعجاز اُونچی جماعتوں کو پڑھانے لگ گیا۔ اب اس کی تنخواہ سے گزارے کے علاوہ بچت بھی ہونے لگی تھی۔ مگر سرفراز، جو اُسی سکُول میں داخل ہو چکا تھا، ابھی تیسری جماعت میں تھا کہ یعقوب اعوان کی چھاتی بیٹھ گئی، گویا اِس برسوں کی شکستہ عمارت کی چھت بالآخر منہدم ہو گئی ہو۔

اب جان کنی کا آخری لمحہ آ پہنچا تھا۔ اس لمحے میں اب یعقوب اعوان کی آنکھوں میں نہ زینب رہی تھی نہ اعجاز اُور نہ سرفراز۔ اب اس کی نظروں کے سامنے صرف اپنے گاؤں کبیر سنگھ والا کا جنوبی منظر رہ گیا تھا، جو اس نے چار سال پہلے آخری بار رات کے اندھیرے میں دیکھا تھا۔

یعقوب اعوان کسی کام کے سلسلے میں ضلع کچہری سے واپس آ رہا تھا کہ رستے میں اُسے سکھوں کا ایک چھوٹا سا گروہ دکھائی دیا جو سڑک کے کنارے رُک کر ایک ہوٹل سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ یعقوب اعوان بے اختیار ان کی جانب کھنچا گیا۔ ہوٹل کے باہر نصب شدہ ٹونٹی سے اُس نے پانی کا گھونٹ پیا اُور فارغ ہو کر سکھوں کے اردگرد منڈلانے لگا۔ پھر کسی بہانے اس نے اِن سے بات چیت شروع کر دی۔ یہ جتھہ مذہبی مقامات کی زیارت کے لئے پاکستان آیا تھا۔ یعقوب اعوان ان کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا۔

"کبیرے کا خشونت سنگھ میری تائی کا رشتے دار ہے،" ایک سکھ یعقوب اعوان کی بات سُن کر بولا۔

"آپ کی بڑی مہربانی اگر آپ ایک پیغام کبیرے کے بھگت سنگھ تک پہنچا دیں۔"

"ضرور جی ضرور مہاراج، کوئی خدمت بتائیں۔"

"اُس سے کہیں کہ ہاتھ پڑے تو آ کر مِل جائے۔ وقت کا کیا پتا ہے۔"

"بالکل دُرست کہا۔ وقت کا کسے پتا ہوتا ہے۔ بس جاتے ہی سندیسہ بھجوا دونگا۔"

آپ فکر نہ کریں۔"

"آپ کی بڑی کرپا بھائی جی۔"

تین مہینے نکل گئے۔ یعقوب اعوان اس بات کو بھول چکا تھا کہ ایک روز آدھی رات کے وقت اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ گھر سے باہر آنے پر اس کا سامنا دو آدمیوں سے ہوا جو مُنہ اور سَر کالی چادروں میں لپیٹے تاریکی میں کھڑے تھے۔

"یگوب اوان؟" ایک نے سوال کیا۔

یعقوب اعوان کو محسوس ہوا کہ یہ آواز اور یہ لہجہ اگر وہ ہزار آدمیوں کے شور میں بھی سنتا تو پہچان جاتا۔

"بھائیا بھگت سنگھ۔" وہ چلا کر بولا۔

"ش ش ---- چُپ کر، کٹوانے کی صلاح ہے؟ چل اندر۔"

بھگت سنگھ کے ہمراہ اُس کا ایک چاکر بلونت سنگھ تھا۔ "بلونتا ادھر سے ہی گیا ہوا ہے، تیرے جانے کے بعد آیا تھا۔" پھر وہ بلونت سنگھ سے بولا "یگوب اپنے جگّو کا یار تھا۔"

یعقوب اعوان کو بھگت سنگھ کے بیاہ کا دِن یاد آیا جب بھگت سنگھ دولہا بنا گھوڑی پہ سوار کسی ریاست کا راج کمار معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کی داڑھی مونچھ کے بال سفید اور بدن فربہ ہو چکا تھا۔

"زینب کدھر ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"وہ تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔" یعقوب اعوان نے بتایا۔

"چل پر ماتما کو ایسا ہی منظور تھا۔ کس کا زور چلتا ہے، سب کا چل چلاؤ ہے۔ یاد ہے جس رات کو تو زینب کو اٹھا کے لایا تھا؟ صبح سویرے جب اُس کے وارث پیچھے آئے تو سارا دِن ہم ان کے پیر پکڑتے رہے تھے۔ مزے تُو نے کئے اور پیر ہم نے پکڑے، ہیں؟" وہ یعقوب اعوان کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ یعقوب اعوان کو کھانسی کا دورہ اٹھا۔

"تیرا سینہ ابھی نکارہ ہی ہے؟"

یعقوب اعوان نے کھانستے ہوئے اثبات میں سَر ہلایا۔ جب اُس کی کھانسی رُکی تو وہ مسکرا دیا۔ کئی سال کے بعد زینب کی یاد نے پَل کے پَل کو اُس کے دِل میں خُون کی

یورش پیدا کی تھی۔

"اجاز کہاں ہے؟" بھگت سنگھ نے پُوچھا۔

"اپنی بی بی کو لے کر ماسی کو ملنے گیا ہے، اُگلے گاؤں میں۔ سکُول میں ماسٹر ہو گیا ہے۔ اُس کا بیاہ بھی کر دیا ہے۔"

بھگت سنگھ نے چارپائی پہ سوئے ہُوئے چار سالہ سرفراز کی جانب اشارہ کر کے پُوچھا "اجاز کا ہے؟"

"میرا ہے۔ جِس رات کو ہم کیبرے سے آئے اسی رات کو پیدا ہُوا تھا۔ زینب نے اس کی شکل نہیں دیکھی، نہ اِس نے ماں کی دیکھی۔"

"کِسی کا زور نہیں بھائیا۔ کِسی کا زور نہیں۔"

رات کے پچھلے پہر تک وہ تینوں بیٹھے دُودھ کے پیالوں کے ساتھ دِن کی بچی ہُوئی روٹیاں کھاتے اَور باتیں کرتے رہے۔ بھگت سنگھ نے بتایا کہ اس کا باپ اَور چچے جسونت سنگھ اَور ارجن سنگھ تینوں فوت ہو چکے ہیں۔ "کِسی کا زور نہیں بھائیا، کِسی کا زور نہیں،" یعقوب اعوان نے بار بار دُہرا کر کہا۔ "یہ بتا بھائیا، میرے گھر کا پتہ کیسے نکالا؟"

"یہ سب بلونتے کا کھیل ہے۔ اِس سارے علاقے کو جانتا ہے۔ دو دِن میں اس نے کھوج لگا لیا۔ آنے جانے کا بھی کوئی معاملہ نہیں یکُوب،" بھگت سنگھ نے کہا۔ "ہم تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ جسوندر کی ماں ڈُھڈّی والے میں گہنا دبا گئی تھی، چوتھے دِن میں نکال کے لے گیا۔ باڈر پر پہرہ ہے، پر سارے رستے تو حکُومت والے بند نہیں کر سکتے۔ آنے جانے کا کوئی معاملہ نہیں۔"

دن نکلنے میں دو گھنٹے رہتے تھے کہ بھگت سنگھ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا باہر صحن میں نِکل کر یعقوب اعوان نے اُس سے کہا۔ "میرا دِل کرتا ہے بھائیا کہ کبھی جا کر ایک نظر کیبرا دیکھ آؤں۔ وَقت کا کیا پتا ہے۔"

"ابھی چلا چل یکُوب، دیر کِس بات کی ہے؟"

یعقوب اعوان لحظہ بھر سوچ کر بولا، "پھر ایک بات مان، بھائیا۔"

"بول۔"

"آج کا دِن رُک جا، کل اجاز آ جائے گا۔ بچّے کو اُس کے حوالے کر کے رات کو

تیرے ساتھ چلا چلوں گا۔"

"بھگت سنگھ نے بلونت سنگھ کی جانب دیکھا۔ "تیرے چک میں ہمارا اور کوئی واقف کار نہیں۔ حالات کی خبر نہیں ہوتی۔"

"کوئی فکر فاقہ نہیں بھائیا' سب میرے اُوپر چھوڑ دے،" یعقوب اعوان خُوش ہو کر بولا۔ "بس یہ دعا کر گاؤں میں کوئی واردات نہ ہو۔ پُلس آ کر چار چار دن بیٹھ جاتی ہے۔"

"کیوں بلونتے،" بھگت سنگھ نے پُوچھا' "کیا خیال ہے؟"

"جیسے مالک کی مرضی،" بلونت سنگھ نے کہا۔

"اِدھر چارپائیاں تیار ہیں' آرام سے دونوں سو جاؤ،" یعقوب اعوان نے کہا۔ "دِن گزُرنے کا پتا نہیں چلے گا' نہ کوئی دیکھے گا نہ بھالے گا۔ دوپہر تک اعجاز بھی آ جائے گا۔"

یعقوب اعوان نے جلدی سے گھی اَور شکر ملا کر باجرے کا آٹا گوندھا اَور روٹیاں پکائیں۔ پھر اُس نے چائے بنائی۔ تینوں نے مِل کر اُن کا ناشتہ کیا۔ پھر یعقوب اعوان نے نئے کھیس نکال کر چارپائیوں پہ بچھا دیئے۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہُوئے سو گئے۔ یعقوب اعوان نے سرفراز کو سبق پڑھنے کے لئے مسجد جانے اَور گھر سے باہر قدم رکھنے سے منع کر دیا۔ بچّہ دِن بھر اپنی چارپائی پہ بیٹھا مہمانوں کی پگڑیوں' اُن کے کیسوں اَور داڑھی سوچھوں کے بالوں کو دیکھتا رہا۔ دوپہر کے وَقت اعجاز بھی پہنچ گیا۔ وہ سکینہ کو دو دِن کے واسطے اِس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ باپ بیٹے نے مِل کر دو مرغیاں ذبح کیں۔ اعجاز تنور سے روٹیاں لے آیا۔ سُورج غروب ہونے میں کچھ وَقت تھا جب بھگت سنگھ اُٹھ بیٹھا۔ بلونت سنگھ گہری نیند سو رہا تھا۔ بھگت سنگھ نے پیر مار کے اُسے اُٹھایا۔ سرفراز سمیت سب نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

"ایک بات کا مُجھے خیال آیا ہے یکُوب اوان،" بھگت سنگھ نے کہا' "بیس کوس کا رستہ ہے۔ چلا چلے گا؟"

"کیوں نہیں،" یعقوب اعوان نے جواب دیا۔ "عمُر چلتے چلتے گزُری ہے۔ میرے سینے میں کمزوری ہے' پر ٹانگوں نے مُجھے کبھی جواب نہیں دیا۔"

"بیریل پہنچ کر ولدار سنگھ سے گھوڑے لے لیں گے،" بھگت سنگھ نے کہا۔

"ابا، چاچے احمد سے گھوڑے لے آؤں؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"مروانے کی صلاح ہے، ماسٹر صاحب؟ عقل کی بات کرو۔ باڈر تک تو چھپ چھپا کر جانا ہے۔ گھوڑوں کا کام نہیں، پیروں کا ہے،" بھگت سنگھ اپنے پاؤں ٹھونک کر بولا۔

"بیریل سے آگے گھوڑے کیسے جائیں گے؟" اعجاز نے سوال کیا۔

"اُس طرف کوئی نہیں پُوچھتا، کسی کو کیا پتا تیرا ابا ہندو ہے، مسلا ہے کہ عیسائی ہے۔ ہمارے تو گُرو نے کیس اور داڑھیاں گلے میں لٹکا دی ہیں، دُور سے دیکھ کر ہی پہچانے جاتے ہیں۔"

"کوئی فِکر فاقہ نہیں بھائیا،" یعقوب اعوان نے کہا "ساری رات چلنا پڑے تو پیر جواب نہیں دیں گے۔"

"کالا نمک ہے؟" بھگت سنگھ نے پُوچھا۔

"نہیں۔"

"اجاز، جاؤ کلن سے کالا نمک لے آ۔"

اعجاز کالا نمک لے کر آیا تو بھگت سنگھ نے چکھ کر دیکھا۔ "ٹھیک ہے،" وہ بولا، اور پُڑیا یعقوب اعوان کے ہاتھ میں دے دی۔ "کھانسی آئے تو چٹکی بھر زبان پر رکھ لینا۔ تیرے سینے کا دورہ ہمیں جیل خانے نہ پہنچادے۔"

تاریکی میں ہلکے ہلکے پُھرتیلے قدم دھرتے ہوئے، آبادیوں سے کترا کر نکلتے، ندی نالوں سے بچتے بچاتے ہُوئے تین بے آواز سائے جب بیریل پہنچے تو پھر یعقوب اعوان کو علم ہوا کہ انُھوں نے سرحد پار کر لی ہے۔ وہاں پر انُھوں نے ولدار سنگھ کے گھر سے دُودھ کے پیالے پیئے اَور اُس کے گھوڑوں پہ سوار ہو کر چل پڑے۔

یعقوب اعوان کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے کیر سنگھ والا قریب آتا جا رہا تھا، اُس کا دِل بدلتا جا رہا تھا۔ اس کے ارادے ڈھیلے اَور ہاتھ باگ پہ کستے جا رہے تھے۔ کئی بار وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا۔

"کیا بات ہے یکوب،" بھگت سنگھ نے پُوچھا، "جانور اڑیل ہے؟"

"نہیں بھائیا،" وہ ہولے سے بولا۔

یعقوب اعوان ایک مخمصے میں اُلجھ گیا تھا۔ اُس کا آدھا جی آگے بڑھنے کو اور آدھا پیچھے لَوٹ جانے کو کر رہا تھا۔ اُسے اپنے احساس کی مرضی پہ اعتبار نہ رہا تھا اَور اپنی چاہ کی کوئی خبر نہ مِل رہی تھی۔ جب وہ گاؤں کے سامنے پہنچ گئے تو اُس نے بھگت سنگھ سے کہا۔

"بھائیا! تو ڈیرے پر چلا جا۔ میں ذرا اُس طرف سے پھیرا لگا کر آتا ہوں۔"

"چل میں بھی چلتا ہو،" بھگت سنگھ نے کہا۔

"نہیں تُو جا، میں ابھی آجاتا ہوں۔"

"یکّوب، تُو میری حفاظت میں ہے۔ میرا دِل ہے کہ تو لوگوں کو میرے ڈیرے پر چل کر ملے۔ تیرے سامنے اُن کو شرمسار کروں۔"

"فکر نہ کر بھائیا، آواز نہیں نکالوں گا، بس اِدھر جنوب کی طرف ایک چکّر کاٹ کر آجاؤں گا۔"

اس جنوبی راستے سے یعقوب اعوان اَور اس کا کنبہ گاؤں چھوڑ کر گیا تھا۔ اور یہی گاؤں کا وہ رُخ تھا جس کی جانب اُس کے کھیت تھے اَور جس راستے کو پچاس برس کی عُمر تک اُس نے ہر روز اپنے قدموں سے ماپا تھا۔ اب یہ ایک اجنبی راستہ تھا۔ اپنی عُمر میں وہ اُس کے ایک ایک گڑھے، ایک ایک پتھر اَور ایک ایک موڑ سے واقف تھا، یوں کہ آنکھیں بند کر کے آ اور جا سکتا تھا۔ اب پتھر اپنی جگہ سے ہِل گئے تھے اَور سارے اُتار چڑھاؤ تبدیل ہو چکے تھے۔ قدم قدم پر ٹھوکر کا سامان تھا۔ یعقوب اعوان ایک بار گھوڑے پر سوار اَور دُوسری بار پیدل چل کر گاؤں کی حد تک گیا اَور واپس آیا تھا، مگر اُسے پتا نہ چل سکا کہ یہ اس کی بُھول تھی یا محض وہم، یا کہ حقیقت میں راستہ اپنے رُخ بدل چکا تھا۔ اُس کے کھیت البتہ اپنی جگہ پر موجُود تھے۔ ایک کھیت میں گنّے کی فصل کھڑی تھی، ایک میں مکی تھی۔ سبزیوں کے کھیت میں گوبھی، شلغم اَور مونگرے تیار تھے۔ کچھ رقبے میں کپاس کھڑی تھی۔ ایک علاقہ گیہوں کی بیائی کے لئے خالی پڑا تھا۔ یعقوب اعوان نے ایک گنّے کے پودے پر نرمی سے ہاتھ پیرا۔ گنّے کے خُشک پتّے کی دھار سے اُس کی اُنگلی پر ہلکا سا چیر آگیا۔ وہ اُنگلی مُنہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔ مگر چیر سے خُون نہ نِکلا تھا۔ برسوں کے کھردرے ہاتھوں پر چنڈیاں بنی تھیں جن میں خُون کی رمق نہ تھی۔ اُس نے اُنگلی مُنہ سے نکال کر کُرتے سے پونچھ لی۔ اُسے اپنی زمین کی خصلت یاد آئی۔ اس کا گنا گاؤں بھر میں سب سے

رس دار ہوا کرتا تھا۔ دُوسروں کے کماد کے مقابلے میں اس کا کماد مرلے میں ڈیڑھ گنا زیادہ گڑ دیتا تھا۔ بدلے میں جو زمین شجاع آباد میں اُسے ملی تھی وہ گزارا کرتی تھی مگر کبیرے کی زمین جیسی لائق نہ تھی۔ کھیتوں کے کنارے کنارے قدم رکھتا ہوا وہ مکی کے کھیت تک پہنچا۔ یعقوب اعوان کی مکی کا چھونے سے چھوٹا بھٹہ، اُس نے یاد کیا، ایک ہاتھ لمبا ہوتا تھا، اور پوہ کے آخر تک، جب دُوسروں کی مکی پک کر سُرخ ہو چکی ہوتی تھی، اُس کے بھٹے کے سفید دانوں سے دُودھ نکلا کرتا تھا۔ سردیوں کی دعوتوں میں دُوسرے کسان اور زمیندار اس سے بھٹے مانگ کر لے جاتے تھے، جنہیں وہ دُودھ میں اُبال کر مہمانوں کو پیش کرتے تھے۔ اعوانوں کی زمین کا "شیریں بھٹہ" علاقے میں مشہور تھا "تیری چھلی پہ انگور لگتے ہیں، یکوب اوان،" لوگ کہا کرتے تھے، "تیری زمین میں شکر ہے۔" وہ ہاتھ بڑھا کر ایک بھٹے کے ریشم جیسے پتوں کو سہلانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک بھٹے کو چھیل کر دیکھے کہ اس کی خاصیت وَیسی کی وَیسی تھی یا کہ کھیت میں پڑنے والے رستے کی مانند بدل چکی تھی۔ اُس نے زبان پہ اپنی مکی کے دُودھ کے مزے کو محسوس کیا جس میں تالو کو بھانے والی ہلکی سی مٹھاس اَور کنوؤں کے گہرے پانیوں کی سی حلاوت تھی۔ اشتہاء کے غدوددوں سے لعاب بہہ کر اُس کے دانتوں میں بھرنے لگا۔ مگر بھٹہ توڑنے سے پہلے اُس کے دِل کو ایک انجانے وسوسے نے گھیر لیا اَور وہ مڑ کر وہاں سے لَوٹ آیا۔ کیکر کی ٹہنی سے اُس نے گھوڑے کی باگ کھولی اَور سوار ہو کر اُسے قدم قدم چلانے لگا۔ کچھ دُور جا کر اُسے بھگت سنگھ کا ڈیرہ نظر آیا۔ وہ ڈیرے کی دیوار کے قریب پہنچا تو بلا ارادہ اِس کے ہاتھوں نے باگ کھینچ لی۔ ڈیرہ گلی کے کونے پہ تھا، اَور دروازے تک پہنچنے کے لئے اُسے کونے کا موڑ مڑنا تھا۔ اُس دروازے کچھ فاصلے پر یعقوب اعوان کا پُرانا گھر نظر آتا تھا۔ گھوڑا موڑ سے پہلے کھڑا تھا اَور اس پہ سوار یعقوب اعوان کا دِل پھڑک رہا تھا۔ آخر اُس نے جی چھوڑ دیا۔ اُس نے گھوڑے کا رُخ پیچھے کو موڑا اَور اُسی سُست چال سے قدم قدم چلاتا واپسی کے رستے پر ہو لیا۔ صرف ایک بار کھیتوں کے پاس رُک کر اُس نے اپنے پیچھے گاؤں پہ نگاہ ڈالی، جس کی مٹیالی دیواریں اندھیرے میں جھلملا رہی تھیں۔

جسم کا لہو اب ایڑیوں سے لے کر ٹھوڑی تک خشک ہو چکا تھا اَور آنکھیں اُس آخری منظر کو لئے لئے ٹھہر گئی تھیں۔ ایک اَور ساعت گزری تو وہ آنکھیں پتھر بن گئیں۔

پانچ ساعتوں کے اندر زندگی تصویروں کی صورت گزر کر معدوم ہو گئی۔ یعقوب اعوان کو رونے والوں میں اعجاز تھا اور اُس کی ماسی۔ اعجاز کی بیوی سکینہ مرنے والے کی طویل اذیت سے تھک ہار کر رو رہی تھی، اور بچہ ماسی کی موٹی موٹی چھاتیوں کے دباؤ اور اُس کے آنسوؤں سے گھبرا کر سسک پڑا تھا۔ جب اعجاز نے اپنے آٹھ سالہ بھائی کو اُٹھا کر کندھے سے لگایا تو وہ خود بھی رو رہا تھا۔ بچے کا رونا نہ تھما تو اعجاز نے اپنے آنسو خشک کیے اور اُسے اٹھائے ہوئے باہر صحن میں نکل آیا۔

"چُپ، سرفراز، ش ش،" وہ پیار سے بچے کی پُشت پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، "چُپ کر جاؤ۔ چُپ۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، کوئی بات ہی نہیں۔ چُپ۔ سو جاؤ۔ اب سو وو جاؤ وو و ------"

اعجاز صحن میں رُک کر کھڑا کھڑا دائیں اور بائیں ہلنے اور ناک میں گنگنانے لگا۔ اُسے کوئی لوری نہ آتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح سرفراز کو ہلکورے دیتا، اس کی پُشت پر ہاتھ پھیرتا اور ایک غیر یقینی سی دُھن گنگناتا رہا سرفراز کی کسمساہٹ بند نہ ہوئی تھی، گو سسکیاں رُک چکی تھیں۔

"اب سو جاؤ۔ شاباش،" اعجاز اُس سے متواتر باتیں کر رہا تھا۔ "تم تو اب بڑے ہو گئے ہو۔ کل تم آٹھ سال کے ہو گئے تھے۔ کل میں نے مٹھائی لے کر دی تھی نا؟ تم اب جوان ہو گئے ہو۔ آج پاکستان کی سالگرہ بھی ہے۔ پاکستان بھی آج آٹھ سال کا ہو گیا ہے تم پاکستان سے بڑے ہو۔ تمھیں پتا ہے، تم پاکستان سے پُورا ایک دن بڑے ہو، دیکھا؟ بڑے آدمی نہیں رویا کرتے۔ چلو اب سو جاؤ۔ شاباش۔"

اعجاز کو اور کچھ نہ سُوجھا تو قومی ترانہ گنگنانے لگا۔ یہ سرفراز کو بھی زبانی یاد تھا۔ ہر روز صبح سویرے، سکول لگنے سے پہلے، ساری جماعتیں میدان میں جمع ہو کر، اور اگر بارش ہو تو سکول کے برآمدوں میں، سارے ماسٹروں سمیت، سب مل کر قومی ترانہ گایا کرتے تھے، اور سرفراز اکثر اسے گھر پہ بھی گاتا رہتا تھا۔

"پاک سَر زمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد---"

ان جانے پہچانے الفاظ اور مانوس دُھن کو سُن کر سرفراز کے دِل کو چین آنے لگا
وہ اِن الفاظ اور اس دھن کو، جو سکُول کے ہر کسی سبق سے زیادہ اس کی یاد کا حصّہ تھے،
دِل ہی دِل میں اعجاز کی آواز کے ساتھ ساتھ دُہرانے لگا۔

"پاک سَر زمین کا نظام قُوّتِ اُخوتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت پائندہ، تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد ----

اُسے اعجاز کے الفاظ، "تُم پاکستان سے بڑے ہو" باربار یاد آرہے تھے۔ جب
تک اعجاز، اُسے کندھے سے لگائے لگائے، آخری الفاظ "سایۂ خُدائے ذوالجلال" تک پہنچا
سرفراز کو دِل میں یقین آچکا تھا کہ چونکہ وہ پاکستان سے پُورا ایک دِن بڑا ہے، اِس لئے یہ
ترانہ اب اُس کی ملکیت ہے۔ اپنے چھوٹے سے ذہن میں اِس خیال کے آتے ہی سرفراز
نے محسوس کیا کہ جیسے اُس کے ہاتھ میں کوئی قیمتی مال آگیا ہو۔ اُس کا دِل اب ٹھہر چکا تھا۔

حصّہ دوم

باب 3

پت جھڑ کا موسم تھا۔ شیشم، نیم اُور بکائن کے پتے دِن بدِن پیلے ہو کر گرتے جا رہے تھے اُور موسمی بگولے اُنہیں اُڑاتے پھرتے تھے۔ دُھوپ کا زور ٹُوٹ چُکا تھا اُور ہوا میں جاڑوں کا بدلتا ہوا رنگ تھا۔ کپاس کی فصل تقریباً چُنی جا چکی تھی اُور اس کی ٹہنیوں کے ڈھینگر اُٹھا لئے گئے تھے۔ اس منچھٹی سے اب کِسان حقّے کی چلموں کے لئے آگ بناتے تھے۔ جب کہ اس کا ایک حِصّہ کھلیانوں میں ذخیرہ کر لیا گیا تھا، تاکہ سردیوں کی بارش میں گیلے بالن کے ساتھ چولہوں میں جلانے کے کام آئے۔ اس سے فارغ شدہ کھیت اب گیہوں کی بیائی کے لئے تیار کئے جا رہے تھے۔ خُشک مٹّی کو پانی سے گہرا نم کر کے دُھوپ اُور ہوا میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ اس کی رگوں میں نئی توانائی پیدا ہو، اُور جب ہل چلے تو زمین کے لب تازہ بیج کو وصول کرنے کے لئے وا ہو جائیں۔ وتر کے انتظار میں کِسانوں کو چند روز کی مہلت مِل گئی تھی، جس کو وہ روئی منڈی میں لیجانے، مقدموں کی پیشیاں بھگتنے، چھوٹے موٹے جھگڑے چُکانے، شادی بیاہ کے میلوں ٹھیلوں اُور دُنیا کے دیگر کاموں میں صرف کر رہے تھے۔ جو لوگ ان مصروفیات سے فارغ ہو چُکے تھے وہ کھیتوں کا ایک چکّر لگانے اُور مویشیوں کی دیکھ بھال کے بعد رات گئے تک ایک دُوسرے کے ڈیروں پہ بیٹھے حقّے گُڑگُڑاتے اُور باتیں کرتے رہتے تھے۔ سن انیس سو سینتالیس کا سال تھا اُور یعقوب اعوان ابھی اپنی بیوی کے بھائی عمُر دراز کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ موضع ڈھڈی والا تھا جہاں زیادہ تر راجپوت قوم کے لوگ آباد تھے۔ اتفاق سے یہ یعقوب اعوان اُور بھگت سنگھ دونوں کا سُسرالی گاؤں تھا، گو سِکھوں کے کنبے اب یہاں سے کُوچ کر کے جا چُکے تھے۔ عمُر دراز کی بہن اُور یعقوب اعوان کی سالی، جو اپنی بہن کی فوتیدگی کے بعد اس کا نومولُود بچّہ پالنے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی تھی، اپنے خاوند احمد خان کے گھر ساتھ والے گاؤں موضع چک مرور جو عرفِ عام میں چک بیاسی (82) کہلاتا تھا میں رہتی تھی، جو بیشتر راجپوتوں کی ہی آبادی تھی۔ اعوانوں کا ایک قریبی گاؤں شجاع آباد تھا اُور دُوسرا جہان آباد، جو کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ گو اِتنا دُور نہ تھا کہ پیدل چل کر نہ جایا جا سکے۔ نُورپور اس علاقے کا بڑا

قصبہ تھا جہاں ڈِسپنسری، بڑا تھانہ، ڈاک خانہ اَور نائب تحصیلدار کی کچہری واقع تھی۔ اِنتظامی اُمور کی رو سے یہ علاقہ تحصیل لاہور کا حِصّہ تھا۔

یعقوب اعوان کی آمد کے بعد جو سب سے پہلی تبدیلی رونما ہُوئی وہ اُس کے نام سے اعوان کا لفظ حذف کیا جانا تھی۔ یہاں سب لوگ نام کے ساتھ اپنی قوم کا لفظ کبھی کبھار، صرف لکھنے پڑھنے کی حد تک یا پھر تکلّف کے طور پر استعمال کرتے تھے، عام تخاطب اَور گفتگو میں محض نام ہی بلُایا جاتا تھا۔ پہلے پہل جب یعقوب اعوان کو خالی اُس کے نام سے مخاطب کیا گیا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ننگا ہو گیا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ اعجاز کی اعوان کہلانے کی عادت اِتنی پکّی نہ بنی تھی۔ اُسے اِس تبدیلی کا احساس ہی نہ ہُوا۔

ایک شام کو عمُر دراز کے احاطے میں حُقّہ گرم تھا اَور شجاع آباد سے تین آدمی ایک تجویز لے کر آئے ہُوئے تھے۔

"یکُوب،" شیر بہادر مخاطب ہُوا، "تو اس گاؤں کا داماد ہے۔ ہماری بیٹی تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔ مگر خُدا کا شکُر ہے کہ تو سکھوں کے گڑھ سے جان بچا کر نِکل آیا۔ تیرے بچّے تیرے پاس رہ گئے ہیں۔ ایک تو بچارا مہاڑ ہے، مقدر میں زندگی لکھی ہے تو بچ جائے گا۔ اب تو جو دو چار کِلّے الاٹ کرانے کے لئے جُوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے تو کون تجھے سیانا کہے؟"

جس دِن یعقوب اعوان زینب کے مُردہ جسم کو چھوڑ کر چارپائی سے اُٹھا اَور باہر صحن میں جا کر بیٹھ گیا تھا، اُس دِن سے اس کا ذہن رُک چُکا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی فرق آ گیا تھا۔ بینائی گو متاثر نہ ہوئی تھی، مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ نظر ٹھہر گئی ہے۔ وہ جب مُنہ اُٹھا کر بات کرتا تو نہ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر ہوتا اَور نہ آنکھوں میں پہچان، ایسا لگتا جیسے سِینے سے اُوپر اُوپر کی بات کر رہا ہو۔

"میری ساڑھے بارہ کِلّے زمین ہے۔" یعقوب اعوان نے کہا۔

"اوے بے عقلے، ہے کہاں؟ وہ تو اُدھر رہ گئی۔ اب واپس جانے آنے کی بات چھوڑ۔ ادھر بے انت زمین خالی پڑی ہے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر قبضہ کر رہے ہیں اب تُو اپنی قوم میں آ گیا ہے۔ ادھر اوانوں میں اتفاق ہے۔ تیرا لڑکا اللہ کے فضل سے جوان ہے۔ ہم

تین گھرانے متفق ہیں، تو بھی آ کر ساتھ مل جا۔ رائے بشن داس کے دس مُربعے خالی پڑے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی ہر ایک کے حصّے آ جائیں گے۔"

اعجاز اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے پُوچھا "وہ ہماری ملکیت میں ہو جائیں گے؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"جتھا بنا کر جائیں گے۔ زمین پر بشن داس کے کمّی بیٹھے ہیں، انہیں ذرا دھمکا کر دوڑا دیں گے اَور قبضہ کر لیں گے۔ ساری دُنیا کر رہی ہے۔"

"زمین تو مہاجروں کے محکمے کی ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"یکّوب مہاجر نہیں تو کیا ہے؟ تین مہینے سے بارہ کِلّے کے کاغذ لے کر پھر رہا ہے۔ کیا ملا اس کو؟ ہم کہتے ہیں کِلّے وِلّے چھوڑ۔ عرضی نویس کو پچاس روپے چڑھا تو کِلّے کی جگہ مُربعے لکھ دے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ پھر اپنی ٹولی جا کر قبضہ کر لے گی۔ کاغذ ہمیں پکڑا دے، آگے ہم جانیں اَور ہمارا کام۔"

"محکمے والوں کو کیا جواب دیں گے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"میں کہتا ہوں اس کام کو ہمارے پر چھوڑ دے۔"

"فلک شیر اوان مہاجرین کے محکمے میں ڈپٹی چیف کمشنر لگا ہوا ہے،" علی بہادر نے تشریح کی، "نُورپور کے اوانوں کو اُس نے مہاجنوں کے امرودوں کا باغ الاٹ کرا کے دیا ہے۔ کاغذ وانغذ سب اپنے پاس سے بنا کر دیئے ہیں۔ برادری کا آدمی ہے، ہل نہیں سکتا۔"

"ساری قبضے کی بات ہے،" شیر بہادر بولا، "ایک بار جا کر بیٹھ جائیں تو پھر کوئی نہیں اُٹھا سکتا۔ دفتری کام فلک شیر کرتا رہے گا۔ بس ایک چھوٹے موٹے کلیم کے کاغذ کی ضرورت ہے۔ کیوں یکّوب، مُنہ سے کچھ بول، ہاں یا نہ کر۔"

یعقوب اعوان نے بے جان سا چہرہ اُٹھا کر شیر بہادر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بجھی کی ٹھہری ہُوئی پتھراہٹ تھی۔ "میرے ساڑھے بارہ کِلّے ہیں،" وہ بولا۔

"اعجاز تیرے ابے کی تو عقل بند ہو گئی ہے،" شیر بہادر جاتے جاتے بولا،

"اب تو ہی اُسے سمجھا۔ کاغذ کے بدلے آدھا مربع اُس کے حصّے سے اُوپر دے دیں گے۔ آدھی حویلی بھی تیرے نام کر دیں گے۔ اُور تجھے کیا چاہئے؟ پر یہ دیر کرنے والا معاملہ نہیں۔ بڑے لوگوں کی نظریں اس جائیداد پر لگی ہُوئی ہیں۔ اَیسے مَوکے بار بار نہیں آتے۔"

اب اس بات کو بارہ برس گزر چکے تھے۔ وہی موسم آن لگا تھا شیشم کے پیڑ ننگے ہوتے جا رہے تھے اور ہوا کی تار ٹُوٹ ٹُوٹ کر جگہ جگہ سے چھوٹے بڑے خودمختار دائیروں میں جھپاکے مارتی ہُوئی اُٹھ رہی تھی۔ گرے ہُوئے پتے ان دائیروں کے اَندر لٹو کی طرح چکر کھاتے ہُوئے اُٹھتے اور پھر گر کر بکھر جاتے تھے۔ دُھوپ میں حلاوت آتی جا رہی تھی۔ اُس وَقت دِن ڈھلنا شرُوع ہو چُکا تھا، مگر اعجاز کا ذہن دوپہر کے واقعہ سے ابھی تک پریشان تھا۔ وہ سکول چھوڑ کر گھر آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ کچُھ کھائے پیئے بغیر سیدھا چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ "سر دبا دوں؟" سکینہ نے ایک دو بار پُوچھا، مگر اعجاز نے نفی میں سَر ہلا کر آنکھیں موند لیں تھیں۔

جب وہ چار سال کا تھا تو گھوڑے پر بیٹھنے کی ضد کیا کرتا تھا۔ اس کا دادا ایوب اعوان اُسے رنگیلی پر اپنے آگے بٹھا کر کھیتوں کو لے جاتا تھا۔ اس وَقت ایوب اعوان کی نظر بند ہونا شرُوع ہو چکی تھی۔ جب رنگیلی چلتے چلتے رکتی تو وہ اپنے پوتے سے پُوچھتا، "اجاز، آگے کھال آ گئی ہے؟" بچّہ سَر موڑ کر دادا کے مُنہ کو دیکھتا، اُور جواب دیتا "ہاں"۔

"چل پھر ذرا دھیان سے بیٹھ،" ایوب اعوان کہتا، اُور باگیں کھینچ کر احتیاط سے رنگیلی کو کھال کے اُوپر سے گزار لیتا۔ نظر خراب ہونے کے باوجُود ایوب اعوان آخری دم تک کھیتوں میں کام کرتا رہا تھا۔ اعجاز بچپن سے اس کی کہانیاں سُن سُن کر بڑا ہُوا تھا۔ وہ اپنی ماں کو تو ماں، مگر دادا کو باپ سمجھتا تھا۔ یعقوب اعوان کی حیثیت بچّے کے شعور میں صرف اَیسے وجُود کی حد تک تھی جو رات کو اُس کے اُور اس کی ماں کے برابر والی چارپائی پر سوتا تھا، اُور رات بھر کھانستا رہتا تھا۔ اُس نے کبھی کھیتوں میں ہل نہ چلایا تھا، سارا سارا دِن کھیس کی بکل میں کھیتوں کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔ اُس کے پاس صرف ایک ہی کہانی تھی جو وہ کبھی

کبھار سنایا کرتا تھا، اور وہ بھی ایسی جس سے خوف آئے۔۔۔۔ کہ کس طرح ایک تنگ سی خندق میں گیس کا ناگہانی حملہ ہوا تھا۔ جس نے سینہ مروڑ کے رکھ دیا تھا اور جان لبوں تک آگئی تھی۔ دادا کی کہانیاں مختلف اور متفرق تھیں۔ وہ گھڑ سواروں کی، وارداتوں کی، نیزہ زنوں، ڈکیتوں اور عزتوں کے انتقاموں کی داستانیں تھیں جن سے جی پھڑک اُٹھے۔ اعجاز چھ سال کا تھا جب دِل کے دھڑکے سے دادا کھڑا کھڑا، دھڑام سے گر کر مر گیا تھا۔ یعقوب اعوان کوشش کے باوجُود اپنے باپ کے آدھے دھڑ کو بھی نہ ہلا سکا تھا، جسے چار کڑیل جوانوں نے اُٹھا کر چارپائی پہ ڈالا تھا۔ اس دن سے بچّے کی زندگی گویا اپنے محور سے ذرا سی ہٹ کر ایک متزلزل کیفیت میں قائم ہو گئی تھی جیسے کوئی ایک ٹانگ پہ کھڑا مسلسل توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ہو۔ ایک عرصے تک اُس نے اپنے آپ کو یکہ و تنہا پایا۔ یعقوب اعوان کی تمام ترجارحیت گویا اسی ایک رات کو ختم ہو چکی تھی جب وہ زینب کو اُس کے گھر سے نکال کے لایا تھا۔ اب وہ محض ایک اکائی کی صُورت میں اندر اور باہر گھومتا تھا جب کہ گھر کا انتظام زینب کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ، جیسے جیسے سال گزرتے گئے، اعجاز کے دِل میں اپنے باپ کی حیثیت کا شعور جاگنے لگا۔ پہلے پہل اُسے اپنے آپ کو باپ کی سرپرستی میں دینے سے کچھ سکون حاصل ہُوا۔ یعقوب اعوان نے عمر بھر میں اپنی طرف سے صرف ایک بات کی تلقین کی تھی۔۔۔۔ کہ بیٹا تعلیم حاصل کرو۔ جب اعجاز پندرہ سال کی عمر میں گھر آکر اپنے باپ سے مخاطب ہوا، "ابا، میں دسویں جماعت پاس ہو گیا ہوں،" تو یعقوب اعوان بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ اُس کے اگلے دانت گر چکے تھے، اور چہرے کی جلد کاغذ سی باریک ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت دفعتاً اعجاز کو احساس ہوا کہ ان دونوں کی جگہیں ایک دُوسرے سے بدل گئی تھیں۔ اب باپ اس کی حفاظت میں آنے کا حقدار تھا۔

"سو بار چاچے کو کہا ہے میرے ابّے سے ادھار لے کر آدھی زمین چھڑا لے۔ سنتا ہی نہیں،" سکینہ نے اعجاز سے کہا۔

سکینہ پہلے بھی یہ بات کر چکی تھی۔ اب اعجاز نے پہلی بار اُسے جواب دیا۔ "ابّے کو کرنے دو جو وہ کرتا ہے۔"

باپ کے بارے میں دو دِلا احساس رکھنے کے باوجُود اعجاز کے دِل میں اس کی محبت

ہولے ہولے چل رہی تھی۔ اُس کے باپ نے زِندگی بھر کوئی شکایت نہ کی تھی، نہ صحت کی خرابی کی نہ کھانسی کے زور کی۔ اعجاز نے اُسے صرف دوبار بے قابو ہوتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پہلی بار جب چنبیلی مری تھی، اس وقت وہ گھوڑی کے پاس زمین پہ بیٹھا کئی منٹ تک سر کو ہاتھوں پہ رکھے آنسو بہاتا رہا تھا۔ دُوسرا موقعہ اُس رات کو آیا تھا جب اُنھوں نے گاؤں چھوڑا، سرفراز پیدا ہوا، اور زینب نے جان دے دی تھی۔ اس موقعے کے بعد اعجاز نے اپنے باپ کو ہنستے ہُوئے نہ دیکھا تھا، سوائے اس وَقت کے جب اعجاز نے اُسے میٹرک پاس کرنے کی خبر سنائی تھی۔ اعجاز کے اپنے اَندر اس حادثے نے احساس کی ایک ایسی جکڑ پیدا کر دی تھی جِس نے اُس کے حواس میں گویا ایک ساتھ نرمی اَور سختی کا مِلا جُلا نظام رائج کر دیا تھا۔ یہ اس کی متزلزل زِندگی کی مزید ایک منزل تھی، مگر ایسی منزل کہ جِس نے اُس کے اَندر ایک انوکھے توازن کو جنم دیا تھا جو صرف اسی کی ذات سے مخصوص تھا۔ باپ کی سادہ لوحی اَور قناعت نے اعجاز کے اَندر سادہ لوحی اَور قناعت تو نہیں، مگر فقط سادگی اَور بیش بہا عزم کا پودا سینچا تھا۔ اس رات کے بعد اپنے باپ کے لئے اُس کے دِل میں جہاں محبت اَور حفاظت کے جذبات رہے تھے۔ وہاں گہری ہم نوائی اَور رحم کا نیا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اس دِن کے بعد ہر چند کہ اُسے یعقوب اعوان کی سوچ کے رک جانے کا عِلم تھا، مگر اُس نے کبھی اپنے باپ کی بات نہ کاٹی تھی۔ جب یعقوب اعوان نے اس کا رشتہ طے کر کے باہر ہی باہر باقی کی آدھی زمین بھی رہن کر دی تھی۔ اَور شادی پر زیور اور کپڑے کے علاوہ دس دیگیں پکوا کر ساری برادری کو مدعو کیا تھا تو اعجاز اُس کے کِسی کام کی مخالفت نہ کر سکا تھا۔ اعجاز نے اپنے دادا ایوب اعوان کو جو مکمل سایہ اپنے بیٹے کو مُہیا کرتے ہوئے دیکھا تھا، یعقوب اعوان کی مَوت کے بعد اعجاز کا وہ تمام تر جذبہ سرفراز کو منتقل ہو گیا تھا۔

سرفراز بستہ اُٹھائے گھر میں داخل ہُوا۔

"بُھوک لگی ہے" وہ بستہ پھینک کر بولا۔

"پہلے بستہ سیدھا کر کے رکھ" سکینہ نے سختی سے کہا۔

"آ آ ---- بی بی ----"

"آ آ بی بی کچھ نہیں، چل بستہ سیدھا کر۔ تجھے لالے کی بات یاد نہیں رہتی؟"

سرفراز ہاتھ پاؤں جھڑکاتا ہوا جا کر بستہ، جو اُلٹے مُنہ آدھا چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا، سیدھا کر کے رکھنے لگا۔

"بھتھو پکائے ہیں،" سکینہ اب نرمی سے بولی، "بیٹھ کر کھا لے۔ چنگیر میں روٹیاں پڑی ہیں۔"

اعجاز نے آنکھیں کھول دیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے خیالات سے باہر نکل آیا۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ وہ چارپائی سے اُٹھ کر دروازے کی جانب چل پڑا۔ "باہر جا رہا ہُوں،" وہ سکینہ سے بولا، "واپس آ کر کھانا کھاؤں گا۔"

"لالہ، میں بھی آؤں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"تُم روٹی کھاؤ۔"

"کھا لی ہے۔" سرفراز نے جلدی سے آدھی روٹی ہاتھ پہ رکھی، اُس پہ بچا ہوا سالن اُنڈیل کر وہ اعجاز کے پیچھے دَوڑ پڑا۔ دونوں چلتے ہُوئے گاؤں سے باہر نکل آئے۔ اعجاز ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھے، سَر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ سرفراز احتیاط سے ہاتھ پہ دھری روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر، بینگنوں کے سالن سے لگا کر کھاتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب وہ اپنے کھیتوں سے بھی آگے نکل آئے تو سرفراز نے پُوچھا،

"لالہ، کہاں جا رہے ہیں؟"

اعجاز جو اپنے خیال میں چلا جا رہا تھا، چونک پڑا۔ "گھر چلے جاؤ۔"

سرفراز نے زور زور سے نفی میں سَر ہلایا۔ کچھ دُور جا کر سرفراز نے کہا۔ "مجھے پیاس لگی ہے۔"

"چلو اُس کنوئیں سے پیتے ہیں،" اعجاز نے کہا۔

کنواں ساکن تھا۔ اعجاز نے گادی پہ ہاتھ جمائے اَور ٹانگوں کے زور پر دھکیلنے لگا۔ دو چکّر کاٹتے کاٹتے اُس کا دَم پُھول گیا۔ اگلے سرے پر سرفراز نے ٹین کی نالی سے گرتی ہُوئی پانی کی دھار سے مُنہ لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پیا۔ پیاس بجھانے کے بعد سرفراز نے دونوں ہاتھ نالی کے آگے رکھ کر پانی روک دیا۔ "لالہ آ جاؤ" وہ بولا۔

اعجاز بھاگ کر پہنچا۔ سرفراز نے ہاتھ ہٹائے تو بقیہ پانی گرنے لگا۔ اعجاز نے اوک

سے اُس کے چند گھونٹ پیے۔ پھر دونوں نے آستینوں سے ہونٹ خشک کیے اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر ان کا پانی خشک کیا۔

"لالہ، گھر چلیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"مَیں آگے جا رہا ہُوں۔ تُم چلے جاؤ۔"

"نہیں،" سرفراز نے دوبارہ نفی میں سَر ہلایا۔

دونوں پھر آگے پیچھے چلتے ہُوئے کچی سَڑک پر پہنچ گئے۔ چلتے چلتے سرفراز پیچھے رہ جاتا، کبھی رُک کر خودرَو پھُولوں کو توڑنے لگتا، پھر دوڑتا ہُوا اعجاز سے جا ملتا۔ اعجاز اپنے خیال میں مگن چلا جا رہا تھا، حتیٰ کہ وہ ڈھڈی والے کے نواح میں پہنچ گیا۔ اب وہ رائے بشن داس کی حویلی اور ملحقہ زمین کے برابر سے گزر رہا تھا۔ سَڑک پکّی کرنے کی منظوری کئی سال پہلے ہو چکی تھی مگر ابھی کام شروع نہ ہُوا تھا۔ یہ زمین دس سال پیشتر شیر بہادر اور اُس کے دو عزیزوں نے اپنے نام لگوالی تھی۔ اعجاز نے یاد کیا کہ جب پہلی بار شیر بہادر اور اُس کے ساتھی اس زمین پر قبضہ کرنے کی تجویز لے کر یعقوب اعوان کے پاس آئے تھے اور ناکام ہو کر واپس لوٹے تھے تو اُس کے بعد انھوں نے مزید ایک کوشش کی تھی۔ صُورت یہ نکل کے آئی تھی کہ متروکہ املاک کے چیف کمشنر جو یُو۔پی، ہندوستان، کے رہنے والے تھے، اتنی بڑی جائیداد کے معاملے میں محض اپنے ڈپٹی چیف کمشنر فلک شیر اعوان کی زبان پر اعتبار کرنے کی بجائے کلیم کرنے والے شخص کو رُوبرو دیکھنا چاہتے تھے۔ شیر بہادر اور اُس کے ساتھی دوبارہ یعقوب اعوان کے پاس آئے، اور اس بار انھوں نے اُسے اس بات پہ راضی کر لیا کہ جو بھی زمین حاصل ہو گی اس میں سے اگر وہ زیادہ لینا نہیں چاہتا تو ساڑھے بارہ ایکڑ کا بہترین "ٹکڑا" برلب سڑک اُسے دے دیا جائے گا۔ یعقوب اعوان خُوشی سے مان گیا۔ مگر ایک اور دِقت بیچ میں آن پڑی تھی۔ فلک شیر اعوان نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ کوئی یُو۔پی کا رہنے والا مہاجر تلاش کر کے لاؤ۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ حکومت کے ایک قانون کے مطابق، مشرقی پنجاب کا مہاجر اپنے کلیم کے اصل کاغذات مُہیا کرنے کا ذمہ دار تھا جب کہ یُو۔پی کے رہنے والوں کو ایک سادہ حلفیہ بیان کے ذریعے بیس پچیس ہزار یونٹ جائیداد الاٹ کر دی جاتی تھی۔ فلک شیر کا کہنا تھا کہ اس طریق کار کے بیچ کاغذات میں نام پتے کا ادل بدل نسبتاً آسان تھا۔

"تُو اُردو تو بول لیتا ہے نا،" شیر بہادر نے یعقوب اعوان سے پُوچھا۔

"ہاں، جنگ میں افسروں سے اُردو ہی بولتا تھا۔ مگر اب بھُول گیا ہُوں۔"

"یا ہاں کر یا نہ کر۔ اگر مگر کا سوال نہیں ہے۔ چل، ذرا بول کے دکھا۔"

یعقوب اعوان نے کچھ ہُوں ہاں ہنک کر کے کوشش کی، مگر اُس کے مُنہ سے کوئی لفظ ادا نہ ہو سکا۔ "بھُول گیا ہُوں۔"

"اچھا، میرے پیچھے پیچھے دُہرا کے بول۔ ٹھیک ہے؟" شیر بہادر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"ابے سالے، کیا بک بک لگا رکھی ہے۔"

"ابے سالے کیا بک لگائی ہے۔" یعقوب اعوان نے دُہرایا۔

"یکُوب، کان کھول کے سن۔ تیار ہے؟"

"ہاں۔"

"ابے سالے، کیا بک بک لگا رکھی ہے۔"

"ابے سالے، کیا بک بک لگائی ہُوئی ہے۔"

"لگا رکھی ہے۔"

"لگا رکھی ہے۔"

"اب پُورا بول کے دکھا،" شیر بہادر نے کہا۔

"ابے سالے، کیا بک بک لگا رکھی ہے۔"

شیر بہادر نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا سب نے اثبات میں سر ہلا۔ "تھوڑی مشق کی ضرورت ہے،" علی بہادر نے کہا، "دُرست، ہو جائے گا۔"

"اچھا یکُوب، اب تو سمجھ کہ میں صاحب بہادر ہُوں۔"

"تو صاحب بہادر ہے؟" یعقوب اعوان نے بے یقینی سے پُوچھا۔

"اصلی نہیں، نقلی۔ تُو فرض کر لے کہ میں جائیداد الاٹ کرنے والا صاحب بہادر افسر ہُوں۔ تو سائل بن کر آتا ہے، اپنا نام بتاتا ہے اُور کاغذ پیش کر کے بات کرتا ہے۔"

یعقوب اعوان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شیر بہادر نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"بیٹھ جا، بیٹھ جا۔ ابھی مشق ہو رہی ہے۔" یعقوب اعوان بیٹھ گیا۔ ایک دوبار گلا صاف

کرنے کے بعد اُس نے بولنا شروع کیا۔ "میرا نام یکُوب اوان ہے۔ یہ میرے ساڑھے بارہ ایکڑ کے کاغذات۔۔۔۔"

"او ہو ہو۔۔۔۔" شیر بہادر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بارہ ایکڑ کی گردان چھوڑ، اللہ کے واسطے بات کو سمجھ۔ رقبے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس یہ کہہ کہ یہ میرے کاغذات ہیں۔"

"میرا نام یکُوب اوان ہے،" اُس نے دوبارہ شروع کیا، "یہ میرے کاغذات ہیں۔" وہ رُک کر شیر بہادر کو دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں، آگے بول،" شیر بہادر نے کہا۔

"ابے سالے، کیا بک بک لگا رکھی ہے۔" یعقوب اعوان جلدی سے بول اُٹھا۔

شیر بہادر نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا۔ "اوئے بے عقلے یہ تو صرف مثال کے طور پر سکھایا تھا۔"

"مثال کے طور پر؟"

"ہاں ہاں۔ وہاں پر تو جی جناب کر کے بات کرنی ہو گی۔"

یعقوب اعوان نے گلا صاف کیا۔ "اچھا۔ میرا نام یکُوب اوان ہے۔ یہ میری جائیداد کے کاغذ ہیں۔ جی جناب۔۔۔۔" یعقوب اعوان نے دوبارہ گلا صاف کیا اور سانس برابر کی، "جی جناب۔۔۔۔" وہ آگے نہ چل سکا تو آنکھیں کھول کر شیر بہادر کو دیکھنے لگا۔

شیر بہادر انتہائی مایُوسی اور غصّے کی حالت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو اُٹھو،" اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہم کس چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ اس کا تو دماغ بند ہے۔"

ادھر سے فارغ ہو کر شیر بہادر اور ساتھیوں نے دھوڑ دُھوپ کر کے یُو۔پی سے ہجرت کر کے آیا ہوا ایک آدمی تلاش کر لیا، جس کے کاغذات میں ردوبدل کر کے ملک فلک شیر نے رائے بشن داس کی حویلی اور دس مُربّعے زمین غیاث الدین انصاری، مہاجر از فیض آباد، یو۔پی کو الاٹ کروا دی تھی۔ ملک فلک شیر اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ انُھوں نے بادامی باغ میں ہوزری کی دو فیکٹریاں اور ملحقہ زمین و مکانات اپنے کچھ عزیزوں کو جو مہاجر ہو کر آئے تھے، الاٹ کروا دی تھیں۔ یہ فیکٹریاں اب پھیل کر دھاگا اور کپڑا بنانے کے

کارخانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جن میں ملک فلک شیر اور ان کے بھائی کا بڑا حصّہ تھا۔ جہان آباد کا ملک عالم جہاں فوت ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا ملک جہانگیر اعوان ملک فلک شیر کا بہنوئی اور علاقے کا ایم۔ایل۔اے تھا۔ اُس نے بھی فلک شیر کی اعانت سے مزید بارہ مُربع متروکہ اراضی کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا تھا۔ ملک جہانگیر کو اعجاز کئی بار دیکھ چکا تھا، مگر فلک شیر صرف ایک مرتبہ اس کی نظر سے گزُرا تھا، جب وہ علی بہادر کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی خاطر آیا تھا۔ شادی رائے بشن داس کی حویلی میں منعقد ہوئی تھی۔ حویلی کی عمارت سے الگ، احاطے کی دیوار کے اندر کئی چھوٹے بڑے کمرے ایک قطار کے اندر تعمیر شدہ تھے، جو کسی زمانے میں گھوڑوں اور دُوسرے زرعی مویشیوں اور ان کے رکھوالوں کی رہائش گاہ کے طور پہ استعمال ہوتے تھے۔ ان میں سے چار بڑے کمرے غیاث الدین انصاری مہاجر اور اُس کے خاندان کو دے دیئے گئے تھے۔ ان کے لئے ایک مُربع زمین بھی چھوڑ دی گئی تھی، جس پہ آٹھ اِنسانوں کے اس کنبے کی خُوشی سے گزُر اوقات ہوتی تھی۔ باقی کی زمین اور حویلی شیر بہادر اور اُس کے دو ساتھیوں نے معمولی رقم کے عوض غیاث الدین انصاری سے خرید لی تھی۔ جس طور رات کی رات میں اعوانوں نے بشن داس کے کمیوں کو بھگایا اور جائیداد پہ قبضہ کیا تھا اُسے دیکھ کر غیاث الدین انصاری نے بلاچوں وچراں رجسٹری کے کاغذات پہ دستخط کر دیئے تھے۔ شیر بہادر اور اس کا بھائی آدھی آدھی حویلی کے مالک تھے۔ نیز ان کے قبضے میں ساڑھے تین تین مُربع اراضی تھی۔ اپنے چچازاد وریام کو انہوں نے دو مُربع زمین دے دی تھی۔ شیر بہادر نے برلب سڑک ایک مُربع رقبہ پر سنگتروں اور لیموؤں کا باغ لگایا تھا، جو اب ڈیڑھ لاکھ سالانہ پہ اُٹھتا تھا۔

"لالہ، ایک مالٹا توڑ لُوں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ٹھہرو۔" اعجاز نے کہا، اور ہاتھ بڑھا کر ایک نسبتاً پکے ہُوئے مالٹے کا انتخاب کیا۔ "یہ لو۔"

سرفراز آدھا زرد اور آدھا سبز مالٹا دانتوں سے کاٹ کر چھیلنے لگا۔ مالٹے کی تازہ تازہ تیز بُو اعجاز کی ناک میں چڑھی تو اُسے گیارہ سال پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب اُس کے ماموں کے گھر پہ اعوانوں کے تینوں آدمی اپنی تجویز لے کر آئے تھے۔ اس رات کو بھی عُمر دراز نے خُوب پکے ہُوئے کھٹے میٹھے سنگتروں سے ان کی تواضع کی تھی۔

"کھٹا ہے،" سرفراز نے دانتوں کے نیچے سے "سی" کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا، مگر مالٹا چوسنا نہ چھوڑا۔

ایک تیز رو خیال اعجاز کے ذہن سے گزرا۔ "یہ باغ ہمارا ہو سکتا تھا۔"

اعجاز کئی بار اس حویلی اور زمین پر آیا گیا اور باغ کے اندر گھوما پھرا تھا۔ مگر آج دوپہر کے سانحہ نے اُس کے ذہن کی جو حالت بنا رکھی تھی اُس کے زیر اثر ان جگہوں کو دیکھ کر پہلی بار اُس کے اندر کچھ افسوس، کچھ احساسِ زیاں، کچھ حسد اور کچھ غصے کے ملے جلے جذبات پیدا ہوئے تھے۔

شجاع آباد کا میونسپل پرائمری سکول سن باون سے مڈل سکول کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک پرانے استاد اور، منشی فاضل کے ذریعے سے، بی۔اے کے ڈگری یافتہ تھے۔ بارہ بجے کے قریب اُنھوں نے اردو، حساب اور ڈرائنگ کے ماسٹر محمد اعجاز اعوان کو، جو اپنی تعلیم اور طوالت ملازمت کے لحاظ سے غیر رسمی طور پر سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تصور کئے جاتے تھے، اپنے دفتر میں طلب کیا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک نہایت تجربہ کار، ہوشیار اور وضع دار آدمی تھے۔ سکول میں سخت انتظام رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماسٹروں سے شفقت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اعجاز کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔

"میں ابھی انسپکٹر کے دفتر سے ہو کر آیا ہوں،" وہ بولے۔

"جی،" اعجاز نے احتراماً جواب دیا۔

"اچھی خبر لایا ہوں۔ سوچا کہ سب سے پہلے تمھیں سناؤں۔"

"مبارک باد کا موقع ہے چیمہ صاحب؟"

"یوں ہی سمجھو، اگرچہ بمطابق محاورہ، یہ کھالا آنے سے پہلے چھلانگ لگانے والی بات ہوگی۔"

اعجاز ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ان کی مسکراہٹ میں شریک ہو گیا۔ "سکول کو ہائی کا درجہ ملنے کا وعدہ لے کر آیا ہوں۔" نواز چیمہ نے کہا "تجویز تو تمھیں علم ہے بہت پہلے کی پیش کی جا چکی ہے۔ ٹالتے ٹلاتے یہ وقت آگیا ہے۔ آج تو میں جا کر وہاں بیٹھ ہی گیا۔ کہا کہ

ڈیشن لے کر ہی جاؤں گا۔"

"ڈیشن مل گیا چیمہ صاحب؟"

"ارے بھائی ڈیشن ایسے تھوڑا ہی ملا کرتے ہیں، یہ تو کہنے کی باتیں ہیں۔ بہرحال وعدہ پکا لے کر آیا ہوں کہ کیس بھاری ری کمنڈیشن کے ساتھ اُوپر بھیج دیا جائے گا۔"

"جی پھر تو مبارک باد کی بات ہو گئی۔" اعجاز نے کہا۔

بات کا جواب دینے کی بجائے ہیڈ ماسٹر نے ٹھوڑی جھکا کر عینک کے شیشوں کے اُوپر سے ایک کڑی نظر اعجاز پہ جما دی۔ یہ ایسی نگاہ تھی جو ان کے چہرے پہ عادتاً سرزنش کرنے سے پہلے نمودار ہوا کرتی تھی۔

"ایک گڑبڑ ہو گئی ہے، اعجاز" وہ بولے۔

اعجاز احتیاط سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "جی، چیمہ صاحب۔"

"شکایت ہو گئی ہے۔"

"کس بات کی، چیمہ صاحب؟"

"تمہاری، بچے، تمہاری۔ تم خوب جانتے ہو میں کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ میں پہلے بھی ایک بار اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے اُمید تھی کہ تم سنبھل جاؤ گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے تم نے اس وارننگ کا اثر نہیں لیا۔"

"مگر چیمہ صاحب،" اعجاز نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مَیں تو اُس کے بعد یُونین کے کسی آدمی سے نہیں ملا۔"

"مگر سلیم خان سے تمہاری ملاقات جاری ہے۔"

"وہ تو میرا پُرانا دوست ہے۔ کوئی عہدیدار بھی نہیں، یونین کا تنخواہ دار ملازم ہے، صرف نوکری کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ کبھی یونین کے کسی معاملے کی بات ہی نہیں ہُوئی۔ دُور پار سے برادری کا آدمی بھی ہے۔"

"اعوان صاحب،" ہیڈ ماسٹر چیمہ طنزیہ لہجے میں بولے،" آپ کس دُنیا میں رہتے ہیں۔ مارشل لاء لگ چکا ہے، کچھ پتا ہے آپ کو؟ پہلے دیواروں کے کان ہوتے تھے، اب آنکھیں بھی لگ گئی ہیں۔ منٹ منٹ کی خبر اُوپر پہنچ رہی ہے۔ کیوں ہم سب کی روزی گنوانے کے چکر میں ہو؟"

"چیمہ صاحب، غلطی ہو گئی، مجھے خبر نہ تھی،" اعجاز نے کہا، "اگر ایسی بات ہے تو میں سلیم خان سے بھی ملنا چھوڑ دوں گا۔"

اب ہیڈ ماسٹر نے اعجاز کی جانب سے نگاہیں پھیر لیں۔ جب وہ دوبارہ بولے تو اپنے آگے میز کو دیکھ رہے تھے، اور ان کے لہجے میں لچک دار فولاد کی سی سختی تھی۔ "اس سے کام نہیں چلے گا بھئی۔"

اُن کی گفتگو کے دوران ہیڈ ماسٹر کا لہجہ ایسی آہستگی سے درجہ بدرجہ بدلتا آیا تھا کہ اب اعجاز نے گویا پہلی بار ان کی آواز کا یہ انداز سُنا اور خطرے کا احساس اُس کے دِل میں جاگنے لگا۔

"ایسے کام نہیں چلے گا" ہیڈ ماسٹر نے دُہرا کر کہا اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ میز کی دراز سے نکال کر اعجاز کے آگے بڑھا دیا۔

"اس پہ دستخط کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" اعجاز کی رُکتی ہُوئی آواز نکلی۔

"تُمھارا استعفیٰ ہے۔" ہیڈ ماسٹر نے اکتائے ہُوئے لہجے میں ہاتھ ہِلا کر کہا، "پڑھ لو۔"

"مگر---- میں---- چیمہ صاحب، میں سلیم خان سے----"

"دیکھو محمد اعجاز، تُم بہت عمدہ اُستاد ہو۔ کیا تُمھارا خیال ہے کہ میں تُمھیں ہاتھ سے کھو کر خُوش ہُوں؟ مگر بیٹا، معاملہ میرے ہاتھ سے نِکل گیا ہے۔ صرف ایک آدمی کی وجہ سے اس سکُول کو تالہ بھی لگ سکتا ہے۔ مَیں تو از خود ملک جہانگیر اعوان تک پہنچا ہُوں۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ وہ تو ذی فنکٹ ہُوئے بیٹھے ہیں۔ پھر بھی اُنھوں نے کچھ نہ کچھ اثر ورسُوخ استعمال کیا اور استعفیٰ پر بات ختم ہُوئی ہے۔ نہ ڈِس مس، نہ ڈسچارج نہ برطرف۔ آگے سروس ملنے میں بھی کوئی دُشواری حائل نہ ہو گی۔ یہی تُمھارے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ تو میاں گرفتاریوں کا معاملہ تھا۔ تُمھیں عِلم ہے لاہور میں کیا ہو رہا ہے؟"

"جی---- نہیں۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ تُمھیں پتا چل جائے گا۔ اس پہ دستخط کر دو اور شُکر کرو کہ تُمھارے بہی خواہ ابھی دُنیا میں موجُود ہیں، بات آگے نہیں بڑھی۔"

جس وقت سے اعجاز سکول سے نکل کر گھر آیا تھا اُس وقت سے صرف ایک بات کا غبار اُس کے دِل پہ چھایا ہُوا تھا: یہ کیسے ہُوا کہ اس موقعے پر اُسے کچھ مہلت مانگنے کی تدبیر نہیں سوجھی؟ کیونکہ اس کا ذہن اِس لمحے کے اندر اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ، کوئی فرصت اُس کو میسّر نہ آئی اور اُس نے خاموشی سے، کپکپاتے ہُوئے ہاتھوں کے ساتھ اس کاغذ پہ دستخط کر دیئے اور اُٹھ کر وہاں سے چلا آیا تھا؟؟ اُس نے اپنی کلاس کے ڈیسک سے اپنی ذاتی کاپی بھی نہ اُٹھائی تھی۔ اُسے کلاس کے چھوٹے چھوٹے بے خبر بچوں سے شرم محسوس ہونے لگی تھی۔ اس "شرم" کا غبار اُس کے اندر پھیلتا جا رہا تھا۔

"لالہ، وہ آدمی کیا کر رہے ہیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کنواں کھود رہے ہیں" اعجاز نے متوجہ ہو کر جواب دیا۔

"چلو چل کے دیکھیں۔"

ایک زمانے کے بعد اعجاز نے کنواں کُھدتا ہُوا دیکھا تھا۔ اِس کا رواج اب یہاں سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیوب ویل کی رسم پڑتی جا رہی تھی۔ جس کے لئے حکومت سے قرضے اور دیگر رعایتیں حاصل ہو جاتی تھیں۔ کنوئیں کا گڑھا پانی تک پہنچ چکا تھا اور اِس وقت اِس میں چک اُتارا جا رہا تھا۔

یہ پُرانی تقریب اعجاز کے ذہن میں بچپن کے وقت سے محفوظ تھی۔ آخری بار جب اُس نے چک کنوئیں میں اُترتے ہُوئے دیکھا تو اُس وقت وہ دس یا گیارہ برس کا رہا ہو گا۔ کبیر سنگھ والے میں کنواں کھودا جا رہا تھا اور وہ سکول سے واپس آ کر سیدھا وہاں پہ پہنچ جایا کرتا اور جھٹپٹا ہونے تک وہیں بیٹھا کسانوں کو زمین کے اندر سے مٹی نکالتے اور گڑھے کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ کنواں کھودنا ہنرمندی کا کام تھا۔ اردگرد کے بارہ گاؤں کے اندر سب سے بڑا ماہر کبیرے کا بلبیر سنگھ تھا۔ جس گاؤں میں کنوئیں کی کُھدائی کرنا ہوتی وہاں بلبیر سنگھ کو لے جایا جاتا۔ سب سے پہلے وہ مقام کا انتخاب کرتا تھا۔ وہ بُوڑھا سکھ زمین کا ایسا بھیدی تھا کہ ایک کدال مار کر بتا دیتا پانی کِس گہرائی پہ نکلے گا۔ وہ پانی کی خصلت تک

سے واقف تھا۔ "کھارا ہے،" وہ گیلی مٹی کو سونگھ کر کہتا، "دیسی کماد ہو جائے گا پر رس دار نہ ہو گا۔ پھٹی بھی نِکل آئے گی۔ اناج کے لائق نہیں ہے۔"

اناج بونے کے خواہش مند زمیندار بلبیر سنگھ کے پیچھے اگلے مقام کی تلاش میں چل پڑتے۔ "رقبہ تو ختم ہونے کو ہے، بلبیر سنگھ جی،" وہ تفکر سے کہتے۔

"اپنے رب پر بھروسہ کر، قدم قدم پر اُس کے کرشمے ہیں۔"

"رقبے کے اندر سچا پانی مل بھی جائے گا؟" زمیندار پوچھتا۔

"زمین کے کھیل آسمان کے کھیل سے دُگنے ہیں بھاپے۔ مرلے مرلے کے نیچے الگ الگ نالہ بہتا ہے۔ کوئی کڑوا، کوئی کسیلا، کوئی میٹھا۔"

"آپس میں ملتے جُلتے نہیں؟"

"سب کے اپنے اپنے رستے ہیں، اپنی اپنی چال جیسے میری چال الگ اور تیری چال الگ۔ دونوں مل بھی جائیں مگر خصلت ایک نہیں ہو سکتی۔" بلبیر سنگھ کا قول پُورا اُترنے والا تھا۔ جس جگہ پہ وہ کدال رکھ دیتا وہیں پہ دائرہ کھینچ کر کُھدائی شروع کر دی جاتی۔ کُھدائی زمین میں گڑھا نکالنے والوں کا کام نہیں تھا۔ اُس کے الگ کاری گر تھے جو عموماً بلبیر سنگھ کے ساتھ جگہ جگہ چلتے تھے۔ گڑھے کا قطر، اُس کی دیواروں کا عمود اور ان کی گولائی، ہر لمحے یہ باتیں دھیان میں رکھی جاتی تھیں۔ مضبوط رسیوں سے بندھی بڑی بڑی بالٹیاں چاروں جانب سے لٹکائی جاتیں اور مٹی سے بھری ہُوئی اُوپر کھینچ لی جاتی تھیں۔ ان کی مٹی آس پاس کے کھیتوں میں پھیلا دی جاتی تھی بلبیر سنگھ ہاتھ میں شیشم کی چھمک پکڑے، ہر دم گھرے ہوتے ہُوئے گڑھے کے گرداگرد چکّر لگاتا، عقاب کی سی نظر ہر کدالئے پہ جمائے، زمین کے ہر دھارے کی مٹی کے مطابق ہدایات دیتا ہوا دِن بھر گھومتا رہتا۔ ایک دھارا ریتلی مٹی کا ہوتا تو اگلا چکنی مٹی کا، اور اس سے آگے بُھر بُھری گاچی کی شکل کا نکلتا۔ کھودیئے ہر دھارے کی سختی اور نرمی کو جانچ کر کدال لگاتے کہ کہیں پہ ہاتھ حساب سے کم یا زیادہ بھاری نہ پڑے کہ گولائی میں فرق آ جائے۔ حتیٰ کہ کھودتے کھودتے تہہ سے کیچڑ نکلنے لگتا، جو بتدریج پتلا ہوتا جاتا۔ جب گدلے پانی کی لہر چڑھتی تو بالٹی بھر اُوپر کھینچا جاتا۔ پھر باریک ململ کے ٹکڑے کو دوہرا چوہرا کرکے اس "پانی" کو چھانا جاتا۔ سب سے پہلے بلبیر سنگھ صاف پانی کا گھونٹ بھر کر مُنہ میں کھنگالتا۔ کنوئیں کے مالکان کے علاوہ

گاؤں کے سب لوگ جنہیں پانی نکلنے کی خبر پہنچ چکی ہوتی، یہ دیکھنے کے لئے دم سادھے کھڑے ہوتے کہ بلبیر سنگھ پانی کو تھوکتا ہے یا کہ نگل جاتا ہے۔ جیسے ہی گھونٹ بلبیر سنگھ کے حلق سے اُترتا، ہجوم سے ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوتا۔

"سچا پانی!!"

مالکان کو مبارک بادیں ملتیں، بلبیر سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی جاتی۔ زمین کی گود میں وہ گول گڑھا کنوئیں میں تبدیل ہو چکا ہوتا تھا۔ اب کھُدائی کا کام روک کر چَک اُتارنے کا مرحلہ آتا۔ جس روز کنوئیں کی کھُدائی کا کام شروع ہوتا تھا اسی دن گاؤں کے ترکھان تناور درخت کاٹ کر ان کی چھلائی اور ٹھکائی میں لگ جاتے تھے۔ چَک کے لئے صرف کالی ٹاہلی کی لکڑی استعمال میں لائی جاتی تھی جس پہ پانی کا کیڑا مار نہ کر سکتا تھا۔ اُس کے علاوہ موٹے تنوں کی ضرورت پڑتی تھی جن کے اندر سے لکڑی کے ٹکڑے کمان کی شکل میں کاٹے جاتے تھے تاکہ چَک کی گولائی میں فرق نہ آنے پائے۔ پھر ان ٹکڑوں کو سریش اور کیلوں کانٹوں اور پیچوں کی مدد سے ایک منوں بھاری چکّر کی شکل میں جوڑا جاتا تھا۔ کنوئیں کے اندر رکھنے سے پہلے چَک کے لئے زمین تیار کی جاتی تھیں۔ کنوئیں کی گولائی کے ساتھ ساتھ چکنی مٹی، جس کے ڈھیر اُوپر کھیتوں میں لگے ہوتے تھے، ٹوکریوں میں بھر بھر کر پھینکی جاتی تھی جو دیواروں کے دامن میں ڈھیر ہوتی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ، لکڑی کے چوڑے تختوں کی مدد سے، جن پہ کھڑے ہو کر چار چار کھودی مزدور کُودتے تھے، اس مٹی کو اچھی طرح سے کوٹا جاتا تھا، حتیٰ کہ چَک کی چوڑائی کے برابر ایک گول تھڑی تیار ہو جاتی تھی۔ پھر اُس کے اُوپر چَک رکھا جاتا جو آگے نیمنہ کا کام دیتا جہاں سے اینٹوں کی گول چُنائی اُٹھائی جاتی تھی۔

جب تھڑی تیار ہو جاتی تو گاؤں سے چَک کا جلوس چلتا تھا۔ اُسے دو بیلوں والی کھُلی گاڑی پہ لادا جاتا اور ساتھ گاؤں بھر کی عورتوں، مردوں اور بچوں کا ہجوم روانہ ہوتا۔ کنوئیں کے مُنہ پہ پہنچ کر مجمع ایک گول دائرے کی شکل میں کنوئیں کے کناروں پہ جمع ہو جاتا۔ چَک کے چاروں جانب دس بارہ جگہوں پر موٹے موٹے مضبوط رسّے باندھے جاتے۔ ہر ایک رسّے کو پندرہ بیس جوان تھامے ہُوئے ہوتے تھے، جو ایک ساتھ رسّوں کو ہاتھوں کے بیچ سے انچ انچ سرکاتے ہُوئے چَک کو اس طور کنوئیں میں اُتارتے تھے کہ اس کی کوئی

ایک جانب بھی دُوسری جانب سے اُونچی یا نیچی ہونے نہ پاتی تھی۔ جب چک مٹی کی تھڑی پر جم جاتا تھا تو رسوں والے ہاتھ سے رسّے چھوڑ دیتے تھے۔ مجمعے پر کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی۔ عورتیں آدھا منہ ڈھانپ کر چپکے چپکے رونے لگتی تھیں۔

جب کنوئیں کی آدھی اونچائی تک اینٹوں کی چُنائی ہو جاتی تو پھر "ٹوبے" اپنا کام شروع کرتے۔ اعجاز نے یاد کیا کہ جب وہ چھوٹا سا تھا تو ٹوبے اس کے لئے دُنیا کے انتہائی پُراسرار لوگ ہوتے تھے۔ یہاں پر یہ ٹوبے، مگر کیبرے میں ڈوبے کہلاتے تھے۔ اُن میں سے کوئی اپنی ناک پہ پنکا باندھ کر اور کوئی صرف اُنگلیوں میں ناک کو داب کر ڈبکی لگاتا اور اِتنی دیر تک پانی میں ڈوبا رہتا کہ جی گھبرانے لگتا تھا۔ جب وہ اُوپر آتے تو بالٹیوں میں مختلف رنگوں کی کیچڑ نما مٹی اور ریت بھر بھر کے لاتے تھے، گویا گدلے پانی کی تہہ میں سُرنگ لگا رہے ہوں۔ اِس طرح کبھی چند ہی گھنٹے، اور کبھی دو دو دِن تک مصروف رہنے کے بعد وہ زیرِ زمین بہتے ہوئے صاف پانی کے دھارے تک پہنچ جاتے۔ اِس ذخیرے سے پھر پانی تہہ در تہہ ریت کی چھلنی سے چھن چھن کر شفاف شکل میں کنوئیں کے اندر چڑھتا آتا تھا اور اپنے زور کی نسبت سے ایک مقام پہ ہموار ہو کر ٹھہر جاتا تھا۔ سالوں پہلے کا وہ منظر اب اِس شام کو اعجاز کی آنکھوں کے سامنے ایسے ہو بہو دوہرایا جا رہا تھا کہ کچھ وقت کے لئے گویا وہ بہ نفسِ نفیس ماضی کے اس پُرانے مقام پہ پہنچ گیا اور اُس کے ذہن سے یہ بات یکسر محو ہو گئی کہ ان دو مناظر کے بیچ ایک لمبے عرصے کا وقفہ ہی نہیں بلکہ دو ملکوں کی حدود کا رخنہ بھی پڑتا تھا۔ کنوئیں کے منہ پہ لوگوں کا ٹھٹ لگا تھا۔ سرفراز آگے نِکل کے ہجوم میں گھس گیا تھا اور پاؤں کے بل، گھٹنے جوڑے، عین کنارے پہ بیٹھا تھا۔ اعجاز کو یوں لگا جیسے سولہ سال پیچھے وہ خود اس بچے کی جگہ پہ بیٹھا کنوئیں کے اندر چک کو اترتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ پرلی جانب بلبیر سنگھ کی جگہ اس گاؤں کا ایک بُڈھا، ہاتھ میں لمبی سی سونٹی پکڑے، کڑی آواز میں رسّے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اعجاز کے دیکھتے ہی دیکھتے چک چکنی مٹی کی گادی پہ جم کر بیٹھ گیا اور رسّے ہاتھوں سے چھٹ کر کنوئیں کے اندر جا پڑے۔ دیکھنے والوں کے اُوپر وقتی طور پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مرد بھری بھری مطمئن نظروں سے کنوئیں کے اندر جھانکنے لگے۔ کچھ بوڑھی عورتیں اپنی چادروں سے آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگیں۔

پھر یکایک مجمعے کے اندر ایک غلغلہ بلند ہُوا۔ سب آوازیں مردوں کی تھیں۔ ساتھ ہی ڈھول پر سیلیے کی تھاپ پڑی۔ چند نوجوان کسانوں نے بازو ہوا میں اٹھائے اور ڈھول کے اردگرد گھومتے ہوئے، سرینھوڑائے، بالوں کے لمبے پٹے جھٹکتے ہوئے، بدن لہرا لہرا کر ناچنے لگے۔ اُدھر سے ایک بیل گاڑی گڑ والے چاولوں کی دیگ لے کر آ پہنچی۔ مٹی کے پیالوں میں سونف کی خُوشبو والے چاول کھودیوں، ٹوبوں، راج مزدوروں، چک اُتارنے والوں، بچوں اور دیگر لوگوں میں تقسیم کئے گئے۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہو گئی اور جوانوں نے ناچ ناچ کر گردو غبار کا بادل اُٹھا دیا۔ عورتیں کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہیں، پھر بچوں کو لے کر دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں واپس اپنے گھروں کو چل دیں۔

"چلو۔" اعجاز نے سرفراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کنوئیں کے چھوٹے سے ٹیلے سے اُتر کر دونوں کچی سڑک پہ پہنچے اور واپس گھر کے رستے پہ ہو لئے۔ ڈھول کی دھمک دُور تک ان کا پیچھا کرتی رہی۔ دھوپ کا رنگ بدل کر زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس علاقے کی زمین اِس قدر ہموار تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے دور دُور تک ایک مہیب سہاگہ پھیر کر سطح کو ہموار کیا گیا ہو۔ حدنگاہ پہ آتشیں رنگ کا سُورج زمین سے ملنے کو تیار کھڑا تھا۔

"لالہ، وہ عورتیں کیوں رو رہی تھیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"چک جو ڈوب رہا تھا۔" اعجاز نے کہا۔

سرفراز ایک منٹ تک سوچتا رہا، گویا سمجھ نہ پا رہا ہو۔ "پھر وہ رو کیوں رہی تھیں؟" اُس نے دُہرا کر پُوچھا۔

"چک زمین میں دفن ہو رہا تھا بھئی۔" اعجاز صبر سے بولا۔ "ایک بار گیا تو گیا۔ کنواں رہے نہ رہے، سُوکھ جائے، اِینٹیں اُکھڑ جائیں، چک پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔"

"جیسے قبر میں آدمی دفن ہو جاتا ہے؟"

اِس سوال پر اعجاز کو دل میں ذرا سی حیرت ہُوئی۔ "ہاں!" اُس نے کہا۔

"مگر وہ تو لکڑی کا چکر ہی تھا۔"

"صرف لکڑی کا چکر ہی نہیں تھا۔" اعجاز نے کہا۔ "اِس پہ درختوں کے درخت لگے تھے۔ اَیسے اَیسے درخت جو گاؤں کے سب لوگوں سے زیادہ عُمر رسیدہ تھے۔"

"لالہ!" کچھ دیر بعد سرفراز نے پوچھا۔ "عمر رسیدہ کیا ہوتے ہیں؟"

"تم اب چھٹے درجے میں ہو، عمر رسیدہ کے معنی نہیں آتے؟ عمر رسیدہ بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے لوگ!"

"جیسے ابا تھا؟"

"ہاں!"

"پھر۔۔۔" سرفراز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔ "پھر صرف عورتیں کیوں روتی ہیں؟"

"عورتوں کے دل میں ان باتوں کا درد ہوتا ہے۔ چک کے لئے عورتیں ہی روتی ہیں۔"

"ہمیشہ روتی ہیں؟"

"ہاں! جب میں تیری عمر کا تھا اُس وقت بھی روتی تھیں۔"

"اُس وقت تم کیبرے میں تھے لالہ؟"

"ہاں!"

"وہاں تو سکھ رہتے تھے۔" سرفراز نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ اِن باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اعجاز نے کہا۔ "لوگوں کے ہزاروں سال پُرانے رِواج ہوتے ہیں۔"

"لالہ! رواج کیا ہوتے ہیں؟"

"رسمیں!"

"کیسی رسمیں؟"

"لینے دینے کی رسمیں، رہنے سہنے کی رسمیں۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "ان کے سارے لوگ زندگیاں گزارتے ہیں۔"

"سکھوں کی بھی رسمیں ہوتی ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

اعجاز اُس کے بچگانہ سوالوں سے کچھ چڑتا جارہا تھا۔ اب سہ پہر کے واقعہ کا بوجھ اُس کے ذہن پر دوبارہ چڑھتا آرہا تھا۔ وہ حویلی شمشیر سنگھ کے برابر سے گزر رہے تھے۔

یہ حویلی ویران پڑی تھی۔
"لالہ!" سرفراز نے پُوچھا۔ "اس حویلی میں کوئی کیوں نہیں رہتا؟"
"اِس کے مالکوں کی آپس میں لڑائی ہے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

بٹوارے سے پہلے اس علاقے میں جہان آباد والوں کے علاوہ دو بڑے زمیندار تھے۔ ایک بشن داس، جو کٹّر ہونے کے باعث جلد ہی اپنی جائیداد چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دُوسرے رائے بہادر شمشیر سنگھ جی جو ایک پڑھے لکھے، روشن خیال آدمی تھے۔ اُن کے مُسلمانوں، سکھوں اُور انگریزوں کے ساتھ یکساں تعلقات تھے۔ چُنانچہ پاکستان بننے کے پُورے بارہ ماہ بعد تک وہ اپنی زمین پر قابض بیٹھے رہے۔ گاہے گاہے افواہ اُڑتی کہ رائے بہادر صاحب اِسلام قبول کر چکے ہیں۔ ایک بار خبر یہاں تک نکلی کہ تبدیلی مذہب کے بعد اُنہوں نے اپنا نام سردار بہادر شمشیر علی خان رکھ لیا ہے مگر وقت گزُرنے کے ساتھ اِن افواہوں کی تردید ہوتی گئی۔ اُدھر مُلک کے حالات نہ ٹھہرنے تھے نہ ٹھہرے۔ مہاجروں کی یلغار ہوتی گئی اُور عوام میں غم و غصّے کی لہر اُٹھتی رہی۔ رائے بہادر شمشیر سنگھ جی کی موجُودگی میں ہی ایک مقامی شخص نے جعلی کلیم داخل کر کے اُن کے لارنس روڈ والے وسیع مکان پر قبضہ جما لیا تھا۔ اپنے اثر و رسُوخ کے باوجُود رائے بہادر صاحب قبضہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ یہ مکان وہ اپنی اکلوتی بیٹی، جو اپنے سرکاری ملازم میاں کے ساتھ دلی اُور شملے میں رہتی تھی، کے نام وقف کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس واقعہ کی وجہ سے اُن کا دِل اس سرزمین سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ بالآخر اُنہوں نے بھی اپنا ڈیرہ اُٹھایا اُور اپنے دِلّی والے مکان میں جا بسے۔

بِشن داس کی حویلی کا معاملہ تو شجاع آباد کے اعوانوں نے بخیر و خُوبی طے کر لیا تھا۔ حویلی شمشیر سنگھ کا معاملہ ٹیڑھا نِکلا۔ یہاں کپور تھلے کے ایک رئیس خان فرمان علی خان کا کنبہ اُور نُور پُور کے ملکوں کا خاندان بیک وقت آوارد ہُوئے۔ فرمان علی خان تو اُسی دم مہاجر ہو کر آئے تھے جب کہ ملک رجب علی کا گھرانہ عرصہ ایک سال سے اس جائیداد پر گھات لگائے بیٹھا تھا۔ رجب علی کُل سات بھائی تھے، جِن میں سے چھ بے اولاد تھے۔ قدرت نے گویا اِس کمی کو پُورا کرنے کے واسطے ملک رجب علی کو آٹھ بیٹوں سے نوازا تھا۔ ساتوں بھائیوں کی کل ملکیت معمولی سا رقبہ اراضی تھا جس پہ اُن کی گزُر بسر ہوتی تھی مگر

ایک ہی گھر کے یہ پندرہ مرد آپس میں اتفاق کی بناء پر مُٹھی کی مانند اکٹھا ہو جانے کی روا[illegible]
رکھتے تھے۔ گاؤں کے اندر چنانچہ اس گھرانے کی ایک حیثیت اور ایک قوت تھی۔ [illegible]
جانب فرمان علی خان کی سات کنواری بیٹیاں اور ایک کمسن بیٹا تھا مگر کپور تھلے کے یہ پٹھان
دِل کے جری تھے۔ اپنی دو نالی بندوق اور کارتوسوں کا ڈبہ سوتے جاگتے بغل میں رکھتے تھے
گویا اکلوتی جان سے دُنیا بھر کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جس رات کو دونوں
فریقوں نے ایک ساتھ آکر حویلی میں پڑاؤ ڈالا اُس شب سے گویا اُس مکان کے بیچوں بیچ
ایک اَن دیکھی دیوار چُن دی گئی تھی۔ کوئی آٹھ گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا حتیٰ کہ
ملکوں کی دیسی رائفل جام ہو گئی جب کہ فرمان علی خان کے آگے چلے ہوئے کارتوسوں اور
خالی ڈبوں کا ڈھیر لگ گیا اور ان کی دو نالی بندوق چلتی ہوئی بلکہ مجسم ساختہ بارہ بور بنی تھی۔ اس پہلے
معرکے میں جیت فرمان علی خان کی رہی اور ملک رجب علی کے قبیلے کو اس بات کا احساس
ہو گیا کہ اُن کا پالا ایک نئی قسم کے مہاجر سے پڑا ہے جو آسانی سے ہار ماننے والا نہیں۔ مگر
اُنھوں نے اپنے مورچے نہ چھوڑے اور حویلی دو بازوؤں میں بٹی رہی۔ پھر پولیس آئی،
مجسٹریٹ موقعہ پر آیا، گرفتاریاں ہوئیں، ضمانتوں پر رہائیاں عمل میں آئیں۔ کارروائی
تھانوں کی حاضریوں سے شروع ہو کر دیوانی عدالتوں اور پھر ہائی کورٹ میں پہنچی۔ فوجداری
کے خاتمے کی خاطر فوری طور پر دونوں فریقوں کو آمنے سامنے سے ہٹایا گیا اور حویلی خالی کرا
دی گئی مگر ملحقہ زمین پر فریقین نے اپنے اپنے قبضے کو نہ چھوڑا۔ غربی اراضی کے نوّے
ایکڑ ملکوں کے نیچے اور شرقی کے ایک سو دس ایکڑ فرمان علی کے قبضے میں رہے۔ فرمان علی
خان کے رقبہ میں دس ایکڑ کا امرودوں کا باغ بھی شامل تھا۔ رجب علی کے قبضہ کے اندر
رقبہ گو کم تھا مگر اُن کے حصّہ میں ایک بھٹہ خشت آگیا تھا جو آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔
قانونی لحاظ سے فرمان علی خان کا قبضہ اُن کی ہندوستانی جائیداد کی دستاویزات کے مطابق حق
بجانب تھا۔ رجب علی خاندان کا کلیم اس بات پہ مبنی تھا کہ یہ زمین اُن کے آباؤ اجداد سے
رائے بہادر شمشیر سنگھ کے دادا ساہوکار کلویر سنگھ نے اونے پونے اور رہن وغیرہ کے
بدلے ہتھیالی تھی، جسے اب قدرت کے قانون کے مطابق وہ واپس اپنی ملکیت میں لے
رہے تھے۔ ملکوں کا کنبہ اپنے افراد کے بل بوتے پر قبضہ قائم رکھنے کے قابل تھا۔ فرمان علی
خان تن تنہا ہی اپنی وسیع حدود کی حفاظت میں جتے تھے۔ دو نالی کندھے پہ اور کارتوس کا ڈبہ

بغل میں لیے اپنے کنبے کے علاوہ سب مزارعوں کو اپنے سائے میں رکھے، وہ آدھی آدھی رات تک کبھی کسی کھیت میں اور کبھی باغ میں کھڑے نظر آتے تھے۔ اُس جدی پُشتی رئیس کو جب ہاتھ سے کام کرنا پڑا تو اُنھوں نے کمر کس کے ایسی محنت کر دکھائی کہ سن اکیاون باون میں ہی اُن کا باغ چالیس پچاس ہزار کا اُٹھنے لگا تھا۔ اب تو اُن کے دِن بدل چکے تھے۔ ہاتھ بٹانے کو بیٹا جوان ہو چکا تھا اور چھ داماد آ شامل ہُوئے تھے جو سب کے سب مُختلف محکموں میں حکُومت کے افسر لگے تھے۔ باغ سے ملحقہ شاندار مکان تعمیر ہو چکا تھا۔ دُوسری طرف رجب علی کے کُنبے نے اپنی زمین میں ایک کی بجائے سات پکے مکان ساتھ ساتھ کھڑے کر لیے تھے۔ زمین کا مقدمہ بدستور عدالت میں چل رہا تھا۔ دونوں فریقوں کی آمدنی اِس حد تک بڑھ چکی تھی کہ روپیہ ہائی کورٹ تک چڑھایا جا رہا تھا۔ مُلک کی مُختصر سی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا موقعہ آیا جس کا دورِ غلامی میں خیال تک نہ کیا جا سکتا تھا، یعنی عدالت عالیہ کے ایک رُکن پر طرفداری کا شبہ کیا جانے لگا تھا۔ ہتک عدالت کے خوف سے کسی وکیل کی جرأت نہ تھی کہ کھُل کر بات کرے، مگر بھاری پتھر کی تعمیر شدہ ہائی کورٹ کی اُس بارُعب عمارت میں اَن دیکھی دراڑیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں اور خلقتِ خُدا کا ایمان، جو بٹوارے کے طوفان کے اندر پہلے ہی گومگو کی حالت میں تھا، ڈگمگا اُٹھا۔ مقدمہ چلتا رہا، گو اِس سے اب کچھ حاصل ہونے کا امکان صفر کے برابر رہ گیا تھا۔ قبضہ جاریہ کو گیارہ برس سے اُوپر کا عرصہ ہو گیا تھا اور کسی ایک فریق کی بے دخلی قریب قریب ناممکن ہو چکی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ فریقین ایک دُوسرے کی موجُودگی کو تسلیم کر چکے تھے اور دِل کی کدورتیں بڑی حد تک صاف ہو چکی تھیں۔ شیر بہادر اعوان کی بیٹی کی شادی پر ملکوں کا سارا خاندان جو گھُوم پھر کر اعوان برادری سے ہی تعلق رکھتا تھا، اور فرمان علی خان مدعو تھے، جہاں دس برس کے عرصے میں پہلی بار اِن کی آپس میں علیک سلیک ہُوئی تھی۔ کچھ عرصے بعد صلح جوئی میں اُس وقت مزید پیش قدمی ہُوئی جب محکمہ اِنکم ٹیکس نے بھٹہ خشت کی آمدنی کو غیر زرعی قرار دے کر اُس پہ دس سال کا مجموعی ٹیکس لگا دیا۔ فرمان علی خان کا بڑا داماد پنجاب بورڈ آف ریونیو کا ممبر تھا۔ رجب علی نے ملک جہانگیر اعوان کو بیچ میں ڈال کر سفارش کی غرض سے فرمان علی خان کو پیغام بھجوایا۔ فرمان علی خان نے روائتی وضع داری کا مظاہرہ کرتے ہُوئے پُرزور سفارش کی اور کچھ رشوت دینے دلانے کے بعد ٹیکس

کی ادائیگی کا ایک چوتھائی سے بھی کم رقم پہ تصفیہ ہو گیا۔ اس کے بعد میل ملاپ میں تو اضافہ نہ ہوا مگر ہر دو فریق کے مابین گویا ایک ان کہا معاہدہ ہو گیا کہ دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت نہیں رہی، جتنا روپیہ حکومتی کارندوں کو چڑھاوہ چڑھ چکا، اب آگے اپنا مال اپنے ہاتھ میں رہے، البتہ مقدمے کو، چھیڑ خوباں کے طور، اپنی رفتار سے چلنے دیا جائے۔ شہر کا چکر لگتا تھا، دُنیا کے کام کاج میں شرکت کا بہانہ اور خوش وقتی کا سامان ہو جاتا تھا۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی تھی۔

اِس سارے قصے میں نقصان صرف حویلی کا ہوا تھا۔ حویلی کی قفل بندی کا حکم روزِ اوّل سے قائم تھا۔ اسّی سالہ پرانی عمارت بارہ برس سے ویران پڑی تھی۔ اُس کی دہری اور تہری اینٹوں کی موٹی دیواروں اور ستونوں سے پلستر اُکھڑ چکا تھا اور موسم کی طویل شدتوں نے جگہ جگہ اینٹوں میں سوراخ ڈال دیئے تھے۔ میناروں کے کنگرے ڈھے گئے تھے۔ عقبی باغیچے میں پھل دار درختوں کو پانی دینے والا کوئی نہ رہا تھا اور وہ عرصہ ہوا سُوکھ کر مُردہ ہو چکے تھے۔ اُن کے بیچ خودرو گھاس کا جنگل سَر سے اُوپر نکلتا تھا۔ رجب علی اور فرمان علی خان کے مزارعوں نے اُن کی شاخوں کو، جو سال بہ سال پھولوں اور میووں سے لدی رہا کرتی تھیں، کاٹ کاٹ کر جلا لیا تھا۔ بچوں نے کنکر پتھر مار مار کے دروازوں کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے تھے جن کے راستے گزر کر چڑیوں کبوتروں اور فاختاؤں نے کمروں میں گھونسلے بنا لئے تھے۔ زمین کی نمی دیواروں پر دس دس فٹ تک چڑھ آئی تھی جس پہ کائی کی موٹی تہہ جمی تھی۔ یہ عالیشان عمارت جس کی تعمیر پہ اسّی سال پہلے کے زمانے میں بھی لاکھوں کا خرچہ اُٹھا ہو گا اب ایک کھنڈر کا نقشہ پیش کرتی تھی۔

"لالہ! اِس میں جن رہتے ہیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کوئی بھی نہیں رہتا۔" اعجاز نے کہا۔

"باسا کہتا ہے بارہ سال مکان خالی رہ جائے تو اس میں جن آ جاتے ہیں۔"

"باسا بیوقوف ہے۔"

"لالہ! باسا سکول سے بھاگ جاتا ہے۔" کچھ دیر کے بعد سرفراز نے کہا۔

سکول کا لفظ اعجاز کے دماغ پہ گویا ہتھوڑے کی طرح آ کر لگا۔ سرفراز کی بات کا جواب دیئے بغیر اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ سرفراز کچھ دیر رُک کر حویلی کو دیکھتا رہا، پھر

بھاگ کر اعجاز سے جاملا۔ وہ مزید سوال کرنے کے لئے مُنہ کھولنے ہی والا تھا کہ اُن دونوں کا دھیان ایک عورت کی جانب مُڑ گیا جو بائیں طرف کے کھیتوں سے نکل کر اچانک سڑک پر نمودار ہو گئی تھی۔ عورت اِن سے سو گز کے فاصلے پر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی، ہاتھ پھیلائے واویلا کر رہی تھی۔ اعجاز تیز تیز چلتا ہُوا عورت کے سامنے جارُکا۔

عورت کی عُمر کوئی پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔ اُس کی جلد کا رنگ کوئلے کی مانند سیاہ تھا اور ناک نقشہ ایسا تیکھا کہ اعجاز اُس پہ نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ عورت کے چہرے پہ بے شکن جلد چمک دار پٹی کی مانند تنی ہُوئی تھی۔ اُس کے بدن پہ فالتو ماس کی بوٹی تک نہ تھی۔ لمبے اور پتلے، چھمک کے سے لچک دار بدن پر کُرتے کے اندر کُھلی چھاتیاں تندی سے سَر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اُس کے کپڑے غلیظ اور جگہ جگہ سے پھٹے ہُوئے تھے اور وہ بین کے انداز میں ہاتھ پھیلائے رو رہی تھی۔

"ملک جی بچالو، اللہ کے نام پر رحم کرو ملک جی!" عورت اعجاز کی قمیض کھینچتے ہُوئے بولی۔ "میرے آدمی کو بچالو، ظالم اُس کی جان لے لیں گے۔ میری اور میرے بچّے کی مدد کرو، تُمہیں خُدا کا واسطہ"

سرفراز نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر اُسے کوئی بچّہ دکھائی نہ دیا۔ عورت اکیلی کھڑی دونوں ہاتھوں سے اعجاز کا بازُو دبوچے چیخ و پکار کر رہی تھی۔ سڑک کے بائیں جانب، تین چار کھیت چھوڑ کر ملکوں کا بھٹہ خشت دکھائی دے رہا تھا۔ بھٹے کی حدود کے ساتھ ساتھ کئی کچے گھروندے بنے تھے جن میں بھٹہ مزدُور اور اُن کے کنبے رہتے تھے۔ ایک گھروندے کے باہر مردوں عورتوں اور بچوں کا چھوٹا سا مجمع لگا تھا۔ اِس جمگھٹے میں کچھ ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ عورت کے اشاروں پہ اعجاز نے دُور سے ایک نگاہ اُن لوگوں پہ ڈالی، پھر اُس کی نظریں واپس عورت کے چہرے پہ لوٹ آئیں۔ عورت اعجاز کا بازُو کھینچتی ہُوئی اُسے کچی سڑک پر لے چلی جو بھٹے کو جاتی تھی۔ پیچھے پیچھے سرفراز بھی چل پڑا۔

ایک کچے گھروندے کے سامنے سے لوگوں کو ہٹاتے ہُوئے جب وہ دروازے تک پہنچے تو اندر کا منظر دیکھ کر سرفراز کا دِل دہل گیا۔ وہ جلدی سے اعجاز کی ٹانگوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور عقب سے سَر نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تنومند آدمی ایک کالے کلوٹے، سُوکھے سڑے آدمی کو بے دردی سے پیٹ رہے تھے۔ مار کھاتا ہُوا آدمی زمین پر پڑا، لاتوں اور

گھونسوں کی بوچھاڑ تلے ایک گٹھڑی کی مانند اِدھر سے اُدھر لڑھک رہا تھا۔ دونوں حملہ آور ساتھ ساتھ خوفناک آواز میں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ گھروندے میں قدم رکھتے ہی عورت نے ایک جست بھری اور زمین پہ پڑے آدمی کے اُوپر گر کر اُسے اپنے بدن سے ڈھک لیا۔ مارنے والوں میں سے ایک نے عورت کو بالوں سے گھسیٹ کر الگ کیا اور دھکا دے کر دُور پھینک دیا۔ اعجاز سے نہ رہا گیا۔ اُس نے قدم اُٹھا کر دہلیز پار کی اور گھروندے کے اندر جا کھڑا ہُوا۔ جیسے ہی اُنھوں نے ایک تیسرے آدمی کو کمرے میں کھڑا پایا، دونوں حملہ آوروں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ چہروں پہ ہلکی سی سراسیمگی لئے، جیسے کوئی انتہائی غیر متوقع واقعہ پیش آ گیا ہو، وہ کبھی اعجاز کو اور کبھی زمین پہ پڑے اَدھ موئے جسم کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد اُن میں سے ایک نے اوندھے پڑے آدمی کی پسلیوں پہ ایک زوردار لات جمائی اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے ہُوئے دونوں گھروندے سے نکل گئے۔ سرفراز نے دیکھا کہ ایک کی سفید شلوار پہ زخمی کے خُون کے چھینٹے پھیلے تھے، جنہیں وہ جاتے جاتے تردد سے پائنچہ پھیلا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر سرفراز کو اَیسے لگا جیسے وہ بہت دُور سے اِسے دیکھ رہا ہو۔

تین چار برس کی عُمر سے ہی سرفراز کے اندر یہ ایک خاص اہلیت پیدا ہو گئی تھی، جس کا اُسے اب آ کر کچھ کچھ احساس ہونا شروع ہُوا تھا۔ کسی جگہ پر، کسی شے کو، کسی واقعہ کو دیکھتے ہُوئے معاً اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ وہاں سے ہٹ کر دُور جا کھڑا ہُوا ہے اور وہاں سے اس پہ نظر پھینک رہا ہے، گویا وہاں حاضر بھی ہے اور الگ بھی ہو گیا ہے، جیسے دُوربین کے اُلٹے سرے سے نظارہ کر رہا ہو۔ اَیسے موقعوں پہ واقعات کی چھاپ اُس کے ذہن پہ روزمرہ کی نسبت کہیں گہری ثبت ہو جاتی تھی۔ چند ماہ پہلے، جب اعجاز اُس کے سکول کا کام دیکھ رہا تھا، سرفراز نے اپنی سمجھ کے مطابق بھائی سے اِس کا ذِکر بھی کیا تھا۔

”لالہ! کوئی کوئی سبق مجھے یاد ہو جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کوئی کوئی نہیں ہوتا۔“

”یہی تو تیری مصیبت ہے۔“ اعجاز نے کہا۔ ”آدھی بات تجھے یاد رہتی ہے، آدھی تو بھول جاتا ہے۔ اَیسے تو کام نہیں چلے گا۔“

"پڑھتے پڑھتے کتاب دُور چلی جاتی ہے۔"

"ہیں؟" اعجاز چونک اُٹھا۔ "دُور چلی جاتی ہے، دُور کیسے چلی جاتی ہے؟"

"پتا نہیں لالہ! کلاس میں ماسٹر صاحب بھی کبھی دُور چلے جاتے ہیں، بلیک بورڈ بھی۔"

اعجاز کئی لمحے تک تشویش سے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "جیسے کوئی خواب ہو؟"

"اونہوں!" سرفراز نے نفی میں سَر ہلایا۔

"اونہوں کیا۔"

"خواب میں تو سب کچھ اصلی لگتا ہے۔"

"تیری چیزیں جب دُور چلی جاتی ہیں تو اصلی نہیں لگتیں؟"

"اصلی لگتی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"بس دُور سے دکھائی دیتی ہیں۔"

"اِسی لیے تو بھول جاتے ہو۔"

"نہیں لالہ! جب دُور ہو جاتی ہیں تو نہیں بھولتیں۔"

"نہیں بھولتیں؟"

"اونہوں، صاف دکھائی دیتی ہیں۔"

"مجھے تو تیری سمجھ نہیں آتی سرفرازے!" اعجاز جھلا کر بولا۔ "تیرا دماغ بھٹکتا ہے، اِسی لیے تیری یادداشت ٹھیک نہیں۔ دھیان دے کر پڑھا کر، فیل ہو گیا تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔"

اب سرفراز دہلیز پہ کھڑا اُس گھروندے کے اندر، جہاں حملہ آوروں کے جاتے ہی مزدور مرد، عورتیں اور بچے گھُس کر داخل ہو چکے تھے، دیکھ رہا تھا اور نظروں ہی نظروں کے اندر گویا ہٹ کر الگ جا کھڑا ہُوا تھا گو دروازے کے اندر رُکا تھا۔ اب زخمی اُسے نظر نہ آ رہا تھا۔ ایک ہجوم کے جمگھٹے نے اُسے ڈھانپ لیا تھا، صرف اُس کے کراہنے کی آواز سرفراز کو خوفزدہ کر رہی تھی۔

"ہائے، مجھے مار دیا، میری جان نکال دی۔ نہ کرو، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، اللہ کے واسطے

مجھے قبر میں چھوڑ آؤ، مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے قبر میں ڈال دو، ہائے۔۔۔،
گو سب مرد اور عورتیں اس کے اوپر جھکے ہوئے ایک ساتھ بول رہے تھے اور اُسے
سیدھے رُخ پہ لٹانے کی کوشش میں چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے مگر
اِس شور کے اندر سے اُٹھتی ہوئی زخمی آدمی کی کمزور سی آواز ایسی صفائی سے سرفراز تک
پہنچ رہی تھی کہ جیسے اس گھروندے میں صرف وہی آواز موجود ہو اور باقی سکوت کا عالم
ہو۔ سرفراز کی اس خاص کیفیت میں ایک اور بات بھی شامل تھی۔ وہ سامنے پیش آنے
والے واقعہ سے نظر ہٹا کر گردوپیش کا اُسی اِنہماک سے جائزہ لینا شروع کر دیتا تھا، جیسے
کلاس میں جب ماسٹر صاحب بولتے بولتے دُور چلے جاتے تو وہ بلیک بورڈ کے اِرد گرد کی
دیوار پر سفیدی، گردوغبار یا پنسل سے بنی ہوئی مختلف شکلوں کا جائزہ لینے لگتا، پڑھتے پڑھتے
کتاب دُور چلی جاتی تو وہ حاشیے پر لگے ہوئے دھبوں کا ملاحظہ کرنے لگتا تھا۔ اِسی طرح اب
وہ لوگوں کے جمگھٹے سے نظر ہٹا کر گھروندے کے اندر نظر دوڑانے لگا۔ کچی دیواروں والا
چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان، صرف ایک رستہ آنے جانے کا
دروازے کی صُورت میں تھا جس کا ایک پٹ ندارد تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ زمین پر
گدڑی بچھی تھی جس پہ کچھ کپڑے پڑے تھے۔ آگے چند برتن اور مٹی کا چُولہا تھا جس
کے ساتھ لوہے کا توا کھڑا تھا اور پاس ہی بانس کی تیلیوں والی جھاڑو رکھی تھی۔ کچھ دیر میں
جب سرفراز کی آنکھیں اندھیرے سے مانُوس ہوئیں تو اُسے گدڑی کے ساتھ تاریک
کونے میں ایک اِنسانی شکل دکھائی دی۔ اُس نے نظریں جما کر دیکھا تو ایک سات آٹھ سال
کا بچہ تھا۔ ماسوا ایک لنگوٹی نما چیتھڑے کے جو اُس کی کمر کے ساتھ بندھا تھا، بچہ بدن سے
ننگا تھا۔ وہ کونے میں سکڑ کر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے سے ایک گہری، پیدائشی دہشت
جھلک رہی تھی۔ بچے کو اِس طرح بیٹھے دیکھ کر سرفراز کی نظروں کا فاصلہ سکڑنے لگا اور وہ
واپس گھروندے میں پہنچ گیا۔ ساتھ ہی اُسے زخمی کی آواز پھر سُنائی دی۔

"ہا آ آ۔۔۔" وہ عجیب سی خُشک، روتی ہوئی آواز میں پکار رہا تھا۔ "مجھے
ہاتھوں پر اُٹھا کر رکھو، رسُول کے واسطے زمین پر نہ ڈالو، میرا لُواں لُواں ٹُوٹ گیا ہے۔۔۔"

دفعتاً سرفراز کو احساس ہُوا کہ اُس خاصیت والی آواز اُس نے پہلے کہیں سُن رکھی
ہے۔ وہ اپنے خیال میں اُسے تلاش کرنے لگا۔ پہلے اُس کا خیال اپنے باپ کی جانکنی پہ جا کر

اٹکا۔ یہ پہلی بار تھی کہ بچّے نے اپنے باپ کی آخری آوازوں کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ اُنہیں دھیان میں لایا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ آوازیں گیلی اور ملائم تھیں اور روتی ہُوئی نہ تھیں بلکہ کھڑی کھڑی ہی ٹُوٹتی جاتی تھیں۔ چند لفظوں کے بعد آخر اس کی سوچ ایک جگہ پہ جا کر رُکی۔ اُسے پتا چل گیا کہ زخمی کی آواز کی کیفیت کیا تھی۔۔۔ اگر اس آواز سے الفاظ جُدا کرلئے جائیں تو یہ ہو بہو اس گائے کے ڈکرانے کی آواز سے مشابہ تھی جسے بچپن میں اُس نے بچھڑا جنتے ہُوئے سُنا تھا۔

اب اعجاز زخمی کے پاس کھڑا لوگوں کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔

"ہوا لگنے دو، آگے سے ہٹ جاؤ، دروازہ چھوڑ دو بیوقوفو! دیکھتے نہیں ہوا بند ہو گئی ہے، اُسے سانس آنے دو، کیا ہلہ مار کے آگئے ہو، یہ کوئی تماشا ہے؟ چارپائی لے کر آؤ۔۔۔"

اپنے بھائی کا چہرہ دیکھ کر سرفراز کا جی شاداب ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ پژمُردگی کی وہ باریک سی جھلی جو اعجاز دن بھر لیے لیے پھرتا رہا تھا اب اُس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں کے کناروں پہ اعتماد کی قوت اُبھر آئی تھی۔ اعجاز کے اندر یہ تبدیلی سرفراز نے پہلے اُس وقت دیکھی تھی جب باہر سڑک پر عورت واویلا کر رہی تھی اور اعجاز اُس کے چہرے، اُس کے پھیلے ہُوئے بازوؤں اور پھر کُرتے کے اندر اُس کی چھاتیوں کو ایسے مگن ہو کر دیکھے جا رہا تھا جیسے کہ عورت کی آواز کو سُن ہی نہ رہا ہو۔ اب اعجاز کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ اس میں ایک گونج پیدا ہو گئی تھی جیسے حلق کی بجائے چھاتی کے اندر سے نکل کر آ رہی ہو۔

"جی چارپائی تو کوئی نہیں ہے۔" کسی نے کہا۔

"چارپائی کوئی نہیں ہے؟" اعجاز نے کمرے کے اندر نظر دوڑا کے دیکھا۔ "کسی کی مانگ کر لے آؤ۔"

"چارپائی تو صرف جمعدار کے پاس ہے۔"

"تو اس سے لے آؤ۔"

اس پر کئی آوازیں ایک ساتھ اُٹھیں۔ "وہ شہر گیا ہُوا ہے۔"

ایک دُوسرا آدمی بولا۔ "شہر کہاں گیا ہے، سچی بات بولو۔"

"تو بھی بات کدھر سے لایا ہے۔" تیسرے نے کہا۔ "تیری موت آئی ہے؟"
آخر ایک مزدور بولنے والوں کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اوئے چپ کرو، ادھر بندہ مر رہا ہے، تم بڑ بڑ کری جا رہے ہو۔ ملک جی! آپ چارپائی وارپائی کو چھوڑیں۔ ہم متھاج لوگ ہیں، اُسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ بس آپ کے دو لفظ چاہئیں۔"

"کیا لفظ؟" اعجاز نے پوچھا۔

"کمپوڈر کو ایک پرچی لکھ دو کہ اس غریب کی دوا دارو کرے۔ آپ کی بات کوئی نہیں ٹالے گا۔"

"کوئی کاغذ واغذ ہے؟" اعجاز نے پوچھا۔ عورت اس کو انجان سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اعجاز کو یاد آیا کہ وہ قلم اور کاغذ کا ایک آدھ پرزہ جیب میں رکھا کرتا ہے، مگر وہ کئی لحظے تک اسی طرح عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا جیسے مسحور ہو چکا ہو۔ پھر اچانک اس نے نظر جدا کر کے جیب ٹٹولی اور اپنا فاؤنٹین پین اور سفید کاغذ کا تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا۔ ایک آدمی باہر سے بانس کے دو موٹے ڈنڈے لیے داخل ہوا جو اس نے ایک دوسرے کے متوازی، زمین پر رکھ دیے۔ پھر انھوں نے گدڑی سے ایک موٹا کمبل اٹھایا اور اس کے کونے رسّی کی خوب مضبوط گانٹھوں سے ڈنڈوں کے چاروں سروں کے ساتھ باندھ دیے۔ جب باندھ چکے تو سب نے مل کر ہائے ہائے کرتے ہوئے زخمی نوجوان کو کمبل پر لٹا دیا۔

"میری پسلیوں کو ہاتھ نہ لگاؤ ظالمو!" وہ بلک کر بولا۔

"خیر ہے شادے، خیر کا بول منہ سے نکال، اللہ رحم کرنے والا ہے۔"

"اللہ ظالموں کو دوزخ نصیب کرے۔" عورت روتی ہوئی چلائی۔

چار آدمیوں نے اپنی اپنی چادریں تہہ کر کے ان کے گدّے بنائے اور انھیں کندھوں پہ رکھ لیا۔ پھر انھوں نے جھک کر بانسوں کے سرے اٹھائے اور اس ڈولی نما سواری کو کندھوں پہ لیے گھروندے سے باہر نکل گئے۔ اعجاز نے رقعہ عورت کے ہاتھ میں تھمایا اور دونوں ڈولی کے پیچھے سڑک کی جانب چل پڑے۔ سرفراز ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔

"تیرا آدمی ہے؟" اعجاز نے پوچھا۔

"ہاں!" عورت ہولے سے بولی۔

"یہ لوگ کون تھے؟"

"کیا پُوچھتے ہو مَلک جی!" عورت خاموش ہو گئی۔

"کوئی تو ہوں گے۔"

"ہمارے مالک تھے۔"

"ملکوں کے آدمی تھے؟"

"اُن کے جمعدار تھے۔ مارنے مروانے کا کام ٹھیکیدار انہی سے کرواتے ہیں۔"

"قِصّہ کیا تھا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"قِصّہ کیا ہو گا مَلک جی! اپنے بچّے کو دو دِن سکُول بھیجا ہے، بس یہ قصہ تھا۔"

سکُول کا نام سُن کر اعجاز کے دِل کو ایک ہَول کا لگا، جس بات کو وہ دِن بھر سے اپنے اندر دفن کئے ہُوئے تھا، جیسے ایک نعش کو لِئے پھرتا ہو۔ اَور جسے وہ اس گھروندے کے اندر وقتی طور پہ فراموش کر چُکا تھا، اب دوبارہ اپنا سارا بوجھ لِئے اُس کے سَر پہ آسوار ہُوئی تھی۔

"اس بات پر جھگڑا کیسا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"دو ہاتھ نمبر سے نِکل جائیں تو ہمارا ٹھیکہ پُورا نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار ایک ہزار نگ روز کے مانگتا ہے، کہتا ہے ہماری پیشگی کی رقم زیادہ ہے۔ سکُول کی ضِد میں نے کی تھی، وزن شادے پر آپڑا۔ میں نے سوچا تھا بچہ کچُھ پڑھ لکھ جائے، اس پیشگی کی غلامی سے نِکل جائے گا جیسے اللہ کی مرضی۔۔۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"کنیز!"

"عیسائی لوگ ہو؟"

"مسلم شیخ ہیں مَلک جی! اللہ رسُول کے ماننے والے ہیں۔ یہاں ہم دو گھر ہی ایمان والے ہیں۔ باقی سب عیسائی ہیں۔"

اب وہ سَڑک پر آچڑھے تھے۔ رات کا اَندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔ یہاں سے ان کے رستے جُدا ہوتے تھے۔ نورپور کی ڈسپنسری کا رستہ دائیں کو مُڑتا تھا، شجاع آباد بائیں ہاتھ پہ

تھا۔ دائیں کو چار آدمی ڈولی کو اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اعجاز کچھ دیر تک وہاں رُکا عورت کو سڑک پر اُن کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اونچی آواز میں مخاطب ہو کر بولا، "کل پتا کرنے آؤں گا۔"

عورت نے ایک لمحے کو پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ بولی اور چل پڑی۔

اعجاز اور سرفراز ساتھ ساتھ گھر کو جا رہے تھے۔

"لالہ! تم نے آج حاضری کا رجسٹر کلاس میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟" سرفراز نے پوچھا۔

اعجاز نے بے خیالی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "یاد نہیں رہا۔" پھر وہ چپکے سے بولا اور خاموش ہو گیا۔

عمر رسیدہ کا مطلب تو مجھے چوتھی جماعت میں ہی سمجھ میں آ گیا تھا، سرفراز نے اعجاز کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سوچا، اور حویلی شمشیر سنگھ کا بھی پتا تھا کہ مالکوں کی لڑائی کی وجہ سے اُسے تالا لگ چکا ہے۔ میں تو صرف لالے سے باتیں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ میں نے ہیڈ ماسٹر کے چپڑاسی کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس وقت لالے کی کلاس ہماری کلاس کے سامنے والے کمرے میں تھی۔ لالہ کلاس کو بیچ میں ہی چھوڑ کر چپڑاسی کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔ اُس نے پہلے کبھی ایسا نہ کیا تھا بلکہ اکثر وہ گھنٹی ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک پڑھائی کو جاری رکھا کرتا تھا۔ آج جب وہ کلاس کو چھوڑ کر نکلا تو سب لڑکے چھٹی کا شور مچانے کی بجائے خاموشی سے منہ اُٹھا کر اُسے باہر جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ مجھے اُسی وقت کھٹک گئی تھی کہ کوئی بات ہے جس کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر نے اتنی جلدی میں لالے کو بلایا ہے۔ بعد میں لوہاروں کے پھجے نے مجھے بتایا کہ وہ ٹٹی خانے سے پیشاب کر کے واپس آ رہا تھا تو اُس نے لالے کو سلام کیا تھا جس کا جواب لالے نے ایسے دیا تھا جیسے بولتے بولتے اُس کا گلا بند ہو گیا ہو۔ ہماری کلاس کی دُوسری کھڑکی سے سکول کا گیٹ نظر آتا تھا۔ میں نے لالے کو گیٹ پار کر کے بائیں جانب کو مڑتے ہوئے دیکھا اور اُس کی چال کو دیکھ کر میرا دِل سکڑ گیا۔ وہ ماسٹر جس کا سارے سکول میں ایسا دبدبہ تھا کہ طالب علم تو ایک طرف، میاں ذوالفقار صاحب ہاکی پلیئر جو پی ٹی ماسٹر تھے اور چودہ چودہ سال کے لڑکے کو ایک ہاتھ پر سر

سے اُوپر اُٹھا لیا کرتے تھے، وہ بھی لالے کے سامنے دم نہ مارتے تھے، وہ آج حاضری کا رجسٹر بھی کلاس میں چھوڑ کر، سر جھکائے سکُول سے نِکل گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُسی وقت لالے کے پیچھے جاؤں مگر چھُٹی ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ چھُٹی کے بعد میں نہ گراؤنڈ میں کھیلنے کے لِئے رُکا نہ کِسی سے بولا چالا، بھاگتا ہُوا گھر پہنچا۔ لالہ چارپائی پہ لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بات ہے جس نے اُسے تردد میں ڈال دیا ہے۔ بی بی چاٹی جتنا بڑا پیٹ لِئے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ مگر اُس نے بطنوں بڑے مزے دار پکائے تھے۔ میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ لالہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا۔ "ذرا باہر جا رہا ہوں۔" مجھے دِل میں محسُوس ہوا جیسے لالہ کِسی خطرے کے سامنے جا رہا ہے۔ میں بھی ضِد کر کے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جُوں جُوں ہم چلتے گئے میرے دِل میں پختہ یقین ہو تا گیا کہ لالے کے ساتھ کوئی واردات گزُری ہے۔ وہ کبھی یُوں گھُومنے کے لِئے گھر سے نہ نِکلا تھا، ہمیشہ کِسی کام سے یا ملنے ملانے کے لئے جایا کرتا تھا۔ آج وہ چُپ چاپ کھیتوں میں اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں نے باتیں چھیڑنے کے بہانے نکالے جن کا مطلب کوئی نہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کِسی طرح لالے کا دھیان بٹاؤں۔ لالہ میری باتوں کا جواب اس لِئے دیتا جا رہا تھا کہ اُس کے خیال میں میری دِلچسپی اِن سوالوں میں تھی۔ حالانکہ اِن سوالوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مطلب کوئی نہ تھا، صرف مقصد تھا، لالے کی اس حالت کو بدلنا جو میرا دل بند کئے جاتی تھی۔ ہم ڈھڈی والے کی سڑک پہ چڑھے تو میں نے باغوں اور حویلیوں کی باتیں شرُوع کر دیں۔ آخر جب ہمیں کنواں کھودنے والے نظر آئے تو میں نے کہا، لالہ! چلو چل کے دیکھیں۔ لالے کو خیال تھا کہ میں نے یہ کارروائی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اصل میں ایک بار میں کنوئیں کی کھُدائی دیکھ چُکا تھا۔ میں نے چک اُترتے ہُوئے، ٹوبوں کو ڈبکیاں لگاتے، لوگوں کو خُوشیاں مناتے اور عورتوں کو روتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پھر بھی میں ایسا مگن ہو کر کنوئیں کے کنارے پہ بیٹھا چک کو اترتے ہُوئے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں لیکن میری ایک نظر لالے پہ لگی رہی تھی۔ میرے دِل میں اُمنگ تھی کہ وہ اس خول سے نِکلے جس میں داخل ہونے کے بعد اُس نے خاموشی سے سر جھکا کر اور ہاتھ پُشت پہ باندھ کر چلنا شرُوع کر دیا تھا۔ یہ خول کِسی اور کو نظر نہ آتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اُس کے پیچھے لالے نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔ دِن کی روشنی گھٹتی جا رہی تھی۔

لالے کا چہرہ سنولا گیا تھا اور میرا دِل اُلٹنے لگا تھا۔ اُس وقت خُدا نے ہماری مدد کی اور یہ عورت سڑک پر دہائی دیتی ہوئی ہمیں مِل گئی۔ لالے کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی نظریں عورت سے نہ ہٹتی تھیں، جیسے کہ وہ ساری دُنیا اور دُنیا کے کاموں کے ساتھ صرف اس عورت کے ذریعے سے جڑا ہوا ہو۔ اُس کے اُوپر سے وہ پردہ جس نے اُسے ڈھانپ کر دُنیا سے الگ کر دیا تھا، اُتر چکا تھا۔ آخری دم تک، جب تک عورت نُورپُور کے رستے پر روانہ نہ ہو گئی، لالے کی جان تنومند رہی۔ میں اور لالہ کچھ دیر تک سڑک پہ کھڑے اُسے جاتے ہُوئے دیکھتے رہے تھے۔ میں نے لالے کے چہرے پہ نظر ڈالی تو اِس کی آنکھیں کچھ مدھم پڑ گئی تھیں۔ عورت کو جاتے ہُوئے دیکھ کر مجھے بھی محسُوس ہوا جیسے کسی دولت کا تحفہ میرے ہاتھ سے نِکلا جاتا ہے۔ مگر اب میرا دِل خُوش ہے۔ آنکھوں کی ذرا سی میل کے سوا لالے کا سارا بدن سیدھا ہے، سر اُٹھا ہُوا ہے اور بازُو چال کی رفتار کے ساتھ دونوں جانب ہِل رہے ہیں۔

گھر کے دروازے پر چاچے احمد کی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ صحن میں دو تین چارپائیاں بچھی تھیں جن پہ چاچے کے ٹبر کے علاوہ گاؤں کے مُتعدد لوگ بیٹھے تھے۔ زمین پر لالٹین رکھی تھی۔ چارپائیوں کے درمیان حُقّہ چل رہا تھا۔

"اجاز!" چاچا احمد اُنہیں دیکھتے ہی بولا۔ "تو کہاں سیر سپاٹا کر رہا ہے؟"

"ذرا پھرنے گئے تھے۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "خیر تو ہے؟"

"تیرے اُوپر بات ختم ہوتی تو خیر کہاں کی اور نخیر کہاں کی؟"

"کیا بات ہے چاچا؟"

"تجھے پتا نہیں کیا بات ہے؟"

رحمت چوہان بول اُٹھا۔ "تیرے ٹبر کا وقت پُورا ہو گیا ہے، اجاز! خیر ہے۔"

آٹے کی چکی والا سیف اللہ بولا۔ "خیر ہی خیر ہے، دائی آ گئی ہے۔ چوہدری احمد تو بات کا بتنگڑ بنا رہا ہے۔"

"بتنگڑ خواہ مخواہ؟" چاچا احمد اُسی مزاج سے بولا۔ "اکیلی لڑکی نے اُٹھ کر دُہائی دی

تو پھر کوئی آیا۔ اس میں ہمت نہ ہوتی تو پھر؟"

"واہ، چوہدری!" ایک کسان بولا۔ "اپنی عورتیں کھیت میں بچے جن کر کماد کی چھلائی کرنے لگتی ہیں۔"

"اس کی ماں نے سو دفعہ کہا چل۔" چاچا احمد بولا۔ "تیرا وقت سخت ہے، اپنے گھر چلی چل، وقت ٹل گیا تو آجانا مگر لڑکی کی ایک ہی ضد کہ۔۔۔"

"اس کا گھر یہ ہے۔" سیف اللہ نے زور سے پیر زمین پر مار کر کہا۔ "یہ، چل اب چپ کر، بے فضول باتیں کرے جاتا ہے۔ ہم کوئی بے وسیلہ لوگ ہیں؟ اللہ سے خیر کی دُعا مانگ، خوشی کا موکہ ہے۔"

سیف اللہ کا سخت لہجہ سُن کر چاچا خاموشی سے حُقہ گڑ گڑانے لگا۔

چلو بھئی، روٹی آگئی۔" سیف اللہ نے کہا۔ "ذرا ہٹ کے بیٹھ جاؤ۔ جگہ دو، بسم اللہ کرو۔"

سیف اللہ کے گھر سے سونف والے گڑ کے میٹھے چاولوں کی پراتیں اور دودھ کے کٹورے آگئے۔ تینوں چارپائیوں پر لوگ اِدھر اُدھر ہو کر بیٹھ گئے اور درمیان کی خالی جگہ پر چاولوں کی پراتیں رکھ دی گئیں۔

"یہ پرات اور کٹورہ اندر دے دو۔" سیف اللہ نے ہدایت دی۔

چارپائیوں پہ بیٹھے مہمانوں نے مقدار کے مطابق کٹوروں سے دودھ اُنڈیل کر چاولوں پر ڈالا اور اُن میں اُنگلیاں ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ گھر کے اندر سے عورتوں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔

"آجا سرفرازے!" چاچے احمد نے بلایا۔ "لے یہ چاول کھا۔"

اعجاز اُسی طرح صحن میں کھڑا انجانے پن سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر آ کر سیف اللہ کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا اور چاولوں کے نوالے آہستہ آہستہ مُنہ میں ڈالنے لگا۔ سرفراز گو کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ کی عمر کو پہنچ چکا تھا، مگر اُسے بچے کی پیدائش کا شعور نہ تھا، صرف ایک مِلا جُلا سا تصور ایسا تھا کہ بی بی کے چاٹی سے پیٹ کے اندر کوئی بچہ تھا جو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح نکل کر آئے گا اور ایک چھوٹے سے اصلی بچے کی شکل میں ظاہر ہو گا۔

چاول کھا چکنے کے بعد وہ گھر کے اندر جانے لگا تو چاچے نے سختی سے آواز دی۔

"اَندر نہ جا سرفرازے! اِدھر آ جا۔"

سرفراز آ کر پھر چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھ گیا۔ دُوسری چارپائی کی پائنتی عباس بیٹھا ایک سوٹی سے زمین پہ لکیریں کھینچ رہا تھا اَور جب تھک جاتا تو سَر اُٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگتا تھا۔

رات سنسان ہوتی جارہی تھی۔ کھُلے مَوسم کی رات تھی۔ نویں دسویں کا چاند صاف شفاف آسمان کے بیچ کھڑا تھا جس کی روشنی سے تارے مدّہم پڑے ہُوئے تھے۔ کئی ایک آدمی چارپائیوں سے اُٹھ کر اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ صحن میں چاچے احمد کے علاوہ رحمت چوہان، جس کی دیوار گھر سے ملتی تھی۔ اَور مولوی فقیرالدین پیش اِمام رہ گئے تھے۔ میراثیوں کے ٹبّر سے دو آدمی زمین پہ بیٹھے تھے۔

"دِتّو، ٹوپی پر آگ تو رکھ کے لا۔" چاچے احمد نے کہا۔

"حُقّہ بھی تازہ کردے۔ بے مزہ ہوگیا ہے۔" رحمت چوہان بولا۔

دِتّو میراثی حُقّہ اُٹھا کر نلکے پر لے گیا۔ وہاں اُس نے باسی پانی زمین پر اُنڈیل کر حُقّہ خالی کیا جس کی سَڑاند صحن میں پھیل گئی۔ حُقّے میں تازہ پانی بھر کر اُس نے نلی پر ہونٹ جمائے اَور پھُونک مار کر دُوسرے سرے سے زائد پانی خارج کیا۔ پھر کش کھینچ کر گڑگڑ کی آواز سے پانی کا اَندازہ کیا۔ اُسی طرح کچھ مزید پانی نکالا اَور دوبارہ کش کھینچا۔ اس عمل کو تیسری بار دُہرانے کے بعد جب وہ پانی کی صحیح مقدار کا تعیّن کرچکا تو تازہ حُقّے کو اُٹھا کر واپس چارپائیوں کے پاس لے آیا۔ پھر وہ زمین پہ رکھی ہوئی حُقّے کی ٹوپی اُٹھا کر صحن کے کونے میں گیا جہاں سلگتے ہوئے اُپلوں کی ڈھیری سے دُھوئیں کی باریک سی لاٹ اس ٹھہری ہُوئی رات میں سیدھی آسمان کو اُٹھ رہی تھی۔ وہاں پہ دِتّو نے ٹوپی خالی کی، ہتھیلیوں میں مَل مَل کر خشک تمبا کُو چُورا کیا۔ پھر اس نے ٹوپی میں گڑ کی ایک ڈلی رکھی اَور اس پہ تمبا کُو بھر دیا۔ اُس کے بعد پھُونک پھُونک کر اُس نے مُردہ راکھ اُڑائی اَور اَندر سے انگارہ اُپلے چمٹے میں اُٹھا کر تمبا کُو پہ دبادیئے۔ تازہ بہ تازہ حُقّے کا ایک کش چاچے احمد کے حلق کو ایسے جا کر لگا کہ کھانسی کے غوطے سے اُس کا سانس اُوپر کا اُوپر اَور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پھر رحمت نے ذرا احتیاط سے کش کھینچا اَور کھانسنے لگا۔

"کڑوا تما کُو ہے۔" چاچا احمد سانس برابر کرکے بولا۔ "سینہ جلا کے رکھ دیا۔"

"میرا بھتیجا پشور کی مارکیٹ سے لے کر آیا ہے۔" رحمت چوہان نے بتایا۔ "کہتا ہے اس سے کڑوا تما کو مُلک میں کہیں نہیں ملتا۔" رحمت رازدارانہ انداز میں چاچے احمد کی طرف جھک کر بولا۔ "سُنا ہے یہ تما کو اُدھر انڈیا کو بھی سمگل ہوتا ہے۔"

"بڑی قیمت پڑتی ہوگی۔" چاچے احمد نے کہا۔

"ہاں!" رحمت نے سَر ہلا کر جواب دیا اَور خاموش ہو گیا۔

اب اُن کے حلق تازہ حُقّے کے عادی ہو چلے تھے۔ رحمت چوہان، چاچا احمد، مولوی فقیرالدین، دِتّو میراثی اَور اُس کا بیٹا ساجا باری باری حُقّہ گُڑگُڑا رہے تھے اَور رات بھیگنے کے ساتھ بھاری اَور دھیمی ہوتی ہُوئی آوازوں میں کوئی کوئی بات کر رہے تھے۔ اعجاز دُوسری چارپائی پہ خاموش بَیٹھا تھا۔ سب کے کان گھر کے اَندر کی جانب لگے تھے جہاں سے وقفے وقفے پر سکینہ کی اذیت ناک چیخ سُنائی دیتی جو دُوسری عَورتوں کی آوازوں میں دب جاتی۔ عَورتوں میں ماسی اَور دائی کی آوازیں نمایاں تھیں۔

"صبر کر کڑیئے، صبر کر، زور لگا' زور لگا۔ اللہ پاک خُوشیاں نصیب کرے۔"

سکینہ کی چیخ ایسی بدلی ہُوئی آواز میں بلند ہو رہی تھی کہ ہر بار اُسے سُن کر باہر بَیٹھے ہُوئے لوگ چونک پڑتے۔ اعجاز دونوں ہاتھوں کو ایک دُوسرے میں دبائے مروڑتا جا رہا تھا۔ مولوی فقیرالدین اُمید پر بَیٹھا تھا کہ پیدائش پر اپنے مذہبی فرائض انجام دے۔ میراثی لڑکے کی آس پہ بَیٹھے تھے کہ مبارک باد پیش کر کے انعام وصول کریں۔ رحمت چوہان سانجھی دیوار کے ناطے بَیٹھا تھا۔ گاؤں بھر میں اب مکمّل خاموشی تھی جس میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اضافہ کر رہی تھیں۔ اُسی طرح سائیں کی ڈھیری سے آتی ہُوئی شبیرے کی بانسری کی آواز بھی رات کے اس سکُوت کا حِصّہ تھی۔ سائیں کی ڈھیری کوئی مزار نہ تھا بلکہ گاؤں سے باہر ایک ٹاہلی کے نیچے شاملات زمین پہ مٹّی کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا جو سالوں سے وہاں پڑا تھا اَور دُھوپ اَور بارشوں کے اثر سے تقریباً پختہ ہو چُکا تھا۔ شبیرا حاجی عزیز دین کا بیٹا تھا جن کی کریانے کی دوکان تھی۔ شبیرا کوئی کام کاج نہ کرتا تھا' سارا دِن دوکان پہ لیٹا سویا رہتا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کے سَر میں "عشق کا بخار" تھا۔ جیسے ہی رات ہوتی وہ سائیں کی ڈھیری پہ جا چڑھتا اَور وہاں بَیٹھا دیر تک بانسری بجاتا رہتا۔ کتوں کے بھونکنے اَور شبیرے کی بانسری کی آوازیں اس حد تک رات میں گھُل مِل چکی تھیں کہ

اُن کا اپنا کوئی الگ وجُود ہی نہ رہا تھا۔ کئی سال بعد ایک روز صُبح سویرے شبیرا سائیں کی ڈھیری پر مُردہ پایا گیا۔ کِسی کو اُس کے "عشق" کی خبر نہ ہُوئی۔ کِسی نے کہا سانپ ڈس گیا ہے، کوئی بولا "سایہ" اپنا کام کر گیا ہے۔ سُنا گیا کہ شبیرے کی مَوت کے دِن کوئی فقیر اِدھر سے گزُرا اَور مَوت کا واقعہ سُن کر بولا تھا۔ "اسے اپنی جان کا دُکھ تھا۔" اُس کی بات کِسی کی سمجھ میں نہ آئی تھی مگر اس روز کے بعد گاؤں کی راتوں میں کبھی بانسری کی آواز بلند نہ ہُوئی۔ اپنی بانسری کی آواز کی مانند شبیرا جس طرح تن تنہا دُنیا میں رہا اُسی طرح رُخصت ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ شبیرے کی موت کے بعد ایک عرصے تک رات کی وسیع خاموشی میں اُنہیں نیند نہ آتی تھی۔ اِن لوگوں کی زندگیوں پر گاؤں کے کِسی بڑے سے بڑے آدمی نے ایسا اثر نہ چھوڑا تھا۔

رات آدھی نِکل گئی تھی۔ سرفراز چارپائی پہ بیٹھا چاندنی میں صحن کی زمین پر بکائن کے سائے کے گرداگرد آنکھوں ہی آنکھوں سے حاشیہ کھینچ رہا تھا کہ اس کی پسلیوں میں ایک چھڑی کی نوک چبھی۔ عباس اُس کے بازُو پہ کھڑا تھا۔ عباس نے سَر کے اشارے سے اُسے باہر چلنے کو کہا۔ سرفراز چُپکے سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ عباس صرف بارہ سال کا تھا مگر قد میں سرفراز سے پانچ سال بڑا لگتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ سکُول سے آکر کپڑے اُتارتا اَور چاچے احمد کے ساتھ ہل کر بڑے بڑے کھیتوں میں ہل چلایا کرتا تو جوان آدمی نظر آتا تھا۔ دروازے سے نِکل کر عباس اپنی بَیل گاڑی سے بچتا ہُوا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔

"ڈنڈی دکھاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں!" سرفراز نے کہا۔

عباس نے دونوں ہاتھ رانوں پہ ملنے شرُوع کیے اَور پھر جلدی سے تہمد اُٹھا دیا۔ سرفراز اَور اُس کے ہمجولی کبھی کبھی، جب مستی اُن کے سَر پہ سوار ہوتی اَور آس پاس کوئی ماسٹر نہ ہوتا تو چھُٹی کے بعد گراونڈ کے اندر رُک کر ایک دُوسرے کو اپنی اپنی ڈنڈیوں کی جھلک دکھلایا کرتے تھے، مگر اُس وقت چاند کی روشنی میں عباس کی ڈنڈی کا حجم دیکھ کر سرفراز دم بخود رہ گیا۔

"اب تُو دکھا۔" عباس نے حکم دیا۔

سرفراز اُسی طرح ہاتھ لٹکائے کھڑا رہا تو عباس نے اُس کے سر پہ چھڑی لہرا کر دھمکی دی۔ "دکھاتا ہے کہ نہیں؟"

سرفراز نے آہستہ آہستہ اپنا نالا کھولنا شروع کیا۔ عباس نے ہاتھ سے جھٹک کر اُس کی شلوار گرا دی۔ سرفراز جتنا بھی زور لگا سکتا تھا لگا چکا مگر عباس کے ڈر سے اُس کی ڈنڈی نہ بنی تھی نہ بنی۔

"جا نمردا۔۔۔" عباس نے دھکا دے کر اُسے گرا دیا اور ایک چھڑی اُس کے کندھے پر جمائی۔

اُسی وقت جمیلہ اندر سے نکل کر اُن کے پاس آکھڑی ہوئی۔ سرفراز اُٹھ کر نالا باندھ رہا تھا۔ جمیلہ کی اوڑھنی ایک کندھے پہ لٹک رہی تھی۔ اُس کے سینے پہ ذرا ذرا گوشت نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ سرفراز کے دل میں خیال آیا کہ اگر وہ جا کر اس سے لپٹ جائے تو شاید اُس کی ڈنڈی بن جائے۔ جمیلہ نے باری باری دونوں کی جانب دیکھا۔

"بشرمو!" وہ بولی۔

عباس نے ایک تھپڑ اُس کے منہ پہ جمایا۔ "چل اندر۔"

"ابے کو بتاتی ہوں۔" جمیلہ بسورتی ہوئی بولی۔

"تیری جان نکال دوں گا۔"

عباس نے آنکھیں دکھائیں۔

جمیلہ گال سہلاتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

"کچے دُودھ کی دھاریں لیتا ہوں۔" عباس بولا۔ "تھن سے منہ لگا کر، ساری طاقت اُس میں ہوتی ہے۔" اُس نے دوبارہ تہمد اُٹھا کر دکھایا۔ اُس کی ڈنڈی اُسی طرح تنی کھڑی تھی۔ سرفراز اُس کے رعب سے پیچھے ہٹتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور چارپائی پہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیند نے اس پہ غلبہ پالیا اور وہ وہیں پہ لیٹ کر سو گیا۔

اس دن سے لے کر وہ جب بھی عباس سے ملا اُس کی پھسلتی ہوئی نظر ایک بار عباس کی رانوں کے بیچ سے ضرور گزرتی اور ساتھ ہی کچے دُودھ کی دھاروں کی یاد آتی تھی۔

پو پھٹ رہی تھی جب شور سے سرفراز کی آنکھ کھل گئی۔ "جوڑا۔۔۔ جوڑا۔۔۔ جوڑا۔۔۔" ہر طرف لوگ پکارتے پھر رہے تھے۔ سب سے زیادہ شور میراثیوں کے باپ

بیٹے نے مچا رکھا تھا جو تالی بجا بجا کر اور گا گا کر اعجاز اور چاچے احمد کو مبارک باد دے رہے تھے۔ سرفراز نے آنکھ کھولی ہی تھی کہ مولوی فقیرالدین فجر کی نماز پڑھا کر اُس کی چارپائی پہ آ بیٹھا۔ گاؤں کی عورتیں ایک ایک، دو دو کرکے، اپنے خوابیدہ چہرے ملتی، اوڑھنیاں سروں پہ جماتی، رات کے پہنے ہوئے کُرتے سیدھے کرتی، صحن سے گزر کر اندر جارہی تھیں۔ گھر کے اندر اب سکینہ کی چیخیں رُک چکی تھیں اور اِن کی جگہ عورتوں کے شور و غوغا نے لے لی تھی۔ خوشی کی، ہنسی مذاق کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی عورت ترنگ میں آ کر کسی گیت کا ایک بول اُٹھا دیتی۔ بیچ بیچ میں چند سیکنڈ کے لیے نہایت ننھی سی رونے کی آواز آتی جیسے کوئی بلی کا بچہ بلک رہا ہو۔ گاؤں کے آدمی اپنے کام کاج کو جاتے ہوئے رُک کر اعجاز کو اور چاچے احمد کو مبارک بادیں دیتے جارہے تھے۔ سورج ذرا اُوپر ہوا تو رحمت چوہان کے گھر سے دودھ والے بھاری گندوے میں اُبلتی ہوئی گرم چائے جس پہ الائچیوں کے چھلکے تیر رہے تھے، بن کر آ گئی۔ ساتھ ہی نظام دین اعوان نے پرات بھر کر تر تراتا ہوا گڑ کا حلوہ اور رات کی بچی ہوئی روٹیاں گھی میں تل کر بھیج دیں۔ سب نے آدھی آدھی روٹی پہ اپنے حصے کا حلوہ رکھا اور ناشتہ کیا۔ بچا ہوا حلوہ اور روٹیاں اندر گھر میں عورتوں کے لیے بھیج دیا گیا۔ پھر سب نے چائے کے پیالے بھر بھر کے پیے۔ دِتو میراثی نے حقہ تازہ کیا۔ اعجاز نے صرف ایک دو نوالے اپنے حصے کے کھائے، باقی پرات میں چھوڑ دیا۔ اُس کے چہرے پر ابھی تک وہی گومگو کی حالت تھی، نہ خوشی نہ غم، صرف ہونٹوں سے مسکرا مسکرا کر لوگوں کے دُعا سلام کا جواب دے رہا تھا۔ چاچا احمد اور مولوی فقیرالدین اندر جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ جب بلاوا آیا تو دونوں نے اعجاز کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی مگر اعجاز نے نفی میں سر ہلا دیا اور چارپائی پہ بیٹھا رہا۔ دو ایک بار کہنے کے بعد چاچا احمد اور مولوی فقیرالدین مایوس ہو کر اندر کی جانب چل پڑے۔ دروازے پہ ایک لحظہ رُک کر چاچا زور سے کھنکارا۔ اندر سے ماسی نے آواز دی۔ "آجاؤ۔" دونوں مرد اندر داخل ہو گئے۔ سرفراز نے بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر قدم رکھا۔ اندر عورتوں کا ایک جمگھٹا تھا۔ مردوں کو دیکھ کر انھوں نے اپنی اوڑھنیاں درست کرنی شروع کر دیں۔

"مبارک ہو، چاچا!" نظام دین اعوان کی بیوی نے آگے بڑھ کر کہا۔ سکینہ گردن تک کھیس اوڑھے آرام سے لیٹی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب اِن اذیت ناک چیخوں کی رمق تک نہ

تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پُرسکون شوق کی روشنی تھی۔ اُس کی بغل میں کھیس سے ڈھکے ہُوئے دو چھوٹے چھوٹے کپڑے کے بنڈل لپٹے لپٹائے رکھے تھے جن سے دو چُوہوں جیسے سر باہر نکلے ہُوئے تھے۔ چاچے احمد نے شہد میں اُنگلی ڈبو کر ایک کے مُنہ میں ڈالی، پھر مولوی فقیرالدین نے گُڑھتی کا یہ عمل دُوسرے کے ساتھ دہرایا۔ سرفراز چارپائی سے پَنچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اچانک اُس کے آگے بہت سی دھکم پیل کرتی ہُوئی عورتیں آ گئیں۔ اُس وقت اسے محسوس ہوا کہ کمرے کے اندر ایک دربند، حبس آلود سی بُو پھیلی تھی، جیسے رُکی ہُوئی اُبکائی کا ڈکار ہو۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کمرے سے نکلنے کو پلٹا تو اُس کے کان میں مولوی صاحب کی آواز پڑی جو ہلکے لحن میں اذان دے رہے تھے۔ وہ صُبح سرفراز کے بھتیجوں حسن اَور حسین کی پیدائش کا دِن تھا۔

جب لوگوں کا آنا جانا کم ہوا اَور چاچے احمد نے گاؤں کے نائی کو بُلا کر پلاؤ کی دیگ چڑھانے کا انتظام شُروع کر دیا تو رات بھر کے جاگے ہُوئے اعجاز نے چارپائی کھینچ کر سائے میں کی اَور لیٹ کر آنکھیں موند لیں مگر نیند اُس کے سَر سے غائب تھی۔

"سکُول سے چھُٹی کر لو۔" چاچے احمد نے کہا۔

"ہاں!" اعجاز نے ہولے سے جواب دیا۔

اس کے دماغ میں ایک سے ایک خیال یلغار کرتا چلا آ رہا تھا۔ صُبح سویرے سے اُس کے ذہن میں صرف چار چیزیں جڑی تھیں۔ عقب میں سکینہ کا چہرہ تھا۔ آگے دو نوزائیدہ بچوں کے ہیولے تھے جن کے نقوش وہ خیال کے باوجُود یاد نہ کر سکتا تھا۔ اِن سے آگے کنیز کی شبیہ تھی، تیکھی، تیز اَور آتش گیر مگر سب سے آگے، اَور سب سے اُوپر ایک شرمندگی کی شکل تھی جس کی صُورت اس کے دماغ میں ایک بھاری، گدلے، بے ترتیب سے پتھر کی مانند دھری تھی۔۔۔۔۔ سکُول سے نکالے جانے کی ذلت۔ اس بوجھ سے نکلنے کے لِئے وہ پچھلے بیس گھنٹے سے رینگ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے اُس کے ہاتھ میں دو سہارے آئے تھے، ایک کنیز کا، دُوسرا اپنے نوزائیدہ بچوں کا۔ مگر اس ذلیل پتھر کا بوجھ سب سے بھاری تھا۔ وہ اس خیال سے ابھی تک چھٹکارا نہ پا سکا تھا کہ کسی اَور کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے استعفے پر وہ خاموشی سے دستخط کر کے کیوں وہاں سے چلا آیا تھا۔ نہ اُس نے کوئی جواب دیا نہ مزاحمت کی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اب یہ گورنمنٹ سکُول بن چُکا ہے، آپ مجھے

برخواست کریں، میں انڈسٹریل کورٹ میں جاؤں گا۔ اگر یہ یونین نا ہی بات تھی تو وہ ٹھیک
سے یونین کی مدد لے سکتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ہیڈ ماسٹر نے چوہان سے مارشل لاء کا ذکر
کرکے اُسے ڈرا دیا تھا مگر یہ کوئی ہمت ہارنے والی بات تو نہ تھی۔ اعجاز کو نہ ہیڈ ماسٹر پہ غصہ
تھا نہ کسی اَور پہ، صرف اپنے آپ پہ تھا۔ اسی طرح گھومتا گھامتا ہُوا اُس کا خیال اس ڈگر
پہ چل نِکلا کہ زندگی میں اُس نے کوئی معرکہ سَر نہیں کیا تھا۔ ایک آدھ، اس نے سوچا
معمولی میدان مارا تھا، گو اس زمانے میں وہ معرکہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

مویشیوں کی منڈی کے موقع پر، اعجاز نے یاد کیا، نورپُور سے ہمارا کبڈی کا مقابلہ
ٹھہرا تھا۔ نورپور والوں نے سرگودھے سے ایک کھلاڑی جیجا ترکھان بلایا تھا جس کی سارے
پنجاب کے اَندر دُھوم تھی۔ پانچ فٹ کا آدمی اَور بدَن ایسا کہ جیسے تنا ہوا گدر فٹ بال ہو۔
جب تیل اَور پسینے میں نہایا ہوا آتا تو مچھلی کی مانند ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔ چھِنکا سا آدمی،
دائیں کو جھانسہ دیتا نہ بائیں کو، تلی پہ تلی مارتا اَور کھڑا کھڑا چھلانگ لگا کر مقابل کو سَر
سے ناپ جاتا تھا۔ میں ایک دو بار دیکھ کر اس کا داؤ بھانپ گیا تھا۔ میں نے اس پہ ہاتھ
ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ کوڈی کوڈی پکارتا ہُوا آیا تو ہم چار لڑکوں کے حلقے نے اُس کا سامنا
کیا۔ میں نے دُوسرے تینوں کو اشارے سے مطلع کر دیا تھا کہ یہ بھارُو میرا ہے۔ دِل ہی
دِل میں مَیں نے اپنے سَر کے برابر اس مقام کا تعین کر لیا تھا جہاں سے اس کے اُڑتے
ہُوئے جسم کا گزر ممکن تھا اَور پھر اُسی جگہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اس بات کی میں داد دیتا
ہوں کہ اس لڑکے نے ہم چاروں کو جانچنے کے بعد یہ پہچان کر لی کہ میں ہی ہوں جس نے
اس پہ وار کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اُس نے میرے سامنے آکر للکار ماری اَور ساتھ ہی
مُجھے ہاتھ سے چھو کر گیند کی مانند اُچھلا، جیسے ہی اُس کے پیر زمین سے اُٹھے، میں نے صحیح
لمحے کا اَندازہ کرکے اُوپر اپنے بازُوؤں کا حلقہ باندھ دیا۔ میرا اَندازہ دُرست نِکلا، میرے حلقے
کے اَندر اُس کی چھاتی مقید تھی۔ مَیں نے اُسے ہوا میں اُچک لیا تھا۔ اس جِن جیسے کے اَندر
مَیں نے اُسے اس طرح جکڑا کہ اُس کا نکلنا محال ہو گیا۔ میرے جوش کی حالت ایسی تھی کہ
اُس کی پُشت کے پیچھے میرے ہاتھ آپس میں یُوں گندھے تھے کہ جیسے کسی رسّی کو بل
دے کر گانٹھ دے دی گئی ہو۔ اس چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس اللہ کے
بندے نے میرے کانوں کے اُوپر دھولوں پہ دھولیں جمانی شرُوع کر دیں۔ اُس کی لو

ایسی کلائیاں ہتھوڑے کی ضربوں کی مانند میرے سر پہ لگ رہی تھیں۔ بعد میں کئی روز تک بائیں کان سے مجھے کچھ سُنائی نہ دیا تھا۔ اِن دھولوں سے بچنے کی خاطر مَیں نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچنا شروع کر دیا۔ میرے لئے یہ جان کی بازی تھی کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اَور ایک منٹ تک اُس کی دھولیں میرے سر پہ گرتی رہیں تو میری رگیں پھٹ جائیں گی اَور کھڑے کھڑے میرا دم نِکل جائے گا۔ یہ ایسا وَقت تھا جب کبھی کبھی کھیل کے مقابلے کے اَندر آدمی کو اپنا آخری وَقت دِکھائی دے جاتا ہے اَور وہ اپنے بدَن کے علاوہ اپنی رُوح کی تمام تر سچائی کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ اُس وَقت میں نے پُورے زَور کے ساتھ جو کسا تو اُس کا پیٹ اُس کی کمر سے جا لگا اَور اس کی سانس اُوپر کی اُوپر اَور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ جب اپنے بازُووں میں مجھے اُس کا بدَن ڈھیلا پڑتا ہُوا محسُوس ہوا تو مَیں نے اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا دم ٹُوٹ چُکا تھا۔ میرے ہاتھوں کی اُنگلیاں خُون رکنے کے باعث جکڑی گئی تھیں۔ میں نے کوشش سے اُنہیں جُدا کیا اَور بازُو کھول دیئے۔ جیجا ترکھان گیلے کپڑے کی مانند زمین پہ جا گرا۔ پاؤں کے بل بیٹھا وہ چہرہ اُٹھا کر یُوں مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے پتا ہی نہ چلا ہو کہ اُس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اَور چہرے پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔ "پتر بدلہ لے کر چھوڑوں گا۔" مگر اُس کے بعد پھر کبھی میری اس سے مڈبھیڑ نہ ہُوئی۔ نور پور کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر سال اُسے بدلے کے لئے واپس آنے کی خاطر رقم کی پیشکش کی جاتی ہے مگر اُس کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ میں نے اس پہ ایسی ذلت وارد کی تھی کہ وہ کھلاڑی جس نے کل پنجاب کے بڑے بڑے مقابلوں میں نام کمایا تھا' آئندہ بھی جو میدان مارنا ہے مار لے گا مگر اس شکست کو عمر بھر نہ بھُولے گا۔

جب مَیں نے اُسے زمین پہ گرایا تو تماشائیوں میں ایک غلغلہ بلند ہُوا۔ ہمارے گاؤں کی ٹولی نے اپنے ڈھول پر تھاپ اُٹھائی اَور ناچتے ہُوئے میدان میں گھُس آئے۔ منتظمین نے اُنہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگتے ہُوئے سیدھے میرے پاس آئے اَور مجھے کندھوں پہ اُٹھا کر تماشائیوں کے حلقے کے ساتھ ساتھ چکر لگانے لگے۔ میں نے اپنے گاؤں کی ناموری کمائی تھی۔ تماشائیوں میں ایک جانب کو عورتوں کی ٹولی کے ہمراہ دوپٹے میں سر چھپائے سکینہ کھڑی تھی۔ اُس وَقت ابھی ہماری شادی نہ ہُوئی تھی اَور چاچا احمد اپنے سارے ٹبر کو لے کر منڈی میں ڈنگر خریدنے کو آیا ہُوا تھا۔ بعد میں سکینہ نے مجھے بتایا کہ مجھے لوگوں کے

کندھوں پہ چڑھا اَور لوگوں کو ڈھول کی تال پہ میرے اِرد گِرد ناچتے ہُوئے دیکھ کر رو
بلک کر رونے لگی تھی۔ سکینہ اَور میرے درمیان کُچھ ایسی چیزیں مشترک ہیں جن کا
بدَل نہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عَورت کا تصوّر میرے دِل سے نہیں جاتا جسے
نے کل پہلی بار دیکھا تھا۔ مُجھے یہ بھی احساس ہے کہ وہ اِن لوگوں میں سے تھی جن پر
ایک کے بعد دُوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کیا کرتا تھا۔ اُس کے میلے کپڑے موٹی سلائی سے
گئے تھے اَور ایک آدھ بے مہارت سا پیوند لگا تھا۔ اُس کے بال چپڑی ہُوئی موٹی موٹی لٹوں
میں لٹک رہے تھے اَور کئی روز سے دھوئے نہ گئے تھے۔ سب سے پہلے مَیں نے اُسے دُور
کے فاصلے سے دیکھا اَور گو اُس وَقت وہ ہاتھ پھیلائے آہ و بکا کر رہی تھی مگر پہلی ہی نظر
میں، جب اس مقام سے مُجھے اُس کا چہرہ بھی نظر نہ آرہا تھا، وہ مُجھے ایک روتی چلاتی ہُوئی
مزدُورنی نہیں بلکہ ایک عَورت کی شکل میں دکھائی دی تھی۔ پچھلے رُخ کی ہوا چل رہی تھی
جس سے اُس کا کُرتہ اس کے بدَن سے چمٹا ہُوا تھا اَور اُس کے کھڑے ہونے کے انداز
میں، اس کے پھیلے ہُوئے بازُوؤں کی بیکسی کی بجائے مُجھے ایک بانکپن نظر آیا تھا اَور اب
بے معلوم طور پہ میرے سَر سے دِن بھر کا بوجھ گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ قریب پہنچ کر
مَیں نے اُس کا چہرہ دیکھا، اُس کے گالوں کی اُبھری ہُوئی ہڈیوں پہ تنی ہُوئی ملائم سیاہ مخمل کی
سی جلد اَور دُودھ جیسے سفید دانت اَور پتلے کُرتے کے اَندر سبز آموں کی سی چھاتیاں
دیکھیں تو یُوں محسُوس ہوا جیسے میرے حواس اس عَورت کے اَنداز کے اَندر جکڑے گئے
ہُوں۔ پہلی نظر سے آخری تک، وہ ایک عَورت تھی مگر ساتھ ہی وہ ایک اَنداز کی تصویر
بھی تھی جیسے کہ اُس کا وجُود ہوا کی چند لکیروں سے تشکیل پایا ہو۔ جب وہ سَڑک پہ چڑھ کر
مجھ سے پرے جارہی تھی تو ہر قدم کے ساتھ اُس کے بدَن کے مُختلف اعضاء الگ الگ
حرکت کر رہے تھے، مگر جُوں جُوں دُور ہوتے جاتے تھے، شام کے دُھندلکے میں ایک باہم
مربُوط اَور بے وزن خاکہ بناتے جارہے تھے جیسے کسی پرندے کی اُڑان ہو۔ جب میں گھر
پہنچا تو نقشہ ہی مُختلف تھا۔ خُدا خُدا کر کے صُبح ہُوئی اَور سکینہ کی چیخوں سے نجات ملی تو دُنیا
ہی بدَل چکی تھی۔ ایک کی بجائے دو اَور دونوں ہی لڑکے، چار چار سیر کے صحت مند بچے۔
میں بھی حیران تھا کہ سکینہ کے پیٹ میں شاید بچے کے علاوہ ہوا بھر چکی ہے جو اتنا پھُول گیا
ہے مگر سب لوگ کہتے تھے چاچے احمد کا سارا ٹبر چوڑی ہڈی کا بنا ہے، ہوا کا گولہ کہاں سے

آئے گا۔ یہ زرخیز ہے اور تومند ہے۔ یہ کسے پتا تھا کہ یہ ایک نہیں دو دو ہیں۔ مجھے ہوا میں اُلٹی چھلانگیں لگانی چاہئیں، مگر یا اللہ، اس ایک دن اور رات میں تُو نے کتنی وارداتیں میرے اُوپر نازل کر دی ہیں------"

زمینداری، جسے وہ ایک سال قبل اپنی ساری اراضی رہن سے چھڑا کر شروع کر چکا تھا، کے سوا اسکول کی نوکری اعجاز کی روزی اور عزت کا ذریعہ تھی۔ اب اس کے کھو جانے کے واقعہ نے اُسے پہلی بار اپنی ہی بنائی محدود زندگی سے باہر نکل کر ہاتھ پاؤں مارنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اُسی کیفیت کے اندر، اپنے ذہن کی تاریکی کو کم کرنے کی خاطر اُس کا خیال ماضی کے اِن روشن لمحوں کی جانب لپکنے لگا تھا جو کبھی کبھار ہر انسان کی عمر میں آتے ہیں اور جن میں آدمی اپنے روز و شب کے کَون و مکان سے اُوپر اُٹھ کر ایک اَور جہان کی جھلک دیکھتا ہے۔ یہی سہارے اب اُس کی آنکھوں کے پردوں پہ تیر رہے تھے۔ اُس نے وہ وقت یاد کیا جب وہ اپنے سُسر چاچے احمد سے ملنے اس کے گاؤں گیا ہُوا تھا۔ کھیتوں کو جاتے ہُوئے رمضان ماچھی نے مذاق مذاق میں چوہدری احمد کو ہل چلانے کے مقابلے کو للکارا تھا، جسے سُن کر اعجاز کی طبیعت چمک اُٹھی تھی اَور اُس نے آگے بڑھ کر مقابلے کی شرط کا جواب دیا تھا۔ پھر چاچے احمد کے ایک ایکڑ کے رقبے میں اُس کا ماچھی کے ساتھ مقابلہ ہُوا تھا۔ اس کھیت میں پچھلے موسم کے اندر کپاس کی فصل لگی تھی۔ اب چھٹی کی چنائی کے بعد منچھٹی بھی گٹھوں میں باندھ کر خشک بالن کے کوٹھوں میں بند کر دی گئی تھی۔ اب اس کھیت کو گیہوں کی بیائی کے واسطے تیار کرنے کا وقت آیا تھا۔ چاچا احمد کچھ مقابلے کی لذت اَور کچھ اس خیال سے کہ مشقت کے بغیر اُس کے کھیت کی مٹی اُلٹی جارہی تھی، خُوش خُوش کھڑا تھا۔

رمضان ماچھی نمبرداروں کے ڈیرے پر جا پہنچا اَور اس وعدے پر کہ اگلے روز وہ اُن کے کھیت میں بیگار کے طور پہ ہل چلا دے گا، اُن کے بہترین سفید بیلوں کی جوڑی مانگ کر لے آیا۔ ساتھ نمبرداروں کے دو لڑکے بھی چلے آئے۔ ماچھی نے ہل کندھے سے اُتار کے بَیل جوت دیئے۔ ماچھی کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہُوا گاؤں پہنچا اَور وہاں رکے بغیر، مقابلے کی خبر کا اعلان کرتا ہوا دُوسرے سرے سے نِکل کر ہانپتا ہُوا واپس آ پہنچا۔ دو دو، تین تین کے ٹولوں میں لوگ اُٹھ کر مقابلے کے کھیتوں میں آنا شروع ہُوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھیت

کے گرداگرد تماشائیوں کا دائرہ بن گیا۔ دو منصف مقرر ہوئے جنھوں نے قدموں سے ماپ کر کھیت کے بین درمیان میں لمبائی کے رُخ سوئی سے لکیر کھینچ دی۔ پھر دونوں فریق اپنے ہل ہانک کر اپنے اپنے نصف کے مخالف سروں پر جا کھڑے ہوئے۔ مقابلے کا دستور مقرر تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے سروں سے چلیں گے اور درمیان میں ایک دُوسرے کے برابر سے گزرتے ہوئے مخالف سمتوں میں بڑھتے جائیں گے حتیٰ کہ حد پہ پہنچ کر واپس مڑیں گے۔ مقابلے میں اصل مرحلے کا مقام یہی موڑ تھا۔ ہل چلانے کا عام دستور قطعہ زمین کی حدود کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دائرے کو تنگ کرتے جانے کا تھا تاکہ بیل رُخ توڑے بغیر چلتے جائیں اور تنگ موڑوں کا مسئلہ پیش نہ آئے۔ جب کہ مقابلے کے اندر سیدھی لکیر کے آخر پہ پہنچ کر اُلٹے پاؤں مڑنے اور لکیر کے ساتھ لکیر ملا کر واپس آنے کا نقشہ تھا۔ جتنی مشاقی سے اور کم سے کم وقت میں کوئی بیلوں کی جوڑی کو ایک سواتی کے زاویے پہ موڑنے اور ہل اٹھا کر نئی زمین پر گاڑنے کا اہل تھا اُتنا ہی قابل وہ اس کھیل کا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ جب دونوں "ہالی" اپنے اپنے کونوں پہ جم چکے تو ہلا لا لا لا۔۔۔ کر کے مقابلہ شروع ہوا۔ تماشائیوں کے ہجوم سے ایک دبے دبے شور کی گونج اُٹھی۔ دونوں منصف مخالف سمتوں میں، اپنا اپنا تہمد ٹخنوں سے اُوپر اٹھائے، فریقین کے ساتھ ساتھ چلتے کھیل کے اصولوں پہ کڑی نظر رکھے ہوئے تھے، کہ ہلوں کے پھل کم سے کم تین انگل زمین کے اندر رہیں اور لکیروں کے درمیان کوئی ننگی زمین نظر نہ آنے پائے۔ "وگدیاں نوں واہن سانجھے، وگدیاں نوں واہن سانجھے۔۔۔" کسی تماشائی نے جوش میں آکر نعرہ لگایا۔ "ہلا لا لا لا۔۔۔" ساتھ ہی ڈھول کی تیز مانوس دھمک سُنائی دی جو تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ میراثی کو خبر ہو چکی تھی۔

خیال کے اس سہارے پہ تکیہ کیے، آنکھیں میچ کر لیٹے اعجاز کے اعصاب پہ گہری آرام دہ کیفیت طاری تھی۔ اُسے ہل مقابلے کے آخر تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اُس کے دِل میں یہ اطمینان بخش علم تھا کہ اس نے وہ مقابلہ سوا لکیر کی گنجائش سے جیت لیا تھا۔ چند لمحے تک وہ اُسی طرح لیٹا رہا، مگر جیسے ہی مقابلے کا تصور اُس کے سامنے سے ہٹا، اس کے دِل کی ابتری لوٹ آئی، جیسے اتنی دیر تک عقب میں دھاک لگائے بیٹھی ہو۔ کسی خیال کے سہارے نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور چارپائی

سے اُٹھ کر گھر سے نِکل گیا۔

نُور پُور کی ڈسپنسری کے احاطے میں، دیوار سے ٹیک لگائے ارشاد اُور کنیز بیٹھے تھے۔ ارشاد نے کھیس کی بکل کھول کر اپنی پٹیاں دکھائیں۔ ''ملھم پٹی ہو گئی ہے، آپ کا احسان ہم نہیں اُتار سکتے مَلک صاحب!-----''

کنیز نے ربڑ کی چپلی پہن رکھی تھی جس کے تلے آدھے گھِس چکے تھے اُور ننگی ایڑیاں زمین پہ گھِسٹتی تھیں۔ وہ کچی زمین پر اَیسے آرام سے ٹانگیں اپنے سامنے لمبی پھیلائے بیٹھی تھی جیسے مٹی کا اُس کے دِل میں کوئی خوف نہ ہو۔ اعجاز کو خیال آیا کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے اِتنے عرصے سے چارپائی پہ سو کر نہ دیکھا تھا کہ اُسے بھُول ہی چکی تھی اُور اب زمین کے ساتھ اُس نے سیدھا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں، پاؤں اُور کندھوں کی نوک دار ہڈیاں عسرت کے اَیسے نشان تھے گویا اُس کے بدن پہ غربت کی تختیاں آویزاں ہوں۔ مگر تنگ دستی نے اُس کے چہرے کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک، جلد کی سیاہ ملائمت، ٹھوڑی کی اُٹھان اُور سفید دانتوں کے گرد ہونٹوں کی ہلکی سی مُسکراہٹ کا تاثر جو بدحالی میں بھی چہرے کا مُستقل جزو بنا رہتا تھا، یہ چیزیں اپنی جگہ پہ قائم تھیں۔ پھر اُس کی سرکش چھاتیاں تھیں، جو اُس کے بیٹھنے کے اس انداز میں بھی جب کہ اس کی کمر میں ہلکا سا خم تھا، کُرتے کے اندر اپنے جان دار خدوخال میں نمایاں تھیں۔ اُس کا چھ سالہ بچّہ اُس کی بغل میں بَیٹھا تھا۔

''کوئی بڑی چوٹ تو نہیں آئی؟'' اعجاز نے پُوچھا۔

''جی درد بڑا اُٹھتا ہے، سانس نہیں نِکلتا۔ چھوٹے ڈاکٹر صاب کہتے ہیَں شہر جا کر ہسپتال سے تصویر کھنچواؤ، مالوم ہوتا ہے پسلیوں کو ضرب آئی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیَں مَلک جی، نہ قدم اُٹھتا ہے نہ ہاتھ پڑتا ہے، کدھر سے کرائے خرچ کے جائیں۔ آپ ایک اُور مہربانی کریں، ٹھیکیداروں سے آپ کی سلام دُعا ہے، اِن سے کہہ سُن کر ہفتے دس دِن کی چھٹی لے دیں۔''

''ڈاکٹر ٹھیک کہتا ہے۔'' اعجاز نے کہا۔ ''آنے جانے کا کرایہ میں دے دوں گا''

ہسپتال میں تصویر مفت اُتر جائے گی۔ ٹھیک پتا چلے گا تو علاج بھی دُرست ہو گا۔"

"ہسپتال کی بات چھوڑیئے ملک صاب!"

"کیوں؟"

"ہم غریبوں کو وہاں کون پُوچھتا ہے۔ ایک ٹیکہ ٹھوک کر لٹا دیتے ہیں۔ پھر مر کر ہی خلاصی ہوتی ہے۔ آپ ٹھیکیداروں سے سفارش کر دیں تو میں چار دِن میں تندرست ہو جاؤں گا۔ اِس بے وکوف عورت نے ایک اَور رنغا میرے سَر پر کھڑا کر دیا ہے۔ پتا نہیں اب کیا بنے گا۔ اللہ میرے اُوپر رحم کرے۔ ہائے۔۔۔"

اعجاز نے سوالیہ نظروں سے کنیز کو دیکھا۔

"چل چُپ کر۔" کنیز تنک کر بولی۔ "ہائے ہائے کر کے کان کھا گیا ہے۔ مَیں پرچہ کرا کے ہی رہوں گی، چاہے جان چلی جائے۔"

"سُن لیا ملک صاحب؟" ارشاد بولا۔ "یہ اڑیل کھچر میرے اُوپر مصیبت لا کر رہے گی۔ ہمیں پیشگی کی متھاجی ہے۔۔۔"

"پیشگی، پیشگی۔" کنیز بولی۔ "میں پیشگی کی متھاج نہیں، تُو ہے۔ میں تو تیرے پیچھے لگ کر ٹھڈے کھا رہی ہُوں۔ پہلے تُو بڑی عیش کر رہا تھا جو اب مُصیبت آئے گی؟ ہائے ہائے ہائے۔۔۔" کنیز نے آواز کھینچ کر ارشاد کی نقل اُتاری۔

"کتنی پیشگی ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"تین ہزار،" کنیز نے جواب دیا۔ "دو ہزار لیے تھے، تین ہزار چڑھ گئے ہیں۔ وہ بھی نہ کسی کام نہ مکام، سارا کھوہ کھاتے گیا۔"

"کیا ہُوا؟"

"اِس نے اپنے مامے کی ضمانت دی تھی۔ اِس کو پُلس نے دوڑا دیا اَور ضمانت کی رقم کھا گئے۔"

"چل اب چپ کر خُدا کی بندی،" ارشاد کراہتے ہُوئے بولا، "میری جان نِکل رہی ہے، تُو پرچہ کرا کے مُجھے ختم کرا دے گی۔ اِس کی عقل پیروں میں ہے ملک صاب، آپ رسُوخ والے ہیں، اِس کو سمجھائیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"مامله کیا ہو گا جی، ایک مُصیبت گئی نہیں، دُوسری آ گئی----" ارشاد نے بتانا شروع کیا۔

"چل مُنہ بند کر۔" کنیز بات کاٹ کر بولی، "رات کو اِس کی پٹی ہو رہی تھی ملک جی، تو پُلس والے ایک زخمی کو لے کر آ ئے۔ تھانیدار نے شادے کو دیکھ کر پُوچھا اِس کے ساتھ کیا گزُری، تو میں نے----"

"مَیں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع بھی کیا ملک صاب مگر----"

"مگر وگر، مگر وگر، نامُراد کبھی زُبان بھی کھولے گا کہ گُنگے کا گُنگا قبر میں چلا جائے گا؟ ملک جی، مَیں نے جو واردات تھی صاف صاف بیان کر دی۔ زیادتی کو بندہ کب تک سہارے۔"

"اب تھانیدار صاب مجبور کرتے ہیں کہ پرچہ کراؤ،" ارشاد نے کہا، "کہتے ہیں ورنہ پُلس ڈاکٹر کی رپورٹ پر خُد کارروائی کرے گی۔ یہ ایسا کنون ہے ملک صاب کہ مُجھے بھی پکڑ کر باندھ دیں گے۔ پھر میرا سننے والا کون ہے؟ یہ سارا ننھا اِس یُونین کے آدمی کا کھڑا کیا ہُوا ہے جی----"

یُونین کا نام سُن کر اعجاز چونکا۔ "کون آدمی ہے؟"

"اُس کا تو کسب ہی یہ ہے ملک صاب، غریبوں کو اُلٹی پلٹی راہ پر لگاتا ہے۔ اِس کا کیا جاتا ہے، مارے تو غریب جاتے ہیں۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے ہم اِکٹھ کر لیں تو مزدُوری دُگنی ہو جائے گی۔ پیشگیاں ماف ہو جائیں گی۔ کہتا ہے زیادتیوں کی رپورٹ کرو۔"

"تو کیا غلط کہتا ہے،" کنیز بولی۔ "پہلے تُجھے کیا اِنام مِل رہا ہے؟"

"اُس کا سَر پھرا ہُوا ہے جی،" ارشاد نے کہا، "اُس نے اِس بیواکوف کا بھی سَر پھیر دیا ہے۔"

"خیر، کوئی بات نہیں،" اعجاز بولا، "کوئی گناہ تو نہیں کرتا اگر ایسا کہتا ہے تو۔"

"کوئی سکول و کول کی بات نہیں جی،" ارشاد نے کہا، "میرے ساتھ جو حشر ہوا ہے اُسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ٹھیکیداروں کو خبر ہو گئی کہ یہ اِس آدمی کی بات سنتی ہے۔"

"یہ آدمی ہے کون؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"بشیرا احمد نام کا آدمی ہے جی، اللہ جانے کہاں سے ہمارے لیے آفت بن کر آیا ہے، شہر میں رہتا ہے، بھجوان پُورے کی طرف،" پھر ارشاد اعجاز کی جانب جھُک کر نیچی آواز میں بولا، "اصلی بات یہ ہے ملک صاب کہ وہ اِس پر آنکھ رکھتا ہے، اِس بے وکوف عورت کی عقل ماری گئی ہے۔" کنیز خاموشی سے اعجاز کا مُنہ دیکھ رہی تھی، جیسے اب جواب دے دے کر تھک چکی ہو۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"بھٹے پر جا رہے ہیں،" ارشاد نے کہا، "آگے جو اللہ کرے۔ ہمارا کیا زور ہے۔"

اعجاز چند لمحے تک وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ "اچھا،" پھر وہ بولا، "میں کل تُمھارا پتا کرنے آؤں گا۔ ٹھیکیدار مِل گئے تو اُن سے بھی بات کروں گا۔" گھر واپس جانے کی بجائے وہ دیر تک کھیتوں میں پھرتا رہا۔

باب 4

"کل سکول سے بڑی دیر کر کے آئے،" سکینہ نے پوچھا۔

"ہاں،" اعجاز نے جواب دیا۔ وہ لحظے بھر کو رُک کر سوچتا رہا کہ بتا دے یا نہ بتائے۔ پھر بولا، "کام آگیا تھا۔"

"چھٹی نہیں لی؟" چاچے احمد نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"سرفراز کہتا ہے اِس نے کل تمھیں سکول میں نہیں دیکھا" سکینہ نے کہا۔

"کلاسیں نہیں لیں۔ دفتر کا کام کرتا رہا تھا۔"

"آج جلدی آ جانا۔" سکینہ بولی۔ وہ چارپائی پہ بیٹھی ایک بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ دائی اِس کے پاس دُوسرے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی جو وقفے وقفے پر ننھی سی آواز سے روتا جا رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے،" دائی بچے کو ہلکورے دیتی ہُوئی بولی، "تیرا دُود وافر ہے۔ میرا آخری جوڑا کھرلوں کے گھر میں ہوا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی بات ہے۔ فسادوں کا زمانہ تھا۔

"ماسی پروین کے گھر؟" سکینہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ تجھے نہیں پتا؟"

"نہ۔ اِس کا ریاض جوڑا تھا؟"

"اور کیا؟ پروین کا دُودھ نہیں تھا۔ بچاری نچوڑ نچوڑ کر ہلاک ہو جاتی تو ریاض کا پیٹ مشکل سے بھرتا تھا۔ دُوسرے کو بکری پر لگا دیا۔ دو دِن تو ٹھیک رہا، پھر اُسے ٹٹیاں لگ گئیں۔ حکیموں کا علاج کیا، آخر میں شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے، مگر جس کی آئی ہو اسے کون بچا سکتا ہے۔ دِنوں کے اندر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تیرے اُوپر اللہ کا فضل ہے۔ کوئی فکر فاقہ نہیں۔"

"ہمارے گھر پر اللہ کا فضل ہے راہیاں،" ماسی ہانڈی چڑھاتے ہُوئے بولی۔ "میرا دُودھ پانی کی طرح بہتا تھا۔ چھوٹے اِتنا پی جاتے کہ اُلٹیاں کرنے لگتے تھے، پھر بھی میرا کرتہ

گیلا ہی رہتا تھا۔ ہاتھ ہاتھ جتنے بڑے چپاخ پڑ جاتے تھے۔ دھوتے دھوتے میری دالی کے مونڈھے دُکھنے لگتے تھے۔ ہنس کر کہتی تھی، چدھرانی، تیرے آگے تو نہر کے محکمے والوں کو بند باندھنا پڑے گا۔"

"اِس کی ہڈیوں کو نہ دیکھ رابیاں،" چاچا احمد حُقے کی نڑی مُنہ سے الگ کر کے بولا "اِس کا ماس بڑا لائق ہے۔"

دائی رابعہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ ماسی کے چہرے پہ رنگ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُس نے تیزی سے ہانڈی میں ڈوئی ہلانی شروع کر دی۔

"میں پھر چلا اعجاز،" چاچے احمد نے کہا۔

"بس چاچا؟"

"بس۔ روٹی کے ٹکڑے کے لِئے بیٹھا ہوں، کھا کر نِکل جاؤں گا۔ تیری ماسی کو پیچھے چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

"ایک دِن اَور رُک جا چاچا۔ بیائی میں ابھی دِن پڑے ہیں۔"

"ڈنگروں کا روز کا کام ہے اعجاز۔ ماچھیوں کے حوالے کر کے آیا ہوں۔ گُتّی کے بچے میرے آدھے پیٹھے اَپنے ڈنگروں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ ایک دِن رہ کر جاتا ہوں تو مرلہ زمین کا ننگا پڑا ہوتا ہے۔"

"اچھا پھر، چاچا۔" اعجاز نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک زمانہ تھا،" چاچا احمد اُسی رو میں حُقّہ گڑگڑا کر بولا، "لوگ اپنا مال دُوسروں کے حوالے کر کے حج پر چلے جایا کرتے تھے۔ اب وہ اِعتبار کا زمانہ گیا۔"

"جلدی آ جانا،" سکینہ نے دُہرا کر کہا۔

"اچھا" اعجاز نے کہا اَور گھر سے نِکل گیا۔

اُس کے پاؤں اِس طرح اُٹھ رہے تھے جیسے اُس کے اَپنے ارادے سے قطعی آزاد ہوں۔ یُوں ظاہر ہوتا تھا جیسے اُس کے بدن کو اَپنے طور پہ علم ہو گیا ہو کہ ایک نقصان کی تلافی کے لِئے دُوسرے خزانے کی تلاش اہم ہو گئی تھی۔

ملکوں کے بھٹے پر ارشاد اَور کنیز کا گھروندہ خالی پڑا تھا۔ دروازے پر جو ٹاٹ لٹکا ہوتا تھا وہ ایک ڈھیر کی شکل میں دہلیز پہ پڑا تھا۔ مزدُوروں کے باقی کنبے سب کے سب اینٹیں

بنانے کے کام میں مصروف تھے۔ مرد گیلی مٹی کا گارا تیار کر رہے تھے۔ پتھیروں میں زیادہ تر عورتیں اَور پانچ سال سے اُوپر کے بچے مٹی کو سانچوں میں بھر بھر کے کچی اِینٹیں نکالتے اَور اُنہیں سُوکھنے کو دُھوپ میں قطار در قطار رکھتے جا رہے تھے۔ اعجاز ایک کنبے کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے محسُوس کیا کہ مزدُور اُس کے ساتھ بات کرنے سے کترا رہے تھے۔ عورتوں نے مُنہ پھیر لیے تھے۔ صِرف بچے مُنہ اُٹھا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

"چل اوئے سُور کے تخم" ایک عورت اَپنے بچے سے چلا کر بولی، اِینٹ اُٹھا اِینٹ، چھتر کھائے گا میرے سے، چل چل چل۔۔۔۔"

سات سالہ سیاہ رنگ ننگا بچہ اُسی طرح کھڑا اعجاز کو دیکھتا رہا۔

"جی سَون بھادرُوں ابھی گُزر کے گیا ہے" مرد گیلی مٹی کو پیر سے ہلاتے ہُوئے بولا "اب کام کا زور آ پڑا ہے، سارا سارا دِن لگائیں تو پھر بھی کچھی پُوری نہیں ہوتی۔"

اعجاز نے سَر ہلا کر اُس کے ساتھ اِتفاق کیا اَور محتاط لہجے میں پُوچھا "ارشاد کہاں ہے؟"

مرد اَور عورت چند لحظوں تک ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھتے رہے، گویا مخمصے میں ہُوں۔ پھر عورت نے تاسف سے سَر ہلایا اَور خاموشی سے اَپنے کام کی جانب مُنہ پھیر لیا۔ مرد نے اِدھر اُدھر دیکھا اَور نیچی آواز میں بولا "سپاہی آیا تھا۔ اُس کے ساتھ تھانے چلے گئے ہیں۔"

اعجاز نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھا۔ اُس نے بھٹے کا ایک چکر لگایا مگر ملکوں کا کوئی آدمی اُسے نظر نہ آیا۔ واپسی پر وہ ایک درخت کے نیچے کچھ دیر رُک کر سوچتا رہا، پھر وہاں سے نکل کر نُور پُور کی سڑک پہ ہو لیا۔

تھانے کے سامنے درختوں کی چھاؤں میں کسانوں کی مختلف ٹولیاں بیٹھی تھیں۔ سفید کُرتہ، سفید تہمد اَور سفید ہی رنگ کی بڑی سی ڈھیلی بل دار پگڑی اِس علاقے کے کسانوں کا تھانے کچہری میں پیش ہونے کا لباس تھا۔ دُھلے ہُوئے سفید کپڑوں اَور دُھوپ میں جلے ہُوئے سیاہ اَور تانبے کی رنگت والے شکن دار چہروں کے چھوٹے چھوٹے جُھرمٹ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ ارشاد اَور کنیز کو پہچاننا مشکل نہ تھا۔ اُن کے کپڑے میلے میلے رنگوں کے اَور سَر ننگے تھے۔ وہ کسانوں کی ٹولیوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔

ارشاد، کنیز اَور بچہ زمین پہ ٹانگیں چوڑی کیے بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک پھٹا پرانا آدمی لباس بچھا کر، پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ سڑک سے تھانے کی پُرانی عمارت کی ڈیوڑھی نظر آتی تھی اَور اُسی سیدھ میں پچھلے برآمدے کے اندر محرّر کی میز لگی تھی۔ محرّر کے سامنے کرسی پر ملکوں کا چھوٹا بیٹا رشید بیٹھا تھا جو سکُول میں اعجاز کا ہم جماعت رہا تھا۔ اعجاز تھانے کے احاطے سے گزُر کر ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ارشاد، کنیز اَور ان کے ساتھی کی نظروں نے سڑک سے ڈیوڑھی تک اُس کا تعاقب کیا۔ ڈیوڑھی سے نِکل کر اعجاز نے تھانے کا صحن پار کیا اَور محرّر کی میز تک جا پہنچا۔

"آ، اعجاز" رشید نے اُٹھ کر تپاک سے مصافحہ کیا۔ "کیسے حال چال ہیں۔ کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"خیر خیریت ہے رشید، تُم اپنی سُناؤ۔"

"اللہ تعالےٰ کا کرم ہے۔ کیا کچُھ ہوتا رہتا ہے۔ سکُول کیسا چل رہا ہے۔"

"بس چل ہی رہا ہے،" اعجاز نے ہنس کر جواب دیا۔

"بیٹھو اعجاز" رشید نے دُوسری کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں کیسے آنِکلے؟"

"اِدھر سے گزُر رہا تھا۔ تجُھے دیکھ کر چلا آیا۔ سوچا مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"شاہ جی، یہ ملک اعجاز اعوان ہیں،" رشید نے تعارفاً کہا "شجاع آباد کا سکُول اِنہیں کے سَر پر چلتا ہے۔"

امداد علی شاہ تھانہ محرّر نے سَر اُٹھا کر دیکھا اَور جواب دیئے بغیر، اُسی طرح ماتھے پہ گھُوری رکھے، چہرہ جھکا کر لکھنا شروع کر دیا، جیسے کہ وہ اِس دُنیا کے ملکوں، سکُول ماسٹروں اَور دُوسرے مشتبہ لوگوں سے مِل مِل کر زندگی سے تنگ آ چکا ہو۔

"تم یہاں کیسے بیٹھے ہو؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"بھٹے کا ایک معاملہ تھا۔ نپٹ گیا ہے۔ شاہ جی ہمارے مہربان ہیں۔"

دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اِرشاد اَور کنیز اُن کے قریب سے گزُر کر اے۔ ایس۔ آئی کے کمرے میں داخل ہُوئے۔ گزُرتے گزُرتے ارشاد نے ہاتھ اُٹھا کر

اعجاز کو سلام کیا۔ اعجاز سرسری جواب دے کر رشید سے باتیں کرنے لگا۔ دُور سے کسی نے محرّر اِمداد علی شاہ کو سلام کیا۔ اِمداد علی شاہ نے مُنہ اُٹھا کر اُس سے کہا کہ وہ اپنے سلام کو لے جا کر اپنی ماں کی ٹانگوں میں گھسیڑ دے اور تھانے سے نِکل جائے ورنہ حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔ اعجاز کا ایک کان محرّر کی جانب تھا اور دُوسرے سے وہ رشید کی بات سُن رہا تھا کہ اچانک تھانیدار کے کمرے سے عورت کی آواز بلند ہونے لگی۔ وہ اُونچے لہجے میں کچھ کہے جا رہی تھی۔ محرّر نے رشید کی جانب دیکھ کر زیرِ لب عورت کو گالی دی۔ پھر اندر تھانیدار کی سخت آواز اُٹھی۔ اعجاز کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے رشید سے الوداعی مصافحہ کیا اور باہر جانے کو مڑنے ہی والا تھا کہ تھانیدار کے کمرے کی چِک اُٹھی اور اندر سے بشپ جان اور کرنل جوزف برآمد ہوئے۔ اعجاز انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اُن دونوں کو پہچانتا تھا۔ بشپ جان تو اُن کے گاؤں میں عیسائیوں کی خبر کو آتا رہتا تھا۔ کرنل جوزف پُرانا نُورپُور کا رہنے والا فوج کا ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ بشپ جان بھاری بھرکم جسم اور متین چہرے والا پچپن کے لگ بھگ کا آدمی تھا جس کے گھنے بال یہ دُہرا تاثر دیتے تھے کہ بیس سال کی عُمر میں سفید ہو چکے تھے اور مزید کہ اُس عُمر سے لے کر آج تک ایک بال بھی جڑ سے ضائع نہیں ہُوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں کرنل جوزف مختلف قسم کا آدمی تھا۔ اُس کا پردادا انگریزوں کے زمانے میں علاقے بھر کا آرچ بشپ تھا۔ دادا ریلوے کے ورکشاپوں میں کام کرتے کرتے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ باپ نے گو کچھ تعلیم حاصل کی تھی، مگر آرچ بشپ کو ملے ہُوئے دو مُربعہ اراضی پر سنگتروں، مالٹوں اور لیموؤں کا باغ لگوا کر اُس نے گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اپنے بیٹے جوزف کو اُس نے سینئر کیمبرج کروا کر فوج میں بھرتی کرا دیا تھا، جہاں سے وہ دس سال پہلے ریٹائر ہو چکا تھا۔ کرنل جوزف ایک خُوبصورت آدمی تھا۔ اُس کی ماں اینگلو انڈین تھی۔ نکھرے ہُوئے گندمی رنگ اور چھریرے بدن کا وہ ساٹھ سالہ آدمی پچاس سے بھی کم عُمر کا لگتا تھا۔ اُس کے سَر کے بال آدھے سیاہ، آدھے سفید تھے، اور سُرخ گالوں والے چہرے پہ بائیسکل کے ہینڈل کی سی سفید مونچھیں تھیں۔ گو وہ اپنی زندگی گاؤں میں گزارتا تھا مگر کسی نے اُسے دیہاتی لباس میں نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ بش شرٹ اور پینٹ، یا گھُڑسواری کی برجس میں ملبوس ہوتا اور ہاتھ میں ڈیڑھ فٹ لمبی پالش شدہ بانس کی گانٹھوں والی چھڑی رکھتا تھا۔ اُس کی بیوی موٹی سی

بھدی اینگلو انڈین عورت تھی جو نوکروں کو ڈنڈوں سے پیٹ کر سزائیں دیا کرتی تھی۔ اُن کی ایک ہی بیٹی تھی جو شادی ہو کر اپنے خاوند کے ساتھ اِنگلستان جا بسی تھی۔ کرنل جوزف کا لگایا ہُوا باغ علاقے میں کھٹے پھل کا سب سے بڑا باغ تھا۔ اب وہ باغ کے وسط میں عمارت تعمیر کرا رہا تھا جس کے اندر مشینری لگوا کر اُس کا ارادہ شربت اور اچار مربے بنانے کا تھا۔ گاؤں کے باہر کرنل جوزف کی بڑی سی پرانی کوٹھی تھی جو بھٹے کے عیسائیوں کے علاوہ سارے علاقے کی عیسائی برادری کا مرکز تھی جہاں کرنل جوزف کا لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

بشپ جان اور کرنل جوزف آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہُوئے کمرے سے باہر آ کر ایک لمحے کو رُکے، پھر ساتھ ساتھ چل پڑے۔ کمرے کے اندر عورت کی غصیلی آواز اُٹھتی جا رہی تھی کہ اچانک تھانیدار کی کڑکتی ہُوئی آواز نے اُسے دبا دیا۔ ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ ساتھ ہی اِرشاد چِک اُٹھا کر باہر نِکل آیا۔ چِک کے پیچھے اعجاز کو کنیز کا ہیولا نظر آیا تو وہ جلدی سے مڑا اور باہر کو چل دیا۔ پُشت پہ اُس نے کنیز کی بلند آواز سنی جو اب برآمدے میں نِکل آئی تھی۔ اُس نے دِل پہ جبر کر کے اپنے آپ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے روکا۔ ڈیوڑھی پار کر کے اُس نے تھانے کے احاطے میں قدم رکھا اور بائیں کو ہو کر رُک گیا۔ ایک مِنٹ کے بعد بشپ جان اور کرنل جوزف باہر آئے۔ کنیز دُہائی دیتی ہُوئی اُن کے تعاقب میں نِکلی۔

"اللہ ظلم کرنے والوں کو بدلہ دے ----" وہ پُکاری۔

اِرشاد نے عقب سے پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی تو کنیز نے پلٹ کر ایک دوہتڑ اُس کی چھاتی پہ رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا گیا۔ "چل ہٹ ماں کُتّے،" وہ چلّا کر بولی۔ احاطے میں بیٹھے ہُوئے کِسانوں کی ٹولیوں کے سَر بشپ، کرنل اور کنیز کی جانب مڑ گئے۔ اُن چاروں کے پیچھے پیچھے ملک رشید چلا آ رہا تھا۔ کنیز لپک کر آگے بڑھی اور بشپ کے سفید کوٹ پر ہاتھ رکھ کر بولی، "بشپ جی، آپ نے دیکھا؟ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا----"

بشپ ایک دم رُک کر یُوں پیچھے ہٹا جیسے اُس کو اپنا کوٹ میلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اُس نے تسلی کے انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہا پھر رُخ بدلا اور کنیز سے بچ کر نکلنا چاہا۔ کنیز

نے کرنل جوزف کا بازو پکڑ لیا۔ کرنل جوزف نے آہستگی سے اپنی چھڑی اُس کے بازو پہ رکھی اور نرمی سے دبائی۔ کنیز نے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"کرنل جوجف صاب، آپ نے دیکھا" کنیز اُس کے آگے آگے چلتی ہوئی بولی، "آپ کی آنکھوں کے سامنے۔۔۔۔"

"سامنے کیا ہو گیا، وومن" کرنل نے اپنے انگریزی لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے سامنے تھانیدار نے میرے نالے پر ہاتھ ڈالا کہ نہیں؟"

بشپ جان کے چہرے پہ ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔

"دیکھو وومن،" کرنل بولا، "ماملہ سب ٹھیک ہو گیا۔ اب بوم مت مارو۔ سب ٹھیک ہے۔ اب جاؤ۔ او کے؟"

اعجاز دِل میں ہنسا۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ کرنل جوزف ٹھیٹھ زُبان بول سکتا تھا مگر اُس نے اپنا لہجہ نہ چھوڑا تھا۔ کنیز کو اُس کا دُوسرا ساتھی بازو سے پکڑ کر پرے لے گیا۔ بشپ جان کی پُرانی سی آسٹن گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ وہ کرنل جوزف اور رشید سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ کرنل کی پُرانی لینڈ روور جیپ دُوسری جانب کھڑی تھی۔ جب وہ اور رشید جیپ کی جانب جاتے ہوئے اعجاز کے قریب سے گُزرے تو اعجاز اپنے ساتھ کھڑے ایک کسان کی طرف چہرہ کر کے کھڑا ہو گیا، گویا اُس سے مخاطب ہو۔ رشید کرنل جوزف سے کہہ رہا تھا۔

"پچاس ہزار اینٹ کل پہنچ جائے گی کرنل صاحب۔"

"کوٹھی پر نہیں مانگتا،" کرنل جوزف بولا، "باغ کے اندر ڈلیوری مانگتا ہے۔"

"بالکل جدھر آپ کہے گا اُدھر لوڈ اُترے گا کرنل صاحب۔"

"اور ایک نمبر کی چاہیے۔ ٹھوک بجا کر دیکھے گا۔ دو نمبر کی ایک اینٹ بھی نہیں لے گا۔"

"ایسی بات نہ کرو کرنل صاحب، آپ نے ہمارے اُوپر اتنا مہربانی کیا،" رشید کرنل کی زُبان بولنے لگا، "ہم آپ کو دو نمبر اینٹ کیوں دے گا۔"

"گُڈ شو۔ بھٹہ پر اور جھگڑا کرے تو ہمیں بولو۔"

"تھینک یُو، کرنل صاحب۔ سر۔"

کرنل کی جیپ کے پاس ہی رشید کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سواری پر چڑھ کر نُور پُور کو روانہ ہو گئے۔ اعجاز کو دل میں کچھ حیرت ہوئی کہ رشید کو پچھلے روز بھٹے پر اعجاز کی موجُودگی کا علم نہیں ہُوا۔ وہ احاطے سے گزر کر ارشاد اور کنیز کے پاس پہنچا جو اب تھکی تھکی چال سے سڑک کے کنارے تک جا چکے تھے۔ کنیز اُس تیسرے آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر رُک گئی۔

"ملک جی، تُم نے دیکھا اِس بغیرت کا کب؟ پیسے لے کر بیٹھ گیا ہے۔"

"اللہ کی بندی۔۔۔" ارشاد نے اُس کا بازو پکڑ کر بات کرنے کی کوشش کی۔

کنیز نے اُسے پُورے زور سے دھکا دے کر گرا دیا۔ "دفعہ ہو، سُور کے تخم" اُس نے بچّے کو اُٹھا لیا۔ چھ سال کا بچّہ اُس کے کولہے پہ جما اعجاز کو عجیب سا لگا۔

"چل چھوڑ اِس کا پیچھا" اُس کے ساتھی نے ہاتھ سے پکڑ کر کنیز کو ایک طرف کیا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"ہو گیا گیا۔ اِس بغیرت کے سامنے تھانیدار نے میرے نالے پر ہاتھ ڈالا" یہ مُنہ نیچا کرے بیٹھا رہا۔"

"چل اب چھوڑ اِس قصے کو۔"

کنیز اعجاز سے مخاطب ہوئی۔ "مَیں نے اِس تھڑدلے کے ساتھ نہیں رہنا۔ میری جان نکال دو ملک جی، اِس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

اعجاز کا دِل لحاتی طور پہ اُچھلا۔ ساتھ ہی اُس کی نظر اُس دُوسرے آدمی پہ پڑی جو آنکھوں میں چمک اُور چہرے پہ اعتماد لِئے کنیز کے بہت قریب، اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پہ رکھے کھڑا تھا۔

"بیوقوفی مت کر" اعجاز بے اختیار ہو کر بولا "چل، جھگڑا ختم ہو گیا ہے۔ اور تُجھے کیا چاہیے؟"

"مجھ کو بڑا کچھ چاہیے ملک جی،" کنیز بولی، "میری بات پر مٹّی نہ ڈالو۔ میرا نہ اِس سے کوئی واسطہ نہ اِس کی پیشگی سے۔ میں ساری دُنیا کی نوکر ہوں، پر کسی کی غلام نہیں ہوں۔ مجھ سے کہتے ہو اِس تھڑدلے کے ساتھ جاؤں جو دِن کو غلامی کرواتا ہے اور رات کو دھوتی اُٹھا کے میرے اُوپر سوار ہو جاتا ہے؟ میرے بچّے سے اِس کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ

کے برتن مانجھ لوں گی، مگر اس کو سکول بھیجوں گی، کسی کی غلامی میں نہیں دوں گی۔"

"کنیز۔۔۔۔" دُوسرا آدمی بولا' "اِس بات کو کل پر چھوڑ دے۔ اب گھر چلی جا۔"

"تو بھی۔۔۔۔" کنیز بھڑک کر بولی۔

اُس آدمی نے نرم لہجے میں کنیز کی بات کاٹ دی۔ "دیکھ، میری بات مان، حوصلہ کر، دِل کو آرام دے۔ بڑا وقت پڑا ہے۔ جا۔۔۔۔" اُس نے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے کنیز کو سڑک کی جانب بڑھایا۔ کنیز اُس کے چہرے پہ ملامت بھری ٹکٹکی باندھے، ٹیڑھے ٹیڑھے قدم رکھتی ہُوئی اَپنے راستے پہ چل پڑی۔ اُس کے پیچھے پیچھے اَپنی پسلی پہ ہاتھ رکھے ارشاد بھی چل دیا۔

"آپ کا اِسم شریف؟" اُس آدمی نے اعجاز سے پُوچھا۔

"محمد اعجاز۔"

"میرا نام بشیر احمد ہے،" وہ مصافحے کے لِئے ہاتھ بڑھا کر بولا۔ اعجاز نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ "کنیز نے مُجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ نے اِن کی بڑی مدد کی، دوا دارو کرا دیا، اِن لوگوں کو کون پُوچھتا ہے، نہ اِن کا گھر نہ گھاٹ، نہ کوئی ٹھکانہ، دو گٹھڑیاں اُٹھا کر ایک بھٹے سے دُوسرے کو جاتے رہتے ہیں۔ اپنا پتا تک لکھانے سے لاچار ہیں۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"کام کیا کرتا ہُوں صاحب، بیکار ہی سمجھیے۔" بشیر احمد ہلکی سی تلخ ہنسی ہنس کر بولا۔ اس ہنسی کو سُن کر اعجاز کو دِل میں ذرا سی حیرت ہوئی۔ بشیر احمد کے چہرے پہ تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جن کے جبڑے کی مضبوطی اَور آنکھوں کی چمک سے ہمیشہ اُمید اَور اِرادے کی کرن پُھوٹتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک میانے قد کا پتلا سا آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پہ صِرف اُس کا دہانہ اَیسا تھا جس کی بناوٹ سے سنک کی جھلک ملتی تھی، چُنانچہ باتیں کرتے کرتے جب وہ اَپنی مختصر سی ہنسی ہنستا تو اُس کے چہرے پہ تلخی اَور خلوص کے دو عناصر آپس میں ایسے گتھم گتھا ہوتے ہُوئے ملتے تھے کہ دیکھنے والا چونک اُٹھتا تھا۔ وہ ایک عام چال ڈھال کا آدمی تھا جسے، اُس کے باتیں کرنے کے اَنداز اَور مخصوص ہنسی نے ایک منفرد شخصیت عطاء کی تھی۔

"ارشاد اور کنیز کو آپ کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟" اعجاز نے پُوچھا۔
جواب دینے کی بجائے بشیر احمد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، جیسے بیٹھنے کی کسی جگہ کا متلاشی ہو۔ "آپ کے پاس کچھ فرصت ہے؟" اُس نے پُوچھا۔
"مجھے کوئی خاص کام تو نہیں۔"
"میں داروغہ والا میں رہتا ہُوں۔ اگر آپ تکلیف نہ سمجھیں تو میرے غریب خانے پر چلیں۔ بیٹھیں گے، کچھ باتیں کریں گے۔"
اعجاز کا آدھا دِل کہتا تھا اِس آدمی سے دُور بھاگے، آدھا اِس شخص کے بارے میں متجسس تھا۔ "کیسے جائیں گے؟" اُس نے پُوچھا۔
"گھنٹے گھنٹے پر بس جاتی ہے۔ آدھ گھنٹے کا رستہ ہے۔" بشیر احمد کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ "پانچ منٹ میں بس آنے والی ہے۔"
اعجاز رُک کر سوچتا رہا۔
"ویسے اگر آپ کو----" بشیر احمد نے کہا۔
"نہیں نہیں،" اعجاز جلدی سے بولا "چلتے ہیں۔"
بس آئی تو دونوں اُس میں سوار ہو گئے۔
"آپ اِسی علاقے کے رہنے والے ہیں؟" اعجاز نے پُوچھا۔
"میں جس مکان میں رہتا ہُوں اُسی میں پیدا ہُوا تھا۔ میرے والد صاحب کی سبزیوں اور پھلوں کی دُکان ہے۔"
"آپ اُس کاروبار میں نہیں گئے؟"
"میں پڑھائی میں پڑ گیا" بشیر احمد اپنی مختصر سی مخصوص ہنسی ہنسا۔ "مگر اپنے علاقے سے باہر نہیں گیا۔ لوکل سکول سے میٹرک کیا۔ پہلے مغلپورہ کے ایک ورکشاپ میں جونیئر کلرک رہا۔ پھر اپنے گھر کے پاس پرائمری سکول میں پڑھاتا رہا۔ وہاں سے چھ سال کی سروس کے بعد برخاست کر دیا گیا۔"
"کیوں؟" اعجاز نے بے ساختہ سوال کیا۔
"مَیں نے ایک روز غصّے میں آکر کہہ دیا تھا کہ دو مہینے سے سکول کا نلکا ٹوٹا ہُوا ہے، گرمیوں کے دن ہیں، بچّے پیاس سے بیہوش ہو رہے ہیں، مٹکوں کا پانی ایک گھنٹے میں

ختم ہو جاتا ہے، بھرنے والا کوئی نہیں، درخواستیں دے دے کر تھک گئے ہیں، افسر اپنے دفتر میں بیٹھے ٹھنڈے شربت اُڑا رہے ہیں، اگر دو دن کے اندر نلکا ٹھیک نہ ہوا تو بچوں کو گھر بھیج دیا جائے گا۔ بس اتنی ہی بات تھی۔"

اعجاز ہکا بکا رہ گیا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا، اُس نے سوچا، یا کہ اِس میں کوئی خدائی راز پنہاں تھا؟

"مجھے علم ہے کہ آپ بھی ایک لائق اُستاد ہیں۔ آپ کو ایجوکیشن کے افسروں کے کرتوتوں کا پتا ہی ہوگا، پیسے سرکاری دوروں اور الّلوں تلّلوں پر خرچ کر دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں فنڈ ختم ہو گئے ہیں۔ چھت ٹپکیں، دیواریں گریں، کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ فنڈ ختم ہو گئے ہیں۔ مگر جب بچے گرمی سے پیاسے بیٹھے رہیں تو جناب یہ سکول ہے یا کربلا کا میدان ہے؟ آپ کے سکول کے حالات ٹھیک ہیں تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہے۔۔۔۔"

کچھ بس کے شور کی وجہ سے، کچھ اپنے خیال کی یورش سے، اعجاز نے بشیر احمد کی بات سننا چھوڑ دی۔ میں اِسے بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا قصہ ہوا ہے، اُس نے سوچا؟ اُس کا جی چاہا کہ بشیر سے پوچھے اُسے کیسے برخاست کیا گیا تھا؟ کیا استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا تھا؟ مگر اعجاز کے اندر جو بند بندھا ہوا تھا اُس نے زبان نہ کھلنے دی۔ اب اُس کے اندر دھیما دھیما غصہ اُٹھنے لگا، جو بس کی رفتار اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار کے ساتھ تیز ہوتا چلا گیا۔

بشیر نے تو شاید کوئی قصور کیا تھا، اعجاز نے سوچا، میرا کیا جرم تھا؟ یہ کہ میں ایک پرانے دوست کے پاس مل بیٹھنے کو جایا کرتا تھا؟ بس کی رفتار اب کم ہو رہی تھی۔ اُسے پتا بھی نہ چلا تھا کہ بس کئی منٹ سے شہر کی آبادی میں داخل ہو چکی تھی۔ بشیر کہہ رہا تھا، "میں والد صاحب کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ کر دیتا ہوں۔ نماز پڑھنے کو مسجد میں جاتے ہیں تو دکان پہ کھڑا ہو جاتا ہوں تاکہ کاروبار بند نہ ہو۔ مگر اِس کام میں میرا جی نہیں لگتا۔ والد صاحب نماز کی تلقین کرتے رہتے ہیں، مگر کیا کروں، میرا اعتبار ہر چیز سے اُٹھ گیا ہے۔ بس کام کی ایک آدھ بات رہ گئی ہے، باقی سب وقت گزاری کے معاملے ہیں۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

بشیر احمد کا گھر درمیانے درجے کے عام پیشہ ور گھروں کی مانند اینٹوں کا مکان تھا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اُس کا اپنا نہایت چھوٹا سا کمرہ، جس میں مشکل سے پانچ چھ

آدمی زمین پہ بیٹھ سکتے تھے، بیٹھک کے ساتھ لگتا تھا۔ اِس کا ایک دروازہ بیٹھک اَور دُوسرا گلی میں کھلتا تھا۔ بشیر نے اَندر سے جاکر دروازہ کھولا۔ فرش پہ پتلی سی دری بچھی تھی جس پہ تین اطراف دیواروں کے ساتھ تکیئے رکھے تھے۔ نہ چارپائی کی جگہ تھی نہ کرسیوں کی۔ صِرف ایک کونے میں چھوٹی سی تپائی پڑی تھی جس پہ دو تین کتابیں تھیں۔ دیواروں میں دو جگہ پر آلے بنے تھے جن کے اَندر بقیہ کتابیں اُوپر نیچے رکھی تھیں۔ دیواروں پر چاروں طرف چھوٹے بڑے پوسٹر لگے تھے۔ سب پوسٹر قلم سے بنی ہُوئی ڈرائنگوں کے پرنٹ تھے جن میں اِنقلابی مزدُور لیڈر ایک ہاتھ میں کوئی جھنڈا پکڑے، دُوسرا بازو فاتحانہ اَنداز میں اُٹھائے مارچ کرتے ہُوئے دِکھائے گئے تھے۔ اُن میں کئی ایک بڑی بڑی مونچھوں اَور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیوں والے خُوبصورت جوان تھے۔ صِرف ایک چھوٹی سی ڈرائنگ تھی جس میں کسی بچّے نے مختلف رنگ کے چاک اِستعمال کر کے ایک کشتی اَور ملاح کی تصویر بنائی تھی۔ پوسٹروں کے درمیان ننگی دیواروں پہ اُچٹتی ہُوئی سفیدی اَور اُکھڑے ہُوئے پلستر کے جنّاخ تھے۔ چھت پہ بجلی کا پنکھا تھا جس کے پَر گرد اَور مکھی کی بیٹوں سے اٹے پڑے تھے اَور درمیان میں مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ایک مدت سے خراب پڑا ہے۔ موسم گو کھُل چُکا تھا مگر چلنے پھرنے سے پسینہ نِکل آتا تھا۔ بشیر نے دری سے ہاتھ کا پنکھا اُٹھا کر اعجاز کو دیا۔

"آپ کسی یُونین سے وابستہ ہیں؟" اعجاز نے پُوچھا۔

بشیر کے مُنہ سے اُس کی مُختصر ہنسی نِکلی۔ "بیٹھیے،" وہ دری پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تشریف رکھیے۔"

اعجاز ہاتھ سے اَپنے آپ کو پنکھا جھلتا ہُوا بیٹھ گیا۔ بیٹھک کا دروازہ کھُلا اور ایک گیارہ بارہ سال کا بچّہ چھوٹی سی ٹرے میں پانی سے بھرے دو گلاس لِئے داخل ہُوا۔

"یہ چھوٹا بھائی عاطف ہے،" بشیر نے کہا۔ بچّہ ٹرے زمین پہ رکھ کر اُسی دروازے سے گھر کے اَندر چلا گیا۔ بشیر پانی کا گلاس اُٹھا کر غٹ غٹ پی گیا۔ اعجاز نے دو گھونٹ پانی کے پیئے اَور گلاس واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"یُونین وونین کیا ہے ملک صاحب،" بشیر ہاتھ سے مُنہ صاف کر کے بولا۔ "برخاستگی کے بعد مَیں نے ٹیچرز یُونین سے مدد طلب کی، وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ آخر

میرا اعتبار اُٹھ گیا۔ کئی مہینے تک میں سوچتا رہا کہ اُوپر جاؤں، ڈائریکٹر کو اپیل کروں، وزیر کو درخواست دُوں۔ پھر ایک روز مجھے ایک عجیب واقعہ دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ ہماری دُکان کے سامنے مزدُور ڈرین بنانے کے لیے کھدائی کر رہے تھے۔ اُدھر سے ایک تیز رفتار کار آئی۔ اُس نے ایک مزدُور کو کچل کے رکھ دیا۔ ڈرائیور نے پہلے بریک لگائی، پھر معاملے کی سنگینی کو دیکھ کر کار کو بھگا لے چلا۔ مزدُوروں نے یہ دیکھا تو اپنی قطار کے اگلے مزدُوروں کو آوازیں دیں، روکو، روکو۔ وہاں سے ایک مزدُور نے چھلانگ لگائی اَور کُود کر کار کے بونٹ پر جا چڑھا۔ ڈرائیور نے تیزی سے کار کو دائیں اَور بائیں چکر دیئے تاکہ آدمی بونٹ سے پھسل کر گر جائے۔ مگر وہ بُڈھا مزدُور چمگادڑ کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے کار سے چمٹا رہا۔ آخر کوئی دو سو گز کے فاصلے پر شہر کے لوگوں نے سڑک کے بیچ آ کر رستہ بند کر دیا۔ ڈرائیور گاڑی رُکنے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر نکلا اَور بھاگ کھڑا ہُوا۔ اُس کے تعاقب میں دس بارہ مزدُور تھے۔ چند قدم پر ہی اُنہوں نے ڈرائیور کو جا لیا۔ پھر جو اُنہوں نے مارنا شروع کیا ہے، اللہ پناہ! لہولہان کر دیا۔ اگر پولیس نہ آ جاتی تو جان سے مار کر چھوڑتے۔ پولیس نے ڈرائیور کے علاوہ چار مزدُوروں کو بھی گرفتار کر لیا۔ جیسے ہی گرفتاریاں ہوئیں، سارے کے سارے مزدُوروں نے جو کوئی پچیس تیس ہوں گے، اپنی اپنی روٹی کی پوٹلیاں پگڑیوں کے پلوؤں میں باندھ کر کندھے پر لٹکائیں، اوزار اُٹھائے اَور کام چھوڑ کر سڑک پر آ جمع ہُوئے۔ اُنہوں نے کہیں سے ایک چارپائی اُٹھائی اَور کچلے ہو مزدُور کو اُس پہ ڈال کر نعرے لگاتے ہُوئے تھانے پہنچ گئے۔ رستے میں اُن سب نے مِل کر خالی کار کو ایک طرف سے اُٹھایا اَور لڑھکا کر اُس گڑھے میں دھکیل دیا جسے وہ کھود رہے تھے۔ جب اُنہوں نے زخمی مزدُور کو اُٹھانے کی کوشش کی تو پہرے پر مقرر سپاہی نے اُنہیں روکنے کی کوشش کی مگر مزدُوروں کے طیش کے سامنے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اِسی طرح پولیس والے کار کے گرد بھی چاک سے نشان لگا گئے تھے۔ مزدُوروں نے اُن کی پرواہ کئے بغیر کار کو اُلٹا دیا۔ میں اُن کے ساتھ تھانے تک گیا۔ رستے میں، مَیں نے دیکھا جہاں بھی مزدُور کام کر رہے ہوتے، معاملہ سُن کر دو چار ساتھ چل پڑتے۔ یہ گروہ لگاتار نعرے لگاتا جا رہا تھا، "قاتلوں کو پھانسی دو۔ مزدُوروں کو چھوڑ دو۔" تھانے کے باہر مزدُوروں کا ٹھٹ لگ گیا۔" بشیر بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔

کچھ دیر اِنتظار کرنے کے بعد اعجاز نے پُوچھا "پھر؟"

"خبر نہیں کیا ہُوا۔ میں تو تھوڑی دیر رُک کر چلا آیا۔ مگر ایسا اکثر میں نے بھی نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے مارے ہی گئے ہُوں۔"

"مارے گئے ہوں؟"

"یعنی لاٹھی چارج ہوا ہو، یا مزید گرفتاریاں ہُوئی ہوں، یا پیسے دے دلا کر ڈرائیور کو چھوڑ دیا گیا ہو اور مزدُوروں کو اندر کر دیا گیا ہو۔ مگر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ بات اکٹھ کی ہے۔ یُونینیں کیا کرتی ہیں، میں آپ کو بتاتا ہُوں۔ اُس دن ایک دو یُونینوں تک بات پہنچ گئی۔ وہ ایک دُکان کے ٹیلیفون پر بیٹھ کر پُوچھتے رہے، کتنے آدمی اکٹھے ہُوئے ہیں، اب کتنے ہُوئے ہیں، اور اب کتنے ہُوئے ہیں۔ اُنہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک کم از کم سو آدمی نہ ہوں ہم نہیں آئیں گے، کوئی فائدہ نہیں۔ جب اُن کو اطلاع ملی کہ سو سے زیادہ آدمی جمع ہو چُکے ہیں تو پھر ایک دو لیڈر صاحبان آئے، تقریریں کیں، نعرے مروائے، خبریں لگوائیں، اندر جا کر تھانیداروں سے بات کی اور مزدُوروں کو دلاسا دے کر واپس چلے گئے۔ مزدُور کے خُون کا کس کو پاس ہے؟"

بشیر پھر خاموش ہو گیا۔ اعجاز کے خیال میں کرنے کو کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ بشیر نے دوبارہ اپنی بات جاری کی۔ "اُس روز مُجھے ایک بات کا پتا چلا، کہ اِکٹھ میں کوئی طاقت ہے یا نہیں ہے، مگر یہ بات بہت بڑی ہے۔ ملک صاحب، میں آپ کو بتاتا ہُوں۔ دیہاڑی دار مزدُور صبح سویرے خالی جیب گھر سے نکلتا ہے۔ پیچھے گھر میں تھوڑا بہت آٹا ہے تو اُس کی عورت دو چار روٹیاں پکا کر بیٹھ جاتی ہے، نہیں تو اِنتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ دیہاڑی لے کر آتا ہے تو ہانڈی چڑھتی ہے۔ اگر دیہاڑی نہیں لگتی تو ریڑھی والوں سے قرض پہ کام چلتا ہے۔ تو جناب ملک صاحب، مزدُور کے لِئے دیہاڑی توڑنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ صرف وہی جانتا ہے جس نے کل کا کھانا کمانے کے لِئے باہر نِکل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ کل گئی، چلی گئی، غائب ہو گئی، کینسل ہو گئی، پرسوں میں تبدیل ہو گئی، سمجھ گئے آپ؟ اب آپ پُوچھیں گے کہ پھر اکٹھ کیسے ہو جاتا ہے؟ تو حضورِ والا، اکٹھ اِس لِئے ہو جاتا ہے کہ مزدُور کی کل مقرر نہیں ہوتی، ہو گئی، ہو گئی، نہ ہُوئی تو نہ ہوئی۔ اِن کی زندگی کا وطیرہ ہی یہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس ساتھی کے سارے دِن ہی ختم ہو گئے ہیں اُس کی خاطر ایک اور

کل ضائع ہو گئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسا دُکھ مَیں نے بڑے بڑوں میں نہیں دیکھا۔ بڑے بڑوں کا دُکھ فائدے کی خاطر ہوتا ہے۔ اِن لوگوں کا دُکھ نقصان کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ یہی فرق ہے۔"

اعجاز اب مسحور ہو کر اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔ بشیر کے چہرے پہ اب طنز یا تلخی کا سایۂ تک نہ تھا، صِرف ایک مثبت جذبے کی جھلک تھی۔ اِس سارے دوران میں اُس نے ایک بار بھی اپنی آواز بلند نہ کی تھی، مگر اُس کے ہموار لہجے کے ایک ایک لفظ میں گہرا تاثر تھا۔ جب اُس نے بولنا بند کیا تو اعجاز چونک اُٹھا گویا ایک سحر ٹوٹ گیا ہو۔ وہ چُپ بیٹھا بشیر کے چہرے کو دیکھتا رہا، جیسے اپنی خاموشی کے ذریعے کہہ رہا ہو، بولتے جاؤ، کچھ اور بتاؤ، میرے دِل کو آرام پہنچاؤ۔"

"اُس دِن مجھے معلوم ہوا،" بشیر نے کہا، "کہ اُوپر کی بجائے میرا راستہ نیچے کو جاتا ہے۔"

"نیچے کو؟" اعجاز کچھ نہ سمجھتے ہُوئے بولا۔

"امیروں اَور وزیروں کی جانب دیکھنے سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا، اگر کچھ ہوگا تو اِن لوگوں سے ہوگا۔ یہی ہمارا مقام ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ یہ لوگ کتنے بے علم ہیں؟ نہ مسجد میں جاتے ہیں نہ روزہ نماز کے پابند ہیں۔ مولوی کی بات اُن کے اُوپر سے گزر جاتی ہے۔ اللہ رسُول اِن کے لِئے ایسی چیزیں ہیں جیسے سینکڑوں میلوں سے کسی پہاڑ کی چوٹی نظر آئے جس پہ برف جمی ہُوئی ہوتی ہے۔ مگر اِن لوگوں کا اپنا ایک ایمان ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جو اِن کو کسی دُوسرے کے لِئے اپنا پیٹ کاٹنے کا اہل بناتا ہے۔" بشیر کا گلا سُوکھ رہا تھا۔ "اَی۔۔۔۔" اُس نے آواز دی۔

عاطف آیا تو بشیر نے اُسے پانی لانے کو کہا۔ بچّہ اُس کا گلاس اُٹھا کر لے گیا اَور پانی سے بھر لایا۔ بشیر نے گلاس مُنہ سے لگا کر آدھا ختم کر دیا۔ وہ گلاس ٹرے میں رکھ کر ہاتھ سے مُنہ پُونچھ رہا تھا کہ اعجاز نے پُوچھا،

"بھٹے کے ساتھ آپ کا تعلق کیسے بنا؟"

"ہاں، آپ نے پُوچھا تھا کہ میں اِن لوگوں کو کتنے عرصے سے جانتا ہُوں۔ اصل میں یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ ہماری زندگیاں اِتفاق کی ڈھب پر ہی تو چلتی ہیں۔ کیوں، یہ

سچ نہیں؟" وہ ہنسا اور اُس کے چہرے پہ اُس عجیب ہنسی کا تاثر پھیل گیا۔ اِس شخص کے ساتھ، اعجاز نے سوچا، کوئی واقعہ گزرا ہے، ایسا خوفناک واقع، کوئی ایسی گہری دِلآزاری جس نے اَپنے آپ پہ اور دُنیا پہ اِس کا ایمان متزلزل کر دیا ہے اور ایک نئے، گہنائے ہُوئے جہان کی جھلک دِکھائی ہے۔ اعجاز کے اُڑان کرتے ہُوئے تخیل کے اندر بشیر احمد اُسے ایک ایسا آدمی لگا جو موت کی شکل دیکھ کر واپس آیا ہو۔

"میرے ماموں نے ایک غریب گھرانے میں شادی کی ہے،" بشیر نے کہنا شروع کیا۔ "اس کے سُسرال والوں میں کچھ لوگ بھٹہ مزدور ہیں۔ اُن لوگوں سے مجھے حالات جاننے کا موقعہ ملا۔ آپ نے اِنہیں دُوسرے مزدوروں کی طرح غریبی کی حالت میں مشقت کرتے ہُوئے دیکھا ہے۔ مگر معاف کیجئے گا، آپ کو حقیقت حال کا پتا ہو تو کپڑے پھاڑنے لگ جائیں۔ دیہاڑی داروں کی کل، اپنی نہیں ہوتی، بھٹہ مزدوروں کی زندگی ہی اپنی نہیں ہوتی۔ کیا آپ کو علم ہے کہ آج کل کے زمانے میں بھی یہ لوگ خریدے اور بیچے جاتے ہیں؟"

"نہیں۔" اعجاز نے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ پیشگی کے لفظ سے واقف ہیں؟"

"تھوڑا بہت۔"

"اِس پیشگی کی رقم سے اِن کے سارے کنبے کی زندگی کا سودا طے پاتا ہے۔ پیشگی کی رقم کا تعین ہی اِس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کنبے میں کتنے ہاتھ کام کرنے والے ہیں۔ نہ عورت کا سوال نہ بچے کا، پانچ سال سے لے کر اسّی سال کی عمروں تک صِرف ہاتھوں کی تعداد گنی جاتی ہے اور پیشگی طے پاتی ہے۔ اگر مزدور ایک مالک سے تنگ آ کر دُوسرے بھٹے پر جانا چاہے تو مالک اُسے پیشگی کی پرچی بنا کر دے دیتا ہے۔ دُوسرا مالک پہلے کو پرچی کی رقم ادا کر کے مزدور کو بمعہ اہل و عیال خرید لیتا ہے۔ مزدوری کا حساب یہ ہے جناب من، کہ ہر ہفتے مزدوری آدھی ملتی ہے، بقیہ آدھی پیشگی کے کھاتے میں کٹ لی جاتی ہے۔ اب آپ کا خیال ہو گا کہ کچھ عرصے کے بعد پیشگی کی رقم ادا ہو جائے گی؟ جی نہیں، سال کے بعد پیشگی دُگنی ہو چکی ہوتی ہے۔"

اعجاز کو اِس سارے سلسلے کا دُھندلا سا تصور تھا مگر تفصیلات کا علم نہ تھا۔

"دُگنی کیسے ہو جاتی ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"دُگنی نہ ہو تو ڈیڑھ گنا ضرور ہو جاتی ہے۔ مقصد میرا کہنے کا یہ ہے کہ پیشگی بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی رہتی ہے۔ ان پڑھ لوگ ہیں۔ جمع تفریق کی خبر کس کو ہے۔ اِن لوگوں نے یہ بات تسلیم کر لی ہُوئی ہے کہ عمر بھر کی غلامی ہے، حساب کتاب کے چکّر میں کون پڑتا رہے؟ یہ تو اِتوار کے اِتوار اپنی مزدوری کو تنخواہ کا نام بھی نہیں دیتے، کہتے ہیں خرچہ لینے جا رہے ہیں۔ اِس 'خرچ' سے آپ کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ غلامی کا چکّر اِن کے خُون میں داخل کر دیا گیا ہے۔ پیشگی کا قرض نسل در نسل چلتا ہے۔ باپ کی پیشگی بیٹے یا بیوی کو منتقل ہوتی رہتی ہے، جیسے بڑے لوگوں کی وراثت میں جائیداد منتقل ہوتی ہے۔ مَیں نے کہا نا، کہ بڑے لوگوں کا اِتفاق آپس میں فائیدے کی خاطر ہوتا ہے، اِن لوگوں کے اِتفاق کی بنیاد نقصان پر اُٹھتی ہے۔"

"یہ تو بڑی ناانصافی ہے،" اعجاز نے کہا۔

"یہ کوئی آج کی بات ہے؟ جناب یہ مُسلمانوں کے مذہب سے، عیسائی کے مذہب سے، یہودی کے مذہب سے بھی پہلے کی بات ہے۔ یہ دیکھئے۔" بشیر اُٹھا اور تپائی سے ایک پُرانی سی چھوٹے سائز کی جلد والی کتاب اُٹھا لایا۔ جلدی جلدی اُس کے ورق اُلٹ پلٹ کر ایک مقام پہ اُنگلی رکھی۔ "یہ انجیل ہے۔ اِس کے بابُ الخروج کی یہ تحریر پڑھیئے۔" اُس نے کتاب اعجاز کے آگے بڑھائی، پھر خُود ہی جُھک کر پڑھنے لگا: "جب حضرت موسیٰ اور ہارون نے جا کر فرعون سے کہا کہ خُداوند اِسرائیل کا خُدا یُوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لِئے عید کریں، تو فرعون نے جو اُن سے بیگار لیتا تھا ان مظلوموں پر ظلم کی انتہاء کر دی، اور اُسی دِن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم دیا کہ اب آگے کو تُم ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لِئے بُھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے، وہ خُود ہی جا کر اپنے لِئے بھس بٹوریں، اور اُن سے اُتنی ہی اینٹیں لینا جتنی وہ اب تک بناتے آئے ہیں، تُم اُس میں سے کُچھ نہ گھٹانا، کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں، اِسی لِئے چلّا چلّا کر کہتے ہیں ہم کو جانے دو تاکہ اپنے خُداوند کے لِئے قربانی کریں۔" تو جناب مَن، یہ فرعون سے بھی پہلے کی بات ہے۔ اب سے پانچ چھ ہزار سال پہلے کے آثارِ قدیمہ کھود کر نکالے گئے ہیں، کیا وہاں سے اینٹیں برآمد نہیں ہوئیں؟ اِس

ناانصافی کی قدامت کا حساب لگانا مشکل ہے۔ انگریزوں نے انھیں کلمہ پڑھا کر دین میں شامل کر لیا، مگر جاگیریں ٹوانوں اور ممدوٹوں کو ہی دیں۔ عیسائی پادری ان سے یہی کہتے رہے کہ جس کا کھاؤ اُس کے آگے دم نہ مارو۔ بشپ صاحب ایسے ہی تو چلے نہیں آئے تھے، اُن کی نمبرداری کا سوال تھا۔ کسی عیسائی مزدور کی مجال نہیں جو گواہی دے۔ کرنل جوزف کو ہزاروں اینٹوں کا چڑھاوا چڑھ گیا، بس، اور کیا چاہیے؟ ارشاد کو دو سو روپے دے کر گھر بھیج دیا۔ مگر کیا یہ روپے اُس کی جیب میں گئے؟ نہیں صاحب، اُس سے کہا گیا کہ کاپی کے اندر یہ رقم اُس کی پیشگی سے منہا کر دی جائے گی۔ وہ نالائق اسی بات میں خوش ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ایک عورت کنیز میں نے ایسی دیکھی ہے، ان لوگوں کے درمیان میرے سارے تجربے کے اندر وہ اکیلی ہی دیکھنے میں آئی ہے جس کے دل میں آزادی کا زور ہے۔ میں اُسے چھ ماہ سے جانتا ہوں، اس عرصے میں اُس نے جو بات بھی کی ہے اُس پہ قائم رہی ہے۔ ورنہ دوسری عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اُن کا آدمی کہیں بھاگ واگ جائے تو بھٹے والے عورت کو کسی زمیندار کے ہاتھ ہزار دو ہزار میں بیچ کر اپنے پیسے پورے کر لیتے ہیں۔ کنیز نے اگر کہا ہے کہ وہ ارشاد کو چھوڑ دے گی تو وہ ایسا ہی کرے گی۔"

"ارشاد عدالت میں نہ پہنچ جائے گا؟" اعجاز نے کہا۔

"ارشاد کا اُس کے اوپر کوئی کلیم نہیں بنتا۔"

"وہ اُس کا خاوند نہیں؟"

"واہ، آپ بھی کیا بھولے بادشاہ ہیں۔ کنیز آزاد عورت ہے۔ اُس کا آج تک کسی کے ساتھ نکاح نہیں ہوا۔"

"اُس کے بچے کا باپ۔۔۔۔؟؟"

"کسی اور بھٹے پر کوئی اور آدمی ہو گا۔ اُس سے پہلے کوئی اور ہو گا۔ سب چل چلا گئے۔ ان لوگوں کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ کنیز کو ارشاد سے کوئی ڈر نہیں۔ البتہ مالکوں سے خطرہ ہے، کہ وہ اُسے اٹھوا دیں گے۔ اسی لیے میں نے ایک سکیم بنائی ہے۔"

اعجاز نے رُک کر پوچھا "کیا سکیم ہے؟"

"میرے ماموں کے رشتہ دار چونیاں کے علاقے میں بھٹے پر کام کرتے ہیں۔ میری سکیم یہ ہے کہ کنیز کو چوری چھپے لے جا کر اُن کے پاس چھوڑ آؤں۔ اُن کے کچھ لوگ

دہاڑی میں بھی ہیں۔ ایک دفعہ یہاں سے نکل جائے تو پھر خیر ہے۔ مالک ارشاد سے بنتے رہیں گے۔"

"آپ کا" اعجاز نے بے خیالی سے پوچھا "اب بھٹہ مزدوروں سے تعلق-----" اُس نے سوال کو ہوا میں اٹکا چھوڑ دیا۔

"تعلق ولق کیا ہوگا صاحب' اِس علاقے میں بیس تیس بھٹے ہیں' لوگوں سے ملتا رہتا ہوں۔ اِن لوگوں کی زندگیاں اِس طرح سے گروی کی نذر ہو چکی ہیں کہ زندگیاں نہیں رہیں بلکہ ایک دستور میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اِن سے کوئی مختلف بات کرو تو سمجھتے ہیں آپ دستور کے خلاف بول رہے ہیں۔ اپنے ڈھرے پر چلتے جانے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ پھر بھی کبھی سو میں کوئی ایک بندہ بِل ہی جاتا ہے۔ آج تک اِن کا کوئی نظام قائم نہیں ہو سکا نہ ہی کوئی اِن کی جانب نگاہ کرتا ہے۔ تقریریں کرنے والے لیڈر سمجھتے ہیں کہ یہ کیڑے مکوڑوں سے بھی گئے گزرے لوگ ہیں' انہیں اِن لوگوں میں اپنا کوئی فائیدہ نظر نہیں آتا۔ یہ تو ے پچانوے فیصد عیسائی لوگ ہیں' جن کو پادری کنٹرول کرتے ہیں' اور بقیہ لوگ اِن سے فائیدہ اُٹھاتے ہیں۔ میں تو" وہ ہنسا "انگریزی کی مثال کے مطابق' ون مین بینڈ ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اِس کا کوئی نتیجہ نِکلتا نظر نہیں آتا۔"

کچھ دیر تک دونوں اِدھر اُدھر کی چھوٹی موٹی باتیں کرتے رہے۔ اعجاز کے دماغ میں ایک ہی سوال تھا۔ اگر اِس کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا تو کیا بشیر کا مقصد صرف کیتھر کو حاصل کرنا ہے؟

اعجاز نے ہاتھ بڑھا کر رُخصت چاہی۔ "اچھا' خُدا آپ کی مدد کرے۔"

"میں آپ کا وقت لینے کی جُرات نہیں کر سکتا" بشیر نے کہا "آپ کی سکول کی مصروفیت بھی ہے' زمینداری بھی ہے۔ مگر جب کبھی آپ کے پاس فرصت کا لمحہ ہو' میرا غریب خانہ کُھلا ہے۔"

ایک لمحے کو اعجاز کا ارادہ لڑکھڑایا۔ اُس کا جی چاہا کہ اپنا دِل بشیر کے سامنے کھول کر اُسے بتا دے کہ وہ اب سکول ماسٹر نہیں رہا۔ آخری وقت میں اُس نے زُبان روک لی۔ "ضرور' ضرور" اُس نے کہا' اور جلدی سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہُوا۔ باہر دِن ختم ہو رہا تھا۔

بس شجاع آباد سے ہو کر جاتی تھی۔ جب وہاں پہ جا کر رُکی تو اعجاز نے اُٹھنے کے لئے متعدد بار پاؤں پہ بدن کا بوجھ ڈالا اور ہٹالیا، ڈالا اور ہٹالیا، یہاں تک کہ بس چل پڑی۔ جوں جوں بس چلتی جاتی تھی اعجاز کی ٹانگوں کی طاقت زائل ہوتی جاتی تھی، جیسے اُن کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ اگر اُس وقت کوئی پوچھتا کہ کہاں جا رہے ہو، کیا کرنے جا رہے ہو، تو صریحًا اِس کا کوئی جواب نہ دے پاتا۔ ایک ان دیکھی، اَن جانی قوت تھی جس نے اُس کا رُخ متعین کر رکھا تھا۔ ساتھ ہی، دِل کے دبیز پردوں کے اندر اُسے اِس بات کا علم بھی تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

بس رُکی تو وہ اُتر پڑا۔ ڈرائیور کو رُکنے کے لیے اُسی نے کہا تھا کیونکہ یہ بس کا سٹاپ نہ تھا۔ دیر تک وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک اندھیرے درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ رات پڑ چکی تھی۔ خزاں کے موسم کا آسمان اِس قدر شفاف تھا کہ چاندنی کی دھنک سے باہر ستارے اپنے حجم سے بڑے دِکھائی دے رہے تھے۔ تین چار کھیت چھوڑ کر بھٹے کی چمنی دِکھائی دے رہی تھی۔ اعجاز نے رُک رُک کر کچی سڑک پہ قدم رکھا جو بھٹے کو جاتی تھی۔ سڑک پر لمبے لمبے گہرے نشان تھے جو بارشوں کے موسم میں بھاری گڈوں کے پہیوں سے بن گئے تھے اور دُھوپ میں سُوکھ چکے تھے۔ سڑک ختم ہُوئی تو اعجاز ایک پُرانے پیپل کے پیڑ کے نیچے رُک کر مزدُوروں کے گھروندوں کو دیکھنے لگا۔ بے کواڑ دروازوں پر ٹاٹوں اور پھٹے پُرانے کپڑوں کے پردے لٹک رہے تھے۔ جن کے سُوراخوں سے اندر جلتے ہُوئے تیل کے دیئے یا لالٹینیں نظر آ رہی تھیں۔ ارشاد اور کنیز کے دروازے پر ٹاٹ، جو دِن میں دہلیز پہ گرا پڑا تھا، دوبارہ اپنی جگہ پہ کیلوں کی مدد سے لٹکا دیا گیا تھا۔ ٹاٹ کی حالت ایسی خستہ تھی کہ بمشکل تین چوتھائی دروازے کو ڈھکتا تھا۔ اِس کے کٹے پھٹے کناروں سے گھروندے کے اندر ایک چھوٹی سی لالٹین دیوار پہ لٹکی دِکھائی دے رہی تھی۔ اعجاز ہولے ہولے قدم رکھتا ہُوا دروازے کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اندر سے ہانڈی کی بُو اُٹھ رہی تھی اور بچّے کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کنیز نرم لہجے میں ہُوں ہاں کر رہی تھی۔ برتنوں کا ہلکا سا کھڑاک تھا۔ اعجاز اپنا دھک دھک کرتا ہُوا دِل سنبھالے کھڑا رہا۔ اِتنے میں دو گھر چھوڑ کر ایک دروازے کا پردہ اُٹھا اور دو آدمی گھروندے سے نِکلے۔ اعجاز اپنی جگہ سے کھسک کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دونوں آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے بھٹے کی جانب چلے گئے،

جیسے اُن کے دل میں کوئی خوف ہو۔ اعجاز دیوار سے الگ ہوا تو اُس کا پَیر ایک ٹین کے ڈبے سے جا ٹکرایا۔ آواز سُن کر کنیز ہاتھ میں لالٹین لیے اُٹھی اور ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر جھانکنے لگی۔ اعجاز اپنا بدن سیدھا کر کے وہاں سے چل پڑا، یُوں جیسے اپنے رستے پہ جا رہا ہو۔ کنیز اُسے پہچان کر بول اُٹھی، "ملک جی، خیر سے آئے ہو؟"

"اِدھر سے گزر رہا تھا،" اعجاز لہجے کو قابُو میں رکھ کر بولا، "سوچا کہ دیکھتا جاؤں، ملک رشید سے ملاقات ہو جائے تو بات کروں۔"

"خُدا تُمھارا بھلا کرے،" کنیز بولی۔ وہ جلدی سے مُڑی اور گھروندے کے اندر چلی گئی۔ وہاں اُس نے وہ بچگانہ سی لالٹین دوبارہ دیوار پر لٹکا دی۔ "لیٹ جا،" وہ جھڑک کر بچے سے بولی، "رُوں رُوں، رُوں رُوں، میری جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بانہہ پر سر رکھ کے سو جا۔"

کنیز ٹاٹ اُٹھا کر باہر نکل آئی۔ اُس کے باہر آنے سے پہلے ہی اعجاز آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چل پڑا تھا۔ کنیز اُس کے ساتھ چال مِلا کر ایک قدم پیچھے چلنے لگی۔

"کیا کھا رہی ہو؟" اعجاز نے اُسے دیکھ کر پُوچھا۔

"باجرے کی روٹی۔" کنیز نے کہا اور روٹی اعجاز کی جانب بڑھائی۔ اعجاز روٹی سے ایک ٹکڑا توڑ کر کھانے لگا۔

"ٹھیکیدار اِس وقت گھر چلے جاتے ہیں،" کنیز بولی، "جمعدار اِدھر رہتا ہے۔ بھٹے کے پیچھے اُس کا گھر ہے۔"

"جمعدار کون ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"اپنی طرح کا مزدُور ہی ہوتا ہے جی، ہاتھ پَیر کا تگڑا ہوتا ہے، ٹھیکیداروں کے مُنہ لگ جاتا ہے۔ اُسے ہمارے اُوپر تھانیدار لگا دیتے ہیں۔"

اب وہ درختوں کے سائے سے نکل کر چاندنی میں آ گئے تھے۔ کچی سڑک کے دونوں طرف چارے کے کھیت تھے جو آدھے پونے کاٹے جا چکے تھے۔ اب مُجھے، اعجاز نے سوچا، اپنے ہاتھ سے کاشت کرنی پڑے گی۔ اُس نے مڑ کر کنیز کو دیکھا جس کے نقش اب چاندنی میں نکھر آئے تھے۔

"ارشاد کہاں ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"نمرد سویا ہوا ہے۔"

کنیز کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر اعجاز کے بدن میں گویا جان پڑ گئی۔ اُس کا ایک ایک پٹھا اضطراب سے پھڑکنے لگا۔ اب تک وہ سیدھا کنیز کو دیکھنے سے گریز کرتا رہا تھا۔ اچانک وہ پلٹ کر کھڑا ہوگیا اور بے خوفی سے کنیز کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ کنیز اپنا کُملایا سادہ چہرہ اور بے تکلف بدن لئے کھڑی اعجاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی اجنبیت نہ تھی، جیسے کہ وہ اعجاز کے ان کہے پیغام کو پڑھ کر قبول کر رہی ہو۔ مزید کوئی لفظ بولے بغیر، دونوں ایک ساتھ سڑک کو چھوڑ کر چارے کے کھیت میں داخل ہوئے۔ کھیت کے بیچ پہنچ کر اعجاز ایک مٹی کی بنّی پر بیٹھ گیا۔ کنیز کچھ دیر کھڑی کھڑی نیچے بیٹھے ہوئے اعجاز کے سر کو دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر نہایت ہلکی سی ملامت آمیز مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ پھر وہ آہستہ سے اعجاز کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اعجاز نے ایک بازو اُٹھا کر اُس کے شانوں کے گرد رکھا۔ دُوسرا ہاتھ پھیلا کر وہ کنیز کے گال کو سہلانے اور انگوٹھا اُس کے ہونٹوں پہ پھیرنے لگا۔ کنیز کھسک کر بنّی سے اُتری اور چارے کے نرم پودوں کے اندر سیدھی پُشت پہ لیٹ گئی۔ اعجاز نے گھٹنوں پہ اپنے جسم کا بوجھ سنبھالا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے کنیز کے کندھوں کو گرفت میں لے لیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح جھکا کنیز کے چہرے اور بدن کو محویت سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے چہرے سے رگڑ کھاتے ہوئے چارے کے پتوں اور گیلی مٹی کی بُو اُس کی ناک میں چڑھی، جو آہستہ آہستہ کنیز کے پسینے کی ہلکی بُو سے مل جُل گئی۔

چارے کی فصل کا سبز رنگ چاند کی روشنی میں ہلکا نیلا نظر آ رہا تھا۔ رات کا طویل و عریض سکُوت سارے جہاں پہ پھیلا تھا، جسے کبھی کبھی سڑک سے گزرتے ہوئے تانگے میں جُتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں یا کسی بس کے انجن کی آواز عارضی طور پہ توڑ دیتی اور پھر خاموشی کی چادر کھیتوں پہ چھا جاتی تھی۔ بھٹے کی بھدی سی پھیلی ہوئی عمارت کسی آسیب زدہ مقبرے کی مانند ساکن کھڑی تھی۔ اعجاز الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ مل کر مٹی اُتاری۔ اُس نے سر جھکا کر دیکھا۔ چارے کے بستر پر کنیز کا نکھرا ہوا، سیاہ بے مزاحمت جسم پھیلا تھا۔ اُس کے کسی عضو میں حرکت نہ تھی، صرف اُس کی آنکھیں کھلی تھیں جو پودوں کے سائے میں ہونے کے باوجُود اعجاز کو نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے محسُوس کیا کہ

اُن آنکھوں میں مسرت، دُکھ، سُرور، درد یا کسی اَور مانُوس جذبے کی جھلک تک نہ تھی، صِرف ایک عمیق خاموشی کا عنصر تھا جو ٹپکا پڑتا تھا۔ بے زُبانی کا یہ خاصہ اعجاز نے کنیز کی آنکھوں میں دیکھا۔ دفعتاً اُس کے اپنے اندر کی مزاحمت جواب دے گئی۔ اُسے احساس ہوا کہ جیسے اُس کے ذہن کا وہ بھاری پتھر ریزہ ریزہ ہو کر اُس کی آنکھوں، کانوں اَور دُوسرے مساموں کے رستے بہہ نکلا ہے۔

"میں برخاست ہوگیا ہوں،" وہ بے ساختہ بولا۔

"ہیں؟" کنیز نے لیٹے لیٹے پُوچھا۔

"سکُول کی نوکری چھُٹ گئی ہے۔"

"پڑھ پڑھا بیٹھے ہو، فِکر کیوں کرتے ہو جی۔"

کنیز کی بے پروا آواز اُس کے کانوں میں آئی تو یک دم اُس کی بلبلاہٹ سرد پڑ گئی۔ "فِکر تو ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "شرمندگی کی بات ہے۔"

"شرم کس بات کی۔ عزّت دار آدمی ہو، نوکری کی غلامی میں بھی کوئی عزّت ہے؟"

"یہ بات تو دُرست ہے۔"

"میں تو پہلے دِن ہی تُمھاری آنکھ دیکھ کر پہچان گئی تھی، ملک جی۔"

"کیا پہچان گئی تھی؟"

"کہ تُمھارے دِل کو کوئی فِکر ہے۔"

کنیز نے اُٹھ کر اپنا لباس دُرست کیا اَور روندے ہُوئے نرم پودوں پر اعجاز کے برابر بیٹھ گئی۔ تین دِن کے اندر پہلی بار اُس بھاری سیاہ پتھر کے جان لیوا بار سے اعجاز کا چھٹکارا ہُوا تھا۔ اُس کا دِل اَور دماغ دونوں اب بے بار تھے، جیسے ہوا میں اُڑتا ہُوا کوئی غبارہ ہو۔ وہ عورت جو اُس کی بات کے وزن کا اندازہ بھی نہ کر سکتی تھی، اُس کے سامنے بڑبڑا کر یہ راز بیان کر دینے سے اعجاز نے گویا اپنی قید سے نجات حاصل کر لی تھی۔ نجات کے ہلکے پن میں وہ ٹکٹکی باندھے کنیز کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ مصائب کا مارا ہُوا یہ جسم، اعجاز نے سوچا، جو اب دسویں یا بیسویں یا پچاسویں بار نئے سِرے سے بے روزگار ہو رہا تھا، جس نے کِس قدر مکمل بے اعتنائی سے کہا تھا "پڑھ پڑھا چُکے ہو، فِکر کیوں کرتے ہو جی، جیسے کہ اُس نے

آگے کا غم ہو نہ پیچھے کا۔ اُس کے لئے اعجاز کے دل میں ایک انوکھی چاہت پیدا ہوئی، ایک
اَن کہی ہمسری کا احساس جس کا بدنوں کے ملاپ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔
"تُو نے اَور کس بات کی پہچان کی تھی؟" اعجاز نے پہلی بار ہلکے پھلکے دل سے بات
کیا۔
کنیز ایک لحظ اُسے تکنے کے بعد ہنس دی۔ "تُمہاری آنکھ میں مرد کی نظر تھی۔"
اِتنی واردات گزرنے کے بعد بھی کنیز کی بات سُن کر اعجاز جھینپ گیا۔ "وہ
کیسے؟"
"تم مجھے دیکھتے جاتے تھے اَور آنکھ نہیں جھپکتے تھے۔"
"تُو تو اُس وقت واویلا کر رہی تھی۔"
"اِس سے کیا ہوتا ہے؟" وہ بولی، "عورت دُور سے ہی ایک نظر میں مرد کو پہچان
جاتی ہے۔"
دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اعجاز نے ہاتھوں سے جھٹک کر اپنے کپڑے جھاڑے۔
وہ کھیت سے نِکل کر سڑک پر آ گئے۔
"بشیر نے تیرے ساتھ کیا بات کی ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔
"کہتا ہے دُوسرے شہر میں بھٹے والے اُس کے واقف کار ہیں، اُدھر کام پر لگوا
دے گا۔"
"اِس سے تیرا کیا فائیدہ ہو گا؟"
"غلامی سے جان چھٹے گی۔ نہ پیشگی کی غلامی نہ مرد کی۔ مزدُوری کروں گی اَور اپنا
خرچہ لُوں گی۔ کیوں، ٹھیک نہیں ملک جی؟"
اعجاز نے کچھ دیر رُک کر جواب دیا، "ٹھیک ہے۔ اچھا۔" پھر اُس نے کہا "اب
چلتا ہُوں۔"
"تُمہاری بڑی مہربانی جی،" کنیز نے اُس سے کہا "تُمہاری بڑی مہربانی، خُدا تُمہارا
بھلا کرے۔"
اعجاز اُسے اپنے گھروندے کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اِس آزادی سے
چلتی ہوئی جا رہی تھی جیسے اُسے اعجاز سے، بشیرے، ٹھیکیدار سے یا دُنیا کی کسی اَور شے سے

سی اُمید کی توقع نہ ہو۔ اعجاز کے دماغ میں شام کا منظر، اور پھر کنیز کے الفاظ، "تُمھاری
ڑی مہربانی جی، خُدا تُمھارا بھلا کرے،" گھوم رہے تھے۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک
ت بجلی کی مانند کوند گئی۔۔۔۔ کہ اِس ساری کارروائی کا کنیز کے ساتھ کسی قسم کا کوئی
روکار نہ تھا، کہ یہ سارا دھندا محض اعجاز کے اپنے روزگار اور بیروزگاری کے چکّر کا تھا،
جس سے اُس نے کنیز کے سہارے سے فراغت حاصل کی تھی۔ اُس وقت اعجاز کو پہلی بار
اپنے آپ سے نکل کر دُنیا کے بیروزگاروں کی بے حرمتی کا احساس ہُوا۔ دل میں ایک
افتاد اُداسی لیے وہ گھر کی جانب چل پڑا۔

رات بھیگ چلی تھی جب اعجاز گھر میں داخل ہُوا۔ نوزائیدہ جوڑے کے علاوہ سب
جاگ رہے تھے۔ سکینہ بچوں کی چارپائی پر پائنتی کی جانب، سَر ہاتھ پہ اُٹھائے پہلو کے بل
لیٹی تھی۔ اُس کی کمر اور کولہوں کے خم دو روز کے اندر ہی واضح ہونے شُروع ہو گئے تھے۔
برابر کی چارپائی پر دائی اُسی انداز سے لیٹی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ صحن میں سرفراز
اس کے ساتھ چارپائی پہ لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔ ماسی باہر سے اپنی بیٹی اور دائی کی گفتگو میں
شامل تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر سرفراز اُٹھ بیٹھا۔ اندر دائی بھی چارپائی پہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ سکینہ
نے پہلو پہ لیٹے لیٹے بدن کو اِدھر اُدھر کھسکا کر اپنی نشست دُرست کی اور مُنہ کا رُخ اعجاز کی
جانب موڑ دیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اعجاز کی حس نے اُسے بتا دیا کہ اُس کا راز افشا ہو گیا
ہے۔ وہ جا کر سکینہ کے پاؤں کے پاس چارپائی کے کونے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر
سوتے ہُوئے بچوں میں سے ایک کے مُنہ سے کپڑا اُٹھا کر اُس کا چہرہ دیکھا۔ پھر اُس نے
بکڑے سے کہا، "ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"اِتنی دیر سے آئے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"شہر چلا گیا تھا۔"

"کیا کرنے؟"

"ایک دوست کے ساتھ چلا گیا تھا۔"

"سکُول نہیں گئے،" سکینہ نے نیم سوالیہ انداز میں کہا جیسے سوال کرنے کی بجائے
کُچھ بتا رہی ہو۔

"اونہوں،" اعجاز نے نفی میں سَر ہلا کر جواب دیا۔ اُس نے سرفراز کی جانب دیکھا

جو آنکھیں کھولے اُسے تکتا جا رہا تھا۔ "نوکری چھوڑ دی ہے،" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"بس،" اعجاز بے خوفی سے سکینہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا، "جی نہیں لگتا تھا

"واہ،" سکینہ نے کہا، "اِن بلونگڑوں کا کیا اچھا اِستقبال کیا ہے۔"

"اِن کی پیدائش سے پہلے استعفیٰ دے دیا تھا۔"

"جیسے تمھیں اِن کی کوئی خبر ہی نہیں تھی،" سکینہ طنز سے بولی۔ "نو مہینے

آنکھوں پر کالی عینک لگا کر پھرتے رہے ہو؟"

اعجاز آہستہ سے ہنسا۔ اُس نے دُوسرے بچّے کے مُنہ سے چادر اُٹھا کر دیکھا۔

دیر تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سکینہ نے پُوچھا۔

"روٹی کھا آئے ہو؟"

"نہیں،" وہ بولا۔

"بُھوک لگی ہوگی۔"

"ہاں۔"

دروازے کے ساتھ ہی باہر بچھی چارپائی سے ماسی بولی، "گرم کر دیتی ہُوں۔"

"ماسی لیٹی رہو،" اعجاز نے کہا۔ "کھاؤں گا۔ بھوک بہت لگی ہے۔"

اُس کا کھانا ڈھکا ہُوا چنگیر میں رکھا تھا۔ وہ چنگیر اُٹھا کر صحن میں ذرا دور بچھی اپنی

چارپائی پہ جا بیٹھا اور ٹھنڈی روٹی کو اِشتہاء سے چبا چبا کر کھانے لگا۔

"سکُول میں آج کیا ہُوا پھر؟" اُس نے سرفراز سے سرسری طور پُوچھا۔

"کچھ نہیں،" سرفراز نے جواب دیا۔

اعجاز کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"لالہ،" کچھ دیر بعد سرفراز بولا، "اب سکُول نہیں جاؤ گے؟"

"اونہوں،" اعجاز نے سَر ہلا کر جواب دیا۔

جب اُس نے کھانا ختم کر لیا تو چنگیر چُولھے کے پاس رکھ کر نلکے پر کُلّی کی۔ پھر آ

کر اپنی چارپائی پہ لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ اِس طویل

دِن کے واقعات چھوٹے چھوٹے اُدھورے مناظر کی شکل میں اُس کی بند آنکھوں سے بہ

بعد دیگرے گزرنے لگے، مگر نیند کی یلغار کے آگے غائب ہوتے گئے۔ شرمندگی کا ایک پُردہ اتر چکا تھا۔ دوسرے کو اتار پھینکنے کی سعی میں اعجاز کو ایک عمر کی ضرورت تھی۔

"دوسرا سرہانہ لا دوں؟" ماں نے پوچھا، مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اعجاز سو چکا تھا۔

حصّہ سوئم

باب 5

صُوبیدار میجر ریٹائرڈ جہان خان ان پڑھ تھا۔ اُس کے بیٹے عالم جہان نے آٹھویں درجے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریز حکومت کی دی ہُوئی چالیس مُربع غیر آباد زمین کے بدلے حاصل کی ہُوئی آٹھ مُربع زرعی اراضی کے بیچ ایک ڈیرے اور چند گھروں پہ مشتمل جس آبادی کی داغ بیل صُوبیدار جہان خان نے ڈالی تھی، اسے فی الحقیقت اِس کے بیٹے عالم جہان نے روز و شب کی محنت سے جہان آباد نامی گاؤں کی شکل دی تھی۔ صُوبیدار جہان خان اپنی زیادہ تر ذہنی اَور جسمانی قوت جنگی مہمات میں صرف کر چُکا تھا۔ جب اسے زندگی میں آرام کا موقعہ ملا تو مزارعوں کے دو چار کنبوں کی مدد سے بمشکل ایک تہائی رقبے پر کاشت شروع کروا کے اسی پر قناعت کر کے بیٹھا رہا۔ عالم جہان جب جوان ہوا تو اِس نے زمینداری کا کاروبار اَپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مزید مزارعے لا کر آباد کرنے کے بعد وہ ایک آدھ سال کے اَندر تمام تر اراضی کو زیرِ کاشت لے آیا۔ اِس نے پُرانی طرز کے کچے ڈیرے کی جگہ پر اپنے خاندان کے لِئے دس بارہ کمروں کا پکا مکان تعمیر کرایا، مزارعوں کی رہائش کے لِئے کچے مکان بنوائے، ان کو گائے بھینسیں خرید کر دیں، نلکے لگوائے، مکانات کی تعداد بڑھنے کے ساتھ جو گلیاں وجُود میں آ گئی تھیں ان کے بیچ پانی کے اخراج کے لِئے نالیاں نکلوائیں، کھاد کے ڈھیر اُٹھوائے اَور ان کے لِئے گھروں سے کچھ دُور دو چار قطعہ زمین مختص کئے، بھینسوں کے نہانے کی خاطر آدھے ایکڑ میں ایک تالاب کی تشکیل کی، اَور یُوں جہان آباد کو ایک مکمل "چک" کی صورت کو پہنچایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عالم جہان کو تعلیم کی افادیت کا علم ہو چُکا تھا۔ اِس نے اَپنے بیٹے جہانگیر اعوان کو آٹھ برس کی عُمر میں ہی پڑھنے کو چیف کالج بھیج دیا، جہاں پہ جہانگیر سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرتا رہا، گو آخری اِمتحان میں کامیاب نہ ہو سکا اَور چھوڑ کر گھر واپس لوٹ آیا مگر اُس مشہور کالج میں قیام کے دوران صوبے کے تمام قابل حیثیت خاندانوں کے لڑکوں سے اِس کے تعلقات اُستوار ہو چُکے تھے۔ اِس کے علاوہ اُس کے اَندر اَپنی ذات میں ایک ایسا اعتماد بھی آ گیا تھا جو اُس کے باپ اَور دادا میں ناپید رہا تھا۔ عالم جہان کی وفات پر جہانگیر اعوان نے زندگی کا

کاروبار سنبھالا تو اُس کا دائرہ کار مزید وسیع ہوتا گیا۔ دیہات کے لوگوں کو دُنیاداری کے سلسلے میں بصرف دو جگہوں سے براہِ راست واسطہ پڑتا تھا۔ ایک پٹواری کا دفتر اور دُوسرے ضلع کچہری، جہاں فوجداری کے معاملات نبٹائے جاتے تھے۔ جہانگیر اعوان کے دِل میں اِن دونوں جگہوں کا کوئی خوف نہ تھا، نہ ہی اُسے وہاں گھوم پھر کر لوگوں کے کام کروانے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ افسرِمال سے لے کر قانون گو، محکمہ انہار میں ضلع دار اور کچہری میں تحصیل دار سے لے کر مجسٹریٹوں تک اُس کی شنوائی تھی۔ اِس طرح اُس کا اثر رسُوخ جہان آباد کی حدود سے نکل کر دُوسرے گاؤں اور قصبوں تک پھیل گیا تھا۔ اِن معاملات میں داخل ہو کر اسے سیاست کا چسکہ بھی لگ چکا تھا۔ مقامی سیاست میں تین برس گزارنے کے بعد وہ آخر صوبائی الیکشنوں کے موقع پر مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جاٹ برادری اور اپنے تعلقات کی بناء پر اِس نے الیکشن کی مہم سر کی اور حلقے سے صوبائی اسمبلی کا ممبر منتخب ہُوا۔ اب ملک جہانگیر اعوان ایم۔ ایل۔ اے علاقے کی بااثر شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔

سن پچاس کی دہائی کے وسط تک یہ زمین نہری پانی سے سیراب ہوتی تھی اور بہت قابلِ مٹی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں گنے، گیہوں، مکی اور باجرے کی کاشت ہوتی تھی اور بھاری فصل اُترتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ساٹھ ستر من فی ایکڑ گیہوں اُترتے دیکھ کر مشرقی پنجاب کے کسان رشک کرتے تھے۔ پھر جب ہندوستان نے اپر باری دو آب کا پانی بند کر دیا تو راتوں رات یہ علاقہ بارانی رقبے میں تبدیل ہو گیا۔ کہیں کہیں پرانے کنوئیں لگے تھے، کچھ لوگوں نے نئے کنوئیں کھودے مگر بیلوں کی مدد سے کھینچا گیا پانی چند ایکڑ رقبے سے زیادہ کی پیاس بجھانے کے قابل نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرزمین کا نقشہ بدل گیا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی کالی مٹی اور سرسبز کھیتوں والی زمین بھورے رنگ اور چھدری کمزور فصلوں کی شکل اختیار کر گئی جس میں کہیں کہیں سبزے کے پیوند لگے دکھائی دیتے تھے۔ کسانوں نے پہلی بار آسمان کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ بارش کی رحمت کے سب دعاگو رہتے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی پیروں فقیروں کے اثر رسُوخ میں ترقی ہوئی۔ حصے پر کاشت کرنے والے غریب کسان ہر چھوٹے بڑے مقامی پیر کے مزار پہ حاضری دینے اور چڑھاوے چڑھانے لگے نتیجتاً گدی نشینوں نے اراضی کے رقبے خریدنے شروع کر دیئے۔ کئی مزاروں پر

جہاں پہلے ایک پکی سی قبر پہ سبز جھنڈی لہرایا کرتی تھی، چمکیلے گنبدوں والی عمارتیں بن گئیں جن کی شان و شوکت مریدوں کے درمیان مزید عقیدت کا موجب بنی۔ ملک جہانگیر نے سن سینتالیس کے بٹوارے کے ساتھ ہی اپنے لیے دو فائدہ مند کام کئے۔ ایک تو اس نے ملک فلک شیر ری ہیبلی ٹیشن کمشنر کی مدد سے سکھوں کے چھوڑے ہوئے چھوٹے بڑے رقبوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ علاوہ اس کے، مقامی مہاجنوں کے کوچ سے پیشتر ان کے پاس گروی شدہ اراضیوں کے کاغذات اونی پونی قیمت ادا کر کے ہتھیا لیے اور کچھ دیگر افسران کی معاونت سے، کچھ دھونس دھاندلی کے ذریعے، رجسٹریاں کرا کے انھیں اپنی قانونی ملکیت کی حیثیت دلوالی۔ اس طرح وہ اپنی زمینداری کو آٹھ سے دس، اور دس سے انیس مربعوں تک پھیلانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے اس نے لوئر باری دوآب کا پانی رکنے کے ساتھ ہی حکومت سے قرضے حاصل کر کے ٹیوب ویل لگوائے اور ٹریکٹر خرید کر مشینی کاشت شروع کر دی تھی۔ گاؤں کے باہر اس نے اپنے لئے ایک وسیع و عریض پکا ڈیرہ تعمیر کروایا تھا جہاں پہ وہ اب جم کر بیٹھ گیا اور اپنے "علاقے" کی نگہداشت کرنے لگا تھا۔

جب جہانگیر کا منشی اعجاز کے لیئے بلاوے کا پیغام لے کر شجاع آباد پہنچا اس وقت سورج سر پر تھا اور اعجاز صبح کا نکلا ابھی ابھی شہر سے لوٹا تھا۔ وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

"ملک جہنگیر نے ٹھیکے والوں سے بات کی ہو گی۔" سکینہ نے خیال دوڑایا۔

"اس سے کس نے کہا ہے؟"

"شاید ابے نے کہا ہو۔"

"چاچے کو کس نے کہا بیچ میں ٹانگ اڑائے؟" اعجاز نے نوالہ چباتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے بات کی تھی۔"

"تو نے؟ تو کیوں دخل دیتی ہے خواہ مخواہ --- میں خود ٹھیکے والوں سے بات کروں گا۔"

"کروں گا، کروں گا۔ کب کرو گے؟ اُدھر تنخواہ گئی، اِدھر دو بلونگڑے آ گئے ہیں۔ ان کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں؟ دخل نہ دوں تو کیا کروں؟ روز سویرے شہر چلے جاتے ہو، خفت خواری کر کے واپس آ جاتے ہو۔ اللہ جانے کس کس کو ملتے رہتے ہو۔ وہی یار

دوست جنھوں نے نوکری گنوائی ہے یا کوئی نئے بن گئے ہیں۔ دخل نہ دو' دخل نہ دو' میری کیا حیثیت ہے۔ ایک ٹونٹے کو ایک تھن سے لٹکایا ہے' دُوسرے کو دُوسرے تھن سے۔ نہ دِن کو چین نہ رات کو آرام۔"

"دودھ تو تیرا بکری کی طرح نِکلتا ہے۔" اعجاز ہنس کر بولا۔ "ٹونٹے نہ پئیں تو تیری شلوار بھی گیلی ہو جائے۔"

"سُوکھی شلوار میں مُجھے کیا انعام مِلتا ہے جو گیلی سے نقصان ہو جائے گا۔" سکینہ تیزی سے بولی۔

اعجاز کو احساس تھا کہ بچّے ڈھائی ماہ کے ہو چلے ہیں اور وہ سکینہ کے نزدیک تک نہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے سَر جھکا کر کھانا کھاتا رہا اور پھر اپنی نئی سائیکل پر سوار ہو کر جہان آباد کو روانہ ہو گیا۔

ایک وقت تھا کہ جہانگیر کے ڈیرے پر علاقے کے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ پھر مارشل لاء لگ گیا تو ضرورت مندوں کی آمدورفت کم ہو گئی۔ اب جُوں جُوں وقت گُزر رہا تھا اور ماحول میں کچھ نہ کچھ آزادی آتی جارہی تھی' سیاست دان پینترے بدل بدل کر اپنے چولہے گرم کرنے میں مصروف ہو گئے تھے' گو کانسٹی ٹیوشن یا الیکشن کے بارے میں ابھی کوئی ذکر نہ ہو رہا تھا۔ اعجاز جب پہنچا تو ڈیرے کے احاطے میں پندرہ بیس آدمی تین مختلف ٹولیوں میں چارپائیوں پہ بیٹھے حُقّے گڑگڑا رہے تھے اور کسانوں کے دھیمے سُست لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ پیچھے متعدد کمرے ایک قطار میں بنے تھے۔ ایک کمرے میں جہانگیر کا دفتر تھا جہاں اِس کا ایک زمینوں کا منشی اور ایک سیاسی منشی بیٹھتے تھے۔ سامنے کے تین کمرے جہانگیر نے اپنے لِئے رکھے ہُوئے تھے جہاں وہ آنے والوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ دو تین کمرے مہمان خانے کے لِئے مخصوص تھے۔ اعجاز کی اِس کے ساتھ ملاقات گو دوستی کی حد تک نہ تھی مگر جب بھی انتخابات وغیرہ کے دوران ضرورت پڑی' اعجاز نے برادری کے فرد ہونے کی حیثیت سے اِس کی مدد کی تھی۔ اعجاز نے کمرے میں قدم رکھا تو جہانگیر صوفے پر چار آدمیوں کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ چاروں کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علاقے کے معتبر لوگ ہیں۔ پانچوں آدمی سر جوڑے نیچی آواز میں کوئی گہری گفتگو کر رہے تھے۔ اعجاز کی آمد پر پانچوں نے سَر اُٹھا کر ایسے اُسے دیکھا گویا وہ اُن کی محفل میں مخل ہوا ہو۔ پھر

جہانگیر نے سَر ہلا کر سلام کا جواب دیا اور کچھ بولے بغیر ہاتھ اُٹھا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اعجاز دُوسری دیوار کے ساتھ بچھی کرسیوں میں سب سے آخر والی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ پانچوں آدمی دوبارہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ اعجاز یہ کمرہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی سامنے بڑی سی میز نظر آتی تھی جس کے پیچھے قیمتی قسم کی کرسی رکھی تھی۔ عقب کی دیوار پر چند فریم شدہ تصویریں لٹکی تھیں۔ ان کے درمیان سب سے بڑے سائز میں ایک تصویر تھی جس میں جہانگیر ایک سابقہ وزیرِاعظم چوہدری محمد علی کے ساتھ کھڑا تھا۔ تصویروں کے علاوہ الیکشنوں کے چند پوسٹر بھی دیوار پر ٹیپ کی مدد سے چپکائے گئے تھے۔ دائیں جانب وہ صوفہ سیٹ رکھا تھا جس پہ پانچوں آدمی بیٹھے تھے، جس کا اصل کپڑا سفید چادر کے ڈھیلے غلافوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ بائیں دیوار کے ساتھ چند ملی جُلی سیدھی پُشت والی اور آرام کرسیاں ایک قطار میں رکھی تھیں جن کا بید کئی جگہ پہ مسلسل استعمال سے اکھڑ چکا تھا۔ اعجاز کئی منٹ تک بے خیالی سے ان جانی پہچانی تصویروں کو دیکھتا رہا جن میں ایک تصویر کے اندر اعجاز بھی جہانگیر اعوان کے ساتھ کھڑا تھا جب جہانگیر ان کے سکول میں کھیلوں کا افتتاح کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہُوئے افراد مستقل سازشی لہجے میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص برابر دُوسروں کی بات کاٹے جا رہا تھا۔ الفاظ اعجاز تک نہ پہنچ پا رہے تھے مگر آدمی کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بار بار ایک ہی بات کو دُہرائے جا رہا تھا۔ جیسے ہی اعجاز کو یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ اِن لوگوں کی یہ کانفرنس کبھی ختم نہ ہوگی، چاروں آدمی اپنی پگڑیاں سنبھالتے ہُوئے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ جہانگیر اُٹھ کر ان کے ساتھ دروازے تک گیا۔ چند منٹ وہاں پہ رُک کر ان سب نے متعدد بار روانہ ہونے کے لیے قدم بڑھائے اور پھر واپس آکر جہانگیر سے بات شروع کر دی جیسے گفتگو کے خاتمے سے مطمئن نہ ہوں۔ اعجاز صبر سے دیکھتا رہا۔ آخر جہانگیر نے تین آدمیوں سے ہاتھ ملا کر اور چوتھے سے بغلگیر ہو کر انہیں رُخصت کیا۔

"آؤ جی، ملک صاحب! کیا حال چال ہیں۔" جہانگیر نے اعجاز سے مصافحہ کیا اور اس کے ساتھ والی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اعجاز سے عُمر میں کئی سال بڑا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں اعجاز کو کبھی ملک صاحب، کبھی بھائی اعجاز، کبھی صِرف اعجاز اور کبھی آپ، تُم اور تو

کر کے مخاطب کرتا تھا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بولا۔ "میں تو ان لوگوں کے بوٹ
چکاتے چکاتے تنگ آگیا ہوں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں کس کتے کام میں پڑ گیا
ہوں۔ آپ سنائیں کیا حال چال ہیں۔"

"اللہ کا کرم ہے، بھائی جہانگیر!" اعجاز نے جواب دیا۔

"آؤ جی! اُدھر آکر بیٹھو۔ یہاں دروازے کے پاس تو ہر آنے جانے والا دیکھتا رہتا
جاتا ہے۔"

جہانگیر اُٹھ کر میز کے پیچھے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اعجاز میز کی داہنی طرف کرسی پر
بیٹھ چکا تو اسے خیال آیا کہ یہ جگہ دروازے کے بالکل ہی سامنے تھی جہاں سے چارپائی پر
بیٹھے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے۔

"اللہ کا کرم تو ہر حال میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔" جہانگیر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ گزر
گزران کیسے ہو رہی ہے۔" پھر وہ جواب سنے بغیر آگے چل پڑا۔ "تمہارے ٹھیکے والوں
سے مَیں نے بات کرلی ہے۔"

اعجاز اس کی جواب نہ سننے کی عادت سے واقف تھا، جلدی سے بولا۔ "آپ سے
کس نے کہا تھا؟"

"ہمیں آم کھانے سے غرض ہے یا درخت گننے سے؟ بھئی مجھ سے کس نے کہا
ہے، کس نے نہیں کہا، اِس بات کو چھوڑو۔ بندے اچھے ہیں، بات مان گئے ہیں۔ جیسے
جیسے کھیت خالی ہوتے جائیں گے تمہارے حوالے کرتے جائیں گے ٹھیکے کا وقت پورا
ہونے کی تکرار نہیں کریں گے۔۔۔۔ اور تمہیں کیا چاہئے۔ تم اپنی مرضی سے زمین تیار
کرو، جو دل چاہے بیجو۔"

"چاچے احمد نے کہا تھا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"پھر وہی بات، دیکھ اعجاز! تیری ایک عادت خراب ہے جس کی وجہ سے تو مار کھاتا
ہے اور وہ ضد کی عادت ہے۔ پہلے اسی کی خاطر تُو نے ایک عزت دار نوکری گنوائی ہے۔"

"اس میں ضد کا کیا سوال تھا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"بھائی اعجاز، مجھے سارے معاملے کا علم ہے۔ تمہارے کہے بغیر مَیں نے پوری
کوشش کر کے دیکھ لی کہ نوکری رہ جائے مگر وقت خراب آیا ہے۔ ہم ڈسمنٹ ہوئے

بیٹھے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر تمھیں وارننگ بھی دے چکا تھا۔ تم پھر بھی اپنی دوستیاں نبھاتے رہے۔ تو بچے کسی نہ کسی طرف سے تو مار کھانی ہی پڑتی ہے۔ اب تم پھر وہی کام کر رہے ہو۔"

"میں ضد نہیں کر رہا، بس پُوچھ رہا ہوں،" چاچے احمد نے۔۔۔"

"میں پُوچھنے وچھنے کی بات نہیں کر رہا۔" جہانگیر نے کہا۔ "دُوسری بات کر رہا ہُوں۔"

"دُوسری بات؟"

"ملک حمید کے بھٹے والی بات۔"

اعجاز چونک کر اس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ اِس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ جہانگیر اِس بات کا ذکر کرے گا۔

"میرا اِس قصے سے کوئی واسطہ نہیں۔" آخر اعجاز نے کہا۔

"اگر ہم نے پہلے تم سے بات نہیں کی تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے میرے بھائی کہ ہمیں اِس قصے کا علم نہیں۔ یہ میری جاب ہے کہ علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے اِس کی خبر رکھوں۔ مغلپورے کا بشیر ارائیں ملک حمید کی مصلّن کو نکال کر لے گیا ہے کہ نہیں؟"

"اس میں میرا کیا دخل ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"تم میرے مُنہ سے ہی کہلوانا چاہتے ہو؟"

"مجھے تو آپ کی بات کی سمجھ نہیں آ رہی بھائی جہانگیر!" اعجاز کمزور سی آواز سے بولا۔

"تم روزانہ اِس مصلن سے ملنے جاتے ہو کہ نہیں؟" جہانگیر نے مضبوط آواز میں پُوچھا۔

ایک لحظے کو اعجاز کے دِل میں آئی کہ انکار کر دے۔ مگر جہانگیر کے پُراعتماد چہرے کے مقابل اِس کا ارادہ ڈھے گیا۔ وہ خاموش بیٹھا سَر موڑ کر زمین پہ دیکھتا رہا۔

"اس کی کی بات نہیں بھائی اعجاز! آخر کو ہم سب مرد ہیں، اپنے وقت میں سب نے اپنے اپنے کسب کئے ہیں۔ خرابی بس ایک بات کی ہے۔"

اعجاز نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو جہانگیر نے بات جاری رکھی۔ "ہمیں خبر نہیں پہنچ رہی تھی کہ ارائیں نے اِس کو رکھا کہاں پر ہوا ہے۔ آخر تم ہی ہماری مدد کو

آئے۔"

"میں؟" اعجاز نے حیرت سے پُوچھا۔

"تمہارا کُھرا پکڑا گیا۔" جہانگیر عیاری سے مسکرا کر بولا۔ "ایک آدمی تمہارے پیچھے لگا تو تُم بے خبری میں اُسے سیدھا علی احمد شیخ کے گھر لے گئے۔"

"تم نے میرے پیچھے جاسوس چھوڑے ہیں؟" اعجاز نے غصّے سے کہا۔

جہانگیر نے اپنا سَر نفی میں اور ساتھ ہی سیدھے ہاتھ کی اُنگلی دائیں اور بائیں ہلائی اَور لمبا سا "اونہوں" کیا۔ پھر وہ اُنگلی سینے پہ رکھ کر بولا۔ "مَیں نے نہیں، ملک حمید نے۔ میرا اِس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ وہ تو میرے پاس تیری شکایت لے کر آیا تھا۔ مَیں نے اِس سے کہا دیکھو بھائی حمید! تو بھی بھائی برادری، اعجاز بھی بھائی برادری، جھگڑا نہیں ہونا چاہئے، بس اِس بات کا خیال کرنا، باقی جو تمہاری مرضی ہو کرو۔ اِس کا کہنا ہے کہ مصلی نے عورت اَور بچّے کے نام پر پیشگی لے رکھی ہے۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔" اعجاز اسی تیزی سے بولا۔

"ملک رجب علی! خُدا جنت نصیب کرے، شرم لحاظ والا آدمی تھا۔ لڑکے ذرا منہ زور ہیں۔ بھٹہ شرُوع سے رجب علی کے لڑکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اصل میں ملک حمید نے اسے اپنی عزت کا سوال بنا لیا ہے۔ کہتا ہے یہ ایک غلط مثال ہے، اگر اسی طرح اِس کے چُوہڑے مصلی بھاگتے رہے تو بھٹے کا اللہ ہی حافظ ہے۔ سچ پُوچھو تو اِس کی بات میری بھی سمجھ میں آتی ہے۔ تُم بتاؤ، اگر تمہارے والے مزارعے کھڑی فصل بیچ کر رقم جیب میں ڈالیں اَور رفو چکر ہو جائیں تو تمہیں کیسا لگے گا؟ مگر مَیں نے کہا نا کہ میرا اِس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں، بھٹے والے جانیں یا مصلی جانیں۔ میں تو تُم سے دُوسری بات کرنا چاہتا ہُوں۔" اعجاز خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

"یہ بشیر ارائیں کا یار احمد علی شیخ!" جہانگیر نے کہا۔ "اس کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟"

اب یہ طے ہو چکا تھا کہ اعجاز کنیز کو ملنے وہاں جاتا ہے، اُس کے انکار، احتجاج یا غصّے کی کوئی بنیاد نہ رہی تھی۔ اعجاز کو محسُوس ہوا جیسے ایک بوجھ اُس کے دِل سے اُتر گیا ہو۔

"میری اُس سے معمولی واقفیت ہے۔" اُس نے کہا۔

"میں تمھیں بتاتا ہوں۔ یہ جو شیخ بنا ہُوا ہے' یہ سب میراثی اور جولاہے ہیں۔ کوئی شیخ بن گیا ہے، کوئی انصاری۔ ارائیوں کو بھی اب جا کر عزت نصیب ہوئی ہے' یہ سبزیاں بیچنے والے ہمارے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے۔ خیر' یہ دُوسری بات ہے۔ یہ احمد علی کسان کمیٹی کا سرگرم کارکن ہے۔ یہ کہتے ہیں ہم کسانوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ میراثی اور جولاہے کسانوں کے حقوق کو کیا جانیں؟ کسان صرف جاٹ کی ذات ہوتی ہے۔ خیر' یہ دُوسری بات ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ یہ احمد علی نام نہاد کسان کمیٹی کا ورکر ہے؟"

"کبھی اس سے بات نہیں ہوئی، مگر مَیں نے سُنا ہُوا ہے۔"

"یہ ٹربل میکر ہیں۔ سب ارائیں میراثی تمھارے دوست ٹربل میکر ہیں مگر اب میں تمھیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ غور سے سنو، میں چاہتا ہوں کہ تُم ان لوگوں کے ساتھ اپنا رابطہ قائم رکھو۔"

اعجاز متجسس نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"ٹربل میکرز کی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ زیادہ گھی شکر ہونے کی ضرورت نہیں، مگر اپنا رسُوخ رکھو۔ کانسٹی ٹیوشن کی کوئی نئی شکل جلد یا بدیر آئے گی۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ سہولتیں مِل جائیں۔"

"اگر یہ ٹربل میکر ہیں تو آپ کو ان سے کیا فائدہ ہو گا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"بھولے بادشاہ!" جہانگیر کہنیاں میز پر رکھ کر آگے جھکا اور اعجاز کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ "آج میں تجھے سیاست کے ایک دو سبق دیتا ہوں۔ سن، آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے دوڑنے، جلسے جلوس کرنے، اشتہار بانٹنے اور نعرے لگانے سے زندگی کا کھیل بدل جاتا ہے۔ اسی بھولپن میں آپ مارے جاتے ہیں' دُنیا کسی دُوسری طرف نکل جاتی ہے۔ سیاست کے دو سبق ذہن نشین کرو۔ پہلا سبق مشہور کہاوت کے مطابق یہ کہ اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں مت ڈالو۔ مطلب یہ کہ کچھ بھائی برادری سرکار کے ساتھ رکھو، کچھ اپوزیشن کے ساتھ، تاکہ جس کسی کا راج ہو، حکومت اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ دُوسری بات۔" جہانگیر ہاتھ پھیلا کر انگوٹھا پہلی دو انگلیوں پر ملنے لگا۔ "یہ ہے؟" وہ بولا' پھر ہاتھ پہلو پہ لے جا کر کرُتے کی جیب کو تھپتھپایا۔ "اور یہ۔"

"یعنی؟" اعجاز نے پوچھا۔

"پیسہ، جناب! پیسہ --- وہ وقت گیا جب ہائی خیالات کا دور دورہ تھا۔ بارہ سال بعد زمانہ پلٹا کھاتا ہے نا؟ --- ملک کو بنے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں؟"

"بارہ۔"

"تو زمانہ پلٹ گیا آ آ --" وہ ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بولا جیسے کہہ رہا ہو، چڑیاں پھُرر رر سے اُڑ گئیں --- "اب جس کی جیب میں پیسہ، اِس کے ہاتھ میں باگ جیسے جیسے وقت گزرے گا" سیاست ان کے ہاتھ میں آئے گی جن کی جیب مضبوط ہو گی۔ پھر یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ پیسے سے پیسہ بنتا ہے۔ غریب لوگ ملک کی دولت میں اضافہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے جسے دولت کمانے کا گُر آتا ہے۔ وہ ملک کو دولت مند بنائے گا تو غریبوں کی زندگی بھی آسان ہو گی۔ تُم تو پڑھے لکھے انسان ہو بھائی جان! ہماری برادری میں تعلیم کی ازحد کمی ہے، اسی لِئے میرے دِل میں تُمہارا درجہ اُونچا ہے۔ ذرا دُنیا پر نظر دوڑاؤ، جتنے بھی امیر ملک ہیں کیا وہ جلسے جلوسوں سے بنے ہیں؟ جی نہیں، وہ اِن لوگوں سے بنے ہیں جنھوں نے پیسہ لگا کر کاریں اور ریل کے انجن اور ہوائی جہاز مینوفیکچر کیے ہیں۔ ہر ایک کی اپنے اپنے وقت پر ضرورت ہوتی ہے۔ ایک زمانہ گیا دُوسرا آگیا۔ کیا خیال ہے؟"

"ان لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے سے آپ کا پیسہ کیسے بنے گا؟"

"ہاں! اب آئے نا نکتے کی بات پر، یہاں پتہ چلتا ہے کہ پڑھائی لکھائی کی سوجھ بوجھ ایک بات ہے اور سیاست کی جان پہچان دُوسری بات ہے۔ اب ذرا کان لگا کر سنو کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایوب خان بارڈر پر سکھوں کی زمینیں سابقہ فوجیوں کو الاٹ کر رہا ہے۔ کسان کمیٹی اور کسان تنظیم نے اس کے خلاف تحریک چلائی ہے (جو واہوے، اوہو کھاوے) یہ نعرہ آپ نے بھی سُنا ہو گا۔"

"سُنا ہے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"اب دُوسری بات یہ ہے کہ ضروری نہیں ان لوگوں کو کامیابی ہو۔ فوجی حکومت کے مقابلے میں کامیابی کی امید رکھنا بیکار ہے مگر کم از کم پریشر تو رہے گا اور اگر کسی وقت میں جا کر ان زمینداروں کا کوئی نتیجہ نکلا تو فائدہ کس کو پہنچے گا؟ بتاؤ؟"

"کسانوں کو۔"

"واہ بھولے بادشاہ! بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں کو زمین دے کر حکومت نے اراضی خراب کرنی ہے؟ پھر ایوب خان ملک میں انڈسٹری لگانا چاہتا ہے' وہ کون لگائے گا؟ اس بات کو سمجھو اعجاز! اس ساری کارروائی کا فائدہ ہمیں اور تمہیں ہوگا' ہمیں اور تمہیں۔ نہ تو سابقہ فوجی نہ میں نہ تیرا چاچا احمد جس بچارے کی زمین بارانی ہو گئی ہے۔ ہم بارڈر سے چند میل کے فاصلے پر ضرور ہیں مگر مقامی زمیندار ہیں۔ بتا کہ ان زمینوں پر حق ہمارا تمہارا ہے یا کہ کیمبل پور کے کسی حوالدار کا؟ فرض کرو کہ بے زمینوں کو زمین مل بھی گئی تو ان کے پاس کاشت کے لئے پیسے کدھر سے آئیں گے؟ ان کو پھر ہمارے تمہارے پاس ہی آنا پڑے گا۔ اب مطلب کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنا کام کرنے دو' پھل آگیا تو ہم کھائیں گے' نہ آیا تو ہمارا کیا جاتا ہے؟ سمجھ آگئی؟ یہ ہے نکتے کی بات! یہ سیاست کا دل ہے' دل۔ لوگوں سے وہ کام لو جس کام کے وہ اہل ہیں۔ ان کو لیڈ کرو۔ تیری طرف سے ہمیشہ مجھے تعاون حاصل ہوا ہے۔ اسی لئے میرے دل میں تیری قدر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نوکری تو تو گنوا ہی بیٹھا ہے' اب اپنی تعلیم تو نہ گنوا۔ احتیاط سے قدم اٹھا اور ان لوگوں سے اپنا رسوخ بنا۔ ملک کی حالت غیر یقینی ہے۔ کسی کو پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ پاور جس طرف سے بھی ملے حاصل کرنی چاہئے۔ اوئے بشے۔۔۔" جہانگیر نے نوکر کو آواز دی۔ "جا اندر سے ملک اعجاز کے واسطے کھانا لگوا کے لا۔"

اعجاز جلدی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "میں روٹی کھا کر آیا ہوں' اب چلتا ہوں۔"

"میری باتوں پر غور کرنا۔" دروازے پر رُخصت کرتے وقت جہانگیر نے اعجاز سے کہا۔ "اپنا خاص آدمی سمجھ کر مَیں نے تجھے یہ باتیں بتائی ہیں۔ اور آتے جاتے رہا کرو۔ اور ہاں' ایک دُوسری بات یاد آگئی ہے' آپس کی بات ہے' طریقے طریقے سے بشیرے ارائیں اور احمد علی کو وارن کر دینا کہ بھٹے والوں سے محتاط رہیں' لڑکے مُنہ زور ہیں۔ سمجھ گئے نا؟"

اعجاز اس سے مصافحہ کر کے رُخصت ہُوا۔

اعجاز نے اگرچہ صرف ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر حالات سے دلچسپی

اور ایک باخبر مزاج رکھنے کے باعث وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ہوشیار آدمی تصور کرتا
تھا۔ آج جہانگیر سے مل کر اس کے اعتماد کو ایک دھچکا لگا تھا۔ اس کو پہلی بار علم ہوا تھا کہ
دُنیا کے بیشتر کاروبار کس اصلیت کے تحت چلتے ہیں اور کون سی ایسی قوتیں ہیں جو زندگی
پر قدرت حاصل کر کے ان کی سمت متعین کرتی ہیں۔ یہ انسانی ذہانت کا ایک نیا رخ تھا جس
سے وہ اب تک نابلد رہا تھا۔ اب اس کے اندر دو مختلف طاقتیں برسرپیکار تھیں، ایک بشیر
کی جذباتی ذہانت جس کا منبع اس کا ماحول تھا۔ دُوسری جہانگیر کی چالاک ذہانت جو انسانی
جبلت سے پھوٹتی تھی۔ اعجاز کو احساس تھا کہ یہ دونوں کبھی ایک دُوسری کو کاٹتی ہوئی
گزرتی تھیں اور کبھی الگ ہو کر متوازی چلنا شروع کر دیتی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس
کے اندر ایک نئی آنکھ وا ہو گئی ہو جس نے اس کی بینائی میں مزید ایک تہہ کا اضافہ کر دیا
ہو۔ ساتھ ہی اسے اس بات کا علم بھی ہوا کہ نظر کی اس وسعت سے ذہن صاف ہونے کی
بجائے زیادہ گندلا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے، اس نے سوچا، لوگ کسی آسان گُر کی تلاش
میں رہتے ہیں جس پہ کاوش خرچ نہ ہو۔ ان باتوں کے علاوہ اور ان سے کہیں زور آور، دو
واقعے ایسے تھے جنہوں نے اس کے دل میں کھُدبُد لگا رکھی تھی۔ ایک کنیز کا قصہ تھا جو
اب راز نہ رہا تھا اور کئی لوگوں کے علم میں آ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لگتا ہوا سکینہ کا وہ
طعنہ تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ تیز ہوتا ہوا اس کے سینے میں اُترتا جا رہا تھا۔ سیدھا گھر
واپس آنے کی بجائے وہ بائیسکل پر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔

سکینہ اور بچے گھر پہ موجود نہ تھے۔ سرفراز اکیلا چارپائی پہ لیٹا لالٹین کی روشنی میں
اپنی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اعجاز کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔

"لالہ، بی بی بیاسی گئی ہے۔"

"کیوں؟ کس کے ساتھ گئی ہے؟"

"چاچے کو گولی لگ گئی ہے۔" سرفراز ہڑبڑا کر بولا۔

"گولی لگ گئی ہے؟ کیسے؟"

"پتا نہیں، سائیں جلا آیا تھا۔ بی بی اُس کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"سائیں اور کیا کہتا تھا؟"

"کچھ نہیں، کہتا تھا چاچا گولی سے زخمی ہو گیا ہے۔ بی بی اُس کے ساتھ چلی گئی

ہے۔"

"ہاں ہاں، چلی گئی ہے، مگر کیا کہ کر گئی ہے؟"

"کہتی تھی روٹی پکی ہوئی ہے۔"

"روٹی کو چھوڑ یار،" اعجاز کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ "بی بی چلی گئی ہے، روٹی پکی ہوئی ہے، ایک ہی رٹ لگارکھی ہے۔ کوئی کام کی بات بھی بتا۔"

"مجھے کہ کر گئی ہے لالے کے ساتھ آجانا۔"

"تُو روٹی کھاچکا ہے؟"

"نہیں۔"

"چلو آؤ۔"

دونوں جلد جلد کھانا کھا رہے تھے کہ پڑوس سے رحمت چوہان آگیا۔ "دائی اِدھر ہی بیٹھی تھی جب چک بیاسی سے بندہ آیا۔" اُس نے بتایا۔ "دائی سے اِتنا ہی پتا چلا کہ چوہدری احمد کو زخم آگیا ہے۔ کوئی اور خبر پہنچی؟"

اعجاز کے مُنہ میں نوالا بھرا تھا۔ "اونہوں" اُس نے نفی میں سَر ہلایا۔

"میری مریم نے کہا کہ ساتھ چلی جاتی ہے۔ مگر سکینہ نے منع کر دیا، کہنے لگی کوئی ضرورت نہیں۔ سائیں ٹانگہ کروا کے لایا تھا۔ اُسی پر ہم نے سوار کروا کے بھیج دیا۔ فِکر والی بات ہے۔ اجاز، کوئی دُشمنی وُشمنی تو نہیں تھی؟"

"نہیں، چاچا اُپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ ہمیں کسی بات کی خبر نہیں۔ مَیں ابھی باہر سے آیا ہُوں۔ بس یہ دو ٹکڑے کھا کے جارہے ہیں۔"

اعجاز نے گھر کے تالے کی چابی رحمت کے حوالے کی، سرفراز کو بائیسکل کے پیچھے بٹھایا اور دونوں بھائی گھر سے روانہ ہُوئے۔ چاند اُپنی پُوری گولائی کو پہنچنے کے بعد اب ہلکا ہونا شروع ہو چکا تھا اور اُس کی روشنی میں گلگھن کی تہہ شامل ہو گئی تھی۔ سڑک پر گڑھوں سے بچتا بچاتا ہُوا اعجاز تیز تیز سائیکل چلا رہا تھا۔

"لالہ! مَیں نے کل کا کام ختم نہیں کیا۔" سرفراز نے کہا۔

"کیوں؟"

"ابھی شروع بھی نہیں کیا تھا کہ سائیں چلا آگیا۔"

"بعد میں کیوں نہیں کیا؟"

"میرا دِل نہیں کیا" سرفراز نے جواب دیا۔

"چلو" کچھ دیر کے بعد اعجاز نے کہا، "کل کی چھٹی کر لینا۔" اُس کی سانس پھول گئی تھی۔

"لالہ ۔۔؟"

"ہاں۔"

"بی بی رو رہی تھی۔"

"تو کیا وہ خبر سُن کر ہنسنے لگتی؟"

سرفراز پھر سارا رستہ چُپ رہا۔

جب وہ گھر پہنچے تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھٹکھٹانے پر سائیں جلّے نے کھولا۔

اندر اعجاز کی توقع کے خلاف صِرف گھر کے افراد بیٹھے تھے، نہ پاس پڑوس کا نہ کوئی گاؤں کا دُوسرا آدمی دِکھائی دیا۔ ایک چارپائی پر سکینہ اور اُس کی ماں بیٹھے تھے۔ ایک بچہ سکینہ کی چھاتی سے لگا تھا، دُوسرا ماسی کی گود میں تھا۔ عباس اور جمیلہ دُوسری چارپائی پر بیٹھے تھے۔ سرفراز جا کر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نواڑ کے پلنگ پر چاچا احمد ٹیک لگائے بیٹھا باتیں کر رہا تھا، جیسے بھلا چنگا ہو۔ صِرف اِس کی داہنی ٹانگ ننگی تھی جس کی پنڈلی کے گرد چادر سے پھاڑی ہُوئی پٹیاں بندھی تھیں۔ پٹیوں پر ایک جگہ خُون کا بڑا سا دھبہ تھا۔ اعجاز نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ اُس نے صِرف سائیں جلّا دیکھا تھا جو باہر چارپائی پہ لیٹا حُقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ سائیں جلّے کی زندگی کے بارے میں کسی کو زیادہ عِلم نہ تھا۔ وہ بچپن میں چاچے احمد کے باپ کے گھر کہیں سے آگیا تھا اور وہیں رہنے لگا تھا۔ سال کا زیادہ عرصہ وہ مختلف مزاروں پر چکّر لگاتا رہتا تھا۔ جب اُکتا جاتا تو کچھ دیر کے لئے چاچے کے پاس واپس آجاتا تھا۔ کبھی اِس کا جی چاہے تو کوئی کام کر دیتا تھا، ورنہ کھاتا پیتا اور سوتا رہتا تھا۔ چاچے کے تینوں بچّے اُس نے ہاتھوں میں کِھلائے تھے۔

"حرام کے نوٹے کو کروڑ دفعہ سمجھایا کہ کسی کو خبر نہ ہونے دینا" چاچا احمد گرج کر بولا۔ "اِس مائیا پاغل نے مائیا دائی کے آگے سب کچھ بک دیا۔ اب بندے بندے کو خبر ہو گئی ہوگی۔ ہیں اعجاز؟"

"نہیں چاچا، صرف رحمت کو پتا چلا ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"وہ مائیا چھان تو ڈھنڈورا ہے۔ اُس کے کان میں کوئی بات پڑنی چاہئے، پھر جدھر تازہ دیکھتا ہے اُدھر خبر سُنانے بیٹھ جاتا ہے اور سارا تما کو پھونک کے اٹھتا ہے۔"

"چل کوئی بات نہیں" ماسی بولی، "کوئی بہانہ بنا دیں گے۔ اُس وقت کوئی اور بندہ تو نہیں تھا۔"

"مگر بات کیا ہے؟ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟" اعجاز نے پوچھا۔ "گولیاں کیسے چل گئیں؟"

"بات کوئی نہیں اعجاز" چاچے نے پنڈلی کے دونوں جانب اُنگلی سے اشارہ کیا، "اِدھر سے آئی، اُدھر سے نکل گئی۔ کچھ ماس اُدھڑ گیا ہے، بس۔ نقصان نہیں ہُوا۔"

"مگر کس نے چلائی گولی۔" اعجاز نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا۔ "کیوں چلائی؟"

پیشتر اس کے کہ چاچا جواب دیتا، سائیں جلا کمرے میں داخل ہُوا۔ "احمو، فقیر کی بات کو رو نہ کر، پٹی کروالے۔"

"ٹھہر جا فراڈیئے" چاچا چیخ کر بولا، "اِدھر آ تیری فقیری نکالوں۔"

سائیں نے اِس کی بات گویا سنی ہی نہیں۔ "برکتے!" وہ ماسی سے بولا۔ "ریشم کا ایک ٹکڑا لے کے آ ـــــ"

ماسی اُٹھ کر دُوسرے کمرے میں گئی اور ایک دو پھٹے ہُوئے کپڑے اُٹھا لائی۔ سائیں نے کپڑے ہاتھ میں لے کر دیکھے اور موڑ دیئے۔ "یہ نقلی کا کام ہے۔ پٹی کے لئے خاص ریشم چاہئے۔"

ماسی پلٹ کر اندر گئی اور اِس بار سات آٹھ گز لمبا، سُرخ ریشم کا تہہ کیا ہُوا کپڑا لے واپس آئی۔

"یہ میرے بیاہ کی پگڑی ہے" چاچا احمد چلایا، "خبردار جو اِسے ہاتھ لگایا۔"

ماسی چاچے کی طرف دیکھنے لگی تو سائیں بولا، "عقلمندے، دو گز پھاڑ کر میرے حوالے کر۔ کل رات کا پٹی لپیٹ کر لیٹا ہُوا ہے۔ زخم خراب ہو گیا تو لات چلی جائے گی، چلنے پھرنے سے بھی رہ جائے گا۔ تجھے لنگڑا خصم چاہئے؟ چل، جلدی کر۔"

چاچا احمد بھی دِل کے اندر راضی ہو چکا تھا، مگر دکھاوے کے لئے مزاحمت کر رہا

تھا۔ ماسی کو پگڑی پھاڑتے دیکھ کر بول،۔ "برکتے، اِسے باندھ کر میں تجھے بیاہنے گیا تھا، بے مُراد، تیری آنکھ میں پگ کی شرم بھی نہیں رہی؟"

"جان جارہی ہے تو پگ کی کیا قیمت ہے؟" ماسی نے کہا۔

"جان کا کیا ہے بے عقلیئے، آج گئی کل دُوسرا دِن۔ یہ پگ مَیں نے عباس کے واسطے رکھی ہُوئی تھی۔"

"عباس کے واسطے اللہ اَور دے دے گا۔"

"اور کدھر سے لائے گی؟ یہ ہندستان کا ریشم ہے۔ میں امبرسر سے کھُتّے کی دُکان سے خرید کر لایا تھا۔ برکتے تجھے یاد ہے پہلی رات کو مَیں نے پگ کھول کر تُمھارے۔۔۔"

"چل چل اب چُپ کر۔" ماسی تیزی سے اُس کی بات کاٹ کر بولی۔ جھینپ کے مارے اِس کا مُنہ سُرخ ہو گیا تھا۔ "آگے پیچھے کی باتیں کرنا جاتا ہے۔ تیری تو عقل ماری گئی ہے۔" اُس نے کپڑا سائیں کے حوالے کر دیا۔

"چاچا،" اعجاز تسلی دیتے ہُوئے بولا۔ "بات ٹھیک ہی ہے۔ خالی پٹی لپیٹنے سے تو زخم نہیں بھرتا۔ خُون بند کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی احتیاط لازمی ہے کہ ورم نہ پڑ جائے۔ پگ تو پھر بھی آجائے گی۔"

"تو بھی اِن کے ساتھ مِل گیا ہے اعجاز؟ جان آنی جانی ہوتی ہے پُترّ، ہائے، یہ پگ مَیں نے عباس کے لِئے سنبھالی ہُوئی تھی۔"

"چل چاچا، عباس ذرا چھوٹی پگ باندھ لے گا۔" اعجاز ہنس کر بولا۔

"نہ حکیم کو بلُانے دیتا ہے نہ نائی کو،" ماسی اعجاز سے مخاطب ہو کر بولی "بیٹھا بیٹھا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ ساری رات اَور سارا دِن آنکھوں میں گزُر گیا ہے۔ اب مَیں کیا کروں؟"

"چلو اب پٹی کر دیتے ہیں۔" اعجاز نے اُس سے کہا "اللہ مدد کرے گا۔"

سائیں نے چُولہے سے ایک جلتی ہُوئی لکڑی اُٹھائی اَور ریشم کے چیتھڑے کو آگ دِکھا دی۔ کپڑ دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مٹھی بھر راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ سائیں جلے نے آگے بڑھ کر پٹی کھولنی شروع کر دی۔ چاچے نے اُسے روکنے کی کوشش کی تو سائیں نے سختی سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پٹی اُتری تو گولی کے زخم کا سُوراخ صاف نظر

آرہا تھا۔ سکینہ کے منہ سے "ہائے" نکلا۔ ماسی نے ایک ہوکا بھرا۔ کالی پنڈلی میں کٹے پھٹے سُرخ گوشت پہ پٹھو جما ہُوا اور ہاتھ رستا ہُوا خُون ٹپک رہا تھا۔

"اِدھر آ" سائیں جلّے نے عباس کو پاس بلایا۔ پھر وہ جمیلہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"چل تُو پرے منہ کر کے لیٹ جا۔"

عباس آہستہ آہستہ چلتا ہُوا سائیں کے قریب پہنچا تو سائیں نے سامنے سے عباس کا تہمد اُٹھا دیا۔ "مُوت" سائیں نے حکم دیا۔

"عباس نے سر جُھکا لیا اور سائیں کے ہاتھ سے تہمد کا پلو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اِسے چھوڑ" سائیں نے تہمد مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ "اُس کو پکڑ، اُس کو، میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ پکڑ اُس کو، اُٹھا آگے سے، اَیشاباشے، اَیسے لے لے۔۔۔ اب دھار سیدھی موری پہ مار، زمین پر نہ گرے، چل۔"

عباس سر نیہوڑائے، اَپنے عضو کو پکڑے بے حرکت کھڑا رہا۔

"زور لگا" سائیں بولا۔

عباس میں پھر بھی کوئی حرکت پیدا نہ ہُوئی۔

"میری بات سنتا ہے کہ نہیں" سائیں نے اپنا ایک مرلے جتنا چوڑا ہاتھ اُٹھا کر پیچھے سے عباس کی گردن دبوچ لی۔ "کر۔ کر۔۔۔ زور لگا۔"

عباس کے چہرے سے کرب ٹپک رہا تھا۔ اِس کے منہ سے بھنچی ہُوئی آواز نکلی۔ "نہیں نکلتا۔"

جمیلہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی لیٹی کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ سرفراز بھی ہنسنے لگا۔

"نکلتا کیسے نہیں" سائیں گرجا، "تُو زور لگائے تو نکلے، چل زور لگا، ہمانے خور!"

ساتھ ہی سائیں نے عباس کی گردن پر اپنی گرفت کس دی۔ عباس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ اُسے کھانسی کا ایک غوطہ لگا تو پیشاب کی ایک مختصر سی دھار چاچے کی پنڈلی پر گولی کی موری سے ذرا ہٹ کر گری، جسے نیچے بہ جانے سے بچانے کے لیے سائیں نے چلو میں بھر کر سُوراخ کے اُوپر قطرہ قطرہ گرا دی۔ چاچے نے منہ سے "ہا" کی آواز پیدا کی اور

کلبلا کر پہلو بدلنے کی کوشش کی مگر ماسی اُس کی ران کو قابو میں کئے ہوئے تھی۔ سائیں نے اُس کا گھٹنہ کھینچ کر پلنگ سے لگا۔ دیا، جس سے پنڈلی کا دُوسری جانب کا سُوراخ عباس کے سامنے آگیا۔ "چل دھار مار،" سائیں نے عباس کی ہمت بڑھائی۔ "مار مار، موری پر، مار، موری پر۔"

سائیں کی گرفت نرم ہونے سے عباس کی سانس برابر ہو چلی تھی، مگر اُس کی کھانسی نہ رُکی تھی۔ کھانسی کے دَورے میں اُس کے پیشاب کی دُوسری دھار برآمد ہوئی جو پنڈلی کو صاف بچاتی ہُوئی بستر پر گری۔

"بیسہ بنی مان،" سائیں بولا۔ تیزی سے اُس نے عباس کا عضو اپنے ہاتھ میں لیا اور اِس کا رُخ سیدھا کر کے بقیہ دھار کو عین زخم پہ گرایا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ عباس کے جسم سے اُٹھالیے۔ "چل اب دفا ہو جا۔"

عباس نے جاتے جاتے جمیلہ کی کمر پہ ایک لات جمائی، سرفراز کے سَر پہ زوردار دھپ لگایا اور صحن میں نکل گیا۔

"اہا۔" جمیلہ لات کھا کر چیخی۔

چاچا احمد پیشاب کے تیزاب سے تڑپ کر ساکن ہو چکا تھا۔ سائیں نے ریشم کی راکھ مُٹھی میں بھری اور اُسے پہلے پنڈلی کی ایک جانب، پھر دُوسری جانب دونوں سُوراخوں پر مَل دیا۔ جب وہ اُنگلی کی مدد سے راکھ، پیشاب اور خُون کے لیپ کو زخم میں بھر رہا تھا تو چاچے کے مُنہ سے گالی نکلی اور وہ ذرا سا اُچھلا۔ مگر اب اُس کا دم ختم ہو چکا تھا۔ ماسی اور سائیں نے ایک تازہ چادر پھاڑ کر ٹانگ پہ کَس کر پٹی باندھ دی۔ چاچا "ہائے ظالمو" کہتا ہُوا مُنہ موڑ کر پہلو کے بل لیٹ گیا۔

"کچھ مُنہ سے بولو کہ یہ حادثہ کیسے ہُوا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

ماسی اور سکینہ ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو رہیں۔ سائیں جلا اب فارغ ہو کر صحن میں اپنی چارپائی پہ بیٹھا بجھتے ہُوئے حُقّے کو سلگانے کی خاطر اِس کی نَلی کو مُنہ میں لے کر لمبے لمبے سانس کھینچ رہا تھا اعجاز مایُوس ہو کر باہر سائیں کے پاس جا بیٹھا۔

"سائیں،" اعجاز نے کہا، "تُو ہی کچھ بتا؟"

"کیا بتاؤں؟"

"چاچے کو گولی کیسے لگی؟"

"پُلس نے ماری ہے۔"

"کیوں؟ کیا معاملہ ہُوا ہے؟"

"معاملہ کیا ہو گا۔ سامان اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا، پُلس سے ٹاکرا ہو گیا۔"

"کیسا سامان؟ کہاں جا رہا تھا؟"

"تجھے نہیں پتا؟"

اعجاز نے سَر ہلا کر لاعلمی ظاہر کی۔

"روز کی بات ہے، کوئی آج کی تو نہیں" سائیں بولا "پُلس کے ساتھ بھی معاملہ ٹھیک ہے، اپنا حصہ نکال لیتے ہیں، ساروں کا کام چلتا رہتا ہے۔ کل یہ کوئی نئے رنگروٹ تھے، گولی چلا دی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، احمدو چھُپ چھپا کر دوڑ آیا۔"

"زخم کو لے کر؟" اعجاز نے حیرت سے پُوچھا۔

"اَور کیا؟ بُڈھے میں ابھی بڑی جان ہے۔"

اعجاز خاموش بیٹھا سائیں جلّے کے حُقّے کی گُڑ گُڑ سنتا رہا۔ پھر بولا، "سائیں! چاچا سمگلروں کے ساتھ ملا ہُوا ہے؟"

"کوئی بھی نام دے لے بچّے، کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق تو پڑتا ہے سائیں،" اعجاز نے کہا۔

"کیوں، تیرا نے روٹی نہیں کھانی؟ باراں پچّوواں کِلّے برانی زمین سے کیا مِلتا ہے۔ نہر لگتی تھی تو روٹی چل جاتی تھی۔ پانی بند ہوا تو زمین پیٹ بھی نہیں بھرتی۔ یہ پلنگ دیکھا ہے جس پر احمدو پڑا ہے؟ پُورا ڈیڑھ سو روپیا لگا ہے اِس پر۔ یہ پیسہ کہاں سے آیا ہے؟ دو بھُونے جی ہیں۔ دو سال میں لڑکی بیاہنے والی ہو جائے گی۔ تُو اپنے گھر میں سُکھ سے بیٹھا ہے، بیٹھا رہ۔ دُوسروں کی جیسی گزرتی ہے یا وہ جانیں یا اُن کا خُدا جانے۔ توبہ کر توبہ۔"

اعجاز دل میں شرمندہ سا ہو کر چپ ہو رہا۔ سائیں نے حُقّے کی نلی اُس کی طرف بڑھا دی۔ اعجاز نے ایک کش کھینچا تو اُسے اچھو لگ گیا۔ "کڑوا تمبا کُو ہے۔" وہ کھانستے

ہوئے بولا۔ جب اُس کی سانس برابر ہوئی تو اس نے پُوچھا، "سائیں، کس قسم کا مال اِدھر سے اُدھر جاتا ہے؟"

"گڑ،" سائیں بولا۔

"گڑ؟"

"ہاں، اُدھر سے کھانڈ آتی ہے۔ ہندستان میں کارخانے ہیں۔"

"پھر گڑ کیوں اُدھر جاتا ہے؟"

"واہ باؤ اجاز، تُو ماسٹر کا ماسٹر ہی رہا۔ ہئی اُن کا کماد تو سیدھا کارخانوں میں چلا جاتا ہے، پیسے نقد جیب میں آجاتے ہیں۔ گڑ کون بناتا ہے مگر گڑ کے چاول اَور شکر کی چُوری کھانے والے اُدھر بیٹھے ہیں۔ اُن کے لیے گڑ اِدھر سے جاتا ہے۔"

"تیری بات تو ٹھیک ہے۔" اعجاز نے ہنس کر کہا۔ "اور کیا کچھ جاتا ہے؟"

"دانے۔"

"دانے؟"

"گندم ہئی گندم۔ اَور سونا۔"

"سونا؟"

"ہاں۔ عرب سے حاجی سونا لے کر نہیں آتے؟ ہندستان میں بڑا مول ملتا ہے۔"

"اُدھر سے کیا آتا ہے؟"

"لاچی۔ گرم مسالہ۔ کھانڈ۔ لٹھا۔"

سائیں نے حُقّے کی نلی دوبارہ اعجاز کی طرف بڑھائی تو اُس نے موڑ دی۔ اعجاز نے کبھی کبھار سگریٹ پینے شروع کر رکھے تھے۔ اُس نے جیب سے ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔ سائیں جلا لالچی نگاہوں سے سگریٹ کو دیکھتا رہا، پھر بولا، "اِس کا تما کُو کڑوا ہے؟"

"پی کر دیکھ لو،" اعجاز نے جلتا ہوا سگریٹ سائیں کو دیا۔ سائیں نے مٹھی کے ایک سرے میں سگریٹ دبایا اَور دُوسری جانب سے لمبا سانس کھینچا، جیسے حُقّہ پی رہا ہو۔ دو کش لے کر اُس نے سگریٹ واپس کر دیا۔ "مزا نہیں آیا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

سائیں نے فیصلہ کن انداز میں سَر کو نفی میں ہلایا۔ "جب تک آواز نہ نکلے، مزا کیا آئے؟" وہ حُقّے کی نلی کو مٹھی میں دبوچ کر بولا۔

اعجاز نے اپنی عمر حُقّے کے آس پاس گزاری تھی، مگر اس بات کا فہم اُسے پہلی بار ہوا کہ سنسان راتوں میں کتّوں کے بھونکنے اور مُرغی کی آواز کی مانند حُقّے کی گڑگڑ میں بھی قدرتی آوازوں کا سا طمانیت کا احساس تھا۔ سائیں جلّے نے سینے کے زور سے کش پہ کش لگا کر حُقّہ چالو کیا تھا۔

"سائیں،" اعجاز نے پوچھا۔ "سامان کس ذریعے سے اِدھر اُدھر آتا جاتا ہے؟"

سائیں جلّے نے ایسے اعجاز کو دیکھا جیسے اُس کی کم علمی پر حیرت زدہ ہو۔

"ڈنگروں پر،" پھر اس نے مختصراً کہا۔

"بلدوں پر؟"

سائیں جلّے نے دوبارہ حیرت سے اُسے دیکھا، پھر حُقّے کا ایک لمبا کش لیا، گویا اعجاز کی خامیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر رہا ہو۔ "زمین دار ہو کر تجھے بلدوں کا علم نہیں؟" وہ بولا۔ "بلد کی گردن اور ٹانگوں میں زور ہوتا ہے، کمر کمزور ہوتی ہے۔ بوجھ کو کھینچ لیتا ہے، اُٹھا نہیں سکتا۔ بلد جاتے ہیں کبھی کبھی۔"

"کیا لے کر؟"

"سُوت، ہندستان میں لٹھے کے کارخانے ہیں۔"

"اور گندم؟"

"اونٹوں پر۔ گڑ شکر گھوڑوں پر۔ سونا کبھی سُوت میں کبھی گڑ میں، جہاں جگہ ملی چھپا دیا۔"

"بندے بھی ساتھ جاتے ہیں؟"

سائیں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ڈنگروں کو ہانک دیتے ہیں۔ اُدھر سے وہ پکڑ لیتے ہیں۔"

"پھر ڈنگر کہاں جاتے ہیں؟"

"اُدھر سے مال لاد کر اِدھر کو ہانک دیتے ہیں۔"

"حساب کون رکھتا ہے؟"

"کیسا حساب؟"

"ناپ تول کا، قیمت کا،" اعجاز نے کہا۔

"ایک ایک پیسے کا حساب ہوتا ہے۔ پیسے دینے دلانے ہوں تو پھر بندے آتے ہیں۔ لاہور سے کاریں آجاتی ہیں، اُدھر امبرسر سے آتی ہیں۔ لین دین پر کبھی جھگڑا نہیں ہُوا، یہ شریفوں کا کاروبار ہے۔ کل رات کو تو قسمت خراب تھی۔ جو لاہور سے کاروں پر آئے نئے اَور اوچھے لوگ تھے۔ پیسے ہاتھ میں آئے تو ناچنے اَور ٹھٹھا کرنے لگے۔ اُدھر پُلس والے بھی رنگروٹ تھے۔ ایک بار للکارا اَور گولی چلا دی۔ کل اُدھر سے بندے آرہے ہیں، مٹھائی لے کر، دیکھنا کیسے شریف لوگ ہیں۔"

"یہاں آرہے ہیں؟" اعجاز نے چوکنا ہو کر پُوچھا۔

"اُدھر کھیت میں ملاقات رکھی ہے۔"

کیا کرنے آرہے ہیں؟"

"اُن کو پچھلے پیسے پہنچ گئے ہیں، خُوشی کرنے آرہے ہیں، یہ رواج ہے۔"

"چاچا تو زخمی ہے،" اعجاز نے کہا، "کیسے جائے گا؟"

"مرتا مرتا بھی جائے گا۔ دیکھ لینا۔ یہ عزت بزتی کا سوال ہے۔ تُو بھی چلا چلنا۔"

اعجاز کچھ دیر تک خاموش بیٹھا سائیں کی پیشکش پر غور کرتا رہا۔ سائیں کے طَور سے لگ رہا تھا کہ اعجاز کے بچگانہ سوالوں سے اُکتا چکا ہے۔

"سائیں،" پھر اعجاز نے پُوچھا، "کبھی تُو بھی اُدھر گیا ہے؟"

یہ سُن کر سائیں جلّے کی دِلچسپی لَوٹ آئی۔ "جاتا رہتا ہُوں۔"

"مال وغیرہ کے سلسلے میں؟"

"اونہوں، اکیلا جی ہُوں، کیا ضرورت ہے کہ اِس کاروبار میں پڑوں۔ مزاروں پر جاتا ہُوں۔ فیروزپور میں میرے خاص مُرشد ہیں۔"

"تجھے کبھی پولیس نے نہیں روکا؟"

"پہلے پہلے پکڑتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے سات دِن تک بند رکھا۔ سوال جواب کرتے رہے۔ کہتے تھے مَیں جسوس ہُوں۔"

"پھر کیا ہُوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ مَیں نے کہا بھائی میں تو پھیرے کا فقیر ہُوں۔ جدھر پھیرے کا حکم آگیا اُدھر نکل پڑا۔ کہتے ہو تو اِدھر ہی بیٹھ جاتا ہُوں۔ ایک وقت کی روٹی دیتے رہو، باقی

اللہ اللہ خیر سلا۔ اندر اندر سے انھوں نے فیروزپور میں میرے مُرشدوں سے پتا کیا، پھر کہنے لگے جا چلا جا۔ اب مَیں اَیلی اَیلی کرتا ہُوا جاتا ہوں۔ مُجھے سب جانتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی رنگروٹ افسر آتا ہے تو پکڑ کر بٹھا لیتا ہے۔ پھر دُوسرے گواہی دیتے ہیں تو چھوڑ دیتا ہے۔"

"سائیں،" اعجاز نے پُوچھا۔ "اگر وہ تُجھے نہ چھوڑتے تو تُو اُدھر ہی رہ جاتا؟"

"ناں جی ناں، سارے سِکھ تھے نامراد، تماکُو کو حرام جانتے تھے۔ روٹی کھا کھا کر میرا ہاضمہ خراب ہو گیا تھا۔ جان آدھی رہ گئی تھی۔ حُقّے سے میری روٹی نیچے اُترتی ہے۔"

جاڑے عروج پر تھے۔ صحن میں دِن کے وقت تین چارپائیاں پڑی رہتی تھیں جن پر گھر کے لوگ اَور آنے جانے والے دِن بھر بیٹھے سردیوں کی دُھوپ کا مزا لیتے تھے۔ گیہوں، چنے اَور دُوسری دالوں کی فصلیں بوئی جا چکی تھیں۔ مرد بیٹھے حُقّہ پیتے اَور عورتیں ہانڈی کے لِئے سبزیاں کاٹتی رہتی تھیں۔ سائیں جلّے کے قیام کے دَوران ایک فالتو چارپائی اندر سے نِکل آتی تھی جِس پہ اُس کی گدڑی کا قبضہ رہتا تھا۔ یہ چارپائی دِن رات صحن میں بچھی رہتی تھی، باقی کی رات کے وقت دیواروں کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی جاتی تھیں اور بارش کی آمد متوقع ہو تو اُٹھا کر صحن والے کچے کمرے میں رکھ دی جاتی تھیں۔ سائیں کے پاس کمبل لپیٹے بیٹھے بیٹھے اعجاز کو بھیگتی ہُوئی سرد رات میں تھکاوٹ محسُوس ہونے لگی۔ مگر اُس کا جی گھر کے اندر جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ وہ اُٹھا اَور ایک دُوسری چارپائی پر کمبل آدھا نیچے اَور آدھا اُوپر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند اُس کے سَر کو چڑھنے لگی۔ سونے سے پہلے، نیند کی حد پر اُس کے سامنے دو منظر نمودار ہُوئے۔ ایک کنیز کی صُورت تھی، دُوسرا جہانگیر کا چہرہ تھا، جو کہہ رہا تھا، "اِس زمین پہ ہمارا حق ہے ہے نہ کہ کیمبل پُور کے کِسی حوالدار کا۔ تُمھارے چاچے کی زمین بارانی ہو گئی ہے۔۔۔" رات کے کِسی وقت اُسے محسُوس ہُوا کہ کوئی اُس کے سَر تلے تکیہ رکھ رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں نہ کھولیں اَور نہ چہرہ دیکھا، مگر ہاتھوں کے لمس سے اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ سکینہ تھی۔ پھر سکینہ نے اُس کے جسم کو بھاری لحاف سے ڈھانپ دیا۔ وہ سردی سے سکڑا پڑا تھا۔ لحاف کے نیچے اُس کے بدن کو بے پناہ آرام محسُوس ہُوا۔

اعجاز دِن چڑھے تک سویا رہا، حتیٰ کہ دُھوپ آدھے صحن میں پھیل گئی۔ دِن بھر

وہ چاچے احمد کو رات کی مہم پہ جانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر سائیں جلے کے بقول چاچا ضِد کا پکا نکلا۔

"ٹانگ جائے تو جائے، بات نہ جائے، اعجاز۔ یہ کام قول پر چلتا ہے۔ ساری پگ کی بات ہے۔"

"پگ پگ کرتے رہتے ہو چاچا۔ تُمہارا خُون پہلے ہی نِکل گیا ہے۔ اب جان بھی دو گے؟"

"ہائے نئے زمانے کے لڑکو، تُمھیں کِس بات کی خبر ہے۔ نہ پگ کی عزت نہ جان کی۔"

"چاچا تیری جان کی عزت ہی تو کر رہا ہوں۔" اعجاز نے کہا۔

"اسی بات کا تو تجھے پتا نہیں بچیا" چاچا بولا "جان کی عزت اسے بچا کر رکھنے میں نہیں، تلی پر رکھنے میں ہوتی ہے۔"

اعجاز آج تک چاچے کو اپنی ماسی کے خاوند اور بیوی کے باپ کی حیثیت سے، اور ایک معمولی زمیندار کی شکل میں پہچانتا آیا تھا۔ اِس سے زیادہ جاننے کی اِس نے کبھی کوشش ہی نہ کی تھی۔ آج اُسے چوہدری احمد خان راٹھور کی نئی شکل دکھائی دی تھی۔ اِس سے پہلے صِرف ایک بار اُسے اِس شخص کے مزاج کا ہلکا سا عندیہ ملا تھا جب چند برس پیشتر اعجاز کے باپ کی موت پر روتی ہُوئی ماسی کو تسلی دیتے ہُوئے چاچے نے کہا تھا۔ "چل اب چُپ کر جا۔ بچارے کا سینہ انگریزوں کی پہلی لڑائی میں ہی بیٹھ گیا تھا پھر بھی اتنی لمی عُمر گزاری، ہاتھ پیروں کا نہیں تو دِل کا بہادر آدمی تھا رونے کی کیا بات ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ جان تو آنی جانی ہوتی ہے۔" اور اعجاز دِل میں کچھ حیران ہوا تھا کہ چاچا غمزدہ ہونے کی بجائے کیسی بات کر رہا ہے۔ یا پھر جب یعقوب اعوان نے سکینہ کا رشتہ مانگا تھا تو چاچا بولا تھا "تو دُوسری کوم کا آدمی ہے یکوب، پر تیرا لڑکا بہادر ہے۔ نُور پُور کی کوڈی میں جس دِن اُس نے جیجے ترکھان کا دم توڑا تھا میرے دِل کو وہ اُسی دِن لگ گیا تھا۔ جا میری رضامندی ہے۔" پھر چاچا دوبارہ اپنے رشتہ دار کے رُوپ کو لَوٹ گیا تھا۔ اب اتنے عرصے کے بعد اعجاز کو چاچے کی دُوسری زندگی کی خبر ملی تھی۔ اُسی وقت اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رات کو رُکے گا اور اِن لوگوں کی "خُوشی" میں بھی شریک ہو گا۔

اب صورت حال اچانک اُلٹ ہو گئی۔ اب چاچا احمد اعجاز کو ساتھ جانے سے منع کرنے لگا۔ "یہ کام خطرے ناک ہے، اعجاز۔ اَپنی ماسی کے پاس رہ، ہم رات کی رات آجائیں گے۔"

"چاچا، میں تو دَوڑ لگا کر بھی آجاؤں گا، تُم چل بھی نہیں سکتے۔ خطرناک تیرے لِئے ہے یا میرے لِئے؟"

"نہ دوڑنے کی بات ہے نہ بھاگنے کی،" چاچا بولا "دِل کی بات ہے، تُجھے اِن چیزوں کی مشق نہیں۔ مشق سے دِل مضبوط ہوتا ہے۔ دِل چھوٹ جائے تو پیر بھی سیدھا نہیں پڑتا۔"

"فکر نہ کر چاچا۔ میرا دِل نہیں چھوٹتا۔" اعجاز نے کہا۔

اب دو مسئلے زیرِ بحث آئے۔ پہلا یہ کہ چاچا وہاں کیسے جائے؟ ڈنگر کی سواری کرے تو بَیل ڈکرائے گا، گھوڑا ہنہنائے گا، گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگے گا۔ اعجاز نے بائیکل کی پیشکش کی تو چاچا اَور سائیں ہنسنے لگے جیسے مذاق کی بات ہو۔ آخر سائیں جلّے کی "گھوڑی" پہ فیصلہ ہُوا۔ دُوسرا مسئلہ عباس کا تھا۔ وہ ساتھ جانے پہ مصر تھا۔ اَور وہ جاتا تو پھر سرفراز کو کون روکتا۔

"باسا تو پڑھائی وڑھائی کے لائق نہیں۔" چاچے نے کہا۔ "مَیں کہتا ہُوں اِس کی مشق ہو جائے تو اَپنی روٹی تو کما لے گا۔ مگر سرفراز اطالبِ عِلم ہے، ایک دِن حیثیت والا ہو جائے گا۔ کیوں اِس کو خطرے ناک کاموں میں ڈالتے ہو۔"

سائیں جلّا اُس وقت مدد کو آیا۔ "کوئی مال تو آنا جانا ہے نہیں احمدو، خُوشی کا مَوکا ہے، پیچھے پیچھے چلے آئیں گے، زُبان بند رکھیں گے، اللہ مدد کرے گا۔"

"تیرے اختیار میں ہو تو اِنہیں مزاروں پہ لے جائے اَور بھنگ پلا پلا کر فقیر بنا دے،" چاچے نے کہا۔ "تیری ہدائت اللہ کسی غریب کو بھی نہ دے۔"

اعجاز کے دِل میں بھی بچّے کے بارے میں وسوسہ تھا۔ مگر اُس نے آج تک سرفراز کی کِسی بڑی خواہش کو رد نہ کیا تھا۔ وہ چُپ رہا۔

"اِتنے بڑے بڑے،" عباس باہیں پھیلا کر سرفراز کو بتا رہا تھا "جلیب ہوتے ہیں۔ ایک آدمی پُورا جلیب نہیں کھا سکتا۔"

رات آدھی سے زیادہ گزُر چکی تھی۔ چاچا احمد سائیں جلے کی چوڑی پیٹھ پر
سوار تھا۔ اُس کے بازو سائیں کی موٹی گردن، اَور ٹانگیں اُس کی کمر کے گرد لپٹی تھیں۔
اعجاز ہلکے پاؤں ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ دو قدم پیچھے عباس اَور سرفراز پلّوں کی طرح
تعاقب کر رہے تھے۔ سائیں نے اُن سے کہہ رکھا تھا کہ پیروں کی آواز نہ آنے پائے۔
چُنانچہ اُن کے چلنے کا انداز کچھ یُوں تھا کہ ٹانگیں ضرورت سے زیادہ اُوپر اُٹھاتے ہوئے
جس سے ان کے گھٹنے تقریباً ناف کی سطح تک پہنچتے تھے، اَپنے تئیں پھُونک پھُونک کر قدم
رکھ رہے تھے۔ صِرف سائیں جلا معمول کے مطابق بھاری چال سے، چاچے کو پیٹھ پر
اُٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر آدھے فرلانگ پر وہ سانس لینے کو رُک جاتا۔ "میری گردن
کا کوانہ دبا احمدو، میرا دم رُکتا ہے۔" وہ سرگوشی میں کہتا، "بوجھ کو میرے مونڈھوں پر رکھ
اَور نیچے نیچے کو نہ لٹکتا جا جیسے ٹٹی کرنے بیٹھا ہُوا ہے۔ رانیں دبا کے رکھ۔ تُو سواری کا
طریقہ بھُول گیا ہے؟"

"اپنا وقت یاد کر سائیں!" چاچے نے جواب دیا، "جب ٹھیکری والے مزار کے
فقیروں نے مار مار کے تیرا پیشاب نکال دیا تھا۔ مَیں چار میل تجھے اُٹھا کر لایا تھا اَور میرے منہ
سے ایک کلما نہیں نِکلا تھا۔ آج میرے زخم آگیا ہے تو تُو باتیں کرتا ہے؟"

اعجاز کو عِلم نہ تھا کہ چاچا کب کی بات کرتا تھا، مگر آج سائیں جلا پینسٹھ سال کی عُمر
سے کم کیا ہی ہوگا۔ وہ اُس بڈھے بدن کی طاقت پہ حیرت زدہ تھا۔ ایک آدھ بار اس نے
سائیں کا بار بٹانے کی پیشکش بھی کی تھی، مگر سائیں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ "ابھی میرے
مونڈھوں میں زور ہے بچے،" سائیں نے کہا، "مَیں نے اَپنی طاقت سنبھال کر رکھی ہے،
اِدھر اُدھر ضائع نہیں کی۔"

"مفت کی روٹیاں پھاڑ پھاڑ کر پلا ہُوا ہے۔" چاچا بولا، "سٹھا پٹھا ہے، سٹھا پٹھا۔"

"اب چِر چِر نہ کر،" سائیں نے جواب دیا۔ "مَیں تیری چالوں کو جانتا ہُوں۔ اُوپر
ہو کر بیٹھ، میری گردن کی جان بخشی کر، ناڑوں میں ہوا آنے دے۔"

پانچوں نفوس بدنوں پہ کالے کمبل لپیٹے ہُوئے تھے، یُوں کہ رات کے اندر اُن کی
حرکت بھی دِکھائی نہ دیتی تھی۔ بارڈر سے آدھ میل اِدھر پچھیتری مکی کا ایک کھیت کھڑا
تھا۔ اُس کے اَندر ملاقات کی جگہ مقرر تھی۔ چاچے اَور سائیں کی پارٹی کچھ دیر سے وہاں

پہنچی۔ وہ کھیت میں داخل ہو کر اندر تک چلے گئے مگر کسی بشر کے آثار اُنہیں دکھائی نہ دیئے۔ درمیان میں پہنچ کر وہ رُک گئے۔ اُنہیں وہاں کھڑے ہُوئے ایک منٹ گزُر گیا تو اچانک ایک ٹارچ، جس کے شیشے پر کالے رنگ کا کپڑا لپٹا تھا، چمکی اور اُس کی مدہم روشنی اُن پانچوں پہ پڑی۔ ان سے بمشکل دو گز کے فاصلے پر چار سکھ مرد بیٹھے تھے۔ اُن سب کی داڑھیاں منڈی ہُوئی تھیں، گو سروں پہ سکھوں کی مخصوص پگڑیاں موجود تھیں۔ اُنہوں نے چند پودے اُکھاڑ کر کھیت میں ایک گول سی جگہ صاف کر رکھی تھی اور پودوں کو زمین پہ بچھا کر اُن پہ بیٹھے تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی سائیں جلّے نے چاچے کی ٹانگوں کے نیچے سے اپنی باہیں کھینچ لیں اور ایک جھٹکے سے اپنی گردن کے گرد چاچے کے بازوؤں کی گانٹھ کھول دی۔ چاچا احمد مٹّی کی بوری کی مانند زمین پہ آگرا۔ "ہا۔۔۔ بے مراد،" چاچے کے مُنہ سے درد کی ایک چیخ نکلی جس کی آواز کو وہ دبا گیا۔ اعجاز نے چاچے کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ چاچا ایک ٹانگ پہ اُچھلتا ہُوا سکھوں کی پارٹی کے پاس جا بیٹھا۔ اُنہوں نے ایک دُوسرے کے شانوں پہ ہاتھ مار کر استقبال کیا۔

"ہم کو تو آج سویرے خبر ملی گُرو!" سکھ بولا، "ہی مانوں نے پیسے کھا کر تیرے ساتھ یہ کب کیا؟"

"کوئی رنگروٹ ہوں گے۔" چاچے نے کہا۔ "تیرے ساتھ تو اُن کا ناکرا نہیں ہوا؟"

"اونہوں!" سکھ سر ہلا کر بولا، "آج تو باڈر شمشان بنا ہُوا ہے۔ سردار اَور مُسلے داڑوپی کر لیٹے ہوں گے۔ کدھر چوٹ آئی؟"

چاچے نے کمبل کا کونا اُٹھا کر ٹانگ ننگی کی۔ "ماس کا زخم ہے، نقصان نہیں ہُوا۔"

"بڑا کرم ہُوا گُرو،" سکھ نے کہا۔ "رنگروٹوں کے نشانے کا بھی کیا پتا۔ ذرا اُوپر لگ جاتا تو تیرا خزانہ ہی اُڑ جاتا۔"

سب ہنسنے لگے۔

"تیرا خزانہ ابھی چلتا ہے نا۔" سکھ نے پُوچھا۔

"چلتا کہاں ہے،" سائیں جلّے نے جواب دیا۔ "اب تو بیاسی کی ناریں بھی طعنے دینے لگی ہیں۔"

"سائیں نے اپنا خزانہ ڈاک خانے میں جمع کرا رکھا ہے۔" چاچا بولا۔ "اسے ڈر ہے
خرچ کرنے کا۔"

"سائیں کی تو بڑی بچت ہو گئی ہو گی،" ایک نوجوان سکھ بولا۔

سب کے اندر ہنسی کی لہر دَوڑ گئی، جس کی آواز اُنھوں نے اپنے حلقے سے باہر نکلنے دی۔ بڑے سکھ نے پگڑی اُتار کر زمین پر رکھی اَور بالوں میں اُنگلیاں پھیر کر خارش کرنے لگا۔ پگڑی کے نیچے اُس کے بال منڈے ہُوئے تھے۔ پھر سکھ نے دوبارہ ٹارچ جلا کر اُس کی روشنی اعجاز اَور دونوں لڑکوں پہ پھینکی اَور آنکھوں پہ زور دے کر پہچاننے کی کوشش کی۔

"بھائی احمد خان، تُو بالکوں کو بھی لے آیا ہے؟"

"ضد کر کے آ گئے ہیں،" چاچے نے کہا۔ "مَیں نے تو کہا کہ میرے زخم کو دیکھو اَور سبق پکڑو، یہ خطرے ناک کام ہے۔ یہ نہ مانے، کہنے لگے ہم جرنیل سنگھ کے جلیب کھائے بغیر نہ رہیں گے۔"

"لاؤ سندھو،" جرنیل سنگھ نے کہا۔ "تھال آگے کر۔"

نوجوان سکھ نے عقب سے ایک بڑی سی پرات اُٹھائی اَور درمیان میں لا رکھی۔ پرات کپڑے سے ڈھکی تھی۔ جرنیل سنگھ نے کپڑا اُٹھایا تو سرفراز کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ عباس کے مُنہ میں پانی آ گیا۔ عباس نے جلیب پہلے دیکھ رکھے تھے، مگر سرفراز صِرف حلوائی کی دُکانوں پہ بنی ہُوئی جلیبیوں سے واقف تھا۔ اِتنے بڑے بڑے جلیب جو پُوری پرات کے پیندے کو ڈھکے ہُوئے تھے اُس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ پرات میں جلیبوں کی اُوپر نیچے کئی تہیں لگی تھیں۔ اُن کے اُوپر مُرغی کے انڈے کے برابر شکرپارے بکھرے تھے۔ اعجاز کے خیال میں چودہ برس پُرانی یاد لَوٹ کے آئی اَور دِل میں ایک میٹھی سی ہُوک اُٹھی۔ کبیر سنگھ والے میں آخری بار اُس نے سکھوں کی ایک شادی پر اتنے بڑے بڑے جلیب اَور شکرپارے دیکھے تھے۔

"لو جی، ہاتھ اُٹھاؤ، بسم اللہ کرو۔"

سرفراز جرنیل سنگھ کے مُنہ سے بسم اللہ کا لفظ سُن کر حیران ہُوا۔ سائیں جلے نے سب سے پہلے مٹھائی پہ ہاتھ مارا۔ اِس نے ایک پُورا شکرپارہ مُنہ میں بھرا اَور دونوں ہاتھوں

سے اُوپر والا ثابت جلیب اُٹھا لیا۔ شکر پارہ نکلنے سے پہلے ہی وہ جلیب کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ سرفراز کا جی چاہ رہا تھا کہ جلیب اُسی طرح ثابت کے ثابت پرات میں رکھے اپنے آتشی رنگوں میں دھیمے دھیمے چمکتے رہیں اور کوئی اُن کو نہ توڑے۔ مگر اب ایک کے بعد ایک جلیب ٹوٹ رہا تھا۔ چاچے نے ایک جلیب کے تین ٹکڑے کیے۔ اِس نے بڑا ٹکڑا اعجاز کو اَور دو چھوٹے عباس اَور سرفراز کو دیئے۔ سرفراز اُسے ہاتھ میں پکڑے دیکھتا رہا' یہاں تک کہ چاروں طرف سے کڑکڑے جلیب چبانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اُس نے بھی ایک کونہ توڑ کر مُنہ میں ڈالا۔

"یہ تو تیرا اپنا ہے بھائی احمد خان'" جرنیل سنگھ عباس پہ ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہُوئے بولا۔ "دُوسرے دو کون ہیں؟"

"یہ بھی میرے ہی ہیں'" چاچے نے کہا۔ "یہ میری لڑکی کا آدمی ہے۔ سکول میں ماسٹر ہے۔" چاچے کو خُوب عِلم تھا کہ اب اعجاز سکول ماسٹری سے فارغ ہو چکا ہے مگر وہ دُوسرے لوگوں کو ابھی تک ماسٹر کر کے ہی بتاتا تھا۔ "یہ چھوٹا اِس کا بھائی ہے' سکول جاتا ہے۔ پڑھائی میں قابل ہے۔"

"ہاں جی' کیوں نہ ہو' بھائی ماسٹر ہے۔ گُرو ترقی دے۔ جلیب کھانے روز روز نہ آجایا کرنا۔ دُنیا میں رہ کر ترقی کرنا۔ ہم تو غرق ہو کر اِس کام میں پڑے ہیں۔ نہ جان کا اِعتماد نہ جہان کا۔ چُھنکا سا بندہ اُٹھ کر ہم کو بندوق مار دیتا ہے۔ اچھا' سائیں تو سُنا' آج اِدھر کیسے آنکلا؟"

"احمدو کی لات آج نکارہ تھی۔ ساروں نے سمجھایا کہ نہ جاؤ' یہ اڑیل اپنی ضد پر کھڑا رہا۔ پیٹھ پہ لاد کر لایا ہُوں۔ میرے مونڈھے لٹک گئے ہیں۔"

"بڑے دِن ہو گئے تُو ہماری طرف کے مزار پہ دِکھائی نہیں دیتا' کیا قِصّہ ہے؟"

"وہاں روٹی رُوکھی سُوکھی ملتی ہو گی نا'" چاچا بولا۔

"وہ کوئی مزار ہے؟" سائیں نے کہا۔ "مُشٹنڈوں کا ڈیرہ ہے۔ میرا دِل کہتا ہے اُس مزار میں کوئی کچھ دبایا ہُوا ہے۔ اُدھر کوئی فقیر بھی جاتا ہے تو اُس کے کپڑے اُتار لیتے ہیں۔ مَیں کہتا ہُوں جرنیل سنگھ' تُو اُن کو مار کر وہاں سے دوڑا دے تو بہتوں کا بھلا ہو۔"

جرنیل سنگھ کے ساتھ بیٹھے ہُوئے دو جوان اَور ایک ادھیڑ عُمر سکھ باری باری ایک

بوتل سے مُنہ لگا کر پی رہے تھے۔ جرنیل سنگھ نے مڑ کر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اُن سے بوتل چھین لی۔

"ہا---- جرنیل سینہاں، خُوشی کا موکا ہے!" اودھیڑ عمر سکھ بولا۔

"تیری موت کا موکا بھی ابھی آئے گا جب تو بڑبڑ کرنے لگے گا اور سارے بازار کو جگا دے گا۔ چلو مٹھیائی کھاؤ، تُمھارا دماغ کچھ اپنی جگہ پر بیٹھے۔"

تینوں بے دِلی سے شکر پارے اور جلیب کے ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر مُنہ میں ڈالنے لگے۔ جرنیل سنگھ کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی پر پٹی لپٹی تھی۔ اُس نے پٹی کھولی تو انگلی کے پورے پر کٹے ہوئے ماس کا چیر لگا تھا۔ اُس نے بوتل کے ڈھکنے میں تھوڑی سی شراب اُنڈیلی اور اُنگلی اُس میں ڈبو دی۔

"زخم آگیا ہے جرنیل سینہاں؟" چاچے احمد نے پُوچھا۔

"آیا کدھر سے ہے، آپ ہی لگایا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیا بتاؤں بھائی احمد، میری تو زندگی ختم ہو گئی ہے۔"

"اللہ رحم کرے، کیا بات ہے؟"

"میرے پیٹ میں دیر سے تکلیف اُٹھتی تھی۔ آخر میں ڈاکدر کے پاس گیا۔ اس سُور کی ہڈی نے دوائی شوائی کوئی نہ دی، بس دارُو پینے سے روک دیا۔ اب یہ دیکھ لے کیا کب کرتا ہوں۔ اُنگلی کو چیر دے کر دارُو میں تھوڑی دیر رکھتا ہوں تو کچھ سرور آجاتا ہے۔ میری تو زندگی ختم ہو گئی ہے احمد خاں۔"

"اللہ رحم کرے گا" چاچے نے کہا۔

اب پرات میں چند ٹوٹے پھُوٹے جلیب اور شکر پارے رہ گئے تھے۔ جرنیل سنگھ نے اُنگلی شراب سے نکالی، ڈھکنے کی شراب احتیاط سے واپس بوتل میں اُنڈیلی، ڈھکنا اُوپر کسا اور بوتل کو تہمد کی ڈب میں اُڑس لیا۔ پھر اُس نے اُنگلی پہ پٹی لپیٹی اور پرات اُٹھا کر زمین پر اُلٹ دی، گویا محفل کے خاتمے کا اعلان کر رہا ہو۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"تجھے دیکھ کر خُوشی دُونی ہو گئی ہے احمد خان!" جرنیل سنگھ نے چاچے کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "آج سویرے ہمیں خبر ملی تو اپنے خواب میں بھی نہیں تھا کہ تو اِدھر پہنچ

گا۔ ہم تو بات کے پیچھے چلے آئے۔"

"جرنیلے،" چاچا نیچی آواز میں للکار کر بولا،۔ "تو بات کے پیچھے باڈر پار کر کے آیا ہے تو سمجھتا ہے کہ تیری بات میری بات سے بڑی ہو گئی؟ میری لات بھی کٹ جاتی تو میں اِدھر پہنچتا۔"

"مانتا ہوں احمد خان، مانتا ہوں۔ چل اب غصہ نہ کر۔"

دونوں نے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔ یخ ٹھنڈی رات کے اندھیرے میں آسمان پہ ستارے اپنے جسم سے بڑے نظر آرہے تھے۔ کالے کمبلوں میں لپٹے، سایوں کی مانند کھیتوں کے بیچ بیچ چلتے وہ گاؤں کی راہ ماپ رہے تھے۔

"میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے،" سائیں جلا چاچے کے بوجھ تلے بھاری سانس لیتا ہوا بولا۔

"تیرے معدے میں جلیب بول رہے ہیں،" چاچے نے کہا۔ "دو ثابت جلیب اور دس شکرپارے تُو میری آنکھوں کے سامنے ہڑپ کر گیا ہے۔"

"تُو گنتا رہا ہے؟"

"ہاں۔ اب بہانے نہ بنا۔ چلتا چل، رستہ تھوڑا رہ گیا ہے۔"

سائیں نے زور لگایا تو اُس کی ہوا چھوٹ گئی۔ دونوں لڑکے ہنس پڑے

"چُپ کرو بدماشو!" چاچا سائیں کی طرف داری کرتا ہوا بولا۔

"ابا!" عباس نے کہا، "سائیں کہتا تھا کسی کی آواز نہ نکلے۔ اب گولے چھوڑ رہا ہے۔"

"مَیں کل ہریاں والے مزار پر جا رہا تھا!" سائیں دکھی آواز میں بولا! "پتا نہیں کیوں رُک گیا۔ میری قسمت میں پینڈا لکھا تھا۔"

"ناشکری نہ کر!" چاچے نے کہا! "ہریاں والے میں تجھے جلیب کون دیتا۔"

"سائیں،" اعجاز نے پُوچھا۔ "ہر ایک مزار پر باری باری جاتے ہو؟"

"اونہوں،" سائیں نے سر ہلایا۔ "وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"کون مقرر کرتا ہے؟"

"مجھے نشانی ملتی ہے۔"

"کہاں سے ملتی ہے؟"

"اُدھر سے،" سائیں نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔

"کیسی نشانی؟"

"کوئی تارہ چمکتا ہے تو مجھے اِشارہ مِل جاتا ہے۔"

"اشارہ مِلتا ہے کہ فلاں فلاں مزار پر جاؤ؟"

"ہاں۔"

"تارہ چمک کر مزار کا نام کیسے بتاتا ہے سائیں؟"

"یہ تیرے مالوم کرنے کی بات نہیں بچے، فقیر کو اِس کا علم ہوتا ہے۔"

"تارے کو کبھی غلطی بھی لگ جاتی ہے۔" چاچے نے کہا۔ "اِدھر سائیں کو اشارہ دیا، اُدھر ٹھیکری والے مزار کے فقیروں کو بھی اشارہ دے دیا۔"

سائیں نے چاچے کی بات کا جواب نہ دیا مگر جب وہ گھر پہنچے تو سائیں نے چاچے کو یُوں دھم سے پلنگ پہ گرایا کہ چاچے کی ہائے نِکل گئی۔ آسمان پہ پَو پھٹ رہی تھی۔

جب اعجاز بستر پہ لیٹا تو اُس کے دِل کو یہ فِکر لگی تھی کہ سرفراز کا سکول سے تیرا دِن بھی غیر حاضری میں گیا۔ مگر خواب میں جانے سے پہلے اس کی بند آنکھوں میں دو ہی منظر آئے۔ ایک کنیز کا چہرہ، دُوسرا سکینہ کا برچھی کی طرح تیز چہرہ جس سے طعنہ نِکل کر اعجاز کو کاٹ گیا تھا۔

باب 6

پھاگن آن لگا تھا۔ اعجاز اپنی زمین کا قبضہ حاصل کر کے کھیت مزدوروں کی مدد سے کاشت شروع کر چکا تھا۔ اِس دوران میں وہ جہانگیر سے دوبارہ جا کر مِل آیا تھا۔ دُوسری بار وہ ملک حمید کی شکایت لے کر گیا تھا کہ حمید اپنے آدمیوں کے ذریعے بشیر اور علی احمد کو دھمکیاں بھجوا رہا ہے۔

"صفدر نے ابھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا؟" جہانگیر نے کہا۔

"اِس بات کو چھوڑو بھائی جہانگیر۔ حمید تو مرنے مروانے کی باتیں کرتا ہے۔"

"مَیں اُس سے بات کروں گا۔ میری بات مانو تو اِس قصے کو اب ختم کرو۔ اچھا یہ بتاؤ، کاہنے میں کسان تنظیم کا جلسہ ہو رہا ہے؟"

"اعلان ہو گیا ہے!" اعجاز نے کہا! "ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی، کٹائی کا انتظار ہے۔"

"تُم شریک ہو رہے ہو؟"

"ہاں۔ جڑانوالے میں چکوک کی زمین کی الاٹمنٹ کے خلاف احتجاجی اجتماع ہے۔"

"وہ تو خیر دُوسری بات ہے۔" جہانگیر بولا، "ہمیں اپنے علاقے پر توجہ دینی چاہیے۔ میری اطلاع ہے کہ بارڈر کے بے دخل مزارعوں کا مسئلہ بھی اُٹھایا جائے گا۔ وہ بھی دُرست ہے۔ تمہارے چاچے احمد خان کو کچھ زمین اُدھر مِل جائے تو اُس کی مدد ہو جائے۔ آپس کی بات ہے اعجاز، ہمیں تو پتا ہے وہ کس کام میں ملوث ہے۔ آگے اُس کا بیٹا بھی اُسی طرف جا رہا ہے۔ مگر سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ جن لوگوں کی زمین بارانی ہو گئی ہے اُن کا پُورا مالیہ معاف کیا جائے۔ میرے ٹیوب ویل بس سمجھو کہ دِکھاوے کی چیز ہیں، آدھی زمین بھی گیلی نہیں کرتے، اُوپر سے اُن کے چلانے کا خرچہ الگ۔ تُم سے کیا چھپانا اعجاز، یہ سب" اُس نے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کیا، "تو بس رکھ رکھاؤ ہے، ہم لوگوں کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اندر کی بات تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

رُخصت ہوتی دفعہ اعجاز نے دوبارہ بات کی۔ "ملک حمید۔۔۔"

"اُس سے مَیں معاملہ کر لُوں گا۔" جہانگیر بات کاٹ کر بولا، "مگر احتیاط سے رہ
اور اُس عورت سے چھٹکارا کراؤ۔ بہت ہو گئی، اب کیا اُس کا اچار ڈالو گے؟" اُس نے ہنس
کر کہا۔

اعجاز کے شعور میں غالباً اِس بات کی خبر نہ تھی، مگر بے معلوم طور پہ وہ جہانگیر کا
ہم رکاب بن چکا تھا۔ اُسے چاچے احمد اور عباس کی فکر تھی۔ پھر نوکری چھٹ جانے کے
بعد کچھ اپنے فائیدے کا بھی خیال تھا۔ اگر جہانگیر بہت سا فائیدہ حاصل کر سکتا تھا تو تھوڑی
بہت زمین اُس کے اپنے خاندان کے حصے میں آ سکتی تھی۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ دو بیٹے
تھے، اور اُوپر سرفراز کی تعلیم کا معاملہ تھا۔ آخر سیاست اِسی کا نام تھا۔ البتہ جہانگیر ایک بات
میں غلطی پہ تھا۔ کنیز اعجاز کے پیچھے نہ پہلے پڑی تھی نہ اب۔ معاملہ اُلٹ تھا۔ وہ اعجاز کی
ہڈیوں میں اُتر گئی تھی۔ جب کبھی بشیراں اُسے اپنے عزیزوں کے پاس وہاڑی بھیجنے کی بات کرتی
اعجاز کسی نہ کسی بہانے اُسے رُکوا دیتا۔ وہ ابھی تک سکینہ کے نزدیک نہ گیا تھا۔ ان دونوں
کے درمیان کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ گھر کی روٹی چلانے کے لیے اگرچہ زمین سے جنس
آ جاتی تھی، مگر کپڑے لتے کے لیے اُوپر کے خرچے کی کمی پُوری نہ ہوتی تھی اور گو سکینہ کو
اُس کے شہر کے چکروں کے بارے میں ابھی اِس سے زیادہ علم نہ تھا کہ وہ اپنے دوستوں
یاروں کو ملنے جاتا ہے، مگر اُس کی جسمانی تہی دامنی پیسوں کی شکایت کی شکل میں ظاہر ہوتی
رہتی تھی۔ اُس نے اپنی شکل صورت کا خیال کرنا ترک کر دیا تھا۔ گرمیوں کے دن سر پہ
آ پہنچے تھے اور وہ چار چار دِن تک نہاتی نہ تھی۔ وہ جو ریٹھوں کی جھاگ سے سر دھو کر
ساری ساری دوپہر سر میں تیل ملتی اور لکڑی کی مہین دانتوں والی کنگھی سے بیچ ماتھے مانگ
نکال کر اپنے گز لمبے بال گوندھتی تھی، وہ بال اب دِن رات اُلجھے رہتے تھے جیسے کنگھی کے
استعمال سے نابلد ہوں۔ نہ آنکھ میں سُرمہ نہ دانت پہ دنداسہ، اُس لڑکی کی نظریں نیچی اور
توجہ ہر لمحے اپنے دو بچوں پر مرکوز رہتیں، جیسے کہ وہ دُنیا سے ہٹ چکی ہو۔ وہ سکینہ کو دیکھتا
تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ جا کر اُسے بازوؤں کے حلقے میں لے لے اور کوئی ایسی بات کرے
جس سے سکینہ کو تسلی ہو۔ مگر کشیدگی کی جھجک اعجاز کے ذہن میں راہ پا گئی تھی۔ دُوسری
جانب کنیز تھی جس کے بدن کے ساتھ اِس کی بے تکلفی اِس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اُسے
دیکھتے ہی دونوں کے بند کُھلنے لگتے تھے۔ تاہم، کنیز کی تمام تر رضامندی اور سپردگی کے

باوجود، اعجاز کے دل میں ہر وقت یہی کھٹکا رہتا کہ وہ ابھی ہاتھ سے گئی کہ ابھی گئی۔

"اقبال سکول جاتا ہے۔" وہ کنیز سے کہتا "وہاڑی کی طرف کیا پتا بھٹے کے قریب کوئی سکول ہو کہ نہ ہو۔ تو یہاں شہر میں کوئی کام وام کر لے، گزارہ ہوتا رہے گا۔ میں نے ملک حمید کے بارے میں بات کی ہے، اس کی دھمکیوں کی پروا نہ کر۔ تجھے کوئی خطرہ نہیں۔۔۔"

ایک طرف سکینہ کو جب بھی اعجاز نظر بھر کے دیکھتا تو یک بارگی اس کے بدن میں خواہش کا شعلہ بھڑک اٹھتا مگر یہ خواہش لمحاتی ہوتی اور دیکھتے ہی دیکھتے گزر جاتی۔ برسوں کی ہمسری کے بعد آج ان کے درمیان نہ لمس رہا تھا نہ الفاظ۔ دوسری طرف کنیز تھی جس کے ساتھ الفاظ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ نہ میں نہ تو، نہ کچھ لینا نہ دینا۔ اس کے اور کنیز کے درمیان جو رشتہ تھا وہ اسی ایک بات پہ قائم تھا کہ نہ کچھ لینا نہ دینا، نہ قرض نہ مقروض، نہ حقوق نہ مطالبات، نہ بات نہ بتنگڑ۔ ایک وسیع و عریض آزادی کا احساس تھا جس کے اندر وہ دونوں تن تنہا متحرک تھے۔

دل کے مخمصوں میں پھنسا، پیچیدگیوں میں ڈبکیاں کھاتا ہوا اعجاز کا ذہن اس بات کو البتہ نہ پہچان سکا کہ اس کا اور کنیز کا تعلق ایک سیدھے سادھے اصول پر مبنی تھا، کہ وہ اپنے دل کے اندر کنیز کو ایک کمتر درجے کی مخلوق سمجھتا تھا اور کہ یہی اس کی خوش کن آزادی کا منبع تھا۔

بیساکھی کے میلے لگ چکے تھے۔ کسانوں کے گھروں میں سال بھر کے دانے آچکے تھے۔ دالوں کی مٹکیاں آدھی پونی بھری تھیں اور ان کا خون گرم تھا۔ اس موسم میں جلسے کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ منتظمین میں کسان تنظیم اور کسان کمیٹی دونوں کے لیڈر شامل تھے۔ علی احمد شیخ تندہی سے اعجاز اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جلسے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس پہ زکام اور بخار کا حملہ ہو گیا۔ جلسے کے مقامی منتظمین سے اس کا رابطہ رہا تھا جن کے لیے اس نے اپنے چھوٹے سے گاؤں رسالے والا سے جو بارڈر کے پاس تھا، بیس آدمی ساتھ لے جانے کو تیار کر رکھے تھے۔ اسے مقامی لیڈروں کی جانب سے یہ عندیہ

بھی مِل چُکا تھا کہ اُس کی خدمات کے صلے میں اس بار اُسے جلسے کو خطاب کرنے کے لیے چند منٹ دیئے جائیں گے۔ اِس وعدے سے علی احمد کو اپنے سامنے گویا ترقی کی سیڑھی نظر آ گئی تھی۔ اعجاز کی مدد سے کئی روز لگا کر اُس نے تقریر لکھی تھی اور سارا سارا دن بیٹھ کر اُسے رٹتا رہتا تھا۔ روزانہ کی مشقت کے باوجود علی احمد کی تقریر رواں نہ ہو سکی تھی اور وہ کبھی ایک جگہ پر اور کبھی دُوسری پہ اٹک جاتا تھا اور جہاں رُکتا اُس سے آگے ساری کی ساری بھول جاتا تھا۔

"تقریر سامنے رکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں،" اعجاز نے اُس سے کہا تھا۔ مگر علی احمد کے اندر اِس جلسے کے بارے میں خاص طور پہ اضطراب تھا۔

"یہ کوئی چھوٹا موٹا اِکٹھ نہیں ملک اعجاز! آپ نے دیکھا ہی ہے، مَیں گھنٹہ گھنٹہ بغیر تیاری کے بول جاتا ہوں۔ مگر یہ بڑا جلسہ ہے۔ ملک مراج کا علاقہ ہے۔ شیخ صاحب بھی آ رہے ہیں۔ یاد ہے انھوں نے بیدخل مزارعوں کے حق میں بھوک ہڑتال کی تھی؟ بڑے خاص آدمی ہیں۔ جناب یہ کوئی ایسا ویسا موقع نہیں، پُوری تیاری کر کے جاؤں گا۔"

جب صبح سویرے اعجاز اور بشیر اُس کے گھر پہنچے تو علی احمد ایک سو چار درجے کے بخار میں چارپائی پہ پڑا کانپ رہا تھا۔ اُس نے کھیس کا پلّو اُٹھا کر آنے والوں کو دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہاتھ تکیئے کے نیچے داخل کیا اور کاپی کے دو ورق نکال کر، جن کے چار صفحوں پر تقریر کی عبارت صحیح کر کے لکھی گئی تھی، لرزتے ہُوئے ہاتھوں سے اعجاز کی جانب بڑھا دیئے۔

"میری قسمت خراب ہے،" وہ بولا، "بشیر کو زُبانی یاد کرا دینا، میری جگہ پر وہ بول دے گا۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"قدرت کو ایسا ہی منظور تھا شیخ صاحب،" اعجاز نے کہا، "جی مت چھوڑو۔ زندگی ہُوئی تو آگے ہزار موقعے آئیں گے۔ بشیر کرے یا کوئی اور کرے، یہ تمھاری ہی تقریر ہے، شروع میں تمھارا ہی نام آئے گا، اطمینان رکھو۔"

علی احمد کی بیوی، جو پردہ کرتی تھی، گھر کے اندر تھی۔ کنیز نے چند روز سے لوگوں کے گھروں میں صفائی کا کام شروع کر رکھا تھا۔ وہ بارہ ایک بجے گھر واپس آ جاتی تھی۔ اعجاز اور بشیر چند منٹ تک علی احمد کے پاس بیٹھے، پھر اُسے تسلی دے کر وہاں سے رُخصت

ہوئے۔

دونوں تانگے پر سوار ہو کر علی احمد کے گاؤں پہنچے۔ وہاں پہ پندرہ بیس کسان گاؤں کے باہر ایک کھیت کے کنارے تیار بیٹھے تھے۔ علی احمد کی بیماری کی خبر سُن کر اُن کے چہرے اُتر گئے۔ اُن کے اطوار سے ظاہر ہونے لگا کہ اُن کے ارادے ڈگمگا گئے ہیں۔ صُورتِ حال دیکھ کر بشیر آگے بڑھ کر اُن کے درمیان جا بیٹھا۔

"جلسے جلوس میں کتنے آدمی ہوتے ہیں؟" اِس نے پُوچھا۔

"بڑے آدمی ہوتے ہیں جی،" ایک کسان نے جواب دیا۔

"اندازہ لگا کے بتاؤ۔ ایک سو، دو سو، ہزار، دو ہزار؟"

"اتنے تو ہوتے ہوں گے،" کسان نے سادگی سے کہا۔

"غلط،" بشیر ڈرامائی انداز میں ہاتھ بلند کر کے بولا۔ "اِس جلسے میں کئی ہزار آدمی ہوں گے۔ شہر پنڈی اور پشاور تک سے اِتنے بڑے بڑے لیڈر آ رہے ہیں کہ کئی ہزار سے بھی زیادہ آدمیوں کا اِکٹھ ہو گا۔ ہم کتنے آدمی ہیں؟ ایک، دو، تین،" بشیر نے ایک ایک کو گننا شروع کیا۔ "اٹھارہ۔ دو ہم ہیں۔ بیس ہو گئے۔ ڈھول والا کہاں ہے؟"

"اس کو آدمی بُلانے گیا ہے۔" اُسی کسان نے کہا۔

"کل اکیس!" بشیر بولا۔ "اب بتاؤ، اِتنے بڑے اِکٹھ میں اِکیس آدمی نہ گئے تو کیا ہو جائے گا؟ کوئی فرق پڑے گا؟"

کسان کے سادہ فہم تک بشیر کی منطق نہ پہنچی۔ اُسے اپنے سامنے دِن بھر کی بیگار کا راستہ دِکھائی دینے لگا۔ "نہیں جی!" وہ بولا، "پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"بالکل دُرست! آٹے میں نمک کے برابر،" بشیر نے کہا۔ "لیکن---" اُس نے دوبارہ ہوا میں انگلی اُٹھائی اور لفظ پر زور دے کر بولا۔ "لیکن!" ایک لحظے کو رُک کر اُس نے باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھا۔ سب چہرے چُپ چاپ اُس کی جانب اُٹھے تھے۔ "لیکن۔" وہ انگلی ہلا کر تیسری بار جذبے سے بولا، "رسالے والے کا نام مٹ جائے گا۔"

کسانوں کے چہرے خُون کی گردش سے سُرخ ہو گئے۔ کچھ دیر تک وہ بشیر کے اس نئے پینترے کو بے سمجھ نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک جرأت کر کے

بولا "یہ بات تو ہے جی۔" بشیر نے اُسی طرح انگلی ہوا میں
"تیس چالیس گاؤں، قصبوں اور شہروں سے،" "اپنے بھائی بند آئیں گے۔ ہزاروں
اٹھائے اٹھائے زوردار لہجے میں بات جاری رکھی، "اپنے بھائی بند آئیں گے۔ ہزاروں ہزار
سے اُوپر تعداد ہوگی مگر ہر ایک جتھہ جب داخل ہوگا تو اُس کے موضع کا نام اُٹھے گا اُس کا
نعرہ لگے گا اُس کا ایک مقام ہوگا۔ قطرہ قطرہ کر کے دریا بنتا ہے۔ اُس دریا میں رسالے
والے کا نہ کوئی نام ہوگا نہ مقام ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے موضعوں کے لوگ اٹھ کر رسالے
کی عزت پر ہاتھ مارتے رہیں گے، غیرت دلاتے رہیں گے، کہ مزارعے بے دخل ہو گئے
اور رسالے کے بھائیوں نے آواز نہیں اٹھائی، جڑانوالے کے چکوں کی زمین بڑے بڑے
چودھری لے گئے اور رسالے سے ایک بول نہیں نکلا، زمینیں بارانی ہو گئیں اور مالیہ معاف
کے لیے رسالے کے جوان چُپ رہے۔ ایسے ایسے بول اٹھا لوگے؟--- بولو، ہماری
شمولیت ضروری ہے کہ نہیں؟"

جیسے جیسے بشیر بولتا جارہا تھا اُس کی آواز میں للکار پیدا ہوتی جارہی تھی اور ویسے
ویسے ہی کسانوں کی غیرت اُبھرتی آرہی تھی۔ آخر ایک کسان جوش میں آکر بولا "کیوں
نہیں جی، سب سے آگے جائیں گے۔ کیوں بھائی؟" اُس نے دوسروں کی جانب دیکھ کر
پوچھا۔ "کچھ منہ سے بولو، ٹھیک ہے کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں،" تین چار نے بیک آواز جواب دیا، "سب سے آگے، سب سے
پہلے رسالے کی آواز اُٹھے گی۔"

"رسالے کی اور شیخ علی احمد کی،" بشیر نے کہا۔

"رسالے کی اور شیخ کی،" پہلے کسان نے کہا۔ "جا اوئے فضلے، مراثی کو جلدی اٹھا
کے لا۔ کہنا ذرا ڈھول کس کے لائے۔ آج اُس کے ہاتھ کا کھیل بھی دیکھیں۔"

اعجاز مبہوت کھڑا بشیر کی کارروائی دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار اُسے بشیر کی اصل
صلاحیتوں کا علم ہُوا تھا۔ اِن اٹھارہ لوگوں کو اُس نے بشیر کے ہاتھوں میں موم کی طرح مُڑتے
ہُوئے دیکھا۔ سیاست کے اِس رُخ میں اُس نے ایک ایسی دلکش کشش محسوس کی جس کا
تجربہ اُسے پہلے کبھی نہ ہُوا تھا۔

اجلاس کے مقام سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر وہ بس سے اُترے تو انہیں دُور

سے جلسے کا ہجوم دکھائی دے گیا اور ڈھولوں کی دھمک اُن کے کان میں پڑی۔ ننگے کھیتوں میں جن سے فصلیں اُٹھائی جا چکی تھیں، سفید کرتوں، چادروں اور پگڑیوں میں ملبوس کسانوں کا مُٹرک مجمع دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دُور سے اسے دیکھ کر ہی اعجاز کا دل گرما گیا۔

"واہ بھئی واہ!" وہ بولا۔ "ذرا پنڈال تو دیکھ بھائی بشیر۔ کیسا مجمع لگا ہے۔"

بشیر کا رنگ زرد ہو گیا۔ "ملک اعجاز!" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "میری طبیعت کچھ گرم سرد ہو رہی ہے۔"

"حوصلہ کر بھائی بشیر۔" اعجاز نے کہا۔

علی احمد کے گھر پہ تو بشیر چُپ رہا تھا۔ رسالے والے تک پہنچتے پہ بھی وہ خُوب بہت میں تھا، مگر جیسے ہی وہ اپنے لوگوں کو لے کر بس میں سوار ہوئے، بشیر کا جی چھوٹنے لگا۔ "ملک اعجاز، مَیں نے تو تقریر صرف ایک بار پڑھی ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "کاغذ سامنے رکھ کر پڑھ دینا۔"

"کہیں پر اٹک گیا تو۔"

"اٹکو گے کیسے، صاف صاف لکھا ہُوا ہے، کوئی اندھیری نہیں آئے گی جو کاغذ کو اُڑا کر لے جائے گی۔ کاغذ اپنے سامنے رکھنا، عینک چڑھا لینا، اور پڑھتے جانا۔"

"سچ پُوچھو تو ملک اعجاز، شیخ کی بات ٹھیک ہی تھی۔ لکھی ہُوئی پڑھنے سے تقریر میں جذبہ پیدا نہیں ہوتا،" بشیر نے کہا۔ "تقریر تو مُنہ زبانی کرنے سے ہی حق ادا ہوتا ہے۔"

"اب تُم بھی شیخ کی طرح اِس چکّر میں مت پڑو،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "میرا خیال ہے اُسے بخار بھی مُنہ زبانی کے ڈر سے ہی چڑھ گیا ہے۔"

"ایک بار اَور پڑھ کر سُناؤں؟" بشیر نے اِلتجا کی۔

"ہاں ہاں، جتنی بار مرضی ہو پڑھو۔"

بشیر نے جیب سے تہہ کیے ہُوئے کاغذ نکالے اَور آہستہ آہستہ پڑھنا شرُوع کیا۔ "ملک اعجاز،" وہ رُک کر بولا، "پسماندگی کا لفظ" میری زُبان پر نہیں چڑھتا۔"

"ٹھیک ہی تو بول رہے ہو۔"

"املاء کے اندر پڑھ لیتا ہوں، مگر روانی سے بولتے ہُوئے اٹک جاتا ہوں۔ اِس جگہ

پر غربت نہ بول دوں؟"

"ہم تو غربت کی وجہ بتا رہے ہیں،" اعجاز نے کہا، "غربت کی وجہ ہی پسماندگی ہے۔ خیر، تم اٹکتے ہو تو غربت ہی بول دو۔"

ٹوٹی ہوئی سڑک پر بس کے دھچکوں کے بیچ بشیر کاغذ کو نظروں کے سامنے رکھنے اور ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُن کے ساتھیوں میں سے دس بارہ کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی تھی۔ باقی کے سیٹوں کے بیچ راستے میں کھڑے تھے۔ اُن میں سے ایک کے پاس حُقّہ تھا، جسے وہ ایک دُوسرے کو ہاتھوں ہاتھ پکڑاتے ہُوئے پیتے جا رہے تھے۔ وہ سب بشیر کو اِس طرح فخر سے دیکھ رہے تھے جیسے اُس کے ہاتھ میں کوئی اِنعام پکڑا ہو۔ ان کے دو تین ساتھی، بمعہ ڈھول کے بس کی چھت پر چڑھ بیٹھے تھے۔ بشیر مزید ایک دو مقام پہ اٹک رہا تھا۔

"بیسک ڈیماکریسی کی جگہ بی۔ ڈی ٹھیک نہیں رہے گا؟" اُس نے پُوچھا۔

"بی۔ ڈی ہی کر دو۔" اعجاز نے کہا۔

بشیر کا اعتماد پھر بھی لوٹ کے نہ آیا۔ وہ کاغذ کو اِس طرح پکڑے ہُوئے بیٹھا تھا جیسے کوئی زہریلی شے اُس کے ہاتھ سے چپک گئی ہو۔ آخر وہ بولا، "بھائی اعجاز، تُمہارے ہاتھ کی تقریر پر حق تو تُمہارا ہی ہے۔"

اعجاز نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس کا شک صحیح ثابت ہُوا۔ "میری جگہ پر تُم تقریر کر دو،" بشیر نے ملتجی ہو کر کہا۔

پچھلے کئی روز سے اعجاز کا دماغ اِس قدر مخمصے کی حالت میں رہا تھا کہ آخر ایک جگہ پر چند منٹ کو بیٹھ کر اُس نے اپنے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ کنیز کا معاملہ، بشیر کا جذبہ، شیخ علی احمد کی لگن، اور اِن سب کے بعد ملک جہانگیر کی تجویز۔ یہ سب واقعات اُس کو الگ الگ، اپنی اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ آخر ایک موقعے پر وہ اس اضطراب کے ہاتھوں مجبور ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ اِس حالت میں زیادہ دیر تک چلتے جانا اُس کے لیے ممکن نہ تھا۔ ذہن کو جھٹک جھٹک کر راستہ نکالتے ہُوئے بالآخر وہ اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ فی الوقت وہ جہانگیر کی بتائی ہُوئی راہ پر ہی کاربند رہے گا۔ صرف یہی ایک بات نہیں تھی کہ وہ جہانگیر کا احسان مند تھا، بلکہ جہانگیر کی باتوں میں دُنیاداری کی

دانش کا بھی عمل دخل تھا۔

"...ہانے کا سودا کبھی نہ کرو،" جہانگیر نے کہا تھا "ورنہ تمہارے نیک جذبے ہوا میں ہی اُڑتے رہیں گے، کسی کے ہاتھ میں نہ آئیں گے۔ دُور سے حالات کو دیکھ کر پہچانو، کیونکہ اُن کی باگیں پیچھے کھڑے ہونے والوں کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہیں۔"

"علی احمد نے یہ کام تمہارے سپرد کیا تھا" اعجاز نے کہا "تمہیں ہی جچتا ہے۔ آخر تمہاری خدمات کوئی کم تو نہیں۔"

"دُرست ہے بھائی اعجاز!" بشیر نے ڈولتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "مگر آخر تمہیں بھی تو کبھی نہ کبھی اِس جدوجہد میں کودنا ہے، پھر آج ہی سہی۔ تمہارے اور میرے بیچ کون سا فرق ہے؟"

"اوہو نہوں،" اعجاز نے ہولے ہولے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمت کرو، آج تمہارا ہی ڈنکا بجے گا۔"

مایوس ہو کر بشیر نے ایک بار پھر تقریر کو ابتدا سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر بس سے اُترتے ہی اتنا بڑا مجمع دیکھ کر اُس کا سانس سُوکھ گیا۔ اعجاز اسے تسلی دیتا ہُوا جلسہ گاہ کی جانب لے چلا۔

ننگے کھیتوں کے ایک وسیع میدان میں جلسہ لگا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا شامیانہ نصب تھا جس کے نیچے لکڑی کے تختوں کا مختصر سا سٹیج کھڑا کیا گیا تھا۔ سٹیج پر دریاں بچھا کر چار پانچ کُرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی تھیں۔ دو نوجوان ایک اُونچے سے ڈیسک پر رکھے ہوئے مائیکروفون کی تاروں کو اُٹھا بچھا رہے تھے۔ باقی کا اِجلاس کُھلے آسمان تلے تھا۔ کئی سو کے قریب لوگ جمع ہو چکے تھے، مگر ابھی چاروں جانب سے مختلف گروہ جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ بیل گاڑیوں، تانگوں اور پیدل جلُوسوں کی آمد لگی تھی۔ بیچ بیچ میں اِکا دُکا گُھڑسوار بھی دکھائی دیتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے جلُوس کے ساتھ اپنا ڈھولچی تھا جو دُور سے ڈھول پیٹتا ہُوا آتا۔ جیسے ہی یہ جلُوس مجمعے سے آکر ملتا ڈھول کی تھاپ بدل جاتی۔ ڈھولچی کے مشاق ہاتھ مشین کی مانند چلنے لگتے اور بانس کی کھپچیاں ڈھول کی تنی ہُوئی کھال پہ اِس طرح دھم دھم دھم بجنے لگتیں گویا خودکار فائیر کرنے والے ہتھیار ہوں۔ اِس کو سُن کر نعرے لگانے اور ناچنے والوں کے بدن چند لمحوں کو منجمد ہو جاتے، جیسے کہ اُن کا

خُون اُچھال مارنے سے پہلے اِس تال کے ساتھ ساتھ اُٹھ رہا ہو۔ جیسے ہی وہ تال ٹوٹتی اور ڈھولچی اپنی مخصوص، دھمال کی جھولدار تھاپ دھم دھما دھم، دھم دھما دھم شروع کرتا، مجمعے کا بند ایک دم ٹُوٹ جاتا۔ بیسیوں بازو اور بدن ہوا میں اُٹھتے اور پاؤں تھرک تھرک کر زمین پہ پڑنے لگتے۔ ساتھ ہی جلُوس کے مجموعی حلق سے شیر کی سی چنگھاڑ برآمد ہوتی۔ زندہ باد اور پائندہ باد کے بیچ اللہ اکبر اور یا علی کے نعرے بلند ہونے لگتے۔ چند منٹ تک یہی جوش و خروش رہتا۔ پھر جیسے ہی ایک مختلف سمت سے نئے جتھے کی آمد کی دھمک کان میں پڑتی، نعرے بند ہو جاتے اور مجمعے کی آنکھیں دُور سے اُٹھتے ہوئے گردو غبار پہ لگ جاتیں۔ آہستہ آہستہ پھر اس گرد میں سے ناچتے، نعرے لگاتے ہوئے کسانوں کی شکلیں نمودار ہونے لگتیں۔ لوگوں کی متلاشی نظروں میں اشتیاق کی چمک ہوتی کہ دیکھیں اب کس شہر کون سے قصبے، کہاں کے موضع کے جلوس کی آمد ہے۔ جتھے والوں نے جھنڈے، پرچم اور کتبے اٹھائے ہوتے جن پر جلی حروف میں اپنے علاقے کا نام، کسان تنظیموں کے نعرے اور جتھہ لیڈروں کے احوال درج ہوتے۔ اُن کے سربراہ گینڈے، موتیے اور دیسی گلاب کے ہاروں سے لدے پھندے، اپنے حواریوں میں گھرے ایسے چل رہے ہوتے گویا فوج کی کمان کر رہے ہوں۔ مجمع اُن کے قریب آنے کا انتظار کرتا۔ جوں ہی وہ جلُوس بڑے جلسے میں آکر شامل ہوتا، اُن کے ڈھول کی دھما دھم یک دم دھم دھم کی تیز گردان میں بدل جاتی اور سارا پروگرام نئے سرے سے شروع ہو جاتا۔ اعجاز اپنی عمر میں میلوں ٹھیلوں کے اندر شامل ہوتا رہا تھا، مگر اِس نوعیت کا اتنا بڑا جلسہ دیکھنے کا موقع اُسے پہلی بار ملا تھا۔ یہ سماں ایسا انوکھا تھا کہ دِل میں اُمنگ پیدا کرتا تھا۔ یہ کس بات کی اُمنگ تھی، اِس کا علم اعجاز کو نہ تھا۔ بس ایک ترنگ کی کیفیت تھی جس سے دِل اُچھلنے لگتا، خیال اُڑان کرنے لگتا، چیزوں کو چاہنے کی خواہش پیدا ہوتی اور زندگی روشن اور پُراُمید نظر آنے لگتی تھی۔ مجمعے کے اندر گھُومتے پھرتے ہوئے آخر ایک موقع پر اعجاز کو دفعتاً اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ شئے جو اس کے خُون میں ترنگ پیدا کرتی تھی وہ ان کسانوں کا رنگ تھا۔ اُن کی آنکھوں میں جو بیباکی تھی، ان کی چال میں جو بے فکری اور آواز میں اعتماد کا جو رنگ تھا وہ اعجاز نے فصل کی کٹائی کے موقع پہ یا کشتی کبڈی کے دنگلوں پر دیکھا تھا۔ مگر وہ صرف وقت کے وقت کو آتا تھا اور موقعہ کے گزر جانے کے بعد ایک بار پھر

کِسانوں کی زندگیوں میں روزمرہ کی قلاشی در آتی تھی، جِس کے ساتھ وہ اپنی اپنی بساط کے مطابق گزارہ کرتے تھے، جیسے کہ صدیوں سے اُن کے آباؤ اجداد کرتے آئے تھے۔ آج اِس اجلاس کے اندر کِسانوں کا انداز کچھ اور تھا۔ ڈھول کی تھاپ پہ اُن کی چال ڈھال نئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دِن رات کی حاجتوں سے چھٹکارا پا چکے ہیں اور اب انہیں اپنے آباؤاجداد کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اِن افراد کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اپنے جدّی ورثے کو ہٹا کر اُس کی جگہ پہ خود آ کھڑے ہُوئے ہیں اور اب یہ بذاتِ خود اپنی نسل کی بنیاد رکھیں گے۔ اعجاز ہجوم کی ریل پیل کے درمیان اپنے آپ سے بے خبر کھڑا اِس احساس کے سنہری لمحوں کا لطف لے رہا تھا۔ اِس عجیب و غریب اُمنگ کی کیفیت میں اِس نے محسوس کیا کہ اِس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا ہے اور خُون کا دوران رگ رگ کو پھڑکا رہا ہے، جیسے کِسی محبوب کی چاہت میں دِل پگھلا جا رہا ہو۔ اچانک اُس کے اِرد گرد مجمعے پہ خاموشی چھا گئی۔ چاروں طرف سے چھوٹے بڑے ڈھول رُک گئے، صِرف مغرب کی جانب سے ایک ڈھول کی تھاپ اُٹھتی رہی جو بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔ سارے جلسے کی نظریں اُس طرف لگی تھیں۔ مائیکروفون پہ ایک نو دس سالہ بچہ کچی سی آواز میں نعت گانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے اِرد گرد خاموشی کو محسُوس کر کے وہ بھی ٹھٹک کر چُپ ہو گیا۔ اب جہاں تک نظر جاتی تھی سَر ہی سَر دِکھائی دیتے تھے جِن کی نگاہیں مغرب سے آنے والے جلوس کی جانب اُٹھی تھیں۔

"شیخ صاحب ہیں؟ ہاں، شیخ صاحب کا جلُوس ہے،" لوگ ایک دُوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "ملک صاحب بھی آئے ہیں" ہاں ہاں، ملک صاحب کیوں نہیں آئیں گے۔ اُن کا اپنا علاقہ ہے۔"

اُن خُوشنود چہروں پہ اُمید کی ایک ایسی جھلک تھی کہ اعجاز کا جی چاہنے لگا جو کچھ بھی اُس کے پاس تھا وہ دے دے مگر ان لوگوں کو مایُوس نہ ہونے دے۔ نیا جلُوس اب قریب آ چکا تھا۔ ہر طرف "کِسان کمیٹی" اور "نیپ" کے بینر سربلند تھے۔ سینکڑوں پاؤں کی ڈھول میں اٹے، ہاروں سے لدے پھندے لیڈر فاتح جرنیلوں کی مانند جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ اس جلُوس کی بل کھاتی ہُوئی لہر دیکھتے ہی دیکھتے بڑے جلُوس میں اِس طرح آ کر مِلی جیسے کوئی پُرشور نالہ دریا میں آ کر شامل ہو جاتا ہے۔ فضا "کِسان مزدُور اتحاد زندہ باد،"

نیشنل عوامی پارٹی زندہ باد، قائد کسان زندہ باد" اور لیڈروں کے ناموں کے نعروں سے گونجنے لگی۔ مجمعے میں ایک شورش تھی جس کی اٹھان پر دھکیلا جاتا ہوا اعجاز اپنے جتھے سے بچھڑ گیا۔ لیڈروں کو اُن کے کارندوں اور جلسے کے منتظمین نے نرغے میں لے کر سٹیج پر چڑھایا۔ نعرے بدستور جاری تھے۔ تین لیڈر جن کے چہرے کانوں تک ہاروں میں پنہاں تھے، چند مقامی معززین کے ہمراہ سٹیج کی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ چھوٹے موٹے لیڈر اپنے اپنے ہار پہنے لکڑی کے سٹیج پر چاروں طرف ٹانگیں لٹکائے، چہرے سامعین کی جانب اٹھائے بیٹھے تھے۔

اعجاز اپنی جگہ پہ کھڑا اشتیاق سے پہلی بار اُن لیڈروں کو دیکھ رہا تھا جن کے اس نے نام ہی سُن رکھے تھے۔ عقب سے کسی نے اُس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ اعجاز نے مڑ کر دیکھا تو بشیر احمد کھڑا تھا۔ اِس کے چہرے پر ہلدی کا رنگ پھیلا تھا۔ اعجاز نے گھبرا کر اپنا ہاتھ بشیر کی پُشت پر رکھا اور اپنے ذہن کی تمام تر قوت ہتھیلی پہ مرکوز کر کے تسلی کی کوئی رَو بشیر کے بدن میں داخل کرنے کی سعی کی۔ اِس سے زیادہ اُس وقت اعجاز کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھا۔ مجمعے کی ہلچل ابھی تھمی نہ تھی۔ کئی منٹ سے سٹیج کے انچارج مائیکروفون پر آ کر لوگوں سے بیٹھنے کی درخواست کر رہے تھے۔ ساہیوال سے ایک نوجوان نے آ کر مزدوروں اور کسانوں کی یکجہتی کے لیے ترنم سے ایک انقلابی نظم پڑھنی شروع کر دی۔ اُس کے بعد ابتدائی مقررین کے نام پکارے جانے لگے، جنہیں ساتھ ہی تلقین کی جاتی کہ وہ دو چار منٹ سے زیادہ کا وقت نہ لیں، کیونکہ جلسے کی پالیسی اور لیڈران کی خواہش کے مطابق زیادہ سے زیادہ مقامی اور علاقائی مقررین کو خطاب کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ انتباہی کلمات کے باوجود، چھوٹے مقرر کو خطاب کے دوران ہاتھ سے پکڑ کر چپ کرایا جاتا اور اگلے آدمی کا نام پکارا جاتا تھا۔ ایک موقعہ پر بشیر کو دیکھ کر اعجاز کے جی میں آیا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر بشیر کا نام مقررین کی فہرست سے محو ہو جائے مگر اُس نے اُس وقت تک اپنا ہاتھ مضبوطی سے بشیر کی پُشت پہ جمائے رکھا جب تک کہ اُس کا نام سٹیج سے پکارا نہ گیا۔ "اب رسالے والا کسان کمیٹی کے سربراہ، کسان حقوق کے انتھک سپاہی، شیخ علی احمد جلسے سے خطاب کریں گے۔۔۔"

اِس اعلان پر رسالے والے کے جتھے سے، جو مجمعے کے مشرقی کونے پر جمع تھا،

ڈھول کی تیز تھاپ اَور "شیخ علی احمد، زندہ باد کے نعرے بلند ہونے شُروع ہُوئے۔ سب لوگوں کے سر، شیخ علی احمد کو دیکھنے کی توقع میں اُس طرف کو مُڑ گئے۔ کئی سیکنڈ گزُر گئے، مگر جتھے سے کوئی شخص برآمد نہ ہُوا۔ نعرے آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ پھر ڈھول بھی خاموش ہوگیا۔ مجمعے سے باتوں کی بھنکار اُٹھی۔ لوگ اُٹھنے بیٹھنے، کپڑے جھاڑنے اَور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ بشیر کی پُشت پر اعجاز کے ہاتھ نے ہولے سے اُسے آگے دھکیلا۔ مائیکروفون پر آدمی نے کہا۔

"شیخ علی احمد صاحب اگر موجُود ہیں تو سٹیج پر تشریف لائیں----"

بشیر نے بیکسی سے آنکھیں اُٹھا کر اعجاز کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ کے اَندر سُرخی کی دھاریاں نمودار ہو رہی تھیں۔

"چلو، تُمھارے اُوپر دباؤ ختم ہُوا،" اعجاز نے سرگوشی میں تسلی دی، "تقریر کی ضرورت نہیں، جاکر علی احمد کا پیغام پڑھ دو، اللہ اللہ خیر سلا، جاؤ۔"

بشیر نے قدم اُٹھایا اَور کمزور چال سے چلتا ہُوا سٹیج کی جانب بڑھا۔ مجمعے کی بھنکار تیز ہوگئی۔ بشیر کو دیکھتے ہی مشرقی کونے سے رسالے کے جتھے کا ڈھول بج اُٹھا اَور چوُہدری بشیر احمد زندہ باد، رسالے والا کِسان اتحاد زندہ باد، ایک بار پھر بلند ہونے لگے۔ بشیر نے اُن کی جانب ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا۔ اعجاز کا دِل دِھک دِھک کر رہا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے بشیر میں گویا جان پڑ گئی۔ وہ ہجوم کے اَندر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سٹیج پر جا چڑھا۔ اعجاز کا دِل خُوشی کے مارے اَور بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بشیر نے سٹیج پر چڑھنے کے بعد ایک آدمی کی مدد سے مائیکروفون کا بچ کھول کر اُسے اپنے قد کے برابر نیچا کیا، اُس کے سامنے اپنا مُنہ جمایا، اَور بولا۔

"کِسان اتحاد کے ادنیٰ خادم، شیخ علی احمد صاحب ناسازئ طبع کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔ مجُھے یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ ان کا پیغام پڑھ کر سُناؤں۔" پھر اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا اَور یکے بعد دِیگرے متعدد نعرے لگوانے شرُوع کیے۔

"کِسان اتحاد۔" وہ چیخا۔

"زندہ باد،" مجمعے نے جواب دیا۔

"جو واہوے،" وہ بولا۔

"اوہو ای، کھاوے۔" مجمع گرجا۔

"قائد کسان۔"

"زندہ باد۔"

"قائد مزدور۔"

"زندہ باد۔"

"شیخ صاحب۔"

"زندہ باد۔"

"ملک صاحب۔"

"زندہ باد۔"

ہر نعرے کے بعد اُس کی آواز میں گرج پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اعجاز حیرت کے مارے مُنہ کھولے گلا پھاڑ پھاڑ کر بشیر کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ جب نعرے ختم ہوئے تو بشیر چند لمحے کو ساکت ہو گیا، جیسے اپنی ہی آواز سے ٹھٹک کر رہ گیا ہو۔ پھر اُس نے ہاتھ میں پکڑے تقریر والے دو کاغذ اپنے سامنے اُٹھائے اَور بولنا شُروع کیا۔ بشیر کے وجُود پہ اعجاز کا انہماک اِس درجہ تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی اُس کو بشیر کی انگلیوں کا ہلکا سا ارتعاش صاف دِکھائی دے رہا تھا جس کے باعث تقریر والے صفحات کپکپا رہے تھے۔ اعجاز کو علی احمد اَور بشیر کے ساتھ اپنی تقریر اتنی بار دُہرانی پڑی تھی کہ خود اُسے زُبانی یاد ہو چکی تھی۔ جیسے جیسے بشیر پڑھتا جاتا تھا، اعجاز کے ہونٹ بے آواز طور پہ ساتھ ساتھ ہلتے جارہے تھے، گویا کسی امام کے پیچھے لقمہ دینے کو تیار کھڑا ہو۔ تقریر کے دوران بشیر کی زُبان صرف ایک آدھ بار ذرا سی لڑکھڑائی، مگر اُس کے لہجے کی مضبوطی بدستور قائم رہی۔ اعجاز کے دِل کی دھڑکن آہستہ آہستہ معمول پہ آنے لگی۔ اُس کے خدشوں کا ہیجان تھمنے لگا۔ جلسے میں داخل ہونے کے بعد پہلی بار بشیر کا دھڑکا اُس کے دِل سے اترنا شُروع ہوا تھا، گویا اُسے یقین آتا جارہا ہو کہ بشیر اب اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو چکا تھا۔ اُس کا دھیان اب گرد و غُبار میں اَٹے ہُوئے مجمعے کی جانب بٹتا جارہا تھا جس کے اَندر وہ پھنسا پھنسایا کھڑا تھا۔ بیساکھ کی کاٹتی ہُوئی دُھوپ میں تپے ہُوئے گرد کے ذرّے سوئی کی نوکوں کی مانند گردن میں سوراخ کر رہے تھے۔ اعجاز کو یہ سوچ کر حیرت ہُوئی کہ بشیر کے اندیشے میں اُس نے گرمی کے اِس

جنم کو ذرہ برابر محسوس نہ کیا تھا۔ اعجاز گو کسان بچہ کسان تھا، مگر اپنی کھلی رنگت اور نسبتاً
سہل زندگی کی نشانیوں کی بدولت اِس ہجوم میں الگ دِکھائی دے رہا تھا۔ وہ سر پہ رومال
پھیلائے، پسینے میں شرابور کھڑا تھا جبکہ اُس کے گرد جلی ہوئی عنابی جلد والے کسان، جن
کے چہروں پہ صرف نمی کی ایک ہلکی سی تہہ چمک رہی تھی، یوں بے خبر بیٹھے تھے جیسے
دلجمعی سے دھوپ سینک رہے ہوں۔ یہ لوگ، اعجاز نے سوچا، ایک الگ قوم ہیں، کٹورہ
بھر لسی پہ دن گزار دیتے ہیں اور پیشاب پیلا نہیں ہونے دیتے۔ اعجاز کی نظر پُشت در
پُشت بیٹھے ہوئے کسانوں سے اُٹھ کر لمحے بھر کو چاندی کے سے لش لش کرتے آسمان پہ
گئی اور خیرہ ہو کر لوٹ آئی۔ اُوپر سے، اِس نے سوچا، آگ برسے یا پانی، ہر حال میں
آسمان سے ان لوگوں کا ساتھ ہے۔ یہ بدن کی کوفت سے آزاد ہیں۔ میں، اُس نے افسوس
کے ساتھ سوچا، جو برحق اِن میں شامل تھا، اِن سے ہٹ چکا ہوں۔

بشیر کی تقریر ختم ہوئی۔ رسالے والے کے دستے سے ڈھول کی تھاپ اور نعروں کی
آوازیں ایک دم سے اِس طرح بلند ہوئیں جیسے گرد کا بھبکا زمین سے اُٹھا ہو۔ باقی کے
جلُوس میں سے چند لوگوں نے اُن کا ساتھ دیا۔ کئی جگہ سے لوگوں نے اُٹھ اُٹھ کر کپڑے
جھاڑے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر بیٹھ گئے۔ بعض لوگ محض جگہ بدلنے کو اُٹھے اور ایک
قدم پرے جا بیٹھے۔ اعجاز کی توجہ رسالے والوں کے نعروں اور ہوا میں اُٹھتے ہوئے بازوؤں
پہ مرکوز تھی کہ اچانک اُس کی کہنی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ بشیر اُس کے سامنے کھڑا تھا۔
وہ فرطِ جذبات سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پیلاہٹ کی بجائے راکھ کا رنگ
پھیلا تھا، جیسے کہ وہ پچھلے چند منٹ کے اندر آہستہ آہستہ بھسم ہوتا رہا ہو۔ مگر اُس کی
آنکھوں میں ایک تیز گرم سی چمک تھی، گویا کسی دبی ہوئی چنگاری نے جان کی رمق کو
روشن کر رکھا ہو۔ اِس غیر قدرتی شکل کو دیکھ کر اعجاز کے دِل میں اُس کے لیے ایک دھڑکتا
ہُوا خدشہ پیدا ہُوا۔ اُس نے جلدی سے بشیر کو بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ چلاتے ہوئے
رسالے والے کے جلُوس کی جانب لے چلا۔ ابھی وہ چند قدم ہی گئے تھے کہ اعجاز نے بشیر
کے چہرے پہ ایک اور نگاہ ڈالی اور رُک گیا۔ معاً اُسے خیال آیا کہ بشیر مجمعے کی شورش کو
سنبھال نہ سکے گا اور ممکن ہے کہ راستے میں ہی ڈھیر ہو جائے۔ اُس نے اپنا رُخ بدلا اور
بشیر کو تھامے تھامے دُوسری جانب سے نِکل گیا۔ بشیر بے احتجاج اُس کے ساتھ ساتھ چلتا

گیا۔ رسالے کا جلوس اپنی کود پھاند میں مصروف تھا۔ سٹیج سے اگلے مقرر کے نام کا اعلان ہوا تو اِس شخص کے جلوس نے ڈھول بجانے اور نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے رسالے والوں کا خروش کچھ دب گیا۔ اعجاز اور بشیر اسی غلغلے کی اوٹ میں ہجوم سے نکل کر سڑک پہ پہنچ گئے۔ اعجاز بشیر کو لیے ٹاہلی کے ایک گھنے درخت کے سایے میں جا کھڑا ہوا۔ پیشتر اِس کے کہ رسالے کے جلوس والوں کی نظریں اُن پہ پڑتیں، سڑک پہ ایک بس آتی دکھائی دی۔ اعجاز نے اُسے ہاتھ دیا اور دونوں اُس پہ سوار ہو گئے۔

جیسے جیسے بس جلسہ گاہ سے دُور ہوتی گئی، بشیر کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ آہستہ آہستہ اِس کی جلد پہ سُرخی کی لہر دوڑنے لگی اور آنکھوں کی چمک معمول پہ آ گئی۔ اُس وقت اعجاز کو احساس ہوا کہ بشیر کی ہڈیوں میں بھری ہوئی جان سخت گیر ہے۔

"علی احمد کارروائی سُن کر بڑا راضی ہو گا۔" اعجاز نے کہا۔

"ہاں،" بشیر کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیلی۔ "خُدا کرے اُن کا بخار اُتر جائے۔"

رستے میں اُنہیں ایک بس بدلنی پڑی۔ چیختی چلاتی ہوئی چُولوں اور پھنکارتے ہوئے انجن والی بس پہ دھچکے کھانے کے بعد جب وہ اپنے چوک پہ اُترے تو ٹھوس زمین پہ قدم رکھتے ہی اُنہیں تومندی کا احساس ہوا۔ اُن کے دِل میں فتح کی سرشاری تھی۔ اعجاز نے دِل میں سوچ رکھا تھا کہ علی احمد شیخ سے ملتے ہی وہ کہے گا۔ جلسہ مار لیا، شیخ۔ اب اُٹھ کے بیٹھ جاؤ۔ رسالے والے کا نام بڑے بڑے لوگوں تک پہنچ گیا ہے۔" اُسے یہ بھی عِلم تھا کہ بشیر اپنے ہیجان کے اندر فوراً ہی بول پڑے گا۔ "شیخ کے نام کا ٹل کھڑک گیا ہے، کیوں چوہدری اعجاز! کیا غلط کہہ رہا ہوں؟ اور،" وہ اپنا چہرہ علی احمد کے مُنہ کے قریب لا کر کہے گا "ملک صاحب اور شیخ صاحب سٹیج پر بیٹھے تالی بجانے لگے تھے۔" یہ باتیں سُن کر علی احمد کا چہرہ کھل اُٹھے گا۔ اُس کے نمایاں تھوتھنی والے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جائے گی اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں چمکنے لگیں گی۔ بدن کے اندر خُوشی کی لہر دوڑنے پر ممکن ہے کہ اُس کا بخار اُتر جائے۔ دُوسری جانب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرطِ جذبات سے اُس کی حالت مزید بگڑ جائے۔ شائید مناسب ہو کہ اتنے زوردار طور پہ جلسے کا احوال پیش نہ کیا جائے؟

ایک عرصے تک اعجاز کی زندگی کے اندر اور باہر ابتلاء کا دَور رائج رہا تھا۔ دِل کی

ناچاقی نے ہاتھ بڑھا کر گھر کے اندر اُنگلیاں پھیلا رکھی تھیں۔ وہاں سے نِکل کر اعجاز نے خلقِ خُدا سے ایک رشتہ استوار کیا تھا۔ اِس دوران اُسے کسی رُخ سے بھی کامرانی کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا لیکن ایک اندرونی قوت تھی جو اُسے اِس راستے پر آگے ہی آگے چلاتی جارہی تھی حتیٰ کہ آج کا دِن آپہنچا تھا۔ دِن بھر کے اعصابی تناؤ کے بعد آخر کامیابی کا احساس ہونے پر اعجاز کے اندر ایک خُوش کُن ماحول پیدا ہو چُکا تھا۔ اِسی کیفیت میں وہ بشیر کے ہمراہ علی احمد کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ دُور سے ہی اُنہیں گلی کا کہرام نظر آگیا۔ گلی کے دہانے پہ ایک کلبلاتا ہُوا ہجوم تھا جس کے اندر مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔

"اللہ خیر کرے بھائی اعجاز" بشیر بولا، "دیکھ رہے ہو؟"

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں دھڑکتے ہُوئے قدموں سے چلتے گلی کے کونے پہ جا کر رُک گئے۔ مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچوں کا مجمع گلی کے اندر تک پھیلا تھا۔ مردوں کی زُبان پہ تھا "حملہ ہو گیا۔ حملہ۔" اور عورتیں پُکار رہی تھیں، "ہائے، بدبختوں نے ظلم کر دیا۔"

اعجاز اور بشیر نے سَر اُٹھا اُٹھا کر گلی کے اندر دیکھا۔ اعجاز نے آخری بار اپنی حسرت ناک کیفیت کے ساتھ چمٹا رہنے کی کوشش میں خواہش کی کہ کاش اِس وقت وہ یہاں موجُود ہونے کی بجائے کسی اور جگہ پر ہوتا۔ مگر اب وقت نہیں تھا۔ وہ دونوں بیتاب ہاتھوں سے مجمعے کو جُدا کرتے ہُوئے آگے بڑھے۔ علی احمد کے گھر کے دروازے پر لوگوں کی پسینے میں بھیگی ہُوئی بھیڑ آپس میں رگڑیں کھا رہی تھی، جس سے دروازے کی چوگاٹھ بھی نم آلُود ہو گئی تھی۔ گھر کے اندر ایک شور تھا۔ بیٹھک کی اکلوتی کھڑکی بند ہونے کے باعث کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ اعجاز اور بشیر بھیڑ کی دھکیل کے بیچ پھسلتے پھسلاتے ہُوئے اندر داخل ہُوئے۔

چار پانچ آدمی علی احمد کی چارپائی پہ جُھکے ہُوئے تھے۔ چارپائی پہ علی احمد اُونچی آواز سے کراہ رہا تھا۔ دو آدمیوں نے اُس کی دائیں ٹانگ کو ہِل ہاتھوں اُٹھا رکھا تھا۔ تیسرا آدمی ایک چوڑی سی پٹی، ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک، پنڈلی کی نلی کے گرد بل دے دے کر کستا جا رہا تھا۔ علی احمد نے کراہتے ہُوئے، اپنے اُوپر جُھکے ہُوئے چہروں میں اعجاز اور بشیر کی شکل دیکھی، مگر پہچان کا کوئی نشان اُن آنکھوں میں پیدا نہ ہُوا۔

"تین جگہ سے ہڈی ٹوٹی ہے۔" ایک محلے دار نے اعجاز اور بشیر کو پہچان کر اطلاع دی۔

"توبہ توبہ" ایک دُوسرا کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا، "ہاکیوں سے مار مار کے نلی چُورا چُور کر دی ہے۔"

گھر کے اندر کُھلنے والے دروازے کا ایک پٹ نیم وا تھا۔ اعجاز اِس گھر کے اندر کبھی نہ گیا تھا مگر اِس وقت وہ ضبط نہ کر سکا۔ وہ علی احمد کی چارپائی سے ہٹ کر گھر کے اندر کُھلنے والے دروازے تک گیا۔ صحن میں عورتوں کے جُھرمٹ کے اندر اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اِس کے سامنے کی دو عورتیں ایک لمحے کے لیئے جُدا ہوئیں تو اُسے ایک جھلک دِکھائی دی۔ زمین پر ایک جسم بے سدھ پڑا تھا جِسے کڑھے ہُوئے سُرخ پھُولوں والی سوزنی سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اُس سوزنی کے دامن سے دو سیاہ پیر جھانک رہے تھے، جو ایک دُوسرے سے اتنی چوڑائی پہ پھیلے تھے کہ معلُوم ہوتا تھا بدن سے چیر کر جُدا کر دیئے گئے ہیں۔ بشیر جو گھر کے اندر آنا جاتا تھا، دروازے سے گزُر کر اعجاز کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اعجاز وہاں سے ہٹ آیا۔ کچھ دیر کمرے میں کھڑا رہنے کے بعد اُس نے دُوسری دیوار کے ساتھ جا کر ٹیک لگائی اور پاؤں کے بل زمین پہ بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا سَر ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ریڑا آ گیا ہے۔" کسی نے آواز دی۔ اعجاز نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گلی میں ایک ہموار پھٹے اور ویگن کے بوسیدہ ٹائروں والی گاڑی کھڑی تھی جس کے آگے خچر جتا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اعجاز نے چھ آدمیوں کو علی احمد کا کراہتا ہُوا جسم اُٹھا کر باہر لے جاتے اور ریڑے پر لادتے ہُوئے دیکھا۔

"سول ہسپتال لے چلو، سول ہسپتال" کئی آوازیں ایک ساتھ اُٹھیں۔

خچر چل پڑا۔

"اور بی بی؟" کسی نے پُوچھا "اوئے مائی کو کون لے جائے گا؟"

"دُوسرے پھیرے،" کسی نے جواب دیا۔ "بات ہو گئی ہے، اِس پھیرے میں جگہ نہیں ہے۔"

اعجاز کو محسُوس ہوا جیسے وہ اِس منظر سے الگ کہیں بیٹھا ہے اور اِس قصے سے اُس

کا کوئی واسطہ نہیں، یا جیسے کوئی خواب خیال کی بات ہو۔ بشیر صحن کی جانب سے داخل ہو کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کے چہرے پر پھر خاک کا رنگ اُڑ رہا تھا۔

"زیادتی کر گئے ہیں،" وہ بولا۔ اعجاز نے خاموشی سے اُس کی بات سنی۔

"آدے والے ہی تھے،" بشیر پھر بولا۔ "حمید کی کرتُوت ہے۔"

اعجاز نے آنکھیں کھول کر بشیر کو دیکھا۔ "بچ گئی ہے؟" اِس نے ہولے سے پُوچھا۔

"ہاں۔ مارا وارا نہیں،" بشیر نے کہا۔ "مگر زیادتی کر گئے ہیں۔"

ایک محلے دار اُن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "چھ آدمی تھے،" وہ بولا۔ "دنا دن گھر میں گھسے اَور منٹوں میں کسب کر کے چلے گئے۔ پرچہ کٹاؤ جی، دیر کیوں کر رہے ہو۔ سارا محلّہ گواہ ہے۔"

"زیادتی کے دَوران شاید گلا دب گیا تھا۔" بشیر نے مری ہُوئی آواز میں کہا۔ "نیلے نشان پڑے ہُوئے ہیں۔ سانس چل رہی ہے۔ اللہ زندگی دینے والا ہے۔"

اعجاز کے اَندر انتقامی جذبہ اِتنی تیزی سے اُٹھا کہ اِس نے چاہا علی احمد اور کنیز میں سے ایک اپنی جان سے چلا جائے تا کہ قتل کا پرچہ ہو، چھوٹے موٹے مقدمے سے تو حمید کی پارٹی بچ نِکلے گی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ جذبہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ اُتنی ہی تیزی کے ساتھ اعجاز کو اَپنی بے بضاعتی کا احساس ہُوا۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں میچ کر سَر گھٹنوں پہ ٹیک دیا۔

کچھ دیر کے بعد بشیر اُٹھ کر گھر کے اَندر چلا گیا۔ جب اعجاز نے گھٹنوں سے سَر اُٹھایا تو کمرہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صِرف دو جوان لڑکے خاموش چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ اعجاز کی آنکھوں کے سامنے وہ بیسیوں منظر گھُوم گئے جب اُس کی آمد پر علی احمد کچھ دیر کے لیے گھر سے چلا جاتا تھا اور اِس کمرے میں کنیز کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوتی تھی۔

بشیر نے صحن کے دروازے سے سَر نکالا۔ "اوئے ریڑے والا کہاں مر گیا ہے؟" اِس نے پکار کر کہا۔

"آ رہا ہے بھائی، آ رہا ہے۔ دو منٹ صبر کرو۔" کسی نے گلی کے دروازے سے جواب دیا۔

"دو منٹ کرتے کرتے گھنٹہ ہو گیا ہے،" بشیر بولا۔ "لڑکی کی جان گلے میں اٹکی

ہے۔ کوئی اَور ریڑا کیوں نہیں پکڑ لیتے؟"

"دو آدمی ریڑے کے پیچھے گئے ہیں بھائی۔ اب کوئی دیر نہیں۔ صبر کرو۔"

محلے دار گلی کے دروازے سے کمرے میں داخل ہُوا۔ "پُلس کو موقعہ دکھلانے سے پہلے باڈی کو اُٹھانا مناسب نہیں۔"

"پُلس کی ماں کی۔۔۔" بشیر نے گالی دی۔ "تُم ریڑے کا بندوبست کرو۔"

بشیر واپس صحن میں چلا گیا۔ محلے دار بڑبڑایا۔ "چاک سے زمین پر جسم کا خاکہ کھینچتے ہیں، تصویریں لیتے ہیں۔ وقوعے کے بارے میں سینکڑوں باتیں ہوتی ہیں۔ کیوں جی؟"

اعجاز بے عِلم سی آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ محلے دار اعجاز کی خالی خالی نظروں سے گھبرا کر پلٹ گیا۔ "تفتیش کے لِئے یہ باتیں ضروری ہوتی ہیں،" جاتے جاتے وہ بولا۔ اعجاز کو یک دم یہ احساس ہُوا کہ ابھی ریڑا آئے گا اَور کنیز کا جسم ہاتھوں میں اُٹھا کر اِسی کمرے کے رستے باہر لے جایا جائے گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اَپنے خیال میں اُس نے یہ منظر دیکھا اَور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ باہر شام پڑ رہی تھی۔ اعجاز کِسی سے بات کئے بغیر گلی سے نِکلا اَور چل پڑا۔

شفاف آسمان پہ آدھے چاند کی روشنی پھَیلی تھی۔ گرم ہوا کے جھونکے خشک کھیتوں سے گرد کے چھوٹے بڑے بگولے اُڑ رہے تھے۔ "آندھی آئے گی،" اعجاز نے بے خیالی سے سوچا۔ صبح کے وقت جب وہ جلسے کے لِئے گھر سے روانہ ہوا تھا تو اپنا بائیسکل پیچھے چھوڑ گیا تھا اَور شہر تک کا چند میل رستہ اُس نے بس پکڑ کر طے کیا تھا۔ اِس وقت واپسی پر تانگے اَور بسیں اُس کے پاس سے گزرتی جا رہی تھیں مگر اُسے سواری کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ پیدل چلتا رہا۔

اعجاز نے دِن بھر سوائے پانی کے دس بارہ گلاسوں اَور چند پکوڑوں کے کچھ بھی حلق سے نہ اتارا تھا۔ دو گھنٹے پہلے علی احمد کی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے اُسے متلی ہونے لگی تھی اَور اسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی اشتہاء ہمیشہ کے لِئے ختم ہو چکی ہے۔ اب گھر میں قدم رکھتے ہی اُسے سخت بھُوک لگنی شروع ہو گئی۔ اِس کے ساتھ ہی اُسے اَپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہُوا۔ گھر کے ماحول سے، اَور سکینہ کے وجُود سے جو نامعلوم سا

خوف اس کے دِل میں بیٹھ گیا تھا، وہ بغیر جانے بُوجھے ہُوئے غائب ہو چُکا تھا۔ اعجاز کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ اُس وقت گھر جائے جب سب کھاپی کر فارغ ہو چکے ہوں۔ اِس کا کھانا چُولہے کے پاس لپٹا لپٹایا پڑا ہوتا تھا جسے وہ اکیلا بیٹھ کر کھاتا اور پھر جا کر چارپائی پہ لیٹ جاتا تھا۔ اُس وقت سکینہ کے پاس پڑوس کی کوئی عورت آ بیٹھی ہوتی۔ گرمیوں کی راتوں میں دونوں عورتیں چارپائی پہ بیٹھی دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتیں۔ اعجاز اکثر اُن کی نیچی نیچی باتوں کی آڑ میں مُنہ پھیر کر سو جایا کرتا تھا۔ آج کوئی دُوسری عورت گھر میں نہ آئی تھی۔ سکینہ اور سرفراز کھانا کھانے کے بعد ابھی چُولہے کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُن کے آگے سالن کی تھالیاں پڑی تھیں جو اُنھوں نے روٹی سے پونچھ پانچھ کر صاف کر دی ہُوئی تھیں۔ اعجاز پہلے اُس چوڑی چارپائی کے پاس رُکا جس پہ جڑواں بھائی حسن اور حسین سو رہے تھے۔ پھر وہ جا کر چولہے کے پاس پیڑھی پہ بیٹھ گیا۔ ذہن کے سُن ہونے نے اُس کے دِل کو بے جھجک کر دیا تھا۔ سکینہ نے اُسے اجنبی سی نظروں سے دیکھا۔

"کیا پکا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"اوجھری،" سرفراز نے جواب دیا۔

اعجاز نے حلق سے ناگوار سی آواز نکالی۔ گھر میں اُنھیں عِلم تھا کہ اعجاز کو اوجھری نہ بھاتی تھی، جبکہ سکینہ اور سرفراز اسے شوق سے کھاتے تھے۔

"کچھ اور ہے؟" اعجاز نے سکینہ سے پُوچھا۔

سکینہ کی بجائے دوبارہ سرفراز نے نفی میں سَر ہلا کر جواب دیا۔ سکینہ نے ادھ جلی لکڑی سے چُولہے کی راکھ اتھل پتھل کر کے چند انگارہ کوئلے ننگے کیے اور اُوپر لکڑی جما دی۔ پھر اُس نے روٹیاں گرم کرنے کو دسترخوان سے تو اصاف کیا۔

"رہنے دو،" اعجاز نے کہا۔ "نرم ہی ہوں گی۔ کھالُوں گا۔"

سکینہ نے خاموشی سے دوبارہ اعجاز پہ نِگاہ ڈالی۔ اُس کی پہلی نگاہ میں جہاں اجنبیت اور ملال تھا، اب دُوسری نگاہ میں اِنکار اور مزاحمت تھی، جیسے کہ اُسے اپنی رنجیدگی کا حق واپس مِل گیا ہو۔ اُس نے اعجاز کی بات اَن سنی کر کے چُولہے میں پھُونک ماری تو لکڑی نے آگ پکڑلی۔ پھر وہ لپٹی ہُوئی روٹیاں ایک ایک کر کے توے پہ سینکنے لگی۔ اُس کے چہرے پہ ناگواری تھی، نظریں دُوسری جانب مُڑی تھیں، اور انداز سے ظاہر تھا کہ جیسے اُس کو کسی

انجان شخص کے لیئے بیگار کرنی پڑ رہی ہو مگر ساتھ ہی اس کے سر کے جھکاؤ اور ہاتھوں کی جنبش میں مکمل دھیان کی کیفیت تھی جیسے کسی گہرے عمل میں منہمک ہو۔ اس نے سرفراز کو سر کا مختصر، لاتعلق سا اشارہ کرکے کہا، "اچار لے آؤ۔"

سرفراز اٹھ کر اندر سے اچار کا پیالہ اٹھا لایا۔ سکینہ نے دوسرے پیالے میں اوجھری کا سالن ڈالا اور منہ دوسری جانب پھیر کے پیالے کو اعجاز کی طرف کھسکا دیا۔ اعجاز لقمے کو بوٹیوں سے بچاتے ہوئے، شوربے کے ساتھ اچار کی پھانک لگا کر کھانے لگا۔

"لالہ! تم اوجھری کیوں نہیں کھاتے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"مجھے پسند نہیں۔"

"پسند کیوں نہیں؟"

"کیوں کی کیا بات ہے؟ مجھے اس سے بو آتی ہے۔"

"لالہ، مزے کی ہوتی ہے۔"

اعجاز برا سا منہ بنا کر کھاتا رہا۔ گاؤں کے ترکھان نے بچوں کے جوڑے کے لیے ایک بھدی سی ریڑی بنا کر دی تھی۔ سرفراز نے اور کوئی کام نہ پا کر پاس کھڑی ہوئی ریڑی پہ دونوں ہاتھ جمائے اور منہ سے چھک چھک کی آواز نکالتا ہوا اسے صحن میں آگے پیچھے دھکیلنے لگا۔ اعجاز بھوک کی شدت سے چاروں کی چاروں روٹیاں کھا گیا۔ سکینہ وہیں بیٹھی منہ پھیر کر اپنے آپ کو پنکھا جھلتی رہی۔ سرفراز نے ریڑی کے کھیل سے اکتا کر نلکے سے پانی پیا اور اپنی چارپائی پہ جا لیٹا۔ کھانا ختم کرکے اعجاز نے پانی پیا، کلی کی اور اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گیا۔

"لالہ، اوجھری کیا ہوتی ہے؟" سرفراز نے سوال کیا۔

"معدہ ہوتا ہے۔"

"یہ معدے میں کیا کرتی ہے؟"

"کھانا ہضم کرتی ہے۔ اوجھری تولیئے کی شکل کی نہیں ہوتی؟"

"ہاں!"

"اس تولیئے کے اندر سے ہاضمہ کرنے والی دوائیاں نکلتی ہیں۔"

"دوائیاں؟"

"ہاں۔"

سکینہ کھانے کے برتن سنبھال کر بچوں کی چارپائی پہ آلیٹی تھی۔ اعجاز کا ذہن معطل تھا مگر ایک صُورت ایسی تھی جو اُس کی آنکھوں کے پردوں پہ منعکس تھی اور ہٹتی نہ تھی، سُرخ پھُولوں والی سوزنی سے نِکلے ہُوئے دو سیاہ پیر جن کی اُنگلیوں کے ناخن زرد تھے، مختلف سمتوں میں مُڑے ہُوئے وہ پیر جو صحن کے فرش پر یُوں دُور دراز پڑے تھے کہ سوزنی کے تلے پھَیلی ہُوئی ٹانگوں کا اَن دیکھا نقشہ اُبھارتے تھے۔۔۔ قینچی کے پھلوں کی سی سیاہ، پٹھے دار مضبوط ٹانگیں! اعجاز کا ذہن مفلوج اَور بدن شل تھا، مگر اُس کے تصور میں آگ لگی تھی۔ چند گھنٹے قبل اُس کے سارے جسم کے اَندر متلی کی کیفیت تھی۔ پھر غضب اَور انتقام کے جذبے نے اِس کی جگہ لے لی تھی۔ اُس کے بعد مرحلہ در مرحلہ اُس کی حالت آخر اِس انہونی کیفیت کو پہنچی تھی جہاں وہ چارپائی پہ لیٹا چھوٹے سے چاند کی روشنی میں ٹکٹکی باندھے سکینہ کو دیکھے جارہا تھا۔ رات گرم تھی اَور سکینہ اُس کے ساتھ والی چارپائی پہ ٹانگیں لمبی پھیلائے سیدھی پُشت پہ لیٹی تھی۔ ململ کے کُرتے میں اُس کے بدن کی گولائیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اُس کے دُودھیا پیر ایک دُوسرے سے مختلف رُخ پہ ڈھلے تھے۔ اعجاز کو علم تھا کہ اُن انگلیوں کے ناخن گول اَور گلابی تھے۔ اگر وہ دُرست ہوش و حواس میں ہوتا تو جس حادثے سے گزُر کر آیا تھا اُس کے بعد اپنی خواہش کے رُخ کی اِس حیرت ناک تبدیلی سے پریشان ہو جاتا۔ مگر اِس وقت اُس کے احساسِ زیاں نے اُس کی گونگی چاہت کو ہر شے سے مُبرّا ایک ایسی زندگی عطاء کی تھی کہ وہ جاکر سکینہ کے پہلو میں لیٹ جانا چاہتا تھا۔ اُس کے دُوسری جانب سرفراز کی چارپائی تھی۔ سرفراز بے حرکت لیٹا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اعجاز نے سوچا کہ سرفراز سو چکا ہے۔ وہ اُٹھنے کو چارپائی سے ہلا۔

"لالہ!" سرفراز بول اُٹھا۔ اعجاز چونک کر اُچھل پڑا۔

"اوئے نامراد، سوتے سوتے دِل ہلا دیتے ہو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں،" سرفراز نے ڈر کے جواب دیا۔

"بولو بولو، کیا بات ہے؟" اعجاز نے سختی سے کہا۔

"مجھے اوجھری سے بُو نہیں آتی۔"

"خُدا کی مار اوجھری پر، اِس کا پیچھا بھی چھوڑے گا یا نہیں؟ سوجا، سویرے تُو نے

سکول نہیں جانا؟"

"لالہ چار چھٹیاں ہو گئی ہیں۔"

"ساری رات جاگنے کی چھٹیاں تو نہیں ہوئیں۔"

"لالہ، میں نے آج سویرے بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"کہ چار چھٹیاں ہیں۔"

"بتایا ہو گا۔ چل اب سو جا۔"

"تیرا لالہ ہوش میں ہو تو کوئی بات یاد رکھے،" سکینہ مُنہ پرے کئے کئے بولی۔
سکینہ کی اِس پہل سے اعجاز کو علم ہوا کہ گو سکینہ کا چہرہ دُوسرے رُخ پہ رہا تھا، مگر اُس عورت کے بدن میں اعجاز کی نظروں کی خبر مسلسل رہی تھی۔

آخر جب چھٹی ساتویں کا چاند ڈھلتا ڈھلتا گھر کی منڈیروں کو آلگا اور آسمان پہ روشنی بجھ سی گئی تو اعجاز نے لیٹے لیٹے سَر موڑ کر سرفراز کے سونے کی آواز پہ کان لگائے۔ سرفراز کی سانس گہری اور ہموار چل رہی تھی۔ اعجاز اُٹھ کر سکینہ کی چارپائی کے برابر جا کھڑا ہُوا۔ اندھیرے میں اُسے دِکھائی نہ دیا کہ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ اعجاز نے جھُک کر دیکھا۔ سکینہ کا چہرہ دُوسری جانب کو مُڑا تھا اور اُس کی آنکھیں کھُلی تھیں۔ اعجاز نے ایک بازو اُس کی کمر کے نیچے اور دُوسرا گھٹنوں تلے داخل کیا اور ہولے سے اُسے پرے کھسکا دیا۔ سکینہ کے بدن نے ہلکی سی مزاحمت کی، جس سے اُس کا وزن معمول سے بھاری اُٹھا۔ اعجاز اُس کے برابر لیٹ گیا۔ اُس کے لیٹتے ہی سکینہ نے پہلو بدلا اور اعجاز کی جانب پُشت کر دی۔ چند منٹ اِنتظار کرنے کے بعد اعجاز نے ایک ہاتھ سکینہ کے پہلو پہ رکھ دیا۔ سکینہ کی جلد میں مہین سی جھرجھری پیدا ہُوئی اور رُک گئی۔ دیر تک دونوں بے حرکت لیٹے رہے۔ پھر نہایت آہستہ آہستہ، جیسے خُون کی حدت سے بدن میں قوت آتی ہے، سکینہ کے بدن میں معمولی سا اکڑاؤ پیدا ہُوا، مگر اُس نے اپنی پُشت نہ بدلی۔ اب نیند اعجاز کے سَر کو اِس طرح چڑھی جیسے زمین کے کسی کونے سے کالی آندھی اُٹھ کر دیکھتے ہی دیکھتے جہان پہ چھا جاتی ہے۔ گرم آسمان پہ ایک ٹیٹری کی ترسی ہُوئی چیخوں کی آواز نے اچانک معصوم بچوں کو خواب میں چونکا دیا۔ سکینہ نے اُنھیں تھپکنا شروع کر دیا۔ اعجاز کو ابھی اِس

بات کا فہم نہیں تھا مگر خواب میں جانے سے پہلے اِس کے بدن میں ایک دُور کا عِلم تھا کہ اِس ایک شام میں اُس پر سے ایک واردات کا گزُر مکمّل ہو چُکا تھا۔ وہ سکینہ کی کمر کے نشیب میں ہاتھ رکھے رکھے سو گیا۔

صبح سکینہ نے رات کی باسی روٹی پہ چٹکی بھر نمک چھڑکا اُور گھی میں تل کرا ُسے چائے کی پیالی کے ساتھ اعجاز کے آگے رکھا تو سکینہ کا رنگ نکھرا ہوا، آنکھیں چمک دار اُور جسم بھرا بھرا باثمرِ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اعجاز کے دِل میں، رات کا پہاڑ گزُرنے کے بعد بھی پہلے روز کی کسک باقی تھی۔ اُسے ایک احساس تھا کہ وقت کِسی طور ہاتھ سے نِکلا جاتا ہے۔ اُس نے حسن کو گود میں لِیے لِیے ناشتہ کیا۔ روٹی ختم کر کے اُس نے دو گھونٹ چائے ختم کی اُور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"میں ابھی آتا ہُوں،" اُس نے سکینہ سے کہا۔ سکینہ اُسے بے تاب سی سوالیہ نظروں سے باہر جاتے ہُوئے دیکھتی رہی۔

"لالہ، میں بھی چلوں؟" سرفراز نے اُچک کر پُوچھا۔

"اونہوں۔ تُم بی بی کے پاس رہو۔" یہ کہہ کر اعجاز دروازے سے باہر نِکل گیا۔

شہر میں علی احمد کی گلی ویران پڑی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ صِرف سولہ گھنٹے پیشتر یہاں پہ ایک طوفان کھڑا تھا۔ اعجاز نے تیسری بار دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے علی احمد کا نو عُمر بھتیجا نِکلا۔ اعجاز علی احمد کے بارے میں دریافت کر رہا تھا کہ پٹ کے پیچھے سے علی احمد کی بیوی کی آواز آئی۔ اُس نے اعجاز کے سلام کا جواب دے کر بتایا کہ اُس کا خاوند ابھی ہسپتال میں ہے۔ اعجاز نے کنیز کے بارے میں پُوچھا تو علی احمد کی بیوی ایک لمحے کو ہچکچائی، پھر بولی، "وہ بھی اُدھر ہی ہے۔" اعجاز سائیکل پہ سوار ہو کر ہسپتال کو چل دیا۔

علی احمد کی داہنی ٹانگ پر ٹخنے سے لے کر آدھی ران تک پلستر لگا تھا۔ ہسپتال کی آہنی چارپائی کے فریم سے ایک رسی لٹک رہی تھی جس کے سِرے سے بندھی ٹانگ بستر سے اُوپر چھت کی جانب اُٹھی تھی۔ علی احمد پُشت پہ سیدھا لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے پہ جگہ جگہ پٹیاں چپکی تھیں۔ اعجاز کے مُنہ سے علیک سلیک کے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ کئی لمحوں تک دونوں گنگ نظروں سے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ اعجاز نے تاسف سے سَر ہلایا اُور علی احمد کی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

"میرا کیا گیا ہے چوہدری،" پھر علی احمد درد سے بولا "دو چار ہڈیاں ہی ٹوٹی ہیں، جڑ جائیں گی،" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے الفاظ ہوا میں اٹکے رہے۔ "میرا کیا گیا ہے چوہدری،۔۔۔ میرا کیا گیا ہے،" اُس نے ہولے سے دُہرایا۔

اعجاز خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے ہمّت نہ ہوئی کہ کوئی اَور بات کرے۔۔۔ آخر بڑی دیر کے بعد اُس نے پُوچھا۔ "پولیس میں رپورٹ کرائی؟"

"کیا فائیدہ؟" علی احمد نے نفی میں سَر ہلایا۔ "ڈاکٹر بھی کہتا ہے رپورٹ کر، رشتے دار بھی کہتے ہیں رپورٹ کرو۔ مَیں کہتا ہوں پُلس کوئی اُن کو پکڑ لے گی؟ اُن کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ پُلس اُلٹا مجھ سے پیسے کھائے گی۔ میری تو درخواست اِتنی ہے کہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس شُکر کروں گا۔" علی احمد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کنیز۔۔۔" اعجاز توقف سے بولا، "اس کا کیس تو سیدھا ہے، ڈاکٹری رپورٹ۔۔۔"

"گواہی کون دے گا؟" علی احمد بات کاٹ کر بولا۔ "میرے گھر کی عورتیں؟ نہیں چوہدری۔ ہم غریب لوگ ہیں، مگر عزّت دار ہیں۔ میرے دادا نے یہ گھر بنایا تھا۔ میرا باپ اِسی گھر میں پیدا ہُوا، مَیں نے بھی یہیں جنم لیا۔ محلّے میں سب سے تعلق واسطہ ہے۔ مردوں کے لِئے جسم پر سوٹے کھانا کوئی بے عزّتی نہیں، مگر گھر کی عورت کو عدالت کا منہ دِکھانا مر مٹنے والی بات ہے۔" علی احمد رُکا، "لڑکی کی بات تو وَیسے بھی ختم ہو گئی۔"

"ختم ہو گئی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"وہ گئی۔"

"گئی؟" اعجاز کا مُنہ کُھل گیا۔ "کہاں گئی؟"

"کوئی خبر نہیں۔ ڈاکٹروں نے ٹیکے لگائے، دیکھ بھال کی، شام کو گولیاں دے کر رخصت کر دیا۔ ابھی میرے بھائی نے آ کر بتایا ہے کہ راتوں رات اُٹھ کر بشیر کے ساتھ نِکل گئی ہے۔ بشیر کے گھر والوں کو بھی علم نہیں کہ کہاں گیا ہے۔"

اعجاز خاموش بیٹھا علی احمد کا مُنہ دیکھتا رہا۔ "کہاں جا سکتے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اُس نے پُوچھا مگر یُوں کہ جیسے ساری دُنیا سے سوال کر رہا ہو اَور جواب کی توقع نہ رکھتا ہو۔

علی احمد ہولے ہولے کراہنے لگا۔ "بشیر ذکر کیا کرتا تھا، اُدھر وہاڑی کی طرف اُس کے رشتہ داروں کو زمین الاٹ ہُوئی تھی۔ ان کا بھتہ خشت ہے۔"

"وہاڑی کے اندر؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"اونہوں۔ کسی چک میں، مجھے عِلم نہیں۔"

اعجاز بے خیالی سے جنرل وارڈ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بستروں پر مریضوں کی ٹانگوں، بازوؤں اور گردنوں کے گرد پلستر ہی پلستر لگے تھے۔ مریضوں کے آس پاس اُن کے عزیز رشتہ داروں کے جمگھٹے تھے۔ زخمیوں کی تعداد اِتنی تھی کہ وارڈ سے باہر اُبلے پڑتے تھے۔ چاروں اطراف کے برآمدوں میں لوگ اپنے اپنے مریضوں کو اپنی چارپائیوں پر اور کچھ زمین پر ہی لٹائے پاس بیٹھے پنکھے جھل رہے تھے۔

"کپاس کا علاقہ ہے،" علی احمد نے کہا۔

"کیا؟"

"وہاڑی۔ بورے والا" وہ بولا۔ "سارا پھُٹی کا علاقہ ہے۔"

"ہاں!" اعجاز آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔

"جب پھُٹی کھلتی ہے تو ایسا دِکھائی دیتا ہے جیسے کھیتوں میں اولے اٹکے ہوں۔"

اعجاز اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے سرسری رخصت لی اور سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔

بڑی سڑک پر سائیکل چلاتا ہُوا اعجاز بے خیالی میں شجاع آباد کا راستہ کاٹ کر گزر گیا۔ اُس کے جسم میں اِتنی قوت تھی کہ کوسوں کوس پیڈل مارتا ہُوا اُڑتا چلا جارہا تھا، گویا کسی مقابلے کی دَوڑ میں شریک ہو۔ جب کئی میل پر جاکر رُکا تو سَر سے پیر تک پسینے میں نہایا گیا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ایسے شہر کا نقشہ جما تھا جِسے اُس نے دیکھ بھی نہ رکھا تھا۔ وہ وہاڑی کبھی نہ گیا تھا۔

دھوپ کی تیزی سے اُس کا چہرہ جل رہا تھا اور سینے کے اندر دم ٹُوٹ چکا تھا۔ اُس نے سائیکل ایک ٹاہلی کے سائے میں کھڑی کردی۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے اور دُور ایک گاؤں کی مٹیالی دیواریں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اعجاز درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کھُلی فضاء اور کڑکتی دھوپوں کی مخلوق تھا، مگر اِس وقت اُس کے اعضاء میں ناتوانی یُوں در آئی تھی جیسے اُن کے اندر کوئی شے ریشہ ریشہ تلف ہو چکی ہو۔ اب

دھوپ اُس کی آنکھوں میں ٹیس پیدا کرنے لگی تھی۔ اُس نے اپنا سَر درخت کے تنے سے ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں کے عقب میں پردیس کے نام اور مقام تحلیل ہونے لگے۔ اُس کا دِل ٹھہرنے لگا۔ ایک انجانی سڑک پر سائیکل کی دیوانی دَوڑ گویا اَپنے جذبوں پہ اُس کی آخری یُورش تھی۔ سایہ دار درخت تلے بیٹھے بیٹھے، بند آنکھوں کے اَندر ہی اَندر، اعجاز کے دِل سے ایک زمانہ گزُر گیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سورج سَر سے ڈھلنے لگا تھا۔ وہ سہارا لے کر اُٹھا اَور تھکے ہُوئے پیروں سے سائیکل کا پیڈل گھماتا ہُوا واپسی کے رستے پر ہولیا۔

حِصّہ چہارم

باب 7

"جیبیں خالی کر دو،" احمد شاہ بولا۔ "چل گامے، تُو پہلے کر۔"

غلام حسین نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریزگاری نکالی اور میز پہ پھیلا دی۔ "کُل ایک روپیہ۔"

"سلیمے،" احمد شاہ نے حکم دیا۔

سلیم نے جیب سے سکّے نکالے اور مُٹھی پہ ہی گن کر میز پر ڈھیر کر دیئے۔

"ایک روپیہ دو آنے۔"

احمد شاہ نے مُنہ سے بولے بغیر اُبرو اُٹھا کر سرفراز کی جانب دیکھا۔ سرفراز نے پیسے جیب سے نکالے اور گن کر میز پہ رکھ دیئے۔

"سرفرازے،" احمد شاہ دھمکا کر بولا۔ "واپس جیب میں کیا ڈال رہا ہے؟"

"اٹھنی ہے۔" سرفراز نے کہا۔

"اس کا قلفہ کھائے گا؟ چل نکال۔"

"اونہوں،" سرفراز نے اُٹھنی جیب میں رکھ لی۔ "کرایہ ہے۔"

"کیسا کرایہ؟"

"کل واپس گھر نہیں جانا؟"

"تُو بس کا کرایہ دیتا ہے؟"

"ہاں۔"

احمد شاہ نے سَر پیٹ لیا۔ "اوئے تو پینڈو کا پینڈو ہی رہا۔ کرایہ کون دیتا ہے؟"

"تین روپے دس آنے ہو گئے،" سلیم نے سارے سکّے میز پہ اکٹھے کرتے ہوئے کہا، "تیرے پاس کتنے ہیں، شاہ؟"

"احمد شاہ نے ہاتھ قمیض کی بغل والی جیب میں داخل کیا۔ جب نکالا تو اُلٹی جیب اندر سے نکلتی ہوئی آئی۔ اُس کی اُنگلیوں میں چند سکّے تھے۔ "میرے پاس تو یہی کچھ ہے۔" اُس نے سکّے سلیم کی ہتھیلی پہ رکھ دیئے۔

"بارہ آنے؟" سلیم نے پُوچھا۔
"دیکھ لو،" احمد شاہ اُلٹی جیب کا کپڑا، جس کی سلائی میل کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھی، ہاتھ سے پھٹک کر دکھاتے ہُوئے بولا۔ "ساڑھے چار تھوڑے ہیں؟"
"پیٹ بھی نہیں بھرے گا" غلام حسین نے مُردہ سے لہجے میں کہا۔
"مَیں نے کہا تھا آج فیشن ہو گا" احمد شاہ مکا ہُوا میں لہرا کر بولا، "تو ساڑھے چار میں فیشن ہی ہو گا۔"
"کیسے ہو گا؟"
"میرے اُوپر چھوڑ دو، بس چلے آؤ۔"
لڑکوں نے چارپائیوں سے ہلنے میں توقف کیا، وہیں بیٹھے بیٹھے کمرے کے نم اندھیرے میں دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے جھک جھک کر زمین پر نظریں دوڑائیں جیسے جُوتوں کی تلاش میں ہوں گو جُوتے سامنے ہی رکھے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُٹھے اور موم بتی کی رَوشنی میں احتیاط سے چلتے ہُوئے دیوار تک گئے، جہاں ایک کے بعد دُوسرے نے چھوٹے سے شیشے کے سامنے ست روی سے بالوں میں کنگھی کی۔ صِرف غلام حسین، جس کے سَر پہ لوہے کے باریک تاروں کے سے بالوں کی ٹوپی بنی ہُوئی تھی جس نے کبھی کنگھی کی شکل نہ دیکھی تھی، اپنے بُوٹوں پہ جُھکا مَیلے کپڑے سے اُنہیں چمکانے کی کوشش کرتا رہا۔
"دُودھ رس منگوا کر کھا لیتے ہیں۔" سلیم نے کہا۔
"اونہوں،" احمد شاہ نے بڑا سا سَر ہلایا۔ "کہیں بیٹھ کر کھاتے ہیں، کل پتا نہیں کیا ہو۔"
مگر احمد شاہ کی آواز میں پہلا سا زور نہ رہا تھا۔ باقی تینوں لڑکے کمرے میں اِدھر اُدھر کھڑے تھے گویا مستقبل کی تمام تر اُمید کھو چکے ہُوں۔ چند میل کے فاصلے پر میدان کارزار گرم تھا۔ جنگ کو چھڑے ہُوئے آٹھواں روز تھا۔
بلیک آؤٹ کا سائرن آدھ گھنٹہ ہُوا بج چکا تھا۔ اِس کے دس منٹ کے بعد بجلی بھی چلی گئی تھی۔ میز پر ایک ٹرانزسٹر ریڈیو بیٹری کے زور پہ چل رہا تھا جس کی آواز ہلکی کر دی گئی تھی، مگر محاذ جنگ کی خبریں نشر کرنے والے آدمی کی آواز بھاری اور بارُعب تھی۔

لڑکے اُس کی سنی ان سنی کر رہے تھے جیسے ٹن ٹن کر آتا چلے ہوں۔ سرفراز نے کھڑکی پہ لٹکے ہوئے کونے کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ باہر گلی میں اندھیرا تھا۔ احمد شاہ نے پھونک سے موم بتی بجھادی۔ کمرے سے نکل کر اُس نے کنڈی لگائی اور تالا چڑھا دیا۔ چاروں لڑکے تاریکی میں سیمنٹ کی سیڑھیوں پر جما جما کر قدم رکھتے ہوئے اُترنے لگے۔ اُن کا چوبارہ تیسری منزل پہ تھا۔ دُوسری منزل کے ایک کمرے میں اُسی کالج کے چند سینئر لڑکے رہتے تھے۔ سرفراز اور اُس کے ساتھی جب اُن کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو اندر سے اُونچی آوازیں سُنائی دیں جیسے کوئی جوش میں آ کر بول رہا ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ریڈیو کے ڈائل کی کمزور سی روشنی اور جلتے ہوئے سگریٹوں کے تین نقطوں کی لَو میں پانچ نوجوان چہروں کے دُھندلے سے خدوخال دِکھائی دے رہے تھے۔

"حرام کی مَوت ہے۔" بولنے والے کی آواز میں غصّے اور افسوس کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"چھوڑ یار،" دُوسرے لڑکے نے کہا "ایسی بات نہ کر، تُو نے اپنی ڈیوٹی ادا کر دی ہے۔ قوم پر سخت وقت آیا ہے۔ خُدا کا شُکر کر کہ بچ کر آ گیا ہے۔"

"اب کوئی میرا ٹینٹوا دبا کے کہے تو پھر بھی اُدھر کا رُخ نہ کروں،" پہلے نے بات جاری رکھی۔ "وہاں کوئی پُوچھنے والا ہی نہیں۔ ہنہہ! فرشتے!"

احمد شاہ اور اُس کے دوست آگے چل پڑے۔ کمرے میں ریڈیو کی نہائیت ہلکی آواز پس منظر میں شہید ہونے والوں کے نام گنا رہی تھی۔

"باجوہ ہے،" سلیم نے گلی میں پہنچ کر بتایا۔

"کون باجوہ؟"

"وُہی تھرڈ ایئر والا، کیمسٹری کے ڈیمانسٹریٹر کا بھائی۔"

"اِتنی تقریر کیوں کر رہا ہے؟"

"والنٹیروں میں گیا تھا۔ بڑا زِچ ہو کر آیا ہے۔"

"اچھا!" احمد شاہ نے سَر ہلا کر کہا۔ "والنٹیر بن کر گیا تھا، پھر روتا کس لیئے ہے؟"

"کہتا ہے اُدھر کوئی پُوچھنے والا نہیں تھا۔"

"تو کیا بینڈ باجے کے ساتھ اِن کا اِستقبال ہوتا؟ جنگ ہے، کوئی میلہ تو نہیں لگا۔"

"دُکھتا ہے دِن رات مزدوروں کی طرح ایمونیشن کے کریٹ ڈھوتے رہے اَور کسی نے پانی تک نہ پُوچھا۔ بم دھماکوں کے اندر سڑک پر بھوکا پیاسا چھوڑ گئے۔"
"تمہیں اُس نے یہ سب کچھ بتایا ہے؟"
"دوپہر کو ہوسٹل میں عمران کے کمرے میں بیٹھا تھا۔"
"جھوٹ بولتا ہے۔" سرفراز نے کہا۔ "ڈر کر بھاگ آیا ہے۔"
"دوپہر کو وہاں پہ تین چار اَور والنٹیر بھی تھے،" سلیم نے کہا، "وہ بھی یہی کچھ کہہ رہے تھے۔"
"کیا کہہ رہے تھے؟"
"کہ جاتی دفعہ کہا گیا تھا کھانے پینے اَور رہنے کا بندوبست ہوگا۔"
"مَیں کہتا ہُوں ڈر کر بھاگ آئے ہیں،" سرفراز نے جوش سے کہا۔
"چُپ کر یار!" احمد شاہ نے کہا، پھر وہ سلیم سے مخاطب ہُوا، "اچھا اَور کیا کہتے تھے؟"
"اِس کے علاوہ ڈیلی الاؤنس کا بھی وعدہ تھا۔ وہاں جاکر کسی نے خیر خبر بھی نہ لی۔ لاوارثوں کی طرح سامان ڈھو ڈھو کر مرگئے، نہ روٹی نہ پانی۔"

چاروں لڑکوں پر اچانک خاموشی چھا گئی۔ گلیاں تاریک تھیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ پر سرفراز کا پاؤں اُلٹ پڑا۔ اُس کے ٹخنے سے درد کی ٹیس اُٹھی تو اُس کے مُنہ سے گالی نِکلی۔ اُس کے دِل میں ایک نامعلوم سا غُصہ بل کھا رہا تھا۔ اُسے احساس ہُوا کہ کونوں کُھدروں میں چھپی ہُوئی تاریکیاں عجیب و غریب شکلیں اختیار کرکے اُسے گھور رہی ہیں۔
"کدھر جارہے ہو یار؟" وہ تیز لہجے مَیں بولا۔ "میں تو اِن گلیوں میں پہلے کبھی نہیں آیا۔"
"بس چلے آؤ،" احمد شاہ نے کہا، "تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔"
"کہاں لے کر جارہے ہو؟"
"مجھے اِس نانبائی کی دُکان کا پتا ہے جس کا کھانا سارے شہر میں مشہور ہے۔"
"مشہوری تو زہر کھلانے والوں کی بھی ہو جاتی ہے،" غلام حسین نے کہا۔
"نہیں۔ اِس کا کھانا کمال کا ہے، سستا اَور مزیدار۔"

دو چار مزید تنگ گلیوں سے گزرنے کے بعد آخر احمد شاہ ایک چوڑی سی دُکان کے آگے رُک گیا۔ دکان کی ساری چوڑائی پر بھاری ترپال لٹک رہی تھی جس کے کناروں سے مدہم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ احمد شاہ نے ایک طرف سے ترپال اُٹھائی اور چاروں لڑکے ایک دُوسرے کے پیچھے دکان میں داخل ہو گئے۔

"آؤ باؤ جی، بیٹھو۔ اوئے جیریا۔" ٹُوٹے ہُوئے دانتوں اور بڑھی ہُوئی ڈاڑھی والے نانبائی نے آواز دی۔ "جامیز صاف کر۔"

احمد شاہ نے اپنے ساتھیوں کو میز پر جا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بے تکلفی سے دو بڑے دیگچوں کے ڈھکنے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے نانبائی سے بات کی اور آ کر چوتھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ دُکان کی چوڑائی ہی چوڑائی تھی، جس کے مُنہ پر ایک جانب نانبائی اپنے دیگچے، تھالیاں اور دُوسری اشیاء لئے بیٹھا تھا، اور دُوسری طرف تنور تھا۔ پیچھے تنگ سے مستطیل فرش پر لکڑی کی چھ بے روغن میزیں اور کرسیاں ایک دُوسری سے لگا کھاتی ہُوئی رکھی تھیں کہ معلُوم ہوتا تھا جیسے بھیڑ لگی ہے۔ صِرف دو میزوں پہ گاہک بیٹھے تھے۔ ایک پہ دو اور دُوسری کے گرد تین، میلے میلے کپڑوں والے اوھیڑ عُمر مرد جو شباہت سے مزدُور معلُوم ہوتے تھے۔ جیرے نے میلی ٹاکی سے رگڑ رگڑ کر میز صاف کی تھی، مگر اُس کی سطح پر چکنائی کی مستقل تہہ چڑھی تھی جو کِسی طور اُتر نہ سکتی تھی۔ اِس میں سے باسی سالن کی بُو آ رہی تھی۔

"گرم گرم روٹیاں لگا بئی۔" نانبائی نے دُبلے پتلے تنورچی کو، جس کے چہرے پہ دھوئیں کی سیاہ راکھ جمی تھی، ہدایت کی۔ چند منٹ میں جیرا چنے کی دال کی چار، پلیٹیں لے آیا۔ اُنہیں میز پہ رکھ کر وہ واپس گیا اور سالن کی چار پلیٹوں کی طشتری اُٹھائے لایا۔ سلیم نے جُھک کر اپنی پلیٹ کا معائنہ کیا۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"عینک، عینک، عینک۔" احمد شاہ اور غلام حسین نے ایک ساتھ گردان کی۔ یہ مذاق اُس وقت سے تھا جب سلیم پہلے پہل اُن کے ساتھ شامل ہوا تھا اور اُس نے نئی نئی نظر کی عینک لگوائی تھی۔ وہ اپنی عینک اِدھر اُدھر رکھ کر بُھول جایا کرتا تھا اور ڈھونڈتے ہُوئے عینک، عینک کی رٹ لگانی شروع کر دیتا تھا۔ دکان میں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔

ایک نانبائی کے سر پہ اور دُوسری میزوں کرسیوں والی جگہ پہ دیوار سے لٹک رہی تھی، جن سے چھوٹتی ہوئی مٹی کے تیل کی بُو دُکان میں پھیلی تھی۔ سلیم نے جیب سے عینک نکالی اور آنکھوں پہ اٹکا کر مدہم روشنی میں سالن کی پلیٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ مگر جیسے ہی وہ پلیٹ پر جُھکا، ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آ آ آ ---" وہ چہرہ چھت کی جانب اُٹھا کر اندوہناک آواز میں بولا۔

"اوجھری!"

احمد شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "کھا کر تو دیکھ۔"

"زہر کھاؤں گا، یہ نہیں کھاؤں گا" سلیم نے کہا۔

"اوئے پینڈو، دُور دُور سے لوگ اِسے کھانے کے لِئے یہاں آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، پشاور سے آتے ہیں۔" غلام حسین بولا۔

"جتنے دھپے اِس کی مخالفت میں مَیں نے اپنی ماں سے کھائے ہیں تُجھے پتا چلے تو رونے لگ پڑے۔"

تینوں لڑکے ہنسنے لگے۔ سلیم نے اوجھری کے سالن کی پلیٹ احمد شاہ کی طرف کھسکا دی۔

"یہ لے، تُو اسے کھا۔"

"ارے چکھ کے تو دیکھ۔"

"چکھ لیتا ہوں، مگر پھر نہ کہنا میز پر قے کیوں کر دی ہے۔"

"چھوڑ یار،" سرفراز ناگواری سے احمد شاہ کو مخاطب کر کے بولا۔ "نہیں کھاتا تو نہ کھائے، ہمارا کیا جاتا ہے۔"

تینوں لڑکوں نے تشویش سے سرفراز کو دیکھا۔ "تُجھے آج کیا تکلیف ہو رہی ہے؟" غلام حسین نے کہا۔

"کھانا سامنے رکھ کر ایسی باتیں سنتے کا تُجھے تو بڑا مزا آ رہا ہو گا۔" سرفراز بولا۔

نانبائی کا لڑکا جیرا گرم گرم روٹیاں لے آیا۔

"چلو یار، مزا خراب نہ کرو۔ بسم اللہ کرو۔"

"مَیں آپ کو اپنے بچپن کا ایک قِصّہ سناتا ہوں۔" سلیم بولا۔ "یہ ہمارے قصائی

اور اوجھری کی کہانی ہے۔" وہ چپ ہو رہا۔

"بول بول، کیا کہانی ہے؟"

"مختصر کہانی ہے یعنی شارٹ سٹوری۔"

"سُنا نا۔"

"وہ اوجھری سے پسینہ پونچھا کرتا تھا۔" سلیم نے کہا۔

"پھر؟"

"بس۔ یہ شارٹ سٹوری ہے۔"

کسی نے ہنسنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سب روٹی توڑ توڑ کر کھانے میں مصروف تھے۔ دو سفید پوش قسم کے آدمی دکان میں داخل ہوئے۔

"آؤ باؤ جی، جی آیاں نوں۔ بیٹھو" نانبائی نے کہا۔ "او جیرے۔۔۔"

دونوں آدمی آکر ایک میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے اور نانبائی کے لڑکے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ باقی تینوں میزوں سے جبڑوں کی چپ چپ کی آواز اٹھ رہی تھی۔

"یہ فرشتے کا کیا قصہ تھا؟" احمد شاہ نے کھاتے کھاتے پوچھا۔

"کون سے فرشتے کا؟"

"باجوے نے کہا تھا۔"

"ہاں" سلیم نے جواب دیا، "کہتا تھا ہمیں یقین سے بتایا گیا تھا کہ بموں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، دشمن کے بم کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ آسمان سے سبز کپڑوں میں ملبوس فرشتے آئیں گے اور ہندوؤں کے بموں کو ہوا میں ہی پکڑ کر دریا میں گرا دیں گے۔ کہتا ہے وہاں نہ کوئی فرشتہ تھا نہ فرشتے کی ہوا۔ بموں اور توپوں کے دھماکوں سے اُن کا پیشاب خشک ہو گیا تھا۔"

احمد شاہ آہستہ سے ہنسا۔

"بھلا جیسے فرشتوں کو بم اٹھانے کے سوا اور کوئی کام نہیں" غلام حسین نے کہا۔

"کیوں نہیں" سرفراز تیزی سے بولا۔ "خدا کی مرضی ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"پھر فرشتے بم پکڑنے کو کیوں نہیں آئے؟" سلیم نے پوچھا۔
"آئے ہوں گے،" سرفراز نے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ دکھائی دیں۔ اُن کو جتنے بموں کا حکم تھا وہ پکڑ لئے، باقی کے چھوڑ دیئے۔"
"تو گویا یہ فرشتوں کی خفیہ پولیس تھی، جو دکھائی نہیں دیتے۔" سلیم بولا۔
"جو لوگ ڈر کر میدان سے بھاگ آتے ہیں انہیں باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔"
سرفراز کے تیور دیکھ کر احمد شاہ نے دونوں لڑکوں کو آنکھ کا اشارہ کیا تو سب بات چھوڑ کر کھانے پہ توجہ دینے لگے۔ اچانک بلیک آؤٹ کے خاتمے کا سائرن بج اٹھا۔
"آہا آ---" لڑکوں کی میز سے خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔
"اوئے جیریا" نانبائی نے مختصر سی تالی بجا کر آواز دی۔ "پردہ اٹھا دے۔"
جیرے اور تندورچی نے دونوں بازو پہ لٹکتی ہوئی رسیاں پکڑ کر کھینچیں تو پردہ دہرا ہو کر اٹھتا چلا گیا۔
"چاچا، ترپال پر بڑا خرچہ آیا ہوگا" سفید پوشوں میں سے ایک نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔
"نئیں باؤجی، یہ تو پندرہ سال پہلے کی ہے۔ رمضان شریف کے مہینے کے لئے لی تھی۔ اب بلیک آؤٹ کے کام بھی آجاتی ہے۔"
"چاچا، برف تو کچھ اور بھیج۔" احمد شاہ نے پانی کے آہنی جگ کو ہاتھ سے محسوس کر کے کہا۔
"برف تو ختم ہے باؤجی، برف خانے والوں نے کوٹہ آدھا کر دیا ہے۔ اِس جنگ نے سارا نظام خراب کر دیا ہوا ہے۔ اللہ ہندستان کا بیڑا غرق کرے۔"
چاروں نے پلیٹیں صاف کر کے پانی کے گلاس چڑھائے اور اطمینان سے ڈکار لیے۔ احمد شاہ اور غلام حسین نے اپنے اپنے سگریٹ سلگائے۔ وہ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ برقی رَو پلٹ آئی۔ اب اُن کی میز سے دوبارہ فتح کا نعرہ بلند ہوا۔
"آہاہا---"
دکان چھوڑنے سے پہلے احمد شاہ نے کھانے کے پیسے ادا کیے۔ گلی میں نکل کر سلیم

نے پُوچھا۔ "کتنا بل بنا؟"

"سچ بولوں یا جھوٹ۔"

"سچ۔"

"یار سچ ہمیشہ نقصان دیتا ہے مگر خیر، جنگ کا زمانہ ہے، جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ دو روپے دس آنے۔"

"کس حساب سے؟"

"چار چار آنے کی دال، چھ چھ آنے کی اوجھری، دوّنی مَیں نے جیرے کو دی ہے۔ ہمیشہ دیتا ہوں۔"

"اور روٹیاں؟"

"روٹیاں مفت۔"

"ہیں؟ روٹیاں مفت، اِسی لئے بھاجی کے پیسے زیادہ لیتا ہے۔"

"باقی پیسے نکالو۔"

"کون سے باقی پیسے؟"

"پونے دو روپے۔"

"وہ میری کمیشن۔"

"اوئے، کمیشن کا لگتا۔" سرفراز بولا۔

"وہ میری سگریٹ کی ڈبی کے پیسے۔"

احمد شاہ کی بات ختم ہونے سے پہلے تینوں لڑکے اُس پہ ٹُوٹ پڑے۔ اُس نے لڑکوں کی گرفت سے نِکل بھاگنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے اُسے گھیر کر دبوچ لیا۔ احمد شاہ نے اپنی قمیض کی جیب کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور پاؤں کے بل زمین پہ بیٹھ کر سَر کو کہنیوں اور گھٹنوں کے بیچ چُھپا لیا۔ اُوپر سے تینوں لڑکے اُس کی کلائیاں کھینچ کھینچ کر جیب اِس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر غلام حسین نے اُس کی کمر کو بازوؤں کے حلقے میں کسا اور گھسیٹ کر اُسے زمین پہ لٹانا چاہا مگر احمد شاہ جو ہر ایک کو طنزیہ طور پہ پینڈو کے لقب سے پکارتا تھا، خود ایک خالص اور تنومند کسان تھا۔ جسمانی طور پہ وہ اپنے تینوں ساتھیوں سے زیادہ زور آور تھا۔ اسی لِئے جب کالج کے پہلے سال میں اُن

چاروں کی آپس میں دوستی ہُوئی تو احمد شاہ کو اُن کے طور پہ لیڈر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جب سال کے اختتام پہ ہوسٹل کی زندگی اور اِس کے ضابطوں سے تنگ آئے ہُوئے لڑکوں نے مشورہ کیا تو پرائیویٹ کمرہ لے کر رہنے کی تجویز بھی احمد شاہ نے ہی پیش کی تھی۔ وہ اکثر باقیوں سے چھوٹی موٹی رقوم کی مُفت خوری کیا کرتا تھا اور کمال سینہ زوری سے کرتا تھا، مگر اِس میں دوستی کا حق بھی شامل ہوتا تھا۔ دُوسرے بھی اُس کے حق کو قبول کرتے تھے، کیونکہ کالج کی زندگی کی چھوٹی بڑی چپقلشوں کے اندر احمد شاہ اُن کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اِسی وجہ سے کالج میں کوئی اُن پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

احمد شاہ نے جب اُن تینوں کا اکٹھا بوجھ اَپنے اُوپر محسُوس کیا تو پھر اُس نے اِس کھیل کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ ایک زوردار پچھاڑ کے ساتھ وہ کُود کر اُن کے چنگل سے نِکل بھاگا۔ تینوں لڑکے بے دِلی سے اُس کے پیچھے دَوڑ پڑے۔ گلی کی نکڑ پر اُنھوں نے احمد شاہ کو جالیا۔ چند منٹ تک مزید دِکھاوے کی ہاتھا پائی ہُوئی، پھر سب کے سب صُورتِ حال کو تسلیم کر کے گھر کے راستے پہ چل پڑے۔ اُن کے ایف۔ اے کے اِمتحان چار ماہ پہلے ختم ہو چُکے تھے، مگر نتیجہ ابھی نہ نِکلا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ تیسرے سال میں مشروط داخلہ لینے کے لِئے کالج آئے تھے کہ جنگ چھڑ گئی۔ روانگی کے وقت وہ کمرہ چھوڑ گئے تھے۔ خُوش قسمتی سے اُن کی واپسی پر کمرہ ابھی خالی تھا۔ کالج ایک دِن کے لئے کُھل کر غیر معین عرصے کے لِئے بند ہو چُکے تھے چُنانچہ اُنھوں نے واپس اَپنے اَپنے گھروں کو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں لڑکے جُوتوں سمیت اَپنے اَپنے بستر پہ گر پڑے۔ اِرد گرد کے کوٹھوں پہ لوگ ہوائی جنگ کا نظارہ کرنے کی اُمید سے مایُوس ہو کر نیچے اُتر رہے تھے۔ ایک خُوش کُن شام کے اختتام پہ لڑکوں کے اعضاء میں خُوشگوار تھکن کا احساس تھا اور دِل میں بِچھڑ جانے کی ہلکی اداسی تھی۔ احمد شاہ نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کا بیٹری والا بٹن نکالا اور بجلی والا دبا دیا۔ قومی ترانے بج رہے تھے۔

"یار اِس کو بند کرو،" غلام حسین نے کروٹ لے کر کہا، "نیند آئی ہے۔"

"ناں!" سرفراز نے کہا، "ابھی نُورجہاں آئے گی۔"

"نُورجہاں کو سُن سُن کر ابھی تیرا شوق پُورا نہیں ہوا؟ میرے تو کان پک گئے ہیں۔"

دو ہفتے ہو گئے ہیں کوئی کام کا گانا نہیں سُنا۔ دن رات یہی ہُو ہا لگی رہتی ہے۔"

"تُو کانوں پر چادر لپیٹ کر سو جا،" سرفراز نے کہا، "بھینس کے آگے بین بجانے کا کیا فائیدہ۔"

"بُڑ بُڑ نہ کر، ابھی تجھے بتاتا ہُوں بھینس ہوں کہ بھینسا۔"

"اوئے واہ، اُٹھنے کی تیرے اندر ہمت نہیں اَور باتیں بڑھ بڑھ کے کرتا ہے۔"

"پینڈو، جوتے تو اُتار کر سوؤ۔" احمد شاہ بیچ میں بولا۔

"یار کیا بکواس لگا رکھی ہے،" سلیم نے تنگ آ کر کہا۔ "چُپ کرو، تُمھاری ہر وقت کی تُوتُو مَیں مَیں کان کھا گئی ہے۔ شاہ، یار ریڈیوئے کی آواز نیچی کر دے، اِن دونوں کو صبر آ جائے۔"

"ہاں بھئی، آئن سٹائن صاحب کو سوچ بچار کی مُہلت چاہیے۔" سرفراز نے کہا۔

"شاہ جی، آئن سٹائن فزکس کا معمہ حل کر رہا ہے،" غلام حسین بولا۔ "دو سال ہو گئے ہیں، ابھی شُروع میں ہی اٹکا ہُوا ہے۔"

اب وہ دونوں اپنی لڑائی چھوڑ کر سلیم کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ احمد شاہ نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کی آواز کم کر دی۔

"ایک سگریٹ تو دو شاہ جی،" غلام حسین نے کہا۔

احمد شاہ نے ڈبی سے سگریٹ نکال کر سلگایا اَور غلام حسین کی جانب اُچھال دیا۔ غلام حسین نے جلتا ہُوا سگریٹ ہاتھوں کے پیالے میں پکڑا اَور تیزی سے اُٹھا کر اُنگلیوں میں دبوچ لیا۔ پھر بھی اُس کی ہتھیلی میں ایک جگہ پہ جلن اُٹھ گئی جسے وہ تکیے پہ رگڑ کر سہلانے لگا۔ احمد شاہ نے اَپنے لِیے دُوسرا سگریٹ سلگایا اَور کش لینے لگا۔ کمرے میں اب خاموشی تھی۔ کچھ دیر کے بعد غلام حسین نے کہا۔

"ایک بات ہے شاہ جی۔ دال تھی بڑی مزیدار۔"

"مجھے تو اُس کی اوجھری پسند ہے۔" احمد شاہ نے کہا۔

"روٹیاں واقعی مفت دیتا ہے؟"

"ہاں۔ پہلے تین آنے کی دال اَور آنے کی روٹی دیتا تھا۔ پھر دال چار آنے کی کر دی اَور روٹیاں مفت، جتنی بھی کھاو۔ وَیسے دو سے تین کھاو تو مذاق میں کہہ جاتا

ہے، لگتا ہے باؤ جی بُھوک رکھ کر نہیں کھاتے۔"

غلام حسین ہنسا۔

"ساتھ ہی اُس نے اوجھری بھی شروع کر دی،" احمد شاہ نے بات جاری رکھی،
"مفت روٹیوں کے لالچ میں لوگوں نے دو دو سالن کھانے شروع کر دیئے۔"

"ہوشیار آدمی ہے،" غلام حسین نے کہا۔

سلیم دیوار کی طرف مُنہ کئے لیٹا خرانے لینے لگا تھا۔ احمد شاہ اور غلام حسین نے سگریٹ ختم کر کے فرش پہ بجھائے تو احمد شاہ نے بجلی بجھا دی۔ ساتھ ہی ریڈیو بند کر دیا۔ اب کمرے میں تاریکی تھی۔ شام کو خُوش وقتی پہ ختم ہُوئی تھی مگر مستقبل کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت سب پہ طاری تھی۔ ہندوستان کی دُشمنی اور اُس کے روبرو مزاحمت کے جذبات دِلوں میں موجزن تھے۔ آخر اعصاب کی تھکاوٹ اُن پہ غالب آگئی اور نیند نے اُنھیں پناہ میں لے لیا۔۔۔ سوائے ایک سرفراز کے۔

سرفراز کی آنکھیں یُوں وا تھیں جیسے کہ اُنھوں نے نیند کا مزا کبھی چکھا ہی نہ ہو۔ شروع شام سے اُس کے دِل میں ایک نامعلوم سے غُصّے کا اُبال تھا جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سَر اُٹھاتا اور پھر دب جاتا تھا۔ اب تاریکی ہونے پہ وہ رُوپوش لاوا تنمارہ گیا تھا اور بُجھائے نہ بُجھتا تھا۔ خُشک آنکھوں کے عقب میں صِرف دو عکس تھے۔ جنگ، اور اوجھری۔

جب اُس نے دیکھا کہ سب سو چکے ہیں اور خرانوں کی آوازیں تینوں جانب سے پیدا ہو رہی ہیں تو سرفراز نے حسب عادت اپنے اندر ہی اندر بولنا شروع کر دیا:

دو چار ماہ کی بات نہیں، دو چار برس کا قصّہ ہے، مگر یُوں جیسے ایک ہی وقت میں ایک ساتھ میرے سامنے کھڑا ہے۔ مُجھے اِس کی ایک ایک بات دِکھائی دے رہی ہے۔ اُس رات کو جب اوجھری پکی تھی اور لالے نے اچار کی مدد سے روٹی کھائی تھی تو ایک لمبے عرصے کے بعد مَیں نے آخر لالے کو بی بی کے ساتھ لیٹے ہُوئے دیکھا تھا۔ آدھی رات کے وقت میری آنکھ کُھل گئی تھی۔ آسمان پر ٹیری بولتی ہی جارہی تھی۔ لالے کا بستر خالی تھا۔

میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو لالہ بی بی کے بستر پہ لیٹا تھا اور اُس میں ہلکی سی جنبش تھی۔ مجھے پتا چل گیا کہ دونوں جاگ رہے ہیں۔ مَیں اُس وقت آدھی نیند میں تھا مگر مجھے یاد ہے کہ مَیں دونوں کو ساتھ ساتھ لیٹا ہُوا دیکھ کر خُوش ہو گیا تھا، کیونکہ کافی عرصہ پہلے مجھے کچھ ایسا فہم ہوا تھا کہ بی بی اور لالے کو کچھ ہو گیا ہے۔ لالہ سارا سارا دن باہر پھرتا رہتا تھا اور بی بی نے بچونگڑوں کو کوسنا اور مارنا شروع کر دیا تھا۔ جب بی بی اُن کو مارتی تھی تو مَیں اُنہیں باہر لے جاتا تھا۔ بچونگڑوں کو وقت بے وقت رونے کی عادت پڑ گئی تھی جس روز بی بی اوجھری پکاتی تھی لالہ مُنہ بنا کر اُٹھ جاتا تھا۔ پھر کبھی کبھی وہ دُودھ کا کٹورہ پی لیا کرتا، ورنہ کھائے پیئے بغیر بستر پہ لیٹ کر سو جایا کرتا تھا۔ بی بی نے اُس کا دھیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس شام کو لالے نے مُنہ تو بنایا مگر اُٹھ کر نہیں گیا، روٹی ختم کر کے پیڑھی پہ بیٹھا بی بی کو دیکھتا رہا تھا۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں رُک کر اُس نے ایک بچونگڑے کو پیار سے ہاتھ لگایا تھا۔ اگلے روز بھی جب وہ سویرے کا نِکلا سہ پہر کو گھر آیا تو اُس کا رنگ زرد تھا اور کپڑے پسینے سے بھیگے ہُوئے تھے، مگر اُس کے چہرے پہ ایک عجیب خالی خالی سا اطمینان تھا اور مزاج کُھلا ہُوا تھا۔ لالہ دونوں بچونگڑوں کو گود میں لے کر دیر تک اُن کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ اُس روز کے بعد لالے نے گھر سے غائب رہنا چھوڑ دیا اور زمین پہ دھیان دینا شُروع کر دیا تھا۔ سال کے گزرنے کا پتا بھی نہ چلا تھا۔ اُس سال کی ہر ایک چھوٹی چھوٹی بات مجھے یاد ہے، مگر یُوں لگتا ہے کہ اُس عرصے میں دو ہی بڑے واقعات ہُوئے تھے۔ میں نے آٹھویں جماعت کا وظیفے کا اِمتحان دیا تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر کو میری پڑھائی پر بڑا مان تھا۔ اُس نے خُود مجھ سے کہا تھا کہ وظیفہ لگ گیا تو سکُول کا نام بن جائے گا۔ لالے نے تین مہینے تک مجھے سارے مضمونوں کی تیاری کرائی تھی۔ بی بی نے کہا نماز پڑھ کر دُعا مانگا کرو۔ مَیں روز رات کو کھانے کے بعد مسجد میں جانے اور نماز ادا کرنے لگا تھا۔ وُضو کرنے پر مجھے اپنے بدن میں عجیب سی یک جہتی کا احساس ہوتا جیسے جسم کے کچھ ڈھیلے ڈھالے، کھڑکھڑاتے ہُوئے حصے ایک دُوسرے سے جوڑ کر خُوب کس دیئے گئے ہوں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں گڑگڑا کر دُعا مانگتا اور گڑگڑانے کے دوران چہرے پر روتی ہُوئی شکل پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ یا اللہ، مَیں دِل میں پُکارتا، اگر میرا وظیفہ لگ جائے تو مَیں وعدہ کرتا ہُوں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لِئے تیری مسجدوں میں نماز باجماعت ادا کرتا اور تیری

عبادت کرتا رہوں گا۔ دُعا مانگنے کے دَوران اللہ میاں کی لمبی سفید داڑھی والی شکل میری آنکھوں کے سامنے رہتی جس میں وہ سَر پہ بڑی سی سفید پگڑی باندھے، آسمان کے وسط میں اپنا چہرہ زمین کی جانب جُھکائے میرے ہر قول اَور فعل کو تاک رہے ہوتے تھے۔ پڑھائی میں سخت محنت اَور لمبے لمبے سبق یاد کرنے کے باوجُود دِل میں ایک بے یقینی سی رہتی تھی۔ مگر گڑگڑا کر دُعا مانگنے کے بعد دِل پہ اطمینان کا پردہ چھا جاتا تھا۔ مَیں مسجد سے لَوٹتا تو بی بی کہتی، "اللہ تیرے لالے کو بھی ہدایت دے۔ اِس نے تو کبھی مسجد کی شکل ہی نہیں دیکھی۔" بی بی سچ کہتی تھی۔ لالے نے میری ہوش میں کبھی نماز نہ پڑھی تھی، سوائے نمازِ جنازہ کے، جو کھڑے کھڑے ہی پڑھ لی جاتی تھی۔ کئی جنازوں پر مَیں لالے کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اِسی طرح میں نے نہ کبھی ابے کو اَور نہ چاچے کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ بی بی کی بات سُن کر لالہ ہنس دیتا۔ "میں اللہ کے بندوں کی مدد کرتا ہُوں،" وہ کہتا۔ "یہ بھی ثواب کا کام ہے۔" لالہ بھی سچ کہتا تھا۔ اُسے مَیں نے کبھی کسی چھوٹے بڑے شخص کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہُوئے نہ دیکھا تھا۔ جب زمین ٹھیکے پہ تھی تو ٹھیکے والے اپنے دُکھڑے سُنا کر ٹھیکہ کم کرا لیتے تھے، جب کچھ دیر کے لِئے آدھے پر مزارعوں کے حوالے کی تو اُن کی تنگ دستی کی داستانیں سُن کر لالہ آدھی سے زیادہ جنس اُنھیں چھوڑ دیتا تھا۔ بی بی اُس سے جھگڑتی تھی اَور زمین اُس سے لے کر چاچے کے ہاتھ میں دینے کی دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔ لالہ ہر دلعزیز تھا۔ اگر وہ کسی شہر کے سکُول میں ہوتا تو اُس کے جانے پر ہڑتال ہو جاتی مگر گاؤں پھر گاؤں ہوتا ہے۔

وظیفے کے اِمتحان سے پہلے مَیں بابے چلّے شاہ کے مزار پر گیا جو ہمارے گاؤں سے آدھے کوس کے فاصلے پر تھا۔ مزار کی دیواریں سنگ مرمر کے سے سفید پتھر کی تھیں جن پر لوگوں نے اپنی منتیں لکھ لکھ کر انھیں بھر دیا ہُوا تھا۔ مَیں نے بھی ایک کونے میں خالی جگہ ڈھونڈ کر موٹے سکّے والی کالی پنسل سے اپنی منت کی تحریر لکھی: بابا جی، آپ کی دُعا سے میرا وظیفہ لگ گیا تو مَیں اپنے پہلے وظیفے کی رقم سے آپ کی خدمت میں پانچ روپے کا حلوا پیش کروں گا۔ سکُول سے چھٹی ہونے پر سیدھا گھر آنے کی بجائے میں ہر روز مزار سے ہو کر اَور اپنی لکھی ہُوئی منت کو پڑھ کر آتا جس سے میرے دل کو تسلی ہوتی تھی۔ اِمتحان شہر کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکُول میں منعقد ہُوا تھا۔ مَیں نے پُورے پُورے

حل کئے اُور گھر آنے پر لالے نے دوبارہ مجھ سے حل کروائے۔ آخری پرچے کے دِن لالے نے اعلان کر دیا کہ بس، سمجھو کہ اللہ کے فضل سے وظیفہ مِل گیا۔ نتیجہ نِکلا تو میرا وظیفہ دو نمبروں سے رہ گیا۔ نتیجہ سننے کے بعد مَیں گھر سے نِکل کر اپنی زمین کو چلا گیا اُور ایک کھیت کے کنارے دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ میرے دِل پر غم کا بوجھ تھا۔ جب شام پڑ گئی تو لالہ مجھے ڈھونڈتا ہُوا وہاں آ نِکلا اُور مجھے اُٹھا کر واپس لے گیا۔

"واہ بھئی واہ، وہ میری سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر بولا" "جوان آدمی ہو، رونے کی کیا بات ہے۔ اب میٹرک کی تیاری کرو،" وہ ہنسا۔ "وظیفے کی رقم بھی زیادہ ہوگی۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا" "تیری تو ساری عُمر پڑی ہے، تجھے پتا ہے۔" وہ چلتا چلتا رُک گیا اُور میری ٹھوڑی کو ہاتھ سے اُٹھا کر بولا" "تیری عُمر پاکستان جتنی ہے۔ جب تک پاکستان رہے گا، تُو بھی جوان رہے گا۔"

"ابا تو مجھے تھن مٹ کہا کرتا تھا" مَیں نے اُس سے کہا۔

"ابے کی کیا بات ہے،" لالہ ہنس کر بولا" "تو ابے کو نہیں جانتا۔ وہ مذاق کیا کرتا تھا۔"

لالے کے ساتھ گھر جاتے ہُوئے میرے دِل کو کچھ تسلی ہُوئی، مگر اس دِن کے بعد نہ مَیں بابے چلے کے مزار پر گیا اُور نہ ہی مَیں نے مسجد کا رُخ کیا۔ بی بی کہتی، "تھ تھ تھ، اللہ میاں کو وظیفہ لگنے کی رشوت دیتے تھے؟ ایسی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔"

لالہ ہنس کر کہتا، "چھوڑ اس کا پیچھا، محنت کرنے دے، نمازوں سے کیا ہوتا ہے۔"

"ہائے کفر کا بول مت بول،" بی بی جواب دیتی۔ "خُدا سے ڈر۔"

مجھے حیرت ہوا کرتی تھی کہ بی بی خود تو کبھی نماز نہیں پڑھتی مگر دُوسروں کو تلقین کرتی رہتی ہے۔ ایک بار مَیں نے پُوچھا تھا۔ "بی بی، تُم نماز کیوں نہیں پڑھتیں،" تو پہلے پشیمان اُور پھر غمزدہ سی ہو کر بولی تھی، "ہم کس گنتی میں ہیں۔ اللہ ہمیں بخش دے گا۔"

گاؤں میں صرف چند ایک بہت بُوڑھے یا وہ غریب بچّے جن کے والدین نے انہیں مسجد میں داخل کرا دیا تھا، نماز پڑھا کرتے تھے۔ باقی کے لوگوں کو اپنی اُور زمین اُور آسمان کی باہمی چپقلشوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بات گئی گزری ہوگئی۔ مَیں نے پھر سے پڑھائی کی محنت شُروع کر دی۔ میرا حوصلہ نہ ٹُوٹا، گو بچپن کے تیقن کی وہ کیفیت پھر

لوٹ کر نہ آئی- میرا دِل ڈگمگا گیا تھا-

لالے نے آٹھ ایکڑ زمین تیار کر کے اپنے ہاتھ سے کماد کی فصل بوئی، جس میں مَیں نے بھی برابر کا ہاتھ بٹایا- یہ اُس سال کا دُوسرا بڑا واقعہ تھا- کچھ زمین ہماری محنت سے لائق ہوئی، کچھ آسمان اُس سال مہربان رہا، پھر چاچے احمد نے ایک نمبر کے گاڑھے رس والے دیسی کماد کا بیج حاصل کرنے میں مدد کی، فصل ایسی گھنی چڑھی کہ سُورج کی روشنی زمین پہ نہ پڑتی تھی اَور کھیت میں ایک قدم چلنا دُشوار تھا- دُوسرے گاؤں کے زمیندار اُس آٹھ ایکڑ کماد کے پھل کو دیکھنے کے لِئے آتے تھے- ایک ایک گنا پونے کے مقابلے کا موٹا اَور بانس کی مانند اُونچا اَور وزن میں دونوں سے بھاری تھا- چُوسنے پر اُس کے رس سے شہد ٹپکتی تھی- گاؤں کے لڑکے ایک سِرے سے داخل ہو کر دُوسرے سِرے تک دَوڑ کے مقابلے کی شرطیں لگاتے تھے، اَور جب دُوسری جانب نمودار ہوتے تو چُھری کی دھار کی مانند تیز پتوں کے چیر اُن کے چہروں اور ہاتھوں کو لہولہان کیے ہوتے تھے- لالے کو جب پتا چلا کہ اِس کھیل سے فصل کا نقصان ہو رہا ہے تو اُس نے اُنہیں سختی سے منع کر دیا- اُنہی دنوں ملک جہانگیر کی شوگر مِل کا ایک کرشر چالُو ہو گیا- اُس مِل میں ملک جہانگیر کا تیسرا حصّہ تھا جس کے پیسے اُس نے ایک مُربع بیچ کر ادا کیے تھے-

"اِنڈسٹری،" ملک جہانگیر نے اُنگلی اُٹھا کر کہا تھا جب مَیں بھی لالے کے ساتھ اُس سے ملنے کے لِئے گیا تھا- "اب ہماری نجات اِنڈسٹری میں ہے- اعجاز- ایوب خان کا ذہن انڈسٹری کی طرف ہے- کیا خبر کہ کل کو یہ زمینداروں کے ساتھ کیا کرے- خود یہ ہری پُور کا رسالدار یا رسالدار کا بیٹا یا جو کچھ بھی ہے، زمینداری سے اِس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں- ہر طرف اصلاحات کا شور مچا ہُوا ہے- نہ جانے کس وقت یہ مارشل لاء کے زور پہ زمینداریوں کا پتا ہی صاف کر دے- اِسی لِئے بھائی، ابھی سے دُور اندیشی کرنی پڑے گی- جدھر کی ہوا چلے اُدھر کو ہی مُنہ کر لو، فاصلہ جلدی طے ہوتا ہے- کیوں، کیا غلط کہتا ہُوں؟"

"بالکل نہیں،" لالے نے جواب دیا- "بڑی پتے کی بات ہے- دُنیا میں آج کل صنعتی دَور ہے-"

"تُم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، اِسی واسطے تُمہارے سامنے کُھل کر بات کرتا ہوں- ہمارا اپنا طبقہ بھی کوئی فرشتوں کی نسل سے نہیں ہے- لکیر کے فقیر ہیں- گلے کا کُرتہ پھنسا

پھٹ جائے مگر قدم برابر زمین ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ جب مَیں نے مربعہ بیچا تو تُو جانتا ہے اپنی ہی برادری نے میری کتنی بدنامی کی تھی، مگر دو سال میں مَیں دو مربعے اَور خرید لوں گا تو پھر ان کی شکل دیکھنے والی ہوگی۔ آنکھیں کُھلی رہ جائیں گی۔"

"دُرست کہا، ملک جہانگیر" لالے نے کہا "اِنگلینڈ اَور امریکہ میں جب صنعتوں کا دَور دَورہ ہوا تو اِس کے بعد وہ ساری دُنیا کے لیڈر بن گئے تھے۔"

"واہ بھئی اعجاز، تیرے ساتھ بات کرکے مزا آجاتا ہے۔ سویرے سے شام تک اَن پڑھ کِسانوں کے ساتھ دماغ کھپا کھپا کے میرا تو دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اب میری بات کو غور سے سُن۔ تیرا دماغ تو صنعت کی بات تک خُوب جاتا ہے۔ مگر میری دُور اندیشی آگے تک پہنچتی ہے۔"

"آپ کی دُور اندیشی کی کیا بات ہے، بھائی جہانگیر" لالے نے کہا۔

"بھائی ای ای۔۔۔" ملک جہانگیر سمجھانے کے اَنداز میں بولا۔ "صنعتیں لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کی مشکلات بھی ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ اب کمی کمین مزارعے ملا جلا کر دو ڈھائی سو جانیں میرے رزق پر پلتی ہیں۔ اِن میں سے ایک کی بھی مجال نہیں کہ میری بات کے آگے اُونچ نیچ کرے۔ مگر مِل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ کوئی مزدُور ہو یا کاریگر، یہ کسی کی رعایا نہیں ہوتے۔ آٹھ گھنٹے کام کیا اَور گھر کی راہ لی۔ بیگار کا تو تصور ہی نہ کرو۔ اوور ٹائم کی تکرار، تنخواہ کا تقاضہ پھر حکومت کی طرف سے سہولتیں، سال کے بعد چھٹیاں، بیماری کی چھٹیاں، ڈِسپنسری بناؤ، ریسٹ رُوم بناؤ، یہ بناؤ، وہ بناؤ، کوئی تھوڑے بکھیڑے ہیں؟ ابھی فیکٹری چالُو نہیں ہُوئی اَور یونین بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ باہر سے شرپسند لوگ آکر لیڈر بن جاتے ہیں۔ سمجھ گئے ناں؟"

"ہاں" لالہ بولا، "یہ باتیں تو ساتھ چلتی ہی ہیں۔ زمین کی بادشاہت کہاں ملتی ہے؟"

"تُم نہیں سمجھے کہ مَیں کیا کہہ رہا ہُوں۔" ملک جہانگیر بولا۔ "یہ لیبر یونین کا قِصّہ ہے بھائی۔ تُمھیں تو یونین وونین کے قصوں کا اچھی طرح عِلم ہے، تجربہ بھی ہے۔ اِسی کام میں تُم نے مار کھائی ہے۔ اب اِس تعلق واسطے کو کام میں لانے کا وقت ہے۔"

لالہ خاموشی سے جہانگیر کو دیکھتا رہا۔

"کہنے کا مقصد یہ ہے بھائی اعجاز کہ لیبر کے معاملے میں تمہارا اثر رسُوخ ہمارے کام آسکتا ہے۔ میں نے اپنے حصہ داروں کو تسلّی دے دی ہے۔ تمھیں پتا ہے شیخوپورہ کے اعوان ہیں، اپنی برادری ہے، میں غیروں سے بھائی چارے کا روادار نہیں، کاروبار کا معاملہ ہے، سو باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلے یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے لوگوں کو جوڑ کر رکھیں۔ ایک وقت میں ملک حمید تمہارے اُوپر ہاتھ ڈالنے کو پھرتا تھا۔ میں نے اس سے کہلوا دیا، ناں ناں، باہر آجا۔ ہمارے گھرانے اُٹھ کھڑے ہُوئے تو مَیں اُن سے الگ ہو کر نہیں چل سکتا۔ تو بھائی اعجاز، ایک دُوسرے کی مدد امداد سے ہی آگے بڑھا جاتا ہے۔ تم نے کماد لگایا ہے، ہم اوّل نمبر ریٹ دے کر اُٹھائیں گے اَور ادائیگی نقد۔ اَور تمھیں کیا چاہیے؟ میں نہیں کہتا کہ یہ کرو اَور وہ کرو۔ سچ پُوچھو تو مُجھے ان باتوں کی کوئی سمجھ ہی نہیں۔ تم تجربہ کار ہو، جو مناسب سمجھو کرو۔ مقصد یہ ہے کہ مِل چلتی رہے۔"

مل کا پہلا کرشر چلا تو وعدے کے مطابق ملک جہانگیر نے ایک کنال چھوڑ کر آٹھوں کے آٹھ ایکڑ گنّا اُٹھا لیا اَور پیسے ایک مہینے کے وقفے پر ادا کر دِیئے۔ ہمارے گھر میں پہلی بار اِتنی نقدی آئی تھی۔ خُوشی کے رنگ لالے اَور بی بی کے چہروں سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ لالے اَور بی بی نے شلوار قمیضوں کے چھ چھ سات سات سُوٹ بنوائے۔ مُجھے بھی تین سُوٹ ملے۔ بچونگڑوں کے لِئے نئے کپڑے آئے۔ سب کے لِئے ایک ایک جوڑا نئی چپلوں کا بنوایا گیا۔ اس کے علاوہ بی بی نے چاچے احمد کے سارے کنبے کو کپڑوں اَور جُوتوں کا ایک ایک جوڑا بھیجا۔ جب باسا نیا جوڑا اَور پشاوری چپل پہن کر ملنے آیا تو اُس کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ میرا قد کاٹھ بھی نِکل رہا تھا مگر باسا تو ایسا گبھرو جوان نِکلا تھا کہ اُس کا سَر آسمان کو چھُوتا ہُوا معلُوم ہوتا تھا گو اب بھی میری نظر غیر ارادی طور پہ کم از کم ایک بار اُس کی ٹانگوں کے بیچ چلی جاتی تھی اَور اُس کا ڈیل ڈول دیکھ کر دِل میں حیرت انگیز خیالات آیا کرتے تھے۔ گاؤں کے درزی اَور موچی کی نظر میں تو ہماری قدر و قیمت بڑھ ہی گئی تھی، دُوسرے لوگوں کے رویئے میں بھی احترام کی جھلک آگئی تھی۔ یہاں تک کہ کئی لوگ اب مُجھ کو بھی سرفرازے کی بجائے بے تکلفی سے "چوہدری" کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی جب بی بی برسبیلِ تذکرہ کہتی کہ یہ سب ملک جہانگیر کی مہربانی کی بدولت ہوا ہے تو لالہ خفا ہو کر کہتا "مہربانی کیسی؟ کیا گنّا اُس نے بیچا تھا؟ جان توڑ محنت اُس

نے کی تھی؟ ہمارا گنا پُوری تحصیل میں اوّل نمبر ہے۔ گڑ نہیں دیکھا، رَوہ پانچ منٹ بھی نہیں اُبلتی اَور کڑاہ کے اَندر جمنے لگتی ہے۔ مہربانی! مہربانی تو مَیں اُس کے ساتھ کر رہا ہُوں۔ دو جھگڑے اب تک نبٹا چُکا ہوں، ورنہ نہ بِل چلتی نہ قِصّہ شرُوع ہوتا۔ مزدُور بچارے اچھے ہیں، ابھی تک میری عزّت رکھ رہے ہیں۔"

"اپنا ہی بھلا کر رہے ہو" بی بی جواب دیتی۔ "نہ بِل چلتی نہ کماد کا مُول پڑتا۔ گڑ پکا پکا کر ہاتھ میں کیا آتا تھا؟ اُوپر سے چوبیس سیر چینی رعایتی بھاؤ پہ ملی وہ الگ۔"

"گڑ پکا کر ہمارا گزُارہ تو ہو جاتا" لالہ کہتا، "مگر بِل نہ چلتی تو جہانگیر کا کباڑا ہو جاتا۔"

"اوّل نمبر کماد کا بیج تو ابے نے ہی لا کر دیا تھا نا" بی بی جواب دیتی۔ مَیں نے محسُوس کیا تھا کہ اوجھری والی رات کے بعد جب لالے اَور بی بی کا سلوک بحال ہوا تھا اُس وقت سے بی بی ہر غلط سلط بات پر اپنی ٹانگ اُوپر رکھنے کی کوشش کرتی تھی، اَور لالہ آخر میں چُپ ہو رہتا تھا۔ مُجھے خیال آتا تھا کہ لالے کے دِل میں کوئی گناہ گاری تھی جس کا بی بی کو پتا چل گیا تھا اور وہ اُس کا فائیدہ اُٹھا رہی تھی۔ اگلا سال سارے کا سارا اچھا گزُرا تھا، سوائے آخر کے دو مہینوں کے۔ مَیں نے دسویں کے اِمتحان کے لِئے دِل لگا کر محنت کی تھی۔ لالے نے بیج کے لِئے ایک کنال کماد کھڑا رکھ لیا تھا۔ اگلے سال ہم نے دس ایکڑ کماد بیچا اَور صِرف دو ڈھائی ایکڑ گھر کی گندم کے واسطے رکھ لئے۔ بیج والے کنال میں سے بی بی نے زور لگا کر دو چار مرلے کماد کا گڑ پکوا لیا تھا۔ کتنی دیر ہو گئی مُجھے تازہ گڑ کھائے ہُوئے۔ دو سال! گرم گرم ادھ جمے گڑ کو پگھلے ہُوئے مکھن میں ڈبو کر باجرے کی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزا آج بھی میری زُبان پر ہے، گویا ابھی ابھی کھا کے بیٹھا ہُوں، گو دو سال سے میں نے نہیں چکھا۔ عجیب بات ہے۔ کیا سب لوگ میری طرح وقت کے اَندر آگے پیچھے پھِرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جیسے کہ گزُری ہُوئی عمر، سامنے کی عمر اَور آنے والی عمر کی کوئی مقرر جائے مقام ہی نہیں؟ اِس سال کے آخر تک کی دو خُوش گوار باتیں مُجھے یاد ہیں۔ ایک خانیوال کا جلسہ تھا۔

"اپنا پیر اَندر رکھو" جہانگیر نے لالے سے کہا تھا۔ "بڑا موقعہ ہے، بھاشانی کا جلسہ ہے۔ اِس میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اَور کوشش کرو کہ اگر لیڈروں کے ساتھ نہیں تو

سٹیج کے آس پاس دکھائی دیتے رہو۔ ایسے چھوٹی سطح کے لوگوں پر اثر و رسوخ قائم ہو جاتا ہے۔"

میرے امتحان ہو چکے تھے۔ زمین بھی اس دوران میں فارغ تھی۔ میں نے لالے کے ساتھ جانے پہ اصرار کیا۔ لالہ مغل پورے کی ایک مزدور یونین اور کچھ کسان کمیٹیوں کے نمائندوں کے جتھے میں شامل تھا۔ ہم بس پر سوار ہو کر خانیوال پہنچے تھے۔ اتنا بڑا جلسہ مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلے پہل تو میرا جی گھبرانے لگا تھا مگر کچھ ہی دیر کے بعد ہجوم کا خوش مزاج جوش و خروش دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا میں مجمعے میں گھلتا ملتا گیا۔ بیسیوں ہی مختلف جھنڈے اور بینر چھوٹے بڑے بانسوں پہ بندھے ہجوم کے سروں کے اوپر اوپر لہرا رہے تھے، زیادہ تر این۔ اے۔ پی۔ کے بینر تھے مگر کئی مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کے کسان اور مزدور تنظیموں کے کتبے اور پرچم سارے میدان پر ایسے پھڑپھڑا رہے تھے جیسے شادیوں کے موقع پر رنگ برنگی جھنڈیوں کی قطاریں۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود مزید جلوس آ آ کر شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر ایک جلوس کے ساتھ کم از کم ایک ڈھولچی ضرور ہوتا تھا جس کی تھاپ پہ چند لوگ آگے آگے ناچتے ہوئے ضرور آتے تھے۔ بہت بڑا سٹیج تھا جس پہ چالیس پچاس لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، گو صرف دس بارہ کرسیاں رکھی تھیں۔ سٹیج کے ایک کونے پر ہاروں سے بھرا ہوا ٹوکرا رکھا تھا۔ مائیکروفون پر ایک دس بارہ سال کا مزدور لڑکا کھڑا پنجابی کی انقلابی نظم گا رہا تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں کی آمد کی خبر تھی۔ بھنڈارہ صاحب، ملک صاحب، انصاری صاحب، شیخ صاحب، بنگش صاحب مگر سب سے زیادہ اشتیاق مولانا بھاشانی کے بارے میں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بھی اُن کو دیکھ نہ رکھا تھا۔ میرے خیال میں صرف ایک صورت آتی تھی جس کا چہرہ مہو غائب تھا بس ایک لمبی چوڑی سفید داڑھی ہر جانب پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی کیونکہ ان کا نام مولانا تھا۔ میں نے کچھ لوگوں کو چہ میگوئیاں کرتے ہوئے سنا کہ مولانا بھاشانی کمیونسٹ تھے۔

"لالہ، کمیونسٹ کیا ہوتے ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"رُوس اور چین کے رہنے والوں کو کمیونسٹ کہتے ہیں،" لالے نے مختصر جواب دیا۔

میری تسلی نہ ہوئی۔ رُوس اور چین کے رہنے والوں کو تو رُوسی اور چینی کہتے ہیں، میں نے سوچا۔ "لالہ،" میں نے پُوچھا۔ "مولانا بھاشانی کمیونسٹ ہیں؟"

"نہیں نہیں،" لالہ سختی سے بولا، "خدمت خلق کرنے والے خُدا خوف آدمی ہیں۔ بہت بڑے لیڈر ہیں۔"

میرا ذہن مزید گڈمڈ ہو گیا۔ آج تک مجھے کمیونسٹوں کے بارے میں پُورا علم حاصل نہیں ہو سکا۔ صرف اِتنا مزید پتا چلا ہے کہ کمیونسٹ لامذہب ہوتے ہیں۔ کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کِسی عِلم والے سے دریافت کروں، مگر موقع ہی نہیں ملا۔ مَیں اِن بے علموں کے گروہ میں پھنس گیا ہُوں۔ یاروں کے یار ہیں مگر ایک نمبر کے جاہل ہیں۔ سارا سارا دِن اور آدھی رات تک کھاتے اور بک بک کرتے رہتے ہیں اور پھر بستر پر لمبے پڑ کر سو جاتے ہیں۔ میرا خیال نہیں کہ اِن میں سے ایک بھی اِس دفعہ پاس ہو۔ ایک مَیں ہی ہُوں جسے نیند آتے آتے ہی آتی ہے۔ پچھلے سال ہمارے انگلش کے پروفیسر میر صاحب کے بارے میں بھی افواہ تھی کہ کمیونسٹ ہیں۔ مگر مجھے تو وہ بہت اچھے لگتے تھے، شیکسپئر کا ڈرامہ کرانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پھر اچانک اُن کی تبدیلی ہو گئی۔ کچھ لوگ کہتے تھے انھیں نکال دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم کیا قصّہ تھا۔

"لالہ، وہ دو آدمی کہہ رہے تھے مولانا بھاشانی کمیونسٹ ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہیں،" لالہ بولا، "افواہیں پھیلاتے ہیں، اِنسان دوست ہونے سے بھلا کوئی کمیونسٹ ہو جاتا ہے؟"

سب سے پہلے پنجاب اور سرحد کے لیڈر آئے۔ ملک صاحب اور شیخ صاحب، بھٹی صاحب اور کلو صاحب، خان صاحب اور چنگیزی صاحب۔ یہ سب لیڈر اپنے اپنے جلُوس لے کر آئے تھے۔ نعروں اور ڈھولوں کے شور میں جیسے جیسے یہ لیڈر آتے گئے، ٹوکرے سے دو دو چار چار ہار اُٹھا کر اُن کے گلے میں، جو پہلے ہی ہاروں سے لدے تھے، پہنائے جاتے رہے۔ سٹیج پر چڑھتے ہی وہ دونوں بازُو ہوا میں بلند کر کے ہجوم کے نعروں کا جواب دیتے اور کُرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ پھر ایک دُوسرے کی جانب جھُک جھُک کر باتیں کرتے، لوگوں کی ریل پیل دیکھ کر خُوشی سے ہنستے، انتظامیہ کے چھوٹے موٹے لوگوں کے ساتھ غیر معمولی اِنکساری سے مصافحے کرتے، اور کناتوں کے پچھلے دروازے کی جانب مڑ مڑ

کر دیکھتے۔ مجمعے میں ہلچل تھی۔ لوگ نعرے لگا لگا کر تھک جاتے تو ایک جانب سے تالیوں کی لہر اُٹھتی اَور چشم زدن میں ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک پھیل جاتی۔ آخر جب بچوں کی نظموں اَور نوجوانوں کی اِکا دُکا تقریروں سے مجمعے کی بے تابی نہ سنبھلی تو دلدار بھٹی صاحب، جو علاقے کی کسان تنظیم کے سیکرٹری تھے، اُٹھ کر مائیکروفون پر آئے۔ اُنھوں نے ہاتھ بلند کرکے مجمعے کو خاموش کرایا اَور اَپنی تقریر شرُوع کی۔ لوگ تقریر سننے لگے۔ دلدار بھٹی صاحب اَپنی تقریروں کے لیے مشہور تھے، مگر میری حالت مختلف تھی۔ یہ میرا پہلا جلسہ تھا۔ میرا دھیان تقریر کی بجائے دُوسری چیزوں پر تھا۔ مَیں الفاظ کی بجائے بولنے والے کی آواز کے زیر و بم کو محسُوس کر رہا تھا۔ پھر میں مقرر کے بازووں، اِس کے سر، ہاتھوں، کندھوں اَور سارے جِسم کی جنبش کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار مُجھے خیال آیا کہ اِس کی جگہ پر اگر میں کھڑا ہوں تو کیسا محسُوس کروں۔ پھر میں نے لوگوں کے بیکراں ہجوم پر نظر دوڑائی تو میرا دِل لرزنے لگا تھا۔ سٹیج کے عقب میں لیڈروں کے داخل ہونے کا جو رستہ تھا اِس پہ بھی میری نظر تھی۔ میں سر سید احمد خان کی تصویر سے واقف تھا۔ آسمان پہ اللہ تعالٰی کی جو صورت میرے ذہن میں تھی وہ سر سید احمد خان سے ملتی جلتی تھی۔ اِس روز میں اللہ میاں اَور سر سید کے بیچ بیچ کی شکل والے مولانا بھاشانی کی آمد کا منتظر تھا۔ پھر ایک بار جو میرے کان تقریر کی جانب راغب ہُوئے تو میں سنتا ہی چلا گیا۔

"یہ کون لوگ ہیَں---" دلدار بھٹی صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہے تھے۔ "جو ہمارے علاقے کی متروکہ زمینوں پر آکر قابض ہو گئے ہیَں؟ ان ناجائز قبضہ جات کے ذمہ دار کون ہیَں؟ میں آپ کو بتاتا ہُوں۔ اِس حق تلفی کے ذمہ دار وہ حکومتی کارندے ہیَں جنھوں نے دُوسرے ضلعوں سے ہی نہیں بلکہ دُوسرے صوبوں سے لوگوں کو یہاں لاکر آباد کیا ہے جنھوں نے جڑانوالے کی جھیل چکو کی زرخیز--- زرخیز--- سونا اگلنے والی زمین بڑے بڑے استحصالی زمینداروں کو عنایت کی ہے لیکن جو محنت کش اَپنے خُون اَور پسینے سے یہ سونا اگاتے ہیَں وہ کل بھی غریب کِسان اَور کھیت مزدُور تھے، آج بھی غریب کِسان اَور کھیت مزدُور ہیَں۔ یہ حکومتی کارندے کون ہیَں جنھوں نے جعلی مہاجروں کے لیے قانُون بنائے ہیَں جنھوں نے قانُون بنایا ہے کہ دلی اَور لکھنؤ کا رہنے والا صِرف ایک حلفیہ بیان دے کر چھتیس ہزار یونٹ الاٹ کرا سکتا ہے۔ میں پُوچھتا ہُوں کہ یہ پاکستان ہے یا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت ہے، جہاں نوکر جھوٹے سچے بیان دے کر مربعوں کے مالک بن گئے ہیں اور شرفاء جن کی حمیت ان کے آگے آنے میں مانع رہی ہے وہ نوکر بن چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اِس سرزمین کو ہمیشہ کے لیے گندے خُون سے داغ دار کر دیا ہے۔ میں بتاتا ہُوں کہ یہ قانُون بنانے والے رنجیت سنگھ جیسے ان پڑھ نہیں ہیں، یہ دلی اور علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں۔ یہ انھی انگریزوں کے کارندے ہیں جنھوں نے قوم کے غداروں کو بڑی بڑی جاگیریں دے کر سب سے پہلے اِس زمین پر داغ لگایا تھا۔ اب ان کی اولادیں امراء اور شرفاء کہلاتی ہیں۔ کوئی ان سے پُوچھنے والا نہیں کہ ان کی ملکیتوں کا منبع کہاں سے پُھوٹا تھا؟ اب انھی نام نہاد خان بہادروں اور نوابوں کے وارثوں نے اپنے حکومتی کارندوں کو پال کر اس پاک سرزمین پر غداری کی مزید مہریں ثبت کر دی ہیں۔۔۔"

میں بُھونچکا کھڑا سُن رہا تھا۔ ان الفاظ نے میرے کانوں میں سنسناہٹ پیدا کر دی تھی۔ لالہ بھی گھر میں کبھی کبھی کسی بات پر جوش میں آ کر تقریر کے انداز میں بات کیا کرتا تھا مگر جو باتیں بھٹی صاحب کے مُنہ سے نِکل رہی تھیں وہ میں نے پہلی بار سنی تھیں۔

"بھٹی نر آدمی ہے۔" میرے ساتھ بیٹھے ہُوئے آدمی نے کہا۔ "بات کھلے عام کرتا ہے، اندر خانے کا آدمی نہیں ہے۔"

بھٹی صاحب سانس لینے کو رکے تو دُوسرے آدمی نے مُنہ کے آگے ہاتھ رکھ کر پھیپھڑوں کے پُورے زور سے بب بب بب با آہلا لا لا لا آ۔۔۔ کی جارحانہ آواز پیدا کی جو حملے اور فتح کی للکار تھی۔

پندرہ برس کی عُمر میں، میں نے کھلے عام ایسی باتیں سنی تھیں جن سے بغاوت کی بو آتی تھی اور جن کا خیال کر کے ہی دِل ڈر جاتا تھا۔ اِس دِن پہلے پہل میرے ذہن میں غداری اور بغاوت کا رشتہ استوار ہوا تھا جیسے کہ یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم و ملزوم ہوں۔ صِرف ایک فرق تھا۔ مُجھے خبر نہیں کہ یہ دلدار بھٹی کی باتوں کا نتیجہ تھا یا کہ محض میری خام خیالی اِس میں کار فرما تھی مگر میرے دِل میں یقین پیدا ہو گیا تھا کہ بغاوت اور غداری دونوں کے وہی لوگ مرتکب ہُوئے تھے جن کو دلدار بھٹی صاحب ملعُون کر رہے تھے۔ دلدار بھٹی صاحب کی باتیں میرے دِل کو ابھی لگنی شروع ہی ہوئی تھیں کہ سٹیج کے پیچھے ہلچل پیدا ہوئی۔ کئی لوگ بھاگتے ہُوئے داخل ہُوئے۔ پھر مزید لوگ دُوسروں کو

سامنے سے ہٹا کر رستہ صاف کرتے ہُوئے آئے۔ ان کے نرغے میں ایک چھدری داڑھی، سیاہ رنگت اَور بھاری جثے والے شخص نمودار ہُوئے۔ دلدار بھٹی نے مڑ کر دیکھا اَور گویا بیچ منجدھار اپنی تقریر روک کر بازو ہوا میں اُٹھا دیئے۔

"حضرت مولانا بھاشانی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔" وہ بولے۔ "ان کے استقبال کے واسطے حاضرین کھڑے ہو جائیں۔" پھر دلدار بھٹی چیخ کر بولے۔ "مولانا بھاشانی!"

"زندہ باد!" جواب میں مجمع نے نعرہ لگایا۔

"ذرا زور سے۔" دلدار بھٹی دُہرا کر بولے۔ "مولانا بھاشانی!"

"زندہ باد!"

"غازیٔ بنگال!"

"زندہ باد!"

"مجاہدِ انسانیت!"

"زندہ باد!"

نعروں کے بیچ ٹوکرے کے باقی ماندہ ہار مولانا بھاشانی کو پہنا دیئے گئے۔ مولانا بھاشانی کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نعروں کے جواب میں زندہ باد کی گردان کرتا رہا اَور دِل میں حیرت سے سوچتا رہا کہ کیا یہ مولانا بھاشانی ہیں؟ میرے ذہن سے سرسید احمد خان اَور اللہ میاں کی ملی جلی صورت آپ سے آپ غائب ہو گئی۔ اِس شخص کی ٹھوڑی پہ چند بال تھے جن میں تقریباً آدھے سفید اَور باقی کے مہندی لگے سُرخ رنگ کے تھے، جلد جلی ہوئی سیاہ جِسم گٹھا ہُوا مضبوط اَور موٹا تھا۔ لباس کے نام کی ایک دھاری دار قمیض اَور ٹخنوں سے اُونچی ہلکی سی لُنگی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل اَور ہاتھ میں لمبا سا لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ پہلی نظر میں یہ آدمی حُلیئے سے کوئی کھیت مزدُور دِکھائی دیتا تھا جو ضعیف العمری کی وجہ سے کام ترک کر چکا ہو۔ صِرف اِس کی چال ڈھال جو بھاری بھاری قدموں والی تھی اَور طور طریقہ جِس سے وہ سٹیج پہ بیٹھے ہُوئے لوگوں سے ملا تھا، وہ مختلف تھے۔ ان میں ایک پُراعتماد سادگی تھی جِس سے معلُوم ہوتا تھا کہ گویا ساری دُنیا اِس آدمی کی اپنی ہی ملکیت میں تھی۔

سٹیج پہ بیٹھے ہُوئے سب لیڈر احتراماً جھک جھک کر مولانا بھاشانی سے ملے۔ مولانا بھاشانی نے سیدھا کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ یُوں بے تکلفی سے آگے بڑھایا جیسے ہاتھ نہیں بلکہ اَپنے آپ کو پیش کر رہے ہوں۔ ان کے اِس انداز سے میرے اندر ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پہلی بار مجھے انسان کی غیر مرئی طاقت کا احساس ہُوا۔ میں سٹیج سے کچھ فاصلے پہ کھڑا تھا۔ مولانا بھاشانی نے لُنگی اتنی اُونچی باندھ رکھی تھی کہ ٹخنوں سے اُوپر چھ چھ انگل ان کی سیاہ مگدروں کی سی پنڈلیاں دِکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ پنڈلیاں میری آنکھوں کے بالکل قریب آگئی ہیں اور میں نے دیکھا کہ ان کی موٹی جلد پر تڑخنے کی وجہ سے سفید سفید باریک لکیروں کا جال بنا تھا۔ سٹیج کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ کر انھوں نے ہاروں کی لڑیاں گلے سے اتار کر میز پر ڈھیر کر دیں اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہجوم کے نعروں کا جواب دیا۔ اِس وقت میں نے یہ بھی محسُوس کیا کہ ایک آدمی کے ہاتھ اُٹھانے اَور دُوسرے آدمی کے ہاتھ اُٹھا کر جواب دینے میں کیا فرق تھا۔ ایک لیڈر ہاتھ اُٹھاتا تھا تو اَپنے آپ کو دِکھاتا ہُوا معلُوم ہوتا تھا۔ دُوسرا لیڈر ہاتھ بلند کرتا تھا تو یُوں لگتا تھا جیسے اَپنے سامنے کھڑے ہزاروں لوگوں کے وجُود کا اقرار کر رہا ہے۔ مولانا بھاشانی کے ہاتھ ایک ایک فرد کو چھُوتے ہُوئے معلُوم ہوتے تھے۔ خود میرے دِل کے اندر اس لَمس کو محسُوس کر کے اَیسا جوش اُبھرا کہ میں نے گلا پھاڑ کر اَپنے تئیں دِن بھر کا سب سے اُونچا نعرہ لگایا۔ میری آواز پھٹ گئی اَور مجھے ایسا محسُوس ہوا جیسے میرے دِل کے گِردا گِرد ایک مضبوط حصار بندھ گیا ہو جو اسے ہر کسی یلغار سے محفوظ رکھے گا۔ اب علاقے کے مقامی اَور ان کے بعد باہر سے آئے ہُوئے بڑے لیڈروں کی تقریریں شرُوع ہوئیں۔ دلدار بھٹی صاحب کی تقریر کے بعد میری توقعات تیز ہو چکی تھیں۔ ان کے الفاظ دِل میں خوف پیدا کرتے تھے مگر ساتھ ہی ایسے پُرکشش بھی تھے کہ مزید سننے کو جی کرتا تھا مگر بعد میں آنے والے لیڈروں کی تقریریں سُن کر میں مایوس ہوتا گیا۔ ان کے الفاظ میں نہ بھٹی صاحب کے لہجے کی کاٹ تھی نہ ان کے الفاظ کی خطرناک للکار۔ یہ لیڈر بول تو جوش سے رہے تھے مگر دھیمے، مہذب انداز میں غریبوں اَور محنت کشوں کے حقوق، جمہوریت اَور دیگر موضوعات پر بات کر رہے تھے جیسے جیسے وقت گزُرتا گیا ان کی باتوں میں میری دلچسپی ختم ہوتی گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پہ سننا ترک کر دیا یہاں تک کہ بیچ بیچ کے نعروں کے جواب میں بھی میں محض ہونٹ ہلانے پر

اکتفا کرنے لگا۔ میری تمام تر توجہ مولانا بھاشانی پر مرکوز تھی جو کرسی پہ سیدھی پشت سے بیٹھے بغور دُوسروں کی تقریریں سُن رہے تھے۔ کسی نے ان کے ہاتھ میں این۔ اے۔ پی کا جھنڈا پکڑا دیا تھا جسے کچھ دیر تک تو وہ پکڑے بیٹھے رہے پھر مفلر کی طرح گلے کے گرد لپیٹ لیا۔ لوگ تقریر کرنے والے کی بات کاٹ کر نعرے لگانے لگے جن کے جواب میں مولانا بھاشانی نے ہنس ہنس کر ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

آخر میں جب مولانا بھاشانی کی اپنی باری آئی تو نعروں، تالیوں اور ڈھولوں کے شور میں وہ اُٹھ کر مائیکروفون پر آئے۔ اشتیاق سے میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ ابھی اُن کے مُنہ سے شیر کی دھاڑ کی سی آواز برآمد ہو گی اور تلوار کی دھار کے سے لہجے میں اُن کے الفاظ سینوں کو چیر کر دلوں میں اُترتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے ذہن سے دِلدار بھٹی کی آواز محو ہو جائے گی۔ اُس لمحے میں مجھے یہ علم نہ تھا کہ مجھ کو پہلے سے بھی بڑھ کر مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی انھوں نے بولنے کے لیے مُنہ کھولا اُن کے حلق سے پتلی سی چیختی ہُوئی آواز نکلی۔ نہ شیر کی دھاڑ کا سا لہجہ، نہ ہی باربط الفاظ۔ وہ کوئی عجیب سی ملی جلی زبان بول رہے تھے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ بیچ بیچ میں کوئی لفظ یا جملہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اِتنے میں ہماری جانب کا لاؤڈ سپیکر بند ہو گیا جس سے آواز بالکل ہی رک گئی۔ اُس کے بعد میرا دھیان اُن کی تقریر سے ہٹ کر اُن کے وجود پر جا اٹکا۔ گفتار کی دِقتوں کے باوجود، اُن کے انداز کا سحر اُسی طرح قائم تھا۔ اُن کے چہرے، ہاتھوں، بازوؤں اور کندھوں کی حرکات میں ایک سادہ سی توانائی اور خُود مختاری تھی جو یک بارگی چونکا دینے کی بجائے غیر محسوس طور پہ دِلوں میں اثر کرتی تھی۔ اِس بات کا مکمل احساس اُس وقت ہوا جب اچانک میری توجہ اپنے اردگرد پہ گئی۔ اتنے بڑے مجمعے پر خاموشی طاری تھی۔ لوگ خلافِ معمول، مولانا بھاشانی کی بات کے بیچ نعرے لگانے سے بھی رُکے ہُوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں کوئی بات آ رہی تھی یا نہیں۔ اِس سے انھیں کوئی غرض نہ تھی ــــــــــ ہم سب ہمہ تن گوش ہو کر اُس شخص کی آواز کو سن رہے تھے جس کے گرد آلود سیاہ پیر اور موٹی پنڈلیاں سٹیج کے فرش میں مضبوط کلّوں کی مانند گڑی تھیں، اور جس کا وجود ایک ایسے شجر کی مانند تھا جس پہ کئی جانداروں کا اِنحصار ہوتا ہے۔

میں ہجوم کی دھکم پیل میں لالے سے بچھڑ چکا تھا۔ جلسے کے خاتمے پر اُسے تلاش کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ لالے کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

"تو نے میرا ہاتھ کیوں چھوڑ دیا تھا؟" وہ خفگی سے بولا۔

"لالہ، اِتنے دھکے لگ رہے تھے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔

"لالہ،" کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا، "تم کہاں بیٹھے تھے؟"

"میں آگے سٹیج کے پاس بیٹھا تھا۔"

"لالہ، تُم نے مولانا بھاشانی کی پنڈلیاں دیکھی تھیں؟"

"ہاں" لالے نے کہا۔ "کیوں، پنڈلیوں کی کیا بات ہے؟"

"اُن کی جلد تڑخی ہُوئی تھی۔"

"میں نے غور نہیں کیا" لالے نے کہا۔

"اُس پہ باریک باریک لکیروں کا جال سا بنا ہُوا تھا" میں نے کہا۔

"تم بھی عجیب عجیب چیزیں دیکھتے رہتے ہو" لالہ بولا۔

مجھے یقین آ گیا کہ سٹیج کے اِتنا نزدیک ہونے کے باوجود لالے کو وہ لکیریں نظر نہیں آئی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ میرے قبضے میں ایک ایسی چیز ہے جو لالے کے پاس نہیں ہے، میں دِل میں خوش ہوا۔ جب ہم واپسی کی بس پر سوار ہُوئے تو میں نے پوچھا، "لالہ، مولانا بھاشانی کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے کِسانوں، مزدُوروں، غریب لوگوں کو اُن کا حق ملنا چاہیے۔"

"ملتا تو ہے" میں نے کہا۔

"محنت کر کے روزی کمانے والے کو کبھی پورا حق نہیں ملتا" لالے نے جواب دیا۔

"جو لوگ ہماری زمینوں پر بیجائی، کٹائی کا کام کرتے ہیں اُن کو ہم حصہ نہیں دیتے؟"

لالے نے عجیب طرح سے میری جانب دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر سوچ کا ایک بل نمودار ہوا۔ "بھئی، سوال محنتانے کا نہیں" لالے نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "اصل

معاملہ بڑے زمینداروں اور بے زمین کسانوں کا ہے۔ جاگیرداروں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہے۔ دوسری طرف ضرورت سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جن کی ملکیت میں ایک انچ زمین بھی نہیں۔ یہ لوگ مالکوں کی زمین پر محنت ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کی زرخرید غلامی کرتے ہیں۔ جاگیردار اُن کو اپنی رعایا کے نام سے پکارتے ہیں اور اپنے مویشیوں کا سا بیگار کا کام اُن سے لیتے ہیں۔"

"جیسے ملک جہانگیر ہے؟" میں نے پوچھا۔

لالہ جواب دیتے دیتے ایک لحظے کو رُک گیا۔ مجھے فوراً ہی اپنے سوال پر پشیمانی کا احساس ہوا۔ مجھے علم تھا کہ لالہ کے ملک جہانگیر کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ ملک جہانگیر نے ہماری فصل اُٹھائی تھی اور لالے کی جیب میں پیسے آئے تھے۔

"ملک جہانگیر اتنا بڑا جاگیردار نہیں،" لالہ بولا۔ "تھوڑا بہت روشن خیال بھی ہے۔ اُس سے بہت بڑے بڑے مالکان ہیں جنھوں نے اپنی ریاستیں بنا رکھی ہیں، جو اپنی کُل اراضی کا دسواں حصہ بھی زیرِ کاشت نہیں لاتے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کی اُسی کاشت سے عیش کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ تجھے پتا ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ایسے زمیندار ہیں جن کی زمین سینکڑوں مُربعوں پر پھیلی ہُوئی ہے؟"

"سیں---- کڑوں---- مرب---- بے؟ میں نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"ہاں، ہاں۔"

میں سینکڑوں مُربعوں کو اپنے تصور میں بھی نہ لا سکتا تھا۔ وَیسے بھی میری دلچسپی اِس گفتگو میں اب ختم ہونی بڑھ رہی تھی۔

"لالہ،" میں نے کہا، "مجھے تو دلدار بھٹی صاحب کی تقریر کا مزا آیا تھا۔"

"ہاں،" لالہ ہنس کر بولا، "دلدار انقلابی آدمی ہے۔ مگر ایسے لوگوں سے اُن کے اپنے آدمی ہی متوحّش ہوتے ہیں۔"

"لالہ متوحّش کیا ہوتا ہے؟"

"واہ،" لالہ بولا، "اِس سال وظیفے کی اُمید لگا کے بیٹھے ہو اور متوحّش کے معنی نہیں جانتے۔ متوحّش وہ شخص ہوتا ہے جسے تشویش لاحق ہو۔"

میں نے پوچھنا چاہا کہ دِلدار بھٹی کے بارے میں اُن کے دوست کیسے متوشش ہو سکتے تھے۔ مگر میرا دِل اب ان باتوں سے اُٹھ گیا تھا۔ میرے دِل میں اُس جلسے کے بارے میں اب صِرف دو ہی عکس باقی رہ گئے تھے ----- ایک دلدار بھٹی کی شعلے کی مانند لپکتی ہوئی تقریر، اور دُوسرا مولانا بھاشانی کا مینار کا سا بُت۔

نتیجہ نِکلا تو صِرف تین نمبروں کی گنجائش سے میرا وظیفہ لگ گیا۔ محنت بار آور ہوئی۔ بی بی نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔ لالے نے گڑ والے چاولوں کی دیگ پکوا کے بانٹی۔ میرے پیر زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔ لالے نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ وظیفہ لگے نہ لگے، میری تعلیم جاری رہے گی۔ ہمارے گاؤں کے اندر، لالے کے بعد میں پہلا لڑکا تھا جو شہر کے کالج میں پڑھائی کرنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ اس بات کا سب کو پتا تھا کہ لالہ جو ارادہ کر لیتا تھا، دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر وہ اپنے قول سے نہ ٹلتا تھا۔ لالہ نتیجہ نِکلنے سے پہلے ہی دو کالجوں سے داخلے کے فارم حاصل کر چُکا تھا۔ وظیفہ لگنے کے بعد اب میرے واسطے کسی بھی کالج میں داخلہ لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہ ایک ایسا وقت تھا کہ میری دنیا کے بدلنے کا اِمکان میری آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اِس موقعہ پر ملک جہانگیر نے ہمارے اوپر اپنا وار کیا۔

ملک جہانگیر کی شوگر مل کو چالو ہُوئے چودہ پندرہ ماہ ہو چکے تھے، جس کے دَوران متعدد بار لیبر کے جھگڑے اٹھے تھے جن کو لالے نے اپنے تعلق واسطے سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"ملک جہانگیر مجھ سے خطرناک کھیل کھلا رہا ہے،" ایک بار لالے نے گھر میں بات کی تھی۔ "میرے اُوپر ناجائز بوجھ ڈالتا جا رہا ہے۔"

"اپنی برادری ہے،" بی بی بولی تھی، "کچھ ہم اُس کے کام آئیں، کچھ وہ ہمارے کام آئے، دنیا کے کاروبار اِسی طرح چلتے ہیں۔ ہمارے حق میں اچھا ہے، خوشی غمی میں شریک ہوتا ہے۔"

"اپنے مطلب کے لیے کرتا ہے،" لالے نے کہا تھا، "مل لگنے سے پہلے ہم کہیں اور رہتے تھے؟ تب وہ کہاں تھا؟ تجھے ان باتوں کا پتا نہیں سکینہ، مزدور ایک سادہ اور غریب طبقہ ہے۔ اُن کا اعتبار ایک بار کسی سے اُٹھ جائے تو پھر چاہے اُلٹے لٹک جاؤ وہ کسی بات کے پھیر میں نہیں آتے۔"

"بس آنکھیں کھول کر چلو، سب کام دُرست ہو جائے گا" بی بی نے کہا۔

لالے کے چہرے پر تفکر تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار ملک جہانگیر اپنا آدمی بھیج کر لالے کو بلا لیا کرتا تھا۔ ہر بار جو لالہ وہاں سے لوٹتا تو پہلے سے زیادہ فکرمند ہوتا تھا۔ جس روز وہ آخری بار وہاں گیا تو مل میں بہت بڑی گڑبڑ ہوئی تھی۔ لالے کی واپسی سے پہلے ہی گاؤں میں خبر پہنچ چکی تھی کہ مزدوروں کے ہجوم پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور بہت مزدور زخمی ہو گئے تھے۔ ہمارے گھر میں عباس خبر لے کر پہنچا تھا۔ بی بی کبھی اندر جاتی کبھی باہر، کبھی بیٹھتی کبھی اُٹھ کھڑی ہوتی۔

"اللہ کرے جھوٹ ہو" وہ بار بار کہتی۔ "بابے، تیری خبر جھوٹ نکلی تو چمڑی اُدھیڑ دوں گی۔"

"بی بی، مولا بھیور اُدھر سے خُود بھاگ کر آیا ہے۔"

"کون مولا بھیور، خیراں ملنگنی کا خصم؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کی بات پر اعتبار کر کے بیٹھا ہے؟ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے جھوٹ بولتا ہوا نکلا تھا۔ میں کیا اُس کو جانتی نہیں؟"

"بی بی، وہ قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہے،" عباس نے کہا۔

"اللہ تیرے لالے کو خیر خیر سے گھر لائے۔ ہم یہ کس بکھیڑے میں پھنس گئے ہیں۔ گڑ کھا لیں گے، یا اللہ ہمارے دِلوں سے لالچ کو نکال۔ مل کیا لگی ہے ہمارے اوپر آفت آ گئی ہے۔ پہلے بھنے کے جھگڑے سے چھڑا کر کھیتی پہ لگایا۔ اب یہ اللہ ماری مل لگ گئی ہے۔ ملک جہنگیر اللہ تجھے ہدایت دے۔" بی بی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی اندر باہر آتی جاتی رہی۔

لالہ گھر آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"اللہ خیر، اللہ خیر" بی بی بھاگ کر اُٹھی اور لالے کے بازوؤں، کندھوں اور ہاتھوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ "خیر ہے ناں؟ چوٹ تو نہیں آئی؟"

لالے نے آہستگی سے جھٹک کر اپنا بدن اُس کے ہاتھوں سے الگ کیا اور چپکے سے جا کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"لڑائی ہوئی ہے؟" بی بی نے پوچھا۔

لالہ کچھ نہ بولا۔

"پُلس آئی تھی؟ پُلس نے لوگوں کو مارا ہے؟ تُم کہاں تھے؟ پُلس کے آگے تو نہیں آئے؟" وہ سوال پہ سوال کئے جا رہی تھی اَور لالہ مُنہ بند کئے بیٹھا ہوا میں تکے جا رہا تھا جیسے اُسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔

آخر بی بی ہار کر اُس کے سامنے سے ہٹی اَور آواز دے کر بولی، "باسے، ایک مُرغی پکڑ کر حلال کر۔"

میں اَور عباس صحن میں مرغیوں کے پیچھے بھاگنے لگے۔ ہماری دیسی مرغیاں مضبوط ٹانگوں اَور پیروں والی تھیں اَور چاں چاں کر کے دھول اڑاتی اَور پنجے مارتی ہُوئی ہاتھوں سے نکل جاتی تھیں۔ آخر ہم نے گھیر گھار کر ایک مُرغی کو قابو میں کر لیا۔

"اوئے سرفرازے"؟ بی بی بولی، "باسا تو پاغل کا نوٹا ہے، تیری عقل بھی پڑھ پڑھ کے ماری گئی ہے؟ یہ انڈوں والی ہے۔ وہ کالی مُرغی پکڑ کے لا۔ چل۔"

ہماری ابھی سانس بھی برابر نہ ہُوئی تھی کہ ہاتھ والی مُرغی کو پھینک کر کالی کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ ساری مرغیوں نے شور مچا مچا کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ میرے تجربے میں کھلی مُرغی پکڑنے کا عمل دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ آدمی کے بدن کا قدرتی ربط ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہاتھ اَور پاؤں اِس انداز سے حرکت کرتے ہیں گویا اُن پر اِنسانی اِرادے کا ضبط نہ ہو۔ اُوپر سے کالی مُرغی اُڑان کر کے منڈیر پر جا چڑھی۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑی سیڑھی پہ چڑھ کر بے حرکت کھڑا ہو گیا۔ دُوسری طرف سے عباس اُچھل اُچھل کر اُسے میری جانب ہانکنے لگا۔ جیسے ہی مُرغی میری زد میں آئی میں نے ہاتھ مار کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ مگر مُرغی نے دُوسرے پنجے کا ناخن میری کلائی میں گاڑ دیا۔ ساتھ ہی اُس نے اِس زور سے پر پھڑپھڑائے کہ اُس کی ٹانگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مُرغی پھر اُڈاری کے زور پہ منڈیر کے اُوپر جا بیٹھی۔ عباس پہلے ہی کوٹھے پر پہنچ چکا تھا۔ مُرغی اُسے اپنے قریب آتے دیکھ کر واپس صحن میں کُود پڑی۔ بی بی صحن میں کھڑی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مُرغی کو ہوا میں اُچک لیا۔ ہم صحن میں پہنچے تو بی بی مُرغی کے دونوں پروں کی جڑوں کو گانٹھ کی شکل میں باندھے کھڑی تھی۔

"باسے، چھُری لے کر آ۔" وہ مُرغی کو میرے ہاتھ میں دیتے ہُوئے بولی۔ میری کلائی پر خُون کا ایک قطرہ اُبھر آیا تھا۔ بی بی نے جھک کر اُسے دیکھا۔ "خیر ہے،" وہ بولی، "ذرا سا ناخن لگا ہے۔ چولہے سے راکھ لے کر اُوپر مل لے۔"

عباس نے مُرغی حلال کی۔ بی بی نے لکڑیاں جلا کر کوئلے بنائے۔ جب لکڑیوں کی پہلی آگ ختم ہو گئی اَور کوئلے دھکنے لگے تو بی بی نے مُرغی کی ادھ کٹی گردن چھری سے کاٹ کر پھینکی اَور پَر نوچ نوچ کے اُتارے۔ پھر اُس نے مُرغی کو کوئلوں پہ اُلٹ پلٹ کر جلد کی باریک لوئیں کو ختم کیا۔ جس سے چمڑی جلنے سے بچی رہی مگر کسی کسی جگہ پہ ہلکی سی جھلس گئی۔ یہ بی بی کے ہاتھ کا کمال تھا۔ ہانڈی میں پک کر یہی جھلسی ہُوئی عنابی رنگ کے چٹاخوں والی دانے دار چمڑی اصل مزا دیتی تھی۔ اِس شہر میں تو اب چمڑی سمیت مُرغی پکانے کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ جہاں دیکھو خشک ننگا گوشت ملتا ہے۔ جس کا سوف دانتوں کے بیچ اٹک جاتا ہے اُور دھاگہ پھیرے بغیر نہیں نکلتا۔ جو لطف چکنی چکنی نرم کھال کو چبانے کا ہے وہ مُرغی کی ٹانگ میں بھی نہیں۔ لالہ اَور میں دونوں چمڑی کے شوقین ہیں۔ لالہ صاف چمڑی پسند کرتا ہے جبکہ اُس کے سرخ سرخ ادھ جلے حصے مُجھے اچھے لگتے ہیں۔ اب تو میں چمڑی والی پکی ہُوئی مُرغی اپنے گھر جا کر ہی کھاتا ہُوں۔ بی بی ہمیشہ میری خاطر مُرغی پکاتی ہے۔ وہ عموماً مُرغی کی ایک ران مُجھے اَور ایک لالے کو پلیٹ میں ڈال کر دیتی ہے۔ اگر باسا آیا ہُوا ہو تو اُس کو پوچھتی ہے کہ وہ ران کھائے گا یا سینہ۔ باسا ہمیشہ میرے حصے کی ران مانگ لیتا ہے۔ اِس موقعے پر لالہ ہمیشہ سینہ لے لیتا ہے اُور اپنے حصے کی ران اور بہت ساری چمڑی مُجھے دے دیتا ہے۔ یہ اب کی بات ہے جب میں گھر چھوڑ کر یہاں آ گیا ہُوں۔ دو سال پہلے کی اُس شام کی بات اَور تھی۔ بی بی نے مُرغی کی دونوں رانیں جن پر گلی ہُوئی نرم اَور لچک دار چمڑی کے غلاف چڑھے تھے، لالے کی پلیٹ میں ڈال کر اُس کے آگے رکھ دیں۔ لالے کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کھانے کی خواہش نہیں ہے۔ مگر جب بی بی نے اُسے کھانے کو کہا تو وہ دسترخوان سے ہاتھ صاف کر کے کھانے لگا۔ بی بی گرم گرم پھلکے توے سے اُتار کر اُن کو مکھن کی ڈلی سے تر کرتی ہُوئی لالے کے آگے رکھتی جا رہی تھی۔ اب لالہ اِس طرح سے کھاتا جا رہا تھا جیسے بہت دیر کا بھوکا ہو۔ عباس لالے کی پلیٹ میں دونوں رانوں کو ایک تار دیکھے جا رہا تھا۔ بی بی کی نظر اُس پر پڑی تو بولی،

"صبر کر ندیدے، تجھے بھی دیتی ہوں۔ چل مُنہ پرے کر، نظر نہ لگا۔"

اُس شام کو لالے نے اپنے کھانے میں شریک کرنے کے لئے ہم سے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ کسی اَور ہی خیال میں غرق تھا۔ بی بی نے اُس وقت تک ہمیں کھانا نہ دیا جب تک کہ لالہ روٹی ختم کر کے، پانی پی کر چارپائی پہ لیٹ نہ گیا۔ پھر بی بی نے ہمیں کٹوروں میں سالن اَور پھلکے دیئے اَور خُود اپنا کھانا لے کر لالے کے برابر والی چارپائی پہ جا بیٹھی اور بچو نگڑوں کے ساتھ مل کر کھانے لگی۔

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" بی بی نے پوچھا۔

"ایک مزدُور زخمی ہو گیا ہے۔" لالے نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ زیادہ زخم تو نہیں آیا؟" بی بی نے پوچھا۔

"سر پہ لاٹھی لگی ہے۔ زخم گہرا لگتا ہے۔ ہسپتال لے گئے ہیں۔"

"بچ تو جائے گا نا؟" بی بی تفکر سے بولی۔

"اِس کا علم تو خُدا کو ہو۔ سر کے زخم کا کسے پتا ہوتا ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔" بی بی نے کہا۔ "مالمہ یہاں تک کیسے پہنچا؟"

"مالک زیادتیاں کریں تو معاملہ اِس حد تک پہنچنا ہی تھا۔"

"تُمھاری بات نہیں چل سکی؟"

"میری بات کتنے دن تک چلتی؟ میرا رُسُوخ اب ختم ہو چُکا ہے۔ میرا تعلق اب جہانگیر سے بھی ختم سمجھو۔"

"نہ نہ، ایسا نہ کہو۔" بی بی بولی۔ "اپنی برادری ہے۔ اچھے بُرے وقت میں کام آنے والا آدمی ہے۔"

"میں نے اس کا ساتھ اُس وقت تک دیا ہے جب تک دے سکتا تھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ وقت بہت پہلے آ چُکا ہوتا۔ اب آگے میں اُس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔"

"کیوں، کیا ہُوا؟" بی بی بے پوچھا۔

"جو کچھ وہ کہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔" لالے نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے میں اُس کے ساتھ مل کر سرکاری یونین بناؤں۔"

"اِس میں کیا خرابی ہے؟"

"دیکھو،" لالہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ اٹھا کر سمجھانے کے انداز میں بولا "یونین مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کے واسطے ہوتی ہے۔ مالکان زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خاطر مزدوروں کو تنخواہ کم دیتے ہیں۔ مزدور اکٹھ کرکے کام بند کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ مالکوں نے اِس کا توڑ کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالا ہے۔ اپنے اعتمادی لوگوں کو عہدے دار منتخب کرا کے اپنے مطلب کی یونین بنا لیتے ہیں اور اسے حکومتی دفتروں میں درج کرا دیتے ہیں۔"

"تو اِس میں خرابی کیا ہے؟" بی بی نے پوچھا۔ "سارے کام اِتمادی لوگوں کے ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں۔"

لالے نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "خُدا کی بندی، خرابی یہ ہے کہ اصلی مزدوروں کے ہاتھ سے اُن کا اختیار چھین کر اپنے پٹھوؤں کو اُن کے مقابلے پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر اُن سے اپنی من مانی کراتے ہیں۔"

"مل تو چلتی رہتی ہے،" بی بی نے کہا۔

"چلتی رہتی ہے تو کیا ہُوا؟"

"کام چلتا رہتا ہے۔ مزدوروں کا بھی اور ہمارا بھی۔"

"تجھے بس پیٹ کی ہی فکر ہے یا کچھ اور بھی کبھی سوچتی ہے؟ لوگوں کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔"

ساری بات تو پیٹ کی ہے۔ روٹی اور کپڑا ملتا رہے تو اللہ کا شکر کرو۔"

"ٹھیک ہے، تجھے روٹی اور کپڑا ملتا ہے، مگر ساتھ ہی تیرا آدمی روز تیری ہڈیاں بھی توڑتا ہے۔ تو کیا تو مطالبہ نہ کرے گی کہ تجھے مارا پیٹا نہ جائے؟"

"کروں گی،" بی بی نے کہا۔ "مگر وہ تو دُوسری بات ہے۔"

"تو پھر یہ دُوسری بات کی ہی بات ہے۔ یہ حقوق کی بات ہے۔ ظلم کے بہت سارے رستے ہوتے ہیں۔"

"مجھے تو تُمہاری سمجھ نہیں آتی،" بی بی بولی۔ "پہلے اِن باتوں میں پڑ کے نقصان اٹھا چکے ہو۔"

"مجھے سمجھ نہیں آتی تو میں کیا کروں،" لالے نے غصے سے کہا۔

مجھے ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ اب لڑائی ہونے والی ہے اور بی بی بھڑک اُٹھے گی۔ مگر اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ عباس بھاگ کر گیا، واپس آ کر بولا، "ملک جہانگیر نے بندہ بھیجا ہے۔"

لالہ اُٹھ کر گیا۔ باہر نکل کر اُس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ دِل میں وسوسہ لئے ہم تینوں صحن میں بیٹھے دروازے کو دیکھتے رہے۔ چند منٹ کے بعد لالہ پلٹ آیا اور چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"کون تھا؟" بی بی نے پوچھا۔

"جہانگیر کا منشی تھا" لالے نے کہا۔

"کیا کہتا؟"

لالہ کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا، "بلاوا بھیجا تھا۔"

"تو جا کر مل آؤ۔"

"اب میں کوئی سیر کرتا ہُوا آیا ہوں؟" لالہ بولا۔ "وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"پھر کیا کہتا ہے؟"

"اُسی بات پہ مجبور کرتا ہے۔"

"کیوں پیچھے پڑا ہُوا ہے؟"

"اُس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ دراصل وہ ضد میں آگیا ہے۔ اِن لوگوں کی ذہنیت ہی ایسی ہے۔ ضد میں آکر کام خراب کر دے گا۔"

"چلو وہ اِتنی تکرار کر رہا ہے تو اِمداد کر دو۔"

"میں نے اِنکار کر دیا ہے۔ اُسے سمجھ جانا چاہئے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں اپنی زندگی بھر کی عزت مٹی میں ملانے کے لِئے تیار نہیں۔ یہ اُصول کا معاملہ ہے۔"

"برادری میں عزت کا تمہیں خیال نہیں؟"

"دیکھ سکو،" لالہ دھیمے لہجے میں بولا، "تجھے ان باتوں کی خبر نہیں۔ ذات برادریاں صِرف ہم لوگوں کی ہوتی ہیں۔ مزدوروں میں نہ کوئی جاٹ ہوتا ہے نہ ارائیں، نہ کوئی سید نہ قریشی، نہ چوہدری نہ کمین۔ مزدوروں کی ایک ہی برادری ہوتی ہے۔ جو اُن کی محنت پر

قائم ہوتی ہے۔ اِس محنت کی کمائی ان کا حق ہے۔ یہ لوگ برادری کے نام پر ووٹ نہیں مانگتے، کھانے کے لِئے روٹی مانگتے ہیں۔ اِس اصول پر میں نے اپنی عمر لگائی ہے۔ تجھے کیا خبر؟" "ہاں ہاں، مجھے کیا خبر،" بی بی چڑ کر بولی، "تمھارے اصول ہماری بیڑیوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں اپنا بھلا پہلے کرو، دُوسرے کا پیچھے کرو۔ اب پیٹ بھر کر کھانے کو ملا ہے تو شکر کرو اَور زمین پر نظر رکھو، آسمان پر آنکھیں نہ اُٹھاؤ۔ میں تو یہ کہتی ہوں۔"

"تیری تو سمجھ پیٹھ کے پیچھے ہے،" لالہ تیزی سے بولا۔ "تیرے ساتھ بحث کرنے کا کیا فائدہ؟" یہ کہہ کر لالے نے کروٹ لی اور اَور مُنہ پرے کرکے لیٹ گیا۔ بی بی دیر تک کھانے کے برتن سمیٹتی اَور مُنہ میں بڑبڑاتی رہی۔

صبح جب میں سو کر اُٹھا تو سورج نِکلا ہُوا تھا اَور گھر میں خاموشی تھی۔ میں بستر سے نِکل کر سارے گھر میں پھرا، مگر وہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ صِرف مرغیوں کا پنجرہ کھلا تھا اَور مرغیاں اپنی صبح سویرے کی سوئی ہُوئی آوازوں میں کُڑ کُڑ کرتی ہُوئی صحن میں دانہ چگ رہی تھیں۔ بستر سیدھے بھی نہ کئے گئے تھے۔ یوں لگتا جیسے سب لوگ بستروں سے نِکلتے ہی باہر چلے گئے تھے۔ میں نے جلدی سے نلکے پر کُلّی کی اَور پانی کا گھونٹ پیا۔ گھر کا دروازہ چوپٹ کُھلا تھا۔ میں نے گلی میں نِکل کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ گلی خالی تھی، صِرف چند بچے دیوار کے ساتھ بیٹھے کنکروں سے کھیل رہے تھے۔ میں نے ساتھ والے گھروں میں جھانک کر دیکھا۔ تقریباً سارے گھر خالی دِکھائی دئے۔ میرے دِل میں ایک مہیب وسوسہ پیدا ہو چُکا تھا۔ میری عقل میں نہ آ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، اب میں کیا کروں، کدھر کو جاؤں؟ متعدد بار میں نے دائیں اَور پھر بائیں کو دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ کیچڑ آلود سیاہ پانی کی چوڑی سی نالی بہہ رہی تھی جس میں گھروں سے نِکلتی ہوئی پتلی پتلی نالیاں آ کر شامل ہوتی تھیں۔ میں وہاں کھڑا نالی میں آہستہ آہستہ بہتے ہوئے گندے پانی کو دیکھتا رہا۔ ایک بچہ کسی درخت کی پتلی سی شاخ نالی میں ڈبوئے چل رہا تھا۔ جس سے پانی کی سطح بیچ سے جدا ہو ہو کر دوبارہ یکجا ہوتی جا رہی تھی۔ دھریک کے چند پیلے پتے نالی میں تیر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے وہ نالی ایک چوڑے سے، کٹے پھٹے ساحل والے دریا کی شکل میں دکھائی دینے لگی۔ کوئی آدمی بھی گلی سے نہ گزرا تھا جس سے میں پوچھتا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ آخر میرے قدم خُود بخود گاؤں سے باہر کی جانب اُٹھنے لگے، جیسے کہ کسی آواز

نے مخاطب ہو کر کہا ہو، "اپنی زمین پر جا۔"

دور سے مجھے ایک مجمع نظر آیا۔ میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ اِتنے میں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں جہاں پہ تھا وہیں رک گیا۔ ہماری گنے کی فصل کہاں تھی؟ میں نے آنکھیں کھول کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ سو گز کے فاصلے پر یہ ہماری زمین تھی جہاں پہ لوگ جمع تھے۔ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے زمین کو بھی دیکھا، اردگرد نظر دوڑائی، پیچھے مڑ کر گاؤں کو دیکھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ جس جگہ پہ میں کھڑا تھا یہ وہی جگہ تھی جسے میں پہچانتا تھا تو میں نے دوبارہ سامنے دیکھا۔ یہ ہماری ہی زمین تھی۔ مگر ہمارا کماد کہاں گیا تھا؟؟ ایک لحظے کو یوں محسوس ہوا جیسے میرے اُوپر کوئی آسیب سایہ کئے ہُوئے ہو۔ میرے پاؤں زمین میں گڑتے گئے اور میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد، جانے بوجھے بغیر میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ پھر میں کنارے پر کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس زمین کو دیکھ رہا تھا جو کل رات تک گنے کے کھیت تھے۔ اِس وقت تین ایکڑ کے رقبے کی ہماری بہترین فصل زمین پہ کچلی ہوئی پڑی تھی۔ سارا گاؤں وہاں جمع تھا۔ میں ایک نظر زمین کو اور ایک نظر لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ چوہدری الہ داد میرے برابر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا بازو میرے کندھوں کے گرد رکھ کر گویا مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا، مگر مُنہ سے کُچھ نہ بولا، صِرف تاسف سے سَر ہلا کر خاموش ہو رہا۔ لالہ چار پانچ آدمیوں کے جھرمٹ میں کھیت کے کنارے اپنا سر ہاتھوں میں لیے زمین پر بیٹھا تھا۔ بی بی اُس سے دو قدم پرے چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ رحمت چوہان کی بیوی ماسی مریم نے اُسے قلاوے میں لے رکھا تھا۔ بی بی ہاتھ سے اپنی اوڑھنی کو آنکھوں پہ دبائے، ماسی مریم کے جسم سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، جیسے اپنے بوجھ کو سہار نہ سکتی ہو۔ حسن اور حسین، تین چار دُوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیت کے اندر گرے ہوئے گنوں کو اُٹھا اُٹھا کر اُن سے کھیل رہے تھے۔ میں جا کر لالے کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ چوہدری الہ داد کی طرح میں بھی اپنا بازو اُس کے کندوں پہ رکھ کر اُسے اپنی حفاظت میں لے لوں، مگر میری ہمت نہ ہوئی، نہ ہی میری جرأت ہُوئی کہ اپنا مُنہ کھولوں اور پوچھوں، لالہ، یہ کیا ہُوا ہے؟ اُسی وقت میں اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سن کر چونک پڑا۔

"خُدا تیرے ظلم کا بدلہ تجھے قبر کے عذاب سے دے۔ تجھے کبھی چین نہ آئے۔

ظالم---- خُونی----"

آواز بی بی کی تھی۔ مگر میں اُس کی جانب نہ دیکھتا تو مجھے پہچاننے میں دقت ہوتی۔ آواز حلق کی بجائے پیٹ کے اندر سے بر آمد ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بی بی آنکھوں سے اوڑھنی ہٹا کر، دونوں بازو ہوا میں اٹھائے اُس ہیبت ناک آواز میں صدا دے رہی تھی۔ ماسی مریم نے نرمی سے بی بی کے دونوں بازو پکڑ کر نیچے کئے اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"خُونی----" بی بی نے آخری لفظ اِس کڑی صدا کے طور اُگلا کہ میری نظر کے آگے وہ ہوا میں جا کر اٹک گیا۔ بیسیوں لوگوں کے اُس مجمعے پر ایک خاموشی کا عالم طاری تھا۔ جیسے کہ وہ سامنے کے منظر کی حقیقت کا علم رکھتے ہوں مگر مُنہ سے بول نہ سکتے ہوں۔ لالے نے اپنا سر ہاتھوں سے اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں خشک، مگر سرخ تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے لالے کو دیکھا، مگر اُس کی آنکھیں بچوں پہ لگی تھیں جو ڈھئی ہوئی فصل کے بیچ ہنس ہنس کر بھاگ رہے تھے۔ میری جانب دیکھے بغیر اس نے ایک ہاتھ میرے سر پہ رکھ دیا اور چوکڑی کی حالت سے اُٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ اردگرد کے لوگوں نے جیسے ہی لالے میں حرکت کے آثار دیکھے، آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"بکوُ چوہا اپنے کھیت میں سویا تھا،" کسی نے کہا۔

"اوئے برکت،" چوہدری الہ داد نے آواز دی۔ چھوٹے سے مُنہ والا بکوُ دُوسری طرف سے اُٹھ کر آیا۔

"تو رات کو اپنے کھیت میں سویا تھا؟"

"ہاں چوہدری۔"

"وہ کھاٹ تیری ہے؟" چوہدری الہ داد نے ایک کِلّے کے فاصلے پر چارے کے کھیت کے کنارے پڑی کھاٹ کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔

"ہاں چوہدری۔ اُدھر ہی پڑی ہے، ایک قدم نہیں ہلائی۔ کھیس بھی نہیں اُٹھایا۔ نشتیش میں اللہ جانے کیا کچھ کہنا پڑے۔"

بکوُ چوہا اِس ساری ہلچل کے اندر اپنے آپ کو اہم جان کر تیز ہو رہا تھا۔

"اوئے تفتیش کے پتر،" الہ داد نے کہا، "تو رات کو اودھر سویا تھا، تجھے کچھ سنائی

نہیں دیا؟"

"چوہدری،" بلال مسیح موچی بولا' "اِس کی گانڈ پر توپ چلا دو تو اِسے پتا بھی نہ چلے۔ یہ کانوں سے بالکل جا چکا ہے۔"

"ناں چوہدری ناں،" بکو ڈائیں کان پر ہاتھ رکھ کر بولا' "بس اِس میں کچھ خرابی ہے۔ کھراوں کے بیاہ پر ایک گولہ میرے پاس آ کر پھٹا تھا' جس سے پردہ ذرا ہل گیا ہے۔ دُوسری طرف سے ساری بات سن لیتا ہوں۔ تیری بات سن رہا ہوں کہ نہیں چوہدری؟"

"ہاں ہاں۔ بول۔"

"مجھے قرآن کی مار پڑے جو جھوٹ بولوں۔ ساری رات نہ ٹریکٹر کی آواز نہ ڈوزر کی۔ میں سن لیتا تو وہ یہ کب کر سکتے تھے؟"

"تو کیا تیرے فرشتے آ کر فصل ہاتھ سے کاٹ گئے ہیں؟" الہ داد نے کہا۔

بکو چوہے کی بیوی عقب سے نِکل کر آگے بڑھی۔ "چوہدری، اس نامراد کو کیا پوچھتے ہو۔ اس کی آنکھ بند ہو جائے تو اسے اپنی دھوتی کا بھی ہوش نہیں رہتا - ایرہ وغیرہ سب کھول کر ننگا پڑا رہتا ہے۔ سارے جانتے ہیں پچھلے سال اس کی دھوتی کے ڈب سے چور نوے روپے کھول کر لے گئے تھے۔ اس کی آنکھ بند ہو تو نامراد مردہ ہے مردہ۔ چل اوئے، بڑھ بڑھ کے بولے جاتا ہے۔" وہ بکو چوہے کو اپنے آگے آگے دھکے دیتی ہوئی وہاں سے نکال کر لے گئی۔

لالہ اپنے سامنے سے ایک ٹوٹا ہوا گنا اُٹھا کر بے خیالی سے اُس پہ ہاتھ پھیرنے لگا' جیسے بیجائی کے لِئے گانٹھوں کا اِنتخاب کیا کرتا تھا۔ پھٹے ہوئے گنوں کا رس بہہ کر جگہ جگہ پہ زمین میں جذب ہو چکا تھا' جس سے خشک مٹی میں چھوٹے چھوٹے سیاہ چٹاخ نظر آ رہے تھے۔ ہوا میں گنے کے رس اور کماد کے کھردرے، کاٹ دار پتوں کی ہلکی خوشبو پھیلی تھی۔

چوہدری الہ داد نے جھک کر لالے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رازداری سے پوچھا'

"کوئی ---- قانونی کاروائی ----؟"

لالے نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا کر بات ختم کر دی۔ پھر وہ ہاتھ سے گنے کا ٹکڑا پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ نرم نرم قدم دھرتے ہوئے، گویا پھولوں پہ چل رہا ہو' وہ کھیت کے اندر بچوں کے پاس پہنچا' اُنھیں دونوں بازوؤں میں اُٹھایا' اور واپس آ کر بی بی کے

پاس رک گیا۔ اشارہ پا کر بی بی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر لالے نے ایک نظر میری جانب دیکھا۔ ہم واپس گھر کو چل پڑے۔ ہمارے پیچھے گاؤں کے سارے لوگ ایک ایک کرکے واپس ہوئے، چلتے چلتے میں نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے بی بی کا پھنکارتا ہُوا لفظ ابھی تک ہوا میں اٹکا ہُوائی دِکھائی دیا، جس کے کناروں سے سرخ قطروں کی پھوار نِکل رہی تھی اَور نیچے کھیت میں کچلے ہُوئے گنے، مسخ شدہ لاشوں کی مانند پڑے تھے۔

ہم ابھی گاؤں سے باہر ہی تھے کہ عباس سائیکل کے پیچھے چاچے احمد کو بٹھائے ہُوئے آپہنچا۔

"ہائے ابا۔۔۔" بی بی نے پھر بازو ہوا میں بلند کیے اَور اُس سے لپٹ گئی۔ چاچے احمد نے بی بی کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں سنبھال لیا۔ لالے نے اُن پر نگاہ ڈالی اَور بچوں کو اُٹھائے اُٹھائے چلتا گیا۔ چاچا احمد وہیں پہ رک کر بی بی کو دِلاسہ دیتا رہا۔ میں اَور عباس لالے کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ لالہ بچے ہمارے حوالے کرکے گھر کے اندر چلا گیا۔ صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ ہم چارپائی پہ بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے لوہے پہ لوہا لگنے کی مخصوص آواز آئی۔ عباس اور میں دروازے پہ جا کھڑے ہوئے۔ اندر لالہ اپنی بارہ بور کی بندوق توڑ کر دوبارہ اُسے جوڑ رہا تھا۔ میرا دِل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تب تک میں صدمے کی حالت میں تھا۔ بندوق کو دیکھ کر میں یکدم اُس کیفیت سے نِکل آیا۔ غصے کا ایک لاوا جو اندر ہی اندر لہریں مار رہا تھا، میرے دِل کو چڑھنے لگا۔ اسلحے کی اِس سیاہ، خاموش شکل میں پوشیدہ قوت اَور سرد فولاد میں آگ اُگلنے کی اہلیت نے میرے احساس کو جگا دیا تھا۔ بندوق کی جھلک نے میرے اندر طاقت کا لالچ پیدا کر دیا تھا۔ میرا خُون جوش مار رہا تھا۔ عباس بھی میرے ساتھ کھڑا اشتیاق سے بندوق کو دیکھ رہا تھا۔ لالے کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ ڈبے سے کارتوس نکال رہا تھا کہ بی بی اَور چاچا پہنچ گئے۔ بی بی نے صحن سے ایک بچے کو گود میں اُٹھا لیا، دُوسرا اُس کی قمیض کا دامن پکڑ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جیسے ہی بی بی اندر کے دروازے پر پہنچی، اُس نے دہائی دینی شروع کر دی۔

"ابا ابا اِسے پکڑ۔ ہائے، یہ کسی کا خُون کر دے گا۔ ابا۔۔۔"

چاچا احمد اُسے سامنے سے ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ اُس نے آگے بڑھ کر لالے کے ہاتھ سے بندوق لے لی۔ لالے نے بندوق بے مزاحمت اُس کے حوالے کر دی۔

"ہم بدلہ لیں گے، اجاز" چاچے نے کہا "سوچ سمجھ کر۔ سکیم بنا کر۔ یہ جلدبازی کا کام نہیں۔"

"بدلے کی بات نہیں چاچا۔ میں اسے صاف کر رہا تھا" لالہ بولا۔ "فصل پر جا کر سوؤں گا۔"

ٹھیک ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ سوؤں گا۔ اوئے،" چاچے نے مجھے اَور عباس کو مخاطب کر کے کہا "شامو شام بسترے اَور چارپائیاں اُدھر لے جانا۔ کہیں نِکل نہ جانا۔ سن لیا؟"

"ہاں چاچا۔"

"اِدھر اُدھر نِکل گئے تو چمڑی الگ کر دُوں گا۔"

"نہیں چاچا" میں نے جواب دیا۔

ہم سب صحن میں دیوار کے سائے کے اندر چارپائیوں پہ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سائیں جلا بیاسی سے پھرتا پھراتا ہُوا آ پہنچا۔ اُس نے کماد کرانے والوں کو دو چار غلیظ گالیاں دیں اَور حقہ تازہ کرنے لگ گیا۔ گاؤں کے اکا دُکا لوگ آتے اور جاتے رہے۔ وہ کچھ دیر بیٹھتے، حقے کے دو کش لگاتے، اَور افسوس سے سرہلاتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔ اُن کے وطیرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ زبردستوں سے لڑائی مول لینے کا نتیجہ اچھا نہیں نِکلتا۔ میرا غصہ اُبل رہا تھا۔ میں اَور عباس الگ چارپائی پہ بیٹھے تھے۔

"میرے ہاتھ میں بندوق آ جائے تو ساروں کو بھون دوں،" عباس نے کہا۔

"ہاں،" میں نے جواب دیا۔

چل،" وہ بولا "بندوق نکال کرلے چلیں۔"

"کیسے نکالیں؟"

"ابھی ابا اَور لالہ اِدھر اُدھر ہوں گے تو نکال لیں گے۔" ہم نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے، مگر ہماری گفتگو چاچے کے کان میں جا پڑی۔

"کیا بول رہے ہو؟" اُس نے سختی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ابا" عباس نے جواب دیا۔

گائے ڈکرانے لگی۔ لالہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ "باسے" چاچے نے حکم دیا، "چل

اٹھ کر دھاریں نکال، سنتا نہیں، بے زبان جانور تکلیف میں ہے۔ پہلے ہی دو گھنٹے دیر ہو گئی
ہے۔" عباس نے اُٹھ کر بالٹی میں دودھ دوہا۔ بی بی نے دیگچہ چولہے پر رکھ کر دودھ کو
ایک اُبالا دیا اور بچوں کو پلایا۔ مگر بی بی نے اپنے کھانے پینے کو چولہے پہ کچھ بھی نہ چڑھایا۔
سائیں جلا بار بار چولہے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ماسی مریم نے گرم گرم پراٹھے، آم
کا اچار، اور سلور کے منہ بند برتن میں ابلتی ہوئی چائے بھیجی۔ چاچے، سائیں جلے، عباس
اور میں نے ناشتہ کیا۔ بی بی اور لالے نے اِسے چھو کر بھی نہ دیکھا۔

"کھالے۔ کھالے،" چاچا کبھی بی بی اور کبھی لالے سے کہتا، "پیٹ سے دشمنی نہ کر۔ پیٹ ایک بماری کا نام ہے۔ اِس کو خراک دیتے جاؤ تو آرام سے سویا رہتا ہے، نہیں تو مغز بھی کام نہیں کرتا۔ کھالے۔ ہاتھ آگے کر۔ کھا۔"

مگر نہ بی بی اور نہ لالے نے آنکھ اٹھا کر روٹی کو دیکھا۔ روٹی ختم کر کے چاچے نے چائے کٹورے میں اُنڈیلی اور ابلتی ہوئی چائے کو پھونکوں سے ٹھنڈا کیا۔ پھر سُرکیاں لے لے کر پینے لگا۔ دروازہ کھلا تھا۔ الیاس کمہار نے باہر سے جھانک کر دیکھا۔

"آجا،" چاچے احمد نے آواز دی۔

الیاس چاچے احمد کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جا،" چاچے نے کہا۔ "چاء کا پیالہ پی۔"

"ناں چوہدری، بیٹھنا نہیں۔ کام کو جا رہا ہوں۔ سویرے کھیت پر گیا تھا۔ سنتے ہی جا پہنچا تھا۔ ظلم ہوا ہے۔ خُدا اُن کو اِس کا بدلہ دے گا۔"

"کیوں، خُدا کو کوئی اور کام نہیں؟" چاچا بولا۔ "ظُلم ظُلم سے چُکایا جاتا ہے۔"

"درست ہے چوہدری۔ زور آوری کا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے،" چاچے احمد نے کہا، "زور آوری کا کام ہے۔ پتا لگ جائے گا۔"

"ایک بات کرنے آیا تھا چوہدری۔"

"کر کر۔"

"وہ گنے،" کمہار جھجکتا ہوا بولا، "خراب ہو گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

الیاس چپ کھڑا رہا۔

"یہ بات بتانے آیا تھا؟" چاچے نے سختی سے پوچھا۔ "تیرا مغز ٹھیک ہے؟"

"میں خیال کر رہا تھا' بات کروں کہ نہ کروں۔ گنے تو خراب ہو گئے ہیں۔ میں کچھ اٹھا کر اپنے خروں کو۔۔۔۔"

چاچے احمد نے یکدم ہاتھ سے چائے کا پیالہ پھینک دیا۔ اُس میں ایک گھونٹ چائے جو رہ گئی زمین پر پھیل گئی۔ اُسی ہاتھ سے چاچا تیزی سے پیر کی جوتی اُتار کر الیاس کمہار کے پیچھے بھاگا۔ "ٹھہر تیرے خروں کی ماں کی۔۔۔۔"

الیاس کمہار پچھلے پاؤں چھلانگ لگا کر دوڑ پڑا اور دروازے کی دہلیز پھلانگ کر غائب ہوگیا۔ چاچا دروازے میں کھڑا مُنہ اُٹھا کر اُسے گالیاں دیتا رہا۔

"چاچا تو خواہ مخواہ سختی کرتا ہے۔" لالے نے کہا۔

"کیا مطلب تیرا؟" چاچے نے جواب دیا۔ "ہمارے اُوپر زیادتی ہُوئی ہے اور اِسے اپنے خروں کی پڑی ہُوئی ہے۔"

"کیا حرج ہے،" لالے نے کہا۔ "غریب آدمی ہے، جا اوئے سرفرازے، کہ دے لے جائے جتنے ضرورت ہیں۔"

"خبردار اوئے، چمڑی الگ کر دوں گا" چاچا مجھ سے بولا۔ "ہمارے گنے ٹھیک ہیں یا خراب ہیں، ڈنگروں کے واسطے نہیں ہیں۔"

"آخر کو تو ڈنگروں کو ہی کھلانے پڑیں گے" لالے نے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ گنے اُدھر ہی رہیں گے۔ گاؤں کا ایک ایک بندہ دیکھے گا۔ روز دن چڑھے دیکھیں گے اَور شرمسار ہونگے۔ تین ایکڑ فصل میں ٹریکٹر پھر گیا اَور اِن حرام خوروں کو خبر ہی نہیں ہوئی؟ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ڈنگر کھائیں یا بندے۔" لالہ ہار مان کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔

"فکر نہ کر اجاز" چاچا بولا "دو چار دِن صبر کر۔ میں اپنے بندوں سے بات کرتا ہُوں۔ بدلہ لیں گے۔ کچھ کھا پی کے لیٹ۔ پیٹ سے بیَر نہ کر۔ آج بھی کھانا، کل بھی کھانا۔ ابھی کھالے۔" لالے نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ابا اِس کا بدلہ لینا ہے؟" بی بی نے کہا۔ بی بی کے اندر حیرت ناک تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ اپنا بھی بھلا' دُوسروں کا بھی بھلا' والی بات بھول چکی تھی۔

"تیرے کہنے کی کوئی ضرورت ہے سکو؟" چاچے نے کہا، "میری پگ اُتر گئی ہے۔ بزتی کا مقام ہے۔ بدلہ لازم آتا ہے۔"

"سات ایکڑ تو بچ گیا ہے،" بی بی نے کہا۔ "ہم گزر بنالیں گے، مگر اُس کی مل بند کر دیں گے۔"

لالہ کڑوی سی ہنسی ہنسا۔ "ہمارا گنا رُکنے سے کوئی مل بند ہوتی ہے؟"

"بند ہوتی ہے یا نہیں، پر ہمارا ایک گنا اُدھر نہیں جائے گا۔ خدا جہنگیر کا بیڑا غرق کرے گا۔ دیکھ لینا، میری بات پتھر کی لکیر ہے۔"

میں اَور عباس اُٹھ کر گھر سے نِکل گئے۔ ہم گاؤں سے باہر باہر پھرتے رہے، مگر اپنے کماد کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔

"میں بندوق نکال کر راتوں رات جہانگیر کو ختم کر دوں گا" عباس نے ڈینگ ماری۔

"کیسے نکالے گا؟"

"رات کو لالے کے ساتھ فصل پر سوؤں گا۔ آدھی رات کو کھسکاؤں گا"

"اونہوں،" میں نے اُسے بتایا، "چاچے نے کہا ہے میں اَور تو گھر میں بی بی کے پاس سوئیں گے۔"

گاؤں میں مختلف قسم کی افواہیں تھیں۔ اگلے دو روز میں چاچے اَور لالے نے اپنے طور پہ پوچھ گچھ کی۔ کوئی کہتا تھا جہانگیر نے اپنے آدمی بھیجے تھے، کسی کا کہنا تھا اُس نے ملک حمید کے ذریعے یہ کام کروایا ہے، کیونکہ سڑک پر ٹائروں کے نشان پہلے دن بھنے کی جانب جاتے ہُوئے دکھائی دیئے تھے۔ اَندرون خانہ سب کی رائے تھی کہ یہ برادری والوں کی آپس کی لڑائی ہے، کسی باہر کے آدمی کے دخل کا مقام نہیں۔ تیسرے دن جہانگیر کا منشی آیا۔ "ملک صاحب نے فصل کے نقصان پر افسوس کا پیغام بھیجا ہے،" اُس نے کہا۔ "وہ خُود تشریف لانے والے تھے، مگر ضروری کام آ جانے کی وجہ سے نہیں آ سکے۔ کہتے ہیں فکر کی کوئی بات نہیں، باقی فصل کو اچھے ریٹ پر اُٹھوا دیں گے، نقصان پورا ہو جائے گا۔" جب منشی نے پیغام دیا تو میں لالے کے پاس کھڑا تھا۔ لالہ سن کر خاموش ہو رہا گو اُس نے منشی کو اَندر آنے کی دعوت نہ دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ لالے کو باقی کی فصل کی فکر

تھی۔ مگر بی بی شیر کی طرح بپھری ہوئی تھی۔

"ایک گنا بھی جھنگیرے کے بھاڑ میں گیا تو میں اِس گھر سے نِکل جاؤں گی۔ جاؤ" وہ لالے سے بولی، "اپنے مزدوروں کو بھڑکاؤ جو مرضی ہو کر، مگر مل بند کرا۔"

چاچے نے دوڑ کر منشی کو گلی کی نکڑ پر جالیا اور ایک درخت کی چھمک سے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ منشی جان بچا کر بھاگا۔

"شاباشے سکو، تو نے میرے دِل کی بات کی ہے،" چاچا واپس کر بولا، "تو اوانوں کی برادری نہیں، تیرے اَندر راجپوت کوم کا خُون ہے۔"

میں سارا دِن گھر سے باہر پھرتا رہا۔ عباس کو چاچے نے گھربار کی دیکھ بھال کے لِئے واپس بھیج دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہاں پہنچ کر ماسی کو کسی کمی کے ساتھ یہاں بھیج دے۔ میں گاؤں کے باہر دِن بھر اکیلا پھر پھرا کر واپس آگیا۔ اُس دِن کے دوران میرے دِل کے اَندر ایک مدہم سا اِرادہ شکل اختیار کرتا رہا تھا۔ شام کو میں نے لالے سے بات کی۔

"شاہدرے کے پاس ایک نئی شوگر مل بن رہی ہے۔"

"ہاں،" لالے نے کہا، "جڑانوالے روڈ پر۔ تجھے کِس نے بتایا ہے؟"

"سکول میں کوئی لڑکا بات کر رہا تھا،" میں نے کہا۔ "ہم اُن کو کماد بیچ سکتے ہیں۔"

"شہر کی پرلی طرف ہے۔" لالے نے کہا۔

"باہر باہر سے نہیں جا سکتے؟"

"جا تو سکتے ہیں۔ مگر خرچہ بہت آئے گا۔"

"ہم اپنا گڈا نہیں بنا سکتے؟" میں نے کہا۔

"بنا سکتے ہیں۔"

"اپنا گڈا ہو تو میں مال لے کر جا سکتا ہوں۔"

"تو لے جائے گا؟" لالہ ہنس کر بولا۔

"ہاں۔"

"اور پڑھنے کب جائے گا؟"

میں ایک سکینڈ تک رُکا رہا، پھر ہمت کر کے بولا، "پڑھنے کا کیا فائدہ؟"

"ہیں؟" لالہ چونک پڑا۔ "پڑھنے کا کیا فائدہ؟ یہ تو کہہ رہا ہے؟ کالج میں تیرے داخلے کے دو چار دِن رہ گئے ہیں اور تو کہہ رہا ہے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ یہ میں کیا سُن رہا ہوں؟"

چار روز میں پہلی بار لالے کے چہرے پر کسی جذبے کا رنگ اُبھرا تھا۔

"میرا وظیفہ ہی کتنا ہے؟" میں نے کہا۔

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"تجھے اِس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کیوں نہیں۔ شوگر مل کا رستہ تو بند ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

اُس وقت مجھے اِس بات کا علم نہیں تھا۔ مگر میں اَندر ہی اَندر عباس کی نقل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو مجھ سے عُمر میں ایک آدھ سال ہی بڑا تھا مگر طور طریقے میں کئی برس پیشتر ہی گویا سن بلوغت کو پہنچ گیا تھا۔ اچانک لالہ ہنس پڑا۔ یہ بھی چار روز میں پہلا موقع تھا کہ اُس کے چہرے پر ہنسی نمودار ہُوئی تھی۔ ہم صحن میں کھڑے تھے۔ لالے نے مجھے بازو سے پکڑ کر چارپائی پہ بٹھایا۔ پھر میرے ساتھ بیٹھ کر سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "دیکھ سرفراز، میں جانتا ہوں تجھے بہت فکر ہے۔ مجھے بھی بڑی فکر ہے۔ مگر میں تیری تسلی کے لِئے اصل صورتِ حال واضح کرنا چاہتا ہوں۔ شوگر مل کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اگر ہم گڑ بھی بنائیں تو پچھلے سال کی بچت ملا کر تیرا دو سال کا خرچہ آسانی سے نِکل آتا ہے۔ پھر اللہ وسیلہ پیدا کرنے والا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو ہوسٹل میں رہے گا۔ جس کالج کا میں نے انتخاب کیا ہے۔ وہ شہر کے دُوسرے کونے پر ہے۔ روز آنے جانے میں پڑھائی کا حرج ہو گا۔ خرچے کا بندوبست میرے پاس ہے۔ مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھ۔ آج کے بعد میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ پڑھنے کا کیا فائدہ۔ میں چاہتا ہوں تو ایم۔اے پاس کرے۔ پی۔سی۔ایس کے اِمتحان میں بیٹھے۔ پڑھائی میں تو جہاں تک جائے گا میں تیرے ساتھ چلوں گا" وہ جوش سے بولا "مجھے اگر منڈی میں جا کر مزدوری بھی کرنی پڑے تو تیرا خرچہ اُٹھاؤں گا۔"

لالے کی بات کے آگے میری قوت برداشت ختم ہو گئی۔ میں اُٹھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا

ہوا گھر سے نکل آیا۔ مگر اب باہر کی دنیا کے آگے میری مدافعت ڈھال کی طرح مضبوط تھی۔ میں سیدھا اپنی زمین پر گیا اور آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں اُس گری ہوئی فصل کی ایک ایک پوری کو دیکھتا رہا جس کا رس سوکھ گیا تھا اور گانٹھیں جل کر سیاہ پڑ چکی تھیں۔ چار روز کے اندر اس جیتی جاگتی فصل کا تخم مردہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب ایک مہیب غصے کا غبار سمٹ کر ایک سخت گٹھلی کی صورت میں میرے دِل کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ اُس دن سے میرے اندر قوت حاصل کرنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ وقت کے ساتھ اِس خواہش کا رخ ہر حملہ آور کی جانب مڑتا چلا گیا تھا۔۔۔"

"اُٹھو۔۔۔ اُٹھو۔۔۔" صبح سویرے احمد شاہ نے لوہے کے گلاس میں چمچہ بجا بجا کر شور مچا دیا۔ "اُٹھو۔۔۔" وہ پکارا، "ورنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی، دوڑو زمانہ چال۔۔۔"

"چپ کر یار، سویرے سویرے بولیاں بولنی شروع کر دیتا ہے،" سلیم نے سوئی ہوئی غصیلی آواز میں کہا اور پاسہ پلٹ کر لیٹ گیا۔

"گھنٹی بج گئی ہے گھنٹی،" احمد شاہ بولا، "میر صاحب نے ایک گھنٹے کا نوٹس دیا ہے۔ نو بجے کمرہ خالی مانگتا ہے۔"

"میر صاحب کی ماں کی۔۔۔" غلام حسین نے بستر پہ آنکھیں کھول کر گالی دی۔

"اوئے، کیا تڑکے منحوس بولی بولتے ہو، نہ خُدا کا نام نہ رسول کا۔ تمھیں پتا نہیں جنگ لگی ہے؟" احمد شاہ نے کہا۔ احمد شاہ گجرات کے ایک معمولی سے گدی نشینوں کا رشتہ دار تھا اور روزانہ فجر کے وقت اُٹھ کر نماز پڑھنے اور گرمی ہو یا جاڑا، ٹھنڈے پانی سے نہانے کا عادی تھا۔ اس کی اِس عادت سے سب بیزار تھے۔ صبح سویرے وہ اپنے فرائض سے فارغ ہو کر سب کو جگاتا تھا تو اُس کا سرخ گالوں والا تر و تازہ چہرہ دیکھ کر دُوسرے تینوں اپنی آنکھیں چھپا لیتے اور ہاتھ سے اُسے دفع ہونے کا اشارہ کرتے تھے۔ "او کانگڑی

پہلوانوں، اُٹھو،" وہ کہا کرتا "تازہ پانی سے نہا کر فجر پڑھنے والے کو کبھی قبض کی شکایت نہیں ہوتی۔"

"اِس میر صاحب یہودی کو پتا نہیں کہ باہر جنگ لگی ہے؟" غلام حسین نے کہا، "ایک گھنٹے کا نوٹس دیتا ہے، دُوسرے گھنٹے کا پتا نہیں۔ میرے دِل میں تو ایک ہی حسرت ہے۔"

"کہ ہمارے جاتے ہی یہاں پر بم گرے۔ ایک گھنٹے کے نوٹس کا اِسے مزا آ جائے۔ میرا سارا پروگرام تباہ کر دیا ہے۔ آج شام کو راشدہ نے ملنے کا وعدہ کیا ہُوا تھا۔ اب میں اُسے لے کر کہاں جاؤں گا؟"

"جہاں پہلے لے کر جاتے تھے،" احمد شاہ شرارت سے بولا۔

"پہلے کہاں ملی ہے یار،" غلام حسین مایوسی سے بولا، "چھ وعدے کر کے دغا دے گئی حرام خور۔ مگر آج کے لیئے تو اس نے قسم لکھ کر بھیجی ہے۔ یہ دیکھ۔" وہ کرتے کی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر ایسے انہماک سے پڑھنے لگا گویا پہلی بار اُس کے ہاتھ میں آیا ہو۔

"اوئے چپ کر کے گھر جا اَور شریفوں کی طرح زندگی گزار۔ تو کن بکھیڑوں میں پڑ گیا ہے،" احمد شاہ نے کہا۔

"تجھے کیا فکر ہے،" غلام حسین بولا، "تیری سیدانی تو گھر بیٹھی تیرا انتظار کر رہی ہے تا کہ تو آئے اور نمازیں پڑھ پڑھ کے اَور ٹھنڈے پانی سے نہا نہا کر اُس کا دماغ خراب کر دے۔ دیکھ لینا شادی کے تین مہینے کے بعد واویلا کرتی ہُوئی گھر سے نہ نکل گئی تو میرا نام بدل دینا۔"

سلیم نے غلام حسین کے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ دیکھا تو ایک دم چھلانگ لگا کر بستر سے اٹھا۔ "اوہو ہو ہو۔ میں نے تو فوزیہ کو خط لکھنا ہے۔"

"میر صاحب اب کس کو کمرہ دے رہا ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ نو بجے نئے کرایہ دار آ رہے ہیں۔ بس یہ کہہ کر چلا گیا ہے۔" احمد شاہ نے بتایا۔ "اَور ہاں۔ اوئے سنو سنو، ایک خبر سنانا تو میں بھول ہی گیا۔"

"کیا خبر ہے؟"

"نتیجہ دو چار دن میں نکلنے والا ہے۔"

"تجھے کیسے پتا ہے؟"

"آج میں نماز کے بعد سیر کرنے نکل گیا تھا۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ شیخ صاحب مل گئے۔ انہوں نے بتایا ہے۔"

"تو اُس کاذب شیخڑے کی بات پر اعتبار کرتا ہے؟"

"ہاں۔ اُس کے رشتہ دار ہمارے مرید ہیں۔"

"کاذب کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب ہے جھوٹا۔ اوئے علم حاصل کرو، تم یہاں آلو چھولے بیچنے نہیں آئے۔" آخری منظر جو اُس چوبارے کا سرفراز کی آنکھوں میں رہ گیا تھا وہ یہ تھا:

احمد شاہ سب سے پہلے تیار ہو کر اپنے صندوق، اور اس کے اُوپر گول باندھے ہوئے بستر پہ بیٹھا ریڈیو کی سوئی گھما گھما کر مختلف سٹیشنوں سے خبریں سن رہا تھا۔ سلیم جو عینک اپنے صندوق میں بند کر کے بھول چکا تھا اپنی ناک کاغذ کے ساتھ جوڑے جلد جلد خط مکمل کر رہا تھا۔ ختم کرنے کے بعد اُس نے کاغذ کو دُہرا تہرا کر کے دھاگے میں لپٹا اور دھاگے کا سرا ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ باندھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہو۔ کھڑکی سے سر باہر نکال کر اُس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور پتھر سے بندھا خط اپنی محبوبہ کے کوٹھے پر پھینک دیا۔

"چلا چل کبوتر لفافے کی چال،" احمد شاہ نے ریڈیو سے دھیان ہٹا کر کہا۔

"نہ تم لوگ کبھی یہاں آؤ گے، نہ کوئی موقعہ ملے گا اور نہ کبھی ملاقات ہوگی،" سرفراز نے کہا۔ "اِتنے تردد کا کیا فائدہ؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟" سلیم نے کہا۔ "یاد تو رکھے گی ناں۔"

"یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟"

یہ رومانس ہے، رومانس، پینڈو،" احمد شاہ بولا۔

"کسی گھر کی لڑکی کو پکڑ کر تمہاری شادی کر دی جائے گی اور تم چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے گھر بیٹھ جاؤ گے،" سرفراز نے کہا۔ "سارا رومانس نکل جائے گا۔"

"تجھے اِن باتوں کا کیا پتا؟" سلیم نے سرفراز سے کہا۔ "تیری نہ ماں نہ بہن۔ تیری

تو شادی بھی نہیں ہوگی۔"

"میں تو نائب تحصیلدار بنوں گا" احمد شاہ بولا، "گورنر کا وعدہ مل چکا ہے۔ بس بی۔اے کرنے کی شرط ہے۔"

"بی۔اے کیسے کرے گا؟ تجھے تو الف بے بھی نہیں آتی۔ تیری قسمت میں تعویز بنانا ہی لکھا ہُوا ہے" غلام حسین نے غسل خانے سے آواز دے کر کہا۔ وہ بالوں میں کنگھی کر رہا تھا اور بار بار کنگھی کو غور سے دیکھتا، اُسے دیوار کے ساتھ جھٹک کر خشکی نکالتا اور پھر بالوں میں پھیرنے لگتا تھا۔

نو بجنے والے تھے۔ الوداع کا وقت آ پہنچا تھا۔ سب ایک دُوسرے سے گلے ملے، دونوں ہاتھوں سے دست پنجے دبا دبا کر ہلاتے رہے، اور ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت ہوئے۔

سرفراز گول بستر کی رسی کندھے اور گردن سے نکال کر بستر کو پشت پہ لیے اور صندوق ہاتھ میں اٹھائے بس کے اڈے کی جانب چلا جا رہا تھا کہ ایک ہوٹل کے سامنے ایک گرد آلود جیپ آ کر رکی۔ جیپ سے دو نوجوان فوجی افسر نکلے۔ جیپ کی طرح دونوں افسر بھی گرد میں اٹے ہُوئے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خشک مٹی کے چھینٹوں سے نہا کر نکلے ہوں۔ اُن کے سر ننگے تھے اور بالوں کی لٹیں گرد کی وجہ سے اکڑی ہُوئی تھیں۔ اُن کی بھویں تک خاکی ہو رہی تھی۔ اُن کو ڈاڑھی منڈوائے غالباً ہفتہ دس دن ہو چکے تھے۔ سرفراز نے اُن کے شانوں پہ نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ دونوں کپتان تھے۔ وہ مکمل جنگی وردی میں ملبوس تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سیدھے کسی خندق سے نکل کر آ رہے ہوں۔ جیپ سے نکلنے کے بعد دونوں نے اپنی رانوں پہ ہاتھ مار کر مٹی جھاڑنے کی کوشش کی۔ گرد و غبار کا ایک چھوٹا سا بادل نمودار ہوا، جس کے بیچ گھرے ہُوئے دونوں افسروں نے ایک دُوسرے کو دیکھا اور کپڑے جھاڑنے کی مزید کوشش ترک کر دی۔ پھر وہ مڑ کر ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ اُن کے بدن سے گو انتہائی تھکن کے آثار نمایاں تھے اور اُن کے کندھوں میں خفیف سا جھکاؤ تھا، مگر اُن کی چال میں ایک ایسی تفخرانہ شان تھی کہ اُس کے اثر سے گویا مسحور ہو کر سرفراز اُن کے پیچھے پیچھے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ درمیانے درجے کے ہوٹل کے ہال کمرے میں تین چوتھائی میزوں کے گرد لوگ بیٹھے مختلف قسم کے ناشتے کر رہے تھے۔ جیسے ہی لوگوں نے فوجی افسروں کو داخل ہوتے دیکھا، اُن کے چلتے ہُوئے

منہ اور حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ چند لحظوں تک وہ سب نظریں جمائے اُن دونوں کو ہال کے پچھلے سرے پر ایک خالی میز تک جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ابھی وہ اپنی کرسیوں پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہال میں سب طرف پاؤں گھسٹنے کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ دونوں کپتانوں نے اپنی خُودکار گنیں میز پہ رکھیں اور کندھے سے خاکی تھیلے اُتار کر کرسیوں کے پاس زمین پر رکھ دیئے۔ پھر جیسے کسی ان کہے ارادے کے تحت، ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ زور سے تالیاں بجانے لگے۔ کپتانوں نے مڑ کر حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ سب لوگوں کے رُخ ان کی جانب تھے، نظریں اُن پر لگی تھیں، اور وہ اُن کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک لحظہ وہ بے سمجھ نظروں سے اِن لوگوں کو دیکھتے رہے۔ پھر جب اُنہیں اصل معاملے کا احساس ہوا تو دونوں کے چہروں پر سرخی کا ہلکا سا رنگ دوڑ گیا۔ وہ جھینپتے ہوئے منہ موڑ کر کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ مگر تالیاں تھیں کہ بجے جا رہی تھیں۔ آخر دونوں کپتانوں نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر تالیوں کا جواب دیا۔ تالیاں روک کر ہال کے سب لوگوں نے اپنی اپنی کرسیاں میزیں چھوڑ کر دونوں فوجیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ فوجی افسروں نے اِس یلغار کو دیکھا تو اپنی گنیں میز سے اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیں۔ اب لوگوں کا ہجوم اُن دونوں کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ ایک ایک بندہ گھس گھسا کر آگے نکلنے کی کوشش میں تھا اور فوجی نوجوان کی پیٹھ تھاپنا چاہتا تھا۔ "زندہ باد۔ زندہ بادہ" وہ ساتھ ساتھ پکارتے جا رہے تھے۔ "پاک فوج زندہ باد۔" جمگھٹے کے عقب میں دو بیرے چائے کے بڑے بڑے ٹرے اُٹھائے ہوئے رُکے کھڑے تھے۔ ایک ٹرے میں چائے کے برتن اور دُوسرے میں کیک، پیسٹری، اُبلے ہوئے انڈے، فرائی انڈے اور بسکٹوں کا ڈھیر تھا۔ ایک آدمی پیٹھ تھپکا کر ہجوم سے نکلا تو اُس کی نظر بیروں پر پڑی۔ اُس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے سے سو روپے کا نوٹ نکال کر بیروں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہوٹل کے مینجر کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "اِن سے پیسہ نہیں لینا" اُس نے کہا۔

"توبہ توبہ جی، یہ تو ہمارے محسن ہیں" مینجر نے کہا، اور نوٹ آدمی کو واپس کرنے کی کوشش کی۔ "یہ رکھیں جناب، یہ تو ہماری عزت افزائی ہے۔ کچھ ہمیں بھی اپنا حق ادا کرنے دیں۔"

"نہیں نہیں،" آدمی نے ہاتھ ہلا کر اُسے منع کر دیا۔ پھر وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر خالی خالی نظروں سے ہال میں دیکھنے لگا۔ اُس کو پیسے نکال کر دیتے ہُوئے چند لوگوں نے دیکھا تھا۔ اُن میں سے ایک نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا اور لوگوں کو سامنے سے ہٹاتا ہُوا اندر گھس گیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے وہ نوٹ ایک کپتان کی اُوپر والی جیب میں ٹھونس دیا۔ کپتان نے اچنبھے سے اُسے دیکھا اور نوٹ نکال کر اُسے لوٹانے کی کوشش کی۔ جب اُس شخص نے ہاتھ اپنے پیچھے باندھ کر لینے سے انکار کیا تو کپتان نے وہ نوٹ میز پر رکھ دیا۔ دیکھا دیکھی ایک دُوسرے شخص نے بٹوہ نکال کر سو کا نوٹ باہر کھینچا اور دُوسرے کپتان کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کپتان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شخص جلدی سے نوٹ میز پہ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد گویا بازی لگ گئی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پیسے نکالنے شروع کر دیئے۔ زیادہ تر سو کے نوٹ نکلے۔ جن کے پاس نہیں تھے انہوں نے چھوٹے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور آدھی الگ کر کے میز پر رکھ دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میز پر نوٹوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگ گئی۔ جمگھٹے کے عقب سے پھر کسی نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ "پاک فوج، زندہ باد،" "پاک فوج کے مجاہد، زندہ باد،" "ہندو بنیئے مردہ باد۔" کچھ لوگوں نے بغلی طرف سے بڑھنے کی کوشش کی جہاں دیوار کے ساتھ فوجیوں کی گنیں کھڑی تھیں۔ ایک کپتان نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں آنے سے منع کر دیا۔ بیرے ٹرے اُٹھائے مشکل سے میز تک پہنچے۔ میز کی سطح پر نوٹ رکھے تھے۔ ایک افسر اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ لوگ ایک لحظے کو رُک کر سیدھے ہُوئے، پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے۔ کپتان کے اشارے میں ایک ایسا انداز تھا کہ ہجوم پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

"آپ کا بہت شکریہ،" کپتان متانت سے بولا۔ اُس کے انداز میں تھکن کے آثار تھے۔ "آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ ہمیں یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرنے دیں۔ ہمیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

"ضرور ضرور جناب،" چند لوگوں نے کہا، "زندہ باد۔ چلو بھئی، اپنی اپنی جگہ۔۔۔۔"

"زندہ باد،" ایک آدمی دُہرا کر بولا۔

"یہ" کپتان نے سارے نوٹ اکٹھے کر کے اُن کی جانب بڑھائے، "یہ بھی لے جائیں۔"

"یہ" نعرہ لگانے والے آدمی نے کہا، "ہماری طرف سے---- ہدیہ عقیدت----"

"ہمیں اِن کی ضرورت نہیں" کپتان نے کہا اور نوٹ ساتھ بچھی ہوئی خالی میز پہ رکھ دیے۔ بیروں نے آخر ناشتے کے ٹرے اُن کے سامنے رکھے۔ لوگ ایک ایک کر کے واپس جانے لگے۔ اچانک ایک موٹا سا آدمی، جو حلیئے سے دکاندار دکھائی دیتا تھا، پلٹ کر آیا۔ دُوسری میز سے سارے نوٹ اُٹھا کر اُنھیں ایک بیرے کے ہاتھ میں تھماتا ہُوا وہ بولا، جا سامنے والے بنک سے اِن کی پرچیاں لے کر آ۔"

ایک بیرے نے فوجی نوجوانوں کی پیالیوں میں چائے اُنڈیلی۔ انہوں نے ناشتہ شروع کر دیا۔ دونوں میں جس کا رخ ہال کے لوگوں کی جانب تھا وہ بھی نظر اٹھا کر انہیں دیکھ لیتا۔ بیچ بیچ میں دونوں آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ جب دُوسرا بیرا چھوٹے نوٹ لے کر بنک سے لوٹا تو وہ شخص جس نے اُسے بھیجا تھا، اٹھا اور بیرے سے نوٹوں کی گڈیاں پکڑ کر کپتانوں کی میز کی جانب بڑھا۔ ان کے پاس پہنچ کر اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہُوئے نوٹ دونوں کے سر کے گرد تین تین بار گھمائے اور واپس ہوٹل کے بڑے دروازے کے باہر، جو سڑک پہ کھلتا تھا جا کھڑا ہُوا۔ فقیروں کے غول کے غول اندر آئے، جن میں اُس آدمی نے چھوٹے نوٹ بانٹنے شروع کر دیئے۔ فقیروں کے پیچھے شہر کے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔

سرفراز جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا جیب میں ہاتھ ڈالے اُنگلیوں کے درمیان اپنی اٹھنی کو گھماتا پھراتا رہا۔ اُس کی جانب کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ جیسے آیا تھا اُسی طرح کھائے پیئے بغیر اپنا سامان اُٹھا کر ہوٹل سے نکل گیا۔ ہاتھا پائی کرتے ہوئے گداگروں سے بچتا بچاتا ہُوا وہ جب سڑک کے پار پہنچا تو اس کے سامنے ایک بنی بنائی راہ اُبھر چکی تھی۔ تین روز تک وہ گاؤں میں اپنے گھر پہ رہا مگر اُس نے کسی سے دِل کی بات نہ کی۔ چوتھے روز وہ شہر واپس آیا اور سیدھا ریکروٹنگ آفس گیا۔ وہاں پہ دریافت کرنے پر اُسے بتایا گیا کہ کمیشن کے کورس کے لیئے اُن لوگوں کی درخواستیں بھی وصول کی جا رہی ہیں جن کا انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ

نکلنے والا ہے۔ بنیادی طبی معائنے کے بعد اُس سے فارم بھروا کر رکھ لیا گیا۔

گھر واپس پہنچ کر اُس کی ہمت نہ ہُوئی کہ اعجاز سے اِس بات کا ذکر کرے۔ اُس کے مستقبل کا جو راستہ اعجاز نے متعین کر رکھا تھا وہ بی۔ اے یا ایم۔اے کرنے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا تھا۔ تعلیم میں اپنے اعتماد کی بنا پر سرفراز کو بھی یقین تھا کہ وہ ان مرحلوں سے کامیاب ہو کر نِکلے گا۔ مگر شہر کے ایک ہوٹل کے اندر دیکھے ہوئے واقعہ نے اُس سیدھے سادے رستے کو الٹ کے رکھ دیا تھا۔ اُن فوجی افسروں کی وردیاں، تھکاوٹ کے باوجود اُن کے انداز سے پھوٹتی ہُوئی قوت کا احساس، ان کا خودکار اسلحہ جس کے نزدیک بھی کوئی نہ پھٹک سکتا تھا، اِن چیزوں نے اُس کے دِل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ زندگی کے ایک اَیسے مقام پہ پہنچا تھا جہاں پہلی بار اُس نے اپنے اصل راستے کی جھلک دیکھی تھی، اَور جس سے اُسے ایک انوکھی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اُس کے اندر کچھ اِس طرح کا عمل جاری ہو چکا تھا کہ جیسے دِل کسی شے کو چاہے اَور یقین ہو جائے کہ یہی اُس کا نصب العین ہے۔ اب صِرف ایک ہی دِقت راہ میں حائل تھی، کہ وہ اعجاز کو کیسے بتائے؟؟

سرفراز اب گھربار اَور خرچے کی فکر سے آزاد ہو چُکا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ اعجاز کی ملکیت اراضی اب آدھے مُربعے سے بڑھ کر مُربعے سے اُوپر پہنچ چکی تھی، اَور جیب میں رقم ابھی اِتنی باقی تھی کہ وہ مزید زمین خریدنے کی خاطر بات چیت کر رہا تھا۔ سرفراز دِن بھر گھر میں بیٹھا یا باہر کھیتوں میں پھرتا یہی سوچتا رہتا کہ بھائی کے ساتھ اپنی بات کیسے چھیڑے۔ ایک روز کھرلوں کے کنوئیں پہ بیٹھے بیٹھے اُس نے محسوس کیا کہ وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا اُس کا ذہن اُتنا ہی گڈمڈ ہوتا جا رہا تھا۔ اِس معاملے سے کچھ دیر کے لِئے چھٹکارا حاصل کرنے کو اُس نے پچھلے دو سال کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ عمل سرفراز نے پڑھائی کے دوران سیکھا تھا۔ ایک موقعے پر اُسے اس بات کا علم ہوا تھا کہ اگر کسی سبق کی پیچیدگیوں میں اُس کا ذہن پھنس کے رہ جاتا تھا تو اُسے وقتی طور پہ چھوڑ کر پرے رکھ دینا اُس کے لِئے فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ پھر وہ ذہن کو آزاد کرنے کی خاطر کِسی ٹھوس اَور جانی پہچانی شے کے خیال میں مصروف ہو جاتا تھا، جس سے اُس کے ذہن میں وسعت کے رستے پیدا ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ پچھلے دو برس کے واقعات ایسے تھے جن کا وجود اپنی جڑوں پہ قائم تھا اَور جن کے بارے میں کوئی شبہ، کوئی الجھن، کوئی مخمصہ نہ

تھا۔۔۔۔

ملک جہانگیر کو جب یقین ہو گیا کہ اعجاز پر اُس کی "سزا" کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، بلکہ اُلٹا سارا سلسلہ ہی منقطع ہونے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے، تو اس نے صلح جوئی کا رستہ اختیار کیا۔ متعدد بار پیغام بھیجنے کے باوجود اعجاز ٹس سے مس نہ ہوا تو آخر ایک روز وہ خُود چل کر ملک حمید کے گھر پر آیا۔ وہاں سے اُس نے حمید کے چھوٹے بھائی ملک رشید کے ہاتھ، جو بھائیوں میں چوتھے نمبر پہ تھا اور سکول میں اعجاز کا ہم جماعت رہ چکا تھا، بلاوا بھیجا۔ اعجاز سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ملک جہانگیر چل کر آیا ہے، ہو سکتا ہے برادری پنچائیت بلا لے۔ مگر سکینہ اور اس کا باپ ڈٹے ہوئے تھے۔

"پنچیت پر اللہ کی مار۔ پنچیت بلائے یا میلہ لگائے، جھنگیر سے جو بات کرے اُس کا مُنہ کالا۔ آپ نقصان کرے، آپ ہی پنچیت بلائے۔ اللہ کی مار۔ صاف صاف جواب دے دو۔" "نقصان کی بات نہیں سکو،" چاچا احمد بولا، "بزتی کی بات ہے۔ بدلہ لازم آتا ہے۔"

"چاچا بدلے کی بات کو چھوڑ،" اعجاز نے کہا۔ "اپنے آپ ہی معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ لیبر میں بڑی گڑ بڑ ہے۔ مہینہ ہو گیا ہے، مزدُور زخم کھا کر ہسپتال میں پڑا ہے۔ رپٹ درج ہو گئی ہے۔ پرچہ کٹانے کی کوشش ہو رہی ہے، جس میں جہانگیر کو نامزد کیا جائے گا۔ اگر مزدُور مر گیا تو سمجھ لو کہ جہانگیر کا بیڑا غرق۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو،" سکینہ نے کہا۔

"جھنگر کو سبک تو آ جائے گا،" چاچا بولا۔

"تینوں کے تینوں مالک بڑے زمیندار ہیں۔ یہ بات نہیں کہ اَن پڑھ ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں، عقل کی بات کر سکتے ہیں، مگر فیکٹریوں کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔ اپنی جاگیرداری کی تربیت سے پیچھا نہیں چھُڑا سکتے۔ ان کی ذہنیت نہیں بدلتی۔ جب موقع آتا ہے، یہ اپنی خصلت پہ آ جاتے ہیں۔"

"تو تیرا خیال ہے کہ مل بند ہو جائے گی؟"

"بند ہو یا چلتی رہے، یہ الگ بات ہے۔ مگر فساد ضرور ہو گا۔"

اعجاز، سکینہ اور چاچا احمد گھر کے اندر بیٹھے چند منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ ملک

رشید باہر صحن میں چارپائی پہ بیٹھا چائے کا پیالہ پیتا رہا۔ اعجاز نے سکینہ اور چاچے احمد کو بات کرنے سے منع کر دیا اور خود باہر جا کر ملک رشید کے آگے اِنکار کر دیا۔ نہ کوئی بہانہ بنایا، نہ عذر پیش کیا، صاف کہہ دیا کہ اُس کا دِل نہیں مانتا۔

"ٹھیک ہے، اعجاز،" ملک رشید نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی مرضی کے مالک ہو۔" ملک جہانگیر واپس چلا گیا۔ وہ ایسی خاموشی سے اپنی سبکی کرانے والوں لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مگر اُسے علم تھا کہ ایک تو اعجاز اپنی ہٹ کا پکا تھا، دُوسرے، اُس کی پشت پہ چک بیاسی کے راٹھور کھڑے تھے۔ چنانچہ اُس نے اِس سلسلے میں مزید کوئی منفی یا مثبت اقدام نہ کیا۔ اعجاز کی سات ایکڑ فصل پک رہی تھی۔ فصل بہت بھاری اُٹھی تھی۔

ایک روز سکینہ نے رات کو سونے سے پہلے ایک سرسری بات کی جس نے اعجاز کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔

"جمعرات کو بیاسی میں بیاہ پر ہم نے بڑا مزیدار گُڑ کھایا تھا،" سکینہ نے ذکر کیا۔

"اُن کا اپنا گُڑ تھا؟" اعجاز نے سوئی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔ پشاور سے منگوایا ہُوا تھا۔"

"ہاں،" اعجاز نے کہا۔ "سرحد میں بڑا بھاری گُڑ بنتا ہے۔ اُدھر کی زمین گنے کو بہت مانتی ہے۔ شوگر ملوں سے پہلے وہاں کے سب زمیندار یہی کام کرتے تھے۔ بمبئی اور کلکتے تک اُن کا گُڑ سپلائی ہوتا تھا۔ صِرف گُڑ بیچ کر وہ بڑی حیثیت والے لوگ ہو گئے تھے۔ اُنہیں 'گُڑ خان' کہتے تھے۔"

"اُس میں میوے تھے،" سکینہ نے کہا۔

"میں نے بھی کھایا ہُوا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "مزیدار ہوتا ہے۔"

اعجاز نے دوبارہ تندہی سے مزدُوروں کے درمیان کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مغلپورے اور باغبان پورے کے علاقے کی بیسیوں چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں فونڈریوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدُوروں کی بنائی ہُوئی انجمنوں، ایسوسی ایشنوں اور یونینوں کے باہمی رابطے کے کام میں دِن بھر مصروف رہتا تھا۔ اُس کے خیال میں ایک سکیم تھی کہ پہلے ایک ہی، ملتے جلتے پیشے کے مزدُوروں کی واحد تنظیم کے اندر اکٹھا کیا جائے۔ پھر اُسے دُوسری بڑی تنظیموں، جیسے ریلوے یونین وغیرہ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ تاکہ ایک

بڑی اور فعال ٹریڈ یونین کے سائے تلے ملک بھر کے مزدوروں کا اتحاد ہو سکے۔ فصل کی تباہی کے بعد کئی روز تک چاچا اور اعجاز کھیت میں سوتے رہے تھے۔ اب اعجاز کا معمول ہو چکا تھا کہ وہ آدھی رات تک گھر پہ سوتا، پھر اُٹھ کر بندوق اُٹھاتا اور فصل پہ چلا جاتا، جہاں اُس کی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ پو پھٹنے پر وہ گھر واپس آ کر پراٹھوں کا ناشتہ کرتا اور ایک دو گھنٹے کے لیے سو جاتا۔ نیند پوری کرنے کے بعد وہ اُٹھتا اور شہر کو نکل جاتا۔

"کچھ گھر کے لیے بنا دو تو مزا آ جائے،" سکینہ نے کہا۔ "آئے گئے کے آگے رکھنے کے کام بھی آئے گا۔"

"اچھا،" اعجاز نے غنودگی کی حالت میں جواب دیا۔

"میں ابے سے کہوں گی، باڑہ پار سے پستہ بدام منگوا دے گا۔"

پھر سکینہ اور سرفراز نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اعجاز، جو کھانا کھا کر آدھی رات تک یوں سوتا تھا کہ کروٹ نہ بدلتا تھا، آہستہ آہستہ دو ایک بار ہلا، پھر سیدھا اُٹھ کر بستر پہ بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں وا تھیں، اور نیند اُن سے غائب ہو چکی تھی۔

"ٹھیک تو ہو؟" سکینہ اُٹھ کر تفکر سے اعجاز کے پاس چارپائی پہ جا بیٹھی۔

"ہاں ہاں،" اعجاز سوتے ہوئے بولا، "کیوں نہ ہم سارا گڑ ہی ایسا بنا لیں؟"

"سارے کا سارا؟" سکینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ گھر کے لیے بنا سکتے ہیں تو منڈی کے لیے کیوں نہیں بنا سکتے؟"

"ہاں، لالہ،" سرفراز بولا، "کیوں نہیں بنا سکتے؟"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں،" اعجاز نے کہا۔ "چاچا پستہ، بادام، اخروٹ، سب اُدھر سے منگوا دے گا۔ سستا بھی پڑے گا۔ گڑ میں میوہ ملا کر چھوٹی ڈلیاں بنا لیں گے۔ منڈی سے وصولی ہو گی تو چاچے کا حساب بیباق کر دیں گے۔"

"مگر یہ تو منڈی میں سارا پیشاور سے آتا ہے،" سکینہ نے کہا۔

"بھئی اگر یہاں پہ ابھی تک کسی نے نہیں بنایا تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ بن نہیں سکتا۔ اصل چیز تو گڑ ہے۔ جمانے سے پہلے اس میں جو مرضی ہو ڈال دو۔"

"پہلے تھوڑا سا گھر کے لیے بنا کر دیکھو،" سکینہ نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ سارے کا سارا غرق ہو جائے۔"

"اچھا اچھا" اعجاز بے صبری سے بولا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ مگر اُس رات کو وہ آرام کی نیند نہ سو سکا، کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں جو بیج داخل ہو چکا تھا اُس نے جڑ پکڑ لی تھی۔

گڑ کا بیلنا چلنے تک چاچے احمد نے وعدے کے مطابق خشک میوے کی گٹھڑیاں گھر پہنچا دیں۔ سارے کا سارا گاؤں "بداموں والا گڑ" بنتے دیکھنے کو اُمڈ پڑا۔ سکینہ کی بات کسی حد تک دُرست نکلی۔ میوے والا گڑ بنانے میں کئی مرحلے آئے۔ سادا گڑ بنانے کا طریقہ آسان تھا۔ گھی سے چپڑے ہُوئے لکڑی کے پیالوں میں گرم گڑ ڈالا اور پانچ منٹ کے بعد زمین پر پھیلائے ہُوئے کپڑے پر پیالوں کو اُلٹ دیا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں کپڑا زائد پانی کو چوس لیتا اور گڑ چکیوں کی صورت میں جم جاتا۔ بادام پستے کی گریوں والا گڑ چھوٹی ڈلیوں کی صورت میں بکتا تھا، جو دیکھنے میں ہاتھ سے دبا دبا کر بنائی ہُوئی لگتی تھیں۔ گرم گرم گڑ ہاتھ میں نہ لیا جاتا، اور ذرا ٹھنڈا ہو جاتا تو ڈلی جمتے جمتے بھربھری ہو کر بکھر جاتی تھی۔ رات بھر تجربہ ہوتا رہا اور گاؤں کا کوئی تماشائی وہاں سے نہ ہلا۔ سارے کسان اپنے اپنے کام نبٹا کر آتے گئے۔ سرد رات میں وہ سب بھاری بھاری کیس لپیٹے، کماد کی چھال کے الاؤ کے گرد بیٹھے، حقہ گڑگڑاتے ہُوئے اپنی اپنی رائے پیش کرتے رہے۔ کوئی کہتا کہیں سے چھوٹی چھوٹی کٹوریاں حاصل کی جائیں، کوئی بولتا چمچے اور کڑچھیاں استعمال کی جائیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جہاں جہاں بادام پستے کی گریاں گڑ میں گڑی تھیں وہیں سے چکی چٹخ کر ٹوٹ جاتی تھی۔ آخر کوئی تجویز کار آمد نہ ہوئی تو اعجاز نے اُس رات کے رس کی سب "پیالہ چکیاں" بنا ڈالیں۔ جو سب سے پہلے کڑاہ میں خشک میوے ملائے جا چکے تھے۔ اُن کی کئی پھٹی چکیاں کچھ وہاں پہ موجود گاؤں کے لوگوں نے کھائیں، باقی کی اعجاز نے گھر کے لئے رکھ لیں۔

"واہ بئی واہ، اعجاز" رحمت چوہان نے اٹھ کر کھیس اپنے کندھوں سے اُتار کر جھاڑا اور ایک طرف رکھ دیا، "بڑی گرمی ہے، اِس گڑ میں۔"

"ہندوستان کے میوے ہیں، ہندوستان کے،" کسی نے کہا۔

"آگ کے اُوپر چھتر رکھ کے بیٹھا ہے،" خُدا بخش ارائیں بولا، "کسی کے لِئے دو انگل نہیں کھسکتا۔ گرمی نہیں چڑھے گی تو اور کیا ہو گا۔"

"آگ بنائی تیرے چاچے نے تھی؟" رحمت نے جواب دیا۔ "نہ تماکو ایا نہ حقہ، چرچر کرنے کو تیز ہے۔"

"چھوڑ چوہدری، لے، مُنہ میٹھا کر،" چاچے احمد نے کہا جو گُڑ کی تقریب کی خاطر اسی روز پہنچا تھا، "کمی کمین کو مُنہ لگانا بول گنوانے والی بات ہے۔ یہ لے۔ کھا۔"

"کون ہے کمی کمین؟" خُدا بخش بھڑک اٹھا۔ "تیرا دادا میرے دادے کا مقروض تھا۔ اپنی دادی سے جا کر پوچھ۔"

سب ہنس پڑے۔ چاچے احمد کی دادی کو مرے ہُوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اِسی طرح نیم مذاق، نیم کینہ وری سے ایک دُوسرے پر پھبتیاں کستے، قصے کہانیاں سناتے ہوئے کِسان اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ دوپہر کا چڑھا ہُوا کڑاہ آدھی رات کو آخری پُور اُتار کے ٹھنڈا نہ ہوگیا۔ بیلوں کو کھول کر ان کی آنکھوں سے کھوپے اتار دیئے گئے اور انہیں چارے کی کھرلی پر لے جا کر باندھ دیا گیا۔ پھر گاؤں کے لڑکوں بالوں کی باری آئی۔ رِواج کے مطابق وہ اپنے سینے اور ٹانگوں کے زور سے بیلنے کو چلا کر جتنے گنوں کا رس نکال سکیں وہ اُن کی ملکیت ہوتا تھا۔ بیلنے کے آخری روز تو لڑکوں کی جوڑیوں میں شرطیں لگتی تھیں۔ پہلی شرط رس نکالنے پہ، اور دوسری پینے پہ لگا کرتی تھی۔ رس نکالنے کا مقابلہ ہر سال خوشی محمد تیلی اور اس کا بھائی داؤد جیتتے تھے، اور رس پینے پر خُدا بخش ارائیں کا سولہ سالہ بیٹا نمبر لے جاتا تھا، جو ایک سانس میں رس کی مٹکی خالی کر دیتا تھا۔ اُس پہلی رات کو لڑکوں نے چار چھ کٹورے رس کے نکالے اور اُنہیں لے کر آگ کے پاس جا بیٹھے۔ چند منٹ تک لڑکوں نے کٹورے آگ کے قریب رکھ کر اُن کا ٹھار توڑا اور پینے لگے۔ حقے بھی بجھ چکے تھے۔ لوگ ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کپڑے جھاڑتے، کھیسوں کے پلوؤں کو دُرست کر کے بدن پہ لپیٹتے اور اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ آخر میں وہاں پہ اعجاز، چاچا احمد اور سرفراز رہ گئے۔ اعجاز اور چاچا احمد کا ٹھکانہ گُڑ کی رکھوالی کے لِئے وہیں پہ تھا۔ اُنھوں نے سرفراز کو گھر بھیج دیا۔ جب وہ لحاف اوڑھ کر سویا تو اُس کی سکیم ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔

اگلے روز اعجاز کسی ورکشاپ سے ایک پختون پٹھان کو لے آیا۔ رستے میں اُس شخص نے، جس کا نام گل افروز خان تھا اور ایک فونڈری میں مزدور کا کام کرتا تھا، پنساری

کی دکان سے میدے کی شکل کا سفوف خریدا اور ایک کپڑے کی دکان سے خُوب چھان بین کرکے، موٹی ململ کی قسم کا چند گز کپڑا لیا۔ دونوں چیزوں کے پیسے اعجاز نے ادا کیے۔ اُس رات کو گل افروز خان نے اپنا کمال دکھایا۔ ابلتی ہُوئی رس کے کڑاہ میں "رنگ کاٹ" کے ساتھ ہی اُس نے یہ سفوف بھی چٹکیوں میں بھر کر چھڑک دیا۔ جب تمام تر آلائشیں اُتار لی گئیں تو گاڑھی رس پہلے کی نسبت قدرے لیس دار نکلی۔ اُسی میں گل افروز خان نے مٹھیاں بھر کے بادام، اخروٹ، پِستہ، مونگ پھلی اور خرمانی کی گٹھلیوں کے "بادام" ملا دیئے۔ اُس کے بعد اُس نے کڑاہ تلے آگ دھیمی کرائی اور کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کو کڑچھے سے اُٹھا کے واپس کڑاہ میں ٹپکاتا اور اس کی "تار" کا معائنہ کرتا رہا۔ جب رس خُوب گاڑھی ہو کر گڑ بننے کی حد تک پہنچ چکی تو اس نے آگ مزید دھیمی کرا دی۔ پھر اُس نے ایک گز ململ کے کپڑے کے درمیان میں قینچی سے ایک انچ کا سوراخ کاٹا اور کپڑے کو چاروں کونوں سے اُٹھا کر تھیلی کی شکل بنائی۔ جب کڑاہ میں گڑ ایک خاص درجہ حرارت تک ٹھنڈا ہو گیا تو گل افروز نے گڑ کٹوروں میں بھر بھر کر اُس تھیلی میں ڈالنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ تھیلی کو اُسی ہنرمندی سے نچوڑنے لگا کہ وقفے وقفے پر گڑ کی ایک مقدار زمین پہ بچھائے ہُوئے کپڑے پر گرتی، کسی حد تک پھیلتی اور جلد ہی جمنا شروع کر دیتی۔

"یہ پوڈر بے ضرر ہے، بے ذائقہ ہے،" گل افروز نے بتایا۔ "اِس کے اندر دو خُوبی ہے۔ نمبر ایک، ڈلی کو جوڑ کے رکھتا ہے۔ نمبر دو، اندر میوے کو تازہ رکھتا ہے۔ سال کے بعد کھائے گا تو کہے گا جیسے ابھی بنا ہے۔"

جب ڈلیاں جم گئیں تو ابھی اتنی نرم تھیں کہ ہاتھ میں دبا کر گول کی جا سکتی تھیں۔ چار چھ گھنٹے میں اُنھوں نے ٹھنڈے گڑ کی سختی اختیار کر لی۔ اب گاؤں والوں نے، جو پٹھان کی کارستانی کو دیکھنے کے لیے سارا دن دُہرے اشتیاق سے بیٹھے رہے تھے، ایک ایک ڈلی کو اُٹھا کر، چاروں طرف سے گھما گھما کر دیکھا۔ اعجاز کو پتا چل گیا کہ یہ کِسان اپنے طبعی شک کے باعث اِسے مُنہ میں ڈالنے سے پرہیز کر رہے ہیں۔ "چکھ کے دیکھو،" اُس نے گل افروز خان سے کہا۔ گل افروز نے ایک ڈلی اُٹھا کر چبائی۔ اُسے نگلنے کے بعد وہ انگلی اٹھا کر بولا، "ایک نمبر۔" ایک منٹ تک پٹھان کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد سب نے ایک ایک

ڈلی اٹھائی اور اُسے چبا چبا کر کھانے لگے۔

"بئی واہ،" کئی آوازیں اُٹھیں۔ "واہ بئی واہ۔"

"پٹھان نے کام کر دکھایا ہے۔"

"بالکل پشاوری گڑ ہے۔"

"چودری،" گل افروز بولا، "مردان کے خانوں کا گڑ بناتے زندگی نکل گیا۔ اب شوگر ملیں لگ گیا تو اپنا کام بند ہو گیا۔ قسمت کا بات ہے۔ مگر یہ ہاتھ جب گڑ بنائے گا تو اصل دراصل ہو گا۔"

خُدا بخش ارائیں جو پیدائشی شکی مزاج تھا، بولا، "منہ کا مزا تو ہے۔ مگر خالص نہیں۔"

"کیا مطلب تیرا کہ خالص نہیں؟" چاچے احمد نے سختی سے پوچھا۔

"دواء ملی ہوئی ہے،" خُدا بخش نے کہا۔

دیکھ چودری،" گل افروز بھڑک کر بولا، "تم گھر میں کالا گڑ کھاتا ہے؟"

"نہیں،" خُدا بخش نے جواب دیا۔

"سفید گڑ کھاتا ہے؟"

"ہاں۔"

"سفید کیسے ہوتا ہے؟"

"رنگ کاٹ سے ہوتا ہے۔"

"تو پھر؟ وہ کوئی آسمان سے اُترا ہے؟ وہ پوڈر بھی دوائی، یہ پوڈر بھی دوائی۔ دونوں فیدے مند دوائی ہے۔ ایک میل نکالتا ہے، دُوسرا گڑ کو جوڑتا ہے، میوے کو تازہ رکھتا ہے، اور دیکھ چودری، اگر دوائی پسند نہیں تو میں کوار گندل سے بنا کر دکھاتا ہوں۔ مگر ایک چٹکی دوائی جتنا کام کرتا ہے اس کے برابر کوار گندل کا گٹھا ضرورت ہے۔ وہ تم ڈھونڈ کر لائے گا؟"

خُدا بخش سے جواب نہ بن پڑا تو ٹھنڈا ہو گیا، گو دو ایک بار اس نے زیرِ لب "نخالص، نخالص" کہا۔ مگر سب کو اس کی نکتہ چیں طبیعت کا علم تھا۔ کسی نے اُس کی طرف دھیان نہ دیا۔ تجربہ کامیاب رہا۔

پہلے روز گڑ منڈی میں گیا تو آڑھتیوں نے شک کی نظروں سے دیکھا۔ "پشاوری ہے؟"

"ہاں،" اعجاز کے آدمی نے کہا۔

اُس روز گڑ کی نیلامی نہ ہُوئی اَور ٹوکریوں کو آڑھتیوں کے گودام میں رکھوا دیا گیا۔ اگلے روز چاچے احمد نے تجویز پیش کی کہ آئندہ سے گل افروز خان کو گُڑ کی ٹوکریوں کے ہمراہ منڈی میں بھیجا جائے۔ وہ ظاہر کرے کہ گُڑ پشاور سے لے کر آیا ہے۔ گل افروز خان نے اُس وقت ذہانت کا ثبوت دیا۔ "چھ سات ٹوکری روز پشاور سے کیسے آئے گا؟" وہ بولا "سات دِن کا سٹاک اِدھر کرو، پھر ریڑے پر لاد کر لے جاؤ، بولو کہ پشاور سے بلٹی آیا ہے۔ منڈی والا پھر مانے گا۔"

اَیسا ہی کیا گیا۔ گل افروز خان سے بات کر کے آڑھتیوں نے مزید پوچھ گچھ کئے بغیر کم سے کم بھاؤ کی حد طے کرلی۔ دکانداروں کو اطلاع پہنچ گئی کہ میوے والا ایک نمبر پشاوری گُڑ سستے داموں بک رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دِن کی کھیپ اُٹھ گئی۔ مقابلتاً سستے بھاؤ بیچنے کے بعد بھی حساب لگانے پر یہ گُڑ سادے کی نسبت تین گنا قیمت دے گیا۔ میوے کی قیمت، ریڑے کے کرائے، اور گل افروز کی مزدوری نکال کر سو فیصد منافع نِکلا۔ اعجاز کے حساب کے مطابق شوگر مل کو بیچنے کی نسبت ستراسی فیصد زیادہ نفع ہوا تھا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ گھر سے نِکلی ہُوئی سکیم اتنی حیرتناک کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ وہ ہر کِسی کی احسانمندی اَور بندش سے آزاد ہو چُکا تھا۔ دو ہفتے کی آمدنی میں سے پیسے نکال کر اُس نے میٹھے چاولوں کی دو دیگیں پکوائیں اور گاؤں بھر میں تقسیم کیں۔ اعجاز کا آدھا کماد ابھی کٹا نہ تھا اُس نے گل افروز خان کو فصل کے اِختتام تک کل وقتی ملازمت پر رکھ لیا۔ گل افروز کارخانوں میں دیہاڑی کی مزدوری کرتا تھا، اٹھ کر اعجاز کے پاس آگیا۔ اُس نے دِن رات کا ڈیرہ فصل پہ لگا لیا اور گنے کی کٹائی، گُڑ کی بنائی، سنبھال اَور لدان سے لے کر منڈی میں نیلامی اَور آڑھتیوں سے رقم کی وصولی کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ آہستہ آہستہ بات گاؤں سے نِکل کر منڈی میں پہنچ گئی اَور آڑھتیوں کو علم ہو گیا کہ گڑ پشاور سے نہیں بلکہ شجاع آباد سے گل افروز خان "پشاوری" کی نگرانی میں بن کر آتا ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ مال چل نِکلا۔ پہلی بار اعجاز کی جیب میں اتنی رقم آئی تھی کہ اُس نے شہر کے بنک میں

جا کر اپنے نام کا حساب کھولا تھا۔ اعجاز کے اندر ایک اور تبدیلی بھی پیدا ہو گئی۔ ملک جہانگیر نے اُس کی کامیابی پر اپنے منشی کے ہاتھ اعجاز کو مبارکباد کا پیغام بھیجا۔

"اِس بے مراد کی اب کِس کو ضرورت ہے،" سکینہ نے کہا۔

"ضرورت کی بات نہیں سکینہ،" اعجاز بولا "وقت کی بات ہے۔"

"وقت اب اُس کا ہے یا ہمارا؟"

"اُن کا بھی ہے، ہمارا بھی ہے،" اعجاز نے کہا۔ "وقت آئے تو ہاتھ کو روک کے رکھو۔ اسی میں فائدہ ہے۔"

"فائدہ کِس بات کا؟ ہم نے اپنا فائدہ خُود کمایا ہے۔ زیادتی اس نے کی تھی یا ہم نے؟"

"ٹھیک ہے۔ مگر ہر جانے کی پیشکش بھی اُس نے ہی کی تھی۔ پھر وہ چل کے بھی آیا تھا۔ ہم نے ہر بار اُسے ٹھکرا دیا۔ اب وہ مجھ سے کوئی فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ پھر بھی پیش قدمی کر رہا ہے۔ کیوں؟ سوچنے والی بات ہے۔"

"پھر کوئی بدمعاشی اُس کے دِل میں ہو گی،" سکینہ نے کہا۔

"بدمعاشی ہو یا کچھ اَور ہو، مگر یہ دُنیاداری ہے۔ اسے سیاست بھی کہتے ہیں۔ تجھے اِن باتوں کی سمجھ نہیں۔"

"پھر سمجھاؤ،" سکینہ تڑک کر بولی۔

"سیاست کے زور پر یہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں اَور ہم لوگوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ہم لوگ چار پیسے کما کر اِن کے مقابلے پر نہیں آ سکتے۔ اِن کا سامنا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، کہ اِن کے طور طریقے اپناؤ۔ ان کو پچھاڑنا ہے تو سیاست کی مار مارو۔"

سکینہ بے سمجھی سے آنکھیں وا کئے اعجاز کو دیکھنے لگی۔ اعجاز دروازے پر کھڑے منشی کے پاس گیا۔ "ٹھیک ہے کریم شاہ،" وہ منشی سے بولا۔ "ملک صاحب سے کہنا پیغام کا شکریہ۔ آپ کی دعائیں اَور اللہ کا فضل شامل حال رہا تو خیر ہی خیر ہے۔"

منشی کریم شاہ نے اعجاز کی بات سنی تو سارے دانت نکال کر ہنسا اَور سلام لے کر چلا گیا۔ سکینہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ مگر سرفراز کو اعجاز کے مزاج میں اِس تبدیلی کی

درک ہو گئی۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ وہ سوچتا رہا کہ یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ اس کے پیچھے کاروبار کی کامیابی تھا یا کہ مزدوروں کے درمیان اُس کی کامرانی، جن کی کم از کم تین انجمنوں کو ملا کر اس نے ایک یونین بنا ڈالی تھی، گو اس میں اُس کا ایڑی چوٹی کا زور لگ گیا تھا؟ جو کچھ بھی تھا اس خود اعتمادی پہ اُس نے سے اعجاز کے اندر، اور اُس کے ذریعے اپنے آپ میں، ایک نئی قوت کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اعجاز کی طبیعت میں ایک نرم روی اور لچک پیدا ہو چکی تھی، جس کی بدولت وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی صبر اور تحمل کے ساتھ لیتا اور ہر پہلو سے سوچ کر فیصلہ کرتا تھا۔ سرفراز کو یقین تھا کہ اِس تبدیلی کا بڑا حصہ اعجاز کے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ تھا۔ سرفراز نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگوں کو بھی قدرتی طور پہ اس حقیقت کا فہم ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ، اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے بیچ اعجاز سے مشورے لینے کے لئے آنے لگے تھے۔

جس روز سرفراز کو پہلے انٹرویو کے لئے خط آیا اتفاق سے وہ گھر پہ موجود نہ تھا۔ خط اعجاز کے ہاتھ لگ گیا۔ جب سرفراز گھر پہنچا تو اُس نے اعجاز کے چہرے پہ ایک عجیب سی کیفیت دیکھی۔ سرفراز کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اتنے دنوں کے اندر پہلی بار اُسے اعجاز کی طبیعت میں ہلچل کے آثار نظر آئے تھے۔ مگر اعجاز نے اپنے اُوپر قابو پائے رکھا۔ اُس نے نرمی سے حقیقت حال دریافت کی۔ سرفراز نے بتا دیا۔ اب وہ دِل کو تھامے کھڑا تھا کہ اعجاز پوچھے گا "کیوں؟" یا پوچھے گا کہ پڑھائی کا کیا بنے گا؟ یا کوئی ایسی بات کرے گا جس سے سرفراز کا دل بھر آئے گا اور وہ جواب نہ دے سکے گا۔ مگر اعجاز اُس خط پہ نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ کئی منٹ کا وقفہ گزر گیا، جس کے دوران اعجاز کی تیز تیز چلتی ہوئی سانس دھیمی ہوتی ہوئی ہموار ہوئی، اور پھر معدوم ہو گئی۔ چند لمحے کے لِئے اعجاز کا سکوت ایسا مکمل تھا جیسے وہ کہیں دفن ہو گیا ہو۔ سرفراز کا جی گھبرانے لگا۔ وہ جا کر اعجاز کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ جب اعجاز نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھیں، جن کی چمک اُس کے چہرے کی ایک خاص شے تھی اور لوگ جس کا ذکر کیا کرتے تھے، دھندلائی ہوئی تھیں، جیسے ان کے ستارے بجھ گئے ہوں۔ اس نے خاموشی سے کاغذ سرفراز کی جانب بڑھا دیا۔

"ٹھیک ہے، لالہ؟"

"ہاں،" کچھ دیر کے بعد اعجاز نے جواب دیا، "ٹھیک ہے،"

"یہ ابھی پہلا اِنٹرویو ہے،" سرفراز نے کہا "خُدا جانے پاس بھی ہوتا ہوں کہ نہیں۔"

"ہو جاؤ گے،" اعجاز نے ہولے سے کہا۔

سرفراز کا دِل مسلسل بیٹھتا جا رہا تھا جیسے کسی نے اُس پہ ایک من کا وزن رکھ دیا ہو۔ لحظہ بہ لحظہ اُسے اعجاز کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ کبھی نہ کبھی، وقفے وقفے پر کرتا رہا تھا۔ "سب سے مشکل امتحان میٹرک کا ہوتا ہے۔ ایف۔ اے کا اُس سے آسان ہوتا ہے۔ پھر بی۔اے کا اُس سے بھی آسان اور ایم۔اے میں تو صرف ایک ہی مضمون ہوتا ہے۔ ایک بار وہاں تک پہنچ جاؤ تو ایسے،" وہ چٹکی بجا کر کہتا "نِکل جاؤ گے-----"

"اصل طاقت امیروں وزیروں میں نہیں ہوتی، اصل طاقت صِرف حکومت کے افسروں میں ہوتی ہے۔ کیا غریب، کیا امیر اَور کیا وزیر، سب اُنہیں سے کام کراتے ہیں۔ بس مقابلے کا امتحان پاس کرنے کا مسئلہ ہے۔ پھر تُم مجسٹریٹ بنو، سب جج بنو یا ڈی۔ایس۔پی لگو، سمجھو لو کہ اقتدار تُمہارے ہاتھ میں آ گیا۔ ملک جہانگیر اور ملک حمید جیسے لوگ تُمہارے دفتر میں جوتیاں چٹخاتے پھریں گے-----"

اِن خیالات کو روکنے اَور اپنے دِل کا وزن اُٹھانے کا سرفراز کو ایک ہی طریقہ سوجھ رہا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اَور اعجاز کی زبان کھولے۔

"حاضری ضروری نہیں ہے، لالہ۔"

اعجاز اُسی لہجے میں توقف سے بولا، "کیوں نہیں۔ ضرور جاؤ۔"

"لالہ، وہاں پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ بی۔اے کی ڈگری ملتی ہے۔"

"اچھا؟" اعجاز بے خیالی سے بولا، "پھر تو ٹھیک ہے۔"

"میری مرضی ہے جاؤں یا نہ جاؤں،" سرفراز بیتابی سے بولا۔

اعجاز ایک منٹ تک خاموش رہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ باہر جاتے ہُوئے وہ ہولے سے بولا، "تُمہاری مرضی ہے بھئی جاؤ، کیوں نہیں جاتے۔ یہ بھی اچھی لائن ہے۔"

سورج سَر سے ڈھل رہا تھا۔ گھر کی دیواروں سے لپٹی ہُوئی دھوپ سہ پہر کی خاموشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ کمال رازداری سے یہ سکوت سرفراز کے دِل میں راہ پا گیا تھا۔

"تمہاری مرضی ہے بھئی۔" اعجاز کے اِن چار الفاظ نے اُس کے اندر ایک وسیع، یخ بستہ خلاء پیدا کر دیا تھا۔ اِس وسعت میں اس نے اپنے آپ کو ایک ہی جست کے اندر لڑکپن کی حدود سے نِکل کر جوانی میں داخل ہوتے ہُوئے دیکھا، جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق اقدام کرنے پر قادر بنا دیا گیا تھا۔ اِس مہیب ذمہ داری کے احساس نے اُس کے دِل میں خوف کی پرچھائیں پیدا کر دی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے محسوس کیا کہ جن سینکڑوں تاروں سے وہ اعجاز کے ساتھ بندھا ہُوا تھا اُن میں سے ایک تار کہیں سے چھنک کر ٹوٹ گئی ہے۔ دروازے سے باہر جاتی ہُوئی اعجاز کی پشت دیر تک اُس کی نظروں کے سامنے رہی اور زندگی میں پہلی بار سرفراز نے دنیا میں اپنی ذات کے اکیلے پن کو ایسی شدت سے محسوس کیا کہ اُس کے اندر کا خلاء پھیل کر اُس کے گرداگرد لپٹ گیا۔ سود وزیاں کے اِس گھنے احساس کو تھامے وہ چارپائی پہ گم سم بیٹھا رہا۔ سامنے والی سفید مٹی کی دیوار پر چمکتی ہُوئی دھوپ نے شیشے کی شکل اختیار کر لی جو اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے، بیچ سے آہستہ آہستہ تڑخنے لگا۔

حصّہ پنجم

باب 8

ہم چھ لڑکے تھے۔ دو ٹیکسیوں میں بمشکل ہم اور ہمارا سامان آیا۔ ٹیکسی والوں نے ہمارا سامان اُتارا اور ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ ہم وہاں کھڑے تھے کہ ایک ہونق سی حجامت والا لڑکا ہمارے پاس سے گزرتا گزرتا رُک گیا۔ بد قسمتی سے میں آگے کھڑا تھا۔ لڑکا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا،

"وِچ پلیس ڈو یو ڈِسگریس؟"

"جی؟" میں نے پوچھا۔

"واٹ اِز جی؟ نو جی شی ہیئر" وہ بولا ، "سپیک اِن انگلش یو پیزنٹ۔"

"یس،" میں نے کہا۔

"یس سر" وہ چیخ کر بولا۔

"یس سر۔"

"وچ پلیس ڈو یو ڈسگریس؟"

"آئی ڈونٹ انڈرسٹینڈ۔"

"سر" وہ پھر چیخا۔

"سر" میں نے دہرایا۔

"آئی ایم آسکنگ یو، وچ پلیس ڈو یو کم فرام؟"

"شجاع آباد سر۔"

"ویئر از دیٹ ڈمپ؟"

"نیئر لاہور سر۔"

"سو آئی ایم رائٹ، یو آر این اَن ایجوکیٹڈ پیزنٹ۔"

میں خاموش رہا۔

"آنسر می،" وہ پھر چیخا۔

"یس سر" میں نے کہا۔

"یس سر واٹ؟"

"آئی ایم اے پیزنٹ سر۔"

"این اَن ایجو کیٹیڈ پیزنٹ۔"

"این اَن ایجو کیٹیڈ پیزنٹ سر۔"

پہلے اُس نے ہم چھ لڑکوں پہ، پھر ہمارے کالے اَور براؤن بکسوں پہ، جو ہم نے یہاں آنے سے پہلے اپنے بازار سے نئے خریدے تھے، ایک حقارت آمیز نظر پھینکی، جیسے کہ وہ ہمیں اَور ہمارے سوٹ کیسوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھتا ہو۔

"وِس ٹَریش،" وہ ہمارے سامان کی جانب اشارہ کر کے بولا، "مائی فادر وِل لفٹ آر یور فادر وِل لفٹ؟"

اگر دنیا میں کہیں پر بھی کوئی اور لڑکا مجھ سے ایسی بات کرتا تو وہ اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ بات ابھی اُس کے مُنہ میں ہوتی اَور وہ زمین پہ گرا ہوا ہوتا اَور میں اُس کے اُوپر چڑھا ہُوا ہوتا۔ گاؤں کے ماحول میں پل بڑھ کر اَور کچھ نہیں تو کم از کم اِتنی ہمت تو آ جاتی ہے۔ مگر اُس وقت معاملہ عجیب و غریب تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ میں کسی پہاڑی علاقے میں آیا تھا۔ ایک دفعہ کالج کے دُوسرے سال ہم چاروں ساتھیوں کا پروگرام بنا تھا کہ مری کی سیر کو جایا جائے۔ مگر آخری وقت پر غلام حسین اَور سلیم کے پاس پیسے پورے نہ ہوسکے اَور پروگرام ختم ہو گیا تھا۔ اب اِس مقام پہ بلند و بالا پہاڑ اَور طویل القامت درختوں کے جنگلات کو دیکھ کر ہم پہلے ہی کچھ خم کھا چکے تھے۔ پھر اکیڈمی کی عمارت، اس کے سبزے اَور سڑکوں کی صفائی ایسی کہ فالتو پرزہ کہیں گرا ہُوا دکھائی نہ دیتا تھا، خوش لباس ملازمین ایسی سبک قدم چال والے کہ جیسے ہوا پہ چل رہے ہوں، اِس تمام تر نظام کا دبدبہ ہماری حسیات پہ اثر کر چکا تھا۔ اُوپر سے ایک نوجوان لڑکا جو ہماری عُمر کا تھا مگر اپنے سر کی سفاک حجامت کے باعث خونخوار نظر آتا تھا، تلوار کی دھار کی مانند اِستری شدہ پتلون قمیض اور چمکتے ہُوئے جوتے پہنے، تنی ہُوئی چھاتی سے چلتا ہُوا آیا تھا اَور ہم سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوا تھا کہ جیسے حکم چلانے کا اختیار اُس کو قدرت کی جانب سے ملا ہُوا ہو۔ ہم میں سے کسی ایک کی بھی زبان نہ کھل سکی۔

"نو۔۔۔" ہمارے ساتھی شوکت نے جُرأت کر کے جواب دینا شروع کیا۔

"نو سر" شوکت نے کہا۔

"پک اِٹ اَپ۔"

ہم نے غیر یقینی سے نظروں سے اپنے سامان کی جانب دیکھا۔

"پک اِٹ اپ۔ پک اِٹ اپ۔"

ہم نے فوراً اپنے اپنے بکس اَور تھیلے اٹھا کر کندھوں پر رکھ لِئے اور کھڑے اُس کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"گو ٹو دیٹ بلڈنگ" اِس نے ایک بیرک نما عمارت کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ہم اُس کی طرف چل پڑے۔

"ڈبل اَپ" وہ بولا۔

ہم تیز تیز چلنے لگے۔

"ڈبل اپ۔" وہ اتنے زور سے چیخا کہ ہم ڈر کے مارے دوڑ پڑے، مگر اُس کے الفاظ مستقل ہمارا پیچھا کرتے رہے، "ڈبل اپ، ڈبل اپ، ڈبل اپ---" اُس کی آواز کے ساتھ ساتھ ہم تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ اپنا بھاری سامان کچھ کندھوں، کچھ سروں پر اٹھائے دو سو گز تک دوڑتے ہوئے جب ہم لکڑی کی اُس عمارت تک پہنچے تو سینے میں ہماری سانس بند ہونے کے قریب تھی۔ یہ کیڈٹ کمپنی آفس تھا۔ وہاں پہ ایک سنجیدہ، نیم خوشگوار شخص نے سینئر انڈر آفیسر کے نام سے اپنا تعارف کرایا، اَور ہمیں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ہم چھ لڑکوں کو فرسٹ کیڈٹ بٹالین کی طارق کمپنی میں متعین کیا گیا۔ ہمارے ساتھ مزید پانچ لڑکے آ شامل ہوئے تھے جنہیں صلاح الدین کمپنی نے بھیجا گیا۔ پھر سینئر انڈر آفیسر نے ہمیں ایک جمعدار صاحب کے حوالے کیا جن کا تعارف "این سی او گل نواز" کر کے کرایا گیا۔ اُس کی ڈیوٹی ہمیں اپنے "کوارٹرز" تک پہنچانے کی تھی۔ این سی او گل نواز جو کیڈٹ کمپنی آفس میں خاموشی اَور قاعدے سے کھڑا رہا تھا، باہر نکلتے ہی ایک درندہ بن گیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک دھاڑ نکلی۔ یہ آواز اِتنی غیر متوقع تھی کہ ہم چونک کر تقریباً اچھل پڑے۔

"آن یور ہیڈز،" اس نے ہمارے بکسوں کی جانب اشارہ کر کے کہا، جنہیں ہم ہاتھوں میں لٹکائے لِئے جا رہے تھے۔ ہم جو گھر سے روانہ ہوتے ہی اپنے آپ کو افسر تصور

کرنے لگے تھے، اس جمعدار کے حلم پر اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ جب وہ دوسری بار دھاڑا تو اُس کی لمبی لمبی مونچھوں والے غضبناک چہرے کو دیکھ کر ہم نے بے چوں وچراں اپنے بکس اٹھا کر کندھوں پر رکھ لئے۔ ہمیں پوری توقع تھی کہ اب وہ ایک اَور دھاڑ مارے گا اَور ہمیں دوڑ لگانے کا حکم دے گا۔ اِس خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنی چلنے کی رفتار معمول سے تیز کر دی۔ جب اُس شخص کی جانب سے مزید کوئی گرج پیدا نہ ہوئی تو ہمارے دِل کو کچُھ تسلی ہو گئی۔ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ آگے ہم نے ایک لڑکے کو اپنا راستہ کاٹ کر گزرتے ہُوئے دیکھا۔ فاصلے سے یہ وہی لڑکا دکھائی دیا جس نے آتے ہی ہمیں اپنا سامان سر پہ اٹھوایا تھا۔ نزدیک آنے پر وہ کوئی اَور لڑکا نِکلا، جو اپنی حجامت اَور اِستری شدہ پتلون اَور چمکتے ہُوئے سیاہ بوٹوں سے عین اُس پہلے لڑکے کی کاپی معلوم ہوتا تھا، اَور اُس نے حرکت بھی ویسی ہی کی۔ وہ چستی سے چلتا ہُوا کہیں جا رہا تھا، ہمیں دیکھ کر رک گیا۔ جیسے ہی اُس کے قریب پہنچے وہ چلّا کر بولا،

"ڈبل اپ، یو لیزی کریچرز۔ ڈبل اپ۔"

ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ اب ہم گل نواز کی ماتحتی میں ہیں اَور مزید خطرات سے محفوظ ہیں۔ ہم نے گویا مدد کے لِئے گل نواز کی جانب دیکھا۔ اُسی وقت گل نواز مُنہ کھول کر اپنی گرجدار آواز میں چیخا، "ڈبل اَپ،" جیسے کہ اُس لڑکے کی نقالی کر رہا ہو۔ حکم دے کر وہ خُود بھی ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ہمارے پاس اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُس کے ساتھ الٹے سیدھے قدم ملا کر دوڑنے لگیں۔

ہماری یہ دوڑ ایک عمارت اَور دو کھیل کے میدانوں کو پار کرنے کے بعد ہمارے کمروں پہ آ کر ختم ہُوئی جو کم و بیش تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ہمیں اپنے اپنے کمرے دِکھا کر گل نواز نے کُتے کی بھونک کی مانند آخری بار مُنہ کھولا۔

"ڈِنر سیون پی۔ ایم شارپ۔ طارق کمپنی میِس اِز دیئر،" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

کمروں میں داخل ہو کر ہم نے اپنے بکس یوں زمین پہ پھینکے جیسے کسی مردہ جانور کو پیٹھ پر لاد کر لائے ہُوں۔ اب ہمیں معلوم ہو چُکا تھا کہ افسر بننا رہا ایک طرف، ہم تو یہاں پہ سپاہی سے لے کر اُوپر تک ہر ایک کے ماتحت تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ اپنی سانس

برابر کریں، جو اس قدر پھول گئی تھی کہ چھاتی کے اندر دم ختم ہو چکا تھا۔ دُوسرا مینس تک پہنچنے کا مسئلہ تھا جو میدانوں کے پار بائیں طرف واقع تھا۔ راستے میں ایک لمبی عمارت آتی تھی جس کے برآمدے میں چند لڑکے کھڑے تھے۔ یہ ہو بہو اُسی قسم کے نوجوان تھے جنھوں نے ہمیں حکم دے کر دوڑنے کی سزا دی تھی۔ اگر قد کے اِنچ دو اِنچ فرق کو نظرانداز کر دیا جاتا تو لگتا تھا کہ سب ایک ہی سانچے سے ڈھل کر نکلے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر ہماری رہی سہی جان بھی نِکل گئی۔ ہم نے اپنے کمروں کے دروازے بند کئے اَور بستروں پہ ڈھے گئے۔ ہمارے پاس صِرف ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

بیس منٹ کے بعد کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں مُردے کی طرح بستر سے اٹھا۔ میرا ایک ساتھی آصف کھڑا تھا۔ وہ اَندر آ کر سیدھا بستر پہ بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے خاموشی سے قمیض کے دو بٹن کھولے اَور کالر کھینچ کر مجھ اپنا کندھا دکھایا۔ اُس کی گردن سے لے کر شانے تک ایک انتہائی خوفناک قسم کی خراش کا نشان تھا، جس پہ خُون کے باریک قطرے جمے ہُوئے تھے۔

"یہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے اٹیچی کیس کے بکسوئے نے کاٹ دیا ہے،" وہ بولا۔ "تم دکھاؤ۔"

گو میرے شانے پہ بھی مستقل درد اُٹھ رہا تھا مگر تھکاوٹ کے مارے میں نے اِس کی جانب دھیان نہ دیا تھا۔ میں نے بٹن کھولے اَور گردن موڑ کر دیکھا۔ میرا شانہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

"بچ گئے ہو،" آصف نے دیکھ کر کہا۔ "میں نے جلدی میں بکسوئے والا حصہ کندھے پر رکھ لیا تھا۔"

"تمھیں اِس پر ڈریسنگ کرنی چاہیے،" میں نے کہا۔ "خُون نِکل رہا ہے۔ زخم بن جائے گا۔"

"چھوڑ یار۔ میں ابھی صابن سے دھو لیتا ہُوں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے تو پیٹ میں بھوک سے درد ہونے لگا ہے۔ اب تُم تیار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے اپنے بکس سے دُھلے ہُوئے کپڑے نکال کر بستر پہ پھیلائے۔ ٹھونس

ٹھونس کر بھرے ہُوئے کپڑوں میں گہری شکنیں پڑ گئی تھیں۔ ہاتھوں سے دبا دبا کر میں نے شکنوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہُوئی تو پتلون، سویٹر اور ٹائی کو حتی الوسع ہموار کرکے اُوپر بھاری بکس رکھ دیا۔ پھر میں نے جلدی سے غسل شروع کیا۔ غسل خانے کے شیشے میں اپنی خراش کی پُوری لمبائی کو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ گردن سے لے کر کندھے کے نیچے تک رگڑ کھا کھا کر جلد اِس قدر سرخ اَور اُبھری ہُوئی تھی جیسے ابھی اُچھل کر باہر نِکل آئے گی۔ میں نے غسل کرکے صاف کپڑے پہنے۔ کپڑوں کی شکنیں اُسی طرح نمایاں تھیں۔ اب ہمارے پاس صِرف پندرہ منٹ تھے اَور ہم سب تیار ہو کر ایک ساتھ برآمدے میں کھڑے دُور سے اپنے میس اَور راستے میں پڑتی ہُوئی عمارت کو دیکھ رہے تھے۔ اب اُن کمروں کے باہر صِرف دو لڑکے کھڑے باتیں کر رہے تھے، مگر ہمیں پتا چل چُکا تھا کہ ہم سب کے لِئے صِرف ایک لڑکا ہی کافی سے زیادہ ثابت ہو سکتا تھا۔

"یار ایک تو انگریزی بول بول کر میری زبان اکڑ گئی ہے۔" اشرف نے کہا۔

"این سی او بھی انگریزی بولتا ہے،" آصف متانت سے بولا، جیسے کوئی اہم خبر سُنا رہا ہو۔

"تم تو کچھ بولے ہی نہیں،" شوکت نے کہا۔

"میں نے کئی بار یس سر کہا تھا،" اشرف نے جواب دیا۔

"سینئر انڈر آفیسر سے میں نے ہی ایک سوال کیا تھا۔"

"کیا سوال تھا؟"

"اب یاد نہیں رہا۔"

"دوڑ دوڑ کر تم ساروں کی مت ماری گئی ہے،" برکت بولا، جو اتھلیٹ رہا تھا اَور ہم سب سے زیادہ ہوش میں تھا۔

"وہ کیڈٹ کالجیئے جو دُوسری کمپنی میں گئے ہیں خُوب انگریزی بول رہے تھے،" اشرف رشک بھرے لہجے میں بولا۔

"اُن کی شکل صورت بھی انہی لوگوں کی طرح ہے،" آصف بولا۔

"اُن کالجوں سے یہ آدھے کیڈٹ تو بن کر ہی نکلتے ہیں۔"

"یار کیا وقت ضائع کر رہے ہو،" برکت بولا "دس منٹ رہ گئے ہیں۔ چلو

"میرے ذہن میں ایک سکیم ہے،" آصف نے کہا۔ "پچھلی طرف سے نِکل چلیں۔"

"نِکل جائیں۔"

"کیسے نِکل سکتے ہیں؟ اُدھر سے رستہ ہی بند ہے۔"

"ایک چھوٹا سا رستہ لیفٹ کو جاتا ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اوپر آ کے دیکھو، یہاں سے نظر آتا ہے۔"

"ہے تو سہی۔ کسی کمرے کو جاتا ہُوا لگتا ہے۔"

"چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم سب اُوپر کو چل پڑے۔ راستہ کمرے کو ہی جاتا تھا، مگر کمرہ بیٹھک کی طرز کا تھا اور خالی پڑا تھا۔ ہم اُس میں داخل ہو کر دُوسرے دروازے سے نِکلے تو پیچھے ایک باغیچہ تھا۔ پودوں کو پھلانگتے ہُوئے ہم آخر ایک تنگ سے پتھریلے راستے پر جا نِکلے جہاں سے میس کا راستہ صاف تھا۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

میس کے دروازے پر چار لڑکے کھڑے تھے، جو چاروں کے چاروں جڑواں بھائی معلوم ہوتے تھے، گویا یہی لباس اور حجامت لیے ماں کے پیٹ سے برآمد ہُوئے ہوں۔

"لک ایٹ دیئر ہیر کٹ،" ایک نے دُوسرے سے کہا۔ "اے، یُو،" وہ ہمیں مخاطب کرکے بولا، "کم ہیئر۔ یو کانٹ گو اِن دیئر وِد یور لانگ ہیئر۔ ڈونٹ یو ہیو اے برش؟" "ڈِپ یور ہیڈ اِن ہیر،" دُوسرے نے ایک پانی سے بھرے ہُوئے ٹب کی جانب اشارہ کرکے ہم سے کہا۔

ہم حیرت زدہ ہو کر کھڑے رہے، جیسے زمین نے ہمارے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔

"کم آن۔ کم آن،" پہلا بولا، "ڈو یو وانٹ یور ڈِنر آر ناٹ؟"

"لیس،" برکت نے جواب دیا۔

"سر،" لڑکا چیخا۔

"سر،" برکت نے دُہرایا۔

"یو وانٹ یور ڈنر، یو ڈِپ یور ہیڈ اِن ہیئر اینڈ ارینج یو ہیئر پراپرلی۔ آر نو ڈِنر۔

گو بیک۔ گیٹ آوٹ آف ہیئر۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد برکت آگے بڑھا۔ اُس نے ٹب کے دونوں کناروں پہ ہاتھ رکھے اور جھک کر اپنے بال پانی میں ڈبو دیئے۔

"ڈاوَن،" لڑکے نے حکم دیا۔

برکت نے کانوں تک سر کو پانی میں ڈبویا۔

"ناٹ اِی نف۔ ڈاوَن۔ ڈاوَن،" لڑکا حکم صادر کرتا گیا۔ "ڈاوَن بوائے، ڈاوَن،" حتیٰ کہ برکت کی ناک پانی میں ڈوب گئی۔ چند سیکنڈ تک وہ سانس روکے اُسی حالت میں ٹھہرا رہا، پھر اُس کا دم ختم ہوا تو اُس نے گھبرا کر سر پانی سے نکال لیا۔ وہ سر کو ہاتھوں میں تھامے جھکا جھکا برآمدے کی سیڑھیوں تک گیا اور بالوں سے ٹپکتا ہوا پانی نچوڑنے لگا۔

"آرگنائز دیم" دُوسرا لڑکا بھونکا۔

برکت نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اُنہیں سنبھالا۔

"وِد یور پام، پریس دیم۔ ڈاوَن۔ ڈاوَن۔"

برکت دونوں ہتھیلیوں سے بالوں کو دبا دبا کر جماتا گیا حتیٰ کہ گیلے بال کھوپڑی کے ساتھ جڑ گئے۔

"ناؤ یُو،" پہلے لڑکے نے اشرف سے کہا۔

ایک کے بعد ایک، ہم سب کو اِسی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اُس کے بعد ہمیں میس میں جانے کی اجازت ملی۔ ہم ہال میں بچھی ہُوئی لمبی سی میز کے ایک کونے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہال میں دس بارہ ایک جیسے لڑکے دو ٹولیوں میں کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہمیں استہزائیہ نظروں سے دیکھتے اُور مسکرا کر مُنہ پھیر لیتے۔ اب صورت یہ تھی کہ اُس چمکتے ہُوئے صاف شفاف ہال اُور چست لباسوں والے لوگوں کے درمیان ہم چھ لڑکے اپنے ڈھیلے ڈھالے شکنوں والے کپڑے پہنے، بالوں کو کھوپڑیوں پہ لیپ کئے جن سے پانی کے قطرے گر کر ہماری کالروں کو گیلا کر رہے تھے، میز کے آخر میں سمٹ کر بیٹھے تھے اُور کوئی بیرا ہماری جانب توجہ نہ دے رہا تھا۔ بھوک سے ہماری انتڑیاں کلبلا رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد پانچ چھ کیڈٹ کالجیئے لڑکے آ کر ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ ان سب کے بال بھی گیلے تھے۔ مگر وہ ہماری طرح مصیبت زدہ دکھائی نہ دے رہے

تھے بلکہ آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، جیسے کہ اِس ساری کارروائی کو مذاق کی حد تک تصور کر رہے ہوں۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ساری رات وہاں بیٹھے رہیں گے اور کوئی ہماری جانب توجہ نہ دے گا۔ آخر تقریباً پندرہ منٹ کے بعد، جو ہمیں پندرہ گھنٹے کے برابر لگے، بیرے کھانے لے کر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ چھری کانٹے کے ساتھ کھانا مطلوب تھا۔ جس کا سلیقہ ہم سب میں صرف شعیب کو تھا۔

"میری طرف دیکھتے جاؤ" وہ سرگوشی میں بولا۔ "جیسے میں کروں ویسے ہی کرتے جاؤ۔"

جیسے تیسے ہم نے کھانا ختم کیا۔ کیڈٹ کالجیئے اعتماد سے چھری کانٹا استعمال کر رہے تھے۔ ہمیں اس رات کو ہی اُن سے حسد ہو گیا تھا، گو وقت گزرنے کے ساتھ اپنی ٹرم کے سب لڑکوں کی آپس میں دوستی اور ہمسری کی روایت قائم ہوتی گئی تھی۔ کھانا ختم کرتے ہی ہم ایسے بے آواز انداز میں کرسیوں سے اُٹھے کہ ہال میں موجود کافی سارے لوگوں کو خبر نہ ہوئی۔ ہمارے دِلوں میں وسوسہ یوں گھر کر چکا تھا کہ ہم کنکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھتے ہوئے، ٹیڑھے ٹیڑھے چلتے ہوئے وہاں سے نکلے جیسے لوگ مقدس مزاروں سے پچھلے پاؤں نکلتے ہیں۔ باہر آ کر ہم نے تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس بھر کر سینہ صاف کیا۔ اپنے تئیں ہم اب دن بھر کی کارروائی سے عہدہ برا ہو چکے تھے۔ چنانچہ جس پچھلے راستے سے آئے تھے اُسے چھوڑ کر سیدھے رستے واپس ہو لیئے۔

ابھی ہم چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ ایک باوردی آدمی، جو شاید حوالدار یا جمعدار یا صوبیدار تھا، ایک دم کہیں سے ایسے ظاہر ہوا جیسے کوئی جنگلی جانور کسی جھاڑی کے عقب سے جست بھر کر نکلتا ہے۔ نکلتے ہی اُس کے حلق سے الفاظ ایسی آواز میں برآمد ہوئے جیسے بارود کا گولہ پھٹتا ہے۔

"ڈبل اپ، یو لیزی بگرز۔ ڈبل اپ۔"

ہم اُچھل کر دوڑ پڑے، اور دوڑتے دوڑتے اپنے کمروں میں جا کر رُکے۔ اُس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کب مَیں نے اُٹھ کر کپڑے بدلے اور کب سویا۔ مگر اکیڈمی میں وہ پہلے دن کا دن مجھے عمر بھر یاد رہے گا، جس کے دوران ہمیں علم ہوا تھا کہ وہاں پہ ہم، سپاہی سے لے کر اُوپر تک ہر ایک کے صرف ماتحت ہی نہیں بلکہ زر خرید غلام تھے۔

اگلے روز نائی نے ہمارے سروں کے گرد بھی اونچی اونچی مشین پھیر کر گردن اور

کان ننگے کر دیئے۔ پھر درزی نے ہماری وردیاں سینے کے لئے ماپ لئے۔ اگلے ہی روز ہماری چست وردیاں سل کر آ گئیں۔ جب ہم نے وہ پہنیں اور کالے بوٹ چڑھائے تو مجھے محسوس ہوا کہ ہماری چال ہی بدل گئی ہے۔ ساتھ اپنے بالوں کی کٹائی کی وجہ سے شکل بھی بدل چکی تھی۔ دو دن میں ہی ہمارے اندر اعتماد پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ انسانوں کو ایک منظم گروہ، خواہ وہ کیسا ہی عجیب الخلق کیوں نہ ہو، اپنے ارکان کو کس طرح شمولیت، تحفظ اور قوت مہیا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ابھی ہمارا کورس شروع بھی نہ ہوا تھا۔

چوتھے روز جب کورس باقاعدہ طور پر شروع ہوا تو دن بھر کا پروگرام دیا گیا جو اس طرح تھا: صبح چھ سے سات پی۔ٹی۔ سات سے آٹھ پریڈ۔ پھر ایک گھنٹہ غسل، لباس بدلنے، اور ناشتہ کرنے کے لئے، جو پریڈ میدان سے کمرے، کمرے سے میس اور میس سے کلاس روم کے درمیان دوڑ لگاتے لگاتے ہی گزر جاتا۔ نو سے گیارہ پڑھائی کی کلاسیں، جن میں ملٹری سبجیکٹ پڑھائے جاتے۔ بارہ بجے دوپہر کا کھانا، ایک سے دو بجے تک ریسٹ، دو سے چار پریڈ، چار سے چھ گیمز، سات بجے ڈنر، ڈنر کے بعد ایک دو گھنٹے پڑھائی کے لئے اور پھر لائٹ آف۔ کہنے کو دن کے دوران ریسٹ کے تین گھنٹے تھے، مگر کمرے میں جاتے جاتے جو کوئی چھوٹا بڑا مل جاتا، یا دور سے دیکھ ہی لیتا، وہیں پہ پکڑ لیتا اور وہ جو کچھ کرنے کو کہتا وہی کرنا پڑتا۔ کسی سوال جواب کی گنجائش نہ تھی۔

جس روز اشرف کا نام شرفی بکرا اور برکت کا برکی نیولا رکھا گیا اُس دن ہم اپنے کمروں کو جاتے ہوئے ابھی کچھ دور ہی تھے کہ دوسری ٹرم کے کیڈٹ مجید اللہ نے ہمیں دیکھ لیا۔

"یو" وہ بولا، "نیل ڈاؤن۔ آل آف یو۔"

ہم کھڑے کھڑے جھکے تو وہ بولا، "ناٹ لائیک دس۔ لائک اے فراگ۔ کم آن، اے فراگ، اے فراگ، لائیک اے فراگ۔"

ہم نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر مینڈک کی شکل اختیار کر لی۔

"ناؤ فراگ مارچ ٹو یور روم۔ گو آن۔ کوئک۔ فراگ مارچ۔"

ہم مینڈک کی طرح پھدک کر چلتے ہوئے اپنے کمروں تک آئے۔

"واٹ آر یُو کالڈ؟" مجید اللہ نے اشرف سے پوچھا۔
"اشرف سر۔"
"آئی وِل کال یُو شرفی۔"
"یس سر۔"
"ناؤ ایمیجن دیٹ یو آر اے گوٹ۔"
"یس سر۔"
"گو آن۔ سپیک لائیک اے گوٹ۔" اشرف نے میں ایں ایں کر کے بکرے کی مانند آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔
"اینڈ یُو؟" مجید اللہ نے برکت سے پوچھا۔
"برکت سر۔"
"بلڈی پیزنٹ نیم۔ فرام ٹوڈے یُو آر برکی، اینڈ یو لُک لائیک اے مانگوس۔"
"یس سر۔"
"یو نو ہاؤ ڈز اے مانگوس سپیک؟"
"یس سر۔" یہ کہہ کر برکت نے چر رچر ر کی آواز پیدا کی۔
"گو آن، گو آن۔"
برکت نے چر رچر ر کی گردان شروع کر دی۔
"آل رائٹ، شاپ۔" مجید اللہ اشرف کی جانب انگلی اٹھا کر بولا، "اینی ٹائم یُو سی می، یُو سٹارٹ سپیکنگ ایز اے گوٹ۔ اینڈ یُو" وہ برکت سے مخاطب ہوا، "آلویز سپیک لائیک اے مانگوس یُو انڈر سٹینڈ؟"
"یس سر،" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔
"اِف یُو فورگیٹ، یو شیل بھی پنشڈ۔ اوکے؟"
"یس سر۔"
پنشمنٹ سے ہماری جان جاتی تھی۔ اگر کوئی سینئر پریڈ سے واپسی پر ہمیں دیکھ لیتا اور اُسے سزا دینے کی سوجھتی تو وہ کِٹ سمیت ہمیں روک کر ڈبل آپ کرا دیتا اور خُود کھڑا دیکھتا رہتا۔ یوں ہمارا ریسٹ کا گھنٹہ گراؤنڈ میں دوڑتے ہوئے گزر جاتا۔ جب تک کہ

ہماری ٹانگیں یا پھیپھڑے جواب نہ دے جاتے۔ حکم عدولی نام کی کوئی چیز یہاں پہ تھی ہی نہیں۔

اُس دِن کے بعد شرفی بکرا اَور برکی نیولا کا نام اُن دونوں کے ساتھ یوں نتھی ہوا کہ عمر بھر چپکا رہا۔ کچھ عرصے تک مجید اللہ کا دستور بن گیا کہ وہ بغیر پوچھے ہمارے کمروں کے دروازے کھول کر اندر گھس آتا۔ شرفی اُسے دیکھتے ہی بکرے کی مانند میں اِیں اِیں کرنے لگتا اَور برکت کے کمرے میں برکی نیولے کی طرح چرر چرر شروع کر دیتا۔ پھر ایک بار یہ تماشا مجید اللہ پہ اُلٹ پڑ گیا۔ وہ برکت کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر داخل ہوا تو اتفاق سے شرفی بھی وہاں بیٹھا تھا۔ مجید اللہ کی شکل دیکھتے ہی برکی اُچک کر اپنے بستر پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا اَور چرر چرر کرنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی شرفی نے اُٹھ کر میں اِیں اِیں کی رٹ لگا دی۔ مگر مجید اللہ اکیلا نہ تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سینئر انڈر آفیسر صبغت اللہ تھا جو کمروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو چند لمحوں تک آنکھیں پھاڑے دونوں لڑکوں کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجید اللہ نے ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش کرایا۔

"واٹ اِز گوئینگ آن؟" سینئر انڈر آفیسر نے مجید اللہ سے پوچھا۔

"سر دِیز فرسٹ ٹرمرز آر اِن دی ہیبٹ آف ڈوئینگ دِس" مجید اللہ شرمندہ سا ہو کر بولا۔

سینئر انڈر آفیسر نے سنجیدگی سے کمرے کی اِنسپکشن کی اَور دونوں کمرے سے نِکل گئے۔ اُس دِن کے بعد مجید اللہ نے شرفی اَور برکی کو منع کر دیا۔

شرفی کو سب سے زیادہ سزا ملتی تھی۔ وہ سخت مسخرہ آدمی تھا اَور کسی موقعہ پر بھی شرارت سے باز نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہم سب کو مشکل میں ڈال دیتا تھا۔ ایک بار ہم فلم شو دیکھ رہے تھے۔ کوئی پُرانی سی امریکی فلم تھی جس میں بیسیوں عورتیں نہانے کا مختصر لباس پہنے اِدھر اُدھر چلتی پھرتی اَور سوئمنگ کرتی دکھائی گئی تھیں۔ ایک سین میں انہی لڑکیوں کا کورس ڈانس آیا تو شرفی نے سیٹی بجا دی۔ یہ بات ڈسپلن کے خلاف تھی، خاص طور پہ سینئرز کی موجودگی میں یہ حرکت قابل سزا تصور کی جاتی تھی۔ سیٹی کی آواز پہ سینئرز نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم سے اگلی قطار والوں کو پتا چل گیا تھا کہ سیٹی شرفی کے منہ سے نِکلی تھی۔ ہمیں علم تھا کہ فلم کے اختتام پر وہیں پہ انکوائری ہو گی اَور شرفی کی شامت

آ جائے گی۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ہمارا چھ کا گروپ ساتھ ساتھ بیٹھا تھا۔ سب نے اسی طرح سیٹیاں بجانی شروع کر دیں، جو سیدھی سادھی سیٹیاں نہ تھیں بلکہ اُن میں "شی" کی آواز شامل تھی۔ ہمارے ساتھ ہی صلاح الدین کمپنی والے کیڈٹ کالجیئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اُس وقت ہمارا ساتھ دیا۔ اب صورت یہ تھی کہ سکرین پر ننگی ٹانگوں والی لڑکیوں کا کورس ڈانس ہو رہا تھا اور ہماری تقریباً ساری قطار سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گو یہ تماشا صِرف چند سکینڈ رہا، مگر سامعین میں کھلبلی مچ گئی۔ سینئرز غصے سے مڑمڑ کر دیکھ رہے تھے۔ باقی کی فلم خاموشی سے دیکھی گئی۔ جیسے ہی لوگ فلم دیکھ کر اُٹھے، ہماری قطار کو فال اِن کرا لیا گیا۔

"ہُو وِسلڈ؟" سینئر انڈر آفیسر نے سوال کیا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

"آئی سے ہو دی بگر وسلڈ فرسٹ؟ سپیک۔"

سب خاموش کھڑے اپنے اپنے سامنے دیکھتے رہے۔ ہم پنشمنٹ کے لیے تیار تھے۔

"آل رائٹ یُو آل۔ یُو وِل ناٹ واک ٹو یُور رُومز۔ نیدر وِل یُو رن۔ یُو وِل گو ٹو یور رُومز سمرسالٹنگ فرام ہیئر۔ ناٹ آن یور ہینڈز بٹ آن یور ہیڈز۔ یو انڈرسٹینڈ واٹ دیٹ از؟"

"یس سر۔"

"ڈِسکرائیب اِٹ۔"

"قلابازیاں سر۔"

"رائٹ۔ سٹارٹ،" وہ بولا، پھر ایک دم چیخا۔ "ناؤ!"

فلم شو اوپن ایئر میں ہوا تھا۔ اُس سے پہلے بارش ہو کے ہٹی تھی۔ ہماری قطار کی قطار کیچڑ، پتھروں اور گیلی زمین پر قلابازیاں کھانے لگی۔ رستہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ آخر آدھ گھنٹے کے بعد ہم اپنے کمروں تک پہنچے۔ ہماری حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ سر، ہاتھ، منہ اور کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت تھے۔ کئی کے ہاتھوں پر خراشیں آ گئی تھیں۔ وہ شام تو ہم سب نے غسل خانوں میں اپنی مٹی اتارتے ہوئے گزاری۔ اگلا سارا

دِن ہم شرفی کے خلاف سکیمیں بناتے رہے۔ شرفی نے اُن سب کو جنھوں نے چہرے اور ہاتھوں کی خراشوں پہ پلستر چپکا رکھے تھے "سوری" کہا، مگر کسی نے جواب نہ دیا اور نہ اُس سے بات کی۔ رات کے کھانے کے بعد پڑھائی کے گھنٹے میں ہم سب دبے پاؤں شرفی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ صلاح الدین کمپنی والے کیڈٹ کالیجئے بھی چھپ کر آ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے شرفی کے کپڑے اُتارے اور صِرف انڈر ویئر میں اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ شرفی نے ذرا برابر مزاحمت نہ کی، جیسے بکرا رضامندی سے قربانی کو جا رہا ہو۔ پھر دو لڑکوں نے پکڑ کر اُسے سر کے بل کھڑا کر دیا۔ اُس کی پشت اور ٹانگیں لڑکوں نے دیوار کے ساتھ دبا کے رکھیں۔ باقی کے سب کرسی، میز، بستر اور زمین پہ اطمینان سے بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ باتیں کرنے یا کوئی بھی آواز پیدا کرنے کا موقع نہ تھا۔ کمرے میں چاروں طرف بیٹھے ہُوئے ہم لوگ سب یوں اِنہماک سے دیکھ رہے تھے جیسے کلاس میں بیٹھے ہُوئے سنجیدگی سے بلیک بورڈ کو دیکھ رہے ہوں۔ جب شرفی کا مُنہ بیربہوٹی کی مانند لال ہو گیا تو ایک منٹ کے لِئے اُسے سیدھا کھڑا کیا گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ ذرا صاف ہی ہوا تھا کہ دوبارہ اُسے اُلٹا کر دیا گیا۔ چند مرتبہ اُلٹا سیدھا کرتے ہوئے دس منٹ گزر گئے۔ آخری مرتبہ اُسے کئی منٹ تک الٹا رکھنے کے بعد جب شرفی کی آنکھیں اُبل پڑیں تو سب نے ایک دُوسرے کی جانب دیکھ کر خاموشی سے اثبات میں سرہلائے اور اس متفقہ فیصلے کی بنا پر شرفی کو سیدھا کھڑا کر دیا۔ ابھی اُس کی سانس برابر نہ ہُوئی تھی کہ اُسے بازوؤں سے پکڑ کر غسل خانے میں لے جایا گیا، جہاں سرد پانی کی بھری ہُوئی بالٹی تیار رکھی تھی۔ اُسے اٹھا کر شرفی کے سر پہ اُنڈیل دیا گیا۔ پھر کیڈٹ کالجیئے، جمال نے اپنے بیگ سے ایک پلاسٹک کا ڈبہ نکالا جو عموماً کھانے لے جانے کے لِئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جمال نے اُس کا ڈھکنا کھولا تو ڈبہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اُس گروپ کے درمیان طے تھا کہ جمال نے کیچڑ جمع کرتے ہُوئے ہاتھ گندے کئے تھے، چنانچہ اسے استعمال کرنے کا کام دُوسرے کریں گے۔ دو لڑکوں نے چلو بھر بھر کر کیچڑ شرفی کے سر اور بالوں پہ مل مل کر لیپ کر دیا۔ اِس عمل کے دوران شرفی نے مُنہ اور آنکھیں دبا کر میچ لیں، مگر شروع سے آخر تک اُس کے مُنہ سے آواز تک نہ نِکلی۔ جب کیچڑ ختم ہو گیا تو دونوں لڑکوں نے ہاتھ دھو کر خشک کئے۔ پھر ہم سب جیسے آئے تھے اُسی طرح خاموشی سے ایک دُوسرے کے پیچھے اُس کمرے سے نِکل کر اپنے کمروں میں چلے

گئے۔ اُس دِن کے بعد سے کیڈٹ کالجیوں کے ساتھ ہمارا اکا ہو گیا۔

اِسی طرح جانیں مارتے، سختیاں سہتے، سزائیں بھگتتے ہوئے خُدا خُدا کرکے، پہلی ٹرم ختم ہوئی اَور ہم سینیئرز میں شامل ہوگئے۔ عجیب بات تھی کہ فرسٹ ٹرم کے آخری دنوں میں ہمارے دلوں کے اندر اُس بدسلوکی کے بارے میں جو ہمارے ساتھ روا رکھی گئی تھی کوئی کدورت باقی نہ رہی تھی، بلکہ ہمارے خیال کے مطابق اُس کے ذریعے ہمیں یہ حق دے دیا گیا تھا کہ نئے فرسٹ ٹرمرز کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا ہمارے ساتھ کیا گیا تھا۔ دستور کے مطابق ہم نے وَیسا ہی کیا۔ اِس ٹرم میں کچھ شارٹ سروس کورس کے لڑکے بھی آئے تھے، جن کی خاص طور پر کھچائی کی گئی، کیونکہ ہمیں علم تھا کہ یہ لڑکے آٹھ نو ماہ میں ہی افسر بن جائیں گے جبکہ ہم لوگ ابھی تھرڈ ٹرم میں گھسٹ رہے ہوں گے۔ ہم اُن سے حسد بھی محسوس کرتے تھے، اَور ساتھ ہی اپنے آپ کو "پروفیشنل سولجرز" ہونے کی حیثیت سے اُن کے مقابلے میں اعلیٰ تر تصور کرتے تھے۔ اِن سب باتوں سے قطع نظر ہمارا روزانہ کا پروگرام وَیسا کا وَیسا ہی رہا۔ پہلی ٹرم کے مقابلے میں یہ دُوسری اکیڈیمک ٹرم تھی، جس کی کلاسوں میں بی۔ اے کے کورس کے مضامین پڑھائے جاتے تھے اَور اُسی حساب سے رات کے دو گھنٹے کی پڑھائی میں بھی محنت درکار تھی۔ اگرچہ پہلی ٹرم کی مشقت کے بعد ہماری جسمانی صحت کافی بہتر ہو چکی تھی، مگر دِن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد تھکاوٹ اب بھی ہم پہ اِس طرح نازل ہوتی تھی کہ نو بجے کے بعد آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ دِن والے ریسٹ کے ایک دو گھنٹے بھی پڑھائی کی نذر ہو جاتے تھے۔ اکیڈمی میں دِن کاٹے نہ کٹتا تھا، مگر ہفتے اَور مہینے یوں گزرتے تھے جیسے گھڑیاں اَور گھنٹے ہوں۔ میرے اکیڈیمک رزلٹ اَور دیگر کارکردگی کی بنا پر تیسری ٹرم میں مجھے پلاٹون کارپورل بنا دیا گیا تھا، جس کی وجہ سے میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فیلڈ کے فرائض کے علاوہ چھوٹے موٹے ڈسپلن کے معاملے بھی میرے زیرِ نگرانی آگئے تھے۔ اب ہم سزائیں بھگتنے اور سزائیں دینے کے کھیل کی منزلوں سے گزر کر اصل ذمہ داری سنبھالنے کی حیثیت میں آچکے تھے۔ اِس تجربے سے مُجھے پتا چلا کہ ہاں یا نہ میں فیصلہ صادر کرنے کے اختیار کا بوجھ کس قدر وزن دار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ مجھے اپنی تمام تر ٹرننگ اَور اصولوں سے بہ رضا منحرف ہونا پڑا تھا۔ ایک بار ایک شارٹ سروس

کمیشن والے لڑکے کا، جنہیں ہم آپس میں "شارٹیئے" کہتے تھے، کیس آگیا جس نے ہینڈ ٹو ہینڈ فائٹینگ کی ٹریننگ کے دوران اپنی بیونٹ گم کر دی تھی۔ ہتھیار گم کرنا ایک مس ڈیمیز تصور ہوتا تھا۔ اِس لڑکے کے ساتھ میری ہمدردی کچھ اس وجہ سے بھی تھی کہ اپنی جسمانی ساخت کے باعث، جو بھاری کولہوں، نمایاں تھنوں اور لچک دار چال والی تھی، اسے عرف عام میں زنخا کہا جاتا تھا اور شدید قسم کی کھچائی کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ مگر دماغی طور پر یہ لڑکا انتہائی ذہین تھا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو قاعدے سے میں نے اُسے مطلع کر دیا کہ ہتھیار گم کرنا ایک اہم معاملہ تھا اور انکوائری کے بغیر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دوبارہ اُس کی شکل دیکھی تو ایک لحظے کے لیے پریشان ہوگیا۔ اُس کا رنگ سرسوں کی مانند زرد اور آنکھوں میں حیوانی وحشت کا اثر تھا۔

"سر، مجھے نکال دیا جائے گا" وہ کانپتی ہُوئی آواز میں بولا۔ خوف کی وجہ سے وہ انگریزی میں بات کرنا بھی بھول گیا تھا۔

"یُو وِل ناٹ بھی تھروِن آوٹ،" میں نے کہا۔ "اونلی پنشڈ۔"

"نو سر،" وہ نفی میں سر ہلا کر بولا، "آئی وِل بی تھرون آوٹ۔ آئی وِل بی ڈیسٹرائیڈ۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کانپ رہا تھا۔

"آل رائٹ،" میں نے اِس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "ویٹ۔"

"آئی کم فرام اے پوئر فیملی سر۔"

"ویٹ۔ ویٹ۔"

میں نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے بچانا ہی پڑے گا ورنہ وہ نفسیاتی طور پہ تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ میں جھوٹ بول کر ذمہ داری اپنے سر لے لوں۔ میں نے پلاٹون سارجنٹ کے پاس جا کر سارا معاملہ صاف صاف بتا دیا۔ اُس نے مجھے نتائج کے بارے میں خبردار کیا، مگر میں نے اُسے قائل کر لیا کہ میں ساری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ جب پلاٹون کمانڈر کے سامنے پیشی ہُوئی تو میں اپنی "سٹوری" بنا چکا تھا۔ کیپٹن اسد اللہ پلاٹون کمانڈر کو میں نے بیان دیا کہ کیڈٹ نواز کھوکھر ہینڈ ٹو ہینڈ ایکسر سائز سے واپس آ رہا تھا تو میں اُس کی بیونٹ اُتار کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے بیونٹ میرے ہاتھ سے پھسل کر کھڈ میں جا گری۔ میں نے رسوں کی مدد سے لڑکے کھڈ میں

اُتارے، مگر بیونٹ نہ مل سکی۔ کیپٹن اسد اللہ نے مجھ سے چند مزید سوالات کئے، پھر بولا،

"آئی کین ریلیگیٹ یُو۔" وہ کڑی نظروں سے مجھے دیکھنے اور سوچنے کے لئے رُکا۔ "بٹ آئی وِل لیٹ یُو آف دِس ٹائم۔ کیپ یور وِٹس اباوٹ یُو، اینڈ" وہ سختی سے بولا، "فائنڈ دا بلڈی ویپن۔"

معاملہ ختم ہوگیا۔ ہم گمشدہ بیونٹ کو بھول چکے تھے کہ چار پانچ ماہ کے بعد ایک روز ایک این۔ سی۔ او اُسے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے آیا۔ پتا چلا کہ بیونٹ ڈمی کے پیٹ میں گھاس، پھونس، روئی اور مرغابی کے پیروں کے اندر ہی پھنس کر رہ گئی تھی اور کیڈٹ کو غالباً ہینڈ ٹو ہینڈ کی ہاؤ ہو اور جوش و خروش میں دیر تک اس کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ اتفاق سے ایک اور ایکسرسائیز کے دوران ایک لڑکے کی بیونٹ ڈمی کے اندر کسی لوہے سے ٹکرائی تو اُسے شک ہوا، اور تلاش کرنے پر گمشدہ بیونٹ نکل آئی۔ ہم نے چپکے سے بیونٹ واپس کر دی۔ اُس وقت تک اُسے گم کرنے والا کیڈٹ اکیڈمی سے فارغ ہو کر جا بھی چکا تھا۔

اِسی طرح ایک اور موقع پر کیڈٹ حبیب اللہ ایک رات کو بارہ بجے باہر سے واپس آیا تو گیٹ پر روک لیا گیا۔ یہ کیڈٹ چارسدے کا خوش شکل پٹھان تھا، اور افواہیں تھیں کہ ایک سول کے افسر کی بیوی کے ساتھ اُس کے تعلقات تھے۔ گیٹ بند ہونے کے بعد باہر رہنا بڑا جرم تھا، اور حبیب اللہ کے کیس کی انکوائری کے دوران یہ معاملہ ایک "مورل ٹرپی ٹیوڈ" کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ جس کے تحت اُسے سروس سے نکالا بھی جا سکتا تھا۔ میں اُس وقت حبیب اللہ کا پلاٹون سارجنٹ تھا۔ مجھے بارہ بجے سوتے سے اُٹھا کر اطلاع دی گئی۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور گیٹ پہ پہنچا۔ حبیب اللہ کا چہرہ نچڑا ہوا تھا۔ میں نے الگ لے جا کر اُس سے پوچھا تو اُس نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ ایبٹ آباد گیا تھا اور واپسی پہ اُسے دیر ہوگئی۔ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر میں نے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ کیوں اور کس سلسلے میں وہاں سے دیر کر کے آیا تھا۔ حبیب اللہ کی نگاہوں میں شرمندگی تھی۔ مگر وہ اِتنا بااصول اور اَپ رائٹ قسم کا شخص تھا کہ اگر میں اُس سے سوال بھی کر دیتا تو وہ ساری کہانی بیان کر دیتا، جسے میں سننا نہ چاہتا تھا۔ مَیں نے گیٹ والوں سے کہا کہ ہمارا ایک کیڈٹ بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھا، اور حبیب اللہ

کو میں نے اُس کی خبر گیری کے واسطے بھیجا تھا جہاں پہ اُسے دیر ہو گئی۔

حبیب اللہ آخر تک میرا وفادار رہا۔ میں جہاں بھی پوسٹنگ پر گیا اُس نے ٹیلیفون یا خط کے ذریعے میری خیریت دریافت کی۔ وہ کمیشن پانے کے ایک سال کے اندر ہی کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر دشمن کے ساتھ ایک جھڑپ کے دوران شدید زخمی ہو گیا اور چند روز ہسپتال میں رہنے کے بعد فوت ہو گیا۔ مَیں اُس کا فاتحہ پڑھنے کے لِئے راہوالی سے، جہاں میں اُس وقت پوسٹنگ پہ تھا، چارسدہ گیا تھا۔

اکیڈمی کے دو سال گویا آنکھ جھپکتے میں گزر گئے۔ ہمارے سامنے کئی گروپ بنے اور ٹوٹے، مگر ہم چھ لڑکے جو پہلے روز اکٹھے آئے تھے، سارے خُدا کے فضل سے ایک ساتھ رہے۔ یوں تو ہم چھ کے چھ آپس میں پکے دوست تھے، مگر میری قربت سب سے زیادہ شعیب کے ساتھ تھی۔ میں چھٹیوں میں ایک دو بار اُس کے گھر بھی جا چکا تھا۔ یہ لوگ چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے۔ شعیب کا باپ ریٹائرڈ بریگیڈیئر اور بلند بانگ قسم کا آدمی تھا۔ شعیب کی ایک بہن نسیمہ تھی جس نے ابھی ابھی بی۔اے کیا تھا اور ایم۔اے سائیکالوجی میں داخلہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلی بار میں گاؤں جاتے ہوئے صرف ایک گھنٹہ اُن کے ہاں رُکا تھا، جس کے دوران بریگیڈیئر صاحب اور شعیب کی بہن سے صرف علیک سلیک ہُوئی تھی۔ دُوسری بار شعیب نے اصرار کر کے مجھے ایک رات کے لِئے ٹھہرا لیا۔ اُس شام کو ہم کھانے کی میز پہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اُن کی ماں کہیں دکھائی نہ دی، نہ ہی کسی نے اُس کا ذکر کیا۔ بہت بعد میں جا کر، جب میں نے اُن کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ نسیمہ نے مجھے بتایا کہ اُن کی ماں مری کے قریب کسی سینیٹوریم میں تھی۔

آخری ٹرم میں صلاح الدین کمپنی کے جمیل اور جمال بھی ایک طرح سے ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے، مگر وہ بات نہ بنی جو ہم چھ کے درمیان تھی، جنھیں ہم "دی اوریجنل سکس" کہتے تھے۔ شعیب اور جمیل میں نمبروں کے مقابلے کی رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ شعیب پڑھاکو ہونے کے باعث اکیڈیمک لحاظ سے آگے تھا، مگر دُوسرے شعبوں میں اُس کی دلچسپی صرف ڈیوٹی کی حد تک تھی۔ جبکہ جمیل آل راؤنڈر تھا۔ آخر میں جمیل سورڈ آف آنر کے لِئے منتخب ہو گیا۔ ڈنر ہوئے، ہم باقاعدہ افسر بن گئے۔ وہی جے سی او،

اور این سی او جو ہمیں کیڑے مکوڑے سمجھ کر پاؤں تلے روندتے تھے، ہمارا ستارہ گننے پر دیکھتے ہی اٹن شن ہو کر سلیوٹ کرنے لگے تھے۔ ہمارا جہان ہی بدل چکا تھا۔ سر ساتویں آسمان پہ تھا اور پیر زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔

"یار یہ باتیں ہوتی رہیں گی،" آصف نے متانت سے کہا، "لیکن ایک بات ہے، آرمی نے ہمیں بندہ بنادیا ہے۔"

تمام تر سختیوں کے باوجود، اکیڈمی چھوڑنے پر ہمارے دلوں میں گہری اُداسی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ میں نے، برکی اور آصف نے انفنٹری کے لیے اپنی ترجیح پیش کی تھی، جبکہ شرفی اور شوکت نے آرٹلری اور شعیب نے کمیونی کیشن کا انتخاب کیا تھا۔

تین چار سال قبل اعجاز نے کھرلوں کے بیاہ کے موقعہ پر ایک اچھے سوتی کپڑے کی شیروانی سلوائی تھی جو اُس نے ایک آدھ مرتبہ ہی پہنی تھی۔ اعجاز کے خیال میں ہر اچھے موقع کے لِئے یہ ایک موزوں لباس تھا۔ مگر سکینہ اور چاچا احمد اُس سے اختلاف کر رہے تھے۔

"بڑے بڑے جرنیل کرنیل آئیں گے،" چاچا احمد کہہ رہا تھا، "پُرانی اچکن پہن کر جانا دُرست نہیں۔"

"ابّا ٹھیک کہتا ہے،" سکینہ نے کہا۔ "کوئی پیسوں کی کمی ہے؟"

"سرفراز فوج کا افسر بن رہا ہے۔ تُو اُس کے باپ کی جگہ پر جا رہا ہے،" چاچے احمد نے کہا۔

"عزت کا مالہ ہے،" سکینہ نے کہا۔ "خرچ اخراجات کی ایسے موکوں پر پروا نہیں ہوتی۔ پیسے اور جداویں کس کام کی اگر موکے محل پر خرچ نہ کی جائیں۔"

اعجاز چُپ بیٹھا تھا۔

"سارے وڈ وڈیرے کالی اچکن پہنتے ہیں۔ اُوپر مایا والی پگ کا شملا نکال کے جا۔ سرفرازے کا سر بھی اونچا ہو گا۔ کالی اچکن بنوا لے،" چاچے احمد نے کہا۔ "پرانی مجھے دے دے۔ میرے اُور بابے کے کام آئے گی۔"

"ابا تُو تو چپ کر،" سکینہ بولی، "پہلے کالی اچکن بنے تو پُرانی کا بھی دیکھا جائے گا۔ سب سے پہلے میرا حق پورا کرے۔ پیسے بنک میں ڈالتا جاتا ہے اُور زمینیں دیکھتا رہتا ہے۔ یہ دیکھ،" وہ اپنے باپ کے آگے باہیں پھیلا کر بولی، "نہ گہنا نہ کپڑا۔ چار دفعہ کہ چکی ہوں ایک کالا برکا ہی بنوا دے۔"

اعجاز مسکرایا۔ "اب تجھے مُنہ چھپانے کا خیال آیا ہے؟"

"مُنہ کون چھپاتا ہے،" سکینہ بولی، "نکاب تو اُلٹا ہی رہتا ہے۔ چھپنے چھپانے کی بات نہیں، عزت کی بات ہے۔ پہلے اُور معاملہ تھا۔ مگر جب اللہ عزت دیتا ہے تو بیبیاں برکا اُور نوکر لے کر گھر سے نکلتی ہیں۔"

"اعجاز،" چاچا احمد سوچ کر بولا، "تو پینٹ کوٹ پہن کر کیوں نہیں جاتا؟ فوج کا رواج ہے۔ اُوپر خاکی ٹوپ لگا لینا ٹش نکل آئے گی۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "خاکی ٹوپ کا رواج ختم ہو گیا ہے چاچا۔"

"تیرے اُوپر جچ جائے گا" چاچا سنجیدگی سے بولا، "تیرا رنگ بھی گورا ہے۔"

"کپڑوں کی طرف تو دھیان نہیں دیتا" سکینہ نے کہا۔

"میرے کپڑوں کو کیا ہے،" اعجاز بولا، "سیدھے صاف ستھرے پہنتا ہوں۔ بس شو، شا نہیں کرتا۔ اوچھے لوگوں کا کام ہے۔"

"شوشا کی بات نہیں،" چاچا احمد بولا۔ "سرفراز کی عزت ہے۔ تیری بھی عزت ہے۔ تیری پزیشن اب کوئی ہلکی ہے؟"

اعجاز کی حیثیت اب بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ میوے والا گڑ ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ ایک سال کے اندر اِس کی کھپت مقامی منڈی کی حدود پار کر چکی تھی۔ اعجاز نے بارہ ایکڑ زمین نقد پر بیع اُور مزید بارہ ایکڑ ٹھیکے پر حاصل کر کے دُوسرے سال ساری زمین میں کماد بویا تھا۔ اپنا بیلنا خرید لیا تھا اور زمین پر دو کمروں کا ڈیرہ بنا لیا تھا جہاں گل افروز خان کے علاوہ دو مستقل ملازم رہتے تھے اُور تازہ گڑ و میوے کا ذخیرہ بھی ہوتا تھا۔ چاچا احمد اُسے

وافر مقدار میں خشک میوے ہندوستان سے منگوا کر سپلائی کر دیتا تھا جو اُسے بازار کی نسبت کافی سستے پڑتے تھے۔ اعجاز اب اپنی منڈی کے علاوہ دُوسرے شہروں کو اپنے گڑ کی "لدان" کرتا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شجاع آباد کی شناخت "بدامی گڑ" کے حوالے سے ہوتی تھی۔ اس سے اگلے سال آمدنی اِس حد تک گئی کہ آدھا مربع زمین نقد پر بیع کرانے اور اُوپر کا خرچہ نکالنے کے بعد بھی اعجاز کے پاس بنک میں جمع کرانے کے لِئے پیسے بچ رہے تھے۔ اِن سب باتوں کے باوجود اعجاز کا دِل اور دماغ صحیح جگہ پہ قائم تھے، نہ دِل میں فتور آیا تھا نہ دِماغ میں غرور۔ اُس کا دِل اصل میں اپنے مزدُوروں کے درمیان ہی اٹکا رہا تھا۔ اُس کے دِل میں بیٹھی ہُوئی چند باتیں تھیں جو اُس کو لمحہ بھر کے لِئے نہ بھولتی تھیں۔

گاؤں کی مصروفیات کے باوجود اعجاز تقریباً ہر روز وقت نکال کر شہر جاتا اور یونین کے کام کرتا تھا۔ وہاں پہ بھی اُسے برابر کی کامیابی حاصل ہُوئی تھی۔ مشرقی شہر اور نواح کی چھوٹی بڑی مزدُور تنظیموں کا باہمی ربط استوار ہونے میں کافی حد تک پیش رفت ہو چکی تھی، جس کا سہرا اعجاز کے سر تھا۔ لیبر فیڈریشن کے عہدے داروں کے ساتھ اُس کا تعلق واسطہ پیدا ہو گیا تھا اور اب وہ اندرون اور مغربی شہر اور شاہدرے بادامی باغ کے بڑے صنعتی علاقے تک مار کرنے کی فکر میں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تنظیم نے اُسے باغبان پورے کے علاقے میں ایک چھوٹا سا کمرہ مہیا کر دیا تھا، جسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا اور وہیں سے ضروری خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اب اُسے ایک "سیٹ" میسر آ گئی تھی جسے وہ اپنی کاروباری ترقی سے بھی زیادہ بڑی کامیابی تصور کرتا تھا۔ اِن حالات نے اُس کے مزاج کے اندر مزید لچک اور دنیاداری کا رویہ پیدا کر دیا تھا، یہاں تک کہ دو ایک بار وہ ملک جہانگیر کے مسئلوں کے بیچ اُس کے گھر پہ جا چکا تھا۔ مزید ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد اعجاز دو مربع سے اُوپر کی اراضی کا ذاتی مالک بن چکا تھا اور جہانگیر اب خاص طور پر اُس کی سیاسی حیثیت کے پیشِ نظر اعجاز کے ساتھ برابری کے درجے پہ سلوک کرنے لگا تھا۔ پھاگن میں جہانگیر کے بھتیجے کا بیاہ تھا۔ جس میں شرکت کے لِئے اُس نے اعجاز کو بمعہ "لفٹنٹ ملک سرفراز اعوان" واہل وعیال دعوت نامہ بھیجا تھا۔

اب سکینہ نے ایک آخری وار کیا۔ "بُر کے بغیر میں جہنگیر کے گھر قدم بھی نہ رکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے،" اعجاز بولا، "برقعہ لے دوں تو جائے گی؟"

سکینہ چپ رہی۔

"اب بول نا،" اعجاز نے کہا، "جائے گی؟"

"دیکھا جائے گا۔ پہلے برکا اور چوڑیاں تو بنیں۔"

اعجاز ہنسا۔ "اب آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہو۔ یہ چوڑیاں کدھر سے آ گئیں؟"

"اور کیا۔ میں کب تک موکا بموکا اماں کے کپڑے مانگ کر بانہوں کو ڈھکتی رہوں؟ تمہیں تو زمینیں خریدنے اور اللہ مارے شہر کے بھیڑوں سے ہی منٹ نہیں ملتا۔"

"چوڑیاں بھی آ جائیں تو پھر؟" اعجاز نے شرارت سے پوچھا۔

"پھر کیا؟"

"پھر جائے گی؟"

"پھر دیکھا جائے گا۔ جھنگیرا کوئی لاٹ صاحب ہے۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "بہانے بنائے جا۔ کب تک بنائے گی۔"

"یہ میرے بہانے نہیں، تمہارے ہیں، جیب کی گانٹھ نہ کھولنے کے بہانے۔"

اعجاز دھیان ہٹا کر منہ ہی منہ میں ہنستا رہا۔ حسن چاچے احمد کے گلے میں باہیں ڈالے اُس کی پشت پہ سوار تھا۔

"اوئے حسنے،" اعجاز نے آواز دی۔ "اِدھر آ۔"

حسن چاچے کی پشت سے اُتر کر باپ کی گود میں آ بیٹھا۔ "نانے کو کیوں تنگ کرتا ہے؟" اعجاز نے کہا۔

"چاچا؟" بچے نے پوچھا۔

"چاچا میرا ہے،" اعجاز نے اُس سے کہا۔ "تیرا نانا ہے۔"

"نہیں،" بچہ بولا۔ "چاچا۔"

"اوئے تیرا نانا ہے، بے وقوف۔"

اعجاز اسی طرح پیار سے اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ سکینہ نے اعجاز کا دھیان بٹا ہُوا دیکھا تو چولہے میں جلتی ہُوئی لکڑی کو ہلا ہلا کر چاچے کو اپنی جانب متوجہ کیا اور ہاتھ اور سر کے اشاروں سے اُسے اعجاز کے ساتھ بات کرنے کو کہا۔

"اجاز" چاچا احمد بولا "جمیلہ کے رشتے کا معاملہ تھا۔ سکینہ نے بات کی ہو گی۔"

"ہاں" اعجاز کچھ توقف سے بولا۔

"بات پکی ہو جائے تو دُرست ہے" چاچے نے کہا "لوگوں کی نظریں سنبھل جاتی ہیں۔"

"بات تو دُرست ہے چاچا" اعجاز نے کہا۔

"پھر زندگی کا کیا پتا ہے۔ آج ہے، کل گئی۔ ایک یہ ذمہ داری نکل جائے۔ تو میں آرام میں ہو جاؤں۔ تیری ماسی ہر وقت فکر کرتی ہے۔"

"درست کہتے ہو چاچا" اعجاز سکون سے بولا "ذمہ داری تو ہوتی ہی ہے۔"

"اُوپر سے باسے کی فکر بھی ہے۔ اُس کا دِل نہ کھیتی میں لگتا ہے نہ کسی اَور بات میں۔ میرے کام کا اُسے چسکا پڑ گیا ہے۔ غلطی میری ہی ہے۔ اب میں کہتا ہوں پُلس وُلس میں بھرتی ہو جائے تو ٹِک جائے گا اور بچا بھی رہے گا۔ تیرا بھی اثر رسوخ ہے، سرفراز بھی اب فوج کا افسر ہو گیا ہے۔ آج کل فوج کا راج ہے۔"

"سارے کام آہستہ آہستہ ہو جائیں گے چاچا۔ ابھی تو سرفراز پورا افسر بھی نہیں بنا" اعجاز ہنس کر بولا۔

"واہ، فوج کے افسر کی بات کوئی موڑ نہیں سکتا۔ بس، تیری بہن کی بات پکی ہو جائے تو میری گردن سے بوجھ اُتر جائے۔"

اعجاز کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بولا "چاچا، جمیلہ میری بہن بھی ہے اَور بیٹی بھی، میری مرضی کی بات ہو تو آج ہی پکی کر دوں۔ مگر سرفراز اب جوان ہے، کالج کا پڑھا ہوا ہے، اپنی مرضی کا مالک ہو گیا ہے۔ ایک بار اُس سے بات کر کے دیکھ لینے دو، پھر سمجھو کہ بات پکی ہو گئی۔"

"مرضی تو جو ہو گی تیری ہو گی اجاز۔ اِن باتوں کا اقرار بڑوں میں ہی ہوتا ہے۔" چاچے احمد نے کہا "تیرا خیال ہے کہ ہندستان سے آنے کے بعد تیرا رشتہ ہوا تھا؟ نہیں۔ سکینہ اَور تُو ابھی بچونگڑے تھے جب تیری بہشتن ماں نے اپنی بہن سے بات کر کے تیرا منگیوا پکا کر لیا تھا۔"

سکینہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے تندہی سے چولہا صاف کرنا شروع کر دیا۔

"وہ اَور زمانہ تھا چاچا،" اعجاز ہنس کر بولا، "اب وقت بدل گیا ہے۔"

"جیسے تیری مرضی،" چاچا احمد بولا، "اپنی لڑکیاں اپنے گھروں میں ہی لگ جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔"

"اِس سے اچھی کیا بات ہے، چاچا،" اعجاز نے کہا۔

چند روز کے بعد جب سرفراز گھر آیا تو چاچے احمد کا سارا ٹبر ملنے کے لیے آیا۔ چاچے احمد اَور ماسی نے اُسے گلے لگا کر خوش آمدید کہا۔

"کیوں ہئی سرفراز،" چاچے احمد نے پوچھا، "اعجاز تیرے پاس ہونے کے جلسے پر پہنچ گیا تھا نا۔ ٹھیک ٹھاک تھا نا، کوئی اُٹھک بیٹھک میں غلطی تو نہیں کر گیا؟"

"نہیں چاچا، لالے کی بڑی شان تھی۔"

"اَور شان بنائی کس نے تھی؟ یہ خُدا کا بندہ تو وہ لٹھے کی اچکن پہن کر جا رہا تھا۔۔۔"

"چاچا لٹھے کی نہیں، بڑے اچھے کپڑے کی ہے،" اعجاز اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

چاچے احمد نے اعجاز کی بات کی جانب توجہ نہ دی۔ "میں نے،" وہ چھاتی پہ ہاتھ مار کر بولا، "اَور سکینہ نے اس کو کالی اچکن پہنائی۔"

"بالکل ٹھیک کیا چاچا،" سرفراز نے کہا۔ "سب لوگ لالے کے شملے کو دیکھ رہے تھے۔" "وہ شملا بھی میں نے اِسے پہنایا تھا سرفرازے۔ تیری عزت کی خاطر۔" چاچے نے کہا، پھر، دلچسپی سے سرفراز کی جانب جُھک کر پوچھا، "جرنیل کرنیل بھی دیکھ رہے تھے؟"

"سب لالے کو دیکھ رہے تھے،" سرفراز ہنس کر بولا۔

"دیکھ لے،" چاچا احمد فخریہ اعجاز سے مخاطب ہوا، "میں نہ کہتا تھا لِش نکال کے جا، سرفراز کا سر اُونچا ہو گا۔"

گاؤں کا ایک ایک آدمی سرفراز سے ملنے کے لیے آیا۔ دو دِن کے بعد جب فراغت کا لمحہ آیا تو اعجاز نے بات کی۔ سرفراز کا جواب سننے سے پہلے ہی اعجاز کو محسوس ہو چُکا تھا کہ اب وقت واقعتاً بدل چُکا تھا۔ سرفراز جو کبھی اُس کی بات کو نہ پلٹتا تھا، اب سمجھ اَور سوچ کر، تسلی اَور حوصلے سے، سر اُٹھا کر جواب دیتا تھا، جیسے اُس کے آگے دنیا جہاں کا وقفہ ہو اَور دِل میں جواب دہی کی کوئی بیتابی نہ ہو۔

"ابھی تو چھ سال تک میں شادی ہی نہیں کر سکتا، لالہ" سرفراز نے کہا۔

"کیوں؟"

"فوج کا قانون ہے۔ یا چھ سال کی سروس مکمل ہو یا چھبیس سال کی عمر۔ اس سے پہلے نہ شادی کی اجازت ملتی ہے نہ میریڈ رہائش نہ الاؤنس۔"

"تجھے رہائش الاؤنس کی کیا ضرورت ہے؟" اعجاز نے کہا، "تیرا اپنا گھر ہے، پیسے دھیلے کا اللہ کا فضل ہے۔ سارا خرچہ میں کروں گا۔"

"سارا خرچہ کرو گے؟" سرفراز نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں،" اعجاز نے جواب دیا۔

سرفراز کچھ بولے بغیر مسلسل مسکراتا ہوا اُسے دیکھتا رہا تو اعجاز کو اُس کا مطلب کھٹک گیا۔ "دیکھ سرفراز،" وہ بولا، "میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ لوگ مجھے کنجوس آدمی سمجھتے ہیں۔ میں کنجوس نہیں ہوں، کفایت شعار ہوں۔ آج میں چند لفظوں میں تجھے اپنی کہانی سناتا ہوں۔"

اعجاز کی آواز ایک لمحے کو بھرا گئی۔ اُس نے کھانس کر گلا صاف کیا، اُٹھ کر ناک سنکی اور چادر کے پلو سے مُنہ پوچھا۔ "میں نے غربت دیکھی۔ ٹھیک ہے، روٹی پیٹ میں جاتی رہی ہے، مگر فاقہ کشی سے بڑی غربت کی صورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے ہجرت اور ماں کی موت ایک ساتھ دیکھی ہے۔ یہ غربت کا ایک بڑا مقام ہے۔ تو خوش قسمت ہے، نہ ہجرت دیکھی نہ ماں کی خبر ہوئی۔ مزید خوش قسمت ہے کہ تیرا اور پاکستان کا اکٹھا جنم ہوا، خوشیاں منائی گئیں۔ میری عمر میں ایک سے ایک کڑا امتحان آیا ہے۔ میں تجھے بتاتا ہوں، سب سے بڑی غربت ذلت کی غربت ہوتی ہے؛ ناطاقتی کی غربت، زیادتی کے سامنے بے بضاعتی کی غربت، سمجھو کہ یہ غربت کا صدر مقام ہے۔ پیٹ کا خلاء کبھی نہ کبھی بھر جاتا ہے، ذلت کے داغ مرتے دم تک سینے سے نہیں اُترتے۔ میں نے اپنے دل سے وعدہ کیا تھا کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر کرنی پڑے، مگر اب مجھے کوئی ذلیل نہیں کرے گا۔ تجھے پتا ہے، اب میں گھر بیٹھ کر کھا کھلا سکتا ہوں، مگر میں نے غریبوں مزدوروں کے ساتھ بیٹھنا نہیں چھوڑا، وہ میری عزت کا سبب ہیں۔ ساتھ اب جیب میں چار پیسے بھی آ گئے ہیں، اونچی جگہ ہو یا نیچی، برابری کا درجہ ملتا ہے۔ میں کنجوس نہیں ہوں، ذرا سوچ سمجھ کر گانٹھ کھولتا ہوں۔

جیب میں رقم ہو تو دِل میں گرمی رہتی ہے۔ ایک منٹ صبر کرو، تمہیں دکھاتا ہوں" اعجاز اُٹھ کر گھر کے اندر گیا اور چند منٹ کے بعد واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بنک کی کتاب پکڑی تھی۔ "یہ دیکھ" وہ ورق اُلٹ کر دکھانے لگا، پھر اُس نے آخری سطر پر انگلی رکھی، "یہ رقم اِس وقت جمع ہے۔ اِس میں آدھی تیری ہے۔ جس وقت چاہو لے سکتے ہو۔ میرے نزدیک حسن حسین سے پہلے تیرا حق ہے۔"

"نہ نہ لالہ، یہ تیری کمائی ہے۔ ضرورت ہوئی تو مانگ کر لے لوں گا۔ مگر میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو چکا ہوں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ روپے پیسے کا اللہ کا فضل ہے تو پھر کچھ اپنے اُوپر بھی خرچ کرو۔ گھر باہر کی حالت درست کرو۔"

"گھر باہر کی حالت کو کیا ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"کہاں ٹھیک ٹھاک ہے؟ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اُسی کچے مکان میں رہ رہے ہیں جو ابے نے بنایا تھا۔ آج تک صحن میں اینٹیں تک نہیں لگوائیں۔ بارش ہوتی ہے تو کیچڑ کی وجہ سے قدم نہیں اُٹھتا۔ مکان پکا کرواؤ، اُوپر چوبارہ بنواؤ، باہر والا کمرہ گرا کر نیا بنواؤ، دروازے کھڑکیاں نئی لگواؤ، روغن سفیدی کراؤ، کچھ پتا بھی چلے کہ اللہ کا فضل ہے۔ خالی کہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اینٹیں لگوا دوں گا۔"

"اُونہوں۔ سارا مکان پکا بنواؤ۔ تم کہتے ہو آدھے پیسے میرے ہیں۔ میرے حصے کے سارے لگا دو۔"

"تیرے پیسے کو میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اپنے پیسے سے سب کچھ بناؤں گا۔"

"چلو جیسے بھی بناؤ، بناؤ تو سہی۔"

"بنا دوں گا کرنیل صاحب۔ بنوا دوں گا۔"

سکینہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے پُرتحسین نظروں سے سرفراز کو دیکھ رہی تھی۔

"سرفرازا ٹھیک ہی کہتا ہے،" وہ بولی۔ "آئے گئے کی نظروں میں بھی عزت ہوتی ہے۔ تمک براوری والے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"اب تُو نے چوڑیوں کے بعد مکان پر بھی سرفراز سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے؟" اعجاز نے کہا۔

"کیوں نہیں؟ سب کچھ بنا سکتے ہو۔ ابھی تو سرفراز ے کی بیوی کے لیے بھی کپڑے اور ہار بنواؤں گی۔"

"بی بی، پہلے مجھے سرفرازا کہنا تو چھوڑ دو۔"

"تو کیا اب تجھے لفٹین صاحب کہوں؟"

"نہیں،" سرفراز ہنسا۔ "سرفراز کہو۔ اور شادی کا ذکر چھ سال سے پہلے نہ کرو۔"

وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ سخی محمد گجر دروازے میں داخل ہوا۔ سخی محمد کی عمر ستر سے اُوپر تھی اور مُنہ میں ایک دانت نہ تھا۔ سلام دُعا کے بعد وہ صحن میں آ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا اعجاز نے بنک کی کتاب جیب میں رکھ لی۔

"ملک اجاز، تو بڑا آدمی ہے،" سخی محمد بولا "میرا انصاف کرا دے تو ساری عمر میرے اُوپر تیرا اِسان رہے گا۔"

سرفراز سخی محمد کے پُرانے قصے کو یاد کر کے دِل ہی دِل میں ہنسا۔ بیس برس پہلے سخی محمد کے پھوپھی زاد بھائی وزیر محمد نے بیٹی کا رشتہ دینے کے وعدے پر سخی محمد سے چھ بکریاں لی تھیں۔ بعد میں سخی محمد کے بیٹے کو قتل کے مقدمے میں بارہ سال قید کی سزا ہو گئی۔ اُس کی غیر موجودگی میں وزیر محمد نے بیٹی کو دُوسری جگہ پر بیاہ دیا۔ اُس دِن سے سخی محمد اپنی بکریاں واپس لینے کا دعوے دار تھا۔

"تیرا معاملہ ٹیڑھا ہے، مہر سخی،" اعجاز نے اُس سے کہا۔ "اتنا زمانہ گزر گیا۔"

"زمانہ گزر گیا ہے تو کیا ہُوا۔ میں تو نہیں گزرا۔ ملک اجاز، بیٹیاں تو اللہ واسطے دی جاتی ہیں۔ مگر وزیر نے مدد مانگی، میں نے بکریاں دے دیں۔"

"مہر سخی،" اعجاز صبر سے بولا "وزیر بھی مر گیا، مراد قید کاٹ کر آیا اور دو سال کے بعد وہ بیماری سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تیری بکریاں بھی مر گئیں۔ اب تو نے کیا لینا اور کیا دینا ہے؟"

"اجاز، میری بکریوں کی نسل اُس کے گھر میں چل رہی ہے۔"

"مہر سخی، بارہ تیرہ سال میں تو زمین بھی قبضہ داروں کی ہو جاتی ہے۔"

"زمین تو اجاز قبضے والوں کی ہوتی ہے۔ پر یہ زبان کی بات ہے۔ مُنہ کی بات کبھی نہیں مرتی۔ وہ زبان کر کے پھر گیا تھا۔"

"تو کیا وہ اپنی بیٹی کو بارہ سال تک گھر میں بٹھائے رکھتا؟ تین بار تو پنچایت فیصلہ کر چکی ہے۔ وزیرے نے اپنی زندگی میں قرآن اٹھالیا تھا کہ بکریاں مراد کے جیل جانے سے پہلے بیماری سے مرگئی تھیں۔ گواہ بھی حاضر ہو گئے تھے۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟"

"اب باقی وزیرے کا کذب رہ گیا ہے اعجاز۔ سارے شہر کو پتا ہے گواہ جھوٹے تھے، اور بکریاں مراد کے جیل جانے کے بعد بچے دے کر مری تھیں۔ آج وزیرے کے گھر میں میری بکریوں کا اجڑ بن گیا ہے، وزیرے کے لڑکے امیر ہو گئے ہیں۔ یہ میری دولت ہے۔ دیکھ،" تخی محمد نے چادر کے کونے کی گانٹھ کھولی اور ایک بوسیدہ سا کاغذ نکالا، جس کی تہیں اُس نے ازحد احتیاط سے کھولیں۔ "بارہ مہینے پہلے میں نے حساب کروایا تھا۔ اٹھتر ہزار کی رقم بنتی ہے۔"

اعجاز اور سرفراز پہلے کئی بار یہ کاغذ دیکھ چکے تھے، جس پہ کسی نے طفلانہ لکھائی میں رقموں کی جمع تفریق کی ہوئی تھی، اور جو بارہ مہینے کی بجائے کئی سال پرانا تھا۔ تخی محمد اسے ہمیشہ بارہ مہینے پہلے کا حساب بتاتا تھا۔ پرزہ دیکھ کر اعجاز اور سرفراز دونوں ہنس پڑے۔

اب تو کہے گا کہ بکریوں کا بیس سال کا دودھ بھی تیرے حصے میں آتا ہے،" اعجاز نے کہا۔

"دودھ میں اُن کو چھوڑ چکا ہوں،" تخی محمد سنجیدگی سے بولا۔ "وہ اُن کی قسمت۔"

سرفراز یہ مکالمہ کئی بار سن چکا تھا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ذرا باہر سے ہو کر آتا ہوں،" اُس نے کہا۔ وہ دروازے سے باہر جا رہا تھا کہ اُس نے اعجاز کو کہتے ہوئے سنا "جو پیچھے بکریوں نے کھائے ہیں وہ حساب سے نفی کیے ہیں؟"

تخی محمد اپنے دُوسرے بیٹوں، بہوؤں، اور پوتوں پوتیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کی دس کلے زمین تھی جس پہ اُس کے دو بیٹے کاشت کرتے تھے اور ساتھ ڈنگروں کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔ تیسرا بیٹا دس جماعتیں پاس کر کے شہر میں کلرک ہو گیا تھا۔ اِن لڑکوں کی وزیر محمد کے بیٹوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی۔ مگر تخی محمد کو اَور کوئی کام نہ تھا۔ دل میں اُسے علم تھا کہ بکریاں یا اٹھتر ہزار کی رقم ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مگر وہ ہر روز گاؤں کے ایک نہ ایک معتبر آدمی کے پاس جا بیٹھتا اور اپنے دعوے کی داستان دہراتا تھا۔ اس کے بیٹے اُسے یہ قصہ کرنے سے منع کرتے تھے، مگر تخی محمد کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ اُس کی

زندگی میں اب یہی ایک شغل رہ گیا تھا۔

سرفراز چلتا چلتا دُور نکل گیا۔ اُس کے دِل کے ساتھ ایک ناگہانی واقعہ پیش آ چکا تھا۔ گاؤں آتے آتے وہ شعیب کے گھر پہ ایک رات کو ٹھہر گیا تھا۔ وہاں نسیمہ سے اُس کی تیسری بار ملاقات ہوئی۔ اب نسیمہ کی شکل اُس کے دل سے نہ اُترتی تھی۔ معمولی سی کُھد بُد کی یہ کیفیت ایک جذبے کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اُس کا بدن ایک تازہ ہل چلے ہُوئے کھیت کی مانند تھا جس کی نالیوں میں پانی کے دھارے ایک ذرے سے دُوسرے کو سرائیت کرتے جا رہے ہوں، مگر جذبے کے یہ سوتے اُس کی سرزمین کو سیراب کرنے کی بجائے ایک زنجیر کا سرا اُس کے ہاتھ میں پکڑاتے جا رہے تھے جس کا دوسرا سرا نظر سے مستقل اوجھل تھا۔ دِل ہی دِل میں کسماتا ہُوا وہ کھیتوں کھیت چلتا گیا۔ ایک جگہ پہ بیٹھ کر اُس نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کیں تو اُن کے پردے پر نسیمہ کا چہرہ یوں دکھائی دیا جیسے برسوں کی محنت سے کھودا گیا ہو، گو تین دِن پہلے سرفراز نے اِس کی جانب دھیان بھی نہ دیا تھا۔

وہ گھر لوٹا تو نجی محمد جا چُکا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی حسن اَور حسین دوڑتے ہوئے آئے۔ سرفراز نے دونوں کو اُٹھانے کی کوشش کی۔

"اووو۔۔۔۔" وہ زور لگاتے ہُوئے بولا۔ پھر اُس نے ہار کر ایک کو چھوڑ دیا۔ "نہ بھئی نہ۔ اب تُم بڑے ہو گئے ہو۔ ایک ایک کرکے۔۔۔۔۔ ایک ایک کرکے۔" اعجاز، سکینہ اَور چاچا احمد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"بھئی سرفراز،" اعجاز بولا، "عباس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ چاچے کو بڑی فکر ہے۔"

"ہاں بچُو،" چاچے نے کہا، "کچھ اُس کا خیال کر۔ باڈر سے اِدھر اُدھر جاتا آتا رہتا ہے۔ اِسے چسکا پڑ گیا ہے۔ مگر تُجھے پتا ہے یہ کام بڑا خطرے ناک ہے۔ میں کہتا ہوں کسی سرکاری نوکری پر لگ جائے تو اس کی زندگی بچ جائے۔"

"فوج میں سپاہی ہو سکتا ہے چاچا،" سرفراز نے کہا۔ "میں اُس کو بھرتی کے دفتر کی طرف رُقعہ لکھ دوں گا۔ صحت والا ہے، آسانی سے ہو جائے گا۔"

"تیری بڑی مہربانی سرفراز،" چاچے نے کہا، "پر فوج میں تو پشور اَور کوئٹے اَور پتا نہیں کدھر کدھر بھیج دیتے ہیں۔ پھر اللہ راکھا ہوتا ہے۔ سال کے بعد دو چار دن کی چھٹی

ملتی ہے تو منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ تیری ماسی تو وچھوڑے سے مر جائے گی۔ میری اس کو کوئی فکر نہیں، میں چاہے ساری عمر ادھر بیٹھا رہوں میرا نام بھی نہیں لے گی۔ پر عباس ایک دن بھی اُس کی آنکھ سے پرے ہو جائے تو رونے لگتی ہے۔"

"چاچا! نام تو تیرا ماسی تیرے سامنے بھی نہیں لیتی۔" سرفراز ہنس کر بولا۔

"میں کہتا ہوں اگر پُلس وُلس میں ہو جائے تو بہتر ہے۔ اپنے آس پاس رہے گا۔"

"پولیس کے محکمے میں میرا کوئی دخل نہیں چاچا۔"

"واہ بھئی واہ، فوج کا راج ہے، تیری بات کون موڑے گا۔ کپتان شپتان پُلس میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے کہوا کر لگوا دے۔ وردی پہننے کا تو شوق میں آ کر اس خطرے ناک کام سے ہٹ جائے گا۔"

"میری مانو تو چاچا فوج میں ہی کرا دو۔ کچھ نہ کچھ پڑھا ہُوا بھی ہے۔ اگر لگا رہا تو ترقی کر کے حوالدار، جمعدار، صوبیدار تک جا سکتا ہے۔ بڑی اتھارٹی ہوتی ہے، سہولتیں ملتی ہیں۔"

"اتھارٹی تو اصلی تیری ہے سرفراز" چاچا بولا۔ "اپنے تین چکوں میں کوئی تیری پزیشن کو نہیں پہنچا۔ ہمارا شملا اونچا ہو گیا ہے۔ ایک دن جرنیل بن جائے گا راج کرے گا۔ بس کوشش کر کے پُلس میں ہی لگوا دے، اللہ بھلا کرے گا۔"

"تیری یہی ضد ہے تو پوچھ گچھ کروں گا چاچا، مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔۔۔"

چاچا اور اعجاز باتوں میں لگ گئے تو سرفراز اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ کمرہ سرفراز کے لئے مخصوص تھا۔ چاچا احمد آتا تو عموماً ڈیرے پر سوتا تھا۔ ماسی یا جمیلہ جب آتیں تو سرفراز کی غیر موجودگی میں اُس کے کمرے میں حسن کو ساتھ لے کر سوتی تھیں جو اُن کا چہیتا تھا۔ حسن کا رنگ گہرا گندمی اور طبیعت میٹھی تھی۔ حسین گورا چٹا خوش شکل مگر غصیلا بچہ تھا اپنے ماں باپ کے قابو میں بھی نہ آتا تھا اور حسن کے ساتھ تو وہ ہر وقت بھڑتا اور اُسے مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ گھر کے لوگوں میں صرف دو ایسے تھے جن کی بات وہ مانتا تھا ایک ماسی اور دُوسرا سرفراز۔ سرفراز کے کمرے میں پانی کی چلمچی منگوا کر رکھی گئی تھی، جو اُس کے پیچھے تو خالی رہتی مگر جب وہ آتا تو آدھی سطح تک بھر دی جاتی تھی۔ سرفراز نے کبھی اُسے استعمال نہ کیا تھا۔ نہانے دھونے، پینے اور پلانے کے لئے وہ باقی گھر والوں کی

طرح تکیے سے کام لیتا تھا۔ اس کے باوجود سکینہ ہر روز پُرانا پانی گرا کر چلمچی کو تازہ پانی سے بھر دیا کرتی تھی۔ کمرے میں نواڑ کے پلنگ اَور بستر کے علاوہ دُوسری طرف ایک میز اَور کرسی بچھی تھی۔ میز پر شیشے کا جگ اَور گلاس پڑے رہتے تھے۔ سرفراز کے قیام کے دوران چلمچی کی مانند جگ میں بھی روزانہ پانی بدلا جاتا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے کو جو سرفراز کے بعد وقتاً فوقتاً کمرے میں سوتا، سختی سے ہدایت تھی کہ کوئی شے خراب یا میلی نہ ہونے پائے۔

سرفراز کمرے میں داخل ہو کر میز کرسی کی جانب جانے کی بجائے خلافِ معمول چلمچی کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ پانی استعمال کرنے کا اُس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ جمائے، جھک کر کھڑا انہماک سے پانی کی بے حرکت سطح پر اپنی صورت کے عکس کو دیکھتا رہا؛ گویا کوئی اہم کام کر رہا ہو۔ اُس کا ذہن خالی تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے ہوا میں معلق ہو۔ تام چینی کی سفید چلمچی میں پانی کا وجود بے رنگ تھا، مگر اُس کے اندر اپنا چہرہ اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر سر پر پھیرا اور کان کے اُوپر بال سیدھے کیے جو کھیتوں کی ہوا نے اڑا کر بے ترتیب کر دیئے تھے۔ سرفراز نے کئی بار زمین پہ کھڑے پانی میں عکس دیکھا تھا، مگر اُس کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ اُس کا چہرہ زمین کی سطح سے کہیں نیچے دکھائی دے رہا تھا، جیسے اس کے اَندر دفن ہو اَور جیتا جاگتا بھی ہو۔ اُس نے چہرے کو دو انچ ایک جانب کو سرکایا اَور رُک گیا، پھر دُوسری طرف ہلایا، پھر سر کو آدھا موڑ کر اپنے چہرے کا ایک طرفہ نظارہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد اِس کھیل سے اُکتا کر اُس نے کمر سیدھی کی تو اُس کا چہرہ زمین میں دھنستا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر وہ متعدد بار جھکا اور پھر سیدھا کھڑا ہُوا۔ یہ ایک روزمرہ کی بات تھی، مگر اُس وقت جب اُس کے ذہن کی کھڑکیاں بند تھیں اَور وہ اُن کے پٹ کھولنے کی کاوش میں تھا، چمکیلی سطحوں کا یہ سراب اُس کے احساس میں اس طرح داخل ہوا جیسے پہلی بار علم کے دائرے میں آ رہا ہو۔ اس نیم حیرت زدہ حالت میں وہ جا کر بستر پہ سیدھا لیٹ گیا۔ ذہن کے ایک پٹ کی درز سے کچھ لو لگی تو اُس نے سوچا، میری اُس سے کوئی خاص بات تو ہُوئی نہیں، آنکھ کی تار تک نہیں جڑی، نہ کوئی اشارہ ملا نہ نشان۔ ہاں، میرے نام کی اُس کو پہچان ہے، میری شکل شباہت سے وہ واقف ہے، میری شناخت اپنے بھائی شعیب کے دوست لفٹنٹ سرفراز کے طور پر کرتی ہے۔ مگر مجھے یہ تک

علم نہیں کہ کیا وہ میرے وجود سے بھی باخبر ہے؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ اُن دونوں کو یہاں مدعو بھی نہیں کر سکتا۔

نسیمہ کے اُس نوئی ہُوئی گلیوں والے گاؤں میں آنے کا خیال کر کے سرفراز کا دِل بیٹھنے لگا۔ یہ خیال گویا ایک خُونخوار درندے کی مانند تھا جو اُس کے دِل پہ حملہ کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ زندگی میں ایک خاص حد تک کامیابی اَور اعتماد حاصل کرنے کے بعد پہلی بار سرفراز کو اپنے بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ اِس خیال کو سمیٹنے کے لیے اُس نے اپنے آپ کو ایک کھیل میں مشغول کر لیا جو وہ اکثر کڑے وقتوں میں کھیلا کرتا تھا۔ اِس کھیل کا اصول یہ تھا کہ خیال کے اندر حاضر حقیقت کی بجائے ایک الگ اَور برعکس حقیقت کی تشکیل کی جائے۔ اِس تصور کو کسی معمول کی اِصلاح، جیسے "خوش آئند خیالات" سے بیان کرنا دُرست نہیں تھا کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو سرفراز کے اندر حقیقت حال کی نسبت زیادہ حقیقی طور پہ وجود میں آتی تھی۔ اِس کھیل کو اُس نے بچپن میں ایجاد کر لیا تھا جب اُس کو اپنی نگاہ میں دُنیا کی چیزیں دُور اَور نزدیک آتی اَور جاتی ہُوئی دکھائی دینے لگی تھیں۔ فوج کی دو برس کی ٹریننگ کے دوران وہ اپنی عجوبہ نظر کو بڑی حد تک ضبط کے دائرے میں لے آیا تھا اور اب اُسے ضرورت کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ یہ اُس کے جاگتے خواب تھے جن پہ اُس کا اختیار تھا۔ اِس وقت چارپائی پہ لیٹے لیٹے اُس نے آنکھیں میچ لیں اَور اپنی مرضی کے مطابق ایک منظر دیکھنے لگا۔

سرفراز کے سامنے اب معاً دُنیا کا نقشہ بدل گیا۔ اُن کا گھر، صحن سمیت، اینٹوں اَور سیمنٹ کا بن گیا، دیواروں پہ سفیدی ہو گئی، گاؤں کی گلیاں پکی ہو گئیں اَور اُن میں نسیمہ چلنے پھرنے لگی۔ وہ گھر میں داخل ہو کر صحن میں بچھی ہُوئی میز کرسیوں میں سے ایک کرسی پہ بیٹھ گئی اَور ہاتھ میں پکڑا ہُوا اخبار کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی مگر اُس کی کمر سیدھی تھی اَور اخبار دونوں ہاتھوں میں پھیلا تھا۔ دوپٹہ سر سے ڈھلکا ہُوا تھا۔ یہ اُس کا وہی انداز تھا جس میں سرفراز نے آخری بار اُسے دیکھا تھا۔ یہ سب عوامل کھٹاک کھٹاک کر کے گویا اپنے اپنے خانوں میں بیٹھتے چلے جا رہے تھے اَور سرفراز کے دِل میں وقت کی تنگی کا احساس ناپید ہوتا جا رہا تھا۔ ایک وسیع و عریض دنیا اُس کے سینے میں سماتی جا رہی تھی جس کے ممکنات کی کوئی حد نہ تھی۔ اِس وقت بستر پہ لیٹے لیٹے سرفراز

کا ذہن اِن آرام دہ تھپکیوں کے اثر سے خاموش ہوتا چلا گیا۔ اُس نے دروازے پہ کھٹکا محسوس کیا مگر اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔

"چاچا" حسین نے پوچھا "بی بی کہتی ہے روٹی کب کھاؤ گے؟"

سرفراز نے آنکھیں کھولے بغیر ہاتھ اُٹھا کر اشارے سے منع کر دیا۔ اُس کے اعضاء پہ نیند طاری ہو رہی تھی۔

راہولی اَور گوجرانولہ کے درمیان سرفراز کے بریگیڈ کا پڑاؤ پڑا تھا۔ ایک وسیع چٹیل میدان میں خیموں کا شہر بسا تھا جس کے گرد صرف دو خاردار تاروں کی باڑ باندھی گئی تھی اَور جرنیلی سڑک کے کنارے پہ لکڑی اَور لوہے کا عارضی گیٹ بنا تھا۔ گیٹ پہ انفنٹری بریگیڈ کے نام کا بورڈ نصب تھا۔ سہ پہر کے وقت عباس "کپتان ملک سرفراز اعوان" کا پتا پوچھتا پوچھتا سرفراز کے خیمے تک پہنچ گیا۔ اُس سے پہلے جب سرفراز کے پاس گیٹ سے "محمد عباس اعوان" کا پیغام پہنچا تو اُس نے داخلے کی اجازت بھیج دی تھی۔

"یار میں ابھی کپتان نہیں بنا لفٹننٹ ہوں، اَور وہ بھی ابھی بنا ہوں،" گلے ملنے کے بعد سرفراز نے ہنس کر کہا۔ "اَور نہ ہی چوہدری اَور اعوان شوان کہلاتا ہوں۔ اِدھر میرا نام لفٹننٹ محمد سرفراز ہے۔ بیٹھو بیٹھو، تُم اِس وقت کدھر یہاں آ نکلے ہو۔ اطلاع ہی کر دی ہوتی۔ گیٹ پر زیادہ دیر رُکنا تو نہیں پڑا؟"

"آدھا گھنٹہ ٹیلیفون کی صندوقچی کا ہینڈل گھماتے رہے۔ یار یہ ٹیلیفوں کس طرح کے ہیں؟"

"ہمارے فیلڈ ٹیلیفون اسی طرح کے ہوتے ہیں۔"

"کوئی کپتان سرفراز تھا اُس سے میری بات کرائی،" عباس نے کہا۔ "وہ چیچہ وطنی کا جیمہ نکلا۔ اُس نے مجھ سے تیرا حلیہ پوچھا تو گیٹ والے سارجنٹوں سے بات کی۔ تو کپتان کب بنے گا؟"

"ابھی دو سال انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کیوں؟" عباس نے پوچھا۔

"یہی قانون ہے۔ تو اگر پولیس میں ہو گیا تو کیا سیدھا تھانیدار لگ جائے گا؟"

"گاؤں میں تو تجھے کپتان ہی کہتے ہیں۔"

"گاؤں کی کیا بات ہے،" سرفراز ہنس کر بولا۔ "چاچا تو کل پرسوں تک مجھے جرنیل بنا دے گا۔"

"ابا کہتا ہے پولیس میں بھرتی کی تو نے کسی سے بات کی ہے۔"

"پولیس میں میری کوئی واقفیت نہیں، ٹالنے کے لئے چاچے سے کہہ دیا تھا کہ پوچھ گچھ کروں گا۔ تو کیا واقعی پولیس میں جانا چاہتا ہے؟"

"میں کب چاہتا ہوں۔ ابا ہر وقت میرے مونڈھے پر چڑھا رہتا ہے۔ میں تو خوش ہوں۔ آزادی سے آتا جاتا ہوں، کسی کا جوابدہ نہیں، تعلقات بن گئے ہیں، پیسے کماتا ہوں۔ بس ابا میری جان کھاتا رہتا ہے۔ کہتا ہے اس کام میں خطرہ ہے۔"

"ہاں،" سرفراز کھل کر ہنس پڑا۔ "یہ کام خطرے ناک ہے۔"

عباس نے بھی ہنستے ہوئے خیمے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک جانب چارپائی پر بستر لگا تھا۔ ساتھ کونے میں میز رکھی تھی۔ ایک اٹیچی کیس میز کے اوپر اور ایک بکس میز کے نیچے رکھا تھا۔ خیمے کے درمیان میں ایک نیچی سی تپائی اور اس کے گرد تین آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ فرش پہ دری اور اس کے بیچ مختصر سا قالین تھا۔ دوسرے کونے میں استری کی ہوئی وردی اپنے فریم پر چھت سے جھانکتی ہوئی ایک سلاخ سے لٹکی تھی۔ ایک طرف لکڑی کا موٹا سا پالش شدہ ڈنڈا چار پیروں پہ کھڑا تھا۔ جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سینگ نما کھونٹیاں لگی تھیں۔ دو قمیضیں، پتلون، ایک چمڑے کی پیٹی اور دو تین ٹائیاں ان کھونٹیوں سے لٹک رہی تھیں۔ نیچے ایک قطار میں چمکتے ہوئے کالے فوجی بوٹ، عام پہننے والے بوٹ، ایک دو چپلوں کے جوڑے رکھے تھے۔

"یہ تیرا کمرہ ہے؟" عباس نے پوچھا۔

"ہاں،" سرفراز نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ میرا 'کمرہ' ہے۔ آرام سے بیٹھ، اکڑا ہوا کیوں بیٹھا ہے۔ کوئی ہے----" سرفراز نے سر موڑ کر اچانک باہر کو آواز دی، جس

سے عباس چونک پڑا۔

ایک آدھ منٹ تک انتظار کرنے پر جب کوئی نمودار نہ ہوا تو سرفراز نے پورے زور سے دوبارہ آواز دی۔ "ارے کوئی ہے اُے۔۔۔۔" ساتھ ہی ایک سپاہی خاکی پتلون قمیض میں ملبوس عجلت سے خیمے کا پردہ اٹھا کر داخل ہوا۔ "سر" وہ بولا۔

"ٹھنڈا پینے کا لاؤ۔"

سرفراز نے حکم دیا۔

"سر" سپاہی جواباً بولا اور اُلٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

عباس نے پشت کرسی سے لگائی اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ سرفراز نے اُس پہ ایک گہری نظر دوڑائی اور ہنس کر بولا "باسے، تو نے پتلون کب سے پہننی شروع کی ہے؟"

عباس جھینپ کر ہنس پڑا۔ "شروع کہاں کی ہے، آج پہلی دفعہ چڑھائی ہے۔ اتبے نے زور سے چڑھوا دی ہے۔ کہتا تھا پینٹ چڑھا کر نہ گئے تو جانے نہیں دوں گا۔" سپاہی مشروب لے آیا۔ دو لمبے لمبے چوڑے مُنہ والے سٹین لیس سٹیل کے پالش شدہ گلاس جو دیکھنے میں چاندی کے بنے ہُوئے معلوم ہوتے تھے، اِسی طرح کی چمکتی ہُوئی ٹرے میں دھرے تھے۔ گلاس سبز رنگ کے کیلے کے شربت سے تین چوتھائی سطح تک بھرے ہُوئے تھے۔ مشروب کے اندر برف دکھائی نہ دیتی تھی مگر اتنا ٹھنڈا کہ گلاس کی بیرونی سطح پر منجمد بخارات کے قطرے لکیریں بناتے ہُوئے بہہ رہے تھے۔ عباس گلاسوں کو دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے ایسے خوش شکل، اُبھری ہُوئی خمدار کمر اور تنگ پیندے والے چاندی کے سے گلاس پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

"چل پی، گلا گیلا کر،" سرفراز اپنا گلاس اُٹھا کر گھونٹ بھرتے ہُوئے بولا۔

عباس نے جھجکتے ہُوئے ہاتھ بڑھایا، گویا گلاس کا ادب اُس کے رستے میں مانع ہو۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر چھوٹا سا گھونٹ لیا اور گلاس کو ہولے سے واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"پی پی یار، کیا بٹر بٹر دیکھ رہا ہے۔"

سرفراز نے ایک نیلے رنگ کے ریشمی سے کپڑے کا ڈریسنگ گاؤن پہنا ہُوا تھا جس کے نیچے اُس کے جسم پر جانگیے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بار بار ڈھلکتے ہوئے گاؤن کو سمیٹتا ہُوا دل میں اِس بات پہ محظوظ ہو رہا تھا کہ چادر کرتے یا شلوار قمیض سے بھی زیادہ پتلون کے

اندر عباس کو دیکھ کر اُس کی نظر زبردستی عباس کی رانوں کے بیچ چلی جارہی تھی جہاں تنگ آسن میں پِستے ہُوئے آلائے تناسل ایک تودے کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے اور جنہیں عباس بار بار ڈھیلا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سرفراز کو عباس پہ ترس آنے لگا۔

"پھر تجھے کتنی دیر لگی ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"اِدھر پہنچنے میں؟"

"نہیں، پینٹ پہن کر چلنے میں۔"

دونوں ہنس پڑے۔ عباس نے ایک دھپ سرفراز کی ران پہ جمایا۔

"یار، ابے کا فہم کچھ اُکھڑتا جا رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہتا تھا پینٹ کے بغیر فوج کے افسر سے ملاقات نہیں کرنے دیتے۔"

"ہاں، پینٹ کے بغیر تو روک ہی دیتے ہیں،" سرفراز سنجیدگی سے بولا۔

"اچھا؟"

"ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو پہن کر آنا ہی پڑتا ہے۔"

"عباس نے ہنس کر ایک اَور دھپ سرفراز کے کندھے پہ جمایا۔

"وَیسے شلوار قمیض میں کوئی حرج نہیں،" سرفراز نے کہا۔ "یوں تو چادر کرتے میں بھی ملاقاتی آتے جاتے ہیں، مگر ذرا دُوسرے فوجیوں کی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"یار سرفراز،" عباس بولا۔ "ایک کام کرا دے۔"

"کیا؟"

"ابے کو کہہ دے مجھے اُدھر ہی لگا رہنے دے۔"

"خطرے ناک کام میں"

"نال یار، مذاق نہ کر۔ ٹھیک ٹھاک مال کماتا ہوں، میرا دِل لگا ہُوا ہے۔ یہ دیکھ،" عباس نے جیب سے ایک خُوبصورت سی ڈبیا نکالی۔

"یہ کیا ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"تیرے لِئے لایا ہوں۔" عباس بولا اور ڈھکنا اُٹھا کر ڈبیا میز پر رکھ دی۔ اندر ایک

اعلیٰ درجے کے ولایتی عطر کی شیشی تھی۔

سرفراز نے مذاقاً آنکھیں پھاڑ کر شیشی کو دیکھا۔ اٹھا کر احتیاط سے اُس کا ڈھکنا کھول کر عطر کو سونگھا، تعریفاً ابرو اٹھا کر عباس کو دیکھا، اور ڈھکنا بند کر کے شیشی کو واپس ڈبیا میں رکھ دیا۔

"جو کچھ بھی چاہیئے مجھے بتا،" عباس نے فخریہ کہا، "میں پیدا کر کے لا سکتا ہوں۔"

"مجھے رِشوت دے رہا ہے؟"

"ایسی بات نہ کر سرفراز، تو میرا بھائی ہے۔ رشوت تو غیروں کو دی جاتی ہے۔ پُلس میں، میں کیا کروں گا۔ وردی چڑھا کر ہاتھ میں بیٹی دے دیں گے اور کسی افسر کی کوٹھی کے دروازے پر کھڑا کر دیں گے۔ ابّا تو پُرانے زمانے کی باتیں کرتا ہے، اُسے کیا پتا کہ میرا کام اب کتنا بڑا ہو رہا ہے۔ ابّا اُس وقت کام کیا کرتا تھا جب لالے کے اخروٹ اور نیزے اور ادرک وورک اِدھر اُدھر آتی جاتی تھی۔ کسی نے بڑا ہاتھ مارا تو سونا لانے لیجانے لگا۔ میں تو اب اِدھر اُدھر کے چکر سے ہی نِکل رہا ہوں۔ یہ کوڑیوں کا کھیل ہے۔ میرا ہاتھ اب اونچے کاموں تک پہنچنے والا ہے۔ ولیت کا مال اِدھر، اِدھر کا مال ولیت کو۔ عطروں اور گھڑیوں سے لے کر فرجوں اور ٹی ویوں تک کی تجارت ہے، اور،" عباس رازداری سے آگے جھک کر بولا "ایسا مال بھی ہے جو سونے اور کندن سے دس دفعہ زیادہ پیسہ دیتا ہے۔"

اچھا اچھا، آواز کم کر کے بات کر یار،" سرفراز جلدی سے بولا، تُو فوج کے گڑھ میں بیٹھ کر ایسی بے قانونی کی باتیں کرتا ہے۔ رپورٹ ہو جائے تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے۔ چل کوئی اور بات کر۔"

"بس پھر ابّے سے کہہ دے کہ تو نے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ پُلس میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ شربت تو ختم کر، باتیں ہی کیے جاتا ہے۔ میں، میس سے جا کر نہا آؤں، پھر تجھے کیمپ کی سیر کراتا ہوں۔"

"سرفراز،" عباس نے پوچھا، "تجھے سلوٹ بھی لگتے ہیں؟"

"ہاں۔ ہر جگہ پر۔ ابھی تجھے دکھاتا ہوں۔ بس اپنی بک بک ذرا بند کر۔"

مگر اُس روز عباس کے رخصت ہونے سے پہلے ہی سرفراز نے دِل میں فیصلہ کر

لیا تھا کہ اُس سے جتنی بھی کوشش ہو سکی، وہ عباس کو پولیس میں بھرتی کرا کے رہے گا۔ اُس کے سامنے عباس کی زندگی کے علاوہ خُود اپنے کیریئر کا سوال تھا کہ اُس کا نام کسی ایسے قریبی رشتہ دار کے ساتھ منسلک نہ ہو جو جلد یا بدیر قانون کی گرفت میں آ جائے۔ وہ عباس کو الوداع کرکے واپس اپنے ٹینٹ کو لوٹ رہا تھا کہ میس سے ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا۔ "ٹیلیفون ہے سر" اُس نے سیلوٹ کرکے سرفراز سے کہا۔

سرفراز رُخ بدل کر تیز تیز قدم بھرتا ہُوا بولا، "کس کا ہے؟"

"خبر نہیں سر" سپاہی نے پیچھے پیچھے چلتے ہُوئے جواب دیا، "سارجنٹ اکرم نے ریسیو کیا ہے۔" لاہور سے شعیب کا فون تھا۔

"میرا کارڈ تجھے نہیں ملا؟" سرفراز نے حال احوال پوچھنے کے بعد کہا۔ "اپنی وے۔ ہیپی برتھ ڈے---- یار مشکل پڑ جائے گی---- سیٹر ڈے نایٹ؟ گڈ۔ مگر سٹیشن لیو،" سرفراز نے ریسیور کے آگے ہاتھ رکھ کر آواز نیچی کر لی، "کرنل اصغر کا تجھے پتہ ہے، اِس معاملے میں سنکر ہے---- اوکے اوکے، ٹرائی مائی بیسٹ-----" چند منٹ مزید بات کرکے اُس نے فون رکھ دیا۔ جب وہ واپس اپنے ٹینٹ میں پہنچا تو اُس کا دِل پھیل کر سینے میں نہ سماتا تھا اور ذہن میں ایسی اُڑان تھی کہ جیسے اُس کے سر میں صِرف آکسیجن بھری ہو۔ اب صِرف اُس کے سامنے اپنے کمپنی کمانڈر کرنل اصغر سے، جو سر سے گنجا تھا، سٹیشن چھوڑنے کی اجازت لینے کا مسئلہ تھا۔ مگر اِس وقت سرفراز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کرنل اصغر کی بجائے آگے کوئی پہاڑ بھی ہو تو وہ اُسے عبور کر جائے گا۔

باب 9

"اوئے تو نے بتیاں وتیاں نہیں لگا ئیں؟" سرفراز نے پوچھا۔
"چپ کر یار،" شعیب بولا، "پاپا کا مزاج گڑبڑ ہے۔"
"کیوں؟"
"شرفی کل رات آیا تھا۔"
"بکرا؟ وہ تو کراچی میں تھا؟"
"ملتان آگیا ہے۔"
"گڈ۔"
"گڈ کہاں یار۔ اُس نے کام خراب کر دیا۔"
"کیا ہُوا؟"
"تمھیں پتا ہی ہے،" شعیب نے کہا۔ "ڈرنک لے کے آیا تھا۔ پاپا نے صبح میرے دراز میں خالی بوتل دیکھ لی۔"
"پاپا تیرے دراز میں کیا دیکھ تھے؟"
"سم ڈیم پیپر آر سمتھنگ، آئی ڈونٹ نو۔"
"پھر کیا بولے؟"
"یہی تو مصیبت ہے۔ بولتے وولتے کچھ نہیں، مُنہ پھلا کر چپ سادھ لیتے ہیں۔"
"اور پھر آپ سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ ہیں؟"
"اور کیا؟ جھاڑ واڑ پلا دیں تو مطلع صاف ہو جائے۔ وہ تو آنکھ ملانا تک بند کر دیتے ہیں اور بہانے بہانے سے نوکروں پر برستے رہتے ہیں۔"
"سائیکلاجیکل پریشر، ہیں؟"
"سائیکلاجیکل وائیکلاجیکل، بٹ اِٹس اے پین اِن دی رانگ پلیس۔"
"پھر کیا ہو رہا ہے۔ پروگرام کینسل؟"
"واہ، کوئی مذاق ہے؟ میری ٹوئنٹی فرسٹ ہے، کینسل کس کھاتے میں؟"

"کچھ بتا تو سہی۔"

"دیکھتے جاؤ۔ چائے پیو، چینج کرو، اور چلو۔"

"کہاں؟"

"میس۔"

"میس میں ارینج کیا ہے؟"

"ہاں۔"

شعیب الماری میں لٹکی ہوئی دو درجن ٹائیوں کو ٹٹولنے لگا۔ اُس نے دو ایک ٹائیوں کے سروں کو برابر لٹکتے ہوئے سوٹوں سے ملا کر دیکھا پھر ایک ٹائی کھینچ کر نکالی اور اُسے کندھے پہ لٹکا لیا۔ دُوسرے ہاتھ سے اُس نے ساری ٹائیوں کا ہینگر نکالا اور اسے لاپروائی سے اپنے بستر پہ پھینک دیا جس کے برابر بچھی کرسی پہ سرفراز بیٹھا تھا۔ ٹائیاں ایک دُوسری میں اُلجھ کر گڈمڈ ہو گئیں۔

"چوز کرلو،" شعیب نے کہا۔

"میرے پاس ہیں،" سرفراز نے کہا۔

"تیری میں نے دیکھ رکھی ہیں۔"

"اونہوں،" سرفراز نے نفی میں سر ہلایا۔

"یعنی تُم نے نئی خریدی ہیں؟"

سرفراز ہلکی مسکراہٹ لیئے اُسے دیکھتا رہا۔

"اچھا آ آ----" شعیب بولا "اب تو نے ٹائیاں 'خریدنی' شروع کر دی ہیں۔ ذرا دیکھوں کیسی ہیں؟"

"اپنے کام سے مطلب رکھو،" سرفراز نے جواب دیا۔

"شعیب کا ملازم ادریس چائے لے کر آ گیا۔ اُس نے سرفراز کے آگے رکھی تپائی پر برتن لگا دیئے۔ "صاب اِستری کے لِئے کوئی کپڑے----؟"

سرفراز نے اپنے ساتھ زمین پہ رکھا بیگ کھولا اور اپنا سوٹ نکال کر اُسے دیا۔ سوٹ کے ساتھ ٹائی تھی جس پہ سلوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ ملازم کپڑے لے کر پلٹنے لگا تو شعیب نے اُسے بازو سے پکڑ کر روکا اور اُس کے ہاتھ سے ٹائی لے کر دیکھی، پھر ہنس کر

واپس کر دی۔

"ایم ایس، تو پینڈو کا پینڈو ہی رہا۔"

"تجھے کیا اعتراض ہے؟" سرفراز چائے بناتا ہوا بولا۔

"یہ ٹائی سوٹ کے ساتھ میچ نہیں کرتی۔ میری ٹائیوں سے چوز کر لے۔"

"چپ رہ۔ میری ٹائی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"میرا کیا جاتا ہے ٹانگ کھنچوائے گا۔ پھر نہ کہنا کہ لڑکیاں 'مخول' کرتی ہیں،" شعیب اُس کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے بولا۔

"لڑکیاں؟"

"ہاں۔ لڑکیا آں۔ یہ مخلوق کبھی دیکھی ہے؟"

"نہیں۔" سرفراز ہنس کر بولا، "کہاں سے آئی ہیں؟"

"چھیما اپنی دوستوں کو پکڑ کے لائے گی۔"

ادریس استری کئے ہوئے دونوں سوٹ اور ٹائیاں احتیاط سے اُٹھائے اندر داخل ہوا۔ اُس نے دونوں سوٹ الماری میں لٹکا دیئے۔

"بریگیڈیئر صاحب کیا کر رہے ہیں؟" شعیب نے ادریس سے پوچھا۔

"جی چلے گئے ہیں۔"

"کہاں چلے گئے؟"

"شائد کلب گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ۔" پھر شعیب نے سرفراز سے پوچھا "پاپا سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں۔"

"چلو، صبح مل لینا۔"

"اگر زندہ اٹھے تو۔" سرفراز نے کہا۔

"اٹھو گے، اٹھو گے۔ اٹھو گے نہیں تو ترقی کیسے کرو گے؟ چلو اب کرسی سے تو اٹھو۔ تیار ہو جاؤ۔"

اب جب سرفراز کپڑے بدل کر تیار ہو رہا تھا تو ایک بار پھر اُس کا دل اُچھلنا شروع ہو گیا تھا۔

میس میں شرفی نعرہ مار کر سرفراز سے ملا۔ "میں نے تیرے کرلی کا علاج ڈھونڈ لیا ہے،" وہ بولا۔ اُس نے بیئر پی رکھی تھی جس کی بو کو دبانے کے لیے وہ پیپرمنٹ چوس رہا تھا اور ساتھ ہی ہنس ہنس کر دُہرا ہو رہا تھا۔

"کیا علاج ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"اونٹ---- ہاہا---- اونٹ---- اوہ----"

"کیا اونٹ اونٹ لگا رکھی ہے، سیدھی بات کر،" سرفراز نے کہا۔

"اونٹ کی---- ہوہوہو----" ہنستے ہنستے شرفی کے مُنہ سے بات نہ نِکل رہی تھی۔ "اُونٹ کی لید کا لیپ----" اُسے اچھو لگا اور کھانستے کھانستے اُس کا دم رُکنے لگا۔ آصف گولڈ، برکی نیولا اور شوکی بانڈے اُس کے گرد کھڑے تھے۔ "وہ تو سوکھے ہوئے گولے ہوتے ہیں شرفی،" آصف بولا، "لیپ کیسے بنتا ہے؟"

"یار پوری ریسی پی تو سنو،" شرفی نے اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہُوئے کہا۔ کنواری اُونٹنی کے پیشاب میں نر اونٹ کی لید---- ہوہو---- آآ----" اُسے ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

رجمنٹل میس میں عقب کی جانب دو چھوٹے کمرے پارٹی کے لِئے ریزرو تھے۔ ایک کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیس پچیس کرسیاں بچھی تھیں۔ کل دس بارہ نوجوان افسر موجود تھے۔ تین فوجی وردیوں میں اور باقی ہلکے سوٹوں میں ملبوس تین تین چار چار کی ٹولیوں میں کھڑے مہذب انداز میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ صِرف دو کرسیوں پر سرفراز اور شرفی بیٹھے تھے، جبکہ اُن کے تینوں سامعین سامنے کھڑے تھے۔ سارے کمرے میں صِرف شرفی بکرا ہی آپے سے باہر ہو کر اُونچی آواز میں بول رہا تھا۔

"آزمایا ہُوا نسخہ ہے،" اُس نے ہنسی دبا کر کہا۔

"کس پہ آزمایا ہے؟" برکی نیولے نے پوچھا۔

"شرفی کی چاچی کا دادا گنجا تھا،" آصف گولڈ نے کہا۔

"ہاں،" شرفی بولا، "اسی سال کی عُمر میں اُس کے بال نِکل آئے تھے۔"

"اوئے، اصغر کرلی کے ہتھے کبھی چڑھ گیا تو تیرا حلیہ دُرست کر دے گا،" برکی نے کہا، "بڑی کُتی چیز ہے۔"

"اوکے، سٹاپ اِٹ مین" سرفراز نیم سنجیدگی سے بولا۔ "میرا او۔ سی۔ ہے۔"
"تُو بھی اپنا سر شیو کروا لے، کرنل خوش ہو جائے گا۔"

شعیب مختلف ٹولیوں کے پاس رُکتا، اُن سے ملتا ملاتا ہُوا اُدھر آ پہنچا جہاں شرفی منڈلی لگائے ہُوئے تھا۔ شرفی کا شور سارا کمرہ سن رہا تھا۔ مگر اُس کی عادت کے معمول کو جانتے ہُوئے سب وقفے وقفے پر نیم محظوظ انداز میں اُس پہ نگاہ پھینک کر پھر اپنی باتوں میں لگ جاتے تھے۔

"شرفی،" شعیب مصنوعی غصے سے بولا "کل تو نے مجھے ٹربل میں ڈالا، آج ہم سب کے لِئے مصیبت کھڑی کرو گے۔ کنٹرول یور سیلف۔"

"اولبو، بائل لانا میرا کام، ختم کرنا میرا کام غائب کرنا تیرا کام۔ وہ تو نے اچار ڈالنے کے لِئے سنبھال کر رکھی ہُوئی تھی؟"

کیپٹن افتخار نے باہر سے جھانک کر دیکھا اور دروازے پہ ہاتھ رکھ کر اٹکا رہا۔

"کنگریچولیشنز،" اُس نے شعیب سے کہا۔

"آیئے آیئے سر،" شعیب دروازے کی طرف جاتا ہُوا بولا "آیئے نا۔"

"آئی کانٹ۔"

کیپٹن افتخار کافی سینئر تھا اور کچھ عرصے کے لِئے اکیڈمی میں شعیب اور سرفراز کے "بیچ" کا اِنسٹرکٹر بھی رہا تھا۔

"سر آپ کو پتا ہے کیا ہو رہا ہے؟" شرفی نے کمرے میں چاروں طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"بھئی مجھے تو اِنوی ٹیشن نہیں ملی، مگر تُم جانتے ہو اِنفرمیشن پوری رکھتا ہُوں۔"

"نہیں سر، آپ کو اصل حقیقت کا علم نہیں ہے،" شرفی بولا "لبو کی چالیسویں سالگرہ ہو رہی ہے۔ اِس نے میٹرک کے سرٹیفیکیٹ میں عُمر کم لکھوائی تھی۔"

کچھ دیر پہلے پارٹی میں کیپٹن دِلاور پہنچ چُکا تھا جو شعیب کا کمپنی کمانڈر تھا۔ اُسے دیکھ کر شرفی اور سرفراز کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے۔

"ہلو اِفتخار،" اُس نے پکار کر کہا۔ کیپٹن اِفتخار نے ہاتھ ہلا کر اُسے جواب دیا اور اُنگلی سے شرفی کی جانب اشارہ کر کے شعیب سے بولا، "تائی ڈم اپ وِد اے روپ راؤنڈ دی

اینکل۔"

"ہم ریسے کا انتظام کر رہے ہیں سر" شعیب نے جواب دیا۔

"اینڈ کیپ اے پیس آف کیک فاری۔"

"ڈ لفنٹلی سر"

میس کے آبدار اور افسروں کے بیٹ مین ٹھنڈے شربت کے گلاس لا لا کر پیش کر رہے تھے۔ شعیب پھرتا پھراتا ہوا اگلے کمرے میں داخل ہوا جہاں سفید وردی والے میس کے ملازم چائے کے برتن پالش کر کر کے سجا رہے تھے۔ شعیب میز کے پاس رُک کر انہیں چھوٹی بڑی ہدایات دیتا رہا، پھر جا کر پچھلے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے، وہ وہاں پر رُکا بے خیالی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ سرفراز جو پہلے کمرے میں چل پھر رہا تھا، لوگوں کے پاس رُکتا اُن سے ایک آدھ بات کرتا ہوا، درمیانی دروازے میں جا ٹھہرا۔ عقبی دروازے میں کھڑے شعیب کی پشت اُسے نظر آ رہی تھی۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُسے علم تھا کہ ابھی کچھ دیر میں نسیمہ اپنے گروپ کے ہمراہ اِسی دروازے سے داخل ہوگی۔ اُس کی پیٹھ پہ لوگوں کی گفتگو کی ملی جلی بھنبھناہٹ اور بیچ بیچ میں شرفی کی بے ساختہ ہنسی کی آواز اُٹھ رہی تھی۔ وہ دھیان ہٹانے کو کمرے میں داخل ہو کر چمکیے سے بڑی میز کے پاس جا کھڑا ہوا اور ایک چینی کی خالی پیالی کو اُٹھا کر بجلی کی روشنی کے سامنے اُس کا معائنہ کرنے لگا۔ اِس وقت اگر وہ آ جائے، سرفراز نے پیالی کی سفید سطح پر منعکس بلب میں نظر جما کر سوچا، تو میں اُس سے کیا کہوں گا؟ اِتنے لوگوں کے بیچ میں کیسے قدم بڑھا کر اُس کے قریب جاؤں گا؟ میری باری کب آئے گی؟ اِتنے پُراعتماد، خوش شکل، اعلیٰ شہری بیک گراؤنڈ والے لڑکوں کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ سرفراز پیشہ وری کی حد تک فوج کے حلقے میں کسی سے مرعوب نہ ہوتا تھا۔ مگر یہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ اُسے احساس تھا کہ وہ اپنی طبیعت، اپنے تجربے اور اپنے مخصوص طبقے کا قیدی تھا جس کی بنا پر وہ کھیل شروع کرنے سے پہلے ہی ہار چکا تھا۔ مگر اپنے دِل کا کیا کروں، اُس نے سوچا؟ اُس نے پیالی میز پہ رکھی تو اُس کا ہاتھ ذرا کپکپا رہا تھا، جس سے پیالی طشتری کے ساتھ ٹکرا کر ٹنٹنائی۔ شعیب نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرفراز کے برابر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے مسکرا کر سرفراز کو دیکھا اور پیالی کے کناروں پر انگلی پھیرنے لگا، گویا بات کرنے کی

ضرورت نہ سمجھتا ہو۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کمروں میں مکمل خاموشی ہو گئی، پھر دوسرے کمرے میں ایک شور اُٹھا۔ سرفراز اور شعیب کو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ درمیان والے دروازے میں دو سیاہ بوٹ ہوا میں لہراتے ہوئے دکھائی دیئے جو بے سہارا آہستہ آہستہ آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ پھر دو ٹانگیں اُلٹی ہوا میں اُٹھی ہوئی سامنے آئیں جن کی پتلون گھٹنوں تک گری ہوئی تھی اور جرابوں کے بعد پنڈلیوں کی دو دو انچ جلد نظر آ رہی تھی جس پہ گھنے سیاہ بال تھے۔

"او مائی گاڈ،" شعیب نے کہا۔ "اِٹ اِز ہِم اگین۔"

سرفراز ہنس پڑا۔ شرفی اپنا کھیل دکھا رہا تھا۔ وہ ہاتھوں کے بل چلتا ہوا پیر اور کہنیاں سمیٹے، دروازے کو پار کر کے صاف دُوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک بڑے گروپ کا غوغا تھا، جو "بک اَپ بکرے" اور "براوو" کا شور کر رہے تھے۔ ایک دُوسرا گروپ آپس میں باتیں کر کے قہقہے لگا رہا تھا۔ شرفی کے بازوؤں میں اب ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔ مگر اُس نے اپنی منزل پوری کر لی تھی۔ دروازے سے ایک فٹ آگے نکل کر اُس نے ایک ایسی قلابازی لگائی کہ اُس کے پاؤں ڈھپ سے آگے زمین پر آ رہے اور پیچھے سے اُس کا جسم اُچھل کر سیدھا سامنے کھڑا ہو گیا۔ چاروں ہاتھوں پاؤں کے سوا اُس کا کوئی حصہ کسی دیوار، دروازے یا زمین سے لگنے نہ پایا تھا۔ اُس کا چہرہ لال بھوٹی ہو رہا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی وہ پلٹا اور شوکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کم آن۔ پے اَپ،" وہ بولا۔

"جیکٹ کا ایک کونا دروازے سے لگ گیا تھا۔" شوکی نے کہا۔

"نان سینس! کوئی وِٹ نس؟"

کوئی نہ بولا، سب مُنہ ہی مُنہ میں ہنستے رہے۔

"رائیٹ،" شرفی نے کہا، "کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ پے اَپ۔"

"کم آن شوکی،" کیپٹن دِلاور ہنس کر بولا، "یُو لوسٹ۔"

اُس کی بات سُن کر شوکی نے آخر کندھے اُچکا کر ہار مان لی۔ "او کے۔ آئی او یُو"

"او یُو کا کیا مطلب؟" شرفی نے ہاتھ بڑھائے بڑھائے مطالبہ کیا۔ "آئی وانٹ کیش مَین۔"

"اَئی ڈونٹ کیری منی،" شوکی نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کم کم۔ جیب خالی کرو۔"

"وی آر رائیل۔" برکی اعلانیہ انداز میں گویا ہُوا۔ "رائیلز کیش کیری نہیں کرتے۔"

"آل رائٹ شرفی،" کیپٹن دِلاور بولا، "آئی او یو کوئی ڈِس آنریبل بات نہیں۔ اِٹس اے جنٹلمین آفیسرز ورڈ۔"

"جنٹلمین آفیسر؟؟" شرفی نے بے یقینی سے، آنکھیں پھیلا کر سوال کیا۔

سب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ چند ایک نے تالیاں بجائیں۔ پارٹی کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔

اب مدعوئین کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ لوگ دونوں کمروں میں بٹ گئے تھے اَور آزادی سے گفتگو اَور مذاق کر رہے تھے۔ اُسی وقت عقبی دروازے پر پھسلتی ہُوئی کار کی روشنیاں گزریں، کچھ ہلچل کے آثار پیدا ہوئے، کار کے دروازے کھلنے اَور بند ہونے، اَور کچھ لڑکیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے کمرے والوں کو خبر نہ ہوئی۔ مگر پچھلے کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں دروازے پہ لگی تھیں۔ نسیمہ ایک بڑا سا ڈبہ اُٹھائے دروازے میں نمودار ہوئی۔ تیز نظروں سے کمروں میں چاروں طرف دیکھ کر وہ بے ساختگی سے مسکرائی۔ اُس کے چہرے سے خوشی مترشح تھی۔ وہ کونے میں رکھی ہُوئی ایک چھوٹی سی تپائی تک گئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہُوا ڈبہ اُس پہ رکھ کر وہ اپنے بھائی کے پاس جا کھڑی ہُوئی اَور باتیں کرنے لگی۔ سرفراز اُس سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اب پہلے کمرے سے لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ آس پاس ہلکے لہجے میں گفتگو ہو رہی تھی، جس کی بھنبھناہٹ کے بیچ نسیمہ کی صاف، کھنکدار آواز کے ٹکڑے سرفراز کے کانوں تک پہنچ رہے تھے-----"زینب----بیکری----نورین----" اب وہ اُوپر لگی رنگ برنگ جھنڈیوں کی جانب اشارہ کرکے ہنس رہی تھی۔ اُس کی آواز سن کر سرفراز کو ایک لمحے کے لیے اپنے کانوں کی سنسناہٹ کے اندر یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف خاموشی چھا گئی ہے اَور رات کی تاریکی میں دور سے بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ نسیمہ نے فیشن ایبل قسم کا شوخ رنگ غرارہ پہنا ہُوا تھا اور قمیض کے اُوپر کندھوں پہ ہلکے سرخ رنگ کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ وہ نسیمہ کی آواز سننے میں محو تھا کہ اچانک اُسے احساس ہوا کہ کسی نے اُس سے کوئی بات کی ہے۔

"ہنہ؟" سرفراز چونک کر مڑا۔

لفٹننٹ سُرخرو خان اپنی بڑی بڑی بلوری آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ "ویک اَپ، ایم ایس۔ وٹس رانگ؟"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ آنکھ کے کونے سے سرفراز نے دیکھا کہ اُس کے ہنسنے کی آواز پہ نسیمہ کو پہلی بار اُس کی موجودگی کا احساس ہُوا اَور اُس نے اچٹتی ہوئی نظر سرفراز پہ ڈالی۔ سرفراز اپنے خیال میں اس قدر کھو چُکا تھا کہ اُس نے تین دوسری لڑکیوں کی جانب دھیان بھی نہ دیا تھا جو نسیمہ کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ نورین، جو کسی حد تک شعیب کی چہیتی تھی اَور جسے سابقہ پھیرے پر سرفراز نے دور سے دیکھا تھا، چست اَور چمکیلا لباس پہنے ہُوئے تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اَور خوش شکل اَور ذرا سر نکالتی ہُوئی لڑکی کھڑی تھی۔ تیسری لڑکی ذرا فاصلے پر کھڑی مُنہ اُٹھائے چھت سے لٹکتی جھنڈیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا قد چھوٹا، بدن منحنی اَور لباس سیدھا سادا تھا اَور وہ نہایت خوش خلقی سے باتوں کے جواب دے رہی تھی۔ اُس کی معمولی شکل و صورت اَور طور طریقے سے ہمت پا کر نوجوان لڑکے ایک ایک کر کے اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ اِس ماحول میں اُس کی خامیاں خُوبیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ نوجوان افسروں نے ایک نظر کے اَندر دُوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اُس لڑکی کے طبقے اَور اُس کی حیثیت کا تعین کر لیا تھا اور بے خطر ہو کر ایک ایک اِنچ اُس کی جانب کھسکتے جا رہے تھے۔ سرفراز نے رُخ بدل کر اپنے اِرد گرد دیکھا۔ سُرخرو خان کسی اَور سے باتیں کرنے میں مصروف ہو چُکا تھا۔ سرفراز نے جی کڑا کر کے قدم بڑھایا اَور شعیب کے پاس جا کھڑا ہُوا۔

"اسلام علیکم،" نسیمہ نے اپنی بات چھوڑ کر، اپنے مخصوص اَنداز میں ہاتھ اُلٹ کر ماتھے سے چھوا، "آپ کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں،" سرفراز نے گھبراہٹ میں جلدی سے جواب دیا۔

"ابھی ابھی؟"

"ہاں،" شعیب نے بات کاٹ کر کہا۔ "ابھی ابھی اِن کا چاپر باہر اُترا ہے۔"

سرفراز ہنس پڑا۔ "میرا مطلب ہے آج ہی آیا ہُوں۔"

"ہمیں کچھ بیکرز نے دیر کرا دی، کچھ ٹریفک نے،" نسیمہ بولی۔ پھر اُس نے

سارے کمرے میں نظر دوڑائی۔ سب آ گئے ہیں؟ کیا خیال ہے، شروع کر دیا جائے؟""
شعیب نے بھی چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ "ہاں،" وہ بولا۔
"ٹھیک،" نسیمہ شرارت بھرے لہجے میں بولی، "اب تُم اُس دروازے کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اُس وقت تک تُم مڑ کر دیکھ نہیں سکتے جب تک میں آواز نہ دوں۔"
"کیوں؟" شعیب آنکھیں چمکا کر بولا۔
"بس۔ یہ رُول ہے۔ اگر تُم مڑے تو ساری کارروائی وہیں پہ روک دوں گی۔ سمجھ گئے؟" یہ کہہ کر نسیمہ نے شعیب کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھمایا اور میز کی جانب اُس کی پشت کر دی۔ شعیب کندھے اُچکا کر وہیں کھڑا کھڑا اپنے ایک دوست سے باتیں کرنے لگا۔
"نورین،" نسیمہ نے آواز دی۔ "چلو آؤ۔"
اُن دونوں کو جاتے دیکھ کر دُوسری دو لڑکیاں بھی اُن کے پیچھے چل دیں۔ وہ چاروں کونے والی تپائی کے آگے دیوار بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر اُنھوں نے ڈبے کے اندر سے کیک نکال کر طشتری پہ رکھا اور اُس پر اکیس موم بتیاں جمائیں۔ کیک کو اپنے پیچھے چھپائے چھپائے نسیمہ نے مڑ کر ماچس طلب کی۔ اُس کے قریب کھڑے ایک نوجوان نے اُسے اپنا لائیٹر پیش کیا۔ نسیمہ ایک منٹ تک اُس سرخ رنگ کے چمکیلے لائیٹر کو ہاتھ میں لیے تعریفی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر پلٹنے سے پہلے اُس نے ہنس کر نوجوان سے کوئی بات کی۔ سرفراز اُس نوجوان افسر کو نہ جانتا تھا، مگر اُس کے دِل میں ہلکی سی جلن پیدا ہوئی۔ اُس کا جی چاہا کہ اُس آدمی کی جگہ پر وہ خُود موجود ہو۔ مگر وہ لائیٹر کہاں سے لے کر آتا؟ وہ تو سگریٹ بھی نہ پیتا تھا۔ اُس نے کمرے کے پار سے نسیمہ کے چمکتے ہُوئے سفید، ہموار دانت ایسے دیکھے تھے جیسے وہ اُس کے پاس کھڑا ہو۔ پھر اچانک کمرے سے ایک مجموعی خوشگوار حیرت کی آواز اُٹھی۔ نسیمہ تینوں لڑکیوں کے نرغے میں، کیک کی طشتری اُٹھائے، اِنتہائی احتیاط سے قدم قدم میز کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں موم بتیوں کے شعلوں کو ہوا سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے ہاتھوں کی اوٹ میں رکھے ساتھ ساتھ چلتی آ رہی تھیں۔

"سپلنڈڈ" کسی نے کہا۔

شعیب نے پلٹنے کی کوشش کی تو اُس کے سامنے کھڑے نوجوان نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے۔ نسیمہ نے میز پہ پہنچ کر کیک کی طشتری درمیان میں رکھ دی۔

"ایکسیلنٹ" کسی اَور نے کہا۔

"آل رائٹ" نسیمہ نے پکار کر کہا "شبو، یُو کین ٹرن اراؤنڈ ناؤ۔"

شعیب مڑا تو حیرت اَور خوشی سے آنکھیں پھیلا کر، مُنہ کھول کر ہنسا۔ نسیمہ نے اُس کے ہاتھ میں چھُری پکڑا دی۔ نورین بھاگ کر میز کی دُوسری جانب جا کھڑی ہوئی اَور کیمرہ آنکھ سے لگا کر تصویر بنانے لگی۔ شعیب نے دو چار پھونکوں میں موم بتیاں بجھائیں اَور کیک کاٹنے لگا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یُو۔۔۔۔" کی مخصوص دُھنیں کمرے میں بلند ہوئیں اَور تالیوں کے بیچ چاروں جانب پھیل گئیں۔ نسیمہ نے شعیب سے چھُری لے کر کیک کاٹنا شروع کیا۔ لڑکیاں سب کو کیک بانٹنے لگیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔ میس کے بیرے گرم چائے سے بھری چاء دانیاں اٹھائے ہوئے لائے۔ لوگ، جو ایک غول کی صورت میں میز کے گرد جمع تھے، اپنے اپنے کیک کے ٹکڑے لئے، چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹ گئے۔ گفتگو کی بھنبھناہٹ بڑھ کر ہلکے سے شور میں تبدیل ہوگئی۔ جبڑے چلنے کے ساتھ لوگوں کی جھجک کے پردے اُترتے گئے۔ شرفی بکرے نے، جو اب تک آپے میں کھڑا تھا، پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ اُس کے گروپ سے قہقہوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ کیک کے ذروں سے آراستہ لب وا کئے لوگ ہنس رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کوئی بات کرنے کی خاطر کمرے کی دُوسری طرف کھڑے لیفٹیننٹ طاہر کو آواز دی۔ اُن کے بیچ کمرے کا شور تھا۔ جب دوسری اَور پھر تیسری آواز پہ طاہر متوجہ نہ ہُوا تو شرفی پنجوں کے بل دبک دبک کر چلتا ہُوا کمرے کو پار کر کے اُس کی پشت پہ جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے طاہر کے کان سے مُنہ لگا کر ایسے زور سے اُسے آواز دی جیسے پٹاخہ پھٹتا ہے۔ طاہر اُچھل پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی چھلک گئی۔ کچھ چائے اس کے کپڑے پہ اَور کچھ زمین پہ گری۔ طاہر سخت طیش کی حالت میں مڑا۔

"شرنی،" وہ دانت پیس کر بولا "یو آر این ایڈیٹ!"

شرنی ہنس پڑا۔ ساتھ ہی اُس نے ہتھیار ڈال دینے کے انداز میں ہاتھ اُوپر اٹھا دیئے۔ مگر طاہر کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ ایک لحظے کے لئے سرفراز نے سوچا کہ طاہر اپنی پیالی میں بچی ہوئی چائے شرنی کے سر پہ انڈیل دینے والا ہے۔ مگر اُسی وقت کسی نے پیچھے سے شرنی کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ شرنی شرمندہ سی ہنسی چہرے پہ لئے واپس آگیا۔ کمرے میں ایک منٹ خاموشی ہو جانے کے بعد دوبارہ معمول کی گفتگو شروع ہو گئی۔ دور سے شعیب گہری سوچ والی نظر سے شرنی کو دیکھتا رہا۔ "یو نو واٹ آئی تھنک؟" پھر وہ بولا۔

سرفراز نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"آئی ایم افریڈ شرنی از گوئینگ ٹو بی تھروِن آؤٹ سونر آر لیٹر۔ ون ڈے ہی وِل کراس دی لیٹ۔"

فوج کے پیشے میں جہاں ہر کمیشن حاصل کرنے والا نوجوان افسر اپنے دِل میں جرنیل بننے کی اُمنگ ہی نہیں لئے ہوتا بلکہ تصور میں اپنے آپ کو کم از کم ڈویژن کی کمان کرتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہوتا ہے، وہاں چند سال میں ایسے لوگ بھی نظر میں آجاتے ہیں جن کے بارے میں ایک قدرتی احساس ہوتا ہے کہ میجر یا زیادہ سے زیادہ لفٹننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچ کر اُن پر ترقی کے راستے بند ہو جائیں گے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ لوگ نالائق افسر ہوں، مگر فوج کے مخصوص کلچر میں کسی نہ کسی وجہ سے اُن کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور اُن کے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ شرنی جس کے لئے شعیب اور سرفراز کے دِل میں خاص محبت تھی، کے بارے میں یہ احساس کرکے دونوں کے دِل بھاری ہو گئے۔ سرفراز نے دوسری دیوار کے ساتھ کھڑے شرنی کو دیکھا جو حسب معمول اپنی کھلی طبیعت اور خوشدلی کے اثر سے آس پاس کے دوستوں میں ہنسی اور خوشی پھیلا رہا تھا۔ یہ شخص، سرفراز نے سوچا، خواہ لکھ پتی بزنس مین بن جائے، مگر "سروس" میں رہنے اور ترقی کرنے کا یونیفارم کا اور رینک کا فخر اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کی کمی وہ عمر بھر پوری نہ کرسکے گا۔ یہ خیال کرکے سرفراز کے دِل میں گہرا افسوس پیدا ہوا، اور دِل ہی دِل میں اُس نے دُعا کی کہ خُدا کرے شعیب کا اندیشہ دُرست ثابت نہ ہو۔

اُسی وقت، گویا مستقبل میں دیکھتے ہوئے، سرفراز کی نظروں میں چیزیں دور اور

نزدیک ہونے لگیں۔ کمرے کا ماحول بدل گیا۔ کچھ لوگ بہت دور اور کچھ بالکل قریب سے دکھائی دینے لگے۔ سرفراز کے لئے یہ نئی بات نہ تھی، مگر کوئی دُوسرا اِسے تسلیم نہ کرتا تھا۔ ایک بار اکیڈمی میں اُس نے شعیب سے اِس کا ذکر کیا تھا، جس نے یہ کہہ کر "ایم ایس، یوُ آرمیڈ،" اُس کی بات کو جھٹک دیا تھا۔ کئی سال پہلے، جب وہ ابھی بچہ تھا، اُس نے اپنے بھائی سے یہ بات کہی تھی۔ اُس کے بھائی نے بھی یہ کہتے ہُوئے کہ "تیرا مشاہدہ تیز ہے"، معاملہ ختم کر دیا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں لمبے عرصے تک اِس کیفیت کے بارے میں وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اُس کا مشاہدہ تیز ہے۔ مگر جوان ہونے تک اُسے علم ہو چکا تھا کہ یہ صرف مشاہدے کی بات نہ تھی، ایک خاص الخاص وصف تھا جو پیدائش کے وقت سے اُس کے اندر موجود تھا۔ اِس حقیقت سے بھی وہ آشنا تھا کہ اِس "راز" کو وہ اپنے اندر مخفی رکھنے پر مجبور تھا، کہ کوئی دُوسرا اِسے سمجھنے بوجھنے سے قاصر تھا۔ رازدانی کے اِس بوجھ تلے ایک طویل تنہائی اُس کے حصے میں آئی تھی جس میں وہ کسی کو شریک نہ کر سکتا تھا۔ اِس کے باوجود، جب وہ اِس کیفیت میں ہوتا تو ایک پُرسکوت حالت اُس پہ طاری ہوتی۔ وہ نہایت آسودگی سے اپنا ہلکا پھلکا بدن اُٹھائے کھڑا ہوتا، اور اُس کے تمام تر حواس ایک نقطے پہ مجتمع ہوتے۔

اُس کمرے کے اندر یہ نقطہ کیک کا ایک ذرہ تھا جو نسیمہ کے دانتوں میں اٹکا ہُوا تھا۔ اُن دونوں میں چند گز کا فاصلہ تھا، مگر جب نسیمہ باتیں کرتی ہُوئی ہنستی تو اُس کے سامنے والے دانتوں کے درمیان وہ باریک سا ذرہ سرفراز کو ایسی صفائی سے دکھائی دیتا جیسے کہ وہ نسیمہ کے سامنے کھڑا ہو۔ کئی بار اُس کا جی چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر ٹوتھ پک کے نیزے سے اُس ذرے کو اُچک لے۔ کمرہ اب ایک مقناطیسی کشش آور میدان کی مانند تھا جس میں سیاہ سروں کے چھوٹے چھوٹے جھرمٹ الگ الگ دکھائی دے رہے تھے۔ سرفراز اپنی تنہا دنیا میں ٹھہرا اِس طرح اِس منظر کو دیکھ رہا تھا جیسے چھت پہ لٹکا ہوا اُوپر سے ساری کارروائی کا ملاحظہ کر رہا ہو۔ کبھی کوئی سر، اور اُس سے ملحقہ شکل ایک جھرمٹ سے کٹ کر گویا کھنچتی ہُوئی دُوسرے جھرمٹ میں داخل ہوتی۔ ایک میزبان شبیہہ نسیمہ کی تھی جو اب کیک کا ذرہ اٹھائے کھڑی تھی۔ اِن جھرمٹوں میں ہر کوئی باتیں کر رہا تھا، مگر سرفراز کی دنیا میں مکمل خاموشی تھی، جیسے اُس کے کانوں کے پردے بند ہو چکے ہوں، یا اُس کے گرد ایک خلاء کا حصار کھنچا ہو جس کے اندر وہ بیک وقت مقید بھی ہو اور آزاد بھی۔ چند لمحے کے

لئے وہ گویا اس جہانِ زندہ سے کٹ گیا تھا۔ سرفراز کی یہ کیفیت گو عموماً صرف چند لمحوں تک ہی رہتی، مگر اس کا عکس اُس کے ذہن پہ یوں پڑتا جیسے برسہا برس پہ پھیلا ہو۔

"آپ کی برتھ ڈے کب ہے؟" دُور سے ایک آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اِس آواز میں ہنسی کی کھنک بھری تھی اور دو دانتوں کے درمیان کیک کا ایک ذرہ چمک رہا تھا۔

سرفراز اُن دانتوں کی ہیئت میں محو تھا۔

"ہُہ؟" وہ چونکا۔ "اوہ---" وہ ہنسا "میری برتھ ڈے؟" جواب میں گو ایک لمحے کا وقفہ تھا مگر اس توقف نے نسیمہ کے چہرے پہ حیرانی کی پرچھائیں پھیلا دی۔

"جی،" وہ بولی، "آپ کی برتھ ڈے۔"

"اگست میں ہے۔"

"بڑا اچھا موسم چُنا آپ نے پیدائش کا۔"

سرفراز کی آنکھوں کے سامنے کھلکھلاتی ہوئی ہنسی تھی جس کے اِرتعاش میں وہ ذرہ لرزا رہا تھا۔ سرفراز اُس پر سے نظریں ہٹانے میں کامیاب نہ ہو رہا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اگر وہ اِسی طرح اُس پہ نظریں جمائے کھڑا رہا تو نسیمہ بدک جائے گی۔

"بارشوں کا موسم ہے،" وہ بولا۔ "دیہات میں تو ہر شے سرسبز ہو جاتی ہے۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ کسی گاؤں میں کچھ دِن گزاروں۔ کئی سال ہو گئے ہیں میں اپنے آبائی گاؤں بھی نہیں گئی۔"

"آپ ہمارے گاؤں آئیں۔"

"سچ مچ؟"

"یو آر موسٹ ویلکم۔"

وہ ذرہ اب چٹان بن چکا تھا جس کے منوں بوجھ تلے سرفراز پِسا جا رہا تھا۔ وہ اپنی قوتِ ارادی کے پورے زور سے اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھے ہوئے تھا جو بڑھ کر اُس ذرے کو اُڑس لینا چاہتا تھا۔ اُس بیباک ذرے نے دانتوں کی ہموار شکل کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"تو آپ اپنی برتھ ڈے پر ہمیں اِنوائیٹ کریں گے؟"

"ضرور۔ ابھی سے اِنوی ٹیشن ہے۔ تیرہ اگست۔ ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ گو اس میں ابھی دس مہینے ہیں۔"

"دس ملو گزرنے میں کونسی دیر لگتی ہے۔"

اب اُس کے لئے اپنے آپ کو روکنا برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ زبان سے بول کر کہنے میں کیا حرج ہے؟ "آپ کے دانت میں۔۔۔۔" سرفراز نے دل ہی دل میں کہنے کی مشق شروع کر دی۔ گو زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا، مگر دل کی آواز سے اُسے اندازہ تھا کہ اُس کا لہجہ مناسب حد تک ہلکا پھلکا نہ تھا۔ سرسری ہونا چاہیے، نہ بہت اُونچا نہ نیچا، جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ آپ کی مرضی، نکالیں یا نہ نکالیں۔ وہ لہجہ اور آواز برابر کرنے کی کوشش میں ہلکا سا کھانسا۔ حلق سے کھنکارنے کی جو آواز نکلی وہ اُس کے کانوں میں دندنانے لگی۔ آواز دُرست نہ تھی۔ ان سب باتوں سے پہلے، سرفراز نے سوچا، وہاں سے نظر ہٹانا ضروری تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی اچانک اُسے یہ کام آسان معلوم ہونے لگا۔ اُس نے جلدی سے دائیں اور بائیں مُڑ کر کمرے پہ نظر ڈالی۔ اِس کے ساتھ ہی گویا طلسم ٹوٹ گیا۔

"آپ آج رات اِدھر ہی رکیں گے ناں؟" نسیمہ نے پوچھا۔

"جی ارادہ تو ہے،" سرفراز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر بات ہوگی۔" وہ الوداعی ہنسی ہنس کر چلی گئی۔ کیک کا ذرہ ابھی تک وہیں اٹکا تھا جس کی اُسے خبر بھی نہ تھی جیسے سرفراز کا دِل جس کی کیفیت کا اُسے علم تک نہ تھا، مگر جس پہ آہستہ آہستہ اُس کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا۔

گھر بھر میں تاریکی تھی، سوائے ایک شعیب کے کمرے کے، جس میں چار لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ آصف گولڈ اور شرفی دونوں کو آصف کی کار پہ، جو اُس کے سنگدل باپ نے اُسے خرید کر دے رکھی تھی، راتوں رات ملتان پہنچنا تھا، جہاں دونوں کی پوسٹنگ تھی۔ مگر شرفی کا اِصرار تھا کہ۔۔۔۔ "یار زندگی کا کیا پتا"۔۔۔۔ روانگی سے پہلے تاش کا ایک راؤنڈ ہو جائے۔ تین گھنٹے کے اندر شرفی اپنی ساری نقدی ہار چکا تھا۔

"شوکی نے شرط کے سو روپے دینے ہیں،" وہ بولا۔ "وہ لگاتا ہوں۔"

"ارے جا،" آصف نے کہا، "بانڈے سے بہاولپور کے ریگستان میں کون جا کر وصول کرے گا۔"

"دے دے گا۔ نہ دیا تو کیپٹن دلاور لے کر دے گا۔"

"کیپٹن دِلاور سے کون مانگے گا؟"

"اگلے مہینے ری یونین ہے۔ تجھے پیسوں سے واسطہ ہے ناں؟ مل جائیں گے۔"

"نو وے،" آصف نے سر ہلا کر کہا۔

"تو لے پھر،" شرفی نے اپنی گھڑی اُتار کر میز پہ رکھ دی۔

"پک اِٹ اَپ، شرفو،" شعیب نے کہا۔ "یہ میس نہیں، میرا گھر ہے۔ پرسَل پراپرٹی نہیں چلے گی۔"

"کیا حرج ہے۔ بڑا بڑا نواب سلطنت ہار جاتا ہے۔ ہارنے میں کونسی بے عزتی کی بات ہے؟ شاعروں نے تو اسے زندہ جاوداں بنا دیا ہے۔"

"زندہ جاوید،" سرفراز نے تصحیح کی۔

"زندہ جاوداں،" شرفی نے اصرار کیا۔ "وانٹ اے بیٹ؟"

"شرفی، تو ان پڑھ کا ان پڑھ ہی رہا،" شعیب نے کہا۔

آصف نے گھڑی اُٹھا کر آگے بڑھائی اور دُوسرے ہاتھ کی اُنگلی ہلا کر شرفی کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ "کم آن، گیٹ اَپ۔ دو بج گئے ہیں۔ چھ بجے پریڈ پر پہنچنا ہے، یاد ہے؟"

"لولیتا زندہ رہے،" شرفی کہا۔ "دو گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

آصف کی زرد رنگ فوکس ویگن لولیتا کے نام سے مشہور تھی۔

"تجھے سٹیئرنگ کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا،" آصف نے کہا۔ "آتی دفعہ تو نے میرا خُون خشک کر دیا تھا۔ چل اُٹھ۔"

"کیوں، کیا ہُوا تھا؟" شعیب نے دریافت کیا۔

"اِدھر کی اُدھر چلاتا ہُوا آیا ہے، اَور کیا ہُوا ہے؟ ریسنگ ڈرائیور کا تُخم۔"

"بھئی توپچی ہے ناں،" سرفراز نے کہا۔ "نشانہ اِدھر مارتا ہے، گولہ کہیں اَور گرتا ہے۔"

شرفی کلائی پہ گھڑی باندھ کر بادل نخواستہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"شرفی،" سرفراز نے کہا، "زندہ جاوداں شاعر کا کلام تو سناتے جاؤ۔"

"دونوں جہان،" شرفی نے میز پہ پھیلے ہُوئے پتوں کی جانب اُنگلی سے اشارہ کر کے کہا، "تیری محبت میں ہار کے، وہ جا رہا ہے کوئی ـــــ"

باقی کا شعر چاروں کے قہقہوں میں دب گیا۔ بیرونی برآمدے کے چھوٹے سے بلب کی روشنی میں اُنھوں نے الوداع کہی، اور لولیتا پھرررر کرکے گیلی رات میں سفید دھواں چھوڑتی ہوئی تاریکی میں غائب ہوگئی۔ شعیب اور سرفراز جیبوں میں ہاتھ دیئے کچھ دیر تک وہیں کھڑے لان کی نیم تاریکی میں دیکھتے رہے جس کی گھاس اکتوبر کی اوس میں کہیں کہیں سے چمک رہی تھی۔

"تم کس وقت پیدا ہُوئے تھے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"یاد نہیں رہا" شعیب نے جواب دیا۔

"ذہن پر زور دے کر سوچو۔ اُواں اُواں کی آواز کے ساتھ ایسوسی ایٹ کرو۔ پھر گھڑی کی شکل یاد کرکے بتاؤ سوئیاں کس پوزیشن میں تھیں۔ میں خُود حساب لگالوں گا۔"

"شائد صبح کے آٹھ بجے تھے،" شعیب سنجیدگی سے بولا۔

"گویا اب تُم اِکیس برس اور اٹھارہ گھنٹے کے ہو چکے ہو۔"

"ہاں،" شعیب نے سوئے ہُوئے لہجے میں کہا۔ "تخمیناً۔"

"اِس لمبے عرصے میں تُم نے کیا کام کیا ہے؟"

"کیشن پائی ہے۔"

"میں اِسے کوئی ایسا کام نہیں سمجھتا۔"

"ایم ایس، توڈِس لائک ہے۔"

"نو۔ جسٹ اِیزی۔"

"میں تو سونے جارہا ہوں۔ شعیب نے کہا۔

"میں بھی ابھی آرہا ہوں۔ تُم چلو۔"

سرفراز برآمدے سے نِکل کر لمبے، مستطیل لان میں داخل ہوا اور ٹہلتا ہُوا اُس کے وسط تک چلا گیا۔ وہاں رُک کر وہ پلٹا اور بے خیالی سے مکان کو دیکھنے لگا۔ نسیمہ کا کمرہ مکان کے عقب کی جانب تھا۔ وہ اِس وقت کیا کر رہی ہوگی، سرفراز نے اپنے دِل سے سوال کیا؟ پھر خُود ہی جواب دیا، گہری نیند سو رہی ہو گی۔ کیا سونے سے پہلے اُس نے دانت صاف کئے ہونگے؟ یہ کوئی ایسا لایعنی سوال نہ تھا۔ سرفراز پہ سراسیمگی طاری تھی۔ وہ کیسے اِن لوگوں کو اُس دقیانوسی گاؤں اور کچے گھر میں لے جائے گا جہاں ڈھنگ کا غسل خانہ بھی

نہیں تھا؟ میس سے واپسی پر نسیمہ نے اپنے بھائی سے سرفراز کی دعوت کا ذکر بھی کر دیا تھا۔

"بچُو، اب تو بلانا ہی پڑے گا" شعیب نے کہا تھا۔ "بچ کر نہیں جا سکتے۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

سرفراز نے اندازے سے دس مہینے کا ذکر کر دیا تھا۔ اب صحیح وقت کا حساب لگانے کے لیے اُس نے انگلیوں پہ شمار کرنا شروع کیا۔ ایک، دو، تین---- اُس کے پاس نو مہینے اور نو دِن کا عرصہ تھا۔ صِرف اتنے وقت میں وہ کیسے اپنی زندگی کا نقشہ بدل سکتا تھا؟ ایک مایوس سا خیال اُس کے دِل میں آیا کہ وہ اپنی سالگرہ شہر کے کسی ہوٹل میں منعقد کر سکتا تھا۔ لالہ خوشی سے بل ادا کر دے گا۔ مگر نسیمہ نے تو خاص طور پہ اُس کے گاؤں آنے کی خواہش کا اِظہار کیا تھا۔ کمبخت گاؤں کا ذکر کیسے آیا تھا؟ سرفراز کا ذہن نسیمہ کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کو ٹٹولتا ہوا پیچھے کی جانب چلنے لگا اور ایک مقام پہ جا کر رُک گیا۔ "بارش کا موسم ہے،" اُس نے خُود کہا تھا "دیہات میں تو ہر شے سرسبز ہو جاتی ہے۔" غصے میں سرفراز نے ایک چپت اپنی ران پہ ماری۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کیوں نہیں کہا کہ وہاں تو گھٹنے گھٹنے کیچڑ ہو جاتا ہے جس کے اندر چلنا محال ہوتا ہے؟ سرفراز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عنقریب اُس کے بدن کا لباس چھن جانے والا تھا اور وہ دنیا کے سامنے ننگا ہو جائے گا۔ اِسی حالت میں وہ بستر پہ پہنچ کر اندھیرے میں لیٹا رہا۔ دیر تک اُسے نیند نہ آئی۔ پہلی بار اُسے احساس ہو کہ وہ کہاں سے اُٹھ کر کہاں پہ آ پہنچا تھا اور اِس مقام پہ وہ اپنی ذات تک محدود تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی قافلہ، کوئی قبیلہ چل کر نہ آیا تھا۔ ایک اُس کا بھائی تھا جس نے اپنی محنت سے چار پیسے کما لیے تھے، مگر کوئی اعلیٰ عہدیدار، کوئی جاگیردار، کوئی نامور سیاستدان اُس کی پشت پہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے آبائی گھر کا دروازہ بھی کسی کے آگے کھولنے کے قابل نہ تھا۔ آخر نیند کے غلبے کے اندر ایک بیتاب، فریاد کرتا ہُوا سوال اُس کے دماغ میں ابھرا: میں نے نسیمہ کے آگے اپنے دِل کو اِتنی ڈھیل کیوں دی تھی؟

"یار ایک کام تو کرنا" جاتے جاتے سرفراز نے شعیب سے کہا۔ "میرا ایک کزن ہے، عباس۔"

"باسا؟" شعیب نے ہنس کر پوچھا "ڈنڈی والا باسا؟"

"ہاں" سرفراز ہنسا۔ "اُسے پولیس میں بھرتی کروانا ہے۔"

"کیوں، زمیندارے سے بھاگ گیا ہے؟"

"وہ تو اس نے دیر ہوئی چھوڑ دیا۔ کچھ غلط کاموں میں پڑ گیا ہے۔ بریگیڈیر صاحب کے کوئی کانٹکٹ ہیں؟"

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں" شعیب نے کہا۔ "سُرخرو سے کہوں گا۔ تُم خُود بھی کہہ سکتے ہو۔ اُس کا بھائی اے۔ ایس۔ پی لگا ہُوا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہاں پر۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز میں۔"

"یار تُم ہی اُس سے بات کرنا۔ تُمہاری اُس اُجڈ پٹھان کے ساتھ زیادہ دوستی ہے۔"

"وہ آدمی کام کا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں بات کر لوں گا۔"

"بھولنا نہیں، اِٹس امپارٹنٹ۔"

"ڈونٹ وری۔ آئی وِل لیٹ یو نو۔"

سرفراز واپس اپنی یونٹ میں پہنچا تو اُس کے دل میں ایک ہی خیال تھا۔ گو دو ہفتے کے بعد وہ ایک دِن کی چھٹی پہ گھر جانے والا تھا، مگر کیفیت یہ تھی کہ اُس وقت تک اِنتظار کرنا اُس کے لِئے محال ہو چُکا تھا۔ آتے ہی وہ اعجاز کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ نو دس مہینے میں، اُس نے لکھا، اُس کے کچھ دوست احباب مہمان بن کر گاؤں آنے والے تھے۔ گھر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اگر سارا گھر پکا نہیں بن سکتا تو کم از کم صحن اور باہر کی دیواروں پر اینٹیں چنوائی جانی چاہئیں۔ مگر سب سے ضروری بات یہ تھی کہ صحن والا کمرہ گرا کر اُس کی جگہ پہ ایک پکا کمرہ بنایا جائے جس کے ساتھ ایک غسل خانہ ہو۔ غسل خانے میں سارے اِنتظامات ہونے چاہئیں۔ نہانے کے علاوہ مُنہ ہاتھ دھونے، دانتوں پہ برش وغیرہ کرنے کے لِئے واش بیسن، اور سامنے دیوار پر شیشہ نصب ہونا چاہئے۔ سب باتیں تفصیل سے لکھ کر سرفراز نے مزید کہا کہ باقی آئندہ، اور خط کو اُسی روز رات کی ڈاک میں بھیج دیا۔ دو ہفتے کے بعد وہ ایک روز کی شیشن لیو پر گاؤں گیا۔

"سرفراز، میں نے آتے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تیرے خط کے مطابق سب کام ہو جائے گا۔ دُہرا کر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"لالہ،" سرفراز ہنس کو بولا، "مجھے پتا ہے نا، کہ تُم پیسے کو کتنے زور سے باندھ کر رکھتے ہو۔"

"پیسا کھیت کے چوہے کی طرح ہوتا ہے،" اعجاز نے کہا، "پکڑ کے نہ رکھو تو دم چھڑا کر بل میں غائب ہو جاتا ہے۔ شکر کر کہ اکیلی جان ہو، میں تیرے پیچھے کھڑا ہوں۔ گھر بار چلاؤ گے تو پتا چل جائے گا۔ یہ کاغذ کیسا لے کر آئے ہو؟"

"میں نے کچھ ٹھیکیداروں سے پوچھ گچھ کر کے کام کا تخمینہ لگوایا ہے۔"

"سرفراز ٹھیک ہی تو کہتا ہے،" سکینہ بولی۔ "افسروں کے میل جول والے بھی افسر ہی ہوتے ہیں۔ اُٹھک بیٹھک کے لِئے جگہ مناسب ہونی چاہئے۔ اس میں ساروں کی عزت ہے۔"

"تو کیا مجھ کو اِس بات کی سمجھ نہیں؟" اعجاز نے کہا۔ "اب تُو بھی مجھے سبق پڑھانے لگی ہے۔ تُم دونوں کے ہاتھ میں کام دے دوں تو کباڑا کر کے رکھ دو۔ یہ جو فوج کے ٹھیکیداروں سے حساب کتاب کروا کے لایا ہے، اپنی طرف سے بڑا تیر مارا ہے۔ اتنی رقم سے تو دو مکان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ لٹیرے ہیں۔ کوئی انجان اُن کے ہتھے چڑھ جائے تو جیب خالی کر دیتے ہیں۔ یہ کام میرے اُوپر چھوڑ دے سرفراز دس مہینے تو بڑی دور کی بات ہے۔ دیکھتے دیکھتے مکمل کروا دوں گا۔ اچھا یہ کونسے مہمان ہیں جو آ رہے ہیں؟"

"ایک ہی ہے،" سرفراز نے جواب دیا۔ "میرا ایک دوست ہے۔"

"بس ایک؟"

شاید اُس کے ساتھ،" سرفراز کا دِل اُچھلا، "کوئی اور بھی آ جائے۔"

"تیرا دوست بھی لفٹنٹ ہے؟"

"ہاں لالہ۔ شعیب۔ پاسنگ آؤٹ پر تُم سے ملا تو تھا۔"

"شعیب؟ کچھ کچھ یاد پڑتا ہے۔ وہ تو نہیں جس کا بڑی بڑی مونچھوں والا بریگیڈیئر باپ بھی آیا ہُوا تھا؟"

"وہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، سو دفعہ آئیں۔ میرا اور تیرا گھر تیرے دوستوں کا اپنا گھر ہے،" اعجاز فخر سے بولا۔ "فکر نہ کرو، اُن کے شایانِ شان مکان تیار ہوگا۔ کہو گے تو ساری گلی پکی کروا دوں گا۔ سردیاں نکل جائیں تو شروع کرواتا ہوں۔"

"کیوں؟" سرفراز نے پوچھا۔

"تجھے تعمیراتی کام کا تجربہ نہیں۔ سیمنٹ اور اینٹ کو دھوپ چاہئے ہوتی ہے، کڑکتی ہوئی دھوپ، پھر جا کے اینٹ اپنی اصلی جگہ پر بیٹھتی ہے۔ اپریل میں شروع کرا کے مئی میں ختم کرا دوں گا۔ بارشوں سے پہلے سب کچھ سوکھ جائے گا۔ تیری سالگرہ تو اگست میں ہے ناں؟ بڑا وقت پڑا ہے۔ تسلی سے رہ۔ بس یہ سردیوں کے مہینے کام کا زور ہے۔ یہ بھی نکل جائے گا۔"

"کونسے کام کا؟" سرفراز نے پوچھا۔

"اپنا باہر کا کام ہے،" اعجاز نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "تو فکر نہ کر۔ چاہے تو ساری پلٹن کو لے آنا۔"

"باہر کا کام۔ باہر کا کام،" سکینہ بڑبڑانے لگی۔ "ذرا اپنے لالے سے پوچھ باہر کا کیا کام ہے؟ کوئی زمین کا کام ہے؟ کاروبار کا کام ہے؟"

"چل تُو چپ کر،" اعجاز نے کہا۔

"چپ کیوں کروں؟ گڑ کی منڈی میں مندا آگیا ہے اور اسے باہر کا کام پڑا ہوا ہے۔ میری بات کو تو یہ بیٹھا بیٹھا گنوا دیتا ہے۔"

سرفراز نے یہ دیکھا تو بات بدلنے کو کہا۔ "کچھ گلی کی نالی کا بھی انتظام ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"ہو جائے گا ہو جائے گا۔ تُو تو ایسے فکر کر رہا ہے جیسے کل ہی تیرے مہمان آنے والے ہیں۔"

باب 10

سردیاں گزرنے پر اعجاز نے وعدے کے مطابق جون کے شروع تک مکان اور صحن پکا کروا کے سفیدیاں کرا دی تھیں اور ساری عمارت جون کی دھوپ میں سوکھ کر مضبوط ہو چکی تھی۔ اُس نے پرانے کچے کمرے کو اُسی طرح رہنے دیا اور گلی والے بڑے دروازے کے ساتھ اندر کی طرف ایک نیا کمرہ اور غسل خانہ تعمیر کرا دیا۔ ساتھ ہی باورچی خانے میں بھی تبدیلیاں کرائی گئیں۔ سفیدی کے علاوہ دیواروں پر چھتیاں لگوائی گئی تھیں جن پر برتن اور مرچ مصالحے کے ڈبے رکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ درمیان میں رکھنے کے لئے پالش شدہ لکڑی کی میز اور چار کرسیاں خریدی گئیں جنہیں سرفراز اپنے قیام کے دوران، یا کبھی کبھی دونوں لڑکے کھانا کھانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اعجاز اور سکینہ ہمیشہ چولہے کے پاس پیڑھیوں پہ بیٹھ کر کھاتے، اور گرمیوں کے سات آٹھ مہینے، بارشوں کے دن چھوڑ کر، ہانڈی چولہا اب صحن میں رہا کرتا تھا۔ مہمانوں کے لئے جگہ تیار تھی، مگر یہ کسی کو یاد نہ رہا تھا کہ سرفراز کی سالگرہ والے دن فوج کی یونٹیں یوم آزادی کی تقریبات کی ریہرسل کیا کرتی ہیں اور افسروں کے لئے چھٹی لینا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ وقت آنے سے کافی پہلے ہی سرفراز اور شعیب کا آپس میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ سرفراز کی سالگرہ کو ستمبر کے مہینے تک ملتوی کر دیا جائے۔ اگست کے آخری ہفتے میں یہ طے ہوا کہ ستمبر کی گیارہ تاریخ کو شعیب اور نسیمہ گاؤں پہنچیں گے۔ سرفراز نے اعجاز کو، جو اپنی ذمہ داری نبھانے کے بعد ایک بار پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو چکا تھا، فوٹوگرافر کی دکان پر فون کر کے پیغام دلوا دیا۔ دس تاریخ کو چولہے کا سارا انتظام صحن سے اٹھا کر باورچی خانے کے اندر منتقل کر دیا گیا۔

سہ پہر کے وقت جب شعیب اور نسیمہ پہنچے تو سرفراز مہمانوں کے لئے نئے بنے ہوئے کمرے میں ان کے بیگ رکھوا کر انہیں باورچی خانے میں لے گیا جہاں سکینہ بیٹھی ہوئی رات کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "السلام علیکم،" وہ سر کو اوڑھنی سے ڈھانپتے ہوئے بولی، اور کرسی سیدھی کر کے نسیمہ کے بیٹھنے کا

انتظار کرنے لگی۔

"نہیں نہیں،" نسیمہ نے کہا، "آپ بیٹھی رہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔" وہ سکینہ کے بیٹھنے کا انتظار کیئے بغیر جا کر چولہے کے پاس دُوسری پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

سکینہ وہاں سے ہٹ کر اُن کے لِئے جگ میں شربت بنانے لگی۔ سرفراز، شعیب اَور اعجاز میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سکینہ نے شیشے کا جگ اَور تین گلاس میز پر رکھے، اَور چوتھے میں شربت بھر کر نسیمہ کو پیش کیا۔ پھر وہ جا کر اپنی پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"آیئے،" نسیمہ نے ہاتھ بڑھا کر حسن سے کہا، جو کھڑا دلچسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ "ہمارے پاس آیئے۔"

"حسن، جو "اوئے" کر کے بلائے جانے کا عادی تھا، اَیسے طور پہ مخاطب کئے جانے پر پریشان ہو گیا۔

"آیئے بھئی، میں آپ کی بہن ہوں،" نسیمہ نے دُہرا کر کہا۔

"چل اوحسنے، یہ تیری باجی ہے،" سکینہ نے حکم دیا۔ "سلام کر۔"

حسن رُک رُک کر، ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا۔

"آیئے۔ آؤ آؤ۔ اَیشاباش۔ یہاں بیٹھو۔ آؤ۔ اب بیٹھ بھی جاؤ۔ ہاں، اَیسے ے ے---- آپ کا نام کیا ہے؟"

حسن چپ چاپ بیٹھا نسیمہ کا مُنہ دیکھتا رہا۔

"اوئے بول، اپنا نام بتا،" سکینہ نے کہا، "یا گنگ شاہ تجھے چاٹ گیا ہے؟"

بچے نے شرما کر نظریں پھیر لیں، مگر زبان نہ کھولی۔

"حسن،" سکینہ نے بتایا۔ "اِس کا نام حسن ہے۔ سارا دِن تو زبان اِس کے مُنہ میں نہیں ٹھہرتی، اِس وقت گُنگا ہو گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں،" نسیمہ ہنس کر بولی، "شرما رہا ہے۔" پھر وہ حسن سے مخاطب ہوئی۔ "شرمانے کی کیا بات ہے بھئی، میں تو تُمھاری باجی ہوں۔ سکول جاتے ہو؟"

بچے نے اِثبات میں سر ہلایا۔

"کونسی جماعت میں ہو؟"

"پانچویں میں ہے۔" سکینہ نے جواب دیا۔ "دونوں پانچویں میں ہیں۔"

"دونوں؟"

"جوڑے ہیں،" سکینہ نے کہا۔

"اوہ۔۔۔" نسیمہ نے کہا، "جوڑے ہیں؟ دُوسرے کا کیا نام ہے؟"

"حسین۔"

"حسن اور حسین۔ بھئی واہ کیا خُوب نام ہیں۔ وہ کہاں ہے؟"

"باہر ہوگا۔" سکینہ بولی، پھر اعجاز سے مخاطب ہوئی، "اسے پکڑ کر لاؤ۔ دوپہر سے غیب ہے۔"

"سکول میں ہمارے ساتھ بھی ٹونز پڑھا کرتی تھیں،" نسیمہ نے بتایا۔ "آئیڈینٹیکل ٹونز۔ بالکل ایک جیسی تھیں۔ اُن کی شناخت کرنے کے لیے الگ الگ سیکشنوں میں داخل کیا گیا تھا۔ شبو، یاد ہیں جمیلہ اور عقیلہ؟"

"ہاں۔"

سرفراز اور شعیب اپنے اپنے گلاس ختم کرکے اُٹھے اور سرفراز کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں پہ وہ چند منٹ تک بیٹھے اپنے گروپ کے لڑکوں کی تازہ ترین خبروں کا تبادلہ کرتے رہے۔ گولڈ نے لولیتا بیچنے پہ لگا دی تھی، اس کا او۔ سی۔ حسد کی وجہ سے اُس کے خلاف ہو گیا تھا اور اُسے ریگولیشن مُک دکھاتا رہتا تھا۔ بکرے کو ذرنگن ٹیس اور مس بی بیوئیر پر ریپرمانڈ مل چکی تھی۔ نیولے کی منگنی ہو گئی تھی۔ شعیب نے بتایا کہ وہ اِس سال سول سروس کا امتحان دینے کا ارادہ رکھتا تھا اور اجازت نامہ حاصل کرنے کی درخواست جی۔ ایچ۔ کیو جا چکی ہے۔ پھر اُس نے کہا

"ایم ایس، یار اپنا 'پنڈ' تو دکھاؤ۔"

باورچی خانے کے سامنے سے گزرتے ہُوئے سرفراز نے دیکھا کہ نسیمہ کی آدھی پیڑھی پہ حسن اور ساتھ ہی فرش پہ حسین بیٹھا ہُوا تھا۔ نسیمہ دونوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اعجاز کرسی پہ بیٹھا اپنے سست انداز میں سکینہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سرفراز اور شعیب ابھی دروازے تک ہی گئے تھے کہ اعجاز نے آواز دی۔

"دو منٹ رک جاؤ، چائے بن رہی ہے۔"

دونوں وہیں پہ رُک کر باتیں کرتے رہے، پھر ٹہلتے ہُوئے واپس آ کر باورچی

خانے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"چلو اب باجی کا پیچھا چھوڑو۔" سکینہ نے چائے کے برتن میز پہ رکھتے ہوئے بچوں سے کہا، "آو بی بی، اب یہاں اُوپر بیٹھ کر چائے پیو۔"

"نہیں جی، میں آرام سے بیٹھی ہوں۔ ہم سب،" اُس نے دونوں بچوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، "یہاں پر ہی چائے پئیں گے۔"

سکینہ نے عمدہ چینی کے سیٹ میں، جو سال بھر میں ایک آدھ بار ہی نکلتا تھا، چائے بنائی۔ اعجاز اُن کے لِئے شہر سے ولایتی بسکٹوں کے ڈبے خرید کر لایا تھا جو اُس نے کھول کر پیش کئے۔

"لالہ، آپ کے گُڑ کی بہت تعریف سنی ہے،" شعیب نے کہا۔

"سرفراز ساتھ لے جاتا رہا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اِس نے چکھایا نہیں؟"

"اِس کی اپنی بھوک ختم ہو تو کسی کو دے: مجھے تو اس نے ہوا تک نہیں لگائی۔"

"بیچ دیتے ہونگے،" نسیمہ شرارت سے بولی۔

"جیسے تُم کیا کرتی تھیں،" شعیب نے کہا۔

"کب؟" نسیمہ نے چمک کر کہا اور ساتھ ہی اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"سردیوں میں ہماری خالہ سوجی کی پنیاں بنا کر بھیجا کرتی تھیں۔"

"جھوٹ،" نسیمہ چیخی۔

"چھپی اپنے حصے کی سکول لے جاکر۔۔۔۔"

"جھوٹ جھوٹ۔ شبو جھوٹ مت بولو۔۔۔۔"

"اپنی سہیلیوں کو بیچ دیتی اور اُن پیسوں کے آلو چھولے کھالیتی تھی۔"

سب ہنسنے لگے۔ اُنہیں دیکھ کر حسن اور حسین بھی ہنس پڑے۔

"اِن کی باتیں مت سنو،" نسیمہ بچوں سے مخاطب ہوئی۔ "یہ گپیں مار رہے ہیں۔"

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے منہ پھیر کر چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔

اعجاز نے ایک مرتبان چھتی سے اتارا اور اُس کا ڈھکنا اُتار کر پلیٹ میں اُنڈیل دیا۔ پلیٹ گُڑ کی ڈلیوں سے بھر گئی۔ شعیب نے ایک ڈلی اُٹھا کر دانتوں سے کاٹی اور چبانے لگا۔

سکینہ نے پلیٹ اٹھا کر نسیمہ کے آگے بڑھائی۔

"مم م م ۔۔۔۔۔" نسیمہ نے ڈلی چباتے ہوئے بند منہ سے آواز نکالی۔

"ڈیلشس ۔"

"ویری گڈ،" شعیب نے کہا۔ "گھر میں بناتے ہیں؟"

"اپنی زمین پر،" اعجاز نے کہا "ڈیرہ ہے۔ سب سامان وہیں پر ہے۔"

"گویا باقاعدہ کارخانہ ہے،" شعیب نے کہا۔ "دیکھنا چاہئے۔"

"ابھی چلتے ہیں، ذرا سورج نیچا ہو جائے۔" اعجاز نے کہا۔

"گرمی ختم ہونے میں نہیں آتی،" سکینہ نے کہا۔ "دھوپ کی تپش اسی طرح ہے۔"

کمرے کی چوڑی سی کھڑکی کے راستے دھوپ داخل ہو کر آدھے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ باہر ستمبر کی فضا مکمل طور پر ساکن تھی۔ اچانک ایک لمحہ ایسا آیا کہ سب کی باتیں ایک ساتھ رُک گئیں اور کمرے پہ سکوت طاری ہو گیا۔ اُس ایک لحظے کے اندر سرفراز کے دِل میں گویا یکبارگی کوئی کل کڑک کر کے سیدھی بیٹھ گئی اور اُس کے بدن کی ساری کلیں ایک دوسری کے ربط سے یوں بے آواز ہو کر چلنے لگیں جیسے کوئی تازہ تازہ تیل دی ہوئی متوازن مشین ہو۔ اُس لمحے میں سرفراز نے اپنی آنکھوں کے قریب دیکھا کہ نسیمہ پیڑھی پہ اس طرح سکون سے بیٹھی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں رہتی آئی ہو، اور اُس کے دل کے سارے خوف، سارے وسوسے غائب ہو گئے اور فرش سے لپٹی ہوئی روشن دھوپ اٹھ کر اُس کے دل پر پھیل گئی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بے اختیار اُٹھے اور نسیمہ کے پاس جا کر زمین پر بیٹھ جائے اور کوئی عام سی، سادہ سی بات کرے، جیسے "سناؤ کیا حال ہے۔" دِل ہی دِل میں وہ اِس خیال سے مسکرا اُٹھا۔ اگلے ہی لمحے باتوں کا دور پھر شروع ہو گیا۔ مگر اب اُس کا جی ٹھہر چکا تھا، جیسے حفاظت میں آ گیا ہو، دھک دھک کی تنگی مٹ گئی تھی اور دِل کا علاقہ وسیع ہو گیا تھا، جس کے اندر وہ ایسی آہستگی سے رواں تھا کہ کان لگانے پہ ہی سُنا جا سکتا تھا۔

"یہ بہت سارے کھانے آپ اکیلی پکا ئیں گی؟" نسیمہ پوچھ رہی تھی۔

"اور کیا؟"

"چلیں میں آپ کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

"اوں ہوں،" سکینہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "آپ ان کے ساتھ ٹہلنے کو جائیں۔ سیر کرنے آئی ہیں، کام کرنے تو نہیں آئیں۔ جا کر زمین دیکھیں، میں سب کچھ کر لوں گی۔" سکینہ جو چار جماعتوں تک سکول میں پڑھی ہوئی تھی، احتیاط کے ساتھ، رُک رُک کر نسیمہ سے بات کر رہی تھی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

"بی بی تو میس میں بندوں کا کھانا اکیلی پکاتی ہے،" سرفراز بولا "ہمارے ساتھ چلیں، آپ کو لالے کا کارخانہ دکھاتے ہیں۔"

سرفراز پہ سارا گاؤں فخر کرتا تھا۔ اُنھیں پتا تھا کہ پہلی بار اُس کے مہمان آئے تھے جو خُود بھی افسر تھے، جنھوں نے اپنی کار گلی کے باہر کھڑی کی تھی، اور جن کے لِئے ملک اعجاز نے اپنی زمین پر دھریک اور بکائن کے تین درخت گرا کر پھٹے کٹوائے تھے جن سے گلی کی نالی ڈھک دی گئی تھی تاکہ اُن کے پیر گندے پانی میں نہ پڑیں۔ گلی میں جو کوئی بھی سامنے آتا خاص اہتمام سے پہلے شعیب کے ساتھ اور پھر سرفراز اور اعجاز سے ہاتھ ملاتا، ہاتھ کو اپنے سینے پہ پھیرتا اور دیہاتیوں کے دستور کے مطابق کوئی بات کئے بغیر نسیمہ کو، جس کا دوپٹہ کندھوں پہ اور سر ننگا تھا، کنکھیوں سے دیکھتا ہوا رستہ چھوڑ کر گزر جاتا۔ گلی سے نکلتے نکلتے اُنھیں دس منٹ لگ گئے۔ دروازوں میں عورتیں اور بچے کھڑے تھے، عورتیں مردوں کو کم اور نسیمہ کو زیادہ دلچسپی سے دیکھ دیکھ کر اوڑھنیوں کی اوٹ میں مسکرا رہی تھیں، جو اُن کا خوش آمدید کہنے کا انداز تھا۔ فورڈ کار کے گرد بچے جمع تھے۔ سورج ڈھل رہا تھا جب وہ ڈیرے پہ پہنچے۔

"اِن کڑاہوں میں رس اُبلا جاتا ہے،" اعجاز اُنھیں بتانے لگا۔ "یہ بیلنا ہے۔ اِس کو بَیل کھینچتے ہیں۔ اِس وقت سب کام بند پڑا ہے۔ ابھی فصل میں رس آنا شروع ہی ہوا ہے۔ مہینے دو کے بعد اگر آپ آئیں تو اِس جگہ پر دِن رات زندگی کی ہلچل دیکھیں گے۔۔۔۔ یہ ہمارا ساتھی گل افروز خان ہے۔"

گل افروز نے، جو فوج میں سپاہی رہ چکا تھا، بوٹوں کی ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ مارا۔

"ریٹائر سولجر گل افروز خان، فرنٹیئر فورس رجمنٹ سر۔" شعیب نے فوجی انداز میں ہاتھ اٹھا کر سلیوٹ کا جواب دیا۔

"فوج میں تو یہ پتا نہیں کیا کرتا ہوگا" اعجاز نے ہنس کر کہا، "گُڑ کا کاریگر یہ ایک نمبر کا ہے۔ اصل میں ہم لوگ تو سب فالتو آدمی ہیں۔ گُڑ بنانے کا کمال گل افروز کا ہی ہے۔ پچھلے سال کا کچھ سٹاک ابھی ہمارے پاس پڑا ہے۔ گل افروز، کمرے کھولو، صاحب کو دکھائیں۔"

گل افروز نے بھاگ کر کمرہ کھولا اور لالٹین جلائی۔ اعجاز، شعیب، حسن اور حسین اُس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔ سرفراز عمداً پیچھے رہ گیا۔

"کمروں میں کیا ہے؟" نسیمہ نے پوچھا۔

"بڑی بڑی عجوبہ روزگار چیزیں ہیں۔"

"اچھا؟ کیا ہیں۔"

"گُڑ کی بوریاں اُوپر نیچے رکھی ہیں۔"

نسیمہ ہنس پڑی۔

"چلیے ٹہل کے آتے ہیں۔" سرفراز نے کہا۔ "لالہ تو بور کر رہا ہے۔ اس کی زندگی گُڑ بنانے اور یا اپنے لیبر یونین کے کام کے گرد گھومتی ہے۔"

کمروں کے عقب میں کچھ فاصلے پر مال بندھا تھا۔ دو بیل، ایک گائے، بچھڑا اور ایک بھینس۔ بھینس جگالی کر رہی تھی۔ اُن کے پاس اعجاز کا ایک مزدور بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

"لیبر یونین؟" نسیمہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ بڑے عرصے سے اِس کام میں لگا ہوا ہے۔"

"اِس کام میں داخل کیسے ہوئے؟"

"کسی زمانے میں لالہ یہاں سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ غالباً وہاں ٹیچرز یونین سے ابتدا ہوئی۔ اب تو ایک بڑی یونین کا سیکرٹری ہو گیا ہے۔ بڑی محنت کرتا ہے۔"

"ساتھ ساتھ زمینداری بھی کرتے ہیں، گُڑ بھی بناتے ہیں؟"

"ہاں" سرفراز آہستہ سے ہنسا۔

"خاصا عجیب سا کمبو ہے۔" نسیمہ نے کہا۔

"ہے تو" سرفراز نے جواب دیا۔ "سب کہتے ہیں کوئی ایک کام کرو، اُس پر توجہ دو، آرام سے بیٹھو۔ مگر لالے نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی۔ دن رات بھاگتا رہتا ہے۔

جیسے اس کے سر پر جن سوار ہیں۔ واقعی عجیب آدمی ہیں۔ مجھے تو اس کی سمجھ نہیں آتی۔"

مزدور حقہ ہاتھ میں لئے، نالی مُنہ سے نکالے بغیر، اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ اُس کے ساتھ ہی گائے بھی نامانوس لباس والی عورت کو دیکھ کر ایک زوردار جنبش کے ساتھ اُٹھی اور آہستہ آہستہ ڈکرانے لگی۔ نسیمہ اُس پہ نظر رکھے، رستہ چھوڑ کر گزر گئی۔ سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر گائے کے ماتھے پر پھیرا اور کان کے پیچھے کھجلی کی۔ گائے نے سر جھٹک کر موڑ لیا اور زور سے ڈکرائی۔

"آپ کو ویلکم کر رہی ہے،" سرفراز نے کہا۔

"میں خُوب جانتی ہوں۔ ایک گائے نے ہمارے گاؤں میں ویلکم کرتے کرتے مجھے سینگ مار دیا تھا۔ اِس کا نشان آج تک میری پنڈلی پہ موجود ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔"

"اصل میں اِن سے ڈریں تو یہ فوراً جان جاتے ہیں اور دلیر ہو جاتے ہیں۔"

"اگر ڈنگروں اور حیوانوں سے ڈر لگے تو کیا کریں؟"

"پتا نہ چلنے دیں۔ سینہ تان کے گزر جائیں۔"

"جی میدان جنگ میں آپ ایسے ہی کرتے ہیں؟"

"میدان جنگ میں حیوان ڈنگر وغیرہ تو نہیں ہوتے۔"

"اور کیا ہوتے ہیں؟" نسیمہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

سرفراز ہنس پڑا۔ "وہ دُوسری بات ہے۔ بہرحال، میں نے ابھی میدان جنگ نہیں دیکھا۔ آپ کا کونسا گاؤں ہے؟"

"اس کا نام بھولکے ہے۔"

"وہاں بھولے لوگ رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اِتنے بھولے کہ وہاں کا بھولا چور مشہور تھا۔"

"واقعی؟"

"روایت ہے کہ بھولا چور لمبی قید کاٹ کر آیا تو اُس نے چوری ڈاکے سے توبہ کر

لی اَور ویرانے میں آ کر ڈیرہ لگا لیا۔ اپنی چوریوں کی کمائی اُس نے کسی جگہ پہ دفن کر رکھی تھی۔ اُس سے بھولے نے کچھ زمین خریدی اَور کھیتی باڑی کرنے لگا۔ اُس کی قسمت ایسی چمکی کہ بہت سی زمین خرید لی، مکان بنا لیے اَور آٹھ دس شادیاں کر لیں۔" وہ ہنسی۔

"وہاں سے اِس گاؤں کی بنیاد پڑی۔"

"آپ لوگ بھولے چور کے ہاں کیسے پہنچ گئے۔"

"بھئی بھولا چور تو پُرانے زمانے میں تھا۔ ہمارے پردادا کو حکومت کی طرف سے ایک مربعہ زمین ملی تھی۔"

"آپ کے پردادا فوج میں تھے؟"

"جی نہیں۔ وہ شکاری تھے۔ یہ بھی روایت ہی ہے کہ وہ انگریز کلکٹر کو سور کا شکار کھلایا کرتے تھے۔ اُس نے خوش ہو کر جاتے ہوئے اِس ویرانے میں اُنہیں زمین دے دی۔"

"گویا آپ بھی زمیندار ہیں،" سرفراز نے کہا۔

"زمیندار؟ ہم تو چھوٹے موٹے کسان بھی نہیں ہیں۔ وہ تو پاپا آرمی میں چلے گئے تو کوئی بات بنی۔ پھر آرمی نے ہی مکان بنانے کے لیے کینٹ میں پلاٹ دے دیا اور ہم شہر میں بس گئے۔ ورنہ آج ہم بھی اپنے رشتہ داروں کی طرح سبزیاں اگا کر گزارہ کر رہے ہوتے۔ زمیندار ہوتے تو پاپا کو ریٹائرمنٹ کے بعد نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چھ سال سے ہم پیچھے پڑے ہیں کہ اِس پھٹ پھٹی کار کو بیچ کر نئی خریدیں۔ اِس کی نوبت ہی نہیں آتی۔"

نسیمہ کی آواز میں کسی تاسف یا خُود ترسی کا شائبہ تک نہ تھا، ایک سیدھی سادی حقیقت کا بیان تھا اور لہجے میں خُود سامانی اَور فخر کی جھلک تھی۔

"کہاں پر ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"گوجرانوالے کے قریب۔"

"آپ لوگ اب بھی وہاں جایا کرتے ہیں؟"

"کہاں جاتے ہیں۔ وہ ایک مربعہ بٹ بٹا کر ہمارے حصے کے چند کِلّے رہ گئے ہیں، اَور ایک معمولی سا کوٹھا ہے۔"

"ارے، آپ تو بالکل دیہاتیوں کی زبان بولتی ہیں،" سرفراز نے کہا۔

نسیمہ ہنسی۔ "ہماری بودوباش پہ مت جایئے۔ میں تو جنی ہوں جی۔"

اُس کی اِس بات سے یکبارگی سرفراز کی آنکھوں کی فضا بدل گئی۔ اُس کو نسیمہ ایک الگ رنگ میں دِکھائی دینے لگی۔ وہ کماد کی نو عمر فصل کے کنارے کھڑے تھے۔ ہوا میں مٹی، گوبر، حیوانوں کے پسینے اور سبز پتوں کی ملی جلی بو تھی۔ شام کے دُھندلکے میں اُس کے سامنے اُٹھے ہوئے سینے، فراخ ماتھے، سیدھے بالوں، گھنی پلکوں اور خمدار مضبوط پشت والی اِس لڑکی میں کوئی اِسرار نہ تھا، نہ ہی کوئی نزاکت تھی، مگر بلا کی کشش تھی۔ اندھیرا گہرا ہو کر اُس کے چہرے پہ پردہ ڈال رہا تھا اور سرفراز کو اُس کے نقوش کی اُبھری ہُوئی سطحیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اُس کا جی چاہا کہ کوئی روشنی ہو جس میں نسیمہ کی نئی شکل کو دیکھے۔ اچانک اُسے اپنے بچپن کا ایک بھولا ہُوا واقعہ یاد آیا جو اُس نے اپنے باپ کی زبانی سُنا تھا۔ اُس کا باپ دالان میں لیٹا کسی کو بتا رہا تھا کہ اُس کی نوجوانی کے ایک دوست نے رات کے اندھیرے میں اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھنے کے لِئے ایک پورے کھیت کو آگ لگا دی تھی۔ پانچ سالہ سرفراز اپنے باپ کے پاس بیٹھا تھا۔ یہ واقعہ اُس کے ذہن سے قریب قریب محو ہو چکا تھا، مگر اُسے اپنے باپ کی آواز ابھی تک یاد تھی کہ یہ قصہ سناتے سناتے اُس میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی اور اُس کی آنکھوں کی چمک مدہم پڑ گئی تھی۔ سرفراز نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر نسیمہ کے کندھے کو چھُوا۔ اُس کی انگلیوں کے پورے گول شانے پہ بس ایک لمحے کو ٹکے، پھر اُس نے ہاتھ گرا دیا۔ اسی ثانیہ میں، جیسے نسیمہ کو پتا ہو کہ سرفراز کا ہاتھ اُسے چھونے والا ہے، اُس نے سر موڑ کر کھلی کھلی آنکھوں والی بیباک نظروں سے سرفراز کو دیکھا اور اُس کے مُنہ سے ایک نہایت مختصر سی ہنسی پیدا ہوئی، جس میں شرماہٹ کی خفیف سی لہر تھی۔ پھر وہ پلٹی اور کھیت کے کنارے تنگ سی بنی پر چلنے لگی۔

"واپس چلنا چاہیے،" وہ بولی۔ "لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہونگے۔"

سرفراز نے چند ڈگ بھرے اور اُس سے آگے نِکل کر تاریک بنی پر اُس کو راستہ دِکھاتا ہُوا واپس لے چلا۔

گھر پہ چاچا احمد آیا ہُوا تھا۔ اُس نے بڑے تپاک کے ساتھ شعیب سے ہاتھ ملایا اور بے تکلفی سے نسیمہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"ہر وقت دُعائیں دیتا ہوں پتر" چاچے احمد نے شعیب سے کہا "تو نے میرے اُوپر بڑا اَسان کیا ہے۔"

"عباس کا کیا حال ہے؟" شعیب نے پوچھا۔

"سکول میں ٹریننگ کر رہا ہے۔ وردی شردی چڑھا کر مہینے میں ایک دن کی چھٹی آتا ہے۔ گاؤں میں بڑی عزت ہے۔ مگر روتا پیٹتا ہُوا آتا ہے، روتا پٹتا ہُوا جاتا ہے۔ پر میں اُسے گھر میں ٹکنے نہیں دیتا۔" پھر ہنس کر بولا "جب آتا ہے اپنے سرفراز کے پیچھے غصہ دِکھانا نہیں بھولتا۔"

"کیا کہتا ہے چاچا؟" سرفراز نے پوچھا۔

"کہتا ہے میں نے منت کی تھی، مگر سرفراز نہیں مانا۔ مجھے جب مل گیا اُس کی گردن مروڑوں گا" پھر چاچا شعیب کی جانب متوجہ ہو کر بولا "اِن دونوں کی شروع کی جوڑی ہے۔ لنگوٹیے ہیں۔"

"ویری اپراپریئیٹ" شعیب نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

"واٹ؟"

"لنگوٹیا۔"

"او۔ یس۔"

دونوں ہنس پڑے۔

میز پر کھانا لگا۔ مرغ پلاؤ۔ گوشت کا شوربہ۔ تندروی پراٹھے، اَور سوجی کا حلوہ کھا کر سب صحن میں چارپائیوں پہ جا بیٹھے۔ نسیمہ نے تجویز کیا کہ سرفراز کی سالگرہ مناسب طور پر منانے کے لِیے کم از کم چند گانے ہی گائے جائیں۔ سکینہ پہلے شرماتی ہوئی چپکی بیٹھی رہی۔ مگر جب نسیمہ نے اپنی سادہ سی آواز میں گانا شروع کیا تو کچھ دیر کے بعد سکینہ نے اُس میں آواز ملائی اَور ساتھ سرفراز، شعیب، اعجاز اَور چاچے نے تال دینی شروع کر دی۔ اب دونوں لڑکیاں خوشی کے، میلوں اَور شادیوں کے گیت گا رہی تھیں اَور چاروں مردوئے کے ساتھ ملا کر تالی بجاتے جا رہے تھے۔ سرفراز اچنبھے کی حالت میں سوچ رہا تھا کہ شہر کے ماحول میں پلنے والی ایک فیشن ایبل لڑکی کو اتنے سارے دیہاتی گیت اَور اُن کے سُر کیسے یاد تھے؟ کیا وہ واقعی ایک جنی تھی؟ اُس کی آواز میں کوئی جادو نہ تھا۔ مگر اُس کے لہجے میں

ایک بلاخیزلنک تھی۔ سکینہ کی جھجک مٹتی جا رہی تھی اور اُس نے نسیمہ سے بھی اُوپر آواز اٹھانی شروع کر دی تھی۔ ٹھہری ہوئی فضا میں ان کی لہکتی ہوئی آوازیں دور تک جا رہی تھیں اور آس پاس کے گھروں کی عورتیں اپنے اپنے بستروں سے اُٹھ کر چھتوں پہ جمع ہونے لگی تھیں۔ سکینہ نے ہاتھ روک کر اُن میں سے دو ایک کو آواز دی۔ "ربو۔ رجو۔ آ کر حلوہ کھالو۔" کچھ دیر کے بعد رابعہ اور رضیہ صحن میں داخل ہوئیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے پھاتو مراثن ڈھولک اُٹھائے آ رہی تھی۔ "ہائے ڈھولکی،" سکینہ اور نسیمہ ایک ساتھ چیخیں۔ پھر کیا تھا، ڈھولک اور اُس کی لکڑی پہ روڑے اور ساتھ تالیوں کی لے پر پانچ تیز، طرحدار، رقصاں آوازوں میں گیت کے بعد گیت گائے جانے لگے اور کوٹھوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ تین کنواری لڑکیوں کے خوابوں اور ایک بیاہی ہوئی کی ان کہی خواہشوں نے ان سیدھی سادی آوازوں میں ایسی لہک پیدا کر دی تھی کہ سننے والوں کے دل کو مچلاتی تھی۔ اُس موسیقی میں فن سے آگے کی کوئی بات تھی۔ بڑی بوڑھیوں سے لے کر بچوں تک منڈیروں پر کھڑے کھڑے تھک گئے تو آرام سے زمین پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔

آدھی رات تک یہ جلسہ لگا رہا۔ آخر جب گیتوں کا شاک ختم ہو گیا، ہر گیت دو دو، تین تین بار دُہرایا جا چکا اور ایسا موقعہ آیا کہ لڑکیاں ایک دُوسری سے تکرار کرنے لگیں، "بھئی کچھ اور گاؤ۔" ---- "اور کیا گائیں، اور کچھ آتا ہی نہیں،" تو ڈھولک آہستہ آہستہ اپنی قدرتی موت مر گئی۔ رات بھیگ چکی تھی۔ چاچا احمد اُٹھا اور بے وجہ اپنے تہمد پر ہاتھ پھٹک پھٹک کر اُسے جھاڑنے لگا۔

"واہ بھئی واہ،" وہ بولا "ایسا جشن تو تیرے بیاہ پر بھی نہ ہو گا۔"

"ایسی بات نہ کر چاچا،" اعجاز نے کہا، "سرفراز کا بیاہ ایک زمانہ دیکھے گا اور یاد کرے گا۔"

"اِنشاء اللہ،" چاچے نے اُنگلی آسمان کو اُٹھا کر کہا۔ "اِنشاء اللہ۔"

"ملکانی، کوئی انام کرام ہی دے دے،" پھاتو مراثن بولی۔

"لے پھاتو، پہلے حلوہ تو کھا۔" سکینہ نے دوبارہ حلوہ گرم کر کے تینوں لڑکیوں کو دیا، جو اُسے انگلیوں میں اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگیں۔

شعیب جو کچھ دیر سے ایک چارپائی پہ لمبا لیٹا ہوا تھا، بولا "بھئی واقعی ایم ایس، میں

نے کوئی پارٹی اس طرح انجوائے نہیں کی۔ نہ سوٹ نہ بوٹ، نہ میز نہ کرسی، بیٹھے ہو تو بیٹھو، جی کرے تو لیٹ جاؤ۔ اُوپر آسمان اور ستاروں کی چھت۔ آآآ۔۔۔۔ دِس اِز لائف! تم خوش قسمت لوگ ہو۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چل یار سوئیں۔ مجھے تو کوئی بیس گھنٹے ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے۔"

شعیب نے کہا وہ سرفراز کے کمرے میں سوئے گا۔ وہاں اُس کے لیے چارپائی ڈال دی گئی۔ نسیمہ نے ضد کی کہ وہ تو سکینہ کے پاس چارپائی بچھا کر سوئے گی۔ آخر کو مہمانوں کے لیے خاص طور پر تعمیر کیے گئے کمرے میں اعجاز اور دونوں بچے سوئے۔ اُس سے ملحق غسل خانہ، جس میں پتھر اور کوئلہ بھرے زمین دوز گڑھے کے اُوپر فلش سسٹم نصب کیا گیا تھا، صبح سویرے شعیب، نسیمہ اور سرفراز کے اِستعمال میں آیا۔ ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد شعیب اور نسیمہ وہاں سے رخصت ہوئے۔ اُن کے جاتے ہی اعجاز نے ڈیرے سے آدمی بلوا کر لکڑی کے تختے گلی کی نالی کے اُوپر سے اُٹھوا کر صحن میں رکھوا لیے۔

"کبھی گھر میں کام آئیں گے،" اُس نے کہا۔

باب 11

اعجاز اپنے دفتر سے ملحقہ فوٹو گرافر کی دکان میں اُس کا ٹیلیفون استعمال کرنے کی غرض سے بیٹھا تھا۔

"ہیلو---- ہیلو---- میں میٹل ورکرز یونین کے سیکرٹری آفس سے بول رہا ہوں۔ چوہدری صاحب ہیں؟---- بھئی چوہدری انتصار صاحب ہیں؟ میں اسسٹنٹ سیکرٹری منظور بول رہا ہوں، سیکرٹری صاحب بات کریں گے---- بھائی صاحب، چوہدری اِنتصار صاحب موجود ہیں یا نہیں؟---- اُن کو فون دیں، ملک اعجاز صاحب بات کریں گے۔"

"ہیلو----" اعجاز نے فون ہاتھ میں لے کر دوستانہ لہجے میں کہا۔ "چوہدری صاحب، جناب آپ کہاں غائب رہتے ہیں۔ چار گھنٹے سے دنیا آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ جی؟---- ہاں ہاں بھئی، ہم بھی تو جلسے کے بندوبست میں لگے ہوئے ہیں۔ میرا آدمی آپ کا انتظار کر کر کے ایک گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ آپ نے کہا تھا کہ لسٹ بنا کر ہمیں بھیجیں گے کہ آپ کی کیا ریکوائیرمنٹ ہے، ہمیں کچھ وقت چاہیے، ہاتھ پر سرسوں تو نہیں اُگائی جا سکتی، ہمارے انتظامات سمجھئے کہ مکمل ہیں---- چوہدری صاحب ہمارے پاس اِس وقت کوئی بندہ فالتو نہیں ہے، صبح کے وقت تھا، مگر---- ہاں بھیج دیں، ٹھیک ہے---- دُرست ہے---- مگر ٹھیک ٹھیک اِنفرمیشن بھیجیں، یہ نہ ہو کہ----" جیسے جیسے اعجاز بات کرتا جاتا تھا اُس کے لہجے میں غیر محسوس طور پہ خُود اختیاری پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ "جی؟---- ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ----" اُس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر دکان میں شور کرتے ہوئے چند لوگوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو آخری وقت پہ دغا ہو جائے---- ہاہاہا---- نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ دغا ہماری طرف سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی اگر آپ، جی؟---- اگر آپ تین گھنٹے کے نوٹس پر چار دیگوں، دس ریٹروں اور پانچ سو جھنڈوں اور بینروں کا مطالبہ کریں گے تو ہم کہاں سے پیدا کر کے دیں گے؟ اِسی طرح ہماری کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بندے جلسے پر بھیجیں۔

اگر وقت پر ہمیں آپ کی طرف سے عندیہ نہیں ملتا کہ آپ کتنے آدمی دے رہے ہیں تو ہمیں کیسے اطمینان ہوگا؟ جی؟---- آپ کی آواز نہیں آ رہی، ذرا منٹ ریسیور کے اُوپر رکھ کر بولیں، ہیلو؟ ہاں اب ٹھیک ہے، میں کہہ رہا تھا کہ اِس جلسے کو کامیاب کرانا ہمارا فرض ہے۔ یہ جلسہ بنے یا بگڑے والا معاملہ ہے، سمجھ گئے نا؟ کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے---- ٹھیک، تو طے ہو گیا کہ کل صبح تک ساری انفرمیشن کا تبادلہ ہو جائے۔ آپ کو علم ہے کہ اپوزیشن کتنی ہے۔ جی؟---- ہاں ہاں، عوام تو ہمارے ساتھ ہیں، سڑکوں پر بھی نکل آئے ہیں، مگر یہ نہ بھولیں کہ ملک پر جن کا راج ہے بندوق ابھی تک اُن کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ پچھلے دنوں کیا ہُوا----- ہاں ہاں، میں سمجھتا ہوں، مگر ابھی ہمیں اِن باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے، جو کام ہمارے ذِمے ہے وہ کریں، جو آج کا کام ہے وہ آج اور جو کل کا ہے وہ کل کریں۔ باقی جو بڑی سیاست ہے وہ بڑے لیڈروں پر چھوڑ دیں، وہ اُوپر بیٹھے ہیں، اُنھیں پتا ہے کہ کیا کرنا ہے، اور سب سے اُوپر خُدا ہے، سارے کا سارا کام اُسی پر منحصر ہے۔ بس ہم اپنا فرض پورا کر لیں تو سمجھ لیجیے کہ ایک اینٹ رکھی گئی، اِسی طرح ایک ایک اینٹ سے مسجد تیار ہو جائے گی۔ فکر نہ کریں۔ جی؟---- بھئی وہ میں نے بہت کوشش کی ہے---- کیا کہا؟---- جی میں نے شہر کے ایک ایک کالج میں پتا کیا ہے۔ دراصل آپ نے بہت دیر کر دی۔ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اِس وقت حالت یہ ہے کہ اویلیبل سیٹوں سے کہیں زیادہ داخلے ہو چکے ہیں، کوئی کسی جرنیل کا آ گیا تو کوئی کرنیل کا، کوئی افسر اور کوئی کسی نام نہاد وزیر کا۔ اب تو سچوایشن یہ ہے کہ، کیا کہتے ہیں، میز کے نیچے گھس کر ہاتھ ماریں تو بھی داخلے کا رستہ نہیں ملتا۔ کالجوں کے دفتروں سے لے کر پرنسپلوں تک رو رہے ہیں۔ اپنی نوکریاں بچانے کی فکر میں ہیں۔ کوئی بات نہیں، اپنی حکومت آنے دیں، سب کام ٹھیک ہو جائیں گے---- جی؟ کیا کہا، ہینڈی کیپ؟---- مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں----"

اعجاز کا اسسٹنٹ منظور ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "چوہدری صاحب،" اعجاز نے فون میں کہا، "ایک منٹ ذرا ہولڈ کریں۔" اُس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر منظور سے پوچھا، "کیا بات ہے؟"

"میں آپ کو بتانا بھول گیا،" منظور بولا، "ایک اور رستہ ہے، اگر کامیاب ہو جائے

تو۔"

"کیا ہے؟"

"ہینڈی کیپ لوگوں کے لیے سیٹیں الگ مخصوص ہیں۔"

"یہ لڑکا ہینڈی کیپ ہے؟"

"ہے تو نہیں۔"

"پھر؟" اعجاز نے پوچھا۔

"میرے خیال میں کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"آخر کیسے؟ صاف صاف بولو، وقت ضائع کر رہے ہو۔ چوہدری اِنتصار نے ہولڈ کیا ہُوا ہے۔"

"لڑکے کو ہینڈی کیپ بنا کر پیش کر دیا جائے۔"

"کیسے بناؤ گے؟"

"آپ چوہدری اِنتصار سے دور چار منٹ کی مہلت لے لیں، میں ایکسپلین کرتا ہوں۔"

اعجاز لاعلمی سے آنکھیں پھاڑے منظور کو دیکھتا رہا۔ پھر جلدی سے ریسیور لگا کر کے بولا "چوہدری صاحب، مَیں چند منٹ میں آپ کو فون کرتا ہُوں۔ ضروری کام آ گیا ہے۔ جی؟ ابھی کرتا ہُوں۔" اُس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ "یہ کیا چکر چلایا ہُوا ہے منظور۔ کیا سٹوری ہے؟"

"ملک جی چوہدری اِنتصار نے ہمیں کبھی کوئی کام نہیں کہا۔ میں نے سوچا اُس کا بھتیجا ہے، کوئی نہ کوئی شکل نکالنی چاہیے۔ اِدھر اُدھر سے پتا کیا تو ہینڈی کیپ والا اینگل ملا۔"

"چوہدری اِنتصار کو تو نے بتایا ہے؟" اعجاز نے پوچھا۔

"کل شام کو اُن کا پیغام آیا تھا۔ میں نے تجویز کیا اِس اینگل پر کام کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کامیابی ہو جائے۔ آج سویرے کا آ کر بیٹھا ہے۔ میں اُس کو ٹریننگ دے رہا ہوں۔"

"ٹریننگ؟ کِس چیز کی ٹریننگ؟"

"ابھی آپ کو دِکھاتا ہوں،" منظور نے مسکرا کر کہا۔ اُس نے آواز دی، "رحمو، لڑکے رشید کو اندر بھیج۔"

ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا معمولی سے سفید کپڑے پہنے ہُوئے اندر داخل ہوا۔

"چل او شیدے،" منظور نے اُس سے کہا "ذرا ملک صاحب کو اپنا لنگ دکھا۔"

لڑکا جو سیدھی سی چال سے چلتا ہُوا اندر آیا تھا مڑا اور لنگڑا کر چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ "لڑکا ذہین ہے ملک جی، دو گھنٹے میں سیکھ گیا ہے۔"

"سیکھ کہاں گیا ہے،" اعجاز بولا "میں بھی دیکھ سکتا ہوں کہ جعلی ہے۔"

"ذرا شرما رہا ہے، اور کوئی بات نہیں،" منظور نے کہا۔ پھر وہ لڑکے پر چیخا۔ "اوئے، گانڈ ہلا کے چل نامراد، تیرا لنگ پیر سے لے کر چتڑ تک جانا چاہیے۔ گانڈ بلا جیسے باہر ہلا رہا تھا۔"

لڑکا اپنی ٹانگ کو مزید جھوک دے کر، چوتڑ مروڑ مروڑ کر چلنے لگا۔

"ایسے اے اے ----" منظور بولا "دُرست ہو رہا ہے، بس تھوڑی کسر رہ گئی ہے۔ اور کوشش کر، اور ---- اور ----"

اب لڑکے نے ایسی چال چلی کہ کمر سے لے کر کندھوں اور سر تک اُس کا سارا بدن تھرتھرانے اور دائیں بائیں ڈولنے لگا۔ یہ منظر ایسا خوفناک تھا کہ اعجاز کچھ دیر تک ہکا بکا دیکھتا رہا، پھر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"اِدھر آ اوئے،" منظور نے لڑکے کو پاس بلایا۔ "بوٹ اُتار کے دِکھا۔"

لڑکے کا لنگڑے پیر والا جوتا اعجاز کو دکھاتے ہُوئے منظور بولا "یہ دیکھیں، موچی سے درست کروایا ہے۔"

موچی نے "درستگی" یوں کی تھی کہ ہتھوڑے مار مار کر بائیں جانب سے جوتے کو پیس کے رکھ دیا تھا جس سے اُس طرف کے ٹانکے کھل چکے تھے۔

"اِس جگہ پر،" منظور نے انگلی رکھ کر بتایا، "سارے بدن کا بوجھ پڑتا ہے۔ جب یہ شلوار کا پائنچہ اٹھا کے دِکھائے گا تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ معذوری کی وجہ سے بوٹ کی شکل بگڑ گئی ہے۔ یعنی کہ میری سکیم کے اندر،" وہ فخر سے بولا، "معذوری اور یہ بوٹ لازم و ملزوم ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،" اعجاز بے صبری سے ہاتھ ہلا کر بولا" "مگر لڑکا ساری عمر تو یہ تماشا جاری نہیں رکھ سکتا۔ ایک نہ ایک دن پتا چل ہی جائے گا۔"

"ملک جی آپ بھی کبھی کبھی بھولے بادشاہوں والی بات کرتے ہیں،" منظور نے کہا، "ایک دفعہ داخلہ ہو گیا تو ہو گیا، پھر کون پوچھتا ہے۔" اُس نے لڑکے کو ٹوٹا ہُوا بوٹ پکڑایا۔ "پہن لے، اَور باہر جا کے بیٹھ۔"

"میں رقعہ لکھ دیتا ہوں،" اعجاز نے کہا، "کل صبح اِسے ریلوے روڈ والے کالج میں چوہدری غلام رسول کے پاس لے جانا۔ وہاں سے فارغ ہو کر چوہدری اِنتصار کے پاس چلے جانا اَور سارے کوائف نوٹ کر کے لے آنا۔"

"بس ٹھیک ہے جی۔ میرا دِل کہتا ہے لڑکے کا داخلہ ہو جائے گا۔ چوہدری اِنتصار کا کام ہو گیا تو ہماری واہ واہ ہو جائے گی۔ آٹھ نو سو کی رائیں برادری چوہدری اِنتصار کی مٹھی میں ہے۔" پھر وہ راز دارانہ انداز میں مُنہ آگے کر کے نیچی آواز میں بولا، "بڑی بڑی کراکے دار لڑکی ہے اُس برادری میں۔ ایسا میلہ لگے کہ شہر میں دھوم مچ جائے گی۔ اَور اِس شہر میں جلسہ کامیاب ہو گیا تو سمجھ لیں کہ سارے ملک میں ہو گیا۔"

اعجاز، منظور اَور اُن کے دو اَور آدمی فوٹو گرافر کی دُکان سے اُٹھ کر اپنے دفتر میں جا بیٹھے۔ دفتر کے برآمدے میں لڑکا بیٹھا تھا۔

"شیدے،" منظور نے اندر جاتے ہُوئے اُس سے کہا، "چل اُس گراونڈ میں جا کر مشق کر۔ گھر جانے سے پہلے تیرا ایک اَور ٹیسٹ ہو گا۔"

دفتر کے اندر زمین پر دری بچھی تھی جس پہ سات آٹھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا بنچ پڑا تھا، جس پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی سی، درازوں والی میز اَور دو کرسیاں تھیں۔ اعجاز اَور منظور جا کر کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ بنچ پر سے ایک آدمی اٹھا اور منظور کی کرسی سے لگ کر زمین پر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے منظور کے کندھے کو چھو کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا اور اُس کے کان مین کوئی بات کی۔

"اچھا اچھا" منظور نے سر ہلا کر ہولے سے جواب دیا۔ "کرتا ہوں۔ صبر کر۔"

اعجاز کی کرسی کو چار آدمی گھیرے کھڑے تھے۔ دو اپنے مسئلے بیان کر رہے تھے، اَور دو کو اعجاز جلسے کے انتظام کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔ چاروں ایک ساتھ

بول رہے تھے۔ اعجاز ایک کے ساتھ بات کرتا تو دُوسرا بیچ میں بول پڑتا۔ جب بات آگے بڑھتی دکھائی نہ دی تو اعجاز نے غصے میں آکر اونچی آواز سے سب کو چپ کرایا۔

"ایک ایک کرکے بولو، ایک ایک کرکے۔ قطار بناؤ۔ چلو۔ تُم دو آگے،" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا، "تم دو پیچھے۔ چلو چلو۔ تُم نے سُنا نہیں۔ قطار بناؤ۔ اَور ایک ایک کرکے بات کرو۔۔۔۔"

بیس پچیس منٹ میں اعجاز نے اُنہیں فارغ کردیا۔ "چلو اب جاؤ۔ تُم کو جو بتایا گیا ہے اُس پر عمل کرو۔ چلو اب جاؤ۔ جاؤ جاؤ۔ میرا سارا دِن تُمہارے لِئے وقف نہیں ہے۔ کِسی اَور کا کام بھی ہونے دو۔ یہ دیکھو،" اُس نے دری پر بیٹھے ہُوئے لوگوں کی جانب اشارہ کیا، "یہ صبح سے بیٹھے ہُوئے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے سیر کرنے آئے ہیں؟ اِن کے بھی ضروری کام ہیں۔ چلو نکلو یہاں سے، کِسی اَور کی باری بھی آنے دو۔۔۔۔"

اُن چاروں کے جاتے ہی دو تین آدمی دری سے اُٹھ کر آگے بڑھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اعجاز تک پہنچ پاتے، منظور نے اپنی کرسی آگے کھسکائی۔

"ملک جی،" وہ اعجاز کی جانب جھک کر بولا، "اِس غریب کا کام اٹکا ہُوا ہے۔"

"کیا ہے؟" اعجاز نے تھکے ہُوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

"پیر کے دِن میں نے آپ سے بات کی تھی۔"

"پیر کے دِن! پیر کو کتنے دِن گزر گئے ہیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ اِن پانچ دنوں میں کتنے معاملے ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی یاد رہتے ہیں؟ تُم بھی عجیب آدمی ہو۔ قصہ بتاؤ کیا ہے؟"

"وہ صابر اینڈ سنز والا معاملہ ہے۔"

"تفصیل کیا ہے۔"

"اِس غریب پر چوری کا الزام لگا کر نکال دیا ہے۔ ایک پیسہ نہیں دیا۔ پندرہ دِن کی تنخواہ، ایک مہینے کا بونس، سب کچھ دینے سے اِنکاری ہیں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟" اعجاز نے کڑی نظروں سے مزدور کو دیکھتے ہُوئے پوچھا۔

"جی محمد رمضان،" وہ اُٹھ کر مستعدی سے میز کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"تو کِس الزام پر نِکلا ہے؟"

"جی کام کرتے کرتے دو تین واشلیں غلطی سے جیب میں رہ گئی تھی۔ غلطی سے ذہن سے اُتر گئیں۔ گیٹ پر تلاشی ہوئی تو چوری کا الزام لگا دیا۔"

"غلطی سے جیب میں رہ گئیں اور غلطی سے ذہن سے اُتر گئیں، ہیں؟"

"جی بالکل۔ دو روپے کی چیز تھی جس کے بدلے میں میرا روزگار مار دیا۔"

"دو روپے کی چیز تھی، ہیں؟" اعجاز نے کہا۔ "اور وہ چار سیر پٹل کا کیا قصہ ہے؟"

"جی کس کا؟"

"تجھے پتا ہے کہ میں نے صابر اینڈ سنز کے مینجر سے بات کی تھی؟"

"جی نہیں،" رمضان گھبرا کر بولا۔

"تیرے تھیلے سے چار سیر پٹل نکلا تھا، وہ کہاں سے آیا؟ تھیلا تیرے سائیکل سے بندھا ہوا تھا۔"

"ملک جی، میرے سیکل کا تو کیریئل ہی نہیں ہے۔ باہر کھڑا ہے، آ کر دیکھ لو۔"

"اوئے کیریئل کی بات کون کر رہا ہے، ہنڈل سے بندھا ہو گا یا تو نے چنٹروں میں پھنسایا ہو گا۔ تھیلا تو تیرا تھا نا؟"

"نہیں جی، یہ ہی تو ساری بات ہے۔ اُس ماں کے خصم مہاجے نے مجھے گیٹ پر تھیلا پکڑایا تھا، پھر وہ مکر گیا۔ انتظامیہ کی یونین کا آدمی ہے، رلا ملا ہوا ہے۔ ساری کارستانی مینجر کی ہے۔ میرے اُوپر دباؤ ڈال رہا ہے۔"

"کس بات کا دباؤ؟ تیرے سے رِشتہ مانگتا ہے؟"

"کہتا ہے اپنی یونین کا کام چھوڑ دو، ہماری یونین میں شامل ہو جاؤ۔"

"بکواس مت کر،" اعجاز سختی سے بولا، "جو بدمعاشی کرتے ہو یونین کے سر ڈال دیتے ہو۔"

"میرے اُوپر ترس کرو ملک جی۔ آپ مائی باپ ہیں۔ میری تو روٹی بھی بند ہو گئی ہے۔"

"وہ کہتے ہیں قرآن کی قسم دے کہ تھیلا اِس کا نہیں تھا،" منظور بولا۔

"تو قسم دے دے،" اعجاز نے کہا۔

"جی خدا کا خوف مجھے مار رہا ہے،" رمضان نے کہا، "میری چھوٹی چھوٹی چھ بچیاں

ہیں۔ قرآن کی قسم کیسے دوں۔"

"ایک طریقہ ہے ملک جی،" منظور نے منت کرتے ہو کہا۔ "خدا ترسی کریں، میں اِسے جانتا ہوں۔ اِس کے گھر میں چولھا بھی سرد ہو گیا ہے۔"

"کیا طریقہ ہے؟"

"کوئی کتاب لپیٹ کے لے جائیں۔ اُس پہ قسم دے دے گا۔"

"کونسی کتاب؟" اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی بھی کتاب ہو۔ آپ لے کر ساتھ چلے جائیں تو کس کی جُرأت ہے آپ کی بات پر اعتبار نہ کرے۔ نہ کھول کے دیکھیں گے، نہ پتا چلے گا۔"

اعجاز چہرے پہ سخت حیرتناک تاثر لیے اُنہیں دیکھتا رہا۔ رمضان نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ دروازے تک جاتا، زور شور سے ناک سِنکتا اور دیوار پہ ہاتھ صاف کر کے آنسو پونچھتا ہُوا واپس آتا۔

منظور نے ہاتھ بڑھا کر میز کا ایک دراز اَور اُس میں سے ایک درمیانے سائز کی کتاب نکالی جو سرخ کپڑے میں لپٹی ہُوئی تھی۔

"یہ تو مجموعہ بھی نہیں دکھائی دیتا، بیوقوف،" اعجاز تلملا کر بولا۔ "کوئی بڑی کتاب لے کر آ۔ اَور کیا کسی شادی میں لے کر جا رہے ہو جو سُرخ ریشمی کپڑے میں لپیٹی ہُوئی ہے؟ کوئی پاک قسم کا سبز غلاف لے کر آ۔"

تھوڑی ہی دیر میں منظور نے بھاگ دوڑ کر کے ایک موٹی سی بڑے سائز کی کتاب بر آمد کی۔ اعجاز نے کھول کر دیکھی تو اُردو انگریزی کی ڈکشنری نکلی۔ "اَور یہ غلاف،" منظور نے نیلے مخمل کا بڑا سا رومال پیش کیا، جو میز پوش دکھائی دیتا تھا۔

"تجھے ہرے رنگ کا کہا تھا،" اعجاز نے کہا۔

"وہ دستیاب نہیں ہوا۔ نیلا بھی چڑھایا جاتا ہے،" منظور تسلی سے بولا۔ "پاک رنگ ہے،" اُس نے نہایت تعظیم کے ساتھ ڈکشنری لپیٹ کر دراز میں رکھ دی۔

"ایک شرط پر میں جاؤں گا،" اعجاز اپنے آپ پہ قابو پا کر بولا، "کہ قرآن کا لفظ ساری گفتگو میں نہ آئے۔"

"اِس کی آپ فکر نہ کریں۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔ اِس ہی مِل کا گناہ اپنے سر لوں؟"

"میں آپ کو شورٹی دیتا ہوں کہ سارا کام بچاواں ہو گا۔"

"کیسے ہو گا؟ ذرا سمجھاؤ۔"

"فقط قسم کا لفظ بیچ میں آئے گا۔ میں کتاب اُٹھا کر آپ کے اور رمضان کے ساتھ جاؤں گا اور اُن سے کہوں گا آپ لوگوں نے قسم کی شرط لگائی ہے۔ ملک صاحب چل کر یہاں آئے ہیں تاکہ اپنے سامنے شرط پوری کروائیں۔ یہ لیجئے۔ میں کتاب آپ کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔ آپ تعظیم سے اِسے چوم کر میز پر رکھ دیں۔ رمضان اِس کے اُوپر ہاتھ رکھ کر کہے گا میں خُدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تھیلا میرا نہیں۔۔۔"

"مہاجے کتی کے بچے کا تھا" رمضان بیچ میں بول پڑا۔

"اوئے چپ کر،" منظور نے سختی سے اُسے جھڑکا اور اپنی بات جاری رکھی، "کہ تھیلا مہاجے کتی کے۔۔۔ او خُدا خوار کرے تجھ کو،" منظور نے ماتھا پیٹ لیا، "میرے ذہن سے بات ہی اُتار دی، دفعہ ہو جا دور ہو جا میری نظروں سے بنچ پر جا کر بیٹھ، مُنہ بند کر، تیرے ہونٹ سی دوں گا بند کر، زور سے بند کر، اور زور سے۔" جب رمضان نے بنچ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر بند کر لئے تو منظور نے اِبتداء سے شروع کیا۔ "آپ تعظیم سے اسے چوم کر میز پر رکھ دیں۔ رمضان اِس پر ہاتھ رکھ کر کہے گا میں خُدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تھیلا میرا نہیں تھا میں چوری کا قصور وار نہیں ہوں۔ بس۔ قصہ ختم۔ مجال کیا کہ آپ کی موجودگی میں کوئی کسی قسم کا اعتراض کرے۔"

اعجاز چند لمحوں تک حیرت اور بے بسی سے منظور کو دیکھتا رہا پھر کوئی لفظ کہے بغیر دھیان ہٹا کر تین دُوسرے آدمیوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو کھڑے انتظار کر رہے تھے۔

"چل او رمضو، باہر بیٹھ،" منظور نے کہا "ابھی فارغ ہو کر چلتے ہیں۔ اور اب شوں شوں بند کر۔ چل نِکل۔"

رات ہو چکی تھی جب اعجاز گھر پہنچا۔ سکینہ ابھی تک اُس کے اِنتظار میں پیڑھی پہ بیٹھی، دیوار سے کمر ٹیکے اُونگھ رہی تھی۔ اعجاز کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی سکینہ کو یوں لگا جیسے اپنا غصہ اُس نے اِسی لمحے کے لئے سنبھال کر رکھا ہو۔

"تھک ٹوٹ کے آتے ہو۔ پھر کاغذ بھی ساتھ اُٹھا لاتے ہو۔ نہ گھر کا خیال نہ باہر

گا۔"

"میں سو دفعہ کہہ چکا ہوں کھانا کھا کر سو جایا کر،" اعجاز نے کہا، "میرے انتظار میں بیٹھی نہ رہا کر۔"

"پھر گھر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُدھر ہی سو جایا کرو۔"

"تُو تو بیوقوف عورت ہے۔ بتایا بھی ہے کہ الیکشن آ رہے ہیں۔ جلسوں کا انتظام کرنا ہے، وقت لگ جاتا ہے۔ یہ موقع گزر گیا تو زندگی پھر اپنے ڈھرے پہ آ جائے گی، تُو تو سمجھتی ہی نہیں۔ لڑکے سو گئے ہیں؟"

"ہاں۔ کھانا پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"تو کیا حرج ہے۔ دوپہر کو تُو دفتر میں تو نہیں بیٹھی ہوتی، میں وہاں پر ہی کھاتا ہوں، جو بھی مل جاتا ہے کھا لیتا ہوں۔ ٹھنڈے کھانے سے، کم کھانے سے، تھوڑا بہت فاقہ کرنے سے آدمی نہیں مرتا۔ ڈیرے والے کھانا لے گئے ہیں؟"

"ہاں،" سکینہ نے کہا۔ "آج بھی مال اُٹھانے کوئی نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"مجھے کیا خبر؟ گل افروز کہہ رہا تھا منڈی میں مال پڑا ہے، بولی نہیں لگ رہی۔"

اعجاز اُس کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

سکینہ پھر بولی، "دو تین مہینے ہو گئے ہیں، کاروبار نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔"

"اَور لوگ جو اِس کام میں داخل ہو گئے ہیں" اعجاز روٹی چباتے ہوئے بولا۔

"منڈی کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کبھی اُوپر، کبھی نیچے۔"

"تمھیں فرصت ملے تو اِس طرف دھیان دو۔ لڑکے جوان ہو رہے ہیں، اُن کی تجھے کوئی خبر نہیں۔ پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ فیل ہو گئے تو پھر تمھاری آنکھ کھلے گی۔"

"فیل نہیں ہوتے۔ تُو خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔ ہماری حکومت آنے والی ہے، سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"اللہ ...! حکومت کے آنے سے لڑکے کیا پاس ہو جائیں گے؟ حکومت کیا کرتی ہے۔ ہم نے تو کبھی حکومت کی شکل نہیں دیکھی۔ وہی پٹواری، ضلعدار، تھانیدار۔ ملک

جھنگیر پہلے بھی کھاتا تھا، اب بھی کھاتا پیتا ہے۔"

"سب کام دُرست ہو جائیں گے،" اعجاز نے کھانا ختم کر کے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"آج پھر کاغذ لے کر آدھی رات تک بیٹھے رہو گے؟" سکینہ نے کہا۔ "منہ پہ دانت اور آنکھیں نِکل آئی ہیں، کبھی اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"دیکھتا ہوں،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "روز دیکھتا ہُوں۔ جا کر سو جا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر کی بات ہے۔ یہ مُلک،----" وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔ اُس کا رخ صحن میں بنے ہُوئے کمرے کی جانب تھا۔ کمرے میں میز پہ ایک پتلی سی لمبی چمنی والا لیمپ رکھا تھا جسے جلا کر اعجاز رات کے کھانے کے بعد دِن بھر کے بقایا کاغذات دیکھتا، اگلے روز کے لِئے یاداشتوں کے نوٹ لکھتا، یا اپنی تقریریں تیار کرتا تھا۔ "ہمارا یہ ملک،" وہ جاتے جاتے بولا، "جو ہاتھ سے نِکل گیا تھا، اب واپس ہمارے قبضے میں آنے والا ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے----"

آخری الفاظ اعجاز نے اس طرح ادا کیے جیسے اپنے آپ سے، یا باہر سوئی جاگتی ہُوئی ساری غیر حاضر دُنیا سے مخاطب ہو۔ سکینہ اُس کی اِس تھکی ہُوئی پُراُمید آواز سے خُوب واقف تھی جِس میں اُس کے جذبے، اُس کے جنون اور سب سے اُوپر اُس کے اکلوتے پن کی صدا تھی۔ جب وہ باورچی خانے سے نِکل گیا تو سکینہ کتنی ہی دیر تک خالی دروازے پہ آنکھیں جمائے بیٹھی رہی، جیسے اعجاز کے چھوڑے ہُوئے خلاء کی شکل کو نظروں سے ٹٹول رہی ہو۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا، کہ کتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے جو اعجاز اُس کے ساتھ چمٹ کر نہیں سویا۔ اُسے محسُوس ہوا کہ ایک پُوری زندگی گُزر چکی ہے، کہ جیسے ایک موت واقع ہُوئی ہو اور ایک نئی شکل میں، نئی تار و پود کے ساتھ، ایک نئی عمر شروع ہُوئی ہو۔ سکینہ کے چہرے پہ اُس گزُری ہُوئی عمر کا تاسف پھیلا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے ایک لمبی سانس لی اور برتن سمیٹنے شرُوع کر دیئے۔

صحن والے کمرے میں اعجاز لیمپ جلا کر کرسی پہ بیٹھا، سامنے کھُلی ہُوئی فائل پہ ذہن جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آج اُس کے دماغ میں اِتنی بہت ساری باتیں اکٹھی ہو گئی تھیں کہ کسی ایک بات پہ دھیان نہ بیٹھتا تھا۔ آخر اُس نے فائل کو ٹھپ سے بند کر دیا، اور سَر ہاتھوں پہ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ "منڈی میں مال پڑا ہے۔ بولی نہیں لگ رہی۔" سکینہ

کی یہ بات اُس کے ذہن میں مسلسل چکّر کاٹ رہی تھی۔
گڑ کا کاروبار تین چار برس سے ایسے عروج پہ جا رہا تھا کہ کامیابی کے احساس نے اُس کے دِل میں ہیشگی کا گمان پیدا کر دیا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اب یہ کاروبار اتنی رفتار اختیار کر چکا تھا کہ خُود بخود چلتا جائے گا۔ مگر کچھ عرصے سے گل افروز کے علاوہ دُوسرے لوگوں کے ذریعے خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ کئی اَور پارٹیوں نے میوے والا گڑ بنانا شروع کر دیا ہے۔ پہلے پہل اعجاز نے اِس پہ کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ ایک بار اُس نے خُود منڈی کا چکّر لگایا۔ وہاں پہ آڑھتیوں نے اَپنے انداز میں اُس کی تسلّی کرا دی تھی۔
"ہمارا تو کام بھی بکتا اَور نام بھی بکتا ہے،" اعجاز نے واپس آکر کہا تھا۔ "نقّال ذرا پیر تو جما کر دیکھیں۔" مگر ایک روز، جب ڈیرے کے دونوں کمرے گڑ کی بوریوں سے بھر گئے اَور نکاس کی کمی کی وجہ سے بیلنا بند کرنا پڑا تو اعجاز گویا یکبارگی ہوش میں آگیا۔ اُس نے فوراً جا کر منڈی کی خبر لی۔ وہاں گڑ کی بوریوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک وقت تھا کہ منڈی کے اندر صرف وہ بوریاں دکھائی دیتی تھیں جن پر سبز رنگ کا "اعوان برادرز، شجاع آباد" کا ٹھپہ لگا ہوتا تھا۔ اب متعدد مختلف ٹھپوں والی بوریوں کی قطاریں تھیں۔
"ملک صاب،" آڑھتی نے کہا، "آپ کا مال اب بھی ایک نمبر ہے۔"
"پھر نکاس کیوں نہیں ہو رہا؟" اعجاز نے پُوچھا۔
"اللہ کی اللہ ہی جانے۔ منڈی کا مزاج ہے۔ اِس کا نہ کسی پیر فقیر کو علم ہے نہ کسی نجومی کو۔"
"دوسرے شہروں کو لدان کرو۔"
"وہاں بھی یہی حال ہے۔"
"سچ سچ بتا، کوئی بدمعاشی تو نہیں ہو رہی؟"
"ملک صاب، یہ کیسی بات کرتے ہیں۔ آپ سے ہمارا کوئی آج کا لین دین ہے؟ کوئی اُونچ نیچ ہو تو سب سے پہلے آپ کو خبر کریں گے۔ آخر ہماری روٹی بھی تو ییں سے چلتی ہے۔ یہ دیکھیں،" آڑھتی نے دکان کے اندر اشارہ کیا، "چھت تک بھری ہوئی ہے۔ آج سات دن ہو گئے ہیں، ایک بوری نہیں اُٹھی۔"
"پھر وجہ کیا ہے؟"

"اللہ کی اللہ ہی جانے۔ شاید لوگوں کے مُنہ کا مزا بدل گیا ہے، یا کوئی اور بات ہے۔ ان باتوں کا علم ہو تو ہم کروڑپتی نہ ہو جائیں؟ فکر نہ کریں ملک صاب، کوئی موسم ایک جیسا نہیں رہتا۔ یہ دِن بھی بدل جائیں گے۔"

اعجاز وہاں سے سیدھا بنک گیا۔ وہاں سے اپنے حساب کا تخمینہ لیا تو پتا چلا کہ زمینیں خریدنے کے بعد، اور سرفراز کی مرضی کے مطابق مکان تیار کرانے کے بعد بھی اتنے پیسے موجود تھے کہ سال کی روٹی بآسانی چل سکتی تھی۔ اعجاز کو صرف ایک ہی فکر تھی، کہ فصل کھڑی کی کھڑی تھی اور بیلنا بند تھا۔ ابھی اُس کے دماغ میں کوئی نئی تجویز نہ آ رہی تھی۔ اِس دوران میں وہ صرف یونین کی سیاست کے کام میں مصروف تھا۔

اعجاز نے نئی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اِس پارٹی نے غریبوں، مزدوروں اور ناداروں کی طرفداری کا نعرہ لگا کر اُن کے ضمیر کو بیدار کیا اور دس برس سے براجمان سابق فوجی صدر کے خلاف تحریک چلا کر اُسے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے عنانِ حکومت ایک فوجی جرنیل کے حوالے کر دیا تھا جو آزاد الیکشن کرانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اعجاز کا اعتقاد کہ ٹریڈ یونین مومنٹ، جس کا بنیادی ڈھانچہ موجود تھا اور جو کسی حد تک منظم تھی، اِس نئی تحریک کی سرخیل ہو سکتی تھی۔ اپنی یونین کے علاوہ اُس نے کسانوں، بھٹہ مزدوروں اور کئی دُوسری تنظیموں سے اپنے سابقہ روابط استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اُس کے تخلیقی ذہن اور فعال کارکردگی کے باعث ٹریڈ یونین تحریک کے اندر اُس کا نام مشہور ہوتا جا رہا تھا اور اپنے علاقے کے آس پاس کی مختلف جگہوں سے اُسے جلسوں میں بولنے کی دعوتیں موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کی تقریروں اور دُوسرے کاموں کی رپورٹیں پارٹی کی اعلیٰ قیادت تک پہنچ رہی تھیں، اور عین ممکن تھا کہ کسی وقت بھی اُسے پارٹی لیڈرشپ کی جانب سے ملاقات کا بلاوا آ جائے۔ وہ پارٹی کے بانی لیڈر کا دیوانگی کی حد تک شیدائی تھا۔ اعجاز اپنے کاروبار کے مندے سے، جسے وہ "عارضی رکاوٹ" کا نام دیتا تھا، ذہنی طور پر "چھپ" کر اپنی ساری اُمیدیں اِس دُوسرے کام پر لگائے ہُوئے تھے۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ پارٹی، جو دیکھتے ہی دیکھتے سارے مُلک میں پھیل گئی تھی، الیکشن جیت کر حکومت میں آ جائے گی، اور پھر اُس کے "سارے کام ٹھیک" ہو جائیں گے۔ کس طرح سے اور کس صورت میں ہوں گے، اِس بات کا اُس

کے پاس کوئی واضح تصور نہ تھا، اور اپنی چشم پوشی کی حالیہ کیفیت میں وہ اِس مسئلے پر زیادہ سوچنا بھی نہ چاہتا تھا۔ پہلے پہل جب یونین کے سلسلے میں اُسے کچھ اختیاری پوزیشن حاصل ہُوئی تو اُس کو علم ہوا کہ اکثراوقات اُسے بے ضابطہ کام، بلکہ کئی ایسے کام جو اخلاق کی حد سے بھی باہر تھے، کرنا پڑتے تھے، اور یہ باتیں اُس کے ضمیر کو ستاتی رہتی تھیں۔ مگر جیسے جیسے وقت گزُرتا گیا اُس کے ذہن کی اُلجھنیں دبتی گئیں۔ اُسے پتا چلا کہ ہر اختیاری رتبے کے ساتھ اُس کے ضروری عوامل بھی شامل ہوتے ہیں جن سے مُنہ موڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِختیار، رتبے، اور خاص طور پہ اِقتدار کی چاہت نے اُس کی رُوح کو ذرا سا داغدار کر دیا تھا، جس کا اُسے فہم بھی تھا مگر جس کی تاویل وہ اپنے آپ سے یوں بیان کرتا تھا کہ یہ وہ قیمت تھی جو بنیادی اصولوں کی خاطر ہر ایک کو کبھی نہ کبھی ادا کرنی پڑتی تھی۔

آخر اسی طرح غل مچاتے ہُوئے خیالات کی یلغار کے بیچ "خالی الذہن" حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے پھونک سے لیمپ بجھا دیا اور کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ چاروں جانب اندھیرا پھیلا تھا۔

"ہماری حکومت،" اعجاز نے دو روز قبل ہی سالار والا کے جلسے میں اپنی تقریر کے اندر کہا تھا، "ہماری حکومت----" اُس نے تقریر میں اثر پیدا کرنے کے چند گر سیکھ لئے تھے، جن میں خاص خاص الفاظ یا جملوں کو دُہرا ٹھہرا کر بولنا شامل تھا۔ "ہماری حکومت،" اُس نے زور دے کر کہا تھا، "ہر گاؤں میں بجلی مہیا کرے گی۔" سب سے پہلے، اُس نے زیرِلب مسکرا کر سوچا، اِس گاؤں میں آئے گی، اور گلیاں پکی ہوں گی۔ اپنے دل پہ دُنیاداری کی میل آنے کے باوجود، وہ خُود اپنی لکھی اور جوش میں ادا کی ہوئی تقریر پہ بے کم و کاست یقین کر لیتا تھا۔ یہ اُس کی معصومیت تھی، یا کہ کامیاب خطابت کے ردِعمل میں لوگوں کی تالیوں کی کشش تھی جس میں وہ مقید تھا، اِن باتوں کا ابھی اُسے فہم نہ تھا۔ وہ تاریک صحن میں کھڑا ابھی سے ذہن کی آنکھ میں اپنا گھر برقی قمقموں سے روشن، اور پکی گلیوں میں کاروں کو دروازے تک آتے ہُوئے دیکھ رہا تھا۔ اِس سیدھے سادھے، صاف ستھرے، مجرد خیال نے اُس کے دماغ سے تمام ملے جلے پیچیدہ اور گنجلک خیالات کو نکال باہر کیا تھا۔ اُس کا دِل ہلکا ہو گیا۔ اُس کی نظر اب تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ وہ جا کر سکینہ کے ساتھ والی چارپائی پہ لیٹ گیا۔

وہ اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ جب وہ اُٹھا تو سکینہ اُسے جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔ اعجاز نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہو گیا؟" اُس نے پُوچھا "ہڑ آ گیا ہے؟"

"ملک جہنگیر آیا ہے" سکینہ نے بتایا۔ "ایسے بیہوش ہو کر سوتے ہو۔ آوازیں دے دے کر تھک گئی ہوں۔"

"کہاں ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"باہر کمرے میں بیٹھا ہے۔"

"مجھے پانی دو۔"

سکینہ نے گھڑے سے گلاس بھر کر اعجاز کو دیا جس کو اُس نے غٹاغٹ خالی کر دیا۔ جو چند قطرے گلاس میں بچ رہے اُن سے اُس نے ہاتھ گیلا کر کے مُنہ پر پھیرا اور بستر کی چادر سے چہرہ خشک کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ صحن میں نکل کر اُس نے کہا "سکینہ، ملک صاحب کے لئے چائے وائے بھیجو۔"

"بنا رہی ہوں" سکینہ نے باورچی خانے سے جواب دیا۔

کمرے میں ملک جہانگیر اور اُس کے دو کارندے بیٹھے تھے۔ اعجاز اُس سے گلے ملا اور دُوسرے آدمیوں سے ہاتھ ملا کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"اعجاز، تم تو یار فجر کے وقت اُٹھنے والے آدمی تھے" جہانگیر نے کہا۔ "مشہور تھا کہ ملک اعجاز جیسا محنتی آدمی اِس گاؤں میں پیدا نہیں ہوا۔ سُورج سَر پر آن پہنچا ہے اور تم سوئے پڑے ہو۔"

"رات کو دیر تک جاگتا رہا" اعجاز نے کہا۔ "وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں بھئی، آپ کی مصروفیات کا چرچا دُور دُور تک ہے۔ اب تو اخبار میں آپ کی تصویریں آتی ہیں۔"

"اچھا؟" کِس اخبار میں؟"

"بدامی باغ کی "عوام" میں کل دیکھی تھی۔ تم تقریر کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ میں نے تصویر نہیں دیکھی، مگر پرسوں ہمارا وہاں جلسہ تھا۔"

"بالکل اپنے نام نہاد لیڈر کی طرح باہیں پھیلا کر تقریر کر رہے تھے۔"

"نام نہاد تو نہیں، پکا پکا لیڈر ہے جناب۔"

"تماشا گیر ہے، ملک اعجاز، کیا بات کرتے ہو۔ سب بالغ نظر لوگوں کو علم ہے کہ تماشا لگاتا ہے۔"

"اس کے جلسوں کا حال سنا؟"

"واہ وا، بڑے بھاری جلسے ہو رہے ہیں۔ مگر تمہیں پتا ہے لوگ کیا دیکھنے جاتے ہیں؟ لوگ عورتوں کے ڈانس دیکھنے جاتے ہیں۔ جب ووٹ پڑیں گے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بھائی جہانگیر۔ آپ بھی یہاں ہیں، ہم بھی یہیں پر ہیں۔ پتا چل جائے گا۔"

"خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم سب کو تمہارے اُوپر فخر ہے۔ تم نے خُوب دُنیا کمائی ہے۔ مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے، سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ سرفراز قابل نکلا، فوج کا افسر ہو گیا ہے۔ سچی بات ہے، اللہ نے چاچے یعقوب کے خاندان کو بڑے رنگ لگائے ہیں۔ اور دو سال میں تیرے اپنے دونوں جوان ہو کر تیرے بازو بن جائیں گے۔ کھانے کو بڑا کچھ ہے۔ اور آدمی کو کیا چاہئے۔ مگر میں آج تیرے ساتھ کسی اور معاملے پر لڑائی کرنے کے لِئے آیا ہوں۔"

"کیا معاملہ ہے بھائی جہانگیر؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"تو نے رتبہ رسوخ پیدا کر لیا ہے، مگر اپنی برادری کو بھول گیا ہے۔"

"کیا بات کرتے ہو بھائی جہانگیر۔ میں ہر معاملے پر برادری کے ساتھ چلنے والا آدمی ہوں۔"

"پھر اسی لِئے میرے مقابلے پر کسی کو کھڑا کر دیا ہے؟"

اعجاز کو کھٹک چکی تھی کہ جہانگیر جلد یا بدیر اس موضوع پر آئے گا۔ "یہ تو پارٹی کا معاملہ ہے بھائی۔ میرا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔"

"کیوں نہیں؟ تمہاری پوزیشن کوئی کم ہے؟ تم چاہو تو ہر طرح سے پریشر ڈال سکتے ہو۔"

"ملک صاحب، اب میں کیسے آپ کو یقین دلاؤں، میری پوزیشن اتنی ہی ہوتی تو

میں اپنے لئے ٹکٹ کی کوشش نہ کرتا؟ میں تو ایک چھوٹا سا پرزہ ہوں۔"

"تجھے یاد ہے؟" جہانگیر بولا "میں نے ہی تجھے نصیحت کی تھی کہ آپوزیشن میں اپنے پیر مضبوط کرو، تاکہ جو دھڑا بھی جیتے ہماری اُنگلی اندر ہی رہے۔"

"ٹھیک ہے،" اعجاز آہستہ سے بولا۔ "میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔"

"درست۔ مگر میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ پیر پکے کرنے کے بعد تم اپنی برادری کو چھوڑ کر گجروں اور رائیوں کے ساتھ جا کر مل جاؤ۔ آج تو نے ایک کمی کو میرے مقابلے پر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ میرے لئے ہی نہیں، تیرے لئے بھی مر مٹنے کا مقام ہے۔"

"ملک صاحب،" اعجاز نے، "آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ میرا کام ٹریڈ یونینوں میں ہے۔ پارٹی کے ساتھ میرا تعلق اسی حد تک ہے کہ ٹریڈ یونین کا پارٹی سے قدرتی الحاق ہے۔ ورنہ میری حیثیت ایک عام ممبر کی ہے۔ جہاں تک مزدوروں کا تعلق ہے، آپ کو پتا ہی ہے کہ مل کے معاملے میں ایک دو بار میرا زور چلتا تھا، وہ میں نے چلا دیا تھا۔"

"تم نے جو مدد کی تھی اُس سے میں کب اِنکاری ہوں۔ ہم تو سب خوش ہیں کہ کاروبار میں ترقی کرنے کے باوجود تم غریبوں مزدوروں میں اُٹھتے بیٹھتے ہو۔ ہم سب کا فائدہ ہے۔ مگر اب تو عزت کا معاملہ ہے بھائی۔ تم آخر مزدوروں کے علاوہ بھی اپنی پارٹی کے حق میں بولتے ہو۔ تمہارا تعلق واسطہ دُوسروں سے بھی ہے۔"

"کبھی کبھار کوئی کسانوں یا ٹیچروں کی تنظیم کے پُرانے واقف مہمان کے طور پر بلا لیتے ہیں تو چلا جاتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ دو پھیرے میرے حلقے میں بھی لگا سکتے ہو۔ تم جہاں مرضی ہو جا کر اپنی پارٹی کے حق میں تقریریں کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میرے حلقے میں آ کر تو میری طرفداری کرو۔"

"یعنی؟" اعجاز نے رُک کر پُوچھا۔

"بھئی دو تقریریں میرے حق میں بھی کر جاؤ۔ کچھ برادری کو پتا چلے کہ ہم،" جہانگیر نے مٹھی کس کر ہوا میں اُٹھائی، "آپس میں اس طرح ہیں۔ ساتھ ہی دشمنوں کو بھی خبر ہو جائے۔"

"آپ کے،" اعجاز کوشش کر کے بولا، "حق میں کیسے بول سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟ سیاست میں بھائی بھائی کو چھوڑ تو نہیں جاتا۔"
اعجاز کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنے آپ پہ قابو پا کر بولا "آپ ہی نے پہلے میری ہمت بڑھائی کہ ایسا کرو اور ویسا کرو، اپنی پوزیشن مضبوط کرو وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ اپنی پوزیشن سے غداری کروں؟ یعنی اب آپ یہ بدنامی میرے نام لگانا چاہتے ہیں؟ کیا کرایا سب غرق؟"
اعجاز کے تیور دیکھ کر جہانگیر ہنسنے لگا۔ "تم تو میری بات کو اُلٹی طرف لے گئے۔ یہ بے عزتی کی نہیں عزت کی بات ہے۔ تیری میری عزت ہم سب کی عزت۔ تیری میری بے عزتی، ہم سب کی بے عزتی۔"
جہانگیر کے منشی نے، جو اب تک خاموش بیٹھا تھا کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "بات تو ملک جی غلط نہیں کر رہے،" وہ جہانگیر کو مخاطب کر کے بولا "ان کی پوزیشن بہت بڑی ہے۔ میرے ناچیز خیال میں تو اس مسئلے کا سیدھا حل ہے۔ جس کمی نے جرأت کی ہے کہ آپ کے حلقے میں اپنے لیے زمین ہموار کرتا پھرے، اُس کو اپنا من پورا کر لینے دیں۔ اس کی ضمانت ضبط ہو گی تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ پھر ہم جانیں اور وہ۔ ابھی اُس کو کھلا چھوڑ دیں۔ بعد میں ہم اُسے دیکھ لیں گے۔ دُوسری طرف اُس کی پارٹی کا پول بھی کھل جائے گا اور ملک اعجاز کی پوزیشن بھی صاف رہے گی۔"
منشی نے بات ختم کی تو جہانگیر نے اعجاز کی جانب دیکھا۔ اعجاز منشی کو دیکھ رہا تھا۔ اب منشی نے ترپ کا پتہ پھینکا۔ "البتہ ملک اعجاز اتنا تو کر سکتا ہے کہ ہماری حمایت میں نہ بولے تو اُس کمی کی حمایت میں بھی کچھ نہ کہے۔"
"ٹھیک ہے،" جہانگیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ یہ میدان اور یہ کوہ۔ الیکشنوں کی کیا بات ہے اعجاز، زندگی اسی کھیل میں گزری ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مخالفوں سے ڈر کے میں تیرے پاس آیا ہوں۔ فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو صرف اس لیے چل کر آیا ہوں کہ اپنوں کی مار دل کو زخمی کر دیتی ہے۔ بس اتنی بات ہے۔"
اعجاز اُن دونوں سے منہ پھیر کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ کر جہانگیر مطمئن ہو گیا۔ صحن میں دھوپ پھیل رہی تھی جس میں مرغیاں پر پھلا پھلا

کر دانہ چگ رہی تھیں۔ اعجاز کے مزدور کا بیٹا جو گھر میں کام کرتا تھا، چائے کا طشتر اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے حسن ایک پلیٹ میں رس اور دوسری میں اُبلے ہوئے انڈے لئے آیا۔

"تکلف کی کیا ضرورت تھی،" جہانگیر بولا۔ "کوئی پرایا گھر ہے؟"

مگر منشی اور دوسرا آدمی دیہاتیوں کی سی بے تکلفی سے اُبلے ہوئے انڈے زمین ٹھوک ٹھوک کر توڑنے لگے۔ اعجاز نے چائے پیالیوں میں اُنڈیل کر سب کو پیش کی۔ منشی اور اُس کے ساتھی نے پہلے رس بھگو بھگو کر کھائے، پھر گرم گرم چائے پرچوں میں اُنڈیل کر پینے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں صرف اُن کی سڑکیوں کی آواز آتی رہی۔

"یار اعجاز، ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی،" جہانگیر نے ایک گھونٹ کے بعد پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے لیڈر پر اتنے فریفتہ کیوں ہو؟"

اعجاز نے ایک لحظہ سوچ کر جواب دیا۔ "بھائی جہانگیر تمہیں اِس بات کی سمجھ نہیں آئے گی۔"

بہت بڑا جاگیردار

"کیوں؟"

"اِس کی سمجھ صرف غریبوں کو آتی ہے۔"

"جہانگیر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "کیا تم واقعی اعتقاد رکھتے ہو کہ ایک بہت بڑا جاگیردار غریبوں کا ہمدرد ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اگر وہ ہو سکتا ہے تو میں بھی ہو سکتا ہوں۔ تقریر ہی کرنی ہے نا۔ میں بھی اُٹھ کے کہہ دیتا ہوں غریبوں کا حق غریبوں کو دو۔"

"صرف بولنے کی بات نہیں۔ عمل کی بات ہے۔"

"ٹھیک،" جہانگیر نے طنز سے کہا۔ "تو جناب عمل کیا ہے؟ بے حیائی؟"

"کیا مطلب؟"

"عورتوں کو آزادی دے کر سٹیج پر نچوانا بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہ ہی ان کا عمل ہے؟ عمل تو ہوتا ہے کہ منہ کھولنے سے پہلے بندہ اپنی جیب کھولے۔ کیا اُس نے اپنی جاگیر مزارعوں میں تقسیم کی ہے؟ صرف لباس تبدیل کرنے سے کیا ہوتا ہے؟"

جہانگیر جواب طلب نظروں سے اعجاز کو دیکھتا رہا۔ اعجاز سامنے بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کے سروں کے اُوپر دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں سوچ اور بے خیالی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ پھر وہ اچانک سر موڑ کر جہانگیر سے بولا۔

"آپ کے اِن سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی بات ہے، شاید اس کی سمجھ آپ کو آ جائے۔"

"بتاؤ کیا ہے؟"

"آپ نے کبھی بادشاہ دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔ نواب وغیرہ دیکھے ہیں۔ یا بچپن میں انگریز افسر دیکھے تھے۔"

"یہ بتاؤ کہ جب لوگ اُن کی شان میں نعرے لگاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں، تو وہ آگے سے کیا کرتے ہیں؟"

"جہانگیر کے فہم میں بات نہ بیٹھ رہی تھی۔ "کرتے کیا ہیں، ہاتھ اُٹھا کر جواب دیتے ہیں۔"

"ٹھی ی ی ک!" اعجاز نے اُسی طنز کے لہجے میں کہا "ایک ذرا سا ہاتھ اُٹھا کر اپنی رعایا کو جواب دیتے ہیں۔ مگر 'میرے' لیڈر کے لیے جب لوگ تالیاں بجاتے ہیں تو وہ ایک ہاتھ کی اُنگلیاں ہلا کر جواب نہیں دیتا۔ وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے جوڑتا ہے اور لوگوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجاتا ہے۔"

"یہی تو تماشا گیری ہے۔ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" جہانگیر نے ہنس کر پوچھا۔

"اِس سے لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ کوئی حاکم نہیں اور کوئی رعایا نہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔"

"یہ تو اُس وقت پتا چلے گا جب وہ حاکم بنے گا۔"

"ٹھیک ہے، بعد کی بات ہے، خُدا معلوم کیا ہو گا۔ مگر اِس وقت،" اعجاز نے انگلی ہوا میں ہلا کر کہا "اُس نے ایک کام کیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اُس نے غریب لوگوں کو تالیاں بجانا سکھایا ہے۔"

جہانگیر کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے گویا ٹھٹک کر پھیل گئیں۔ پھر فوراً وہ اُٹھ کھڑا

ہوا۔ "اِن باتوں سے کیا ہوتا ہے میاں۔ چلو چھوڑو۔ اب اجازت دو۔"

اعجاز بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ بڑی بات ہے ٹلک جہانگیر۔" اعجاز نے کہا۔

وہ کمرے سے نکل کر باہر کو چلے تو جہانگیر نے کہا، "بڑی ہے یا چھوٹی ہے، میں تو ایک بات سمجھتا ہوں اعجاز۔ ہماری عزت، تمہاری عزت، سب ایک ہے۔ اللہ سے دعا کرو کہ عزت تمہاری بھی رہ جائے اور اپنی بھی رہ جائے۔ باقی خیر ہے۔"

"ابھی ٹکٹوں کا بھی فیصلہ نہیں ہوا بھائی جہانگیر،" اعجاز نے کہا۔ "اتنی جلدی کس بات کی ہے؟"

"تمہاری پارٹی کے لیڈر میرے حلقے میں آ کر اُس کی حمایت میں تقریر کیوں کر رہے ہیں؟ اندر خانے سب فیصلے ہو گئے ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ٹکٹ گجر کو ہی ملے گا۔"

وہ گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے کہ حسن اندر سے آیا۔ "بی بی کہتی ہے کھانا کھا کر جائیں۔ مرغی ذبح کی ہے۔"

"بی بی کو میرا سلام دو،" جہانگیر بچے کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کہو اگلی دفعہ کھائیں گے۔ آج ضروری کام سے جانا ہے۔" اُس نے ہاتھ سے بچے کی ٹھوڑی اوپر اُٹھا کر گال پر تھپکی دی۔ "میرا حصہ تم کھا لینا۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ ہنس کر بولا۔

جہانگیر اعجاز سے گلے مل کر رُخصت ہوا۔

"کیا کرنے آیا تھا؟ سکینہ نے پُوچھا۔

"الیکشن کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"مدد امداد کی ٹوہ پر آیا ہو گا۔"

"ہاں۔"

"سنا ہے سراج گجر اُس کے مقابلے پر کھڑے ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"تجھے کس نے بتایا ہے؟"

"سرداراں دائی کی بہن نُور پُور کے گجروں کی دائی ہے، اُس نے ذکر کیا تھا۔ تم تو جنگیر کی مدد ہی کرو گے۔"

اعجاز چارپائی پہ سیدھا لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔

"تمہارا دماغ کدھر اُڑتا رہتا ہے؟" سکینہ نے کہا۔

"ہیں؟"

"میں نے کہا تم تو تلک جھنگیر کی مدد امداد ہی کرو گے ناں۔"

"سراج گجر کو بھی میں جانتا ہوں۔ بُرا آدمی نہیں۔ آزاد منش ہے۔ غریب پرور ہے۔ لوگوں کے کام کرتا ہے۔"

"گجروں کے ساتھ ہمارا نہ کوئی لین نہ دین۔ خوشی غمی میں برادری ہی ساتھ اُٹھتی بیٹھتی ہے۔ جھنگیر کا تمہارے اُوپر حق بنتا ہے۔"

اعجاز اِس گفتگو سے اُکتاتا جا رہا تھا کہ سکینہ نے کہا "فصل کھڑی ہے، بیلنا بند ہے۔ تھوڑی بھی نہیں، سوا مربعے کی فصل ہے۔ آخر ڈنگروں کو تو نہیں کھلانی۔ جھنگیر اپنی بل کے لئے خوشی سے خرید لے گا۔"

"اِس بات نے اعجاز کو سوچنے پر مجبور کر دیا، مگر وہ خاموش رہا۔

"کوئی ہاں یا نہ کرو، چپ کا روزہ رکھ کر لیٹ گئے ہو۔"

"ٹھیک ہے، نہ جہانگیر کی مدد کروں گا نہ گجر کی۔"

"میں تو کہتی ہوں جھنگیر کا ساتھ دو۔ کبھی اپنے فائدے کی بات بھی سوچ لیا کرو۔"

اعجاز کا جی چاہ رہا تھا کہ سکینہ اِس قصے کو ختم کرے۔ "تو نے واقعی مرغی ذبح کرائی ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں۔ تتری کل شام سے سُست نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا اِس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔۔۔۔ یاد ہے پچھلی سردیوں میں چاچے گامے کا سارا ٹبر بخار سے لیٹ گیا تھا؟ پیچھے خبر نکلی کہ بیمار مرغی ذبح کر کے کھائی تھی۔"

"تیرا بیڑا ترے۔ تو ایسے کام کیوں کرتی ہے؟"

"تتری بیمار کہاں تھی، بس ذرا سُست تھی۔ ایسی چمکتی ہوئی گلابی بوٹی تھی۔ دیکھو،" اُس نے ڈوئی ہانڈی میں ڈبو کر ایک بوٹی اُٹھائی، "یہ کوئی بیمار ہے؟ بیمار بوٹی تو سینک لگتے ہی کالی سیاہ ہو جاتی ہے۔"

"تو کسی دن ہم سب کو مروائے گی۔" اعجاز نے کہا اور کروٹ بدل لی۔ لیٹے لیٹے اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔

"دو آدمی آئے بیٹھے ہیں،" سکینہ نے کہا۔

"کون ہیں؟"

"شہر سے تمہیں بلانے آئے ہیں۔"

"روٹی پکا دو۔ جہانگیر نے سارا دِن غرق کر دیا ہے۔ آج مجھے بڑے کام کرنے تھے۔" اعجاز دو آدمیوں سے ملنے کے بعد کھانا کھانے بیٹھ گیا اور سالن سے لگا لگا کر روٹی کھانے لگا۔ جب کھا چکا تو سکینہ پلیٹ کو دیکھ کر بولی۔

"بوٹیاں کیوں نہیں کھائیں؟"

"پوری گلابی نہیں تھیں،" اعجاز ہنس کر بولا۔

سکینہ نے اُسی پلیٹ سے ایک بوٹی اٹھائی اور دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگی۔

"آج شاید مجھے دیر ہو جائے،" اعجاز نے کہا۔

سکینہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اعجاز اُن دو آدمیوں کے ہمراہ گھر سے نکل گیا۔

گرمیوں کا موسم آنا جانا تھا، مگر پھر بھی دِن کے اِس گھنٹے لوگ دو چار بار دروازے سے جھانکنے کے بعد، دھوپ کے چلن دیکھ کر، نہائے دھوئے، ہلکے ہلکے قدم رکھتے ہوئے باہر نکلتے تھے۔ مگر آج کا سماں ہی مختلف تھا۔ نہ کسی کو موسم کی فکر تھی نہ گرد کی، اور نہ ہی سفید کپڑوں کی بردباری کا خیال تھا۔ موچی دروازے کے میدان میں کھوے سے کھوا چھلنے کی مثال صادق آتی تھی۔ لوگوں کے گرد آلود چہروں پہ پسینے کے قطرے لکیریں بنا رہے تھے مگر اُنہیں پونچھنے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ لاکھوں کا یہ مجمع بازو اُوپر اٹھائے، تالیاں بجاتا ہوا نعرے پہ نعرہ لگا رہا تھا۔ فضا میں ہزارہا آوازوں کی مجموعی ہیبت پھیلی تھی۔ یہ لوگ اپنے محبوب لیڈر کو دیکھنے آئے تھے جسے ایک فوجی ڈکٹیٹر نے جیل میں ڈال دیا تھا، اور جب وہ ڈکٹیٹر دستبردار ہوا تو دوسرے فوجی ڈکٹیٹر نے اُسے چھوڑ دیا تھا۔ رہا ہونے کے بعد اُن کا لیڈر پہلی بار اِس شہر میں آیا تھا اور لوگ، غریب اور نادار لوگ اُسے

دیکھنے کو، اُس کی آواز سننے کو گلیوں، محلوں، جھگیوں اور بازاروں سے اُمڈ پڑے تھے۔ اس نے نہ پینٹ کوٹ اور ٹائی لگا رکھی تھی، نہ شیروانی اور جناح کیپ پہنی ہوئی تھی۔ ملیشے کے رنگ کی معمولی شلوار قمیض اُس کے زیب تن تھی اور پاؤں میں چپلی تھی۔ اس کی قمیض کے کف کھلے تھے، اور جب وہ بازو اُوپر اٹھاتا تو آستینیں کہنیوں تک ڈھلک جاتیں اور بانہیں ننگی ہو جاتیں۔ غریب لوگوں کے اِس جم غفیر کے سامنے سٹیج پر کھڑا ہوا وہ ایک غریب آدمی نظر آ رہا تھا۔

"میرے بال چند مہینوں میں سفید ہو گئے ہیں،" وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ جیل میں دھوپ نہیں آتی۔۔۔۔" مجمعے سے تالیوں کا شور اُٹھا۔ "میرے بال اِس وجہ سے سفید ہُوئے ہیں کہ میں سوچتا رہا ہوں۔ اگر میرے اندر غیرت ہے تو میں کیا کروں؟"

اِس جملے پر ہجوم اُچھل پڑا۔ تالیوں اور نعروں کا شور زمین سے آسمان تک جا پہنچا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے اِس کھلبلاتے ہُوئے مجمعے کی رُوح تڑپ اُٹھی ہو۔ کئی منٹ تک مسلسل "زندہ باد" اور "جیوے ای جیوے" کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ اِس شخص کا ہاتھ اِس حد تک غریب عوام کی نبض پر تھا کہ اِس جملے کے اندر دفن ایک لفظ "غیرت" کو استعمال کر کے اُس نے اِن لوگوں کو عزت نفس مہیا کر دی تھی۔ اُس نے ابھی ان لوگوں کو کچھ بھی نہ دیا تھا مگر مذہبی رہنماؤں سے ایک تخیل مستعار لے کر انہیں ایک دُنیاوی جنت کا نقشہ دکھایا تھا جس میں اُنھیں عزت بھی ملے گی اور دولت بھی۔ اور غریب لوگ، جن کی زندگیاں صرف اُمید کی ناُمیدی پہ بسر ہوتی ہیں، جی توڑ کر اُس پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ مگر اِس لیڈر کے پاس صرف یہی کچھ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مال و عزت کی کشش کے ساتھ ساتھ خوش وقتی کا سامان بھی ایک ملے جلے مجمعے کی ضرورت تھا۔

"ایک شخص ہے شیر علی،" وہ کہہ رہا تھا۔ "اُسے نوابزادہ شیر علی کہتے ہیں۔ اُس کو حکومت نے میری جگہ پر وزیر خارجہ مقرر کیا ہے۔ اس شخص کو خارجہ پالیسی کا کیا علم ہے؟"

"کوئی علم نہیں۔۔۔۔" مجمع دھاڑا۔

"چل شیر علی،" لیڈر نے انگلی ہوا میں اٹھائی، پھر جھٹکے سے گرائی، "نیچے

اتر۔۔۔۔ چل او شیرو، نیچے اتر۔"

مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ تالیوں، نعروں اور قہقہوں کے شور میں لیڈر اور ہجوم انگلیاں ہلا ہلا کر دُہرا رہے تھے، چل او شیرو، نیچے اتر۔۔۔۔ چل او شیرو، نیچے اتر۔"

اگلے روز اخباروں میں سرخیاں لگی تھیں: "میرے اندر غیرت ہے تو میں کیا کروں؟"

اعجاز اپنے دفتر میں میز پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ منظور ایک تصویر پر انگلی رکھے کھڑا تھا۔ "یہ آپ کا ہاتھ ہے ملک جی" پھر وہ ارد گرد کھڑے آٹھ دس لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا، "یہ ملک اعجاز کا ہاتھ ہے، دیکھ رہے ہیں؟" آٹھ دس سر تصویر کے اُوپر جھک کر دیکھنے لگے۔ "میں ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ تصویر میں پیچھے چھپ گیا ہوں۔ ہے نا ملک جی؟"

اعجاز کے چہرے پہ مسرت کی سرخی پھیلی تھی۔ وہ طمانیت کے ایسے احساس سے پھیل کر بیٹھا تھا کہ کرسی اُس کے وجود کے لیئے ناکافی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے مسکرا کر آہستہ سے سر ہلایا۔ جلسے کو بارہ چودہ گھنٹے ہو چکے تھے مگر منظور ابھی تک ہیجانی کیفیت میں تھا، جس میں اخباری رپورٹوں اور تصویروں نے اضافہ کر دیا تھا۔ وہ پھر بولا، "ملک جی، آپ نے دیکھا، صاحب تقریر کے دوران بار بار آپ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بات کر رہے تھے؟" اعجاز کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دُوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا، "ہاں ہاں، ملک صاحب تو سٹیج کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ دیکھو، یہ سٹیج ہے،" اُس نے اُنگلی رکھ کر دکھایا، "اور یہ ملک جی کھڑے ہیں، بالکل آگے۔ بس دو چار ہی گز کا فاصلہ ہے۔"

"صاف نظر نہیں آتا" ایک شخص شکی لہجے میں ہولے سے بولا۔

"اوئے فضلے، تجھے تو عینک لگنی چاہئے،" منظور جوش سے بولا، "اندھے کو بھی نظر آ رہا ہے کہ یہ ملک اعجاز کھڑا ہے۔ میں بالکل ساتھ کھڑا تھا۔ تصویر کا اینگل غلط ہونے سے میں پیچھے چھپ گیا ہوں، ورنہ میری بھی شکل یہاں آ جاتی۔ میں نے صاف دیکھا کہ صاحب ملک جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہے تھے، اپنے حقوق کے لئے جنگ کرو، جدوجہد جاری رکھو، ہمت نہ ہارو۔ کیوں ملک جی؟"

"سٹیج پر تو چوہدری ارشد کی طرح کا کوئی بندہ بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے،" ایک دُوسرا

آدمی تصویر پر اُنگلی رکھ کر بولا۔

"ہونہہ!" منظور نے حلق سے حقارت بھری آواز نکالی۔ "سارا شہر جانتا ہے چوہدری شدا اچھچہ ہے۔ جب کام کرنے کا موقعہ آتا ہے تو کہتا ہے میں بیمار ہو گیا ہوں، ٹانگ میں موچ آ گئی ہے، چلا نہیں جاتا۔ گھر میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب جلسہ ہوتا ہے تو پوسی مار کر سٹیج پر چڑھ جاتا ہے۔ چچہ نہیں مہاچچہ ہے۔ شاہدرے والوں کو بھی اب اُس کا پتا چل گیا ہے۔ دیکھ لینا اِس دفعہ اپنی یونین کے الیکشن میں بھی ہار جائے گا۔"

"ناں ناں، منظور،" اعجاز صبر سے بولا "دوسری تنظیموں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم سب بھائی ہیں۔"

"ملک جی آپ خفا ہوں یا راضی، مگر سچی بات ہے، کوئی مینجمنٹ کا چچہ ہمارا بھائی نہیں ہو سکتا۔ یہی لوگ ہیں جو تحریک کو تباہ کرتے ہیں۔ اس کے اسسٹنٹ توکل شاہ نے خُود مجھ سے کہا ہے کہ اِس دفعہ چوہدری شدے کا کوئی چانس نہیں، یہ منافق ہے،" پھر وہ دوسروں کی طرف دیکھ کر بولا "سارا کام تو ہم نے کیا ہے، جتنے بندے ہم لے کر گئے ہیں کوئی لے کر نہیں گیا۔ پندرہ دِن ہو گئے ہیں، خُدا گواہ ہے میں نے پلک پر پلک نہیں رکھی۔ قائد اگر کہے تو اللہ کی قسم جان ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دوں۔ مگر جب موقع آتا ہے تو یہ چچے سلوار پر لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیتے ہیں۔"

"اِن باتوں سے کچھ نہیں ہوتا بھئی،" اعجاز نے کہا، "سب کو پتا چل جاتا ہے کِس نے کام کیا ہے، کِس نے نہیں کیا۔ چھوڑ اِن قصوں کو، چل۔" اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے احتیاط سے اخبار سمیٹ کر تہہ کیا اور اُسے اُٹھا کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ "آ،" وہ منظور سے بولا۔

دفتر کے ساتھ اعجاز کے دوست فوٹوگرافر کی دکان تھی۔ اعجاز اور منظور اُس میں داخل ہو کر فوٹوگرافر سے دعا سلام لیتے ہوئے اُس کے پچھلے کمرے میں جا بیٹھے جو عموماً خالی رہتا تھا۔ اُس نیم اندھیرے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں، اور ایک طرف کو دیوار کے ساتھ بان کی ننگی چارپائی بچھی تھی۔ منظور چارپائی پر اور اعجاز اُس کے سامنے کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"منظور،" اعجاز مخاطب ہوا، "تجھے میرے ساتھ کام کرتے ہو کتنا عرصہ گزرا ہے؟"

غیر متوقع سوال سن کر منظور ایک لحظے کو رُکا، پھر بولا، "یہی کوئی سال ڈیڑھ سال۔"

"اِس سے پہلے تُو کیا کرتا تھا؟"

"یہی محنت مزدوری کرتا تھا، آپ کو پتا ہی ہے۔"

"میں نے تجھے محنت مزدوری کرنے کے لیے تو اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا نا۔"

"منظور کو کوئی جواب نہ سُوجھا تو چارپائی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا، "ہیں جی؟"

"اوئے میں نے تجھے دو جماعتاں پڑھا ہوا آدمی سمجھ کر کچھ سیکھنے سکھانے کے لئے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ تو نے ڈیڑھ سال میں کیا سیکھا ہے؟"

"ملک جی،" منظور مزید سمٹتا ہوا بولا، "میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی خاص مہربانی سے یہاں تک پہنچا ہُوں۔ آپ کا احسان زندگی بھر۔۔۔۔"

"اُوں ہوں،" اعجاز نے نفی میں سر ہلا کر کہا، "احسان و حسان کو چھوڑ۔ تو نے مجھ سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ میں بہت مایوس ہوا ہُوں۔"

منظور نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے آنکھیں نیچی کر لی۔ اب وہ سمٹا سمٹا ہوا چارپائی کے کنارے پر گچھا مچھا بنا بیٹھا تھا، اِس طرح کہ کندھے سکڑے ہوئے، کہنیاں گود میں گڑی ہوئی اور ٹانگیں ایک دُوسری کے گرد لپٹی ہُوئی تھیں۔

"تو ایرا وغیرا لوگوں کے ساتھ وقت گنواتا رہتا ہے،" اعجاز نے کہا، "جن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اب الیکشن آ رہے ہیں۔ ہمارا کام اپنے حلقے کی رکھوالی کرنا ہے۔ یہ لیبر یونین سے اُوپر کا کام ہے۔ یہ سیاست کا وقت ہے۔"

"جی بالکل ہے،" منظور بولا۔

"آصف شاہ کا نام سنا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"بالکل سنا ہے جی، اپنے حلقے کی پارٹی کا آدمی ہے۔"

"اور نصیر شیخ؟"

"وہ بھی حلقے کی پارٹی کا بندہ ہے۔"

"تجھے پتا ہے کہ اِن دونوں کے درمیان ٹکٹ حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہُوئی ہے؟"

"افواہیں تو سنی ہیں۔"

"اور ہمیں آج تک اِن میں سے کسی نے پُوچھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک۔ ہم تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔ ہم کو تو اپنی یونین کانگریس کے دفتروں سے ہدایات وصول ہوتی ہیں، یہ کرو، وہ کرو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ ٹھیک؟"

"جی بالکل درست۔"

"یہ پارٹی کے لوگ کہتے ہیں ان کا عوام کے ساتھ رابطہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ رابطہ وابطہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ دفتروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قائد کی مقبولیت کے عوض اِن کو ووٹ مل جائیں گے۔ اگر کوئی تنظیم ہے تو صرف ہماری ہے۔ ہماری تو عمر گزر گئی ہے تحریک کو منظم کرتے ہوئے۔"

"بالکل درست فرمایا۔ آپ کی تو عمر گزر گئی ہے----"

"تو پھر کیا ہم ایک طرف لگ کر کھڑے رہیں اور دُوسرے ہماری محنت کا پھل کھاتے رہیں؟"

"نہیں ملک جی، یہ تو ناانصافی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ دیکھ جھورے، میں تجھے سیاست کی ایک رمز سمجھاتا ہوں۔ سیاست میں انصاف یا ناانصافی نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ صرف یہ،" اعجاز نے انگلی سے اپنا ماتھ ٹھونکا" کام کرتا ہے۔ دماغ کام کرے تو صحیح وقت پہ صحیح عمل کرنے سے کامیابی ہوتی ہے، ورنہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ناکام ہو جاتے ہیں تو اِس میں کسی دُوسرے کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ آپ کا اپنا قصور ہوتا ہے۔"

"یا حالات کا" منظور نے جُرأت کر کے کہا۔

"اوئے بیوقوف، حالات کو آدمی خُود بناتا ہے۔ اب حلقے کی پارٹی کو ہی دیکھو۔ کیا حالات ہیں؟ دو آدمی سربراہ بنے ہُوئے ہیں، کشمکش چل رہی ہے۔ ہمیں کوئی پُوچھتا نہیں۔ اِن حالات میں ہمارا کیا کام ہونا چاہیے؟"

منظور چند لمحے تک آنکھیں کھولے اعجاز کو دیکھتا رہا، پھر گویا آہستہ آہستہ اُس کے فہم میں یہ رمز داخل ہونے لگی۔ اُس کی آنکھیں جو کچھ دیر کو دھند لا گئی تھیں، چمکنے

لگیں۔ اُس کے ہاتھ اَور پیر کھلنے لگے۔ اُس نے ہاتھوں کو آپس میں گوندھنا چھوڑ کر اُنہیں چارپائی پہ رکھا، کہنیاں باہر کو نکالیں، کنارے سے کھسک کر بان پر نشست کی، اَور بولا۔

"ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ان دونوں کو الگ الگ شاباشاباش کہتے رہیں، دونوں کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے رہیں، جب اُن کے ووٹ تقسیم ہو کر طاقت کمزور ہو جائے گی تو پھر اپنی ضرورت لے کر ہمارے پاس آئیں گے، کیونکہ ہمارے اندر بھی شیخ برادری اَور سیدوں کے ووٹ ہیں، اُن کو اَپنے ہاتھ میں رکھیں اَور وقت آنے پر استعمال کریں۔" اعجاز نے منہ سے بات کی نہ ہاں یا نہ میں سَر ہلایا، بس ہلکی سی مُسکراہٹ لئے منظور کو دیکھتا رہا۔ منظور کو پتا چل گیا کہ اُس کی بات کو اعجاز کی رضامندی حاصل ہو گئی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا حلیہ بدلنے لگا۔ اُس نے ٹانگیں کھول دیں، ہاتھ مزید پھیلائے اَور چارپائی پہ نیم دراز ہو گیا۔ تفخر کے مارے اُس کے سَر میں مہین سی لرزش پیدا ہو رہی تھی اَور نظریں اعجاز پہ گڑی تھی۔ "ٹکٹ تو جس کو ملتا ہے ملتا رہے گا" وہ بولا "پہلے لڑ کر تو مریں۔ ہمارے دست نگر ہوں گے۔"

اعجاز ہنس کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تُم تو بڑے بڑے لفظ بولنے لگے ہو۔" اس نے اخبار کو ایک اَور تہہ دے کر جیب میں رکھا۔ "میں تو گھر چلا۔ تو دفتر جا کے بیٹھ۔"

دوپہر کا وقت تھا۔ سکینہ کی آنکھیں دروازے پہ لگی تھیں۔ جیسے ہی اعجاز نے قدم رکھا وہ بولی۔

"گل افروز آیا تھا کہتا تھا کماد کو کیڑا پکڑ گیا ہے۔"

"ہاں" اعجاز چارپائی پہ بیٹھتے ہُوئے بولا "دیکھ کر آیا ہوں۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کل دوائی چھڑک دیں گے، قابو میں آ جائے گا۔"

"جلسہ تو رات کو ختم ہو گیا تھا۔ ساری رات کہاں پر رہے؟"

"ورکروں کے ساتھ مصروفیت رہی۔ بڑا بھاری جلسہ تھا۔ یہ تو دیکھ۔" اعجاز نے جیب سے اخبار نکال کر چارپائی پہ پھیلا دیا۔ سکینہ آ کر اُس پہ جھک گئی۔

"کیا ہے؟" وہ جھکے جھکے بولی۔

"پڑھ بعد میں لینا۔ تُو آدھے گھنٹے میں ایک سطر پڑھتی ہے۔ پہلے یہ تصویر دیکھ۔"

"یہ تمہارے جلسے کی تصویر ہے؟" سکینہ نے حیرت سے پُوچھا۔

"اور کیا؟ ذرا سَر نیچے کر اور نظر پہ زور ڈال۔" اعجاز نے تصویر پہ ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔ "دیکھ یہ بھلا کون ہے۔"

سکینہ کی نزدیک کی نظر کمزور تھی۔ وہ چہرے کو تصویر کے قریب لا کر دیکھنے لگی۔

"کون ہے؟"

"اب تو پہچاننا بھی چھوڑ گئی ہے؟ تجھے عینک نہ لگوا دوں؟ یہ میں کھڑا ہوں۔"

"اچھا آ؟" سکینہ کئی لمحوں تک غور سے دیکھتی رہی، پھر سَر اُٹھا کر مایوسی سے بولی، "مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مہین مہین نقطوں کی طرح آدمیوں کے مُنہ ہیں۔ پکی بات ہے کہ یہ تمہاری تصویر ہے؟"

"ہاں ہاں" اعجاز نے کہا۔ اُس کے لہجے میں ہلکی سی بے یقینی کی جھلک تھی۔ "سب لوگوں نے دیکھی ہے۔ سب یہی کہتے ہیں۔ میں اِسی جگہ پر تو کھڑا تھا۔ یہ ہمارے قائد ہیں، اور یہ میں ہوں۔ چل چھوڑ۔ تجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

اعجاز اُٹھ کر غسل خانے میں نہانے کے لئے چلا گیا۔ غسل کے بعد وہ اندر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ سکینہ نے پھر ذکر چھیڑ دیا۔

"بیس کِلّے، خالی پڑے ہیں۔ تمہیں اپنے جلسوں اجلاسوں سے فرصت نہیں ملتی۔ اللہ کا حکم ہے کہ اُس کی زمین سے خوراک حاصل کرو۔ زمین خالی رکھنے سے گناہ ہوتا ہے۔"

"تجھے کس نے بتایا ہے؟"

"بیوی جی نے۔"

"تیری بیوی جی بھی اَن پڑھ اور اُس کا خاوند مولوی بھی اَن پڑھ۔ اُنہیں تو میرے خیال میں نماز بھی پُوری نہیں آتی۔"

"ہائے توبہ کر۔ ایسے کلمے بولتے ہو تو مجھے خوف آتا ہے۔ مَیں کہتی ہوں شاید اِسی لئے لڑکوں کے نتیجے ٹھیک نہیں آ رہے۔"

"لڑکوں کے نتیجے اِس لئے ٹھیک نہیں آ رہے کہ پڑھتے نہیں، کھیل کود میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ کی مرضی کا اِس میں کوئی دخل نہیں۔ ذرا الیکشن نِکل لینے دو، پھر دیکھو میں کیسے انہیں قابو کرتا ہوں۔"

"کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں زمین ٹھیکے پر ہی دے دو۔ تمہارے پاس وقت نہیں تو کسی اور کو محنت کرنے دو۔ اُس کا فائدہ ہو، ہمیں بھی فائدہ دے۔ ابا اشارہ دے چکا ہے۔ اُس کے حوالے ہی کر دو۔"

"چاچے کے بس کا کام نہیں۔ اس کی عمر گزر چکی ہے۔ وہ اکیلی جان دو مربعے نہیں سنبھال سکتا۔ بس الیکشن گزرنے کے دیر ہے۔ گیہوں ذرا پچھیتری ہو جائے گی، مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ فکر نہ کر۔ تمیں بکلے کماؤ کھڑا ہے۔"

سکینہ نے چند لمحے توقف کیا، پھر وہ ہمت کر کے بولی، "میں نے گل افروز کو ملک جہنگیر کے پاس بھیجا ہے۔"

"ہیں،" اعجاز چونک پڑا۔ "کیوں؟"

"تمیں بکلے گنا کھڑا کھڑا برباد تو نہیں کرنا۔ تم کل جاؤ گے تو پرسوں آؤ گے۔ دوائی چھڑکتے چھڑکتے کھڑے فصل کو کیڑا کھا جائے گا۔"

"کوئی کیڑا ویڑا نہیں ہے۔ گل افروز کو گڑ بنانا آتا ہے، فصل کا اُسے کیا پتا؟ دو چار گنوں کے منڈھ کالے ہو گئے تو سمجھا کہ کیڑا لگ گیا ہے۔ تجھے بھی پتا ہے کہ نیچی جگہ پر چار دن پانی رُک جائے تو منڈھ کالے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ساری فصل دیکھی ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"بیلنا بند پڑا ہے، گڑ کی بولی کب لگے گی، کچھ پتا نہیں۔ مَیں نے گل افروز کے ہاتھ جہنگیر کو مل کے لئے فصل اٹھانے کا پیغام بھیجا ہے۔"

"اعجاز دِل میں سکینہ کی دلیل کا قائل ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی ہار ماننا نہ چاہتا تھا۔ "تو نے بڑے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں،" وہ بولا۔

"پر پرزے تو تم نکال رہے ہو۔ پر گھر میں اور پرزہ شہر میں۔ پیچھے کسی کو تو کام کرنا ہی ہے۔ مجھ سے بربادی نہیں دیکھی جاتی۔"

"واہ بھئی واہ،" اعجاز آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "پر گھر میں اور پرزہ شہر میں۔ خدا کا شکر ہے کہ تو تین جماعتیں ہی پڑھی ہوئی ہے۔ دو اور پڑھ جاتی تو نمبرداری کا حق مانگنے لگتی۔"

"تین نہیں، چار،" سکینہ بولی۔

"ہیں؟"

"چار جماعتیں پاس ہوں۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔ تم ہمیشہ ایک جماعت گھٹا کے بتاتے ہو۔"

اعجاز اب فصل کی ذمہ داری سے دستبردار ہو چکا تھا۔ اِس وقت اُس کی نظریں سکینہ کا تعاقب کر رہی تھیں جو پینتیس کے لگ بھگ ہونے کے باوجود چال ڈھال اور بدن میں نو عمر لڑکیوں کی مانند تھی۔ ساتھ ہی تھکاوٹ اور نیند سے اعجاز کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے اندر گہری نیند سو جانے کی خواہش تھی۔ وہ تکلے پر کلی کر کے اندر چارپائی پہ جا کر لیٹ گیا۔

"چل چھوڑ ان باتوں کو" وہ بولا۔ "اِدھر آ۔"

سکینہ اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"جا" اعجاز اُس کی کی ران پر ہاتھ رکھ کر بولا "اندر سے کنڈی چڑھا کے آ۔"

"اوں، ہوں" سکینہ نفی میں سر ہلا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اوں ہوں کی کیا بات ہے؟ ہر وقت اوں ہوں، اوں ہوں کرتی رہتی ہے۔"

"کپڑے آئے ہیں" سکینہ نے کہا۔

"تجھے ہر دُوسرے دِن کپڑے آ جاتے ہیں؟ بہانہ تو نہیں بنا رہی؟ ایک دِن تجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو تیرا پول کھل جائے گا۔"

"ہاں ہاں، مہینے میں دو دِن تو تم اَپنے دِل کو لے کر آتے ہو۔ مہینہ تمہیں دو دِن کا کیوں نہ لگے؟"

"چل کپڑے وپڑے چھوڑ، کوئی حرج نہیں، آ جا۔"

"ہائے ہائے خدا کا خوف کرو، تمہارے سر پر تو جن سوار ہیں۔"

"بہت سارے جن نہیں، صرف ایک ہی جن ہے۔"

"چل چل، سو جا" سکینہ نے بے تکلفی سے کہا۔ پھر دروازے سے باہر جاتی ہوئی شرارت سے بولی "نیند نہیں آتی، تو وضو کر کے نماز نیت لے۔ دِین بھی راضی، دُنیا بھی راضی۔"

مگر اتنے میں اعجاز کروٹ بدل کر سو چکا تھا۔

باب 12

شامیں خنک ہو چکی تھیں۔ سرفراز کی پوسٹنگ بہاولپور کی ہو چکی تھی اور وہ تین روز کی چھٹی پر گھر جاتا ہوا شعیب کے گھر رات گزارنے کی غرض سے آیا تھا۔ دونوں گھر کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سرفراز اپنے دِل میں نسیمہ کی راہ تک رہا تھا۔ اِس ایک سال کے اندر سرفراز اور نسیمہ کی قربت، جی اور آپ کی منزل سے گزر کر تم اور تُو کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اُن دونوں کی دوستی کو شعیب اور اُس کے باپ نے بھی اُن کے طور پہ تسلیم کرلیا ہوا تھا۔ آنے سے پہلے سرفراز نے ٹیلیفون پر رابطہ کرکے شعیب سے، جِس کی پوسٹنگ اب سیالکوٹ میں تھی، ملاقات کا وقت طے کرلیا تھا۔ دونوں تین ماہ کے بعد آپس میں ملے تھے اور بہت سی اپنی اور اپنے دوستوں کی باتیں کر رہے تھے۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ نسیمہ ابھی گھر نہ آئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں بریگیڈیئر کرار حسین اپنے فوجی فاؤنڈیشن کے دفتر سے جہاں وہ ڈپٹی مینجر تھے، واپس لوٹے اور سرفراز سے ملنے کے بعد وہیں بیٹھ گئے۔ حال احوال پُوچھنے کے بعد، حسب معمول انہوں نے اپنی سابقہ سروس کی باتیں شروع کردیں۔ شعیب نے بوریت کے انداز میں سرفراز کو دیکھ کر آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں، مگر بریگیڈیئر صاحب اپنی رو میں بولے جا رہے تھے۔

"بہاولپور کی پوسٹنگ کوئی پسند نہیں کرتا۔ گرمی۔ ریگستان۔ نو انٹرٹین منٹ۔ نوجوان افسروں کے لِئے بہاولپور از بیڈ نیوز۔ بٹ آئی لائیکڈ اِٹ ڈیئر۔ میں نے وہاں بٹالین بھی کمان کی ہے اور پانچ سال بعد بریگیڈ بھی کمان کیا ہے۔ ونڈر فل ٹوپوگرافی۔ شکار کے لِئے اِس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔ اب تو سنا ہے بڑے بڑے عرب شیخ وہاں شکار کے لِئے آتے ہیں۔ ابو دابی اینڈ واٹ ناٹ۔ بسٹرڈ کا شکار کرنے آتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اُن کی مردانگی کے لِئے مفید ہے۔ ہاہاہا۔۔۔" بریگیڈیئر صاحب نے اپنا مخصوص فلک شگاف قہقہہ بلند کیا، جس کی گرج سڑک کے پار تک سنی جاتی تھی۔ قہقہے کی لرزش سے اُن کی مونچھیں اُچھلتی رہیں۔ "تم نے سڑک پر سفر کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں کی دیواروں پر سب سے زیادہ قوتِ مردانگی کے اِشتہار ہوتے ہیں۔ جتنے

بیک ورڈ لوگ ہوتے ہیں اُن کو سب سے زیادہ اپنی قوت مردانگی کی فکر ہوتی ہے، کیونکہ
وہی ایک میدان ہے جہاں وہ اپنا جھنڈا گاڑ سکتے ہیں۔ ہاہاہا۔۔۔۔"
"پاپا۔۔۔" شعیب نے ناپسندیدگی کے لہجے میں کہا۔
"شبو، دِس از دا ٹروتھ۔ بسٹرڈ تو ایک عام سا پرندہ ہے۔ اس کا گوشت بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ مردانگی وردانگی آل نان سینس۔ یہ تیل کے پیسے والے عرب دنیا کے سب سے بزدل لوگ ہیں۔ بسٹرڈ از ناٹ گوئنگ تو وِن دیم اے وار۔"
"مجھے تو بہاولپور اس لیے پسند نہیں کہ دُور ہے۔ تین دِن کی چھٹی آؤ تو دو دِن سفر میں ہی گزُر جاتے ہیں۔"
"شبو تو اب پاس ہی بیٹھا ہے، دو گھنٹے کا سفر ہے، پھر بھی مہینہ مہینہ بھر دکھائی نہیں دیتا۔ مگر بہاولپور کے ریگستانوں کی کیا بات ہے۔ پھر چولستان کے علاقے میں چلے جاؤ تو اور ہی دُنیا ہے۔ وہاں کی زمین میں سوائے خُود رو جھاڑیوں کے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں علم ہے سرفراز، کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک وہاں کے لوگ صرف دودھ اور گوشت پر زندہ رہتے تھے۔ نہ اناج کھاتے تھے نہ سبزی۔ مویشیوں کے ریوڑ رکھ لیتے تھے، جو جھاڑیاں کھا کھا کر پلتے تھے۔ اُن کے مالک اُن ریوڑوں کو کھاتے اور اُن کا دودھ پیتے تھے۔ بس۔ دیٹ اِز اِٹ۔ میرا مزاج شروع سے ریگستانی رہا ہے۔ وہ اقبال کا شعر تم نے سنا ہوگا ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرم، وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل۔ اِن علاقوں کی لمبائی چوڑائی دِل میں بلند ہمتی پیدا کرتی ہے۔ مجھے سروس نے موقع نہیں دیا، ورنہ ابو دابی اینڈ واٹ ناٹ جا کر عربوں کو ایک دفعہ تو پریڈ کرا کرا کے جنگجو بنا دیا۔ بسٹرڈ اینڈ واٹ ناٹ سب بھول جاتے۔"
"مگر سروس میں آپ کی باتیں آج تک لوگ کرتے ہیں،" سرفراز نے کہا۔
"آپ کا نام۔۔۔۔"
"بس نام ہی رہ گیا ہے نا بھائی۔ بات یہ ہے کہ آئی ایم نو باڈیز فول۔ وہ کیا لفظ آج کل رائج ہے، چمچہ؟ بلڈی آفل ورڈ۔ مگر یس، آئی ایم نو باڈیز چمچہ۔ جو بات سچ ہے منہ پر کہہ دیتا ہوں۔ اگر یہ نقص نہ ہوتا۔۔۔۔ یس، اِٹ از اے فالٹ اِن مینی ویز۔۔۔۔ تو آج میں تھری سٹار ہوتا۔ خیر، آئی شڈ ناٹ کمپلین۔ سروس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔

عزت، شہرت، روزی کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑے کے پاس چلا جاؤں، اُٹھ کے ملتا ہے۔ باقی رہ گئی دولت، وہ کوئی اپنے ساتھ تو نہیں لے جاتا۔"

باہر ایک گاڑی آ کر رُکی۔ اُس میں سے نسیمہ اُتری۔ وہ سڑک پر کچھ دیر رُکی جھک کر کار کی کھڑکی میں سے اپنی دوستوں سے بات کرتی رہی۔

"یہ چھمی بھی آج کل عجیب چکر میں ہے،" بریگیڈ صاحب نے دونوں لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اِس سیاسی پارٹی کے بارے میں جذباتی ہو رہی ہے۔ جلوسوں میں جاتی ہے۔ تمہیں اِس کی مصروفیتوں کا علم ہے؟"

"کبھی تھوڑی بہت بات ہوتی ہے۔" شعیب نے کہا۔ سرفراز کی آنکھیں سڑک پہ لگی تھیں۔

"السلام علیکم،" نسیمہ نے لان میں قدم رکھ کر گرمجوشی سے کہا۔ اُس نے اپنے باپ کو ماتھے پر چوما اور کرسی کھینچ کر اُس کے برابر بیٹھ گئی۔

"کب پہنچے؟"

سرفراز نے کلائی اُٹھا کر گھڑی دیکھی۔ "ایک گھنٹہ ہو گیا۔"

"مَیں ایک گھنٹہ پہلے ہی آ گئی ہوتی۔ بس دیر ہو گئی۔"

"گاڑی میں کون تھا؟" شعیب نے پُوچھا۔

"نصیبہ۔ اُس کو کسی سے ملنے جانا تھا، رُک نہیں سکی۔ سلام بھیجا ہے۔ کتنے دِن کی چھٹی ہے؟"

"دو دِن کی۔"

"شبو کہہ رہا تھا تین دِن کے لیئے آؤ گے۔"

"سنڈے ملا کر تین دِن ہی بن جاتے ہیں۔"

"سنڈے بھی کوئی دِن ہوتا ہے؟ سنڈے کو تو مینڈک بھی چھٹی کرتے ہیں۔"

"مینڈک؟"

"ہاں۔ یہ دیکھو،" نسیمہ نیچے گھاس کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ "شام ہوتے ہی نکل آتے ہیں، مچھر کھانے کے لئے۔ اتوار کو یہ بھی نہیں نکلتے۔"

سرفراز ہنس پڑا۔

"جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے گنے ہیں۔ اتوار کو صرف دو چار پینو قسم کے نکلتے ہیں۔ باقی چھٹی کرتے ہیں۔"

ملازم نے آکر پُوچھا۔ "صاحب چائے اَور بناؤں؟"

"ہاں ہاں بھئی۔ چائے پلاؤ۔" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔" نسیمہ بولی۔

"وہ بھی کھالیں گے۔ اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔ تم پھر کسی جلوس میں گئی تھیں؟"

"پاپا آپ کیا جلوس جلوس کرتے رہتے ہیں۔ جلوس نہیں ہوتے، جلسے ہوتے ہیں۔"

"اَور یہ جو لوگ سڑکوں پر جھنڈے لے کر ناچتے پھرتے ہیں۔"

"میں اُن میں نہیں جاتی۔"

"تم لوگ اِن ناتجربہ کار سیاست دانوں کے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔ مجھے سمجھ نہیں آتی۔"

"تجربہ کاروں نے ہمارے مُلک کی جو دُرگت بنائی ہے اُسی کی وجہ سے ناتجربہ کار آئے ہیں۔ بہرحال، نئے لوگ نہیں آئیں گے تو سلسلہ کیسے چلے گا۔"

"صرف آپ کا لیڈر ہے جسے کچھ نہ کچھ لوگ جانتے ہیں۔ باقی سب رِف رَیف ہے۔"

"ہمارے مُلک کا نوے فیصد رِف رَیف ہی ہے، جسے کوئی نہیں پُوچھتا۔"

"اِن لوگوں میں کیا خاص بات ہے جو آپ کو اپیل کرتی ہے۔"

"رِف رَیف میں؟"

"ڈونٹ بی سلی۔ اِس پارٹی میں۔"

"سب سے پہلے تو یہ غریبوں کے حق میں ہیں۔ دُوسرے یہ لبرل لوگ ہیں۔ سوسائٹی کی گھٹن کو دُور کرنے والے ہیں۔ آپ کبھی چل کر دیکھیں، ایسے ایسے حیرتناک واقعات ہوتے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں، آج کے جلسے میں بڑے بڑے گھروں کی عورتیں اپنی مائیوں کے ساتھ، جن کو وہ عام طور پر چھُونا بھی پسند نہیں کرتیں، ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناچ رہی تھیں۔"

"اِسی لِیے تو لوگ آپ کے لیڈر کو شعبدہ باز کہتے ہیں۔"

"پاپا لوگ نہیں کہتے لوگ تو وہاں چل کر جاتے ہیں۔ ایسا دشمن کہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ شعبدہ بازی ہی ہے تو ہمارے مُلک کو شعبدہ باز کی ہی ضرورت ہے۔"

"بی سائیڈز، ہی اِز ڈِس لائل۔" بریگیڈیر صاحب نے کہا۔

کچھ دیر کے لِیے چاروں پر ایک نیم کشیدہ خاموشی چھاگئی۔ نسیمہ تازہ چائے بنا رہی تھی۔

"آپ لوگ چائے پئیں گے؟" اُس نے شعیب اَور سرفراز سے پُوچھا۔

سرفراز نے اِثبات اَور شعیب نے نفی میں سَر ہلایا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ گھروں کی بتیاں جل چکی تھیں۔ تینوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

"پاپا اِن مچھروں کا کوئی انتظام کریں،" شعیب نے ہوا کے اندر مچھر مارنے کی کوشش میں تالی بجائی۔ "سپرے کرائیں۔"

"کراتا ہوں۔ دُوسرے دِن پھر آ جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے، ڈبلیو۔ایچ۔او کی ٹیم مچھر مارنے کے لِیے آئی تھی۔ کراچی میں ہی ہار کر واپس چلی گئی۔ اُن کی رپورٹ تھی کہ وہ نارمل مچھر مارنے آئے تھے جس کی اُڑان دو سو گز تک ہوتی ہے۔ ہمارے مچھر ایک میل تک اُڑتے ہیں۔ اب وہ نیا ایکوپمنٹ لے کر آ رہے ہیں۔ یہاں سٹرانگ سٹف کی ضرورت ہے۔"

"اِتنا سٹرانگ نہ ہو کہ بندے ہی مرنے لگیں،" سرفراز ہنس کر بولا۔

"اِس کی بھی ضرورت ہے۔ ہاہاہا۔ دیکھتے نہیں شہر میں گاڑی چلانا مشکل ہو گیا ہے۔"

"پاپا۔۔۔" نسیمہ احتجاجاً بولی۔

"تمہارے جلوس بھی اِسی لِیے نکلتے ہیں۔ نومینی پیپل۔ بریڈ اینڈ سرکسز۔"

"ڈونٹ سٹارٹ آن دیٹ اگین، پلیز۔" نسیمہ نے کہا۔

"یہ سب باتیں ٹھیک ہیں بھئی،" بریگیڈیر صاحب اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ "مگر ووٹ؟ ووٹ نہیں ملیں گے۔ ووٹوں کی اس مُلک میں اَپنی میکینکس ہے۔"

وہ لان کو پار کر کے جا رہے تھے کہ نسیمہ نے آنکھ سے شعیب کو اشارہ کیا۔

"پاپا، ہم ذرا باہر جا رہے ہیں" شعیب نے کہا۔ "چابیاں تو دیں۔"

بریگیڈیئر صاحب نے پتلون کی جیب سے کار کی چابیاں اُن کی طرف اچھال دیں، جنھیں سرفراز نے ہوا میں پکڑ لیا۔

"پٹرول اپنا ڈلوانا" بریگیڈیئر صاحب بولے، "بلکہ ٹینک فل کرا کے لانا۔ ہاہاہا۔۔۔"

"کہہ دو کھانا باہر کھائیں گے،" نسیمہ نے آہستہ سے کہا۔

"پاپا، کھانا باہر کھائیں گے،" نسیمہ نے آواز دی۔

بریگیڈیئر صاحب نے مڑے بغیر جواب میں برآمدے سے ہاتھ ہلا کر الوداع کی اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلے گئے۔

سردیوں کی آسودہ، چمکیلی دُھوپ زمین اور آسمان پہ پھیلی تھی۔ موسم کیا بدلا تھا کہ معلوم ہوتا تھا مُلک بھر کی رُت بدل گئی ہے الیکشن کا دُوسرا دِن تھا اور تقریباً سارے نتائج موصول ہو چکے تھے۔ انھیں دیکھ کر پارٹی کے اپنے لوگوں نے، بڑے بڑے لیڈروں تک نے انگلیاں دانتوں میں دبالی تھی اور دشمن ہوش گنوا بیٹھے تھے۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ صرف ایک طبقہ تھا، چھوٹے چھوٹے ورکروں، مزدوروں کسانوں اور غریب لوگوں کا، جن کا اعتبار پہلے دِن سے قائم تھا۔ جس اعتبار نے اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا کی تھی اور اُس میں آخر دِن تک بال نہ آیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ووٹوں کی "میکینکس" کا علم تو نہ رکھتے تھے مگر جنھوں نے اپنے پاؤں پہ چل کر پرچیاں ڈالی تھیں اور اُس مقام کو پہچانتے تھے جہاں اُن کا پسینہ گرا تھا۔ انتخابات کے نتائج سے وہ نہ حیران ہوئے نہ پشیمان۔ انھیں علم تھا کہ ایسا ہو گا۔ یہ وہ نسل تھی کہ پہلی بار جس کا بھروسہ اپنے خیال پہ، اپنے لیڈر پہ، اپنے خُدا پہ اور اپنے دِل پہ قائم ہوا تھا۔ جس وقت سے اِس اعتبار کی شکل اُن کے اندر پیدا ہوئی تھی اُس وقت سے اِن کے اندر ذرہ برابر شک پیدا نہ ہوا!

تھا۔ بڑے بڑے سیاستدانوں کی زندگیاں ان نتائج نے اُدھیڑ کر رکھ دی تھیں۔

غریب لوگوں کی یہی قوم تھی جو اعجاز کا اپنا حلقہ تھا۔ اُس کے حلقے میں کوئی تجربہ کار سیاستدان نہ تھا، صرف وہی لوگ تھے جن کی آنکھوں کی چمک اب دوبالا ہو گئی تھی۔ اعجاز کی سکیم کامیاب رہی تھی۔ آصف شاہ اور شیخ نصیر کی کشمکش جب بڑھی تو باری باری اعجاز کے پاس مدد مانگنے کو آئے۔ آخر میں پارٹی نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ٹکٹ نہ دیا، بلکہ قومی حلقے کا ایک کریانے کے دوکاندار کو اور صوبائی کا ایک چھوٹے آڑھتی کو دیا، جو دونوں اکثریت سے کامیاب ہُوئے تھے۔ یہ دونوں اعجاز کے پرانے ساتھی اور احسان مند تھے اور اعجاز نے ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج وہ دونوں پچھلے پہر کو اپنے اپنے ڈیروں سے فارغ ہو کر، اپنے اپنے حمایتوں کے ہمراہ جن کی تعداد حیرت انگیز طور پر دُگنی چوگنی ہو چکی تھی، اعجاز کے دفتر پر آ بیٹھے تھے۔ اعجاز نے پہلے سے بڑی بڑی رنگ برنگ چھتریوں کا انتظام کر رکھا تھا جو زمین میں گڑی تھیں۔ کچھ لوگ چھتریوں کی چھاؤں میں اور باقی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ اعجاز نے اپنی جیب سے چائے کی دیگیں چڑھوائی تھیں۔ دو ڈھول والے دھماھم ڈھول بجا رہے تھے۔ سب مزدوروں نے آج کے روز چھٹی کر رکھی تھی اور شوخ رنگوں والے کپڑے پہنے، ڈھولچیوں کے گرد دھوپ میں کھڑے، موٹے موٹے تڑکے ہُوئے سفید پیالوں میں سُڑک سُڑک کر چائے پی رہے تھے۔ ڈھول والوں کی ٹولی کی دو فربہ اندام بوڑھی عورتیں ہاتھ بلند کئے ڈھول کی تال پر ناچ رہی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک رُکا کھڑا تھا، مگر کسی کو پروا نہ تھی۔ کاروں، بسوں اور ٹرکوں والے فتح کی دُھن میں ہارن پر ہارن بجائے جا رہے تھے۔ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ نئے منتخب شدہ ایم-این-اے اور ایم-پی-اے سید باقر علی شاہ اور مختار ڈوگر اپنے اپنے گروہ کے ساتھ وہاں پہنچے تو اعجاز باہیں کھول کر اُن سے گلے ملا۔ پھر سب ایک دُوسرے سے ملنے، باتیں کرنے اور قہقہے لگانے لگے۔ کئی نئے لوگوں نے بے اختیار ہو کر ڈھول کی دھمک پر ناچنا شروع کر دیا۔ ایک بڑی چھتری تلے بچھی کرسیوں پر شاہ صاحب، ڈوگر صاحب اور اعجاز آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ منظور نے ایک آدمی کو آواز دی۔ "چینی کی پیالیاں صاف کر کے سپیشل چاہ لے کر آ۔" کچھ دیر کے بعد میراثیوں نے ڈھول بجانے بند کر کے اپنے چٹکلے شروع کر دیئے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیاہ رچا ہوا ہو۔ مزدور، محنت کش اور دیگر غریب

لوگ اس بیباکی کے ساتھ ممبران اسمبلی سے مخاطب ہو رہے تھے گویا اُن کا دامن پکڑ کر کھینچ رہے ہوں۔

"شاہ جی، ایک ایک وعدہ جو کیا ہے وہ پُورا کرنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ بڑی بڑی اسمبلیوں میں جا کر اپنے وعدوں کو بھول جائیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

"ہاں جناب، شاہ صاحب اَور ملک صاب' یہ یاد رکھیں کہ یہ موکا پھر بھی آئے گا جب آپ ووٹ مانگنے دبارہ آئیں گے۔"

"بھائی کیوم سولہ آنے درست بات کر رہا ہے جی،" ایک آدمی، جس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ سدا غصے کی حالت میں رہتا ہے' بولا' "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ منافکوں کی نشاندہی کی جائے اَور انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ آج ہی آپ کے آگے منا فکین کی کتاریں لگ جائیں گی جو آپ کی وفاداری کا حلف اُٹھائیں گے۔ اگر اجازت دیں تو میں ابھی ان کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔"

باقر علی شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے چپ رہنے کی تلقین کی۔ "یہ خوشی کا وقت ہے میرے بھائی۔ آج کے دِن یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ ان کاموں کے لِئے بہت وقت پڑا ہے۔"

اعجاز آگے جھک کر آہستہ سے بولا۔ "اُٹھ کر دو لفظ کہہ دیں۔ ضروری ہے۔ لوگ خوش ہو جائیں گے۔" باقر علی شاہ گویا پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اعجاز اُٹھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ باتوں میں مصروف لوگوں نے ایک دُوسرے کو اعجاز کی جانب متوجہ کیا اَور اُس کی چھتری کے گرد جمع ہونے شرُوع ہو گئے۔ باقر علی شاہ نے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے سامنے کے لوگ بیٹھ گئے۔

"میرے بھائیو، دوستو، ساتھیو" باقر علی شاہ نے بولنا شرُوع کیا۔

"ہم وطنو" مختار ڈوگر نے یاد دِلایا۔

"اَور ہم وطنو" باقر علی شاہ نے کہا۔ "میں اَور میرے ساتھی مختار ڈوگر صاحب یہاں آپ سب کا شکریہ ادا کرنے کے لِئے حاضر ہُوئے ہیں۔ میں اُپنے دِل کی گہرائیوں سے آپ' اَور خاص طور پر ملک اعجاز کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے دِن رات ایک کر کے ہماری کامیابی کا سبب بنایا۔ باقی کچھ بھائیوں نے وعدوں کا ذکر کیا ہے۔ تو جناب والا' ہم کوئی

سرمایہ دار، جاگیردار، صنعتکار یا وڈیرے نہیں ہیں۔ ہم عوام میں سے اُٹھے ہیں، اور عوام میں ہی رہیں گے۔ اپنے وعدے پُورا کرنے کی خاطر، آپ کی توقعات پر پُورا اُترنے کی خاطر اگر ہمیں بڑے سے بڑے آدمی کا دامن بھی کھینچنا پڑا تو ہم گریز نہیں کریں گے، آپ کی خاطر اپنے قائد کے آگے بھی بولنا پڑا تو ہم اِس سے کبھی نہیں جھجکیں گے۔ خُدا کے فضل وکرم سے آپ دیکھیں گے کہ ہم ہمیشہ کے لئے آپ کی اُمیدوں پر پُورے اُتریں گے۔ سن سنتالیس کے بعد آج پہلی بار عوام کی فتح ہوئی ہے، ہم اِس فتح کا احترام قائم کریں گے، اِس کی حرمت کی خاطر جان لڑا دیں گے۔ مزید براں، بھائیو یہ وعدوں کی بات نہیں، وعدے پینٹ کوٹ والے کرتے ہیں۔ ہم،" اُس نے ہاتھ سے شلوار کا پائنچہ اٹھا کر دکھایا، "قائد سے لے کر ورکر تک موٹا جھوٹا پہننے والے لوگ ہیں۔ ہم وعدوں کی نہیں، حقوق کی بات کرتے ہیں۔ حقوق کی بات آج تک کس نے کی ہے؟ حقوق مانگنے سے نہیں ملتے۔ حقوق درخواست کرنے سے نہیں ملتے۔ حقوق ہاتھوں سے پکڑ کر حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ہم،" باقر شاہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا، "حقوق حاصل کرنے والوں میں سے ہیں۔ بولو، قوت کا سرچشمہ----"

"عوام ہیں----" سامعین نے ایک ساتھ کہا۔

"ذرا زور سے---- عوام----"

"زندہ باد،" مجمعے نے نعرہ لگایا۔

"اوئے تمہارا گلا بیٹھ گیا ہے؟ ذرا زور لگا کے بولو تا کہ دشمنوں کے کان بھی کھلیں۔ عوام---" "زندہ باد----" جواب میں لوگ دھاڑ کر بولے۔

باقر علی شاہ فاتحانہ انداز میں مڑ کر بیٹھ گیا۔ چند ہی منٹ کے بعد وہ اور مختار ذوگر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ اب مجمعے نے اُن کے نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ڈھولچی، جن کو دونوں ممبران اسمبلی بیس بیس روپے دے کر گئے تھے ایک بار پھر زور شور سے ڈھول پیٹنے لگے۔ اعجاز اُن دونوں کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دُور تک ساتھ چل کر گیا۔ اُن کے پیچھے اُن کے حمایتوں کا گروہ تھا۔ ڈھول کی ولولہ انگیز دھمک دُور تک اُن کا پیچھا کرتی رہی۔

اِقتدار کا چمکدار ستارہ جو اِن سیدھے سادھے لوگوں کے گمان میں راتوں رات اِن کی مٹھی کے اندر آ چکا تھا اور "طاقت کا سرچشمہ" بننے کے خواب دِکھلا رہا تھا، جلد ہی انگلیوں کے بیچ سے چھنتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ انتخاب ہو چکے تھے، مگر ممبران ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ اسمبلی کا اجلاس اب تک نہ ہو سکا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی صورت نظر آ رہی تھی۔ ڈِکٹیٹرشپ کی مختلف بوتلوں میں بند جو حقوق کے جِن ہاتھ پیر مارتے رہے تھے جب بوتلیں توڑ کر باہر نکلے تو جمہوریت نے ایک عفریت کو جنم دے دیا تھا۔ ایک طرف مُلک کے دونوں بازوؤں کی آپس کی چپقلش خطرناک حد تک گہری ہوتی جا رہی تھیں، دُوسری طرف مارشل لاء کی جکڑ ابھی قائم تھی۔ لوگوں کے ذہن اِنتشار کی حالت میں تھے۔ اِس صورتِ حال میں پارٹی کی جانب سے ورکروں، اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کی طرف سے مزدوروں کو جو ہدایات موصول ہو رہی تھیں، اُن کی کوئی ٹھوس شکل یا واضح انداز نہ تھا۔ صرف گول مول الفاظ میں کہا جا رہا تھا کہ اپنی تحریکوں کو فعال بنائے رکھو، انھیں مرنے نہ دو، سُست نہ ہونے دو، دباؤ جاری رکھو، جس نہج پر یہ پہنچ چکی ہیں اُسے برقرار رکھو۔

سیاست دانوں کے مقابلے میں اعجاز کا کام نسبتاً آسان تھا۔ سیاست دانوں کے ہاتھ میں کوئی کارگر شے نہ تھی، سوائے کاغذ ممبری کے، اور سیاست کے اصل فوائد---- سرکاری محکموں اور افسروں سے اپنے لوگوں کے کام نکلوانے کے عوامل---- اُن کی دسترس سے باہر تھے، جبکہ اعجاز کا روزمرہ کا کام حسبِ سابق جاری تھا، کارخانے چل رہے تھے، تنظیم قائم تھی، چھوٹے چھوٹے مسائل پیدا ہو رہے تھے، سلجھائے جا رہے تھے، کشمکش رواں تھی۔ مگر اب اعجاز کے اندر ایک تبدیلی آ چکی تھی۔ اُس کا دِل بڑی حد تک اِس اپچی پچی کلم سے اُٹھ گیا تھا۔ اس روزانہ کے معمول میں، جس کے اندر وہ جذب رہا کرتا تھا، اب اُس کے لِئے وہ کشش نہ رہی تھی، جو پہلے تھی۔ بات کو کسی حد تک مختصر اور سادہ کر کے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اُسے سیاست کا چسکہ پڑ گیا تھا، مگر یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اُس کا جذبہ ایک سیڑھی اُوپر کی بلندی پہ پہنچ گیا تھا۔ جس میں اب ساری قوم کے غریبوں کی حالت سدھارنے کا تصور شامل تھا۔ اپنے حلقے کے سیاست دانوں سے اُس کا

رابطہ تقریباً روز مرہ کی بات تھی۔ یہ لوگ تاریخی عوامل اَور کچھ قسمت کے زور پر منتخب ہو گئے تھے، مگر انہیں اِس زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اعجاز نے جو سکیم الیکشن کے دوران سوچی اَور چلائی تھی اُس کی مکمل کامیابی نے اُس کے اندر اعتماد کا ایک نشہ پیدا کر دیا۔ مزدور تحریک میں کام کرتے ہُوئے اُسے سالہا سال گزُر چکے تھے، مگر اب آ کر پہلی بار اُسے سیاست کی اصل رمزوں کا علم ہوا تھا۔۔۔۔ کہ اِقتدار میں ہونے یا اقتدار سے باہر ہونے کی شرط سے بالاتر، سیاست کے کاروبند میں ایک اپنا اختیار قوت کا احساس ہوتا ہے۔ جس کی خاطر لوگ بڑے بڑے کام چھوڑ کر عمریں گنوا دیتے ہیں۔ اعجاز کی اہمیت میں اضافہ ہونے کے ساتھ بہت سی نئی جگہوں پر اُسے جلسوں میں شمولیت کی دعوتیں موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اُس کی تقریر میں روانی آ گئی تھی۔ اب اُسے تقریر لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ دو چار بنیادی تقریروں کو جوڑ توڑ کر، موقع کے مطابق خاصی پُراثر فی البدیہہ تقریر کی جا سکتی تھی۔ جب وہ سٹیج پہ کھڑا ہو کر دو سو مزدوروں کو خوش آئند مستقبل کی خبر سناتا تو اِس مستقبل کے بے اصل ہونے کے باوجود اعجاز کو اَپنے دِل میں یقین ہوتا کہ جو بات وہ کر رہا ہے وہ سو فیصد سچ ہے اَور وہ یہ بات کہنے کا حق بردار ہے۔ اِسی یقین کی بنیاد پر اَپنی نظروں میں اُس کی حیثیت قائم تھی، اَور اِسی عزم کے باوصف، تالیوں اَور زندہ باد کے نعروں کی آوازیں سن کر خُود اختیاری کا جذبہ اُس کے اندر ایک نشہ آور دواء کی مانند پھیل جاتا تھا۔ ایک روز اچانک اُسے خیال آیا کہ یہ کیفیت اُس نئے نویلے احساس سے مشابہہ تھی جو اُس کے اندر اُس روز پیدا ہوا تھا جب، برسوں پہلے، اُس نے سڑک کے بیچ واویلا کرتی ہُوئی اُس عورت، کنیز کو دیکھا تھا۔ اُس احساس کے اچنبھے کو اَور کوئی شے پہنچ نہ پاتی تھی، سوائے اُس موقع کے جب وہ بھری رفتار سے تقریر کر کے بیٹھتا اَور سینکڑوں لوگوں کے نعروں کی آوازیں اُسے سر پہ اُٹھا لیتی تھیں۔ ممکنات میں سے ہے کہ یہ ایک کھوکھلا ڈھانچہ تھا جس کے سہارے وہ یہ کھیل جاری رکھے ہُوئے تھا، مگر اِسی یقین اَور عزم کے بل پہ اُس کے دل میں غریبوں کی تقدیر بدلنے کا اِرادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اغلب یہ تھا کہ اَپنی توصیف کا نشہ اَور غریبوں کا درد، دونوں ایک دُوسرے کو سہارا دینے کا سبب بن رہے تھے۔

اعجاز کے گرد منڈلانے والے لوگوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی افواہ اُڑتی کہ جیسے ہی نئی حکومت نے انتظام سنبھالا اعجاز کو ترقی دے کر لیبر کی منسٹری میں کسی اہم

سرکاری عہدے پر تعینات کر دیا جائے گا۔ کبھی خبر آتی کہ ملک اعجاز لیبر کے وفد کے ساتھ بیرونِ ملک دورے پر جا رہے ہے۔ مگر یہ موصولات زیادہ تر اُس کے اپنے لوگوں کی اختراعات ہوتی تھیں۔ اب خُود اُس کے اپنے حواری اکٹھے ہونے شُروع ہو چکے تھے۔

اعجاز کو سکینہ نے کئی بار کہہ چکا تھا کہ الیکشن سے نبٹ کر وہ اپنی فارغ زمین کو فصل کے لیے تیار کرے گا، مگر اُسے اسکی فرصت ہی نہ ملی تھی۔

"کھائیں گے کہاں سے؟" سکینہ کہتی، "گیہوں نہ بوئی تو آٹا کسی سے اللہ واسطے مانگ کر لائیں گے؟"

"ایسا موقع آیا تو خرید بھی سکتے ہیں،" اعجاز جواب دیتا۔ "گنا تو کھڑا کھڑا بک ہی گیا ہے۔"

"اور زمین خرید کر سَر پر مارنے کے لیے رکھی ہے؟"

اعجاز وقت کو ٹالتا ہی رہا۔ بیشتر اوقات جب وہ سو کر اُٹھتا تو پہلے ہی کوئی نہ کوئی آدمی آکر اُس کا انتظار کر رہا ہوتا اور اعجاز ناشتہ کرکے سیدھا شہر چلا جاتا۔ آخر جب سکینہ نے وقت ہاتھ سے نکلتا ہوا دیکھا تو گھر سے نِکل پڑی۔ اعجاز کے پیچھے اِصرار کرکے اُس نے جو کالا برقعہ سلوا رکھا تھا، اور جسے اُس نے صرف ایک مرتبہ کسی کی شادی پر نقاب اُلٹ کر پہنا تھا، وہ اُس نے تہہ کرکے صندوق میں رکھ دیا، اور بدن پر موٹا کھیس لپیٹ کر رقبے پر پہنچ گئی۔ چند روز کے بعد گل افروز نے اطلاع دی کہ منڈی چلنی شُروع ہوگئی ہے اور مال بک رہا ہے۔ سکینہ نے چند روز انتظار کیا، اور جب سٹاک کیا مال آدھا رہ گیا تو اُس نے گل افروز کو بیلنا چلانے کا حکم دیا۔ ایک طرف سے کماد کاٹ کاٹ کر شوگر مل کے لِیے لادا جا رہا تھا۔ مخالف جانب سے گڑ کے لئے گنا کاٹا جانے لگا۔ سارا کاروبار اب سکینہ کی نگہبانی میں چل رہا تھا، سوائے منڈی کی "اگراہی" اور شوگر مل کے نقد لین دین کے، جو اعجاز کے ہاتھ میں رہے۔ صرف پہلے روز اعجاز نے سکینہ سے اِتنا پُوچھا تھا۔

"تو نے بیلنا چلوا دیا ہے؟"

"ہاں،" سکینہ نے آرام سے جواب دیا تھا۔

"کماد تو مل کو بک چکا ہے۔"

"مل جتنا وصول کرے گی اُتنے کے پیسے دے دے گی۔ سارے کماد کا کوئی ٹھیکہ

ہے؟"

اعجاز مٹہ سوڑ کر چپکا ہو رہا تھا۔ دراصل اُس کے ذہن سے ایک بار اُتر گیا تھا۔ پھر چند دن کے بعد وہ شہر سے لوٹا تو اُس کے خالی مربعے پر چاچا احمد ہل چلا رہا تھا۔ اُس نے علیک سلیک کے علاوہ چاچے سے کوئی بات نہ کی۔ مگر گھر آ کر سکینہ سے بولا،

"چاچا میرے رقبے پر ہل چلا رہا ہے۔"

"وہ نکل گیا ہے اور گیہوں کی بیائی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ تم بھی اِدھر اُدھر نظر ڈالو تو تمہیں پتا چلے۔ دُوسروں کی فصل دو دو ہاتھ کھڑی ہو گئی ہے۔ تمہیں تو بس ایک ہی کلم ہے۔ نہ اُدھر سے فارغ ہو گے، نہ فصل کا کچھ کرو گے۔ گھر میں تینوں وقت کا کھانے والی چار جانیں ہیں۔ پھر چار آدمیوں کی روٹی بیلنے پر جاتی ہے۔ پچھیتری فصل ہو گی، پر دانے تو اندر آئیں گے۔ ابّے سے جتنا بھی ہو سکا، چار کلے، چھ کلے، روٹی تو چلے گی۔"

اعجاز اِس بار بھی چپ رہا۔ اُس کا دماغ کہیں اَور اُلجھا ہوا تھا۔ ورکروں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ کسی کا کوئی کام نہ ہو رہا تھا۔ مُلک کے دونوں بازوؤں کے سیاسی جھگڑے گمبھیر شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ فوج تصفیہ ہونے نہیں دے رہی کیونکہ بنگالی حکومت سے احکام لینے پر تیار نہیں۔ اِن حالات میں پارٹی کے لیڈر نے اپنے ورکروں کو، خاص طور پہ طلباء کو سڑکوں پہ نکل لانے کی دھمکی دے دی تھی۔ شہر میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہونے کی خبریں آ رہی تھیں۔ تاریخ مقرر نہیں ہُوئی تھی، مگر پارٹی کے لوگ ابتدائی انتظامات میں مصروف تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اِس بار اعجاز سے براہِ راست رابطہ نہ کیا گیا تھا اَور نہ اطلاعات بہم پہنچائی جا رہی تھیں۔ کئی پیغامات بھیجنے کے بعد بھی حلقے پارٹی کے سربراہان کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ جیسے جیسے یہ بات بڑھتی جا رہی تھی، اعجاز کی حیثیت مشکل تر ہوتی جا رہی تھی۔ اگر یہ بات اِس حد تک نہ جاتی تو اعجاز اَپنے دفتر سے اُٹھ کر پارٹی کے دفتر میں چلا جاتا اَور وہاں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کی صفائی ہو جاتی۔ مگر محض اتفاقیہ طور پر اب حالات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ اُس کے دِل میں میل آنی شروع ہو گئی تھی۔ اب چل کر وہاں جانا اُسے اَپنی حیثیت کو کم کرنے کے برابر نظر آنے لگا تھا۔

"حاسد ہیں، ملک جی،" منظور اُس سے کہتا۔ "آپ کی پوزیشن کو دیکھ نہیں سکتے۔

جب ضرورت تھی تو میاؤں میاؤں کرتے روز آ جایا کرتے تھے۔ ایک دن الٹے پاؤں چل کر آئیں گے۔ یہ لوگ کل کلاں کی پیداوار ہیں۔ آپ کی تو ساری عمر کی خدمت ہے۔"

آخر ایک روز اتفاق سے سڑک پر اعجاز کی باقر علی شاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ "شاہ صاحب" اعجاز نے خوش خلقی سے کہا۔ "بڑی دیر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا حال چال ہیں۔ آپ تو لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے ہیں۔"

"کیا حال پوچھتے ہیں ملک صاحب۔ آپ سے کونسی بات چھپی ہوئی ہے۔ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ بے چینی ہی بے چینی ہے، کچھ پتا نہیں چلتا کہ کدھر سے آ رہے ہیں، کدھر جا رہے ہیں۔ آپ خوش قسمت ہیں، ہزار دو ہزار لوگ کنٹرول کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں پوچھیں، لاکھوں آدمی ہیں، ہر کوئی اپنی بولی بولتا ہے، ہمارا گریبان پکڑتا ہے۔ سچی بات ہے، آپ سے کیا چھپی ہوئی ہے۔ میں دکانداری کر کے پیٹ پالتا تھا۔ اب اس بکھیڑے میں پڑ کے میرا تو کاروبار تباہ ہو گیا ہے۔ اپنی حکومت آئے تو کوئی وسیلہ بنے۔ اب تو اِسی اُمید پر بیٹھے ہیں۔"

"درست فرمایا آپ نے شاہ صاحب۔ مگر آپ کا ہی نہیں، سبھی کا حال ایسا ہے۔ آپ کو میں اپنے گھر کی بات بتاؤں، میری پچیس کلے زمین خالی پڑی ہے، اِتنی فرصت نہیں ملی کہ اُس میں سال کے دانے ہی بیج دوں۔ اب آ کر میری گھر والی نے اپنے باپ سے کہا ہے کہ دو چار کلے تیار کر کے بیائی کر دے۔ اب وہ ساٹھ سالہ آدمی میری سال کی گندم بیج رہا ہے۔ یہ تو حال ہے ہمارا۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ یہ بتائیے کہ کسی جلسے ولسے کی خبریں آ رہی ہیں۔ کہاں ہے، کیسا ہے، کچھ ہمیں بھی بتائیں۔"

"ہمیں تو ملک صاحب پارٹی ہیڈ کوارٹر سے یہی اطلاع ملی ہے کہ جلسے کے انتظام کے لیے تیار رہیں اور مزید ہدایات کا انتظار کریں۔ آپ کو بھی لیبر فیڈریشن یا جہاں سے بھی ہدایات آتی ہیں آ جائیں گی۔"

اعجاز بہت ضبط کر چکا تھا۔ آخر بولا۔ "قبلہ شاہ صاحب، گستاخی معاف، عرض یہ ہے کہ الیکشن میں بھی آپ کو کوئی علم نہیں تھا کہ ہمیں کہاں سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ تو کیا آپ ووٹ لینے ہماری فیڈریشن کے پاس گئے تھے؟"

"ارے بھئی ملک اعجاز، تم تو خفا ہو گئے۔ میں کہہ رہا تھا۔۔۔"

"نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اِتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جلسے کے لیے بندے لے جانے کی خاطر ہماری خدمات کی ضرورت پڑی تو پھر فیڈریشن کے چکر ہی لگیں گے۔"

"بھائی، بات تو سنو۔۔۔۔"

"حضور میں نے دس بندوں کے ہاتھ آپ کو اور دس کے ہاتھ ڈوگر صاحب کو پیغام بھیجے ہیں۔ آپ کو اِتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک آدمی کے ہاتھ ہی جواب بھیج دیں۔ میرا کوئی ذاتی مفاد تو ہے نہیں، اگر پارٹی کی کامیابی ہوتی ہے اِس کا سہرا آپ ہی کے سَر ہوگا۔ آپ پارٹی کے نامزد ہیں۔"

"اعجاز، میں پہلی فرصت میں بذاتِ خُود آکر بات کی صفائی کروں گا۔"

مگر کئی روز گزر گئے اور نہ باقر علی شاہ آیا، نہ مختار ڈوگر اور نہ ہی اُن کا کوئی آدمی۔ اعجاز دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اُسے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ جب ایک بار یہ خیال اُس کے دِل میں راہ پا گیا تو پھر چھلانگ پھلانگ کر بڑھتا ہی گیا۔ اعجاز کو اپنی پوزیشن پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی، جیسے کسی نے اُس کے کندھے سے چادر اُچک لی ہو۔ اُسے چادر کا نہیں، لُٹ جانے کا دُکھ تھا۔ اُس نے پچھلے ایک برس کے اندر لیبر کے کام سے ہٹ کر پارٹی کی خاطر کام کیا تھا اور وہ ایسی بدسلوکی کا مستحق نہ تھا۔ اب آکر اُسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ وہ سیاست کے داؤ پیچ سے ابھی واقف نہ ہوا تھا۔ اُس کے ذہن میں کوئی سکیم، کوئی تجویز اِس جال سے بچ نکلنے کی نہ آ رہی تھی۔ اِس جال کی خاصیت ایسی تھی کہ کستا ہی چلا جا رہا تھا۔ اب اُس کے لئے پسپا ہونا دشوار ہو گیا تھا۔

ایک روز اعجاز اُپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ منظور ایک شخص کے ہمراہ داخل ہوا۔ "یہ چیمہ صاحب ہیں،" منظور تعارفاً بولا۔ "آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"اعجاز نے غور سے دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب؟" وہ حیرت سے بولا۔

یہ شخص اُس کا پرانا ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ تھا۔ مگر اُس کا حلیہ اِس قدر بدل چکا تھا گویا کوئی اور ہی آدمی ہو۔ اُس کے بال تمام تر سفید ہو چکے تھے، چہرہ مٹھی میں مروڑے ہوئے کاغذ کی مانند لکیروں کا جال بن گیا تھا، گال پچک کر لٹک گئے تھے اور جسم گھل کر آدھا رہ گیا

تھا۔ اعجاز اُسے پہچان کر اِس طرح چونکا کہ سالوں پہلے اِس شخص کے ہاتھوں اُس کا جو حشر ہوا تھا، وہ تذلیل جس نے اُس کی زندگی کا رُخ موڑ دیا تھا، ثانیۂ اُسے بھول گئی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اسلام علیکم،" اعجاز نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کہاں؟ بیٹھیے۔ تشریف رکھیے۔" ہیڈ ماسٹر چیمہ آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "معاف کیجئے، میں پہلی نظر میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

"جی نہیں،" نواز چیمہ مستقل آنکھیں نیچی کئے بولا۔ "شوگر کا مریض ہوں۔"

"اللہ رحم کرے،" اعجاز نے کہا۔ "آج کل تو اس کا علاج دستیاب ہے۔"

"جی ہاں،" نواز چیمہ ہولے سے بولا، مگر اُس کے سَر کی جنبش سے ظاہر تھا کہ اُس نے سب کچھ آزما کر دیکھ لیا ہے اور مایوس ہو چکا ہے۔

اعجاز چند لمحے تک اُسے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اُسے ماضی کی یاد آ رہی تھی۔ مگر اِس وقت رنج کی بجائے اُس کے دل میں سب سے اُوپر جو احساس تھا وہ سامنے بیٹھے ہوئے اُس شخص کی ہیئت پہ حیرت کا تھا۔

"آپ ہمارے سکول سے تبدیل ہو گئے تھے،" اعجاز نے کہا۔

"جی ہاں،" نواز چیمہ نے جواب دیا۔ "ساہیوال چلا گیا تھا۔ اب دو سال سے باغبان پُورہ گورنمنٹ ماڈل سکول میں ہوں۔"

"اچھا؟ یہ تو اپنا ہی علاقہ ہے۔ ہمیں خبر تک نہیں ہوئی۔ دو سال سے ہیں،" اعجاز حیرانی سے سَر ہلا کر بولا۔ "بہت بڑا سکول ہے۔ ہیڈ ماسٹر ہیں؟"

"جی ڈپٹی ہیڈ ہوں۔ یہاں کے ہیڈ کا گریڈ اُوپر ہے۔"

کچھ سیکنڈ کے لئے پھر خاموشی ہو گئی۔ اعجاز کے دِل میں مختلف اور متضاد جذبات تھے۔ منظور بیٹھا دو انگلیوں سے میز کو بجا رہا تھا، جس کی آواز اعجاز کو ناگوار گزر رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر منظور کو منع کیا۔

"آج اِدھر کیسے آنا ہوا؟" اعجاز نے سنجیدگی سے پُوچھا۔

"نواز چیمہ نے حلق سے دو ایک بار ایسے آواز نکال جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر رُک رہا ہو۔ پھر اُس نے مُنہ کے آگے مٹھی رکھ کر آہستہ سے حلق صاف کیا اور آنکھیں

اٹھائے بغیر کمزور سی آواز میں بولا، "ملک صاحب، میرا کوئی حق نہیں بنتا کہ آپ کے پاس کوئی غرض لے کر آؤں۔ مجھے احساس ہے کہ ایک وقت میں میرے ہاتھ سے آپ کے ساتھ زیادتی ہو گئی تھی۔ میرا کوئی حق نہیں بنتا۔۔۔۔۔۔" وہ رُک گیا۔

"کوئی بات نہیں چیمہ صاحب" اعجاز کچھ توقف سے بولا، "قصہ کیا ہے۔ بتایئے۔"

چیمہ نے عینک اتاری اور جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پہ دبایا، پھر اُسی رومال سے شیشے صاف کر کے عینک ناک پہ لگائی۔ اُس کے بعد وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر خاموش بیٹھ رہا، جیسے اُس کو کوئی بات نہ سوجھ رہی ہو۔

اعجاز چپکا بیٹھا اِنتظار کرتا رہا۔

ایک منٹ کے بعد نواز چیمہ بولا، "میں اپنے کیے پر عمر بھر شرمسار رہوں گا۔"

"چھوڑیئے اُس قصے کو، گیا وقت گزران، جو ہوا اچھا ہوا،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "اگر آپ مجھ سے استعفیٰ طلب نہ کرتے تو آج میں سکول ماسٹر ہی ہوتا۔ ٹھیک ہے ناء؟ چلیے بتایئے کیا بات ہے۔"

"نویں درجے کا ایک طالب علم تھا۔ اُس کی سفارش آئی۔ لڑکا نالائق تھا، مَیں اُسے کیسے پاس کر سکتا تھا۔ اب اُس کے سفارشی نے اُستادوں سے مل کر میرے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک شروع کروا دی ہے۔"

"اِس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کی نوکری پکی ہے۔"

"کہیں دُور دراز کے قصبے میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔" چیمہ نے کہا۔ "سفارشی بارسوخ آدمی ہے۔ اب تو اسمبلی کا ممبر بھی ہو گیا ہے۔"

اعجاز کے کان کھڑے ہوئے۔ "کون ہے؟"

"مختار ڈوگر۔ ٹیچرز یونین کی لوکل برانچ میں ایک عہدیدار اُس کا سگا رشتہ دار ہے۔ اُس کے ذریعے اُس نے یہ کام کروایا ہے۔"

"اچھا آ!" پھر وہ نواز چیمہ سے مخاطب ہوا۔ "یونین میں اُس کے رشتہ دار کا نام کیا ہے؟"

"عرفان ڈوگر۔"

اعجاز کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے،" چند منٹ سوچنے کے بعد وہ بولا، "میں پتا کرتا ہوں کہ یہ کیا قصہ ہے۔ ایک آدھ دِن مُجھے دیں۔"

"اِس کے علاوہ،" نواز چیمہ کی آواز یکدم رندھ گئی، "بڑے لچر الزامات میرے اُوپر عائد کیے جا رہے ہیں۔ میں بوڑھا آدمی ہُوں۔ ریٹائرمنٹ میں ایک سال رہ گیا ہے۔ اب آخری عمر میں یہ سازشی ٹولہ میرے خلاف کھڑا ہو گیا ہے۔ میں فیملی والا آدمی ہُوں۔ میرے بچے اِدھر زیرِ تعلیم ہیں، میں اُن کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ میرے مُنہ میں اَلفاظ نہیں کہ آپ کا شُکریہ اَدا کروں۔ میں شرمسار ہُوں۔ خُدا جانے کس طرح----" اُس کی آواز ٹُوٹ گئی اَور اَلفاظ گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اَور مُنہ ڈھانپ کر رونے لگا۔

"بھئی چیمہ صاحب---- چیمہ صاحب----" اعجاز گھبراہٹ اَور تسلی کے ملے جلے انداز میں بولا، "چیمہ صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ کنٹرول کریں۔ میں سنبھال لوں گا۔ معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ منظور، چیمہ صاحب کو پانی پلا۔"

نواز چیمہ نے رومال میں ناک سنکی، پھر تہہ کر کے اُس سے آنکھیں اَور چہرہ خشک کیا اَور دوبارہ عینک لگا لی۔ پھر اُس نے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے گلاس پکڑا، پانی کا ایک گھونٹ بھرا اَور گلاس میز پر رکھ دیا۔ ایک منٹ تک وہ آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا، پھر اچانک کھڑا ہو گیا۔

"اجازت چاہتا ہوں،" وہ ادب سے بولا۔

"ٹھیک ہے چیمہ صاحب، معاملہ درست ہو جائے گا۔ یہ کام میرے ذمے ہے،" اعجاز نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "فکر نہ کریں۔"

نواز چیمہ جلدی سے ہاتھ ملا کر دفتر سے نِکل گیا۔

اعجاز کو خاموش دیکھ کر منظور بھی چپ ہو رہا۔ کچھ دیر کے بعد اعجاز اَپنے خیال سے نِکل کر منظور سے مخاطب ہوا۔

"تُم ایک کام کرو۔ ٹیچرز یونین کی لوکل برانچ میں جاؤ اَور عرفان ڈوگر کو پکڑو۔ سکُول سے ہی پتا چل جائے گا۔ اُس کو میرا پیغام دو کہ چیمہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔"

"درست،" منظور بولا۔

"تسلی سے بات کرنا، مُنہ پر نہ دے مارنا۔ اُسے سمجھا دینا کہ چیمہ اپنا آدمی ہے۔ اُمید تو ہے کہ اُس کی عقل میں بات آجائے گی۔ ہاں، اگر اُس نے توں تڑاں کی تو پھر اصل پیغام دینا، کہنا کہ چیمہ صاحب کو کوئی زک پہنچی تو یاد رکھنا، ہمیں بھی گُر آتے ہیں، میں برانچ ہی تڑوا دوں گا۔ سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا جی۔"

"مگر کوشش کرنا کہ کام آرام سے ہی ہو جائے۔ چل اب جا، تیری کارستانی بھی دیکھتے ہیں۔"

دو گھنٹے کے بعد منظور وہاں سے لوٹا۔ "بات ہی کوئی نہیں جی۔ بڑے ہی پیار سے کام نکل آیا۔ یہ عرفان ذوگر تو آپ کا گرویدہ ہے۔ کہنے لگا کہ ٹیچر یونین کا پہلا مظلوم تو ملک اعجاز ہی تھا۔ مختار ذوگر کو لیڈر بنے جمعہ جمعہ آٹھ دِن ہوئے ہیں، ملک اعجاز کو تو ہم پوجتے ہیں۔ ملک جی، ایک بات بتائیں۔"

"کیا۔"

"یہ چیمہ ہی تھا جس نے آپ کو نکالا تھا؟"

"ہاں ہاں،" اعجاز بے صبری سے بولا۔ "کئی سال ہو گئے ہیں اِس بات کو۔ اِسی لئے تو شرمندہ ہو رہا تھا۔ بہرحال ----"

"عرفان ذوگر بھی کہہ رہا تھا کہ تعمیل کرنا ہم پر لازم آتا ہے، مگر ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، جس آدمی نے ملک اعجاز کی روزی چھینی اُسی کی آپ مدد کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے،" اعجاز بولا، "اتنی مدت کے بعد بات دِل میں نہیں رکھنی چاہئے۔ اُس کی شکل نہیں دیکھی تو نے، مرنے والا ہو رہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی گزر جائے گا۔ خیر، کوئی پکی بات بھی کی تو نے؟"

"جی کوئی پکی کی پکی؟ پتھر سے بھی پکی۔ عرفان ذوگر کہتا ہے رشتہ داری رہی ایک طرف، ملک اعجاز نے تو ساری عمر خدمت کی ہے، اُس کا پیغام ہمارے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ چیمے کے خلاف کوئی ایکشن نہیں ہو گا۔ قرارداد واپس لے لی جائے گی۔ میں نے کہا تم فکر نہ کرو۔ مختار ذوگر کو ہم سنبھال لیں گے۔"

اعجاز جو میز پر کہنیاں رکھے آگے جھک کر بات سن رہا تھا، طمانیت سے لبوں میں مسکرایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ اُسی طرح بیٹھا دروازے سے باہر دیکھتا ہوا، ہولے ہولے مسکرا کر مونچھوں پہ اُنگلیاں پھیرتا رہا، گویا اُس دُہری فتح کے لمحے کا لطف لے رہا ہو۔

اگلے ہی روز مختار ڈوگر دو حواریوں کے ہمراہ اعجاز کے دفتر آ پہنچا۔ "ملک اعجاز، میں آج تم سے دو دو باتیں کرنے آیا ہوں،" وہ کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔

"جی آیاں نوں۔ ڈوگر صاحب، ہم یہاں اور کس لیئے بیٹھے ہیں۔ باتیں سننے کے لیئے تو ہم ہر وقت حاضر ہیں۔ پیغام بھیج دیتے، میں آ جاتا، تکلیف کیوں کی؟" اعجاز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ بتاؤ کہ جس ظالم نے تجھے نکالا، ذلیل کیا، اُسی کی مدد کے لیئے تو اپنوں کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے؟"

"آں۔ آں،" اعجاز نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روکا، "مختار تو نے ایک ساتھ دو سوال کر دیئے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ میری فطرت کے اندر دل میں کینہ رکھنے کی عادت نہیں۔ اُس وقت حالات کے مطابق اُس نے جو قدم اُٹھایا ٹھیک اُٹھایا، اور اب میں نے جو کیا درست کیا۔ دُوسرے یہ کہ کن اَپنے لوگوں کے سامنے کھڑے ہونے کی میں نے جُرأت کی ہے؟"

مختار ڈوگر نے حیرت سے اَپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا جیسے اعجاز کی بات پہ اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ اَپنا سیاہ رنگ، لمبے لمبے دانتوں والا بھاری چہرہ اعجاز کی طرف موڑ کر بولا، "ملک، تجھے پتا نہیں کہ اِس ظالم نے میرے یتیم بھتیجے کو نجیز فیل کر دیا ہے۔ وہ آج میٹرک کی تیاری کر رہا ہوتا، بچارا نانویں میں دھکے کھا رہا ہے۔"

"ملک مختار، یہ بات تو میں آج پہلی بار تم سے سن رہا ہوں۔"

"اور بیڈ کریکٹر بھی ہے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں۔ جو بچے اس سے ٹیوشن پڑھنے جاتے ہیں اُن کی گواہی ہے۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اگر اِس بات کا علم ہوتا تو کیا مجھے سانپ نے کاٹا تھا کہ تیرے مخالف کوئی کام کرتا۔ میں نے اَپنے تئیں ایک بوڑھے لاغر

آدمی کی مدد کے لیئے عرض بھیجی تھی، یونین والوں نے منظور کر لی، اُن کی مہربانی ہے۔"

مختار ڈوگر نے دوبارہ بے یقینی سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ "ملک، تجھے واقعی علم نہیں تھا کہ میں نے یہ کام کروایا ہے؟"

"بالکل نہیں،" اعجاز نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "کیوں منظور؟"

"ملک مختار صاحب، حاشا وکلا، یہ بات ہم آپ کے منہ سے سن رہے ہیں۔ ہمارے کان میں بھنک بھی پڑ جاتی تو ہماری کیا مجال تھی۔ ہم اور آپ کوئی دو ہیں؟"

منظور نے ساتھ ہی چائے کی پیالی پیش کی۔

مختار ڈوگر ہاتھ ہلا کر بولا، "ناں ناں، ملک اعجاز تیری چاء مجھے اُس وقت تک منظور نہیں جب تک تو اُس شور کی مدد سے ہاتھ نہیں کھینچے گا۔"

اعجاز چند لمحے تک سیدھا مختار ڈوگر کو دیکھتا رہا۔ ظاہر ہوتا تھا کہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اصل میں وہ اس لمحے کا لطف لے رہا تھا۔ اب کنٹرول اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"ڈوگر صاحب، سارا معاملہ رابطے کا ہے۔ اگر رابطہ قائم رہے تو ممکن ہی نہیں کہ ایسے واقعات ہوں۔ آپ نے رابطہ توڑ دیا، کام غلط ہوگیا۔ اب تو جناب عرض یہ ہے کہ اصول کا معاملہ ہے، اور اصول سے زیادہ عزت کی بات ہے۔ یہ یونین کے کام ہیں۔ آپ کا کام مختلف نوعیت کا ہے، ہمارا مختلف نوعیت کا۔ دونوں کاموں کی کارکردگی بھی مختلف خطوط پر اُستوار ہے۔ یونین کے کام اِس طرح نہیں چلتے کہ صبح ایک بات کرو اور شام کو دوسری۔ اگر ایسا ہو تو مل مالکان ہمیں ایک دِن میں کھا جائیں۔ اصل میں درست لائحہ عمل یہی ہے کہ آپ ہمارے کام میں دخل نہ دیں، ہم آپ کے کام میں دخل نہ دیں، بلکہ جہاں ضرورت پڑے دونوں ایک دُوسرے کی مدد کریں۔ یہ صرف رابطے کی بات ہے۔"

مختار ڈوگر معمولی پڑھا ہوا، سیدھا سادا آدمی تھا۔ ووٹ اُسے پارٹی کی بناء پر ملے تھے، اور ٹکٹ برادری اور لوگوں کے درمیان حسن سلوک کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اعجاز کی بات اُس کی سمجھ سے کچھ زیادہ طویل اور پیچیدہ ہو گئی تھی۔ وہ بے سمجھی سے ایک منٹ تک اعجاز کو دیکھتا رہا، پھر بولا، "یہی تو ساری بات ہے ملک اعجاز، رابطہ ہی اصل چیز ہے۔

کیوں سردارے،" وہ اپنے ایک ساتھی سے بولا "عوام کے اندر رابطے کی وجہ سے ہی ہماری کامیابی ہوئی ہے۔ کیوں، کوئی غلط بات ہے؟"

"بالکل درست فرمایا" سردارا بولا "رابطہ مہم ہی کامیابی کا راز ہے۔"

"ہم نے آپ سے کب رابطہ توڑا ہے ملک؟" ڈوگر نے پُوچھا۔

اب اعجاز نے محسوس کیا کہ مختار ڈوگر اُس کی مٹھی میں تھا۔ اُس نے ٹیک لگا کر کرسی پر اپنا جسم پھیلایا۔ "توڑا کیوں نہیں۔ اِس جلسے کی مثال ہی لو جو ہونے والا ہے۔ میں نے کوئی دس آدمی تمہارے پاس بھیجے ہیں تاکہ کچھ معلومات حاصل ہوں اَور مل جل کر اِنتظام کریں، جیسے پچھلے جلسے کا کیا تھا۔ مگر تمہاری طرف سے ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔"

"میرے پاس تیرا ایک بندہ نہیں آیا۔ کیوں سردارے، ملک اعجاز کا کوئی بندہ تمہارے پاس آیا ہے؟"

"نہیں جناب" سردارے نے جواب دیا "ہمارے پاس کوئی پیغام پہنچتا تو ہم جواب دیتے۔ ہمیں کوئی خواب تو نہیں آئی تھی؟"

"میرا ایک آدمی باقر علی شاہ سے مل کر آپ کے نام پیغام چھوڑ کے آیا" اعجاز نے کہا۔

"باقر شاہ کے پاس؟" مختار ڈوگر کرسی سے اُچھل پڑا۔ پھر معنی خیزانداز میں آنکھیں پھیلا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھ کر، ہاتھ ماتھے پہ مار کر بولا "دیکھا؟ اب پتا چلا ناں کہ بات کیا ہے۔" اُس کے ساتھیوں نے سَر ہلا کر اتفاق کیا۔ پھر مختار اعجاز کی جانب مڑا اَور اُنگلی چھت کی جانب اُٹھا کر بولا "ملک، خُدا حاضر ناظر ہے، باقر شاہ نے مجھ سے ایک بات نہیں کی۔"

کمرے میں اعجاز، منظور، مختار ڈوگر اَور اُس کے ساتھیوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ "بھائی منظور" مختار ڈوگر نے ہیجانی انداز میں بازو ہلا کر دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ منظور نے اعجاز کی طرف دیکھا۔ اعجاز نے سَر کے اشارے سے اس کی تائید کی۔ جب منظور دروازہ بند کر چکا تو مختار ڈوگر آگے جھک کر رازداری سے بولا "ملک اعجاز، آپس کی بات ہے، آپس میں رہے۔ باقر شاہ میری مخالفت کر رہا ہے۔"

"ہیں؟" اعجاز نے مبالغہ آمیز دلچسپی ظاہر کی۔

"ہاں۔ ہمارے پاس ثبوت ہے۔"

"مگر کیسے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"میرے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے۔ کہتا ہے میں پارٹی کے لِئے نقصان دہ ہوں۔ بیٹھا رہتا ہوں۔ کام نہیں کرتا، وغیرہ۔ اَور خُود لوگوں کو میرے تک پہنچنے نہیں دیتا۔ اُس نے حکم دے رکھا ہے کہ کام کروانے کے لِئے سب اُس کے پاس آئیں۔"

"یہ بات سچ ہے؟" اعجاز نے حیرت سے پُوچھا۔

"ہمارے پاس ثبوت ہیں۔ سردار قرآن اُٹھاتا ہے۔ کیوں سردارے؟"

"بالکل جی، میں قرآن اُٹھانے کو تیار ہوں۔"

"کس بات پر؟" اعجاز نے پُوچھا۔

سردارے نے بے سمجھی سے مختار ڈوگر کو دیکھا۔ مختار ڈوگر بولا، "اوئے بتا ناں کہ تو نے اَپنے کانوں سے سنا ہے۔"

"میں نے خُود اَپنے کانوں سے سنا ہے۔ میں قرآن اُٹھانے کو تیار ہوں،" سردارے نے کہا۔

"مگر کیوں؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"ہیں جی؟"

"کس وجہ سے وہ مخالفت کرتا ہے؟"

"بس، اللہ واسطے کا بیر ہے،" مختار ڈوگر بولا، "اُس کا خیال ہے کہ اِس علاقے میں سیدوں اَور کشمیریوں کا راج ہونا چاہئے۔ کہتا ہے ڈوگروں کا علاقہ باڈر کے ساتھ ہے۔ وہ اُدھر جا کر سمگلنگ کرتے رہیں، سیاست سے اُنکا کیا تعلق ہے۔"

"چھوٹا آدمی ہے جی،" سردارے نے کہا۔ "دکانداری سے اُٹھا ہے۔ اَیسا آدمی اَور کیا کرے گا۔ ملک مختار کی تو جدی پشتی آڑھت ہے۔ سب عزت کرتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک بات نہیں،" اعجاز نے تشویش سے کہا۔ "اَیسے آدمی کی تو رپورٹ ہونی چاہئے۔ جب اِتحاد ہی نہ رہا تو پارٹی کہاں کی اَور سیاست کہاں کی؟"

"بالکل،" مختار ڈوگر بولا، "یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔"

"خیر،" مجھے آج خبر ہو گئی ہے۔ ہم بھی اپنی طرف سے پتا نکالیں گے۔ تم میرے ساتھ مستقل رابطہ رکھو ڈوگر صاحب۔ اگر بات یہی نکلی کہ باقر شاہ ٹھیک آدمی نہیں ہے تو پھر یہ مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارا آپس میں اتحاد رہے۔ اسی میں کامیابی ہے۔ گندے انڈوں کو نکال کر باہر پھینکا جا سکتا ہے۔ جلسہ آنے دو، اگر باقر شاہ کے یہی چلن رہے تو ہم اپنا جلوس لے کر جائیں گے، اور اُس کے آگے مختار ڈوگر کھڑا ہوگا۔ دیکھ لیں گے باقر شاہ کتنے بندے لے کر جاتا ہے۔"

"واہ جی واہ، سبحان اللہ۔ بات ہوئی ناں۔" سردارے نے کہا۔

اِسی ہیجان میں مختار ڈوگر نے اپنے آگے رکھی ہوئی چائے کی پیالی اُٹھا کر پینی شروع کر دی۔ جیسے ہی اُس نے پیالی لبوں سے لگائی، سردارا اور اُس کا ساتھی اپنی پیالوں کی جانب لپکے۔ سردارے کی چائے میں ایک مکھی تیر رہی تھی۔ اُس نے چھوٹی اُنگلی سے مکھی نکال کر باہر پھینکی اور دو گھونٹ میں پیالی خالی کر دی۔

"یہ تو ملک اعجاز کی مہربانی ہے،" مختار ڈوگر پیالی میز پر رکھ کر بولا، "وقت پر معاملہ پکڑ لیا۔ ورنہ باقر شاہ نے تو رخنہ ڈال دیا تھا۔"

"اِسی کا نام سیاست ہے ڈوگر۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔ بس حوصلہ نہ ہارو۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔"

کچھ دیر کے بعد مختار ڈوگر خوشی خوشی اعجاز سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔

اُس رات کو اعجاز گھر لوٹا تو اپنی دُہری تہری کامیابی پر پھولا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اُس نے مختار ڈوگر کو باقر شاہ کے چکر میں ایسے ڈالا تھا کہ وہ پیچھے کی بات کو بھول ہی گیا تھا اعجاز کے لبوں پر بار بار مسکراہٹ اُٹھ رہی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اُس کا بدن پھیل کرتا ہوا تھا۔

"اِدھر آ----" اُس نے سکینہ سے کہا۔

سکینہ اُس کا مقصد جان کر پیچھے ہٹ گئی۔ "اُوں ہوں،" اُس نے سر ہلا کر کہا۔

"کیوں تجھے پھر کپڑے آ گئے ہیں؟"

"اُوں ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے جو گونگوں کی طرح سر ہلاتی جا رہی ہو۔"

"میرا دل نہیں کرتا" سکینہ بولی۔

"دل نہیں کرتا؟" اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔ "تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"ہاں، چار پہر جاگ کر دماغ نہیں تو اور کیا خراب ہو گا؟ زمین کو کون دیکھتا ہے؟ شکر کرو پکی پکائی مل جاتی ہے۔ میری ہڈیاں تھکاوٹ سے ٹوٹ رہی ہیں، تمہارے اوپر شیطان سوار ہے۔"

یہ پہلی بار تھی کہ سکینہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ لگانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ مگر اس کا لہجہ ایسا تھا کہ اعجاز کا غصہ ایک لمحے کو بھڑک کر دب گیا۔ پھر اس نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"کفر کا کلمہ نہ بول۔ میاں بیوی کے تعلق پر شیطان کا نام رکھنے والا گناہگار ہوتا ہے۔ اپنی بیوی جی سے پوچھ لینا۔"

"تم جو مہینے مہینے کے تھکے ہوئے آتے ہو اور بیہوش ہو کر سو جاتے ہو، کبھی میرا حال بھی پوچھا ہے؟ بیوی کے بھی حق ہوتے ہیں۔"

"چل چپ کر۔ تُو تو سارا مزا ہی کرکرا کر دیتی ہے۔"

"مزہ تو اللہ جانے تم شہر میں کہاں کہاں لیتے پھرتے ہو۔ پھر کوئی مصلّن مل گئی ہو گی۔"

اعجاز ایسے چونکا کہ لیٹا لیٹا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ تجھ سے کس نے کہا؟"

"کیوں، میری آنکھیں اور کان نہیں ہیں؟"

"تیری آنکھیں اور کان میرے اوپر تہمتیں لگانے کے لیے ہیں؟"

"ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ نہ بول۔ تیرے کرتوت میں جانتی ہوں۔ ساری دُنیا جانتی ہے۔ جھنگیر کے منشی سے لے کر گل افروز تک سب جانتے ہیں۔"

سکینہ "تم" سے "تو" پر یا پیار میں آتی تھی یا سخت غصے میں۔ اعجاز نے اُس کے تیور پہچان لیے تھے۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

"تیرے کان کچے ہیں، دشمنوں کی باتیں سن کر مچلی جاتی ہے۔ تجھے کان بند رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لال جیتے رہیں۔"

ایک لمحے کو اعجاز کے دل میں خیال آیا کہ اُس نے سکینہ کو گھر سے نکلنے کی اجازت دے کر غلطی کی تھی۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ گھر اور باہر کا سارا کاروبار سکینہ کے ہاتھ میں تھا اور خود اعجاز کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی۔ اُس نے خاموشی میں خیریت جانی اور ناگواری سے منہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اُس نے اپنی دن بھر کی فتح و نصرت پہ خیال جمایا اور ایک خوشگوار نیند کا انتظار کرنے لگا۔

رُت بدلی تو منظر ہی بدل گیا۔ موسم بہار آ لگا تو ملک کے مشرقی حصے میں ملٹری ایکشن شروع ہو چکا تھا۔ شہر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اِسی دوران جلسے کا موقعہ بھی آ گیا۔ دو ماہ قبل مختار ڈوگر کی اعجاز کے ساتھ ملاقات کا حال جلد ہی باقر علی شاہ کے کانوں تک پہنچ گیا۔ چند روز چھوڑ کر باقر علی شاہ بھی اعجاز کے دفتر میں آوارد ہوا تھا۔ اعجاز بڑے تپاک سے اُسے ملا۔ باقر علی شاہ اکیلا آیا تھا۔

"منظور،" اعجاز نے آواز دی۔ "جا شاہ صاحب کے لیے نمبر ون چاء بنوا کے لا۔"

باقر علی شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر منظور کو روک دیا۔ "سارا دِن چائے پیتے پیتے گزر جاتا ہے۔ میری تو انتڑیاں خراب ہو گئی ہیں۔"

"جا پھر بوتل لے کر آ ----"

"تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ملک صاحب،" باقر علی شاہ مخاطب ہوا۔ اُس کی اعجاز سے ایسی بے تکلفی نہ تھی جیسی مختار ڈوگر کی تھی، جس کے اعجاز کے ساتھ آڑھت کے سلسلے میں پرانے تعلقات تھے۔ "ٹھنڈے پانی کا گلاس دے دو۔"

"نہیں نہیں۔ جا بوتل لے کر آ، کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔"

"ملک صاحب،" باقر علی شاہ بولا "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔"

"کیا سن رہے ہیں شاہ صاحب۔ کچھ ہمیں بھی بتائیں۔" اعجاز نے کہا۔

"یہی کہ مختار ڈوگر میرے خلاف باتیں کرتا پھر رہا ہے۔ سنا ہے یہاں بھی آیا تھا۔"

"چوہدری مختار دو چار دن پہلے آیا تو تھا۔ ایک سکول ماسٹر کا معاملہ تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کوئی آپ کا ذکر آیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے میری اطلاع غلط ہو۔ بہرحال، قصہ یہ ہے ملک صاحب کہ مختار ڈوگر

میرا جونیئر ساتھی ہے۔ ہے کہ نہیں؟"

"بالکل ہے۔ آپ قومی حلقے کے نمائندے ہیں۔ آپ کے دو ایم۔ پی۔ اے ہیں، ڈوگر اور رفاقت شاہ۔"

"تو کیا ڈوگر پر واجب نہیں آتا کہ مجھے مناسب عزت دے؟"

"کیوں نہیں۔ بالکل آتا ہے۔"

"رفاقت شاہ کو دیکھیں، ہر ایک معاملہ میرے ساتھ ڈسکس کرتا ہے، میرے مشورے کے بغیر قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کے برعکس ڈوگر نے آج تک کسی بات میں میری رضامندی طلب نہیں کی۔ شروع دن سے اپنا گروپ بنا کر بیٹھا ہوا ہے اور اسی کوشش میں رہتا ہے کہ میرے بندے کھینچ کر اپنے گروپ میں شامل کرلے۔ کئی مرتبہ اس نے میرے بارے میں غلط سلط خبریں پھیلائی ہیں۔ یہ حلقے کے لئے کوئی اچھی بات ہے؟"

"یہ تو بہت بری خبر سُنائی آپ نے شاہ صاحب۔ حلقے کے لئے، بلکہ پارٹی کے لئے اس سے بُری خبر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آپس کی بات ہے، ڈوگر کی تو تعلیم وغیرہ بھی ہلکی ہی ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے آدمی ہیں، آپ کو علم ہو گا کہ دنیا کی بڑی بڑی تحریکیں صرف نااتفاقی کی وجہ سے فیل ہوگئیں۔"

باقر علی شاہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا اور سامنے رکھی ہوئی کوکا کولا کی بوتل اٹھا کر پینے لگا۔ "آپ نے بالکل درست فرمایا، نااتفاقی بری بلا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ مجھ سے حکم لے، آخر وہ بھی عوام کا منتخب نمائندہ ہے۔ لیکن کم از کم رُتبے کے لحاظ سے مجھے مناسب عزت احترام تو دے۔ آپ کی ساری عمر اسی کام میں گزری ہے، آپ کو علم ہے کہ ایک دُوسرے کے مقام کا خیال نہ رکھا جائے تو سارا سسٹم ہی فیل ہو جاتا ہے۔ ہوتا ہے کہ نہیں؟"

"سسٹم کیا شاہ صاحب، تانا بانا ہی بکھر جاتا ہے۔ اِس بات کا اِن لوگوں کو علم نہیں ہے۔ بہرحال، اِس کا کوئی بندوبست تو ہونا ہی چاہئے۔ میرے خیال میں تو آپ کو ان باتوں سے بالاتر رہنا چاہئے۔ آپ کی پوزیشن ایسی نہیں کہ اِن قضیوں میں پڑیں۔ آخر ہم چھوٹے لوگ کس لئے یہاں بیٹھے ہیں؟" اعجاز کی بات کا اثر خاطر خواہ ہوا تھا۔ جب باقر علی شاہ بولا تو فرطِ جذبات سے اُس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"واہ ملک صاحب، آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ میں تو عوام کا خادم ہوں، اور سب سے پہلے میں آپ کا خادم ہوں۔"

"یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے شاہ صاحب، ورنہ کون آپ کے کام کو نہیں جانتا۔ پانی کی سبیلیں، افتتاحی جلسوں میں آپ کی خدمات پیش پیش، تاجر طبقہ ہو یا تھانہ، سب کے ساتھ آپ کے تعلقات، ہر دُوسرے دِن اخباروں میں آپ کی تقریریں، تصویریں، جتنے رفاہی کام آپ نے چند مہینوں میں کئے ہیں ہم نے ساری عمر میں نہیں کئے۔ ہم تو آپ کے کارندے ہیں۔ آپ کو کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ یہ کام آپ مجھ پہ چھوڑیں۔ میں ڈوگر کو الگ لے جا کر ذرا کھینچتا ہوں، اُس کا کیڑا نکالتا ہوں۔ فکر نہ کریں۔ ویسے مختار ڈوگر آدمی برا نہیں۔۔۔۔"

"میں کب کہتا ہوں،" باقر شاہ بات کاٹ کر بولا۔ "اصل میں اُس کے اڈوائیزر خراب ہیں۔"

"بالکل یہی بات میرے دِل میں بھی تھی۔ میں اُس کے اڈوائیزروں کے کان بھی مروڑتا ہوں۔ ایسے لوگوں کو درست کرنے کا طریقہ مجھے آتا ہے۔ بس آپ میرے ساتھ رابطہ رکھیں۔ اب بڑا جلسہ بھی آ رہا ہے۔ اشد ضروری ہے کہ ہم سب اِتحاد کا مظاہرہ کریں۔ اِس کے لئے فل رابطہ رکھنا بے حد ضروری ہے۔"

"آپ ہمارے لیڈر ہیں ملک صاحب،" باقر علی شاہ اعجاز کے آگے بچھ گیا۔ "جیسے آپ کہیں وَیسے ہی ہو گا۔"

آٹھ دس روز کے اندر، اِسی طرح کی مہم چلا کر اعجاز نے دونوں کی صلح کرا دی۔ اعجاز کے بند دفتر کے اندر گلے شکوے ہوئے، اور وہیں پر باقر علی شاہ اور مختار ڈوگر آخر میں اُٹھ کر گلے مل لئے۔ جب جلسے کے لِئے حلقے کا جلوس چلا تو اگلے ٹرک پر باقر علی شاہ، مختار ڈوگر اور رفاقت شاہ کے ساتھ اعجاز بھی کھڑا تھا۔ شہر کے ہر کونے سے مختلف جلوس، ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ، ناچتے گاتے ہوئے مردوں عورتوں کے ہمراہ، مانگے تانگے ہُوئے ٹرکوں، ریڑھوں، گدھا گاڑیوں، رکشاؤں اور تانگوں کے ساتھ ایک ہی سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے پیدل چلنے والوں کی ایک فوج تھی۔ ان سب کا رُخ گول باغ کی جانب تھا۔ اعجاز کا جلوس شہر کے سب سے دُور دراز حصے سے چلا تھا۔ اُس نے تقریباً سارے شہر کو پار

کر کے اپنی جائے مقام تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ وہ جگہ جگہ پر رُک کر چل رہا تھا۔ جہاں پر جلوس رُکتا، زور شور سے نعرے لگنے شروع ہو جاتے۔ جلوس کو دیکھنے والے مقامی لوگ سڑک کے کنارے کھڑے، جوش میں آ کر نعروں میں شامل ہو جاتے۔ فاصلے فاصلے پر پانی کی سبیلیں لگی تھیں جہاں لوگ ہاتھ کا چلو بنا کر پانی پیتے، مُنہ پر گیلے ہاتھ پھیر کر تازہ دم ہوتے، ریڑھی والوں سے پکوڑے اور دہی پھلکیاں خرید کر کھاتے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک رُکا کھڑا تھا۔ پولیس کی نفری ہر طرف نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سارے ضلع کی پولیس شہر کی سڑکوں پر جمع ہو گئی ہے۔ مگر بیشتر جلوس پُرامن تھے۔ لوگ ہنس کھیل رہے تھے، تالیاں بجاتے اور ناچتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ گرد کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔

گول باغ کے اندر، جس کا نام ناصر باغ رکھا جانے والا تھا، لوگوں کی ایسی بھیڑ تھی جیسی صبح سویرے سبزی منڈی میں ہوتی ہے۔ پسینے سے تربدن ایک دُوسرے سے رگڑ کھا رہے تھے۔ شہر کے مختلف حلقوں اور نواح کے دیہات سے ڈھولوں، باجوں اور طوطیوں والے جلوس ایک کے بعد ایک باغ میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ دھکم پیل کا ایک عالم تھا کہ ہر آدمی آگے ہی آگے نکل کر سٹیج کے قریب تر ہونا چاہتا تھا۔ ہر طرف ایک بھگدڑ مچی تھی، مگر ایسی بھگدڑ کہ جس کے اندر لوگ بھاگنے دوڑنے کی بجائے اپنی جگہ پر ہراساں کھڑے ہل جل رہے تھے۔ اعجاز کا جلوس وسط تک پہنچ کر رُک گیا۔ آگے کندھے سے کندھا اور پیٹھ سے پیٹھ جوڑے آدمیوں کے پشتے لگے تھے جیسے پکی دیواریں ہوں۔ سٹیج پر ایک ڈاڑھی مونچھ منڈا آدمی مائیکروفون پہ کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر تقریر کر رہا تھا جس کا ایک لفظ مجمعے کے شور کی وجہ سے سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ وہ سَر سے مکمل گنجا تھا، جس کی وجہ سے اُس کا ٹنڈمنڈ چہرہ معمول سے زیادہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ ہجوم کی گرمی لوگوں کے سروں کو چڑھ رہی تھی۔

"شاہ جی،" اعجاز اپنے ساتھ کھڑے باقر علی شاہ سے مخاطب ہو کر بولا، "یہ کام خراب ہے۔ آگے نکلنے کا کوئی رستہ ملنا چاہیے۔"

"ضرور ملنا چاہیے ملک صاحب۔ میں قومی اسمبلی کا منتخب نمائندہ ہوں۔ منتظمین کو مجھے مناسب عزت دینی چاہیے۔"

اعجاز نے ایڑیاں اُٹھا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ "منتظمین بھی دراصل آپ ہی

کی طرح اسمبلیوں کے ممبر ہیں، کوئی آسمان سے نہیں اُترتے۔ لیکن سب اندرون شہر کے مہاجے گاے ہیں جو معتبر بنے ہوئے ہیں، اپنے اپنے حواریوں کو سٹیج کے آگے کھڑا کر رکھا ہے۔ دیکھیں میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ اور ڈوگر صاحب اور رفاقت شاہ یہیں پر جم کر کھڑے رہیئے۔ اپنی جگہ نہ گنوایئے۔"

اعجاز کو ایک طرف چند پست قد لوگ کھڑے ہوئے نظر آ گئے تھے، جہاں سے اُس نے اندازہ کیا کہ پچھلی جانب سے شائد سٹیج پر پہنچا جا سکتا تھا۔ اِس مُہم میں اُسے آدھ گھنٹہ لگ گیا، مگر وہ آخر اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں اُس نے ایک چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں والے نوجوان کو جا پکڑا، جو منتظمین میں سے دکھائی دیتا تھا۔

"جنابِ عالی،" اعجاز نے اُسے ایک ماہر یونین لیڈر کے لہجے میں مخاطب کیا۔ "ہمارے حلقہ نمبر اٹھاسی کے ممبر قومی اسمبلی اور دو ممبران صوبائی اسمبلی پیچھے ہجوم کے اندر پھنسے کھڑے ہیں۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ انہیں سٹیج پر لایا جائے، ورنہ وہ اپنا دو ہزار کا جلوس لے کر واپس جا رہے ہیں۔"

نوجوان نے آنکھیں پھیلا کر اُسے دیکھا۔ اندر ہی اندر وہ اعجاز کی بات کے وزن کا تعین کر رہا تھا۔ جب اعجاز نے اُس کی نظر کے سامنے آنکھ نہ جھپکی تو نوجوان بولا، "ایم۔این۔اے اور ایم۔پی۔اے صاحبان کے نام کیا ہیں؟"

اعجاز نے نام بتائے۔ نوجوان نے جھک کر زمین سے ایک اِشتہار اُٹھایا، اُسے جھٹک کر مٹی صاف کی اور اُس کی پشت پر پنسل سے نام لکھے۔

"او غیاثے،" اُس نے ایک دُوسرے نوجوان کو آواز دی۔ "کوئی بلے ہیں؟"

"ہاں میاں صاب، لے لیتا ہوں۔"

"تین چار بلے لے جاؤ۔ اِن صاحبان سے کھو لگالیں اور انہیں آگے لے آؤ۔"

اعجاز اُس نوجوان کے ساتھ واپس گیا، اور تھوڑی ہی دیر میں وہ تینوں ممبران اور حلقے کے دو تین مزید معززین کے ہمراہ سٹیج کے سامنے کھڑا تھا۔

"بڑا کام دکھایا ملک صاحب،" مختار ڈوگر نے تعریفاً کہا۔ "کیا عمل پڑھا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں،" اعجاز ہنس کر بولا، "میں نے سیدھا جا کر کہا کہ میرے ممبران اسمبلی کو سٹیج پر بٹھاؤ، ورنہ ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"سٹیج کے اُوپر؟"

"ہاں، قائد کے ساتھ۔"

"واہ یہ تو بڑی بات مانگ لی۔"

آپ کو ان باتوں کا پتا نہیں شاہ صاحب۔ یہ رمزیں ہم یونین والے ہی جانتے ہیں۔ توپ مانگو تو تلوار ملتی ہے۔"

سٹیج کے پیچھے ہلچل مچی، نعرے بلند ہوئے، اور اچانک ڈائیس پر اُن کا لیڈر نمودار ہوا۔ وہی عام سا شلوار قمیض کا لباس، پاؤں میں چپلی، قمیض کے کف کھلے۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے تالی بجائی، پھر بازو کھول دیے، جیسے سارے جہان کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ قمیض کی آستینیں ڈھلک گئیں اور کہنیوں تک بازو ننگے ہو گئے۔ ہجوم میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ نعرے بند ہوئے تو تالیاں بجنے لگیں، تالیاں رُکیں تو پھر نعرے شروع ہو گئے۔ کئی منٹ تک اِسی طرح شور مچا رہا۔ پھر لیڈر نے ہاتھ اُٹھا کر مجمعے کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ غل اِس طور سے تھا جیسے ایک مہیب الجثہ جانور کے آخری دم نکلتے ہوں۔ ہجوم آخری بار جھرجھرایا اور خاموش ہو گیا۔ لیڈر نے دو چار لفظ ہی کہے ہوں گے کہ مائیکروفون بند ہو گیا۔ لیڈر بولتا چلا گیا۔ مجمعے سے آوازیں اُٹھنے لگیں، "آواز---- آواز----" پہلے ایک، پھر دو اور آدمی آ کر مائیکروفون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ چند سیکنڈ میں وہ چالو ہو گیا، مگر اب اُس میں آواز پھٹی پھٹی نکلنے لگی تھی۔ عقب سے ایک آدھ بار "آواز--- آواز---" کی صدا اُٹھی، مگر جب دیکھا کہ لیڈر اپنی روانی میں بولتا جا رہا ہے، تو خاموشی چھا گئی۔

لفظوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ سن سینتالیس کے بعد یہ پہلا لیڈر آیا تھا جو خواہ کسی زبان میں بولتا، لوگ صرف اُس کی آواز سننے اور شکل دیکھنے کی خاطر مُنہ کھولے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُس کے وجود کو اپنے مقابل پا کر لوگوں کی غربت کے داغ اُن کے دل سے دُھل جاتے اور ان کے اندر توقعات کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ لوگ اُس شخص سے ہر لحظہ کسی ایسے معجزے، کسی کرامت کی توقع رکھتے تھے جس کی رونمائی سے اُن کی زندگیاں بدل جائیں گی۔ اِس شخص کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اِتنا بڑا جاگیردار ہو کر غریبوں کی جھونپڑیوں میں جا کر اُن کے ساتھ کھاتا پیتا اور زمین پر سوتا رہا تھا۔ اِن باتوں نے

اُسے اِس قوم کے اندر فقیری کا درجہ دے دیا تھا۔ اعجاز بھی مسحور کھڑا اُس کے لفظوں سے بے نیاز، اُس کے ہاتھوں کے اِشارے، اُس کی تقریر کے انداز کو دیکھ رہا تھا اور وقت وقت پہ نعرے لگاتا جا رہا تھا۔ اِس کربل کربل کرتے مجمعے میں زندگی کی توانائی دوڑتی پھر رہی تھی۔

پھر اچانک مائیکروفون کا نقص رفع ہو گیا اور آواز صاف ہو گئی۔ "یہ ایک مداری ہے،" لیڈر کہہ رہا تھا "اس کے پاس مداریوں کی کئی ٹوپیاں ہیں۔ ایک ٹوپی پریذیڈنٹ کی ہے۔ پھر اُسے اتار کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ٹوپی پہن لیتا ہے۔ جب ضرورت محسوس کرتا ہے تو اُسے اتار کر پھینک دیتا ہے اور کمانڈر انچیف کی ٹوپی پہن لیتا ہے۔ اِس کے پاس ایک سیاست دان کی ٹوپی بھی ہے۔ جب اُسے پہنتا ہے تو انتقالِ اقتدار کی ٹال مٹول کرنے لگتا ہے۔ جب یہ سیاست دان بنتا ہے تو پھر کیا کہتا ہے؟ پھر کہتا ہے انتقالِ اقتدار، ٹال مٹول۔" یکدم لیڈر نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور لے میں کہنا شروع کیا "اِنت---- قال---- اق---- تدار---- ٹال----" ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے پاؤں پہ چاروں طرف گھوم گیا، جیسے کوئی مست قلندر ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے الفاظ اُس کے مُنہ سے اُچک لیے اور اُس کی نقل میں گھوم گھوم کر گانے لگے، "اِنت---- قال---- اِق---- تدار---- انت---- قال---- اق---- تدار----" ڈھول جو خاموش ہو چکے تھے دھما دھم بج اُٹھے۔ مجمعے میں لوگوں نے تالیاں بجا کر گھومتے اور یہی گردان کرتے ہوئے کئی چکّر کاٹے، جیسے کسی لمبی چوڑی مشین میں نصب ہزاروں پھرکیاں ایک ساتھ چل رہی ہوں۔ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ لیڈر نے یہ الفاظ کس ضمن میں بولے تھے، کہ وہ ایک دُوسرے شخص کے الفاظ کو دُہرا کر اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ مگر ہجوم اپنے تئیں ایک مطالبے کی صورت یہ الفاظ پکار رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب لیڈر نے محسوس کیا کہ لوگ منتقلیِ اِقتدار کا مطالبہ کر رہے تھے تو وہ بھی پلٹ کر ہجوم کے ساتھ شامل ہو گیا، گو اُس کا پلٹنا کسی نے نہ دیکھا اور نہ محسوس کیا، کہ الفاظ بھی وہی تھے، حرکت بھی وہی اور سُر اور لے بھی وہی تھی۔ اعجاز گو اِس سارے عمل میں شامل تھا، مگر ایک خیال کو وہ اپنے دِل میں آنے سے نہ روک سکا، کہ کیا سیاست اتنی غلط فہم خطوط پر استوار ہوتی ہے؟

باب 13

"یہ باتیں پریس میں نہیں آ رہیں۔ بلیک آؤٹ ہے؟" جمیل نے کہا۔

جمیل سلٹ میں بیمار پڑ گیا تھا۔ وہاں سے اُسے واپس بھیج دیا گیا تھا۔ سرفراز ہسپتال میں اُس کے پاس بیٹھا اُس سے باتیں کر رہا تھا۔

"سنا ہے ایویکوایشن میں کافی پرابلم ہو رہی ہے،" سرفراز نے موضوع تبدیل کرنے کی خاطر کہا۔

"ہاں۔ ایئرسپورٹ ویسے ہی کم ہے۔ ڈار کو جانتے ہو؟ اسحاق ڈار، بی کمپنی والا؟ ڈائیریا اور ڈسنٹری سے ایک ہفتے تک ادھ موا پڑا رہا۔ ہم تو سمجھے تھے ہی اِز اے گوئنگ کیس۔ مگر آخری وقت پہ لفٹ کر لیا گیا۔"

سرفراز سے جہاں تک ہو سکا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر اُس کے اندر ایک ابتری کی صورت پھیلتی گئی۔ آخر وہ پُوچھنے سے نہ رہ سکا۔

"جمیل، یہ جو باتیں تم نے بتائی ہیں۔"

"ہاں۔"

"سنی سُنائی تو نہیں؟"

"آر یُو کریزی؟ میں ایسی بات سن سُنا کر کروں گا؟"

"تُم نے خُود دیکھا ہے؟"

"لک ہیئر ایم ایس، آئی ایم لائیبل تو مائی کنٹری، اینڈ تو مائی سروس،" جمیل نے جوش میں آ کر کہا۔ "سرفراز نے تنبیہہً ہاتھ اٹھایا تو وہ آواز ہلکی کر کے پھنکارتی ہوئی سرگوشی میں بولا، "پریگننٹ وومن بے نٹڈ، ہاف وے بی ہینگنگ آوٹ آف ہر گٹ۔"

"او کے او کے، آئی گیٹ اِٹ۔ چپ رہو۔ آئی ایم سوری۔"

سرفراز کو اُبکائی آ رہی تھی۔ جمیل، جو کہنی کے بل اُٹھ بیٹھا تھا، واپس بستر پر ڈھے گیا اور سرہانے پہ سر رکھ کر کھلی کھلی آنکھوں سے چھت کو دیکھنے لگا۔

سرفراز اُٹھ کر غسل خانے چل دیا۔ وہاں پر وہ پانچ سات منٹ تک ٹھہرا جی کی متلی

کو روکتا رہا، پھر واپس آ کر جمیل کے بستر پر بیٹھ گیا۔

"واٹ آر یو گوئینگ ٹو ڈو؟" اُس نے پُوچھا۔

جمیل کے اندر بولنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ وہ اُسی طرح لیٹا کھلی کھلی آنکھوں سے ایک تار سرفراز کو دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو، "مجھ سے کیا پُوچھتے ہو؟" یا "تمہیں پتا ہے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

جمیل کا جسم آدھا رہ چکا تھا۔ اُس کا چہرہ بے رنگ تھا اور نتھنوں کے گرد کی جلد میں نیلاہٹ آ گئی تھی۔ اُس کے پیٹ کی خرابی قابو میں نہ آ رہی تھی۔ خُون ضائع ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے مستقل خُون دیا جا رہا تھا۔ سرفراز نے آنکھیں چرا لیں۔

اِس کاروائی کے عقب میں جو مقصد کارفرما تھا اُس کے ساتھ سرفراز کا کوئی تنازعہ نہ تھا۔ مگر اُس سے کیا فرق پڑتا تھا؟

اعجاز اپنے کام سے فارغ ہو کر رات کو گھر پہنچا تو جہانگیر کا منشی بیٹھا تھا۔

"میں شہر میں بھی آپ کو ڈھونڈتا آیا ہوں،" منشی نے کہا۔

"آج میں دفتر میں نہیں بیٹھا" اعجاز نے جواب دیا۔ "اِدھر اُدھر کام کرتا پھرا ہوں۔ کیوں، کیا معاملہ ہے؟"

"ملک صاب نے یاد کیا ہے۔"

"خیر تو ہے؟"

"جی اللہ جانے،" منشی نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "آپ چل کر پتا کر لیں۔"

"ٹھیک ہے،" اعجاز نے کہا۔ "صبح شہر جاتے ہوئے اُدھر سے ہوتا جاؤں گا۔"

"جی ملک صاحب نے کہا تھا جس وقت بھی ملیں ساتھ لے کر آنا۔ ضروری کام ہے۔"

اعجاز منشی کو گہری نظر سے دیکھتا اور سوچتا رہا، پھر بولا "اچھا۔ روٹی کھائی ہے؟"

"نہیں جی۔"

"کچھ پیٹ پوجا کر لیں، پھر چلتے ہیں۔"

اعجاز اندر جا کر سکینہ کے پاس بیٹھ گیا۔ "میں سارے دن کا تھکا ہوا ہوں،" اس نے شکایت کی۔ "اب جہانگیر نے بلا بھیجا ہے۔"

"کچھ خبر بھی ہے کیا ہو گیا ہے؟" سکینہ نے کہا۔

"نہیں۔ کیا ہوا ہے؟"

"بندہ مارا گیا ہے۔"

"ہیں؟" اعجاز گویا جاگ اٹھا۔ "کہاں پر؟"

"جھنگیر کی زمین پر۔"

"کس کے ہاتھ سے؟ کیسے؟"

"کچھ پتا نہیں۔ افواہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے جھنگیر سے قتل ہوا ہے، کوئی کہتا ہے اس کے لڑکے سے۔"

"لڑکے سے؟" اعجاز نے دُہرا کر پُوچھا "عالمگیر سے؟ وہ تو شریف سا لڑکا ہے۔ کالج سٹوڈنٹ ہے۔"

"کہتے ہیں لڑکی کا معاملہ تھا۔"

اعجاز کے چہرے پہ تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ "اچھا منشی کو روٹی تو بھیجو۔" اُس نے کہا "اور مجھے بھی دو۔ میں ذرا نہا لوں۔"

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی، مگر ملک جہانگیر اپنے ڈیرے پہ بیٹھا تھا۔ اعجاز اُسے ایک نظر دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے پاس دو آدمی بیٹھے تھے۔ ڈیرے کے احاطے میں آٹھ دس لوگ چارپائیوں پہ بیٹھے خاموشی سے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جہانگیر نے بیٹھے بیٹھے، مسکرائے بغیر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"کیا معاملہ ہے بھائی۔" اعجاز نے فکرمندی سے جہانگیر کے قریب بیٹھتے ہوئے پُوچھا۔

"معاملہ کیا ہو گا اعجاز۔ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ بات کا بتنگڑ بن گیا ہے۔"

"کچھ تفصیل تو بتاؤ۔"

ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

"کیوں گامُوں" جہانگیر نے بیتابی سے پُوچھا۔ "کوئی اطلاع آئی؟"

"بندہ آگیا ہے ملک جی۔ نُورا ابھی پہنچ جائے گا۔"

"سور کے تخم، ہزار دفعہ کہہ کے بھیجا تھا کہ اُسے ساتھ لے کر آؤ۔"

"ملک جی، فوتگی کا مالمہ تھا۔ نُورے نے کہا جیسے ہی مردے کو قبر میں اُتارتے ہیں، وہ چل پڑے گا۔"

جہانگیر نے مایوسی کے عالم میں ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "اوئے تم لوگ میری ہتّوں میں بیٹھ جاؤ گے۔ چل دُور ہو جا۔ نُورا ابھی نہ پہنچا تو یاد رکھ، تیری خیر نہیں۔"

گامُوں پچھلے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔ جہانگیر اعجاز کی جانب متوجہ ہوا۔

"قصہ کیا ہوا تھا بھائی جہانگیر" اعجاز نے پوچھا۔

"یار قصہ کیا ہو گا۔ یہ شخص ہمیشہ سے تنگ کر رہا تھا۔ کبھی حصے پر جھگڑا کھڑا کر دیتا، کبھی رقم اُدھار لے کر واپس نہ کرتا۔ کبھی ونگار سے اِنکار کر دیتا۔ اِس کا باپ ساری عمر ہمارے پاس رہا، کبھی اُونچی بات نہیں کی۔ یہ لڑکا شُروع سے ہی سَر نکالتا ہوا تھا۔ باپ دادا کے وقت کے آدمی کو اُٹھانے کو بھی جی نہیں کرتا، ورنہ میں نے کبھی کا اُٹھا دیا ہوتا۔ کیا پتا تھا یہ مصیبت آئے گی۔"

"وقوعہ کیسے ہوا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

جہانگیر ساتھ بیٹھے دو نوجوانوں پر نظر پھینک کر اعجاز سے بولا، "اپنے گھر کے بندے ہیں۔ یہ اوکاڑے والے چاچے کا داماد ہے، فوڈ کے محکمے میں افسر ہے ماشاء اللہ۔ اور یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ اِن سے کوئی بات چھپی ہُوئی نہیں۔ وقوعے کا قصہ یہ ہے اعجاز کہ عالمگیر کو تم جانتے ہی ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں پلا ہے۔ میں نے اِس کی پرورش بڑے دھیان سے کی ہے۔ کالج میں پڑھتا ہے، ہوسٹل میں رہتا ہے۔ کہتا تھا کہ موٹر سائیکل لے دو، مَیں نے کہاں ناں بھئی، پہلے فرسٹ ڈویژن میں بی۔اے کر، پھر لے کر دوں گا۔ میرے دِل میں خیال تھا کہ کہیں اس کے دِماغ میں فتور نہ آ جائے۔ شریف النفس بچہ ہے۔ چھٹیوں پر آیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ میری ایک بندوق اٹھا کر گھگیاں مارنے چلا جاتا ہے۔ آج شائد مشا کے کھگڑے کے گھروں کی طرف نِکل گیا۔ اُس کے بعد مجھے کچھ پتا

نہیں کیا ہوا۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے لڑکے نے پرندے پر فیر کیا تو مشتا کا گھگڑ نکل کر گالیاں دینے لگ پڑا کہ تو نے میرے گھر پر فیر کیوں کیا ہے۔ لڑکے کی یہ خصلت نہیں کہ کسی کو جان بوجھ کر نقصان پہنچائے۔ آخر میرا بچّہ ہے، کیا میں اُس کی خصلت نہیں جانتا؟ مُجھے علم ہے کہ اس نے ڈرانے کے لئے بندوق سیدھی کی ہوگی۔ بدبخت گھگڑ کی آئی ہوئی تھی، اُسے لگ گئی۔"

اعجاز دو ایک منٹ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہی بات ہے کہ اَور کوئی قصہ بیچ میں نہیں تھا؟"

"اَور کیا قصہ ہو گا اعجاز۔ میری بات پر تُجھے اعتبار نہیں؟ اَیسے تو تم جانتے ہو،" جہانگیر نے اَپنائیت سے اعجاز کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر کہا، "دوست دشمن سب ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ اَیسا واقعہ ہو جائے تو لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ مگر یہ سب افوائیں ہیں۔ سمجھ گئے ناں؟ سب افوائیں ہیں۔"

"عالمگیر اب کہاں ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"اُس کو میں نے فرنٹیر کی طرف نکال دیا ہے۔ معاملہ درست ہو جائے تو بلالوں گا۔"

"اب کیا کر رہے ہو؟"

"ایک میرا وفادار ہے، نُورا مصلی،" جہانگیر نے کہا۔ "اُس کا اقرار اَور گرفتاری پیش کر دیتے ہیں۔ پولیس کو اطلاع ہو گئی ہے۔ دو سپاہی اِدھر بیٹھے ہیں۔ ڈی۔ایس۔پی۔ کی طرف سے پیغام آیا ہے کہ جو انتظام کرنا ہے کرلو، کل صبح وہ خُود پہنچے گا۔"

"میرے لائق کیا کام ہے؟" کچھ دیر بعد اعجاز نے پُوچھا۔

"تو نے جو کرنا تھا کر لیا میرے بھائی۔ اُس کمین کو جتا دیا۔ اب وہ ایم۔پی۔اے بنا پھرتا ہے۔ دیکھیں گے جس دِن اُسے کرسی ملے گی۔ مگر خیر، کوئی بات نہیں، ووٹوں کا معاملہ تھا اِس کھیل میں ہار جیت برابر ہے، کوئی ہارتا ہے، کوئی جیتتا ہے۔ اِس بار نہیں تو اگلی بار سہی۔ مگر یہ تو تیرے گھر کا معاملہ ہے۔"

"بالکل ہے بھائی جہانگیر۔ مگر میں سمجھا نہیں۔"

"وہ کنجر کمین گھگڑوں کی طرف داری کر رہا ہے۔ گواہیاں تیار کروا رہا ہے۔ کہتا پھر

رہا ہے۔ جہانگیر کے گھر سے کوئی نہ کوئی پھانسی چڑھے گا۔"

"اچھا۔۔۔۔؟" اعجاز ایسے بولا جیسے حیرت میں بھی ہو اور سوچ میں بھی۔

"جا کر اُسے کہہ دے اعجاز، کہ جہانگیر کے گھر سے کوئی پھانسی لگا تو گھگھڑ کی موت پر نہیں، گجر کے قتل پر لگے گا۔ یہ میرا پیغام ہے۔"

"ناں ناں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جا کر اُس سے ملتا ہوں۔ اگر وہ باز نہ آیا تو پھر میں اُس کے سامنے کھڑا ہوں گا۔ بھائی جہانگیر، یہ تمہارا نہیں، میرا معاملہ ہے۔"

"اب یہ کام تمہارے ذمے ہے اعجاز۔"

"بالکل ہے۔" اعجاز نے کہا۔ "سو فیصدی ہے۔"

نورے مصلی کا رنگ کوئلے کی مانند سیاہ، لمبی لمبی کالی مونچھیں، اور قد چھ فٹ سے اُوپر تھا۔ اُس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی مگر آنکھیں بڑی بڑی اور بچوں کی طرح صاف اور روشن تھیں۔ اُس نے مُنہ سے کچھ بولے بغیر ہاتھ ماتھے سے چھُو کر سرسری سا سلام کیا اور آ کر اطمینان سے جہانگیر کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا، جیسے اُس کے لئے دُنیا کے معاملات طے ہو چکے ہوں اور اب اُسے اُن سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"نورے۔"

"جی سرکار۔"

"تو نے کچھ سنا؟"

"کن میں آواز تو پڑی ہے۔"

"اقرار اور گرفتاری دینی ہے۔"

"جو حکم سرکار۔"

"کل سویرے ڈی۔ایس۔پی صاحب آئیں گے۔ اُن کے سامنے بیان ہوں گے۔"

"تیار ہوں۔" نُورے کے راضی بہ رضا چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

"تجھے پھاہ نہیں لگنے دوں گا۔ عدالت میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جب تو نے جرم ہی نہیں کیا تو اقرار سے کیا ہوتا ہے۔ مقدمہ بیٹھ جائے گا۔"

"پھاہ کا ڈر نہیں سرکار۔ یہ سر اُوپر والے کی اور آپ کی امانت ہے۔ گیا تو گیا۔ بس ایک دو باتوں کا فکر ہے۔"

"بتا۔"

"میرے دروازے پر بھینس باندھ دو۔"

"باندھ دی گئی۔"

"لڑکی کا بیاہ پہلے بھی سرکار نے کرنا تھا اب بھی سرکار نے کرنا ہے۔"

"درست۔"

"سال کے سال دانے گھر میں آ جائیں۔"

"ٹھیک۔"

"میرا بچہ سکول جائے نہ جائے، اُس کا روزگار آپ کے ذمے۔"

"منظور۔"

"میں آ گیا تو آ گیا۔ نہ آیا تو معراج بی بی کو نکاح کی آزادی ہے۔"

"تو کہیں بھی نہیں جاتا نُورے۔ کیا تیرا خیال ہے کہ میں تجھے جانے دوں گا۔ یہ کام میرے ذمے پر چھوڑ دے۔ اللہ پر بھروسہ کر۔"

"میں گھر سے ہو آؤں۔" نُورا اُٹھتے ہوئے بولا۔

"تو آج رات گھر پر ہی رہ،" جہانگیر نے کہا۔ "صبح سویرے آ جانا۔"

"ٹھیک ہے سرکار۔"

نورے نے سر پہ پٹکا سیدھا کیا، چادر اُٹھا کر کندھے پہ رکھی، اور کوئی بات کیے بغیر پلٹ کر اُسی بے اعتنائی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر کے بعد اعجاز بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"صبح سویرے سراج کو جا کے پکڑوں گا۔ حوصلہ رکھ، بھائی جہانگیر۔"

"اللہ حافظ،" جہانگیر نے مدھم سی آواز میں کہا۔ اُس کا چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے سکڑتا جا رہا تھا۔

اگلے روز شام کے وقت اچانک سرفراز گھر آ پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان کی ہو گئی ہے۔ چھ ماہ پہلے اُس کی رجمنٹ مشرقی پاکستان جا چکی تھی۔ مگر اُس وقت سرفراز کی پوسٹنگ عارضی طور پہ ایک دُوسری رجمنٹ میں کر دی گئی تھی۔ اب افسروں کی کمی کی وجہ سے اُسے اپنی پیرنٹ رجمنٹ میں واپس آنے کا بلاوا آ گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے اپنے دِل سے مجبور ہو کر سرفراز نے نسیمہ سے منگنی کی بات چھیڑی تھی۔ نسیمہ کا اِبتدائی ردِ عمل گھبراہٹ کا تھا، اور اُس نے بات ٹالنے کے انداز میں کوئی اور ذکر شروع کر دیا تھا۔ مگر جس خوشگواری سے وہ بات کرتی رہی تھی اُس سے ظاہر تھا کہ وہ سرفراز کی جانب سے اِس تجویز کی متوقع تھی۔ اگلی ملاقاتوں پہ سرفراز نے بہانے بہانے سے بات جاری رکھی۔ اب جبکہ سرفراز کا مشرقی پاکستان جانے کا موقع آ گیا تو اُس نے گھر آ کر اعجاز سے بات کی۔ اعجاز ہکا بکا رہ گیا۔ سرفراز کے گھر والوں کے خواب میں بھی نہ تھا کہ اُس کے نسیمہ کے ساتھ تعلقات اِس حد تک پہنچ چکے تھے۔ مگر جلد ہی اپنی حیرت پر قابو پا کر اعجاز نے خوشی سے تفصیل پُوچھنی شرُوع کی۔

"میرے پاس صرف تین دِن ہیں،" سرفراز نے بتایا۔ "میری فلائٹ بک ہو چکی ہے۔ میں نسیمہ سے مل کر آیا ہُوں۔ لالہ تم کل جاؤ اَور بریگیڈیئر صاحب سے بات کرو۔ اکیلے ہی جاؤ، ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ پھر پرسوں تم اَور بی بی جا کر جو بھی رسم کرنی ہے کر آنا۔"

"اِتنی جلدی میں سب کچھ کیسے ہو گا؟" اعجاز نے کہا۔

"ہو جائے گا۔ بریگیڈیئر صاحب کو پتا ہے میں جا رہا ہُوں۔ کسی اَور کو بتانے لیجانے کی ضرورت نہیں۔ وقت تنگ ہے۔ سب لوگ سمجھ جائیں گے۔ بس رسم ہی کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں، رسم ہی تو کرنی ہے،" سکینہ بولی۔ "میری چار مندریاں ہیں۔ سب سے بہتر لال نگوں والی ہے۔ جا کر پہنا آئیں گے۔"

"موٹے موٹے نگوں والی؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ہاں۔"

"نہ نہ۔ وہ نہ پہنانا۔"

"کیوں؟"

"وہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ہاتھ پر پھوڑے نکلے ہوئے ہوں۔"

"جاؤ جاؤ بڑا آیا ہشیار۔ پورے تولے کی مندری ہے۔"

"بی بی، میری بات سنو،" سرفراز ہاتھ جوڑ کر بولا، "وہ ایک سادہ سا چھلا ہے نا، تمہارے پاس، وہی ٹھیک ہے۔ منگنی کا چھلا ہی ہوتا ہے۔"

"میرا ساٹن کا نیا سوٹ بھی پڑا ہے۔ وہ لے جائیں گے۔"

"کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں،" سرفراز نے کہا۔ "بس بات ہی کرنی ہے، اور نشانی کے طور پر چھلا پہنانا ہے۔"

"ہائے کچھ نہ کچھ تو ساتھ ہونا چاہیے۔"

"پھل اور مٹھائی لے جائیں گے،" اعجاز نے کہا۔

"ٹھیک ہے،" سرفراز بولا۔

"ہائے، وقت ہوتا تو تولے کا چھلا بنواتی۔ تیرے لالے کی جیب ہلکی کراتی۔"

اعجاز نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نکال لیا۔ "دیکھ، میری جیب میں کچھ بھی نہیں۔"

"ہاں ہاں،" سکینہ سرفراز سے مخاطب رہی۔ "مجھ سے کہتا ہے بنک میں پیسے رکھتا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھے، نہ مجھے کاپی دکھاتا ہے۔ اللہ جانے کس کس کے اوپر خرچ کرتا پھرتا ہے۔"

"بس تو اپنا راگ چھیڑ دے،" اعجاز بولا۔ "موقعہ محل نہ دیکھا کر۔"

"میں نے بھی جانا ہے،" حسن نے کہا۔

"میں نے بھی،" حسین بولا۔

"ابا کہے گا اسے نہیں پوچھا" سکینہ نے کہا۔

"بی بی خدا کے لیے اپنا برقعہ پہن کر نہ جانا،" سرفراز نے کہا۔

"کیوں، برقعے کو کیا ہے؟ ریشمی کپڑے کا ہے۔"

"نہ نہ، کوئی چادر اوڑھ لینا۔"

"باسا بھی چھٹی پر آیا ہے۔ وردی شردی پہن کر اچھا لگتا ہے،" سکینہ نے کہا۔

"باسے نے اُدھر کوئی پہرہ دینا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں۔"

"ابا ابا ٹانگے پر جائیں گے؟"

"ہائے ہائے خوشی کا موکا ہے۔ بندے شندے ساتھ جائیں تو عزت ہوتی ہے۔"

"ابا سالم ٹانگہ کرائیں گے؟"

سب ہیجانی کیفیت میں بول رہے تھے۔ اعجاز نے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھائے۔ "چپ کرو۔ سب چپ کرو۔ کوئی بات طے ہونے دو۔ بس ٹھیک ہے، فائنل ہو گیا۔ میں صبح صبح نکل جاؤں گا۔ بریگیڈیئر سے بات کر کے دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔ اگر وہ رضامند ہو گیا تو کل شام کو ہی رسم کر آئیں گے۔ اِس طرح سرفراز کو ایک پُورا دِن گھر پر مل جائے گا۔"

"ہاں لالہ، بالکل ٹھیک پروگرام ہے۔"

"سرفرازے، تو بڑے بڑے کام اتنی جلدی میں کرتا ہے،" سکینہ نے شکایت کی۔ "نہ خوشی کی نہ ڈھول ڈھمکا۔"

"بی بی، جب میں واپس آؤں گا تو جتنا مرضی ہے ڈھول ڈھمکا کر لینا۔ اب وقت نہیں ہے۔ تمھیں پتا ہے جہاں میں جا رہا ہوں اُدھر جنگ کی حالت ہے؟"

"ہائے اللہ،" سکینہ نے انگلیاں دانتوں میں دبا کر تائید کی خاطر اعجاز کو دیکھا۔ اعجاز نے خاموشی سے مُنہ دُوسری طرف موڑ لیا۔

"اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ اِمام ضامن باندھ کے بھیجوں گی تمھیں۔"

"چل یار،" اعجاز نے سرفراز سے کہا۔ "زمین کا چکّر لگا کے آئیں۔ کوئی بات وات بھی کریں۔ یہاں تو شور مچا ہوا ہے۔"

دونوں بھائی اُٹھ کر گھر سے باہر نکل گئے۔

حصّہ ششم

"کانٹوں کی زباں خشک ہوئی پیاس سے یا رب
اِک آبلہ پا اِس وادئی پُرخار میں آوے"

غالب

باب 14

"ہاؤ آر یو فیلنگ ٹوڈے؟" کیپٹن عمران نے سرفراز کو آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"آئی ایم آل رائیٹ" سرفراز نے ذرا سا سر موڑ کر جواب دیا۔

"بیٹر؟"

"مچ بیٹر۔"

"خوش قسمت ہو یار، ایکشن سے تھوڑی دیر ہی پہلے پہنچے۔"

سرفراز ہلکا سا مسکرا کر چپ ہو رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ بد قسمت؟؟

"مجھے دس مہینے ہو چلے ہیں۔ سارا سین دیکھ چکا ہوں۔ فرسٹ ایکٹ سے لے کر ڈراپ سین تک" کیپٹن عمران پھر بولا۔ "اینی نیوز اباؤٹ کیپٹن جمیل؟ میں سہلٹ میں تھا تو اُسے ایویکوئیٹ کیا گیا تھا۔"

"ہی ایکسپائرڈ" سرفراز نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اوہ، شِٹ!"

دونوں کچھ دیر خاموش لیٹے رہے۔

"بلڈی شیم" کیپٹن عمران پھر بولا۔ "فرسٹ ریٹ بوائے۔ ایبسولیوٹلی فرسٹ ریٹ۔" وارڈ میں دونوں کے بستر ساتھ ساتھ تھے۔ کیپٹن عمران کی بائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی گئی تھی اور اُس کی ران کا ٹنڈ منڈ تنا، جس کے سرے پر سفید پٹیوں کا موٹا سا گولا بنا تھا، لوہے کے جنگلے پہ رکھا ہوا اُوپر کو اُٹھا تھا۔

سرفراز کو بائیں کولہے پہ زخم آیا تھا مگر خطرناک نہ تھا۔ شریپنل نے مار اندر تک نہ کی تھی اور جلد کافی سرعت سے ملتی جا رہی تھی، گو اس کا ابتدائی صدمہ اِس قدر شدید تھا کہ سرفراز چار روز تک نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا رہا، جس کے دَوران اُسے کئی بوتل خون دیا گیا۔ آج اُسے مکمل ہوش میں آئے دُوسرا دِن تھا۔ پہلے روز اُس نے آنکھ کھولی

تو عمران نے اپنا تعارف کرایا۔

"کیپٹن عمران، فور ایف ایف۔"

جواباً سرفراز نے کہا۔ "کیپٹن سرفراز، سکتھ پنجاب۔" پھر سرفراز نے سوالیہ انداز میں اُس کی کٹی ہوئی ٹانگ کی جانب اِشارہ کیا۔

"اوہ دِس،" کیپٹن عمران نے اپنی ٹانگ کو دیکھا۔ "کانوائے بامبڈ۔ ڈائریکٹ ہٹ۔" پھر اُس نے سرفراز کے زخم کی جانب ہاتھ اُٹھا کر پُوچھا "واٹ ہیپنڈ؟"

"گرنیڈ اٹیک،" سرفراز نے مختصراً جواب دیا۔

"فیلڈ؟"

"نو۔ آفیسرز میس۔"

"اوئیس آئی ہرڈ اباؤٹ اِٹ۔ ٹیرراٹیک۔" عمران نے سنجیدگی سے سَر ہلا کر کہا۔

"فیلنگ بیٹر؟"

سرفراز نے اِثبات میں سَر ہلا کر جواب دیا۔ "اینڈ یو، سر؟"

"آئی وِل سروائیو،" عمران نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس کے بعد جیسے ہی سرفراز نے سَر موڑ کر دیکھا ایک مسلح سکھ سپاہی بستروں کی قطاروں کے بیچ راؤنڈ کرتا ہوا اُن کی جانب چلا آ رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے انھیں دیکھتا ہوا گزُر گیا۔ سرفراز آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ سکھ سپاہی سرفراز کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر ہلکا سا مسکرایا۔ سرفراز نے وارڈ کے دُوسرے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں ایک اَور مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ سرفراز نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے کیپٹن عمران کو دیکھا۔ عمران کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے کندھوں کو خفیف سی حرکت دی۔

"سرنڈر،" وہ بولا۔ "بلڈی شیم۔"

سرفراز سن لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔

"ایز آئی سیڈ، خوش قسمت ہو۔ ساری سیرینٹی سے سوئے سوئے گزُر گئے۔"

سرفراز کو اب کیپٹن عمران کی باتوں پہ غصہ آ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنی ڈرپ کی ٹیوب کو کھینچ کر نکال دے اَور کود کر سکھ سپاہی سے رائفل چھین لے۔ اِسی جوش میں اُس کا اُوپر کا دھڑ چھ انچ تک بستر سے اُٹھا پھر واپس گر گیا۔ ایک منٹ تک اسی تلاطم سے

گزرنے کے بعد اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

دوسرے دِن تک اُس کے حواس نے صورتِ حال کو کم و بیش قبول کر لیا تھا۔ کیپٹن عمران نے اُس کا حال احوال پُوچھا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"آئی سے، اباوٗٹ دی اٹیک آن افیسرز میس۔ دے سے کہ بنگالی افسروں نے پہلے ہی ڈائیو لگا دی تھی؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں،" سرفراز نے کہا۔

"آبویئسلی دے وران دانو۔"

"پاسبل،" سرفراز نے سَر ہلا کر اتفاق کیا۔

"باسٹرڈز۔ تم نے کوَر نہیں لیا؟ سلو، وَریئو؟"

"مجھے یاد نہیں، سر،" سرفراز نے جواب دیا۔

مگر اُسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ کیپٹن عمران نے درست سنا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے بنگالی افسروں نے اچانک جستیں بھرنی شروع کر دی تھیں۔ چشم زدن میں وہ میزوں کرسیوں کے نیچے غائب ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ کے بعد کھڑکی کے راستے پھینکا گیا گرینڈ لڑھکتا ہوا آ کر سرفراز کے پاؤں سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سرفراز اپنی تمامتر آرمی ٹریننگ کو بھول گیا اور اپنے پاؤں پہ کھڑا اُس گرینڈ پہ نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ اُس کی نظروں میں کبھی وہ اُٹھ کر اس کی آنکھوں کے قریب آ جاتا حتیٰ کہ سرفراز اُس کے پائن ایپل کی ساخت والے، ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہُوئے چانے الگ الگ دیکھ سکتا تھا۔ پھر دُوسرے ہی لمحے وہ نظر سے دور ہوتا ہوا، زمین کو اپنے ساتھ لیتا، ہٹتا ہٹتا ایک چھوٹے سے کالے دھبے میں تبدیل ہو جاتا۔ جب وہ قریب آتا تو سرفراز کے دِل میں خیال آتا کہ کیا یہ اب پھٹے گا؟ پھٹے گا تو پھر کیا ہوگا۔ اس خیال کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ہلنے سے قاصر رہتا۔ اگلے لمحے جیسے ہی وہ سیاہ گیند پرے ہٹنے لگتا اُس کے پھٹنے کا خیال مٹ جاتا اور سرفراز عجیب طرح سے اپنے آپ کو محفوظ تصور کرنے لگتا۔ ایک سیکنڈ کے بعد دُوسرا سیکنڈ گزر گیا۔ "گیٹ ڈاوٗن" کسی نے چیخ کر کہا، "گیٹ ڈاوٗن یُو فول۔"

سرفراز گویا نیند سے جاگ اُٹھا۔ اُس نے پلٹ کر مُنہ کے بل زمین کی جانب جست

بھری۔ وہ ابھی ہوا میں ہی تھا کہ گرنیڈ ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

"سے بی،" سرفراز نے کہا، آئی واز اے بٹ سلو سر۔"

"ڈیم بیڈ لک،" عمران نے کہا۔

ڈاکٹروں کے مختصر راؤنڈ اور ڈریسنگ وغیرہ کے بعد وہ سارا دن مکمل طور پہ فارغ ہوتے تھے۔ سرفراز اور عمران کے بستروں کے سامنے دیوار میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ان سے پرے پچیس گز تک زمین خالی تھی اور اس سے آگے خاردار تاروں کی دو باڑیں تنی تھیں۔ اُن کے بعد ایک وسیع کھیت تھا جو غیر آباد پڑا تھا۔ کھیت میں جگہ جگہ خودرو جھاڑیاں اور کہیں کہیں گھاس اُگی تھی۔ اُس کھیت میں دن بھر ایک بکری پھرتی رہا کرتی تھی۔ بکری کا معمول تھا کہ وہ باڑ کے ساتھ ساتھ، گھاس اور جھاڑیوں پہ منہ مارتی ہوئی اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر چکر لگاتی رہتی تھی۔ سرفراز اور عمران کے لیے جو اپنے اپنے بستروں میں قید تھے اور کرنے کے لیے جن کے پاس دن بھر کوئی کام نہ تھا، بکری آزاد فضا کی علامت تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اُس بکری کو دیکھتے رہا کرتے تھے۔ آخر ایک روز انھوں نے ایک کھیل شروع کر دیا۔ وہ بکری کے چکر گننے لگے۔

تین کھڑکیوں میں باری باری بکری کا سر نمودار ہوتا اور بائیں جانب غائب ہو جاتا۔ تقریباً دس یا بارہ منٹ کے بعد اُس کی واپسی ہوتی۔ آخری کھڑکی میں اُس کا سر دکھائی دیتا پھر تینوں کھڑکیوں کے سامنے سے گزر کر وہ دائیں طرف کو چلی جاتی۔ اِسی طرح وہ دائیں اور بائیں ٹہلتی رہتی۔ کھیل کے دو مختلف حصے تھے۔ پہلا حصہ بکری کے سر کو دائیں یا بائیں جانب کی کھڑکی میں دیکھ کر "سنیپ" کہنے کا تھا۔ جو کوئی ایک سیکنڈ دیر کر دیتا اُس کا ایک نمبر کاٹا جاتا تھا۔ ایک نمبر کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی تھی۔ دوسرا حصہ دن کے آخر میں بکری کے کل چکروں کا شمار تھا۔ کاغذ، قلم دستیاب نہ تھے، اِس لیے حساب دماغ میں رکھنا پڑتا تھا۔ دن کا وقت گزارنا سب مریضوں کا مسئلہ تھا۔ پہرے داروں کی ہدایت کے مطابق آپس میں کم سے کم گفتگو کی اجازت تھی۔ نہ زبان اور نہ ہی ہاتھ، پیر ہلانے کی، اور

نہ دماغ خرچ کرنے کو کچھ تھا۔ چنانچہ جب سرفراز اور عمران کے آس پاس کے بستروں والے لوگوں نے کسی حد تک کھیل کے اُصول سمجھ لیے تو وہ بھی بن بلائے اُس میں شریک ہو گئے۔ افسر، جونیئر کمشنڈ اور نان کمشنڈ سب ملے جلے اِس وارڈ میں پڑے تھے۔ کھیل صرف دو دو کے جوڑے آپس میں کھیلتے تھے اور جوڑے بنانے میں رینک کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کھیل کی حد تک جو الفاظ بولے جاتے تھے اُن میں پہرے دار بھی مخل نہ ہوتے تھے۔ کسی جوڑے میں سے کوئی ایک اگر نیند کے غلبے میں آ جاتا تو تین روپے فی منٹ کے حساب سے کاٹ کر اُس کے منفی کھاتے میں ڈال دیئے جاتے تھے۔

کھیل کے پہلے حصے کا حساب رکھنا آسان تھا۔ کھڑکی میں بکری کا سَر دیکھ کر پہلی آواز لگانے والوں کا حساب رکھنا صرف ایک ایک روپیہ اُوپر نیچے کرنے کا معاملہ تھا اور ہر دس بارہ منٹ کے بعد نئی رقم نکل آتی تھی۔ مگر دِن بھر کے پھیرں کا حساب یاد رکھنے میں مشکل پیش آتی تھی، جِس پہ بعض اوقات اختلاف پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

"تیس پھیرے،" بکری کے رخصت ہونے پر کیپٹن عمران کہتا۔

"اونہوں،" سرفراز نفی میں سَر ہلاتا۔ "اِکتیس۔"

"تیس۔"

"اِکتیس۔"

"بیٹ؟"

"او کے۔" سرفراز اتفاق کرتا۔

"سَو؟"

"آئی کانٹ افورڈ اِٹ،" سرفراز کہتا۔

"ففٹی؟"

"ٹونٹی فائیو۔"

"ڈن،" عمران کہتا۔ "کیوں صوبیدار صاحب، کتنے چکّر ہوئے؟"

"اِکتی سر،" صوبیدار خُدا داد خان، جِس کا ایک پیر زخم کی وجہ سے گل چکا تھا، فیصلہ کن انداز میں کہتا۔

کیپٹن عمران کے مائنس حساب میں پچیس روپے ڈال دیئے جاتے۔ "لائیرز!"

کیپٹن عمران زیرِ لب بڑبڑاتا۔ رقوم کا لین دین گو فی الوقت خیالی تھا مگر اُس پہ جو لے دے کی جاتی وہ اپنی اپنی عزت قائم رکھنے کا بہانہ بن گئی تھی۔ درحقیقت بکری ان لوگوں کے لئے زندگی کا سہارا بن چکی تھی۔

شام ہونے سے کچھ پہلے جب بکری کا مالک اُسے لے کر چلا جاتا تو بتیاں بجھانے کے گھنٹے تک اُن کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ بے رونق چہرے لئے اپنے اپنے بستروں پہ ایسے لیٹے اور بیٹھے ہوتے جیسے کوئی عزیز ہستی اُن سے بچھڑ گئی ہو۔

"اگر ایک روز مالک نے بکری کو ذبح کر کے کھا لیا تو؟" ایک سپاہی کہتا۔

"ہندو ہے،" دُوسرا جواب دیتا "اُس کی لٹ نہیں دیکھی؟ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے۔"

"اگر اُس نے بیچ دی تو؟" پہلا اپنا نظریہ یاسیت جاری رکھتا۔

"دودھ دینے والی ہے،" تیسرا کہتا "مالک کبھی نہیں بیچے گا۔"

"تجھے کیسے پتا ہے دودھ دیتی ہے؟"

"میں نے اُس کے تھن دیکھے تھے۔ بھرے ہوئے تھے۔"

"تھن تو نظر ہی نہیں آتے۔"

"ایک دن میں اُٹھ کر بیٹھا تھا۔ ہاتھوں پر اُٹھ کر تھن دیکھے تھے۔"

"تمہارے جوڑوں پر زخم ہیں۔ تم بیٹھ نہیں سکتے۔"

"ایک دن بیٹھا تھا،" تیسرا تنگ آ کر کہتا "اُسی دن سے تو زخم زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ لیٹا لیٹا تھک گیا تھا۔"

پہریدار آ کر اُنہیں باتیں کرنے سے منع کر دیتا۔

جب بکری چکر لگا رہی ہوتی تو سامنے کے مریضوں کی قطار بستروں پر دراز، نیم دراز چوکنی بیٹھی ہوتی اور کئی سر ایک ساتھ وقفے وقفے پر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہل رہے ہوتے۔ بکری کو بھی کسی طور ان لوگوں کے ساتھ اپنے تعلق کی آگاہی ہو چکی تھی۔ سرفراز کو یقین تھا کہ بکری سیدھا منہ اُٹھا کر اُنکی جانب نہیں دیکھتی بلکہ انکھیوں سے اُنہیں بھانپتے ہوئے گزرتی ہے۔ کئی اور وجوہات کی بنا پر بھی سرفراز بکری کی خصوصیات کا قائل ہو چکا تھا۔ مثلاً بکری کبھی باڑ سے پرے میدان میں نہ جاتی تھی گو اُس

میدان میں کئی جھاڑیاں اُگی تھیں اور ایک دو جگہ پر سبز گھاس خاصی گھنی تھی، بلکہ وہ ہمیشہ باڑ کے برابر ہی آگے پیچھے سفر کرتی تھی۔ سرفراز کو اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اتنے سارے مردوں کے مقابل بکری کو اپنی نسوانیت کا احساس ہو چکا تھا۔ اِس خیال سے سرفراز کی نظر میں بکری اِس حد تک پرکشش ہو گئی تھی کہ اُسے بکری کی چال میں اٹھکیلیاں نظر آتی تھیں اور اس کے ہر دم ہلتے ہُوئے ہونٹ اور گھاس پات سے بھرے بھرے گال اُسے دلکش دکھائی دینے لگے تھے۔

جس روز اُس مقام سے، جو ایک سکول کو خالی کرا کے ہسپتال میں تبدیل کیا گیا تھا، اٹھا کر انہیں لے جایا گیا اُس روز لوگوں نے دیکھا کہ بکری متعدد بار کھڑکیوں کے سامنے رُک رُک کر اُن کی جانب منہ اُٹھائے کھڑی رہی اور "میں میں" کرتی رہی۔ اُس کو اپنے چاہنے والوں کے کُوچ کی خبر ہو چکی تھی۔ سرفراز کی قطار والے لوگوں کی عجیب گومگو کی حالت تھی۔ ایک طرف تو اُن کے اندر ہسپتال سے اُٹھ کر، جہاں اُن کی زندگی ایک ڈھب پہ قائم ہو چکی تھی، کسی نامعلوم مقام پہ لے جائے جانے کا ہیجان تھا۔ دوسری جانب بکری سے بچھڑ جانے کا غم تھا اور آگے روٹین کا کچھ علم نہ تھا۔ اِن کے برعکس مقابل کی قطار والے لوگ، جنھوں نے پہلے پہل اِس کھیل میں شامل ہونے کی سعی کی تھی مگر بکری والی کھڑکیوں کی جانب پُشت ہونے کے باعث ناکام رہے تھے، کم از کم بکری کے غم سے آزاد تھے۔ آخری لمحوں میں جمعدار سلیم نے منہ کھولا۔ وہ تیس سالہ میٹرک پاس نوجوان ادبی ذوق کا مالک تھا اور پُرانے پُرانے شاعروں کے سینکڑوں شعر اُسے ازبر تھے جنھیں وہ موقعہ محل کی مناسبت سے پڑھتا رہتا تھا۔ جنگ کے دوران اُس کا چہرہ اور سینہ بری طرح جھلس گیا تھا اور پٹیاں اِس طرح بندھی تھیں کہ صرف ناک، منہ اور آنکھوں کے سوراخ کھلے تھے۔ جب اُس کی پٹی کی جاتی تھی تو جلد چیتھڑوں کی مانند اُترتی تھی اور دُوسرے منہ پھیر لیتے تھے۔ مگر اُس کو اپنے شعر کبھی نہ بھولے تھے۔ سرفراز کا خیال تھا کہ انہی شعروں کی مدد سے وہ ابھی تک زندہ تھا۔ جب اُسے سٹریچر پہ ڈالا جا رہا تھا جمعدار سلیم نے بکری کی جانب منہ اُٹھا کر آخری شعر پڑھا۔ "یوں اُٹھے آج اِس گلی سے ہم، جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے۔"

اِس طرح وہ اپنے مشکل وقت کی اُس بے زُبان ساتھی سے جدا ہُوئے جس نے اُن کے لئے ایک انسان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

"ڈیرسٹ چھیمی،" سرفراز نے لکھنا شروع کیا "یہاں جو حادثہ رونما ہوا ہے اُس کا تمہیں علم ہو گیا ہو گا۔ اِس بڑے حادثے سے چند روز قبل ایک چھوٹا سا حادثہ میرے ساتھ پیش آ گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے کچھ دِن ہسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔ مگر اب میں بالکل تندرست ہوں، فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں ٹرین سے نارائن گنج، پھر سٹیمر کے ذریعے دریائی راستے سے لے جایا گیا۔ رات کے وقت سٹیمر ایسی جگہ پہ کھڑا کیا جاتا جہاں دریا مگرمچھوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی فرار نہ ہو سکے۔ اِس طرح ہم کلکتے پہنچے۔ وہاں سے پھر ٹرینوں پر سوار کرا کے اِس شہر میں پہنچایا گیا جس کا نام رانچی ہے۔ اب ہم شہر کے باہر کیمپ نمبر اٹھانوے میں مقید ہیں۔ ان حرامیوں نے ہمیں نظربند کرنے کے لِئے کیج تیار کر کے رکھے ہیں۔ کیج، یعنی پنجرے۔ میں کیج نمبر تین میں ہوں۔ ان کیجز کا نقشہ اِس طرح ہے۔ عام فوجی بیرکیں ہیں جو سپاہیوں کے لِئے بنی ہوتی ہیں۔ ایک ایک میں چار چار، چھ چھ، آٹھ آٹھ آدمی ہیں۔ بیرکوں میں ہمارے سونے کے لِئے چارپائیاں ہیں۔ ہمارے کیج میں تقریباً اسی بیرکیں ہیں۔ جو چیز انہیں پنجرے بناتی ہے وہ اِردگرد کی حفاظتی تدابیر ہیں۔ کیج کے گرد سب سے پہلے خاردار تار کے گول گول چکروں کی باڑ ہے۔ اِس کے بعد ہاف ٹریک۔ پھر ایک راستہ ہے جس میں گارڈ پھرتے رہتے ہیں۔ اِس کے بعد ٹرپ فلیئرز کی باڑ ہے۔ اُس سے آگے چاروں طرف زمین دوز مائنز ہیں۔ آگے خونخوار کتے چھوڑے ہوئے ہیں جو چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اُن کے بعد مزید گارڈ ہیں جن کے لِئے الگ بیرکیں بنی ہوئی ہیں۔ کچھ گارڈ اُن کے اُوپر اور کچھ نیچے پھرتے ہیں۔ ہر طرف سرچ لائٹیں نصب ہیں جو بھری دوپہر میں بھی جلتی رہتی ہیں۔ اِن اقدامات سے معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نہتے قیدی نہیں بلکہ ایک فوج ہیں جو اندر توپیں گاڑے بیٹھے ہیں۔ اِن بزدل بنیوں کی ذہنیت ہی ایسی ہے۔ البتہ اِس سے ایک فائدہ ہوا ہے، کہ شکست خوردگی کا احساس جس نے پہلے چند روز تک ہمیں پژمردہ

رکھا تھا، یہ صورت دیکھ کر غصے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے دِلوں میں قوتِ مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے اَور یہاں سے فرار کا اِرادہ پکا ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے کیج کے بعد ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ صبح سویرے میدان میں فال اِن کرا کے ہماری گنتی کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ناشتہ ملتا ہے، جو ایک خشک روٹی اَور پھیکے پانی کے سے شوربے پر مشتمل ہوتا ہے۔ دِن بھر ہم لوگ تقریباً فارغ ہوتے ہیں۔ میری بیرک میں ہم چھ آدمی ہیں۔ چار ہم انفنٹری کے افسر ہیں۔ ہم چاروں کا گروپ بن گیا ہے۔ لفٹنٹ فضل، کیپٹن عزیز، کیپٹن افتخار، اَور میں۔ رینک سینئر جونیئر ہونے کی وجہ سے ہم فوجی آداب کا خیال تو رکھتے ہیں، مگر سوائے اِس کے ہمارے درمیان مکمل برابری کی فضا ہے۔ ہم چاروں کے علاوہ ایک ایئرفورس کا آفسر ہے۔ وہ پینتیس کے لگ بھگ کا وِنگ کمانڈر ہے۔ اُس نے آتے ہی ڈاڑھی بڑھا لی ہے اَور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ چھٹا آدمی انجینئرز کور کا ہے۔ وہ مذہب کی جانب راغب تو نہیں ہوا، اَور نہ ہی اُس کا کوئی اَور شغل ہے۔ مگر وہ خاموش طبیعت ہے اَور الگ تھلگ رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت تک ہم بیرک میں بیٹھے یا میدان میں کھڑے باتیں کرتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ ہندوستانی اخبار مل جاتا ہے، جس کا ایک ایک لفظ ہم پڑھ کر چھوڑتے ہیں، گو ہمیں معلوم ہے کہ صرف وہی اخبار ہمیں مہیا کیا جاتا ہے جس میں ہمارے خلاف پروپیگنڈا، یا ہمیں بدظن کرنے کے لِئے کسی ہندو یا سرکاری مسلمان کا لکھا ہوا میٹیریل ہوتا ہے۔ مگر ہم اسے وقت گزاری کے لِئے پڑھتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی روٹی اَور پتلی سی دال کا ملتا ہے۔ روٹی کا آٹا مٹی ملا ہوا ہوتا ہے جو دانتوں میں کرچ کرچ کرتا ہے۔ دال ایک عجیب نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اِسے موٹھ کی دال کہتے ہیں۔ میں نے تو یہ دال اَپنے علاقے میں نہیں دیکھی۔ وَیسے تو یہ ثابت دالوں کی طرح گول دانے دار ہوتی ہے، مگر اندر سے خالی ہوتی ہے۔ اس کے اندر گودا نام کو نہیں ہوتا، صرف چھلکا ہوتا ہے اَور اندر پانی بھرا ہوا ہوتا ہے۔ دانت میں دباؤ تو دانہ چھونے سے غبارے کی طرح پھٹ جاتا ہے اَور یوں لگتا ہے جیسے چھلکے کے ساتھ روٹی کھا رہے ہیں۔

میدان کے اندر پانچ وقت باجماعت نماز ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے کچھ دِل کو سہارا دینے اَور کچھ وقت گزاری کے لِئے مذہب کی جانب رجوع کر لیا ہے۔ چند لوگ

میدان کے کونے میں تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے چند سبزیاں بوئی ہیں، اور فارغ وقت وافر ہونے کے باعث بے ضرورت گوڈی کرتے رہتے ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہُوں پودے کو جڑ پکڑنے دو، زیادہ گوڈی اچھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ لوگ نہیں سنتے۔ یہاں پر کئی لوگوں کی خصلت بدل گئی ہے۔ بات سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں، اپنی ہی کیے جاتے ہیں۔ رات کا کھانا پھر وہی روٹی اور موٹھ کی دال کا پانی، جس کے اندر کبھی کبھی کسی گلی سڑی ہُوئی سبزی کی جڑ تیر رہی ہوتی ہے۔

آٹھ دس دِن اِس جگہ پہ رہنے کے بعد آدمی کا دھیان صرف ایک چیز پر جم جاتا ہے، اور وہ اگلے وقت کا کھانا ہے۔ کھانا جس کو ہم عام زندگی میں اِس لائق نہیں سمجھتے کہ اِس پر توجہ صرف کی جائے اور جو اپنے وقت پر گویا خُود بخود سامنے آموجود ہوتا ہے، وہی کھانا ساری زندگی کا محور بن جاتا ہے۔ آج تک میرے نزدیک کھانے کا رشتہ صرف اِشتہاء سے رہا ہے۔ بلکہ ہم ایسی شکم سیر زندگی بسر کرتے ہیں کہ ایک آدھ وقت کا کھانا چھوٹ بھی جائے تو فرق نہیں پڑتا۔ اِشتہاء محسُوس ہو تو کھانا جب چاہیں، جہاں چاہیں، حاصل ہو جاتا ہے۔ کھانے کی جگہ ہمیشہ اشتہاء کے بعد آتی ہے۔ یہاں پر کھانے کی بے مزگی کی وجہ سے اِشتہاء ناپید ہو چکی ہے، چنانچہ کھانا اپنی ایک الگ شخصیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں ہوتی ہے کہ اگلا کھانا وہی پانی والی دال اور ریت والی روٹی کا ہو گا مگر اِس کے باوجود دِل میں کسی خوش آئند واقعے کی اُمید، کسی معجزے، کسی شعبدے کی توقع ہوتی ہے، اور اِن سب آرزوؤں کا مرکز اگلے وقت کا کھانا ہوتا ہے۔ جب وہ حسب معمول گزُر جاتا ہے تو پھر اُس سے اگلے وقت کا کھانا محورِ خیال بن جاتا ہے۔ یوں مستقل "اگلے وقت" کے کھانے کے گرد جو تمناؤں کا جال بنا ہوتا ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اِس طرح ساری انسانی خواہشات اُس آئندہ آنے والے کھانے کے گرد گھُومتی ہیں جو ذہن کی فضا میں ایک ستون کی طرح نصب ہوتا ہے، ایسا ستون جس تک رسائی ناممکن ہو۔ اس کی مماثلت اُن آئیڈیلز سے ہے جن کے سہارے لوگ زندہ رہتے ہیں۔

روزمرہ کی گفتگو کا بڑا حصہ بھی کھانے کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ ایک افسر میجر صدیق نے کہیں سے ٹماٹر کا بیج حاصل کرکے پودا لگایا ہے، جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ہماری بیرک کے علاوہ دُوسری بیرکوں والے بھی اِس پر نظریں رکھے ہُوئے ہیں۔ ہم سب

کو سرخ سرخ رس بھرے ٹماٹروں کے خواب آتے ہیں۔ دِن میں کئی بار ہم پودے کے پاس جا کر اس کا معائنہ کرتے ہیں۔ جیسے وہ ہم سب کا بچّہ ہو جیسے پالنے پوسنے اَور تندرست رکھنے کا فرض ہم سب پر عائد ہوتا ہو۔ ہم اُس دِن کا انتظار کرتے ہوئے نہیں تھکتے جس روز اُس پہ پھل آئے گا۔

ہفتے میں دو بار گوشت پکتا ہے۔ کہنے کو یہ گوشت کا سالن ہوتا ہے مگر دراصل وہی بے نمک مرچ کا شوربہ ہوتا ہے جس کے اندر کہیں کہیں کوئی ننھا سا چھیچھڑا تیر رہا ہوتا ہے۔ یہ دال خور بنیئے ہمیں شاید مردہ جانوروں کا گوشت کھلاتے ہیں، گو بتایا یہی جاتا ہے کہ حلال گوشت ہے جو "مسلے" قصائیوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اُن دو دِنوں میں ہم سب کی آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اَور کم از کم دو ایک نوالے ہم شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد پتا چلتا ہے کہ اشتہاء کا نام و نشان مٹ چکا ہے اَور ہم زندہ رہنے کو، یا محض عادتاً کھائے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بھی پہلے دو نوالوں کی حد تک خوب گہما گہمی رہتی ہے۔

کھانے کے بعد دُوسرے نمبر پر فرار کا خیال ہمارے دلوں میں ہر دم جاگزیں رہتا ہے۔ آج کل ہم نے یہاں سے فرار کی ایک سکیم کو شروع کر رکھا ہے۔ اِسکی پلان بھی میجر شاہ زمان نے بنائی ہے۔ اس کی تفصیل اگلے خط میں لکھوں گا۔ اِس سکیم کے بارے میں ہماری عجیب کیفیت ہے۔ اس سکیم کے کامیاب ہونے کی ہمیں اُمید ہے، ورنہ ہم اتنا بڑا رسک کیوں لیں۔ مگر ساتھ ہی، جیسا کھانے کے بارے میں ہمارا رویہ ہے، ویسا دِل کے اندر ہمیں یہ بھی علم ہے کہ وقت آنے پر ہمیں ناکامی کا سامنا کرنے پڑے گا۔ یہاں پر ہر ایک کے اُوپر ایک ساتھ اُمید اَور نااُمیدی کی کیفیت طاری رہتی ہے، جوان کیمپوں کی خاصیت ہے۔ یہ ہر دو جذبے ہم وقت گزاری کے لئے، یا محض عادتاً اختیار کر چکے ہیں۔

ہم سب کا وزن دِن بدن کم ہوتا جا رہا ہے، سوائے چار چھ لوگوں کے جو ہمارے کیج کی دوسری بیرکوں میں رہتے ہیں۔ وہ نماز کے علاوہ زیادہ تر وقت نفل پڑھنے اَور وظیفہ کرنے میں صرف کرتے ہیں، اپنی تین وقت کی روٹی ہڑپ کر جاتے ہیں اَور جو پتلا شوربہ اَور دال کے بلبلے بچ رہتے ہیں اُنہیں برتن اٹھا کر پانی کی طرح پی جاتے ہیں۔ پھر جلد ہی وہ خوابِ خرگوش میں محو ہو جاتے ہیں تاکہ تہجد کے وقت اُٹھ کر پھر اپنی روٹین شروع کر

دیں۔ بیچ بیچ کے وقت وہ تسبیح رولتے ہوئے اِدھر سے اُدھر پھرتے رہتے ہیں اور کسی دوسرے آدمی سے بہت کم بولتے ہیں، یا پھر شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مُنہ دیکھتے ہوئے ڈاڑھی کے فالتو بال نوچتے رہتے ہیں۔ صرف یہ لوگ ہیں جو مکمل اطمینان سے روز بروز فربہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مُجھے اِن کا فارمولا پسند ہے، اور کئی بار دِل میں حسرت پیدا ہوتی ہے کہ اِسے اپنالوں، مگر افسوس کہ خواہش رکھنے کے باوجود اِسے اختیار نہیں کر سکا۔ کتنے خوش قسمت ہیں یہ لوگ!""

یہاں پہنچ کر سرفراز نے خط کا مضمون ختم کر دیا۔ یہ جھوٹ موٹ کا خط تھا۔ یہ وہ خط تھا جو وہ لکھنا چاہتا تھا، مگر اُسے علم تھا کہ لکھ نہیں سکتا۔ چنانچہ اُس نے اپنے لِئے ایک فارمولا ایجاد کر لیا تھا۔ وہ قلم کا اُلٹا سرا کاغذ پر رکھ کر لکھنا شُروع کر دیتا اور لکھتا جاتا، یہاں تک کہ اُس کا ہاتھ تھک جاتا۔ گو کاغذ پر لفظ نمودار نہ ہوتے، مگر سرفراز کے اندر اپنے قریبی لوگوں کو اصل حالات سے آگاہ کرنے کی جو ناقابلِ برداشت خواہش تھی، وہ کچھ نہ کچھ پُوری ہو جاتی تھی۔ کیمپ کی فضا میں اُمید اور نااُمیدی کی جو ملی جلی کیفیت ان کے اندر سرائیت کر چکی تھی وہ خُود فریبیوں کا ملغوبہ تھا۔ اسے وہ دِن کاٹنے کی خاطر سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ سرفراز جھوٹ موٹ کے خط سے دِل کا غبار نکال چکتا تو قلم سیدھا کرتا اور اصلی خط شُروع کرتا۔ اُن سب کو ایک ایک کارڈ دیا جاتا تھا، جس کے اُوپر پتہ پرنٹ کیا ہوا تھا: کیمپ ۹۸۔ بھارت۔ اِس کارڈ پہ اُنہیں پچیس لفظ لکھنے کی اجازت تھی۔ سرفراز لکھتا۔

ڈیرسٹ جیمی: میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہماری نگہداشت درست ہو رہی ہے۔ زندگی معمول کے مطابق گزُر رہی ہے۔ تمہارا سری۔"

اُمید اور نااُمیدی کی ویسی ہی کیفیت اعجاز کے اِرد گرد بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اُس کی پارٹی کی حکومت آئی: اُمید و بیم، توقعات، خواہشات اور مطالبات چھلانگنے

پھلانگتے ہُوئے آوارہ ہُوئے۔ مگر جوں جوں دِن گزُرتے گئے یہ راز، جو کوئی راز بھی نہ تھا، اُن پر آشکار ہوتا گیا کہ جو کام پہلے نہ ہوتے تھے، وہ اب بھی نہیں ہو رہے۔ گو ملک کا مشرقی حصہ بنگلہ دیش بن چکا تھا اور اُن کا لیڈر موت کی کال کوٹھڑی سے رہا ہو کر واپس جا چکا تھا، مغربی حصے میں مارشل لاء ابھی قائم تھا۔ اُن کا لیڈر دُنیا کا پہلا سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن چکا تھا اور اُس کے وزیر اپنے اپنے محکموں کے افسروں سے کام سیکھ رہے تھے۔ عوام کے محکمانہ کام اُنہی افسروں کے ہاتھ میں تھے جن کے اختیار میں پہلے تھے اور بندوبست اُسی رفتار سے جاری تھا جیسا ہمیشہ سے چلا آیا تھا۔ لیڈروں کے وعدے وعید حکومتی گورکھ دھندوں میں پھنس کر غائب ہو چکے تھے۔ نااُمیدی جڑ پکڑ رہی تھی۔

جنگ میں شکست کے احساس نے قوم کے دِل کو شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ نہ شکنجہ ڈھیلا ہوتا تھا، نہ جذبات کو نکاس کا رستہ ملتا تھا۔ ایک "صُمٌ بُکمٌ" کی کیفیت تھی جس نے اِسے موضوعِ ممنوعہ کی حیثیت دے دی تھی۔ گویا لوگ دِلوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہوں۔ اندر اندھیرے کی فضا تھی۔ آٹھ دس ماہ تک مستقل روشنی میں رہنے کے بعد اندھیرے کے بعد اندھیرے کا پردہ یکدم جو گرا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روشنی جو اُنہیں دیکھائی جا رہی تھی، دِن کی روشنی نہ تھی بلکہ رات کی روشنی تھی جو ہاتھ سے جلائی گئی بتیوں سے پیدا کی گئی تھی، جس کے اندر اُنہیں فریب نظر کے کرشمے دِکھائے جاتے رہے تھے۔ جب ہوا تیز چلی اور بتیاں بجھ گئیں تو تاریکی ہی تاریکی تھی جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ اس قوم کو کئی بار لڑائی کے میدانوں میں ہار ہُوئی تھی۔ سینکڑوں برس کے زمانے میں جنگوں سے سابقہ پڑا تھا، کبھی جیت ہُوئی تھی کبھی ہار۔ مگر کبھی شکست کا احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی ہمت نہ ٹُوٹی تھی۔ اب اِس فریب کاری نے جو اپنے ہی لوگوں نے اپنی قوم پر روا رکھی تھی، اِس حربی ہار کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی میں جو لوہے کی سلاخ تھی وہ دوہری ہو چکی تھی۔ کوئی کھلے بندوں اِس کا ذکر نہ کرتا تھا، مگر لوگوں کا اعتبار پہلے دوسروں پر، پھر اپنے آپ پر سے اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ اُن کا چارا کچھ ایسی کیفیت سے تھا کہ جیسے وہ بازار تک گئے ہوں اور جب واپس آئے ہوں تو گھر کا آدھا سامان چور اُٹھا کر لے جا چکے ہُوں۔ سامان کا نقصان صرف آنکھوں کے سامنے تھا، مگر ذِلت اور بے بسی کا احساس دِل پہ وار کرتا تھا، کہ کوئی اُن

کے دروازے میں داخل ہو کر للکارتا ہوا دُوسرے راستے سے نکل گیا تھا۔ ناطاقتی کے اِس احساس سے ہر شے پہ اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ اعتبار کے اُٹھ جانے سے مستقبل کا دِکھاوا پامال ہو چکا تھا۔ یقین محکم جیسے الفاظ محض نعرے دکھائی دینے لگے تھے۔ ہار اَور جیت بے معنی ہو چکی تھی۔ اُن کے ساتھ دغا ہوا تھا۔

یہ تاریخ کا عجیب کھیل تھا کہ اعجاز اَور سرفراز ایک دُوسرے سے ہزاروں میل دُور ہونے کے باوجود اِسی اُمید اَور نااُمیدی کی گڈمڈ فضا میں سانس لے رہے تھے جس کے ماضی نے حال کو جنم دیا تھا۔ مگر حال بانجھ ہو چکا تھا اَور مستقبل کو جننے سے قاصر تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار اِس حد تک اعتماد سے عاری ہو چکے تھے کہ سب سے پہلے اِس چھینا جھپٹی میں شامل ہو گئے۔ سن سینتالیس کی تاریخ دہرائی جانے لگی۔ اُس وقت یہ تاریخ ایک وسیع و عریض المیئے کی پیداوار تھی۔ جب دہرائی گئی تو اِس نے ایک مضحکے کی صورت اِختیار کر لی۔ اب مُلک چھوڑ کر بھاگنے والے ہندوؤں اَور سکھوں کا مال اِن کا ہدف نہ تھا۔ اب لوگ اَپنے بھائی بندوں کے مقابل کھڑے تھے۔ سب تعلق اَور واسطے دِلوں سے فرار پا چکے تھے۔ تاریخ نے اَپنے سے سبق نہ سیکھنے والوں پہ غضب کے قہقہے لگانے شرُوع کر دیئے تھے۔

اعجاز انتہائی انتشار کے عالم میں تھا۔ ایک طرف اُسے بھائی کے جنگی قیدی بن جانے کا غم کھائے جاتا تھا۔ دُوسری جانب اُس پہ اَپنے حمایتوں، پیروکاروں غریب مزدوروں کا دباؤ تھا، جو اُس سے اَپنی توقعات پُورا کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ تنخواہوں میں اضافے کی تکرار، ہڑتالیں، تالہ بندیاں، منگائی، اِن سب چیزوں کا بوجھ اُس پہ آ پڑا تھا۔

ابھی لیبر کے بارے میں کوئی نئی قانون سازی نہ ہو سکی تھی، مگر محنت کش صبر کی تلقین پہ سیخ پا ہوتے تھے۔ یہ بھی اعجاز کے ساتھ ایک مذاق تھا کہ اَپنی حکومت آنے پر اُسے پتا چلا کہ وہ اَور اُس جیسے دُوسرے لوگ کتنے بے اختیار تھے۔ وہ افراتفری کے عالم میں ہر طرف بھاگا پھرتا تھا۔ اُوپر سے سکینہ کا اِصرار دِن رات جاری تھا۔

"تمہیں تو نہ آج وقت ملے گا نہ کل۔ زمین بنجر ہو رہی ہے۔ ابا چار پانچ کِلّے کر سکتا تھا، وہ اُس نے کر دیئے ہیں۔ سال کے دانے گھر میں آ گئے ہیں۔ ابّے کے سَر کو دعائیں دو۔ اِس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتا۔ میں صرف بیلنے کے کام کا ذمہ لیتی ہوں۔ خُدا

کا شکر کرو کہ گڑ کی منڈی تیز ہو گئی ہے۔ دُوسرا مربع ٹھیکے پر دے دو۔ ابے کے پاس لوگ آ رہے ہیں۔ اِتباری ہیں۔ ٹھیکہ وقت پر دینے کی گرنٹی دیتے ہیں۔ ابا نگرانی کرنے کو تیار ہے۔"

گڑ کا کام شروع کرنے سے پہلے اعجاز خُود دُوسروں کی زمین ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتا رہا تھا۔ جب گڑ کا کام چل نکلا تو اُس نے اپنی زمین خرید لی تھی۔ مگر اُس کی مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیس پچیس ایکڑ گنے کی کاشت کے علاوہ باقی کی زمین خالی چھوڑ رکھی تھی۔ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اپنی زمین کو کسی دُوسرے کے ہاتھ میں دینا اُسے کبھی گوارا نہ ہوا تھا خواہ وہ ٹھیکے دار ہوں یا آدھے کے مزارعے ہوں۔ اِس تجویز کی اُس نے ہمیشہ مخالفت کی تھی، گو جب بھی پُوچھا گیا وہ کوئی مناسب وجہ بیان نہ کر سکا تھا۔ مگر اب ایسا موقعہ آیا تھا کہ اُس کے دِل اور دماغ کی سطح نرم پڑتی جا رہی تھی، جیسے اُبال کھا کھا کر اُس پہ ننھے ننھے بلبلے پیدا ہو گئے ہوں۔ سرفراز کی قید نے اُس کی کمر توڑ دی تھی۔ آخر سکینہ کے آگے بھی اُس کی ہمت جواب دے گئی۔

"اگر ٹھیکہ وصول نہ ہوا تو پھر میرے پاس دوڑتی ہُوئی نہ آنا" اُس نے جواب دیا۔

سکینہ نے اُسے راہ پہ آتے دیکھا تو آ کر اُس کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ "گرنٹی ہے گرنٹی۔ بیاسی کے وڑیچ ہیں۔ اِتباری ہیں۔ وہاں کی چوکی میں باسے کا جماتی آ کر سپاہی لگا ہوا ہے۔ چوکی کا حوالدار بھی باسے کا واقف کار ہے۔ پلس سے بڑی گرنٹی کیا ہو سکتی ہے۔"

اعجاز نے سکینہ کی پشت پہ ہاتھ رکھا۔ اُس کی پتلی سی قمیض پسینے سے گیلی ہو کر پشت سے چمٹی ہُوئی تھی اور اُس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی باس اُٹھ رہی تھی جیسے پھٹے ہُوئے دودھ سے اُٹھتی ہے۔ چاچے کے ٹبر کی کاٹھی بہترین ہے، اعجاز نے سوچا۔ سکینہ کا بدن آج بھی اُس طرح ہے جیسا بیاہ والے دِن تھا۔ اس کی چھاتیوں کو کسی سہارے کی ضرورت نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔

اعجاز کا ذہن اپنے بکھیڑوں سے فرار حاصل کر کے جسم کی راحت کی جانب مبذول ہونے لگا۔ "یہ کیسی گرنٹی ہے،" وہ ہنس کر بولا، "کل پولیس والے تبدیل ہو جائیں تو

پھر؟" "باسا تو اِدھر ہی ہے ناء- شہر میں لگ گیا ہے- اَپنے ہاتھ میں رکھے گا- پھر ابا اُن کے سَر پر حاضر ہے- اُس کے سامنے کوئی پیر نہیں مار سکتا- تم اَپنے جیلوں کو چھوڑو- میں خُود جا کر ہل چلانے لگوں تو پھر تمہیں چین آئے گا؟"

"ہاں،" اعجاز ہنسا- "مجھے پھر چین آئے گا- پہلے تو مجھ سے ہل چلانا سیکھ- پھر جا کر چلانا-"

سکینہ نے اعجاز کے ہاتھ کو اَپنی پیٹھ پر ہولے ہولے ہلتے ہوئے محسُوس کیا- وہ اَپنی جگہ پہ بیٹھی بیٹھی کسمسائی، گویا جسم کی رضامندی کا اِظہار کر رہی ہو- پھر اُس نے تیزی سے بچوں کی چارپائیوں پہ نظر ڈالی- حسن اَور حسین کھلے آسمان تلے گہری نیند سو رہے تھے- سکینہ اعجاز کے ہاتھ سے نِکل کر اُٹھی اَور لڑکوں کی چارپائیوں پہ جھک کر احتیاط سے اُن کی چادروں کو، جنہیں لڑکوں نے نیند میں اُتار دیا تھا، سیدھا کر کے اُنہیں ڈھانپ دیا- جب وہ لوٹی تو ہنسی سے دُہری ہو رہی تھی-

"کیا بات ہے؟" اعجاز نے پُوچھا-

"حسینے کا--- حسینے کا---" آواز دبانے کی کوشش میں اُس کے مُنہ سے ہنسی کے مارے بات نہ نِکل رہی تھی-

"کوئی بات تو بتا، بس ہنسے جا رہی ہے- تیرا سَر پھر گیا ہے؟"

"حسینے کا بدن اُٹھا ہوا ہے-" وہ بولی-

اعجاز کی ہنسی نِکل گئی- اُس نے سَر اُٹھا کر سوئے ہُوئے لڑکوں کی جانب دیکھا، مگر اندھیرے میں اُسے کچھ نظر نہ آیا- اُس نے سکینہ کو کھینچ کر اَپنے ساتھ لٹا لیا-

"شرم کر،" سکینہ ہنسی دباتے ہُوئے سرگوشی میں بولی، "لڑکے جوان ہو رہے ہیں-"

"ٹھیک ہے ناء، جلدی جوان ہو جائیں تو تسلی سے اَپنے کام میں لگ جاؤں-"

"تجھے تو بس دو ہی کام ہیں- گھر آتے ہو تو میری سختی لے آتے ہو---"

"سختی تو میرے اندر ہے،" اعجاز اَپنے بدن پر ہاتھ مار کر بولا، "تیرے اندر تو نرمی ہی نرمی ہوتی ہے-"

"اَور باہر جا کر اَپنی افسری میں لگے رہتے ہو-"

"افسری کہاں کی؟" اعجاز اُس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، "میرا اپنا آدمی مشکل میں ہے اور میں اُس کی جان نہیں چھڑا سکتا۔"

"کون ہے؟"

"منظور کا بھائی۔ اُسے پولیس نے پکڑ کر حوالات میں رکھا ہوا ہے۔"

"اُس نے کوئی گناہ کیا ہو گا۔"

"اونہوں۔ ایک پولیس افسر کا نوکر تھا۔ اُس نے چوری کا الزام لگایا ہے۔"

"تم اِس کام کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

اعجاز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آسان بات نہیں۔ عزت کا سوال ہے۔ چل چھوڑ اس قصے کو۔۔۔۔"

سکینہ کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ یہ مردنی کا ڈھیلا پن نہیں، جانداری کا پھیلاؤ تھا جس سے گوشت میں نرمی آ گئی مگر پٹھوں کا تناؤ اُبھر آیا تھا۔ یہ گوشت اور پٹھوں کا میلان تھا جو مرد کو چند لمحوں کے لیے دُنیا کے ہر تردد سے آزاد کر دیتا ہے۔ رات آدھی کے قریب نکل چکی تھی۔ جیٹھ کی تند لُو میں حلاوت آ گئی تھی۔ پسینے سے شرابور جسموں پہ ہوا کے جھونکے رگڑ کھاتے ہوئے گزرے تو دونوں کو ٹھنڈک کا میٹھا میٹھا احساس ہوا۔ سکینہ کا حلق لذت آمیز کراہیں روکنے کی کوشش میں خشک ہو رہا تھا۔

"آندھی اُٹھ رہی ہے،" اُس نے پھٹی ہوئی سی آواز میں سرگوشی کی۔

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہوا ٹھنڈی ہے۔ کہیں مینہ برسا ہے۔ سو گئے ہو؟"

"ہوں،" اعجاز نے نیند میں حلق سے آواز نکالی۔

"ملک بھینگر کا بیٹا سنا ہے واپس آ گیا ہے۔"

"تجھے بھی ایسے وقت کیسی کیسی باتیں سوجھتی ہیں،" اعجاز نے کہا۔ "چپ کر کے سو جا۔" سکینہ نے اعجاز کی چادر کا آدھا پلو اپنے جسم پہ اوڑھا اور بازو اعجاز کی چھاتی کے گرد لپیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُجالا ہونے سے پہلے سکینہ اُٹھ کر اپنی چارپائی پہ گئی اور چادر لپیٹ کر سو گئی۔ مغرب کی طرف سے کالی آندھی چڑھ رہی تھی جس نے آسمان کو تاریک کر دیا تھا۔ ہاتھ کو

ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

اعجاز تھانیدار چوہدری شریف بھٹی کے پاس بیٹھا تھا۔

"اعجاز، تیرا یونین کا کام میں نے کتنا کیا ہے، بتا؟ جب کسی مل مالک نے مزدور پہ ظلم کیا، جب کسی مزدور کا دُوسرے سے جھگڑا ہوا، کتنی رپٹیں تیرے لیے میں نے پھاڑی ہیں، کبھی اِنکار کیا ہے؟"

"کبھی نہیں، چوہدری صاحب، میرے اُوپر آپ نے ہمیشہ خاص مہربانی کی ہے۔ اِسی لیے تو میں اعتماد لے کر آ جاتا ہوں۔ آپ جیسے مہربان افسر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

"مگر یہ آدمی تو تیری کسی یونین کا بھی نہیں، ایک نجی نوکر تھا۔"

"یہ آدمی بے قصور ہے چوہدری صاحب۔ اس نے چوری نہیں کی۔ کوئی نہ کوئی چیز کہیں نہ کہیں سے تو نکلتی۔ آپ نے اِس کے سات رشتے داروں عزیزوں دوستوں کے گھروں کی تلاشی لے لی ہے۔ میں ایک عام شہری کی حیثیت سے اِنصاف مانگنے آیا ہوں۔ آپ انصاف کے پاسبان ہیں۔"

"انصاف کی بات چھوڑ اعجاز۔ انصاف کو آج کون پُوچھتا ہے۔ میرے ساتھ کیا انصاف ہو رہا ہے؟" اُس نے بازو لمبا کر کے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ "اِس سارے علاقے کو دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہُوں۔"

"کتنا علاقہ ہے؟"

"بہت بڑا علاقہ ہے۔"

"میں اِس علاقے کا مالک ہوں،" تھانیدار نے کہا۔ "میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہیں۔ الونس ملا کر پونے چار سو بنتی ہے۔ میں پونے چار سو میں اِس سارے علاقے کو کنٹرول کر سکتا ہوں؟"

"چوہدری جی، آپ کی عزت، آپ کا اختیار، اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔"

"اوئے عزت اختیار کو چھوڑ۔ یہ دو ستارے جو میرے مونڈھے پر لگے ہوئے ہیں کیا میرا پیٹ بھرتے ہیں؟"

"جہاں تک تنخواہ کا معاملہ ہے، ہماری حکومت نے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھانے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔"

"حکومت کے وعدے مجھے مت بتا۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ سپاہی بھرتی ہوا تھا، تیس سال سے حکومتوں کے وعدے سن رہا ہوں۔ جہاں تک اِس کیس تعلق ہے، یہ میرے ہاتھ سے باہر ہے۔ ڈی۔ایس۔پی صاحب کا ملازم تھا۔ اُن کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔"

"چوہدری صاحب،" اعجاز نے کہا "سب جانتے ہیں کہ شہر کا مالک ایس۔پی ہوتا ہے اور علاقے کا مالک ایس۔ایچ۔او۔ بس۔ قصہ ختم۔ ڈی۔ایس۔پی صاحب آپ کا کہنا کیسے موڑ سکتے ہیں؟"

"تو میری نوکری کے پیچھے پڑا ہے؟ مجھے اُلٹے رستے پر مت لگا۔ میری ریٹرمنٹ قریب ہے۔ ڈپٹی صاحب نے میری گانڈ میں ہاتھ دیا ہوا ہے۔ میرے افسر ہیں۔ دیکھ میں تجھے بتاتا ہوں۔ باقر شاہ کو ڈپٹی صاحب کے پاس لے جا اور اُن کی منت کر۔ یہی ایک طریقہ ہے۔"

"درست ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں۔ مگر ریاض کے ساتھ ذرا نرمی اختیار کریں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"نرمی ہی نرمی ہے۔"

"کوئی پرچہ تو درج ہوا نہیں، نہ رپٹ لکھی گئی ہے۔"

"پرچہ اُس وقت ہوگا جب ہمیں ثبوت ملے گا۔"

"ثبوت چوہدری صاحب موجود ہی نہیں ہے۔ وہ چوری کا مرتکب ہی نہیں ہوا۔"

"ثبوت حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ تو میری بات مان، جیسا میں نے کہا ہے ویسا کر۔"

باقر علی شاہ اپنے کمرے میں آنکھیں میچے، سر پہ پٹی باندھ کر لیٹا ہوا تھا۔ ایک نوکر اُس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔

"کیا حال ہے، شاہ صاحب،" اعجاز نے پوچھا۔

"کیا حال پوچھتے ہو ملک اعجاز، کوئی ایک چیز ہو تو بتاؤں۔ بلڈ پریشر، گردے کی تکلیف، اُوپر سے لو لگ گئی ہے۔ آج چھ دِن ہو گئے ہیں، بستر سے نہیں اُٹھا، ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

وہاں سے مایوس ہو کر اعجاز مختار ڈوگر کے پاس پہنچا۔

"کیا کہا؟ چھ دِن سے بستر پر پڑا ہے؟" مختار ڈوگر نے آسمان کی جانب دیکھ کر ہاتھ باندھ دیئے، "اللہ میری توبہ، سید کی ذات اور اتنا بڑا جھوٹ! ابھی ابھی شفیع لوہار کے بیٹے کا ولیمہ کھا کر آیا ہے۔ میرے ساتھ کھڑا تھا۔" پھر وہ آگے جھک کر راز داری سے بولا، "اصل میں لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ کسی کے ساتھ اُٹھ کر تھانے تک نہیں جاتا۔ اپنے حواریوں کے ذریعے افواہ پھیلا رکھی ہے کہ اُسے وزارت ملنے والی ہے، پھر سب کے کام ہو جائیں گے۔ میں تو ملک اعجاز ہر کسی کے ساتھ اُٹھ کر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے کچہری تک جاتا ہوں۔ اللہ شاہد ہے، تم کہو تو ہائی کورٹ تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ مگر یہ رفیق ڈی۔ ایس۔ پی بڑا کتا افسر ہے۔ میں ایک دو دفعہ لوگوں کے کام کے لئے گیا ہوں۔ اب تو وہ مجھے ملنے کا وقت بھی نہیں دیتا، میری شکل دیکھ کر نہ کر دیتا ہے۔ تمہارے ساتھ میں چلا گیا تو اُس نے اگر کام کرنا بھی ہوا تو مجھے دیکھ کر نہ کر دے گا۔ میری صلاح مانو تو اکیلے ہی چلے جاؤ۔ شاید کوئی دید لحاظ کر دے۔ آخر تمہاری اپنی حیثیت بھی کوئی کم نہیں۔ سارا زمانہ تمہیں جانتا ہے۔ ویسے تمہیں بتاؤں،" وہ اعجاز کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا، "چغلی کی بات نہیں، باقر شاہ اگلے روز بھی کہہ رہا تھا، کہتا تھا ملک اعجاز کی اصل طاقت منظور ہی ہے۔ ساری بھاگ دوڑ وہی کرتا ہے۔ منظور کو ہٹا دو تو اعجاز زیرو بھی نہیں رہ جاتا۔ چغلی کی بات نہیں، میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ آدمی سانپ ہے سانپ۔ اِس پر اعتماد کرنا چوداں کا گھاٹا ہے۔ آگے تمہاری اپنی عقل ہے۔ ہمارا کام تو صرف وارننگ کرنا ہے۔"

اعجاز اپنے دفتر میں واپس آیا تو اُس کے چہرے پہ افسردگی تھی۔ کرسی پہ منظور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میز پر جھکا ہوا تھا۔

"ناامید ہونے کی ضرورت نہیں جھورے۔ دیکھ ابھی دوڑ بھاگ کر رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔"

منظور نے جواب دیئے بغیر مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور اُسی طرح بیٹھا رہا۔

ڈیرسٹ چھیمی۔ تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے دو خط اور لالے نے دو خط الگ الگ لکھے ہیں۔ مجھے تمہارا صرف ایک خط ملا ہے اور لالے کا کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے تمہیں لکھا تھا کہ یہ چور جو ہمارے جیلر بنے ہوئے ہیں زیادہ خط و کتابت کو روک لیتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بیحد خوشی ہوئی کہ تم اور لالہ اور سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہو۔ اب ہم لوگ نسبتاً آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جون جولائی میں گرمی سے جان پر بنی ہوئی تھی۔ آس پاس کوئی سایہ نہیں اور سیمنٹ کی بیرکیں تندرو کی طرح تپ جاتی تھیں۔ کچھ کھانے کو وَیسے ہی جی نہیں کرتا۔ نیم گرم پانی پی پی کر پیٹ "آپھر" گیا تھا۔ اب بارشیں شروع ہوئی ہیں تو تھوڑا بہت چین آیا ہے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا ہے کہ میرا خط پہنچنے میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں، اِس لِئے جب یہ خط تمہیں ملے گا تو اُس وقت تک سردیاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ یہ مہینے میں دو خطوں کی اجازت جو ہمیں انہوں نے دے رکھی ہے سب فراڈ ہے۔ میں تمہیں بیس سے زیادہ خط لکھ چکا ہوں۔ مگر تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تمہیں صرف چار خط ملے ہیں۔ سب سے اچھی خبر یہ ہے کہ دو ہفتے پہلے ریڈکراس کے آدمی کیمپ کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ اُس روز ہماری چارپائیوں پر صاف چادریں بچھیں اور صفائی ہوئی، میزوں پر اخباریں رکھ دی گئیں اور اصلی گوشت کا سالن پکا۔ کچھ گورے تھے اور دو افریکن کالے تھے۔ ہم نے اپنی شکایتیں پیش کیں۔ بتایا کہ تین وقت ریت والی روٹی اور مویشیوں کو کھلانے والے دانوں کا شوربہ جسے یہ بنئے دال کہتے ہیں، کھانے کو ملتا ہے۔ مطالبات پیش کیے۔ مہینے میں چار خط لکھنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ ہفتے میں تین بار گوشت پکے جو گوشت ہو چھیچھڑے نہ ہوں۔ باقاعدگی سے ہمارا میڈیکل ٹیسٹ ہو اور ہر ہفتے ہمارا وزن کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ جس مستعدی سے وہ ہماری باتیں نوٹ کر رہے تھے اُسے دیکھ کر ہمارے دِلوں میں اُمید کی کرن

پیدا ہوئی، مگر اُس کے پیچھے ایک مستقل نا اُمیدی کا احساس کہ یہ لکھ لکھا کر چلے گئے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ کوئی شکایت رفع نہ کی گئی۔ ہم ریڈ کراس کو خط لکھتے ہیں تو یہ حرامی اُسے روک لیتے ہیں۔ ہاں، البتہ ایک بہت بڑی امپروومنٹ ہو گئی ہے۔ ہماری سب سے پہلی شکایت گرمی کی تھی اَور مطالبہ تھا کہ ہمیں بجلی کے پنکھے لگوا کر دیئے جائیں، ورنہ ہم اِن بیرکوں میں جل بھن کر مر مرا جائیں گے۔ یہ ایک ہی چیز تھی جس کا اُن لوگوں کو فرسٹ ہینڈ تجربہ ہوا تھا۔ دو گوروں نے سفید کاٹن کی قسم کے کپڑے کے سوٹ پہنے ہُوئے تھے اَور ٹائیاں لگا رکھی تھیں۔ پسینے سب کو آ رہے تھے، مگر سوٹوں والے گوروں کی تلملاہٹ دیکھنے والی تھی۔ اُن کا پسینہ بنیانوں اَور قمیضوں سے نکل کر کوٹوں کو گیلا کر رہا تھا۔ وہ بار بار ٹائیوں میں پھنسی ہوئی گردنوں سے کالر ڈھیلے کر کے رومال سے خشک کر رہے تھے۔ چنانچہ اَور تو کچھ نہ ہوا، ہماری چھتوں پر پنکھے لگ گئے۔ پنکھے گرم ہوا پھینکتے تھے، پچھلے ہفتے بارشیں شروع ہوئیں تو ان کی ہوا ہی غائب ہو گئی ہے۔ مگر اُنہیں دیکھ دیکھ کر ہی کچھ نہ کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ اِن پنکھوں نے البتہ ایک ایسا کام دکھایا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ اب ہنسا مت، یہ ایک سچی داستان ہے جو ہم عمر بھر (جو بھی "عمر بھر" آئے گی) لوگوں کو سناتے رہیں گے۔ ہوا یہ کہ کل ایک قسمت کی ماری چڑیا، عام سی چڑیا جو گھروں میں ہوتی ہے، ہمارے کمرے میں آ گئی۔ دیواروں کے ساتھ اِدھر اُدھر اڑتی ہُوئی بیچاری گھومتے ہُوئے پنکھے کے پروں سے ٹکرا گئی اَور زخمی ہو کر پھڑپھڑاتی ہُوئی فرش پر گر پڑی۔ لفٹننٹ فضل نے ایک جست میں چڑیا کو جا دبوچا۔ ہم چھ کے چھ آدمی کئی منٹ تک آپس میں مشورے کرتے رہے کہ اِس کا کیا جائے۔ کسی نے کہا اِسے میدان میں چھوڑ دیں، یہاں کوئی کتا بلی تو ہے نہیں جو اسے کھا جائے گا۔ اِس کا زخم خُود ہی مندمل ہو جائے گا۔ دُوسرا بولا کہ ہم خُود ڈسپنسری سے ٹنکچر وغیرہ مانگ کر اس کا علاج کریں اَور اِسے میسکاٹ کے طور پہ اپنے پاس رکھ لیں۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ ننھی سی چڑیا جس کے ایک کندھے سے خُون بہہ رہا تھا، فضل کے ہاتھ میں دبکی بیچارگی کی نظروں سے خلا میں دیکھتی رہی۔ آخر میجر شاہ زمان نے ہاتھ بڑھا کر فضل سے چڑیا لے لی اَور باہر کو چل پڑا۔ ہم سب لاعلمی کی حالت میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ شاہ زمان سیدھا ہمارے باورچی کے پاس پہنچا، اُس سے چھری مانگ کر زمین پہ بیٹھا، اُور پیشتر

اِس کے ہم میں سے کوئی مُنہ کھولتا، شاہ نے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر چڑیا کو ذبح کر دیا۔ چڑیا کے گلے سے اِتنا خُون بھی نہ نِکلا کہ چھری کا پھل ہی گیلا ہو۔ وہ پھرپھڑا کر ساکت ہو گئی۔ شاہ زمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے احتیاط سے اُس کے پر نوچ کر اُسے ننگا کیا اور باورچی کو پکڑا دیا۔ باورچی نے اُسی چھری سے اُس آدھے انگوٹھے جتنے پرندے کا قیمہ کیا اور رات کو دال میں ملا کر پکانے کو ایک طرف رکھ دیا۔ ہم سب کے دِل میں چڑیا کے ذبح ہونے پر افسوس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ چڑیا کا بہترین مصرف یہی تھا۔ جب سالن پک کر آیا تو اُس میں گوشت مکمل طور پہ گھل چکا تھا۔ وہی موٹھ کی دال کے پانی بھرے بلبلوں کا لمبا شوربہ تھا اور پرندے کا نام و نشان نہ تھا۔ میرے دانت میں ایک باریک تیلا سا آیا تھا۔ میں نے نکال کے دیکھا تو مجھے وہ چڑیا کی کوئی ہڈی دکھائی دی۔ یا ہو سکتا ہے یہ میرا واہمہ ہی ہو۔ سالن کے ذائقے میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ مگر ہم نے گوشت کے تصور میں زیادہ ذوق شوق سے کھانا کھایا----

یہاں پہنچ کر سرفراز کا جی اُس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اُس کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ وہ میدان میں نِکل کر چند منٹ تک ٹہلتا رہا۔ کئی لمبے لمبے سانس لینے کے بعد واپس آ کر اُس نے قلم کے اصلی سرے سے کارڈ پر، جس کے اُوپر پرنٹ تھا: کیمپ ۹۸۔ بھارت، اپنے پچیس لفظ لکھنے شروع کئے۔

"ڈیرسٹ چھیمی۔ میرا جو بھی خط تمہیں ملے وہ لالے کو ضرور پڑھا دیا کرو۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ تمہارا۔ سری۔"

ایک روز صبح نو بجے سب کو میدان میں جمع ہونے کا حکم ملا۔ "کیا قصہ ہے؟" سرفراز نے کیپٹن عزیز سے پُوچھا۔

"پکی خبر نہیں، مگر سنا ہے کوئی انڈین مسلمان وعظ کرنے آ رہا ہے۔"

چھوٹی چھوٹی قینچی سے کتری ہوئی سفید ہموار ڈاڑھی والا ساٹھ پینسٹھ برس کا آدمی

ہاتھ میں چند اخبار لیے ہوئے آیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،" وہ بولا۔ "میرا نام بدرالدین ہے۔" اُس نے رُک کر اَپنے سامنے چارپائیوں اَور کرسیوں پر بیٹھے اَور اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگوں پر نظر دوڑائی۔ "میں یونیورسٹی میں اِکنامکس اَور پولیٹکل سائنس کا اُستاد ہوں۔" اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اخباریں کھولیں۔ اخباروں کے نام "سٹیٹسمین" اَور "ہندوستان ٹائمز" دکھائی دیئے۔ پھر اُس نے اندر کے کچھ ورق سامعین کے سامنے پھیلائے۔ اگلی رو میں بیٹھے ہوئے سرفراز نے اخبار کے صفحے پر موٹے اَلفاظ پڑھے:

PROBLEM - SOLVING BETWEEN INDIA AND PAKISTAN, BY BADRUDDEN CHAUDRI.

"میں اَپنے تیئں کئی برس سے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اَپنے دونوں ملکوں کے مابین برادرانہ تعلقات اُستوار کرنے کی سعی کرتا رہا ہوں۔ مُجھے آج آپ لوگوں سے ملنے کا موقع پا کر انتہائی خوشی ہوئی ہے اَور ساتھ ہی دُکھ بھی ہوا ہے۔ جن حالات میں ہم ایک دوسرے سے مل رہے ہیں وہ دُکھ دینے والے حالات ہیں۔ ہمارے مُلک صدیوں تک اکٹھے رہے ہیں، ہماری تاریخ مشترک ہے۔ ہم نے اِس برصغیر پر بیرونی حملہ آوروں کی بیسیوں یلغاریں ایک ساتھ سہی ہیں۔ ہماری زُبانوں میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے، مگر ہمارے رسم و رواج ایک ہیں اَور سینکڑوں برس سے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ہماری اصل تہذیب ہے۔ آج کی دنیا میں مذہبی نظریاتی ریاست کا تصور ناقابل عمل ہو چکا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد پاکستان کے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اَور سب سے زیادہ مسلمان انڈونیشیا میں بستے ہیں۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک تو اسلامی ریاست ہے اَور دوسری نہیں ہے؟ دراصل مذہبی نظریاتی ریاست کا دَور گزُر چکا ہے۔۔۔۔"

کیپٹن عزیز جو سرفراز کے پہلو میں بیٹھا بیتابی سے پہلو بدل رہا تھا، آخر ضبط نہ کر سکا۔ "واٹ اباؤٹ اِسرائیل؟" وہ بولا۔

"یس، واٹ اباؤٹ اِٹ؟" بدرُالدین نے خطیبانہ انداز میں کہا۔ "وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے بات میرے مُنہ سے چھین لی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ بیس پچیس برس سے خُون خرابہ ہو رہا ہے۔ تاریخ میری بات کو صحیح ثابت کرتی

ہے۔ مذہبی نظریاتی ریاست فساد کا گھر ہے۔"

"مگر ایک سیکولر ریاست نے اسرائیل کی بنیاد ڈالی،" کیپٹن عزیز نے جواب دیا۔
"اور دوسری سیکولر ریاست اِسے سپورٹ کر رہی ہے۔ یہ دوغلہ پن نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اِنہی سیکولر ریاستوں نے مشرقِ وسطیٰ میں فساد کی جڑ ڈالی ہے؟"
"آپ کا پوائنٹ کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر یہ ایک الگ اور وسیع النظر سوال ہے جس میں داخل ہو کر ہم وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے اپنے مسائل توجہ طلب ہیں۔"

"ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں،" عقب سے ایک افسر نے جذباتی آواز میں کہا۔
"صرف ایک مسئلہ ہے، کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا، جس کا ثبوت آج مل چکا ہے۔ اور اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے آپ جیسے منافقوں کی خدمات خریدی جا رہی ہیں۔"

بدرالدین چوہدری کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایک گارڈ دھمکی آمیز انداز میں بولنے والے افسر کی جانب بڑھا، جس کو اُس کے دُوسرے ساتھیوں نے کھینچ کر بٹھا دیا۔ بدرالدین نے کچھ کہنا چاہا، مگر ایک دو بار ہکلا کر رہ گیا۔ وہ دوبارہ بات شروع کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار ہی کر رہا تھا کہ افسروں کے مجمعے میں جگہ جگہ سے "غدار، ٹریٹر، گو بیک،" کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ گارڈ مستعد ہو گئے۔ اُنہوں نے صورتِ حال جانچ کر بدرالدین کو نرغے میں لیا اور اُسے واپس لے چلے۔ اُن کے جانے کے بعد پندرہ بیس افسر غصے کی حالت میں میدان کے اندر کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر بکھر کر اپنی اپنی بیرک میں چلے گئے۔

"سر آپ کو بولنا نہیں چاہئے تھا،" سرفراز نے کیپٹن عزیز سے کہا۔
"میں نے ایک مناسب سوال کیا تھا۔ اِس میں کوئی حرج نہیں تھا۔"
"یہ بات نہیں سر،" سرفراز نے آواز نیچی کر کے کہا۔ "ایسکیپ سکیم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے آدمی کسی کی نظروں میں نہ آئے۔"
"ہاں یار، تمہاری یہ بات تو درست ہے۔ مگر اُس وقت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ آئی شُڈ بھی مور کیئر فل اِن فیوچر۔ تھینکس۔"

مختار ڈوگر، ایم پی اے، اعجاز کے دفتر میں داخل ہوا۔

"ملک اعجاز، مدد کی ضرورت ہے۔" وہ پریشانی میں بولا۔

"کیا بات ہے؟" اعجاز نے تھکے ہوئے لہجے میں پُوچھا۔

"کل جلسہ ہے اَور بولنے والوں کی ماں مرگئی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"کوئی بیمار پڑ گیا ہے، کوئی کراچی چلا گیا ہے، کسی کو کوئی اَور بہانہ مل گیا ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اب تم ہی میرے جلسے کو بچا سکتے ہو۔"

"باقر شاہ کہاں ہے؟"

"اُس کا کیا پُوچھتے ہو، وہ کبھی میرے جلسے میں آیا ہے؟ وہ گھر بیٹھا دعا مانگ رہا ہو گا کہ میرا جلسہ فیل ہو جائے۔"

"میں تو کل صبح وکیل کے پاس جا رہا ہوں مختار۔ منظور کے بھائی کی بلاجواز نظربندی کی درخواست کے لئے۔۔۔۔"

"گیارہ بجے تک فارغ ہو جاؤ گے۔ مشورہ ہی تو کرنا ہے نا؟"

"وکیلوں کا تمہیں پتا ہے، نو بجے ملیں یا بارہ بجے۔ وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"ملک اعجاز، میں آٹھ مہینے میں پہلی غرض لے کر تیرے پاس آیا ہوں۔ تم وہاں کھڑے ہو جاؤ تو جلسے کو باندھ سکتے ہو۔ میں اکیلا وہاں کیا باں باں کروں گا۔ جلسہ فیل ہو گیا تو" اُس نے اَپنائیت سے اعجاز کا ہاتھ پکڑا اَور لمبے لمبے دانت نکال کر مسکرا دیا، "میری جان، ہم سب کی بے عزتی ہے۔"

"مختار، ایک بات بتا،" اعجاز تلخی سے بولا "میں تجھے آج یاد آیا ہوں۔ جب جلسے کا انتظام کیا، بولنے والوں کا بندوبست کیا، اُس وقت میں کہاں تھا؟ میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں کہاں تھا۔ میں یہیں پر بیٹھا تھا۔"

"حاشا وکلا، اعجاز، دو دفعہ یہاں سے میں پھر کر گیا ہوں۔ ہر دفعہ پتا چلا کہ منظور کے

ساتھ تھانے گئے ہوئے ہو۔"

"مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی،" اعجاز نے ناگواری سے منہ پھیر لیا، گویا کہہ رہا ہو، جھوٹ بولتے ہو۔

"اب اِس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ چل جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب میری عرض کے آگے اِنکار نہ کر۔ تو چاہتا ہے کہ تیرے آگے ہاتھ جوڑوں، پیر پکڑوں؟"

"کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کر سکتا،" اعجاز نے کہا۔

"میں کل صبح اپنا آدمی بھیج دوں گا، وہ تجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر کچہری لے جائے گا، تیرے ساتھ رہے گا، واپس بھی لے آئے گا۔ ٹھیک ہے؟"

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا تو مختار ذوگر نے اعجاز کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا اور اُٹھ کر جاتے جاتے بولا، "بس ٹھیک ہے۔ کل سویرے آدمی یہاں موجود ہو گا۔"

اگلے روز صبح سویرے اعجاز اپنے دفتر میں گُم سُم بیٹھا تھا۔ ایک آدمی افسردہ سی شکل لیے میز کے پاس کھڑا تھا۔ چوہدری مختار ایک نوجوان کے موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا آ پہنچا۔

"یہ مقبول احمد میرا بہترین ورکر ہے،" مختار ذوگر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مقبول، تو ملک اعجاز کو جانتا ہی ہے۔ آج سارا دِن تیری ڈیوٹی اِن کے ساتھ ہے۔" پھر وہ اعجاز سے مخاطب ہوا۔ "مقبول کچہری کے سارے رستے جانتا ہے۔ کئی وکیلوں سے بھی واقفیت ہے۔"

"کچہری جانے کی ضرورت نہیں،" اعجاز نے کہا۔

"ضرورت نہیں؟ یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ کیوں، کام ہو گیا؟"

"ہاں۔ منظور کا بھائی رہا ہو کر گھر آ گیا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"مبارک ہو؟" اعجاز گرج کر بولا۔ "مبارک ہو؟ اُس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیسے؟" مختار ذوگر نے پُوچھا۔

"تشدد سے، اور کیسے؟"

"اُفوہ! اُفوہ! اللہ معاف کرے۔"

"اللہ کا اِس سے کیا تعلق ہے؟" اعجاز نے کہا۔ "یہ بندے کا کام ہے۔ یہ عوام کی حکومت میں عوام کا کام ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تم جاؤ مختار۔ میں منظور کے گھر جا رہا ہوں۔ جلسے پر آ جاؤں گا۔"

مختار ذوگر بیٹھا اُس کا مُنہ دیکھتا رہا۔

"آج میرا بھی بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے،" اعجاز جاتے جاتے بولا۔

پنڈال لگا تھا۔ ڈھائی تین سو کے لگ بھگ کا مجمع تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں لوگ شامیانے کے سائے میں ایک دُوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ سٹیج پر چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر معمولی قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ کناتوں کے پیچھے مختار ذوگر کی چاولوں کی دیگیں چڑھی تھیں جو جلسے کے بعد سامعین میں تقسیم کی جانے والی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب اعجاز وہاں پہنچا تو ایک نوجوان نعت پڑھنے کے بعد چھوٹی موٹی تقریر کر کے مائیکروفون سے ہٹا تھا اور ایک دُوسرے شخص نے آ کر مزاحیہ تقریر شروع کر دی تھی۔ لوگ اُس کے سیاسی اور نیم سیاسی لطیفوں پر ہنس رہے تھے۔ کسی نے فلمی گانوں کی ٹیپ لگا دی۔ جس کی گھسی ہُوئی آواز بھی ساتھ ہی مائیکروفون سے خارج ہو رہی تھی۔ سٹیج کا انتظام مکمل انتشار کی حالت میں تھا۔ مختار ذوگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیچھے دیگوں کے پاس ایک پیڑھی پر سَر ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا تھا۔ دیگوں کی گرمی کی وجہ سے اُس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک آدمی نے آ کر آہستہ سے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ مختار ذوگر چونک کر اُٹھا اور کنات کا کونہ اُٹھا کر پنڈال میں داخل ہوا۔ اعجاز کے تیور دیکھ کر اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا، جیسے کہ وہ اعجاز کو مدعو کرنے پر پچھتا رہا ہو۔ اعجاز کو دیکھ کر چند مزدوروں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ اعجاز نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہ دی، نہ ہی اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُن کا جواب دیا۔

"ملک اعجاز، منظور کے بھائی کا سن کر مجھے دِلی رنج ہوا ہے،" مختار ذوگر نے کہا، "میں جلسے کے بعد سیدھا اُس کے گھر جا رہا ہوں۔ تم آ گئے ہو تو میرے دِل کو کچھ ڈھارس ملی ہے۔ اب تم جانو اور جلسہ۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا سٹیج کی جانب بڑھا۔ مختار ذوگر اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اُس کی چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ اعجاز کو آگے بڑھانے جا

رہا ہو اَور ساتھ ہی اُسے روک کے بھی رکھنا چاہتا ہو۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَور قائداعظم کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا" مختار ڈوگر نے اعجاز کے برابر آ کر کہا۔ "ویسے تو کسی کی کیا جرأت کہ حضور کی شان میں کچھ کہے۔ مگر مولوی اَور لیگیئے بات کو اُلٹی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ ہو چکا ہے۔"

اعجاز نے سٹیج پہ قدم رکھا تو مختار ڈوگر اُس کی خاموشی سے مزید گھبرا گیا۔ اُس نے اعجاز کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"اللہ تبارک و تعالیٰ کا ذِکر کسی بھی حساب میں کر دینا" مختار ڈوگر نے کہا۔ "وہ متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ اَور لوگوں میں جوش بھی پیدا ہوتا ہے۔ بس نعرہ تکبیر کافی ہے۔"

اعجاز نے بدمزگی سے اَپنا بازو چھڑایا اَور سٹیج پر چڑھ گیا۔ چند اَور نعرے بلند ہوئے اب اعجاز نے ہاتھ اُٹھا کر اُن کا جواب دیا اَور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مختار ڈوگر ایک طرف سے نِکل کر مزاحیہ تقریر کرنے والے کے سامنے جا کھڑا ہوا اَور سختی سے اُسے ہٹنے کے اشارے کرنے لگا۔ اُس شخص نے اَپنی آخری پھبتی ختم کی اَور سٹیج سے اُتر گیا۔ مختار ڈوگر نے مائیکروفون سنبھال لیا۔

"اب میں آپنے علاقے کی جانی پہچانی شخصیت، عظیم مزدور لیڈر، پاسبانِ اِنسانیت، ملک محمد اعجاز اعوان سے، جو خاص طور سے ہماری دعوت پر آپ سب کو ڈریس کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ آئیں اَور آپ سے باتیں کریں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر نعرہ لگوایا۔ "ملک اعجاز اعوان ۔۔۔۔" "زندہ باد" لوگوں نے جواب دیا۔ کچھ تالیاں بجیں، ایک دو مزید نعرے لگے۔ اعجاز نے اُٹھ کر مائیکروفون کی چابی ڈھیلی کی اَور اُسے اَپنے قد کے برابر اُٹھا کر چابی کَس دی۔ پِھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

"میں آج کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنے نہیں آیا۔ صرف، اَور صرف، "اعجاز نے دو اُنگلیاں ہوا میں اُٹھائیں،" دو باتیں کہنے آیا ہوں۔ مگر یہ باتیں کہنے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی میں نہایت عزیز دوست کے گھر سے تعزیت کر کے واپس آیا ہوں۔ راستے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک علاقے میں آٹا دوکانوں سے غائب ہو گیا ہے۔"

"ایک نہیں مَلک صاب،" مجمعے میں سے ایک آدمی چلا کر بولا "سارے علاقوں میں ختم ہو گیا ہے۔"

"وہاں پر،" اعجاز نے اپنی بات جاری رکھی، "دُکان کے سیدھے دروازے کے آگے لوگوں کی لمبی قطار لگی تھی، جو خالی ہاتھ دھکم پیل کر رہے تھے، حالانکہ دکان کا دروازہ بند تھا۔ جب میں اُلٹی طرف سے گزُرا تو دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ پچھلے دروازے کے راستے ایک ایک کرکے داخل ہو رہے ہیں اَور آٹے کے تھیلے لے لے کر نکل رہے ہیں۔ میں آپ سے ایک سوال پُوچھتا ہُوں۔ سیدھے دروازے کے آگے دھکم پیل کرنے والے لوگ کون تھے؟"

"عوام تھے،" مجمعے سے دو تین آوازیں آئیں۔ "یہ عوام تھے۔"

"اُوں ہوں،" اعجاز نے نفی میں سَر ہلایا اَور ساتھ ہی اپنی دائیں اُنگلی ہلائی۔ "یہ لوگ عوام نہیں تھے۔ آپ پُوچھیں گے کہ عوام نہیں تو پھر کون تھے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ عوام نہیں تھے۔"

ڈھائی سو آدمی بے سمجھی سے مُنہ اُٹھائے خاموش بیٹھے تھے۔

"میں آپکو بتاتا ہوں کہ کیوں یہ لوگ عوام نہیں تھے۔ پچیس سال ہو گئے ہیں، ہم سن رہے ہیں کہ عوام کے لئے یہ ہو رہا ہے اَور عوام کے لِئے وہ ہو رہا ہے۔ جو بھی حاکم آتا ہے یہی رَٹ لگاتا ہے کہ ہم عوام کی بھلائی کے لِئے آئے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اِن پچیس سالوں میں بھلائی کِس کی ہُوئی ہے۔ بھلائی ہُوئی ہے امیروں اَور کبیروں کی، افسروں اَور جاگیرداروں کی، نفع خوروں اَور رسہ گیروں کی، بلیکیوں اَور سمگلروں کی، بدعنوانوں اَور رِشوتیوں کی۔ اِن سب کی بھلائی ہُوئی ہے۔ تو پھر آپ مُجھے بتاؤ کہ عوام کون ہوئے؟"

اب لوگوں کو اعجاز کی اُلٹی منطق کی کچھ کچھ سمجھ آنی شرُوع ہو رہی تھی۔

"امیر اَور کبیر لوگ،" ایک آواز آئی۔

"ہاں ہاں،" دُوسری آواز اُٹھی "امیر اَور رسہ گیر۔"

"مل مالک،" تیسرے آدمی نے جھجکتے ہُوئے کہا۔

"درست،" اعجاز نے اُنگلی اُٹھا کر بولا۔ "آپ کی بات سو فیصدی درست ہے۔ حکومتیں جھوٹ نہیں بولا کرتیں۔ حکومتوں نے اِن لوگوں کا نام عوام رکھ دیا ہے اَور پچیس

سال تک اِن کا فائدہ کرتی رہی ہیں۔ دکان کے سامنے خالی ہاتھ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ عوام نہیں ہیں۔ عوام وہ ہیں جو پچھلے دروازے سے سفارشی پرچیاں لے کر آتا لے جا رہے ہیں۔ حکومتوں نے عوام کے نام اَور پتے بدل دیئے ہیں، اَور ہمیں ابھی تک پتا ہی نہیں چلا۔ میرے بھائیو، دکانوں کے سامنے دھکے کھانے والے لوگ عوام نہیں، یہ تو غریب لوگ ہیں۔"

یکایک اعجاز کے سامنے بیٹھے ہُوئے لوگوں میں جھنجھناہٹ کا شور اُٹھا، گویا مجمع جاگ اُٹھا ہو۔ درمیان سے ایک آدمی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"عوام۔" اُس نے نعرہ لگایا۔

"نامنظور،" لوگوں نے جواب دیا۔

"غریب لوگ۔"

"منظور۔"

"آج سے،" اعجاز نے ہاتھ بلند کر کے اُنہیں چپ کرایا۔ "آج سے ہمارا مطالبہ ہے کہ کوئی حکومت اَور کوئی لیڈر "عوام" کا لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ دھوکہ دہی کا لفظ ہے۔"

اب مجمع پُوری طرح سے اعجاز کے خیال کی رو میں شامل ہو چکا تھا۔ دو چار آدمی کھڑے ہو کر نعرے لگوانے لگے۔ اُن میں سے ایک ایک بولتا، اَور مجمع جواب دیتا جاتا۔

"عوام کون؟"

"امیر کبیر۔"

"عوام کون؟"

"رسہ گیر۔"

"عوام کون؟"

"رشوت خور۔"

"عوام کون؟"

"بدعنوان۔"

"عوام کون۔"

"مل مالک۔"

"بولو، عوام۔"

"نامنظور۔"

"غریب۔"

"بے قصور۔"

"غریب۔"

"منظور، منظور۔"

اِس نئے اَور نامانوس نعرے کو سن کر دیگیں پکانے والا عملہ کناتوں کے کونوں کناروں سے سَر نکالے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کنات کے ایک بانس کے ساتھ لگ کر مختار ڈوگر مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ اعجاز چند لمحوں تک خاموش کھڑا اِن نعروں کو سنتا رہا، پھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں خاموش کرایا۔

"اب دُوسری بات،" وہ بولا، "پچیس سال سے ہم حکومتوں کی بات سنتے آئے ہیں کہ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اَیسا کر دیں گے، ویسا کر دیں گے۔ یہ گا، گے، گی سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ ہم پُوچھتے ہیں کہ یہ کب ہو گا اَور وہ کب ہو گا، اَیسا کب کریں گے اَور ویسا کب کریں گے؟ ہم ترس گئے ہیں یہ سننے کے لِئے یہ ہو گیا ہے، وہ ہو گیا ہے۔ اَیسا ہو گیا ہے اَور ویسا ہو گیا ہے۔ درست، یا نادرست؟"

"درست۔ درست۔" مجمع چلایا۔

"اِس لِئے ہمارا دُوسرا مطالبہ یہ ہے: آج کے بعد کوئی حکومت، اَور کوئی لیڈر، گا، گے، اَور گی کے لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ بھی دھوکہ دہی کے اَلفاظ ہیں۔"

"دھوکہ دھوکہ، جھوٹ جھوٹ،" نعرے لگانے والوں نے کہا۔

"آج کے بعد،" اعجاز نے کہا "حکومت کے ہر بیان میں "ہے" کا لفظ برتا جائے۔ یہ سچا لفظ ہے۔"

اب تقریباً آدھے لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے۔ اُنہوں نے دوبارہ نعرے لگانے شُروع کر دیئے۔

"گا، گے، گی۔"

"نامنظور۔"

"گا، گے، گی۔"

"جھوٹ فریب۔"

"گا، گے، گی۔"

"دھوکا چلاکی۔"

"ہے، ہے، ہے۔"

"منظور، منظور۔"

"گا، گے، گی۔"

"بے اصل۔"

"ہے، ہے، ہے۔"

"اصل اصل۔"

"اِس کے بعد نعرے لگوانے اَور جواب دینے والوں نے انہیں مختصر اَور آسان کرنے کی خاطر صرف ایک ہی گردان شرُوع کردی۔

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

اس آواز میں ایک عجیب تان تھی، جس کا علم اعجاز کو بھی اسے سننے کے بعد ہوا۔ اس میں لہو گرمانے والی لبیک، للکار کی لے، دلاوری کی ہاہاکار تھی۔

"ہے ہے ہے،" آواز اُٹھتی۔

"ہے ہے ہے،" سینکڑوں آوازوں کا جواب ملتا۔

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سلسلہ دِن بھر چلتا رہے گا۔ عام حالات میں یہ منظر دیکھ کر اعجاز کے خُون کی گردش میں تیزی آجاتی اَور دِل کا خانہ پھیل کر سینے کو بھر لیا کرتا تھا۔

مگر اس وقت وہ منظور جیسے وفادار کے گھر سے اُس کے بھائی ریاض کی چارپائی سے اُٹھ کر آیا تھا جہاں چار آدمیوں نے ریاض کو بازوؤں اَور ٹانگوں سے پکڑ کر قابو میں رکھا ہوا تھا اَور وہ واہی تباہی بک رہا تھا۔ منظور زمین پہ بیٹھا تھا اَور اُس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے بین کی آواز آ رہی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں کے سامنے سے یہ منظر نہ ہٹتا تھا۔ اُس کی روح میں ایک عمیق افسردگی سرائیت کر گئی تھی اَور دِل پر ایک من وزنی رنج کا بوجھ تھا۔ مجمعے کی ہے ہے سن کر اُس کے چہرے پر فتحمندی کے آثار پیدا نہ ہُوئے۔ اُس نے سنجیدگی سے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو خاموش کرایا۔ مختار ذوگر نے موقع دیکھ کر سرعت سے کام لیتے ہُوئے ایک طرف سے کناتیں اُٹھوا دیں جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر المونیم کی پلیٹوں کے انبار تھے۔ اُس نے ہاتھ کے تیز تیز اشاروں سے لوگوں کی توجہ میزوں کی جانب مبذول کرائی۔ لوگ اُس راستے سے گزر کر میزوں پہ رکھی نمکین چاولوں کی پراتوں پر ٹوٹ پڑے۔ اعجاز ایک طرف سے باہر نکل گیا۔ پہلے وہ دو چار قدم اَپنے دفتر کی جانب بڑھا۔ پھر پلٹ کر اُس نے سائیکل کا رخ گھر کی جانب موڑ دیا۔

اس تقریر کا انجام بھی یہی ہوا ہو گا کھانا کھاؤ اور جاؤ --- جھوٹ --- شوت --- ہوس

یونینوں کے اندر افواہیں کئی روز سے گردش کر رہی تھیں، مگر نہ اُن کا کوئی سرا ہاتھ میں آتا تھا، نہ کوئی وجہ معلوم ہوتی تھی۔ بس گول مول سی بات کہیں سے نِکل کر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی کہ اِدھر اُدھر سے پُوچھ گچھ ہو رہی تھی اَور اعجاز کو اُوپر سے کوئی بلاوا آیا تھا یا آنے والا تھا۔ کئی کا خیال تھا کہ اُسے انعام کے طور پر کوئی اعلیٰ پوزیشن ملنے والی تھی۔ دُوسروں کا اندازہ اس کے برعکس تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اعجاز نے منظور کے بھائی کے معاملے میں چوک کے اندر کھڑے ہو کر ڈی۔ایس۔پی کا نام لے کر گالیاں دی تھیں اَور ایس۔ایچ۔او کو سرعام چیلنج کیا تھا کہ اگر اُسے گرفتار کرنا چاہتا ہے تو آئے اَور کرے، چنانچہ کسی نہ کسی حد تک وہ سرزنش کا مستحق قرار دیا جا رہا تھا۔ اعجاز کے پاس یہ افواہیں پہنچ رہی تھیں، اَور سیاست کی رو سے اُسے علم تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ان

دنوں اُس کے دل میں تشویش کی صورت پیدا نہ ہو رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ جب سے منظور کام چھوڑ کر کل وقتی طور پر اُپنے بھائی کی دیکھ بھال میں لگ گیا تھا، اعجاز کا جی اُچاٹ رہنے لگا تھا۔ منظور کے ساتھ اُس کی وابستگی نہ طوالت وقت کے باعث تھی، نہ منظور کی کارکردگی کی وجہ سے تھی۔ صرف منظور کی وفاداری کی ایک خاص صورت تھی جو اعجاز کے دِل میں راہ پا گئی تھی۔ اُس کے لِئے منظور دفتر کا ایک ملازم نہ رہا تھا بلکہ قریبی عزیز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

دو ہفتے کے بعد اعجاز طلبی کا پروانہ ہاتھ میں پکڑے ملتان کے سٹیشن پر اُترا۔ تین روز پہلے اُسے پیپلز لیبر فیڈریشن کی جانب سے خط موصول ہوا تھا۔ اسسٹنٹ جائنٹ سیکرٹری بی۔اے چوہدری دورے پر ملتان پہنچ رہے تھے۔ اُن سے جا کر ملنے کا حکم درج تھا۔ خط پر منسٹری آف لیبر کے ایک سیکشن افسر کے کاؤنٹر سائن بھی موجود تھے۔ اعجاز نے شہر کے صدر دفتر سے پتا کیا۔ بی۔اے چوہدری کو کوئی نہ جانتا تھا۔ صرف ایک آدمی نے بتایا کہ اِس شخص کی ابھی ابھی تعیناتی ہُوئی ہے، مگر اس سے پہلے ایک آدھ بار کراچی وغیرہ میں لیبر کو آرگنائز کرنے کے سلسلے میں ان کا نام سننے میں آیا تھا۔ تفصیل سے کوئی بھی آگاہ نہ تھا۔ ایک ہی دِن کے اندر یہ خبر سارے علاقے میں پھیل گئی کہ ملک اعجاز ملتان میں افسران سے ملنے جا رہے ہیں۔ سب لوگ نتیجے کے اِنتظار میں تھے۔

اعجاز کو کہیں دُور نہ جانا پڑا۔ سٹیشن کے ساتھ ہی ریلوے یونین کے دفتر میں بی۔اے چوہدری اَور اُن کے سٹاف کو دو کمرے دے دیئے گئے تھے، جہاں تین روز تک اُن کا قیام تھا۔ اعجاز پُوچھتا ہوا وہاں جا پہنچا۔

"یہ بی۔اے چوہدری صاحب کا کمرہ ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"سیکرٹری صاحب؟ جو کراچی سے آئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ میں لاہور سے آیا ہُوں۔"

"یہی کمرہ ہے۔ اُن کے پاس کچھ آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر آپ اندر چلے جائیں۔"

اعجاز نے دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا۔ دروازے کے عین سامنے چوڑی

سی میز تھی، جس کے اِس طرف تین آدمی دروازے کی جانب پشت کیے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ اُپنے سامنے کرسی پر بیٹھے ہُوئے آدمی سے کوئی بات کر رہے تھے۔ وہ آدمی، جو اعجاز کے اندازے میں بی۔اے۔ چوہدری تھا، میز پہ جھکا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا اَور اپنے مقابل بیٹھے ہُوئے لوگوں کی طرف دیکھے بغیر اُن کی باتیں سن کر آہستہ آہستہ سَر ہلاتا جا رہا تھا۔ اعجاز اُس پر سرسری سی نظر ڈال کر بغل کی طرف پڑی ہُوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پُرانی عمارت کا بڑا سا، اُونچی چھت والا کمرہ تھا جس کی دیواروں سے سفیدہ اَور سیمنٹ جگہ جگہ سے اُکھڑ چکا تھا۔ بغل کی دیوار میں ایک نیم وا دروازہ تھا جو ملحقہ کمرے میں کھلتا تھا۔ اُس کمرے سے چند مردوں اَور عورتوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ پانی والا پُرانا سا کولر نصب تھا جس کے پنکھے کا ہلکا ہلکا شور کمرے میں پھیلا تھا۔ کمرے میں باہر کی نسبت کافی ٹھنڈک تھی۔ اعجاز میز کی جانب دوبارہ متوجہ ہوا تو کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اُٹھے بغیر، آگے جھک کر تین آدمیوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ تینوں رخصت ہو کر کمرے سے نِکل گئے تو اعجاز نے کاغذ نکال کر آگے بڑھایا۔ اُس وقت پہلی بار اُس نے توجہ سے بی۔اے چوہدری کو دیکھا اَور اُسے ایسا دھچکا لگا کہ وہ خُود بخود کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اَور آگے جھک کر اپنے آپ کو سہارا دیا۔

"بشیر!" اُس نے ہولے سے کہا گویا اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

بشیر ایک تار اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پہ بے معلوم سی مسکراہٹ تھی، مگر آنکھوں میں آشنائی کی جھلک تھی، جیسے کہہ رہا ہو حیران ہُوئے ناں؟ اعجاز استعجاب کی حالت میں میز کے ساتھ کھسکتا ہوا بشیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بشیر نے گرمجوشی سے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ بشیر کے پنجے میں انوکھا زور تھا جسے محسوس کر کے اعجاز چونکا۔

"تم ---؟ اعجاز کے مُنہ سے بات نہ نِکل رہی تھی۔ "بی۔اے ----؟" بشیر نے ہاتھ سے سامنے والی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ اعجاز جا کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں بشیر کے چہرے سے نہ ہٹتی تھیں۔

"چوہدری۔" بشیر نے کہا۔ "بی۔اے۔ چوہدری۔ بشیر سے بی۔اے۔ چوہدری تک کا سفر بہت طویل ہے۔ وقت مختصر ہے مگر سفر لمبا ہے۔ موقع آنے پر کبھی بیٹھ کر بات کریں گے۔ تم سناؤ، کیسی گزُر رہی ہے۔ تم نے بھی کافی سفر طے کیا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے،" اعجاز نے جواب دیا۔

اِس وقت اپنی طلبی کی کھدبد اُس کے دل سے ختم ہو چکی تھی۔ وہ صرف بشیر کی ہیئت میں کھویا ہوا تھا۔ وہ پرانا، پلپلے چہرے اور نرم آنکھوں والا بشیر غائب ہو چکا تھا۔ اُس کا رنگ اِس حد تک صاف ہو چکا تھا کہ کسی آسمانی رنگ ساز کے کمال کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کی موٹی، سلوٹ در سلوٹ جلد کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے چہرے کی چربی کسی مشین کے ذریعے نچوڑ لی گئی ہو۔ اُس کی جلد کی بنتر تک بدل چکی تھی۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف ہو چکی تھیں۔ اُس کے بال اُسی طرح گھنے تھے مگر اُن میں سفید لکریں دکھائی دے رہی تھیں۔ بال اُس نے بہت چھوٹے کٹوا رکھے تھے، جس سے اُس کا حلیہ یکسر بدل گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا بھاری حزن تھا، مگر ساتھ ہی پتھر کی سی سختی آ گئی تھی۔ آنکھوں پہ اُس نے شفاف پلاسٹک کے فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اعجاز کے ذہن کے پردے پر دو شکلیں بار بار اُبھر رہی تھیں، جیسے فلم چل رہی ہو۔ ایک وہ بشیر جو ایک جلسے میں اعجاز کے پہلو میں کھڑا اُس کی لکھی ہُوئی تقریر پڑھنے سے پہلے تھر تھر کانپ رہا تھا اور اعجاز اُس کی پشت پہ ہاتھ رکھے اُسے تھامے ہُوئے تھا۔ اور دُوسرا یہ بی۔اے۔ چوہدری تھا جو سفید لٹھے کی کلف لگی شلوار قمیض پہنے کرسی پر یوں بیٹھا جیسے بااختیار ہونے کا احساس اُس کے کندھے پہ لگا ہو۔ اُس کی آواز تک بدل چکی تھی، اُس میں گھسا ہوا سا کھردرا پن آ گیا تھا جیسے مستقل طور پہ گلا بیٹھا ہوا ہو۔ اُس شخص کی جون بدل چکی تھی۔

"تو گویا تمہیں ----" اعجاز نے بات شُروع کی، پھر فوراً اپنی تصحیح کی، "آپ کو میرے سارے کیریئر کا علم ہے۔"

جواب میں بشیر نے اُسے دیکھتے ہُوئے دوبارہ آہستہ سَر ہلا کر اتفاق کیا۔

"مگر نہ کوئی خط نہ پتر،" اعجاز نے کہا "نہ کوئی اپنے شہر کا چکر۔"

چند لحظے تک بشیر لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے اپنے سامنے میز پر دیکھتا رہا، پھر اُس نے آنکھیں اٹھائیں۔ "چھوڑو اِن باتوں کو۔ یہ بتاؤ، میری ایک بات مانو گے؟"

"کیوں نہیں،" اعجاز خوشدلی سے بولا۔

"ہمیں ذرائع ابلاغ میں پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے۔"

"لیبر میں؟"

"نہیں پارٹی میں۔ مگر اُس میں لیبر بھی آ جاتی ہے۔ ایک قومی اخبار شروع کیا جا چکا ہے۔ صوبائی سطح پر پارٹی ایک اخبار نکالنا چاہ رہی ہے، تاکہ آپوزیشن پریس کے پراپیگنڈے کا تدارک کیا جا سکے۔"

"مگر میں۔۔۔۔" اعجاز توقف سے بولا، "میں نے اخبار کا کام کبھی کیا ہی نہیں۔"

"اِس کام میں کیا ہوتا ہے،" بشیر نے ہاتھ ہلا کر کہا، جیسے اپنے سامنے کی ہوا کو پرے ہٹا رہا ہو۔ "اخبار تو روز پڑھتے ہو نا، اور تقریریں بھی لکھتے ہو۔ بس وہی کچھ ہوتا ہے۔" ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک عورت ہاتھ میں چند کاغذات لیے داخل ہوئی۔ اعجاز نے ایک لحظے کو سَر موڑ کر اُسے دیکھا اور پھر بشیر کی جانب متوجہ ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ایک بار پھر حیرت کے مارے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

کنیز کی صورت میں زیادہ فرق نہ آیا تھا، صرف بدن میں کچھ فربہی آ گئی تھی۔ البتہ اُس کی چال بدل گئی تھی۔ اب وہ زمین پر اِس طرح کھل کر قدم رکھتی جیسے اُسے زمین پر اور اپنے اگلے قدم پر مکمل اعتبار ہو۔ اِس کے باوجود اُس کے چہرے پر بشیر کی سی کرختگی نہ آئی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر وہ تمام سفید دانت نکال کر مسکرائی۔

"کنیز۔" اعجاز ہولے سے پکارا۔

"ملک اعجاز،" کنیز بولی، "راضی خوشی ہو؟"

"ہاں کنیز،" اعجاز نے یوں جواب دیا جیسے خواب کی حالت میں ہو۔

کنیز نے جلدی سے ہاتھ والا کاغذ بشیر کو پکڑایا۔ "یہ خوش دل لغاری کا قصہ ہے،" وہ بولی اور میز کے گرد چلتی ہوئی آ کھڑی ہوئی۔ "کیا حال چال ہے۔"

"ٹھیک۔۔۔" اعجاز کے گلے میں تھوک پھنس گیا۔ اُس نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ "ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

"مجھے،" کنیز نے ہنس کر ہاتھ پھیلائے، "تم دیکھ ہی رہے ہو۔" اُس کی آواز میں اعتماد تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بیباکی اور ہونٹوں کے گرد کی جلد میں وہی پُرانی ملائمت تھی۔ اُس نے سفید سلکی کپڑے کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور سیاہ رنگ کا باریک دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ فربہی اُس کے جسم کے خم مندمل نہ کر سکی تھی۔ اُس کی چھاتی میں وہی رعنائی اور اُٹھان تھی۔

"چوہدری بشیر کا بلاوا آیا تھا" اعجاز نے کہا۔

"ہاں،" کنیز بولی، جیسے کہ یہ بات اُس کے علم میں ہو۔ "رہو گے؟"

"آج واپس چلا جاؤں گا۔"

اعجاز نے کنکھیوں سے دیکھا کہ کنیز کو اُس کے ساتھ باتیں کرتے ہُوئے دیکھ کر بشیر کرسی میں بیٹھا بیٹھا کسمسایا، مگر ہاتھ میں پکڑے ہُوئے کاغذ پر جھکا رہا۔

"اچھا" وہ ہاتھ کے اشارے سے بولی، "میں اُس کمرے میں ہُوں۔ مل کر جانا۔"

"ضرور۔"

"دیکھو گولی نہ دے جانا۔" کنیز جاتے ہُوئے بولی۔

"کیا؟"

وہ ہنسی۔ "یہ کراچی کی زُبان ہے۔ مطلب ہے کہ وعدہ کر کے غائب نہ ہو جانا۔"

"نہیں نہیں۔ مل کر جاؤں گا۔"

اعجاز اُسے فرش پار کر کے دُوسرے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کنیز سے اعجاز کا واسطہ وقتوں تک رہا تھا مگر اُس کی یاد میں کنیز کے دو ہی رُوپ محفوظ تھے، ایک پہلا، جب وہ ڈھیلا سا کرتہ پہنے، ننگے پاؤں سڑک کے بیچ کھڑی واویلا کر رہی تھی، اور دوسرا علی احمد کے گھر صحن کا جہاں وہ ایک لاش کی مانند سوزنی سے ڈھکی پڑی تھی۔

جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تو اعجاز کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کنیز ہمارے بانڈڈ لیبر کے سیکشن میں ہے،" بشیر نے کہا۔

چند منٹ کے بعد بشیر نے ایک کاغذ لے کر اُس پہ لکھنا شروع کیا۔ دو چار سطریں لکھ کر کاغذ کو پلٹا اور چند سطریں دُوسری طرف تحریر کیں۔ پھر اُس نے کاغذ سیدھا کر کے اعجاز کو پکڑا دیا۔

"لاہور میں اِن صاحب سے جا کر مل لو۔ نام اور پتہ لکھ دیا ہے۔ دُوسری طرف میرا کراچی کا پتا ہے۔ ضرورت پڑے تو خط لکھ دینا۔"

اعجاز نے دیکھا کہ اچانک بشیر کے لہجے میں اُکتاہٹ نما تھکن کی جھلک آ گئی تھی، جیسے کہ وہ اِس ملاقات کو اب ختم کرنا چاہتا ہو۔ اعجاز نے کاغذ پڑھے بغیر تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ بشیر نے بیٹھے بیٹھے میز پر آگے جھک کر اُس سے ہاتھ ملایا۔ اعجاز

رخصت ہو کر درمیانی دروازے کی جانب بڑھا تو بشیر بولا "اس کمرے کا دروازہ برآمدے میں بھی ہے۔"

اعجاز باہر برآمدے میں نکل گیا۔ اُس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ اندر سے کنیز نے اعجاز کو دیکھ لیا۔

"آؤ ملک اعجاز، آجاؤ" وہ آواز دے کر بولی۔

اُس کے ساتھ والی کرسی پر ایک خوش شکل جوان عورت بیٹھی تھی۔ کنیز نے اُس کی طرف دیکھ کر ابرو سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی مشینی کل کی طرح اُٹھی اَور اَپنی کرسی اعجاز کو پیش کرکے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"اَور کیا خبر ہے" کنیز نے کہا۔ "علاقہ کیسا ہے؟"

"جیسا تھا ویسا ہی ہے۔" اعجاز نے بتایا۔

"کچھ نہ کچھ فرق تو آیا ہو گا۔ اِتنی مدت ہو گئی ہے۔"

"ہاں" اعجاز نے کہا۔ اُس کا خُون یورش کر رہا تھا اَور دِل کی کوئی کوئی دھڑکن تلف ہو رہی تھی۔ اُس سے پُوری بات نہ ہو پا رہی تھی۔ وہ مختصر سی بات کرکے چپ ہو رہتا۔

"سنا ہے تم بڑے زمیندار ہو گئے ہو" کنیز نے کہا۔

"چھوٹا زمیندار۔ جیسا پہلے تھا۔"

کنیز نے نفی میں لمبا سَر ہلایا۔ "ہمیں سب خبر ہے ملک اعجاز۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ تم نے یونین کا کام نہیں چھوڑا۔"

اعجاز کی حیرت نہ ٹھہرتی تھی۔ کنیز کی زُبان بھی سدھر گئی تھی۔ "جو ہو سکتا ہے کرتا ہوں۔"

"بس ذرا احتیاط سے رہو۔"

"احتیاط سے؟"

"ہاں۔" کنیز ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتے ہُوئے بولی۔

اُس کمرے کے اندر کرسی پر بیٹھے بیٹھے اعجاز کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ کنیز کو دیکھ دیکھ کر اُسے کھلی جگہوں کا تصور آ رہا تھا۔ کنیز اُس کی کیفیت کو بھانپ کے اُٹھ کھڑی

ہوئی۔

"چلو باہر نکلتے ہیں۔ اندر تو حبس نے جان نکال دی ہے۔"

دونوں برآمدے میں چلتے چلتے عمارت سے باہر چھوٹے سے خشک لان میں نکل آئے۔ کھلی ہوا میں سانس لے کر اعجاز کا جی ٹھہرنے لگا۔

"تمہارا ایک بیٹا تھا نا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ پڑھ لکھ جائے، مگر پڑھائی میں اس کا جی نہ لگا۔ مگر مجھے چھوڑ کر نہیں گیا۔ جب بھی اسے چھٹی ملتی ہے پہلے میرے پاس آتا ہے۔" وہ ایک لحظے رکی، پھر بولی "دیکھو، زندگی ہو تو آدمی کبھی نہ کبھی مل ہی لیتا ہے۔"

"ہاں۔"

"تمہاری بڑی مہربانی ملک جی، تم مجھ سے ملنے کو رک گئے۔"

"تم ہمیشہ مجھ سے یہی کہتی رہتی ہو،" اعجاز نے کہا۔

"کیا؟"

"بڑی مہربانی، بڑی مہربانی،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "مہربانی کی کیا بات ہے؟" کنیز آہستہ سے ہنس کر سوچ میں پڑ گئی۔ قریب سے ایک ریل گاڑی گرجتی ہوئی گزرنے لگی۔ جب وہ گزر چکی تو کنیز بولی،

"ایک زمانہ ہو گیا۔ پتا نہیں تمہیں یاد بھی ہے یا نہیں۔ مگر اُدھر تمہارے علاقے میں بڑے بڑے ملک تھے، چوہدری تھے، مربعوں والے، جائیدادوں والے، بڑی شانوں والے تھے۔ مجھے پکڑ کر لے جاتے، اپنے جسموں کو میرے اوپر رگڑتے جیسے اندر گھس جانا چاہتے ہوں، میری زبان اپنے منہ میں رکھ کر چوستے۔ اب اس کے بعد پیچھے کچھ رہ جاتا ہے؟"

اعجاز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ گونگوں کی طرح کنیز کو دیکھتا رہا۔ کنیز سر جھٹک کر بولی، "مگر نہیں۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی نہیں کھاتے تھے۔ جس گلاس میں پانی پیتی تھی اُسے مانجھ کر ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ ایک مدت ہوئی اِس بات کو، مگر ملک اعجاز، تم نے میری پکائی ہوئی ہی نہیں، میرے دانت کی کاٹی ہوئی روٹی میرے ہاتھ سے لے کر کھائی

تھی۔ یہ تمہاری مہربانی تھی ملک جی جو مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ یاد ہے؟"

جواب میں اعجاز نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

کنیز ہنس دی۔ "چلو چھوڑوں ان باتوں کو۔ تمہارے منہ میں تو زبان نہیں رہی۔ تم ایسی ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اب میں جاتی ہوں۔"

اعجاز کا جی چاہنے لگا کہ وہ کنیز کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ مگر وہ پلٹ کر جا رہی تھی۔

"ارباب" وہ ایک لمحے کو رُک کر بولی، "ذرا دیکھ بھال کر رہنا۔ اپنا خیال رکھنا۔"

اعجاز اُس کھردرے خشک گھاس والے لان میں کھڑا ایک لمبی سی مال گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے چل پڑا۔

لکشمی چوک سے ہوتا ہوا اعجاز منٹگمری روڈ پر ہولیا۔ ایک دودھ دہی کی دکان کے ساتھ تنگ سا دروازہ تھا جہاں سے سیمنٹ کی سیڑھیاں سیدھی اُوپر چڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"ایڈریس تو یہی ہے" دکاندار کے لڑکے نے اعجاز کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھا۔ "اُوپر چلے جائیں۔"

اعجاز نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو دکاندار بولا، "اُوپر چڑھ جاؤ چوہدری جی۔ دفتر شفتر ہیں، بے فکر ہو کر جاؤ۔ آدمی آتے جاتے رہتے ہیں۔"

اعجاز پُوچھتا پاچھتا ہوا تیسری منزل پر جا پہنچا۔ وہاں ایک ہی کمرہ تھا۔ بیچ میں ایک میز رکھی تھی جس کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ سب سے اچھی دفتری کرسی پر ایک معتبر قسم کا آدمی چشمہ لگائے بیٹھا تھا۔ باقی تینوں کرسیوں پر تین جوان آدمی بیٹھے اخباریں پڑھ رہے تھے۔ کمرے کی حالت خستہ تھی۔ دیواروں پر گرد کی موٹی تہہ جمی تھی۔ دو کھڑکیوں کے متعدد شیشے ٹوٹے ہوئے تھے جن کی جگہ پر گتے اٹکا کر ہوا بند کی گئی تھی۔ فرش پر بوسیدہ سا قالین بچھا تھا۔ کمرے کی فضا کسی قصبے کی میونسپل لائبریری سے ملتی جلتی تھی۔ اعجاز نے کاغذ پر لکھا ہوا نام دُہرا کر پُوچھا "سید قمرالاسلام آپ ہیں؟"

"جی میں ہی ہوں،" معتبر آدمی نے شائستگی سے جواب دیا۔

اعجاز نے رقعہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "بی۔اے۔چوہدری صاحب نے مجھے آپ سے ملنے کو کہا تھا۔"

"بی۔اے۔چوہدری؟" قمرالاسلام نے کاغذ پڑھ کر پُوچھا۔ "میرا نام اور پتہ تو درست ہے۔ مگر یہ بی۔اے چوہدری کون ہیں؟"

"دوسری طرف لکھا ہوا ہے۔" اعجاز نے کہا۔

قمرالاسلام نے کاغذ پلیٹ کر پڑھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "اچھا بشیر،" وہ بے تکلفی سے بولا۔ "اب بی۔اے۔ چوہدری بن گیا ہے؟" وہ کچھ دیر تک بے خیالی سے کاغذ کو انگلیوں میں مسلتا رہا۔ "انہوں نے کچھ عندیہ دیا کہ کس سلسلے میں آپ کو یہاں بھیج رہے ہیں؟"

"کہہ رہے تھے،" اعجاز جھجکتا ہوا بولا، "آپ اخبار نکال رہے ہیں۔"

"ہاں" قمرالاسلام نے مُنہ سے اِستہزائیہ آواز نکالی اور طنزیہ مسکراہٹ سے تینوں لڑکوں کی جانب دیکھا۔ لڑکے پڑھے لکھے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ تینوں چھت کی طرف آنکھیں اُٹھا کر مسکرائے اور دوبارہ خاموشی سے اخبار پڑھنے لگے۔

"بھئی اخبار نکلنے کی خبر تو ہم نے بھی سن رکھی ہے" قمرالاسلام نے کہا۔

نوجوانوں میں سے ایک ہنس پڑا۔

"معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا نام نہیں پُوچھا" قمرالاسلام نے کہا۔

"محمد اعجاز۔"

"محمد اعجاز صاحب، تشریف رکھیے۔ بھئی ان کے لِیے کرسی چھوڑو۔"

سب سے کم عمر لڑکا کرسی سے اُٹھ کر ساتھ رکھی نیچی سی تپائی پہ بیٹھ گیا۔

"آپ لیبر موومنٹ میں رہے ہیں؟" قمرالاسلام نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔"

قمرالاسلام سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اعجاز نے مختصراً اپنے کام کے حالات بتائے۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔" تھوڑی دیر تک قمرالاسلام اخبار کے ورق پڑھے بغیر اُلٹتا

پلٹتا رہا، جیسے کچھ سوچ میں ہو۔ پھر چہرہ اُٹھا کر ایک لحظہ اعجاز کو دیکھتا رہا۔ اب اُس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب تھی اَور ابرو پہ ہلکی سی شکن تھی۔

"بشیر صاحب کو میں جانتا ہُوں۔ وہ ہیں تو لیبر کے آدمی، مگر ہوشیار آدمی ہیں۔ اُنہوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے تو کچھ سوچ کر بھیجا ہو گا۔ مگر میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم لوگ تین ماہ سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آج فنڈز آتے ہیں کہ کل آتے ہیں۔ پہلے پلان بنا کہ ہفتہ وار نکالیں، پھر روزنامے کا فیصلہ ہوا۔ اِرادے بلند ہوتے جا رہے ہیں، فنڈز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیبر کا معاملہ تو پھر بھی ٹھیک ہے، اصلاحات ہونے والی ہیں، یا ہو رہی ہیں۔ اُدھر تو ووٹوں کا معاملہ ہے۔ اِدھر کیا ہے؟ پیسے لگائے جاؤ اَور انتظار کرو۔ ہم کر رہے ہیں۔ جب پیسے ملیں گے تو ہم کام کریں گے اَور دُوسرے انتظار کریں گے۔ یہ لانگ ٹرم معاملہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ جرنلزم کے لِئے موزوں ترین آدمی ہُوں۔ مگر لیبر پالیٹکس میں اَور اِس کام میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ میری طرف دیکھئے۔ میں پارٹی کا بانی رُکن ہُوں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے قمرالاسلام کے چہرے کی کیفیت، اُس کا لہجہ اُس کے جسم کا انداز تک سراسر بدل گیا۔ وہ پُرسکون شائستگی کا تاثر ہوا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ہراسانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ باتیں کرتے کرتے اُس کی تھوک کے ننھے ننھے گولے اُس کی باچھوں میں اٹک گئے تھے اَور ان کی لیس لبوں کی حرکت کے ساتھ بار بار شکلیں تبدیل کر رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں مہین سی کپکپاہٹ رواں تھی۔ دُوسری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لڑکے کسمسا کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ایک جا کر کونے میں رکھی ہُوئی تپائی پر پڑے چائے کے برتنوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ دُوسرا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اَور جھک کر نیچے سڑک کو دیکھنے لگا۔ تپائی پر بیٹھا ہوا لڑکا اخبار سامنے پھیلائے آنکھوں کے کونوں سے قمرالاسلام کو تاکنے لگا۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ قمرالاسلام کی اِس کیفیت سے آشنا تھے اَور اس کے گزُرنے کا اِنتظار کر رہے تھے۔

"میں پارٹی کا ---" قمرالاسلام نے دُہرا کر کہنا شرُوع کیا۔ "بانی ممبر ہوں، اَور یہاں تین مہینے سے بیکار بیٹھا ہوا ہُوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"آپ کے خیال میں،" قمرالاسلام آگے جھک کر نیم رازداری سے بولا "کیا پارٹی نے مجھے کھڈے لائن لگا دیا ہے؟"

"نہیں جی،" اعجاز سراسیمگی سے ہنس کر بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

قمرالاسلام نے اُس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ "میں ریوولیوشنری ہوں۔ ابھی صبر سے اِنتظار کر رہا ہوں۔ ایک بار طے ہو گیا کہ اُنھوں نے مجھے ایک طرف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر دیکھنا اُن کے دماغ ٹھکانے لگا دوں گا۔ ایسا اُودھم مچے گا کہ یہ سارے چوہے چیچے جو پارٹی کے گرد جمع ہو گئے ہیں دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ ان لوگوں کی کیا کومٹ منٹ ہے؟ میں،" وہ مٹھی ہوا میں بلند کر کے گرجا "ریوولیوشن کا آدمی ہوں۔" پھر اُس نے ہاتھ کھول کر دھم سے میز پر مارا۔ "اِن کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا۔"

اُس کے زرد رنگ چہرے کی کیفیت دیکھ کر اعجاز کی بے چینی بڑھنے لگی۔

"چل یار،" قمرالاسلام نے چشمہ اُتارا اور رومال سے اُس کے شیشے صاف کرتے ہوئے ایکدم اپنا مزاج تبدیل کر کے لڑکے کو مخاطب کیا۔

"اعجاز صاحب کو چائے پلا۔" اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اِس وقت چائے نہیں پیتا، مجھے تکلیف دیتی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ دراصل مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اجازت دیجئے۔"

"ارے نہیں بھئی، آپ کو بشیر نے، اوہ معاف کیجئے گا" وہ طنز سے بولا "بی۔اے۔ چوہدری، جائنٹ اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب نے اِتنی دُور سے بھیجا ہے۔ ہم آپ کی کوئی تواضع نہیں کر سکے۔"

"میں یہیں سے آیا ہوں۔"

"اچھا؟ ہاں ہاں، آپ نے بتایا تو تھا۔ بہرحال، جہاں تک آپ کا تعلق ہے، ویلکم، جائن دا کلب۔"

"پھر آؤں گا۔ جلدی کی کیا بات ہے؟ اب اجازت لیتا ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ۔"

سہ پہر آخری دموں پہ تھی جب اعجاز اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ اُس نے دو ڈھائی دِن کے بعد دفتر میں قدم رکھا تھا۔ اُس کی کرسی پر مرزا عبدالرشید بیٹھا تھا۔ یہ شخص

جو لوہار خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ایک عرصے سے مزدور تنظیموں میں پیش پیش رہا تھا گو ایک جگہ پر ٹک کر کام نہ کرتا تھا، ایک ہی شہر کے اندر حلقے تبدیل کرتا رہتا تھا اور کبھی دُوسرے شہر کو چلا جایا کرتا تھا۔ شروع سے ہی اُس نے کسی نہ کسی وجہ سے اعجاز کے خلاف ایک گروپ بنالیا ہوا تھا، گو اعجاز کی حیثیت کے مقابل وہ کبھی کھل کر سامنے کھڑا نہ ہوا تھا اور مُنہ پر وہ ہمیشہ اعجاز کے احترام کا خیال رکھتا تھا۔ اعجاز کو اُس کی حرکتوں کو علم تھا مگر اُصولی طور پر وہ مرزا رشید کی مخلص خدمات کے پیشِ نظر اُس کا لحاظ رکھتا تھا۔

مرزا رشید اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر اعجاز سے ہاتھ ملایا، مگر اُس کے لیئے کرسی خالی نہ کی۔ اعجاز کا ماتھا ٹھنکا۔ رشید دوبارہ اُس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ کھڑے رہے۔ مرزا رشید نے دُوسری کرسی کی جانب اشارہ کر کے اعجاز کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

"بیٹھو ملک اعجاز، اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔"

اعجاز سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیا بن گیا ہوں شیدے،" اُس نے پوچھا۔

"جرنلسٹ بن گئے ہو جناب۔ ہمیں لیڈ کرنے والوں میں شامل ہو گئے ہو۔"

"تُم سے کِس نے یہ کہا ہے؟"

"واہ ملک صاب، ہم کوئی اتنے ہی بے خبر ہیں؟"

"میں کوئی جرنلسٹ ورنلسٹ نہیں بنا۔ تم سے کسی نے غلط کہا ہے۔"

"اچھا؟ پھر کیا کرنے کے اِرادے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

رشید نے چپکے سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ میز کے دراز سے نکال کر اعجاز کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ یہ صوبائی ہیڈ کوارٹر سے مرزا عبدالرشید کے نام خط تھا جس میں ہدایت درج تھی کہ وہ ملک محمد اعجاز کے حلقے کا چارج سنبھال لے، کیونکہ ملک محمد اعجاز نے---- اگلے چار الفاظ نے اعجاز کا لہو اُس کے سَر کو چڑھا دیا----- "استعفیٰ دے دیا ہے۔" غُصیلے خُون کی یورش سے ایک لمحے کو اعجاز کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے سَر کو آہستہ سے جھٹک کر نظر صاف کی اور کاغذ رشید کو واپس دے دیا۔ ساتھ ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ اب اُس کی عزت کا سوال تھا۔ اگر وہ اِس بات سے لاعلمی ظاہر کرتا تو اُس کی

بنی ہوتی تھی۔ ارادے کی پوری قوت کو بروئے کار لا کر اُس نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا۔

"میرا خیال تھا" وہ ہنس کر بولا "معاملہ شاید اندر ہی اندر طے ہو جائے گا۔"

"واہ ملک صاب، آخر ہم بھی ایسے بے تعلق تو نہیں۔ ہمیں پتا تھا یہاں سے اُٹھ کر آپ قومی محاذ پر ہی جائیں گے۔" رشید نے نچلے دراز سے دو فائلوں کا پلندہ نکالا۔ "یہ کچھ آپ کے ذاتی کاغذات ہیں۔ میں نے احتیاط سے فائلوں میں بند کر دیئے ہیں۔ اب ذرا ہمارا بھی خیال رکھیئے گا۔ کبھی کبھی اخبار میں ہمارا ذکر بھی آ جائے۔ کوئی تصویر شصویر چھپ جایا کرے۔ آخر ہم نے بھی خدمت کی ہے۔"

"کیوں نہیں، شیدے،" اعجاز اُٹھتے ہوئے بولا "تُو تو بڑا فعال آدمی ہے۔"

فائلیں بغل میں لیئے اعجاز دفتر سے نکل کر سوچے سمجھے بغیر مختار ڈوگر کے گھر کی جانب چل پڑا۔ مختار ڈوگر کی نئی کار جو اُس نے حال ہی میں خریدی تھی، باہر کھڑی تھی۔

"ڈوگر صاحب ہیں؟" اعجاز نے ملازم سے پُوچھا۔

"ہیں، ملک صاب۔"

"اُن کو اطلاع دو۔"

طویل انتظار کے بعد ملازم اندر سے لوٹا۔ "جی ڈوگر صاب تو گھر پر نہیں ہیں" اُس نے بتایا۔

"ابھی تُو نے کہا تھا کہ ہیں۔"

"جی کوئی آدمی آئے تھے، اُن کے ساتھ پچھلے دروازے سے نکل گئے ہیں۔"

ملازم کے چہرے پہ صاف لکھا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

اعجاز وہاں سے چلا تو قدرتی طور پہ اُس کے قدم منظور کے گھر کی جانب اُٹھنے لگے۔ سالہا سال کے بعد پہلی بار اُسے احساس ہو رہا تھا کہ زمین اُس کے پاؤں تلے سے سرک رہی ہے، اور وہ لاعلم تھا کہ یہ معاملہ آخر کیا تھا۔

منظور کے بھائی کو ڈاکٹروں نے مستقل خواب آور دوائیاں کھلا کر سلا رکھا تھا۔

"پہلے سے بہت بہتر ہے،" منظور نے بتایا۔ "صبر میں ہے۔ ذہن بھی کچھ نہ کچھ صاف ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہے پچھلی اتوار کو اِس نے آپ کو پہچان لیا تھا؟ ایسا لگتا

ہے کہ کبھی کبھی صاف نقشے آتے ہیں، پھر مٹ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں یہ اچھی سائن ہے۔ انشاء اللہ سو فیصدی ہو جائے گا۔ مجھے اپنے قریب سے ہلنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں یہ بھی اچھی سائن ہے، کم از کم کسی کو تو مستقل پہچانتا ہے۔ میں اُٹھ کر لٹرین بھی جاؤں تو شور مچا دیتا ہے۔ اور ملک جی، کام کیسا چل رہا ہے؟"

"میں نے کام چھوڑ دیا ہے منظور۔"

"ہیں؟" منظور اُچھل پڑا۔ "کیوں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اصل میں مجھے فارغ کر دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟ کس نے کیا ہے؟ دفتر بند ہو گیا ہے؟"

"دفتر تو کھلا ہے۔ مرزے شیدے نے سنبھال لیا ہے۔"

"شیدے تلوار نے؟" منظور جوش میں چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ شیدے کی کرتوت ہے۔ اُس سازشی کو نہیں چھوڑوں گا۔ اُس کی ماں کی تلوار اُس کی پیٹھ میں گھسیڑ دوں گا۔"

"بیٹھ جاؤ، منظور،" اعجاز نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھایا۔ "اُس کا قصور نہیں ہے۔"

"آپ اُسے نہیں جانتے ملک جی، سازشی ہے مادر چود۔ میری ایک بات مانو ملک جی، میری زندگی تو اب کچھ بھی نہیں رہ گئی،" منظور کی آنکھوں میں آنسو تھے، "بس ایک بار ہاں کہہ دو، میں اُسے آج ہی ختم نہ کر دوں تو اپنے باپ کا تخم نہیں۔"

"میری بات سنو منظور، خواہ مخواہ ایسے کلمے مُنہ سے نہ نکالو۔ شیدے نے کچھ نہیں کیا۔ اُسے اُوپر سے حکم ملا ہے۔ یہ سارا کام بشیر ارائیں نے کیا ہے۔"

"بشیر ارائیں؟ وہ کون ہے؟"

"تم اُسے نہیں جانتے۔ کئی سال پہلے وہ یہاں ہوا کرتا تھا۔ اب بڑا صاحب بن گیا ہے۔"

"آپ سے اُس کی دشمنی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر اُس نے آپ کے ساتھ برائی کیوں کی؟"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"میرا تو دل کہتا ہے یہ شیدے کی کرتوت ہے۔ ایک بار مجھے جانے دیں، اُلٹا لٹکا کر بکوا لوں گا۔"

"اُونہوں،" اعجاز نے منع کیا۔ "اِس بات کا مجھے خُود ہی پتا لگانا ہے۔"

اعجاز کا جی وہاں سے اُٹھ کر کہیں جانے کو نہ کر رہا تھا۔ وہ آدھی رات تک منظور کے پاس بیٹھا رہا۔ آخر اُس نے گھڑی کا وقت دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"رات تو نِکل گئی ہے ملک جی، اب کہاں جاؤ گے۔ سائیکل بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔ یہیں رہ جاؤ۔"

"نہیں منظور، میں رات کی گاڑی سے ملتان جا رہا ہُوں۔"

"ملتان؟ کیا کرنے؟"

"وہاں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ کل آ جاؤں گا۔ یہ فائلیں تم اَپنے پاس رکھ لو۔"

سٹیشن سے اعجاز گاڑی میں سوار ہوا تو اُس کے خیال میں کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُس کے دماغ میں چمچہ پھیر کر اُسے گڈمڈ کر دیا ہو۔ ریل گاڑی میں تھوڑی دیر کو تھکاوٹ نے اُسے آ لیا، اَور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ جاگا تو اُس کا ذہن کسی حد تک صاف تھا۔

اَور اُس میں وہی ایک سوال کھٹک رہا تھا، جیسے خالی برتن میں کنکر کھڑکتا ہو۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وجہ کیا تھی؟ اِس معاملے کی تہہ میں کیا تھا؟ پولیس کے ساتھ میری کھٹ بٹ پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے۔ یہ یونین کے کام کا ایک حصہ ہے۔ ہم اَور وہ۔ مزدور اَور پولیس۔ پھر اَور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کنیز؟ وہ کنیز کو میرے ساتھ باتیں کرتے ہُوئے دیکھ کر کسمسایا تو تھا۔ مگر نہیں، یہ فیصلہ تو پہلے کا ہو چکا تھا۔ کیا بشیر مُجھ سے حسد کرتا ہے؟ کنیز کے ساتھ میرے سابقہ تعلقات کی بنا پر؟ یا اَپنی پُرانی خفتیں مٹانے اَور نئی حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے؟ ان میں سے کوئی بات بھی دُور از کار نہیں تھی۔ آخر آدمیوں کے دِلوں کے بھید کون جانتا ہے۔

ریلوے یونین کی عمارت میں قدم رکھ کر اعجاز سیدھا بشیر کے کمرے تک گیا اَور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بشیر کے پاس چار آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سب

چائے پی رہے تھے اور بظاہر خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اعجاز میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بشیر کچھ کہے بغیر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ "میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں" اعجاز نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ" بشیر نے ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "ابھی فارغ ہو جاتا ہوں۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے" اعجاز سختی سے بولا۔ "مجھے واپس جانا ہے۔"

بشیر اُس کے تیور دیکھ کر اپنے چاروں مہمانوں سے مخاطب ہو کر بولا "اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ جو باتیں ہوئی ہیں میں نے نوٹ کر لی ہیں۔ کوئی اور بات ہوئی تو مجھے مطلع کر دینا۔ ویسے اِنشاء اللہ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

بشیر نے بیٹھے بیٹھے آگے جھک کر چاروں سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ رخصت ہو کر کمرے سے نکل گئے تو اعجاز بولا "میں نے استعفیٰ نہیں دیا۔ کس نے دیا ہے؟"

"بھئی بیٹھ تو جاؤ۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کوئی نہیں" اعجاز کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "استعفیٰ کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ مگر لکھا گیا ہے کہ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور ایک دوسرے آدمی کو میری جگہ پر تعینات کر دیا گیا ہے۔"

"میرے خیال میں تو تھا کہ بھئی یہ کام تمہاری مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ آخر تم نے لیبر کے علاوہ پارٹی کی سیاست میں بھی تو قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمہاری قابلیتوں کو صحیح طور پر استعمال ہونا چاہئے۔ لیبر کے لِئے ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو صرف لیبر کا کام کرے۔ تمہارے لِئے زیادہ وسیع میدان کی ضرورت تھی جس میں تم اپنے جوہر دکھا سکو۔ چنانچہ تمہیں وہ موقعہ مہیا کر دیا گیا۔"

"موقع مہیا کر دیا گیا؟ موقع مہیا کر دیا گیا؟؟" اعجاز نے غصے سے دُہرا کر کہا۔ "کیسا موقع مہیا کر دیا گیا؟ وہ جس جگہ تم نے مجھے بھیجا تھا وہ موقع مہیا کیا گیا تھا؟ نہ وہاں کوئی کام ہو رہا ہے نہ کالج ہو رہا ہے۔ تین چار لڑکے آتے ہیں جو اخباریں پڑھ کر اور چائے پی کر چلے جاتے ہیں، اور ایک نیم پاگل سا آدمی وہاں بٹھا رکھا ہے جو ریولیوشن کی باتیں کرتا ہے۔"

بشیر کے چہرے پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "ہاں، انقلاب کی باتیں ہم سب کرتے آئے ہیں،" وہ ہولے سے بولا، جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔ "مگر اس کا سلیقہ کسے ہے؟ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ مقصد یہ ہے کہ اسی واسطے تمہیں بھیجا تھا کہ وہاں جا کر آرگنائز کرو۔"

"نہ پیسہ نہ دھیلا،" اعجاز بولا، "آرگنائز کیا کروں؟ وہ جو وہاں بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے کہ پارٹی کا بنیادی ممبر ہے۔ وہ میری سنے گا؟ میں کسی اخبار وخبار میں جانا نہیں چاہتا۔ میں وہ کام کروں گا جس میں میں نے عمر صرف کی ہے۔ میں نے کوئی استعفیٰ نہیں دیا۔ میرے ساتھ فریب ہوا ہے۔"

بشیر کا انداز یکدم بدل گیا۔ نہ وہ آنکھوں میں آشنائی کی جھلک رہی، نہ لہجے کی دوستی۔ اعجاز نے اِس کیفیت کو یوں محسوس کیا جیسے تند لو کا جھونکا منہ کو لگتا ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے بشیر کو دیکھ رہا تھا اور اُس نے محسوس کیا کہ پہلے روز جو اُس نے سوچا تھا کہ بشیر کا رنگ اِن سالوں کے دوران صاف ہو گیا تھا وہ محض پیلاہٹ تھی جو جلد کی سلوٹوں پر پھیلی ہوئی تھی، جیسے نعشوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اب بشیر کی آنکھوں میں اور لبوں کے گرد وہ پتھر کی سی سختی پُوری طرح نمایاں ہو گئی تھی جسے پہلے روز اعجاز نے محسوس کیا تھا۔

"یہ نہ میرا فیصلہ ہے نہ لیبر کے کسی آدمی کا،" بشیر بولا۔ "یہ ہائی کمان کا فیصلہ ہے۔"

"ہائی کمان؟ کِس کی ہائی کمان؟"

"پارٹی کی ہائی کمان۔"

"میرے متعلق؟" اعجاز متعجب ہو کر بولا۔ "میری کیا حیثیت ہے؟ کیا میری لیول پر پارٹی کی ہائی کمان فیصلہ کرتی ہے؟"

بشیر کی آواز کی سرد مہری اعجاز کی ہڈیوں سے آ ٹکرائی۔ "جہاں ڈسپلن کا سوال آتا ہے وہاں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں کی جاتی۔"

"میں نے کب ڈسپلن توڑا ہے؟"

بشیر نے ایک لمحہ توقف کیا، جیسے دل میں کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ "وہ تقریر جو تم نے مختار ڈوگر کے جلسے میں کی تھی۔ وہ تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔"

"اُس میں تم نے کیا کہا تھا؟"

"وہی معمول کی باتیں، کہ عوام کے نام پر ہر کار مختار نے قوم کو دھوکہ دیا ہے، اِس لئے عوام کا نام آئندہ سے استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔"

"کیا یہ مناسب بات تھی؟"

"میرے خیال میں بالکل مناسب تھی۔ ایسی تقریریں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں۔"

"درست،" بشیر نے کہا۔ "لیکن وہ تب کی بات تھی، اَور یہ اب کی بات ہے۔ اُس وقت پارٹی اقتدار حاصل کرنے کے لِئے جدوجہد کر رہی تھی۔ اب پارٹی حکومت میں ہے۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ اِن دو مواقع کی ضروریات مختلف ہیں۔ اس بات کی سمجھ تمہارے جیسے انقلابیوں کو نہیں آتی۔"

"لیکن حکومت چلانے کے لِئے بھی کیا لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا نہیں پڑتا؟"

"درست۔ لیکن تم نے برخود غلط حربہ استعمال کیا ہے۔"

"اِس میں کونسی بات غلط ہے؟"

"اپنے ملک کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ پہلی بار کسی کو عوام کے نام پر حکومت ملی ہے۔ لیڈر نے عوام کا نام لیا تو لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عوام کے نام پر لوگوں نے ووٹ دیئے، عوام کے نام پر لوگوں نے بڑے بڑے وڈیروں اَور سیاسی ساہوکاروں کو ہرایا، عوام کے نام پر لوگوں کا جذبہ جاگا۔ جمہوریت کا اِتنا بڑا انقلاب یہاں پہلی بار آیا ہے اَور تم عوام کے نام کا تصور ہی مٹا دینا چاہتے ہو؟ اگر عوام کا لفظ مٹ گیا تو سب کچھ مٹ جائے گا۔ ایسی باتوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

اعجاز دم بخود رہ گیا۔ "میں نے تو صرف عوام اَور غریب لوگوں کا فرق بیان کیا تھا،" وہ بولا۔

"اُونہوں،" بشیر سَر جھٹک کر بولا۔ "تُم نے عوام کے نعرے کو، جس کے بل پر قوم ہمارے ساتھ چلی ہے، بے عزت کیا ہے۔ تم نے جمہوریت کی جڑ پر وار کیا ہے۔ زبان کے ساتھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ہے جو سب سے بڑی قوت ہے، اَور سب سے بڑی شرارت کی جڑ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ شرارت پھیل جائے تو نہ غریب کے پاس کچُھ رہے گا نہ امیر

کے پاس۔ ایسی شرارت اپنے نہیں، غیر لوگ کرتے ہیں۔"

"مگر جس کام کے لئے تم نے مجھے بھیجا ہے وہاں تو سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔ کیا وہ زبان کی شرارت نہیں ہے؟"

بشیر خشک سی ہنسی ہنسا۔ "ملک اعجاز، تم سیاست کے معصومین میں سے ہو۔ سیاست کے معصوموں کا اکھاڑہ جرنلزم ہے۔"

"سیاست کے معصوموں کا اکھاڑہ؟" اعجاز نے دُہرا کر پُوچھا۔ اب اُس کا غصہ جو اچنبھے کی صورت میں دب گیا تھا، دوبارہ اُبھر رہا تھا۔

"ہاں" بشیر بولا، "کون پڑھتا ہے۔ کون اعتبار کرتا ہے۔"

"پھر تم نے مجھے وہاں کس لئے بھیجا ہے؟"

"بھئی دشمنوں کے پراپیگنڈہ کا جواب تو دینا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک فنکشن ہے۔ دیکھ ملک اعجاز، بہت سے معاملوں میں تم سمجھ دار ہو۔ میرے اُوپر تمہارے احسان ہیں، میں انکار نہیں کرتا۔ اور انہیں لوٹانے کی اپنے تئیں کوشش بھی کرتا رہا ہوں، جن کا ذکر میں نہیں کرنا چاہتا۔ مگر میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ سب اِنقلابیے آخر میں صرف دو صورتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں، روزی کمانے کی، اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی۔ روٹی جہاں سے ملتی ہے کماتے ہیں، اور ضمیر کو مطمئن کرنے کی وہ کوئی نہ کوئی صورت اِیجاد کر لیتے ہیں۔ مگر ملک کے کروڑوں عوام کو سنبھال کر رکھنا ایک بالکل دُوسرا کام ہے۔ اِس میں رخنہ اندازی کی گنجائش نہیں ہے۔"

"میں ایسا اِنقلابیہ تو نہیں بشیر، تمہیں پتا ہے۔ میں نے ہزاروں مزدوروں کو سنبھال کر رکھا ہے۔"

"وہ وقت گیا اعجاز،" بشیر کی آواز میں اُکتاہٹ تھی۔ "جو فیصلہ ہو گیا وہ ہو گیا۔"

اب اعجاز کی حالت قابو سے باہر ہو گئی۔ "تو میری عمر بھر کی کمائی غارت گئی؟"

"میرا اِس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں،" بشیر نے بات ختم کرتے ہُوئے کہا۔

"میں اپنی جگہ واپس حاصل کروں گا" اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں دیکھوں گا وہ آدمی کیسے میری جگہ پر بیٹھتا ہے۔"

بشیر نے منع کرنے کے انداز میں خاموشی سے سَر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اعجاز پلٹ

کر کمرے سے نِکل گیا۔ کھلے دروازے کے باہر رُک کر وہ بولا،

"میں نے اِس کام میں عمر گنوائی ہے۔ مجھے کون نکال سکتا ہے۔ تم لوگوں نے،" وہ پہلے بشیر اُور پھر برآمدے میں کھڑے دو چار آدمیوں کی جانب اُنگلی اُٹھا کر بولا، "تم لوگوں نے کیا کیا ہے۔ تم لوگوں نے کرسیوں پر بیٹھ کر حکم چلائے ہیں۔" وہ باہر کو چل پڑا۔ وہ برآمدے میں چلتا اُور مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا اُونچی آواز میں بولتا جا رہا تھا۔ "میں نے میدان میں بازی لگائی ہے، میں نے اپنی روزی اس میں گنوائی ہے، میں نے گھر باہر کی قربانی دی ہے۔ میرے ساتھ دغا ہوا ہے۔" برآمدے سے نِکل کر وہ خشک گھاس کے لان میں رُک گیا۔ دفتروں کے کمروں سے لوگ نِکل نکل کر برآمدے میں جمع ہو رہے تھے۔ سب کی توجہ کا مرکز اعجاز تھا۔ بشیر کے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کنیز چوکھٹ سے ٹیک لگائے، کولہے پہ ہاتھ رکھے کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ دو عورتیں اُور ایک مرد کھڑے تھے۔ بشیر کے کمرے کے دروازے سے اُس کی شکل نمودار ہوئی۔ اعجاز نے دیکھا کہ وہ ایک مضبوط چھڑی کے سہارے بمشکل ایک ٹانگ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ اعجاز بہت بول چکا تھا، مگر اُس کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ اُس نے مٹھی کس کر ہوا میں لہرائی،

"میں نے اِس میں ۔۔۔۔" الفاظ اُس کے مُنہ سے ایسے نکلے جیسے بندوق کی نال گولیاں اُگلتی ہے، "اپنا ایمان گنوایا ہے۔"

جواب میں پندرہ بیس خاموش چہرے برآمدے میں کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے، جن کے آخری سرے پر کنیز اُور بشیر کھڑے تھے۔ دفعتہً اعجاز کو یوں محسوس ہوا جیسے سارا خُون اُس کے بدن سے نچڑ گیا ہے اُور اُس کا سینہ خالی ہو گیا ہے۔ بشیر کی مفلوج شبیہہ کو چھڑی کے سہارے کھڑے دیکھ کر اُس کے غصے کی لہر بیٹھتی چلی گئی۔ وہ تیزی سے پلٹا اُور عمارت کی حدود سے نِکل گیا۔

اعجاز بس پکڑ کر دوپہر تک واپس پہنچ گیا۔ وہ سیدھا اُس دکان پر گیا جہاں اُس نے اپنی بائیسکل، چین اُور پہیے کی تاروں کی خرابی کی وجہ سے مرمت کے لئے دی ہوئی تھی۔

"ملک صاب،" منیر میکینک بولا، "سیکل نیا خریدیں۔ یہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔"

"جب نیا تھا تو اُس وقت بھی میں نے ہی چلایا تھا نا،" اعجاز نے کہا۔

منیر ہنس پڑا۔ "حضور آپ کی پزیشن تو موٹر سیکل کی ہے۔ سیکلوں کو اب چھوڑیں۔ یہ دیکھیں، ایک نمبر موٹر سیکل آیا ہوا ہے۔ چھ مہینے بھی نہیں چلا۔ ستا بک رہا ہے۔"

اعجاز کافی عرصے سے اِرادہ کر رہا تھا کہ لڑکے بڑے ہو رہے ہیں، اپنی بائیسکل اُن کو دے کر ایک موٹر سائیکل خرید لے، مگر حسبِ عادت گانٹھ کھولنے سے کتراتا رہا تھا۔ اِس وقت میکنک کی بات نے عجیب طور پہ اُس کے اندر ایک طمانیت بخش کیفیت پیدا کی۔ چمکتا ہوا موٹر سائیکل تقریباً نیا لگ رہا تھا۔

"کتنے میں بک رہا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"آپ کو خاص ستا لے دوں گا۔ ٹرائی کر کے دیکھیں۔"

"قیمت کا اندازہ تو بتا۔"

"پیسوں کی بات چھوڑیں ملک صاب۔ آپ ٹرائی لیں۔ آدھی کک پر سٹارٹ ہونے والی مشین ہے۔ ایسا مال روز روز مارکٹ میں نہیں آتا۔"

اعجاز نے موٹر سائیکل کے گرد گھوم پھر کر، اُس کے اُوپر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ "تو پھر قیمت نہیں بتائے گا؟"

"ملک صاحب، پھر وہی بات؟ چلیں لے جائیں کچھ بھی نہ دیں۔ ٹرائی تسلی بخش ہُوئی تو جو آپ کی جیب میں ہوا وہ دے دینا۔ میں آپ سے دُوسری بات کروں تو کہنا کہ منیرا جھوٹا آدمی تھا۔" ساتھ ہی اُس نے جیب سے چابی نکال کر موٹر سائیکل میں گھمائی اور کک ماری تو پھرر کر کے انجن چلنے لگا۔ "ذرا اِس کی آواز سنیں ملک صاب، جیسے ابھی ابھی کارخانے سے بن کر آیا ہے۔ ہے کہ نہیں؟"

کچھ دیر بعد اعجاز نے کہا، "ٹھیک ہے منیر۔ آج میں اِسے گھر لے جاتا ہوں۔ کل لے آوں گا۔ ٹرائی ٹھیک رہی تو سودا کریں گے۔"

"ملک صاب، جب تک جی چاہے ٹرائی لیں۔ آپ کوئی ناواقف آدمی تو نہیں، ہمارے مہربان ہیں۔ ذرا ایک بات کا خیال رکھیں۔ مشین صاف ستھری ہے، کہیں اِدھر اُدھر سے لگنے نہ پائے۔ ناخن کا نشان بھی پڑ جائے تو گاہک کی نظر میں قیمت آدھی رہ جاتی ہے۔"

"فکر نہ کر منیر۔ نشان لگ گیا تو میں آدھی قیمت پر خرید لوں گا۔"

دونوں ہنس پڑے۔

جب اعجاز گھر میں داخل ہوا تو سکینہ اور دونوں لڑکے اُٹھ کر دوڑ پڑے۔ اعجاز نے احتیاط سے موٹر سائیکل اُٹھا کر دہلیز پار کی اور اسے صحن والے کمرے کی دیوار کے برابر کھڑا کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"تجھے دِکھائی نہیں دیتا کیا ہے۔"

"کس کا ہے؟"

"دکاندار کا ہے۔"

"کس دکاندار کا؟"

"سائیکل کی دکان والے کا ہے بھئ۔ ٹرائی کے لِئے لایا ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ ٹھیک نکلا تو خرید لوں گا۔"

"خرید لوگے؟ یہ تو ہزاروں کا ہو گا۔"

"پھر کیا ہے۔ تو جیتی رہ، اِسی طرح سنبھال کے کاروبار کرتی رہی تو کار بھی آ جائے گی۔"

"اور تم اِس پہ چڑھ کے ساری ساری رات سیر کرتے رہو، ہیں؟ کل کے گئے ہوئے آج آ نکلے ہو۔"

"ابا یہ ہمارا ہو جائے گا؟" حسن نے پُوچھا۔

"ابا مجھے بھی چلانا سکھا دو گے؟" حسین بولا۔

"ابا سیکل میں لے لوں گا۔"

"جا اوے، بڑا معتبر آیا۔ تو کیسے لے لے گا۔" حسین جارحانہ انداز میں بولا۔ حسن دبک کر چپ ہو رہا۔ دونوں لڑکے ہیجانی کیفیت میں موٹر سائیکل کے گرد چکر لگا رہے تھے۔

"اوئے ہٹ جاؤ" اعجاز ... پرے ہو جاؤ۔ جس نے اس کو ہاتھ لگایا اُس کی

چمڑی اُتار دوں گا۔" اعجاز سیدھا اندر جا کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ سکینہ دُوسری چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"ملتان چلا گیا تھا۔"

"تُم پرسوں بھی ملتان گئے تھے۔"

"ہاں۔"

"پھر کل کیا کرنے گئے تھے؟"

"کام تھا، بتایا تو ہے۔"

سکینہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "بتاتے کیوں نہیں کہ بشیر رائیں سے ملنے گئے تھے۔"

"تجھے کس نے بتایا ہے" اعجاز نے چونک کر پُوچھا۔

"زلفی ریڑھے والے کو شہر میں منظور ملا تھا۔ منظور نے اُسے بتایا ہے۔"

"ہاں" اعجاز کروٹ سے ہل کر سیدھا پشت پہ لیٹ گیا۔

"یہ بشیر رائیں وہی ہے جو تمہاری مصلّن کو نکال کر لے گیا تھا؟"

جواب میں اعجاز نے حلق سے 'ایسہ' کر کے ناگوار سی آواز نکالی۔ "میرے خلاف جھوٹی باتیں تجھے کون بتاتا رہتا ہے؟"

"جھوٹی نہیں ہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"تُو کانوں کی کچی ہے۔ لائی لگ ہے۔ حسنے، حسینے" اُس نے لڑکوں کو آواز دے کر بلایا۔ "آؤ۔ میری ٹانگیں دباؤ۔"

لڑکوں نے چارپائی کے دونوں جانب بیٹھ کر باپ کی ایک ایک ٹانگ سنبھالی اَور زور زور سے دبانے لگے۔

"مصلّن ابھی اُس کے ساتھ ہے یا چھوڑ کے بھاگ گئی ہے؟"

"تجھے کوئی اَور بات کرنے کو نہیں ملتی؟ میرا دماغ پہلے ہی خراب ہو رہا ہے۔"

سکینہ نے دِل کا غبار نکالنے کے بعد موضوع بدل دیا۔ "زلفی کو منظور نے بتایا ہے کہ تم نے کام ختم کر دیا ہے۔"

اعجاز خاموش رہا۔

"کیوں، ٹھیک ہے یا غلط؟"

"ہاں،" اعجاز آہستہ سے بولا۔

"ہاں کیا؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب پیچھا بھی چھوڑ، سَر کھائے جا رہی ہے۔"

"تمہارا سَر بڑا نازک ہے ناں۔ میں فجر کی اذان تک بیٹھی جاگتی رہی ہوں، میرے سَر کو کچھ نہیں ہوا۔"

"تیرا سَر تو لکڑی کا ہے، اِسے کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ اوئے،" وہ لڑکے پر چیخا "ہاتھ ہولا رکھ۔"

"اللہ کا شکر ہے تم نے کام چھوڑ دیا ہے۔ ٹھیکہ ختم ہونے کو ہے۔ زمین واپس لے کر خود کھیتی کرو، کچھ ہاتھ میں بھی آئے۔ ٹھیکے والے تو اپنی قسمت کو ہی روتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیکہ تو نے اَور چاچے نے دیا تھا۔ اب روتی کیوں ہو؟"

"تُم کچھ کرنے والے ہوتے تو ہمیں کیا سانپ نے کاٹا تھا کہ زمین دُوسروں کے ہاتھ میں دیتے؟ بس ٹھیک ہے، اب کوئی اَور کام اَپنے سَر مت لینا۔ گھر میں رہ کر کاشت کراؤ۔ کچھ لڑکوں کا بھی خیال کرو۔ سارا دِن باہر ڈُنگے مارتے رہتے ہیں۔ میرے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں کس کس کام کو سنبھالوں؟"

اعجاز ٹانگیں دبواتے دبواتے سو گیا۔ سکینہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے آواز دے کر کہا۔

"اوئے حسنے، ابے سے پُوچھ روٹی کھانی ہے؟"

دونوں لڑکوں نے باری باری باپ کو جھنجوڑا۔ "ابا، ابا بی بی کہتی ہے روٹی کھانی ہے؟" اعجاز نے نیند میں اُوں آں کی آواز نکالی اَور کروٹ بدل کر سو گیا۔

"پتا نہیں کہاں کہاں سے پھر پھرا کر آیا ہے،" سکینہ اَپنے آپ سے بولی، "اب خالی پیٹ سو گیا ہے۔ اُٹھ کر کہے گا میرے بدن میں درد ہو رہی ہے۔"

اعجاز شام کے وقت اُٹھا اَور روٹی کھا کر پھر سو گیا۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھا تو اُس کا

جسم ہلکا پھلکا تھا۔ نہا دھو کر جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھا تو اُس کا مزاج حیرت انگیز طور پہ خوشگوار تھا اَور دِل کھلا ہوا تھا، جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

"کپڑا لے کر موٹر سائیکل کو صاف کرو،" اُس نے لڑکوں سے کہا۔ "گندے ہاتھ نہ لگانا۔" لڑکے خوشی خوشی جا کر موٹر سائیکل کی گرد صاف کرنے لگے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" سکینہ نے دُوسرا پراٹھا اُس کے سامنے رکھتے ہُوئے پوچھا۔

"منظور کو ملنے جا رہا ہُوں۔ اُس کے پاس میرے کاغذات ہیں۔"

اعجاز نے سفید لٹھے کی دُھلی ہُوئی شلوار قمیض پہنی۔

"جلدی آ جانا،" سکینہ نے کہا۔ "ابے کو بلایا ہے۔ بیٹھ کر کوئی بات کریں گے۔"

"ابا، موٹر سیکل صاف ہو گیا ہے۔ باہر لے جائیں؟"

"میں نے تم سے کہا ہے اِس کو ہاتھ نہیں لگانا۔ پرے ہو جاؤ۔"

مگر جب اعجاز نے موٹر سائیکل دہلیز سے نکالا اَور اُسے نالی سے بچا بچا کر دھکیلتا ہوا گلی کے سرے تک لے گیا، تو حسن بولا۔

"ابا ایک جھوٹا تو دے دو۔"

تمہارے سکُول کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو جاؤ۔"

"ابھی دیر ہے،" حسین بولا۔ "بس سڑک تک۔"

اعجاز نے دونوں لڑکوں کو پیچھے بٹھایا اَور احتیاط سے چلاتا ہوا سڑک تک لے گیا۔ "چلو اب اُترو۔"

"ابا سڑک پر تھوڑی دور،" دونوں لڑکے بولے، "ذرا تیز۔"

اعجاز نے موٹر سائیکل کا رخ شہر سے اُلٹی جانب موڑا اَور آدھے میل تک تیز چلا کے لے گیا۔ ہوا لڑکوں کے چہروں سے رگڑ کھا کے گزُری تو اُنھوں نے چیخ چیخ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اعجاز نے اَپنے بچوں کی ہمراہی میں اِس انوکھے لطف کو محسوس کیا تھا۔ واپسی پر اُس نے کچے راستے پر موٹر سائیکل روک لی۔ "اب دوڑ جاؤ،" وہ بولا۔ "سکُول سے دیر ہو گئی تو تمہیں درست کروں گا۔"

آٹھ دس منٹ کے اندر اعجاز شہر میں اَپنے علاقے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اپنے دفتر کے سامنے سے گزُرتے ہُوئے اُس نے اِرادتاً رفتار بہت دھیمی کر لی۔ اُس نے دُور

سے دیکھ لیا تھا کہ شیدا تلوار دروازے میں کھڑا چند لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے مقابل پہنچ کر اعجاز نے اُن پر سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ سب باتیں چھوڑ کر اعجاز کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اعجاز کو سلام کیا، جس کا جواب اُس نے ہاتھ اُٹھا کر دیا اور اُسی رفتار سے گزر گیا۔ اُسے پتا تھا کہ وہ سب مُنہ اُٹھائے اُسے دُور تک دیکھتے رہے ہونگے۔ وہ سر اُٹھائے، اکڑ کر موٹر سائیکل پہ بیٹھا تھا اور اُس کا دِل، جو صبح سے ہلکا تھا، اب اُڑنے لگا تھا۔

وہ تھوڑی دُور ہی گیا ہو گا کہ ایک بس سٹاپ پر اُسے مانوس چہرہ نظر آیا۔ بیس گز آگے جا کر اُسے یاد آیا کہ یہ بدیع الزمان تھا۔ کئی سال پہلے یہ اخباری رپورٹر ہوا کرتا تھا، جس نے پہلی بار اعجاز سے ملاقات کر کے اُس کی تصویر اور ایک مختصر سا بیان ایک بڑے اخبار میں چھاپا تھا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے وہ ایک نئے روزنامے کا ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ اعجاز کے ساتھ اُس کی چند بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اعجاز واپس مڑ آیا۔ بس سٹاپ سے شیدا تلوار اور اُس کے ساتھی دکھائی دے رہے تھے جو سب کے سب ابھی تک اعجاز کی جانب مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ بدیع الزمان سٹاپ پہ کھڑا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔

"بدیع صاحب، چلیئے آپ کو چھوڑ آؤں۔"

بدیع الزمان نے اخبار سے سَر اُٹھا کر دیکھا۔ "اخاہ، ملک اعجاز صاحب، السلام علیکم۔ کیسے ہیں۔ خیریت سے ہیں؟"

"بالکل خیریت سے ہُوں۔ اللہ کا کرم ہے۔ آیئے۔"

"میں آپ کے وقت کا حرج نہیں کرنا چاہتا۔" بدیع الزمان نے کہا۔

"وقت نہ ہوتا تو میں رُکتا ہی کیوں بدیع صاحب۔ آیئے آیئے۔"

"ہاں، آج کل تو شاید آپ کے پاس کچھ وقت فارغ ہو" بدیع الزمان بولا۔

اُس نے اعجاز کی پچھلی نشست پر جم کر بیٹھنے، اپنا تھیلا گود میں سنبھالنے اور ناک پر عینک کو درست کرنے میں کچھ وقت لیا۔ پھر کچھ سوچ کر عینک اُتار دی اور جیب میں رکھ لی۔ "اللہ کا نام لے کر چلیئے۔ میں بھی وِرد کرتا ہوں۔ مجھے اِن سواریوں سے خوف آتا ہے۔"

اعجاز روانہ ہوا تو بدیع الزمان بات جاری رکھتے ہُوئے بولا، "ہاں، آپ کے سیٹ اَپ میں کچھ ردوبدل کی خبریں ملی ہیں۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"بھئی اخبار نویس ہیں۔ حالات سے باخبر رہنا ہمارا پیشہ ہے۔"

"اعجاز ہنسا۔ "یہ تو درست ہے بدیع صاحب۔ خبر بھی کم و بیش درست ہی ہے۔"

"کچھ تفصیلات بتایئے۔"

"تفصیلات کا ابھی مجھے پوری طرح علم نہیں،" اعجاز نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"جب پتا چل گیا تو ضرور بتاؤں گا۔ آپ سنایئے، "طلوع" کیسا چلا رہا ہے؟"

"وہاں سے تو میں فارغ ہو گیا ہوں،" بدیع الزمان نے کہا۔

"فارغ ہو گئے؟ کیوں؟"

"بس چھوڑ دیا۔ مالکان کے اور میرے خیالات میں فرق تھا۔ دخل اندازی کرتے تھے۔ میں وہاں چل نہیں سکا۔ استعفیٰ دے دیا۔"

"افسوس کی بات ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اب کیا کر رہے ہیں؟"

"بھئی میں نے سوچا کہ مالکان کوئی اور ہوں اور ایڈیٹر کوئی اور تو کام دیر تک نہیں چل سکتا۔ اخبار اپنا ہی اچھا ہوتا ہے، چاہے چھوٹا ہو۔ چنانچہ میں نے ہاتھ پاؤں مار کر ایک ہفتہ وار نکالا ہے۔ ابھی اس کے تین اشو نکلے ہیں۔ خبر نہیں کتنے روز چلے گا۔ ابھی تو ہم ٹیتھنگ ٹربلز سے ہی نہیں نکل سکے۔ قسمت یاور ہوئی تو چل نکلے گا ورنہ قلم کان میں اڑس کر پھر کسی طرف کو نکل پڑیں گے۔" وہ ہنسا، پھر جلدی سے بولا، "ارے اس طرف نہیں بھئی، یہ تو "طلوع" کے دفتر کو جا رہے ہیں، اب میرا دفتر دوسری طرف ہے۔ آگے چوک سے سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔"

ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بدیعُ الزمان نے اعجاز کو رکوا لیا۔ "چلیے، کچھ تھوڑا وقت ہے تو ایک چائے کی پیالی ہو جائے۔ گپ شپ رہے گی۔ ہمار سیٹ اپ بھی دیکھیے۔"

"میں ایک دوست کی خبر لینے جا رہا تھا،" اعجاز موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے بولا، "چلیے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔"

اعجاز بدیعُ الزمان کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ دفتر ایک چھوٹے سے چوبارے میں تھا جس کی کھڑکیاں پچھلی گلی میں کھلتی تھیں۔ ایک میز، تین چار کرسیاں، دو تپائیاں، ایک ٹائپ رائیٹر دفتر کی کل اوقات تھی۔ اخباروں، رسالوں اور سادے کاغذوں کے ڈھیر

اس کے علاوہ تھے، جن کے درمیان گھرا ہوا ایک نوجوان لڑکا کرسی پہ بیٹھا تپائی پہ جھک کر کچھ لکھ رہا تھا۔ چلنے پھرنے کی جگہ کچھ کم تھی مگر چوبارہ صاف ستھرا تھا اور اس میں ایک خاص ترتیب سے بے ترتیبی نظر آ رہی تھی۔

"یہ میرا اسسٹنٹ ہے۔" بدیع الزمان نے تعارفاً کہا۔ اور پیشتر اس کے اعجاز نوجوان سے مصافحہ کرتا، بدیع الزمان اُسے بازو سے پکڑ کر ایک کونے میں لے گیا، جہاں اُس کے ہفتہ وار کا ڈھیر لگا تھا۔ اُس نے اُوپر سے ایک پرچہ اُٹھا کر اعجاز کو دکھایا۔ "کیسا ٹائیٹل ہے؟"

"واہ،" اعجاز نے پرچہ اُس کے ہاتھ سے پکڑتے ہُوئے کہا۔ "بہ بانگ دہل، بہت خُوب۔"

"پہلے اس کا نام 'نقطہ نظر' تجویز ہُوا تھا۔ مگر اُس میں مُجھے کوئی چاشنی نظر نہیں آئی۔ کیا خیال ہے؟"

"بالکل درست ہے۔"

"بھئی بات یہ ہے کہ اگر کچھ کہنا ہے تو بہ بانگ دہل کہیئے۔ چاہے چار دن ہی کہیئے۔ کیوں، ٹھیک ہے ناں؟ بھئی شمس، ملک صاحب کو چائے تو پلاؤ۔" بدیع الزمان اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اعجاز کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اِشارہ کرکے بولا۔ "ایک میرے عزیز ہیں، اُنھوں نے کئی سال سے ڈیکلریشن حاصل کرکے رکھی ہُوئی تھی۔ بس پرچے کا نام بدلنے کی ٹیکنیکیلٹی تھی، وہ کروا لی۔ کچھ دوستوں سے مانگا، کچھ رشتہ داروں نے مدد کی، میرے ایک پھوپھا بینک میں ہیں، کافی سینئر پوسٹ پر ہیں، کچھ اُنھوں نے ہاتھ بٹایا، گارنٹی کی صورت میں، مگر بینک گارنٹی بھی سکہ بند چیز ہے۔ بہرحال اِتنا کچھ ہوگیا کہ شروع کرسکوں۔ اخبار اصل میں اِشتہاروں پر چلتا ہے۔ اِس کے لِئے کانٹیکٹ ہونے چاہئے۔ ابھی تک تو شوسٹرنگ آپریشن ہے۔ مگر رسپانس اچھا ہے۔ پڑھا جا رہا ہے، اور اس پہ کمنٹ بھی ہو رہا ہے۔ کافی حوصلہ افزا حالات ہیں،" وہ بے یقینی سے ہنسا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔ "تم بتاؤ، تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

"مُجھے بھی ارباب بست و کشاد اخبار نویسی کی جانب دھکیلنے والے تھے،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "بال بال بچا ہُوں۔"

"کہاں؟" بدیع الزمان چوکنا ہو کر بولا۔

"کوئی پارٹی کا اخبار نکال رہے ہیں۔"

"وہ قمرالاسلام والا تو نہیں؟"

"وہی ہے۔"

"ہنہ،" بدیع الزمان حقارت سے بولا۔ "میں قمر کو بیس سال سے جانتا ہوں۔ پارٹی کا پنچھو ہے۔ ساری عمر باتوں کی کمائی کھاتا رہا ہے۔ وہ اپنے قصبے کا ایک ورق کا لوکل پرچہ نہیں نکال سکتا۔ ڈیلی پیپر نکالنا کوئی خالہ جی کا گھر ہے؟ ملک اعجاز' اگر اخبار کا کام ہی کرنا ہے'" وہ آگے جھک کر اپنائیت سے بولا' "تو یہاں آ جاؤ' تمہارا اپنا پرچہ ہے' تنخواہ ونخواہ نہیں دے سکتا۔"

"خدا کا شکر ہے' اسکی ضرورت نہیں۔"

"ہاں ہاں' جانتا ہوں' پیچھے سے ماشاء اللہ تگڑے ہو۔ میں کئی بار سوچا بھی کرتا تھا' تمہاری بیک گراؤنڈ کا آدمی یونین وغیرہ کے چکروں میں نہیں پڑتا۔ ہم تو حالات کے آگے آگے بھاگتے ہوئے جدھر کو دھکیل دیئے گئے اُدھر کو جا نکلے۔"

"حالات ہی اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں بدیع صاحب'" اعجاز نے کہا۔ "حالات ایک بندے کے دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں' مگر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ حالات ہماری سمتیں متعین کرتے ہیں۔"

"تمہارے جیسا تجربہ کار اور تعلق واسطہ رکھنے والا آدمی تو اس کام میں بہت کامیاب ہو سکتا ہے۔"

اعجاز ہنسا۔ "آپ کو ایک بات بتاؤں؟ کل ہی ایک آدمی سے ملا ہوں جو کہہ رہا تھا کہ جرنلزم سیاسی معصومین کا اکھاڑہ ہے۔"

"ہاں ہاں'" بدیع الزمان عادی سگریٹ نوشوں کی مخصوص ہنسی ہنسا۔ "ایک سنگی ویوپوائنٹ یہ بھی ہے۔ مگر جناب' میں نہ سیاسی ہوں' نہ معصوم ہوں۔ سیاست چھوڑ دی ہے' اور معصومیت کھو دی ہے۔" وہ اپنی بات پر دوبارہ پورے زور سے ہنسا۔ "اب تو انسان کا انسان کے اوپر ظلم روکنا میرا مشن ہے۔ چھوٹی برائیاں بڑی برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔ آج کل ایک گھی سکینڈل کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ خراب گھی کھا کھا کر سینکڑوں لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ بڑے بڑے اخباروں نے خبر دبا دی ہے۔ مگر میں نے یہ کام اپنے ذمے

لے لیا ہے۔ ریکارڈ جمع کر رہا ہوں۔" بدیع الزمان نے میز کا دراز کھول کر ایک لمبا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اعجاز کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لسٹ ہے اُن لوگوں کی جو بیمار پڑے ہیں۔ نام اور پتے سب مکمل ہیں۔ دیکھو۔" اُس نے ایک جگہ پر اُنگلی رکھ کر کہا۔ "یہ دو آدمی موضع نُور پُور کے ہیں، جو تمہارا ہی علاقہ ہے۔ میں نے ایک فری لانس کو اس کام کے پیچھے لگایا تھا مگر زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ جُرأت والے آدمی کا کام ہے۔ تجربہ کار آدمی کا کام ہے۔ اِس میں بہت سے اینگل ہیں، کافی چیزیں اِنوالو ہیں۔ اگر تمہارے جیسا کوئی آدمی میرے ساتھ ہو تو گارنٹی سے کہتا ہوں، بامب شیل ہوگا بامب شیل۔"

"یہ بات تو درست ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"شمس، بھئی ملک صاحب کو ایک اور چائے بنا کر دو۔"

"نہیں، ایک پیالی کافی ہے۔ میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔" اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب اجازت دیجئے۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

"بدیع الزمان اعجاز کو سیڑھیوں تک چھوڑنے کے لئے آیا۔ "پھر کیا خیال ہے؟" وہ اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"کس بارے میں؟"

"ہو جائے معرکہ؟" بدیع الزمان آنکھ مار کر بولا۔ "مل کے کرتے ہیں۔"

"ابھی تو میں سنبھلا بھی نہیں بدیع صاحب،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "کچھ زمینداری کے معاملے نبٹانے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"سنجیدگی سے غور کرو ملک، بامب شیل ہے۔ نام نِکل جائے گا۔" بدیع الزمان نے ہوا میں اُنگلی اور انگوٹھا پھیلا کر اخبار کی سرخی کی لکیر کھینچی۔ "ملک۔ محمد۔ اعجاز۔ بولڈ ٹائپ میں چھاپوں گا۔"

اعجاز سَر ہلا کر ہنسا اور بدیع الزمان سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہوا۔

باب 15

پیاری چھیمی- کل میجر صدیق کا دِماغ خراب ہو گیا- سچ مچ کا خراب نہیں ہُوا، وقتی طور پر غصّے کی وجہ سے آپے سے باہر ہو گیا تھا- میجر صدیق وہ آدمی ہے جس نے ٹماٹر کا پودا لگایا تھا- دراصل اِس نے تین چار بیج بوئے تھے، مگر وہ انہیں پانی اِتنا زیادہ دیتا تھا کہ بیج پھُوٹنے کے بعد خشک ہوتے چلے گئے تھے- صرف ایک پودا جڑ پکڑ گیا- میجر صدیق کی حالت دیکھنے والی تھی، پھُولا نہ سماتا تھا پانی پہ پانی دیئے جاتا تھا- یہ سپلائی کور کا رینکر ایک جنرل کی طرح میدان میں پھرتا تھا-

"میجر صاحب" لوگ اسے کہتے، "پانی دے دے کر آپ نے باقی کے بیج مار دیئے ہیں- اب اِس کو بھی لے ڈُوبیں گے-"

"تُم مجھے سکھا رہے ہو" میجر صدیق جواب دیتا- "میں بچپن سے ٹماٹر اگا رہا ہوں- میرے گھر میں ٹماٹر کے بارہ پودے ہیں-"

"کچھ مٹی، پانی اور ہوا کا بھی اثر ہوتا ہے جناب-"

"جاؤ جاؤ" میجر صدیق کہتا- "تُم سب میرے دُشمن ہو- تم نہیں چاہتے کہ میں ٹماٹر کھاؤں-" پتا چلا کہ ٹماٹر میجر صدیق کی مرغوب سبزی ہے اور ایک سال سے اُوپر ہو چکا ہے کہ اِس نے ٹماٹر نہیں چکھا- اُس کی خُوش قسمتی تھی کہ پانی میں ڈُوبنے کے باوجُود پودا بڑھتا گیا- اب میجر صدیق دن کا بیشتر حِصّہ اِس کے گرد منڈلاتے ہُوئے گزارتا تھا- پودا آہستہ آہستہ پورے قد کو پہنچ گیا، وقت بھی پورا ہو گیا، مگر پھل کا نشان نہ نِکلا- لوگوں نے دبے دبے لفظوں میں کہنا شروع کر دیا کہ یہ بیج بانجھ ہے- میجر صدیق کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی- وہ دِن بھر ایک ایک شاخ، ایک ایک کونپل کا ملاحظہ کرتا رہتا اور نماز کے بعد گڑ گڑا کر دُعا مانگتا- کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے اپنے کانوں سے اسے خدا تعالیٰ سے ٹماٹر کی بھیک مانگتے ہوئے سُنا ہے- آخر میجر صدیق کی دُعائیں بار آور ثابت ہُوئیں- ایک روز پودے پر ٹماٹر کی ایک ننھی سی سبز گولی نمودار ہُوئی- اب کیا تھا، میجر صدیق کی کرسی پودے کے پاس بچھ گئی- سارے کے سارے افسر ایک ایک دو دو کر کے اِس پھل کو

دیکھنے اَور میجر صدیق کو مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ میجر صدیق کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر کرسی لیتا اَور جا کر پودے کے پہلو میں بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ تسبیح پر وظیفہ کرتا رہتا وہاں سے وہ صرف نماز کے وقت اَور کھانے کے لئے اٹھتا اَور پھر واپس پہنچ جاتا۔ دن گزرتے گئے اَور کوئی مزید ٹماٹر نہ نِکلا، مگر وہ ایک جو پیدا ہُوا تھا، بڑا ہوتا گیا، حتیٰ کہ اُس کا حجم ایک عام ٹماٹر سے بھی بڑا ہو گیا اَور رنگ سبز سے بتدریج سُرخ ہوتا ہُوا آخر بیر بہوٹی کا سا ہو گیا۔ جیسے جیسے ٹماٹر کا رنگ بدلتا گیا، میجر صدیق کے چہرے پہ بھی سُرخی کی لہر دوڑتی گئی۔

"میجر صاحب،" اِس کے ساتھی کہتے، "اب یہ پک گیا ہے، اسے اُتار لو، لٹکا لٹکا گل سڑ جائے گا۔"

"میں ٹماٹر کی خصلت جانتا ہوں،" میجر صدیق جواب دیتا، "اور ٹماٹر میری خصلت جانتا ہے دِس اِز مائی بے بی۔ جب یہ پوری طرح پک جائے گا اَور اِس کی کھٹائی مٹھاس میں بدل جائے گی تو اِس کی خُوشبو سے مُجھے خُود بخود پتا چل جائے گا۔"

اس سارے عرصے میں میجر صدیق نے ایک پیدائشی سپاہی کی مانند اِس ٹماٹر کی حفاظت کی، جیسے کہ اِس کی تمامتر ناموس کا اِنحصار اُس ٹماٹر پہ ہو۔ گو کھانے کی حد تک ہمارا اُس ٹماٹر میں کوئی حصّہ نہ تھا، میجر صدیق کی والہانہ سروس ہم سب کے لئے باعث عزت واِفتخار بن گئی۔

پھر کل کا دن آ پہنچا۔ صبح ہُوئی تو ٹماٹر پودے سے غائب تھا۔ ہماری آنکھ ہی میجر صدیق کی چیخ وپکار سے کھلی۔ ہم بستر سے اُٹھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ میجر صدیق کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اِس کا رنگ کاغذ کی مانند سفید تھا، جیسے سارا خُون دل کی جانب یورش کر گیا ہو، اَور اُس کی شورش سے صدیق کے مُنہ سے بات نہ نِکل رہی تھی، جیسے حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ وہ تتلائے جا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے نِکلتی ہُوئی جھاگ کے ننھے ننھے ذرے اُس کی ڈاڑھی میں اٹکے جا رہے تھے۔ اِس کے ہاتھ ہوا میں ناچ رہے تھے اَور بازوؤں کی حرکت میں کسی سمت کا تعین نہ تھا۔

"میں جان سے---- جان سے مار---- دوں گا۔ قتل کردوں گا---- میں---- میں ڈھونڈ لوں گا۔ پتا چلاؤں گا، دیکھتے---- دیکھتے رہو، یاد رکھو، میں----

میں وارن کر رہا ہوں۔ جس نے کھایا اُس کو نہیں چھوڑوں گا۔" میجر صدیق نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اکڑا کر ہاتھ ایک دُوسرے سے جوڑ دیئے، گویا کسی کا گلا دبا رہا ہو۔ اُس کے نمازی وظیفہ گو ساتھی اُس کے گرد کھڑے تھے، مگر میجر صدیق کی کیفیت دیکھ کر کسی کی جرأت نہ ہو رہی تھی کہ تسلی کا ایک لفظ کہے۔ سب لوگ جیسے جیسے اِس کے شور سے جاگ رہے تھے، باہر نکلتے آ رہے تھے۔ سب کبھی میجر صدیق کو اور کبھی ٹماٹر کے پودے کو دیکھ رہے تھے۔ سچی بات ہے کہ وہ ٹماٹر کا پودا، جس کا قد کاٹھ ایک چھوٹے سے درخت کے برابر تھا اور جس پہ سینکڑوں سبز پتے تھے کہ ٹہنیاں نظر نہ آتی تھیں، اِس ایک ٹماٹر کے بغیر ننگا لگ رہا تھا۔ غیظ و غضب کے مارے میجر صدیق کی پھٹی ہُوئی آواز پودے کی عریانی کو مزید عیاں کر رہی تھی۔

"ٹماٹر کا چھلکا ہضم نہیں ہوتا،" وہ چلا رہا تھا، "فضلے کے ساتھ نِکل آتا ہے۔ میں ایک ایک کا فضلہ چیک کروں گا۔ ڈھونڈ کر --- ڈھونڈ کر دَم لوں گا --- چھوڑوں گا نہیں ---"

سکھ گارڈ، جو کچھ دیر تک ہمدردی سے کھڑے دیکھتے رہے تھے، آخر تنگ آ گئے۔ اُنہوں نے میجر صدیق کے علاوہ سب کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ لوگ ایک ایک کر کے ہٹنا شروع ہوئے۔ ہم اندر لوٹ رہے تھے کہ میجر کو کہتے ہُوئے سنا،

"جو اسے کھائے گا اسے یہ زہر بن کر لگے گا --- سنکھیا بن کر --- سنکھیا ---"

سنا ہے کہ کل رات کو عشاء کی نماز کے بعد میجر صدیق اتنی دیر تک سجدے کی حالت میں پڑا رہا کہ اِس کے ساتھیوں نے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اُس کو اٹھایا کہ بیرک میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے اسے سجدے میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ آج صبح میجر صدیق اکیلا اکیلا میدان میں چل پھر رہا تھا۔ ہم سب کو میجر صدیق کی کرسی کے بغیر میدان خالی خالی سا لگا۔ دُوسری کیاریوں میں چند سبزیاں اور کچھ پھُول لگے تھے، مگر اِس ایک ٹماٹر کے جانے سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا میدان ہی اُجڑ گیا ہے۔ کسی نے اُس سرسبز کونے کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کی ---

سرفراز نے قلم کا سرا سیدھا کیا اور اِس چھپے ہُوئے کارڈ کی خالی جگہ پر اپنے پچیس

لفظ لکھنے شروع کئے۔ "ڈیرسٹ چھمو۔ مجھے اِس سارے مہینے تمہارا خط نہیں ملا۔ میں ٹھیک ہوں۔ صحت اچھی ہے۔ نگہداشت دُرست ہو رہی ہے۔ لالے کو سلام۔ سری۔"

پہلے پہل سرفراز دو چار لفظ زیادہ لکھ دیا کرتا تھا۔ مگر جب سے اسے پتا چلا تھا کہ ایک لفظ بھی زیادہ ہو تو کیمپ کی ڈاک والے اِس پہ کالی سیاہی پھیر دیتے ہیں، وہ گن کر الفاظ لکھنے لگا تھا۔

مائی ڈیر نسیمہ۔ کل رات ہم نے دعوت کھائی۔ پورا تھری کورس ڈنر، اور اُس کے بعد کافی۔ تفصیل اِس کی یُوں ہے کہ میجر شاہ زمان پرسُوں پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بستر پہ پڑ گیا۔ موشن اَور الٹیاں نہ رکیں تو ہم نے شور مچایا۔ آخران لوگوں نے اسے ہسپتال بھیج دیا۔ ہسپتال کیمپ کے اندر ہی ہے۔ ہسپتال کا دستور ہے کہ ہر مریض جو داخل کر لیا جاتا ہے اُسے روزانہ ایک انڈہ کھانے کو ملتا ہے۔ اَب شاہ زمان ایک باتوں باتوں میں ہمیں بتا چکا تھا کہ اُسے انڈے سے سخت نفرت ہے اور آٹھ سال کی عمر کے بعد اِس نے آج تک انڈے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب وہ ہسپتال لے جایا جا رہا تھا تو کیپٹن عزیز نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہُوئے شاہ زمان کے کان میں ہدایت کر دی کہ ایک تو وہ انڈہ لینے سے انکار نہ کرے، اور دُوسرے یہ کہ اُبلا ہُوا انڈہ طلب کرے۔ پرسوں تو اسے ڈرپ وغیرہ لگی رہی۔ کل صبح اِس کا پیٹ ٹھہر گیا تو ہسپتال کی خوراک جاری کر دی گئی۔ ہم نے لفٹننٹ فضل کو، جو ایسے کاموں میں ہشیار ہے، وِزٹ کے لئے تیار کیا۔ یُوں تو بیمار پرسی کے لئے ایک آدھ آدمی کو وزٹ کی اجازت ہے، مگر آج کل کسی وجہ سے عموماً انکار کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فضل نے ایک بہانہ یُوں گھڑا کہ شاہ زمان اِس کے پیروں کی اولاد سے ہے اَور اس کے پیر اسے رات کو خواب میں دکھائی دیئے ہیں جنھوں نے حکم دیا ہے کہ فوراً فضل کو جا کر اس کی خبر لینی چاہیئے۔ فضل نے میجر چٹوپادھیائے سے کہا کہ اگر اُس نے اپنے پیروں کی حکم عدولی کی تو اُس پر آفت نازل ہو جائے گی۔

"تمہارے اُوپر تو آفت آ گئی" میجر چٹوپادھیائے نے انگریزی میں کہا "اس سے

بڑی آفت کہاں سے آئے گی؟ ہم تمھاری حفاظت کر رہے ہیں، کوئی ایکسٹرا آفت نہیں آنے دیں گے۔"

"نہیں سر، میرے اُوپر تو آپ کا پہرہ ہے مگر میرے پیچھے گھر والوں پر آفت آجائے گی وہ بے قصور مارے جائیں گے۔"

غرضیکہ لفٹننٹ فضل نے ایسی دلیلیں پیش کیں کہ کچھ لے دے کے بعد اُسے پانچ منٹ کی وِزٹ کی اِجازت مِل گئی۔ شاہ زمان تک پہنچتے پہنچتے تین جگہ پر فضل کی تلاشی ہوئی۔ پہلی اپنے احاطے سے نکلتے وقت، دُوسری اگلے احاطے میں داخل ہونے کے وقت اور آخری ہسپتال کے دروازے پر۔ اُسے علم تھا کہ واپسی پر بھی اِسی طرح تین تلاشیاں ہوں گی، چنانچہ جب شاہ زمان نے آنکھ بچا کر انڈہ فضل کے حوالے کر دیا تو اُس نے انڈے کو پہلے جراب میں اُڑسا، پھر بغل میں پکڑا، مگر کسی جگہ محفوظ نہ پاکر آخر اُس نے پتلون کی بٹی کھولی اور فوتے سیدھے کرنے کے بہانے ہاتھ اندر داخل کر کے انڈہ رانوں کے بیچ دبا لیا۔ پھُونک پھُونک کر قدم رکھتا ہُوا وہ واپس لوٹا تو دو تلاشیوں سے بچ کر نِکل آیا۔ تیسری جگہ پر سکھ گارڈ نے خُوب اچھی طرح سے ہاتھ پھیر کر اُسے ٹٹولا تو انڈہ پکڑا گیا۔ پھر فضل اور گارڈ کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ فضل کی زبانی کچھ یُوں تھا۔

"واہگرو، سردار جی، تسی کیہڑے ضلعے دے ہوں؟"

"امبر سر دے ضلعے دا ہاں۔ پر توں ایہہ گل چھڈ، ایہہ دس کہ آنڈا تے گگڑی دا ہا توں کویں دِتا ہا؟"

"آنڈا تے سردار جی ککڑی دا ای اے۔"

"پر چڈیاں تے تیریاں وچوں نکلیا ہا۔"

"سردار جی گل ایہہ وے کہ حلات دی وجہ نال تسی ساڈے اُتے پہرے دار مکرر ہو گئے او، پر تسی امبر سر دے تے میں لہور دا، جے تے اسی بھرا بھرا ای آں ناں۔ سال توں اُتے ہو گیا اے آنڈے دی شکل نہیں ویکھی، ایہہ آنڈا چھڈ دیو تے ساری عمر تہاڈے بچیاں نوں دُعاواں دیاں گا۔"

قصہ مختصر سکھ کا دِل پسیج گیا اور اُس نے انڈہ فضل کو دے دیا۔ دِن بھر ہم نے انڈے کو ایسے سنبھال کے رکھا جیسے کوہ نور ہیرا ہو۔ انڈے کی سکیم ہم چاروں کے درمیان

تھی۔ ویسے بھی ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ چار سے زیادہ آدمیوں میں بٹ کر انڈے کی صورت شکل بگڑ جائے گی۔ چنانچہ ہم اپنی روٹی اور دال کھا کر فارغ ہوئے اور اُس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ ونگ کمانڈر اِمتیاز عشاء کی نماز پڑھنے نہ چلا گیا۔ اب ہمارے پاس تقریباً بیس منٹ تھے۔ اُس کے جاتے ہی ہم نے سب سے پہلے ڈھیلی تار پر لٹکتا ہُوا بلب کھینچ کر نیچا کیا اور اُسے تولئے سے ڈھانپ دیا تاکہ روشنی کمرے سے باہر نہ نکلنے پائے۔ اُس کے بعد ہم نے میز پر ایک سفید کاغذ پھیلایا، اُس پر ایک طرف نمک کی چھوٹی سی ڈھیری لگائی۔ ایک ایک گلاس پانی کا سب نے سامنے رکھا۔ پھر انڈہ چھیل کر چھری سے، جو ہم نے باورچی سے اُدھار لی تھی، نہایت احتیاط اور صفائی کے ساتھ انڈے کے چار برابر ٹکڑے کئے۔ اب ہم کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ مگر پہلے ہم نے اُن لوگوں کی خاطر جنہیں یہ کھانا میسر نہیں تھا، اور وہ لوگ جو زخمی اور بیمار تھے، اور وہ جو ہمارے ساتھی تھے اور میدان کارزار میں کام آئے تھے، اور آخر میں میجر شاہ زمان کی خاطر، سَر جھکا کر احتراماً ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ اِس کے بعد ہم نے اپنا اپنا پانی کا گلاس اُٹھایا اور ایک ساتھ کہا، "پاکستان، زندہ باد" اور ایک ایک گھونٹ پی کر گلاس نیچے رکھ دیئے۔ اب پہلا کورس شروع ہُوا۔ ایک ایک چٹکی نمک اٹھا کر مُنہ میں ڈالا اور اُسے گلے سے اُتارنے تک چوستے رہے۔ پھر دُوسری چٹکی۔ اِس کے بعد مین کورس کی باری آئی۔ چھری سے اپنے اپنے حصے کے انڈے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا اور ایک ایک ٹکڑا اُٹھا کر مُنہ میں رکھا۔ مُنہ پہلے ہی نمکین تھا، اُبلے ہُوئے انڈے کی خُوشبو دہن سے حلق کی نسوں تک میں سرائیت کر گئی اور ایک انوکھا لطف آیا۔ اِس ایک چوتھائی انڈے کو ختم کرنے میں ہم نے دس مِنٹ صرف کئے۔ اس کے بعد آخری کورس کے طور پر اپنا اپنا پانی کا گلاس اُٹھا کر گرم گرم کافی سمجھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پیا۔ وِنگ کمانڈ اِمتیاز کے آنے سے پہلے ہم نے میز صاف کی، بلب سے تولیہ اُتارا اور اُسے کھینچ کر چھت تک اُونچا کر دیا۔ پھر ہم اپنی اپنی چارپائیوں پہ لیٹ گئے۔ اُس وقت ہم ایسا سیر محسُوس کر رہے تھے جیسا کبھی کسی بینکوئٹ کے بعد بھی نہیں کیا۔

آج کل مجھے کیپٹن سلطان کے بارے میں فکر لگی ہے۔ مگر اگلے خط میں لکھوں گا۔ اگر سب کچھ آج ہی لکھ دیا تو پھر اگلے خط میں لکھنے کے لئے کیا رہ جائے گا؟

سرفراز نے قلم سیدھا کر کے اصل خط لکھنا شروع کیا۔ "ڈیر نسیمہ۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اُمید ہے کہ وہاں سب لوگ ٹھیک ہوں گے۔ ہم جلد ملیں گے۔ سرفراز۔"

ڈیرسٹ۔ تمہیں یاد ہو گا کہ پچھلے خط میں، میں نے کیپٹن سلطان کے بارے میں لکھا تھا۔ میری اپنی رجمنٹ سکستھ پنجاب کا ہے۔ اُس کا ذہن کچھ گڑبڑ ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے، بس ذرا غیر متوازن ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے، جن واقعات کی بنا پر ہم اِس حالت کو پہنچے ہیں اُن سے ہم سب غیر مطمئن ہیں، بلکہ ہمارے دِل میں گہرا رنج ہے، اور کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی صورت میں شاید اِس کا بیان بھی ہو جائے گا۔ مگر بیلنس اور ڈسپلن ضروری چیزیں ہیں، خاص طور پر ہمارے موجُودہ حالات میں تو اِن کے بغیر آدمی کے اندر انارکی پھیل سکتی ہے۔ ہمیں اِن سب باتوں کا احساس ہے۔ مگر سلطان کو ایک جنون ہو گیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ جب کسی شے کے خلاف رنج اِتنا بڑھ جائے کہ دماغ پر ہی چھا جائے تو پھر یہ ایک ایسے چکر کی صورت اِختیار کر لیتا ہے جو نہ گھٹتا ہے اور نہ ایک مقام پر رُک کر کھڑا رہتا ہے، بلکہ اپنی ہی پیدا کردہ قوت کے سہارے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک طرح سے یہ آدمی کا جذباتی سہارا بن جاتا ہے۔ یہ واقعہ میں نے اِس عرصے میں سلطان کے ساتھ ہوتے دیکھا ہے۔ پہلے چند ماہ تک وہ بالکل نارمل تھا۔ جب ہماری فرار کی سکیم ناکام ہُوئی تو جمیل اسے سہار نہ سکا۔ (اِس ناکامی کی تفصیل اگلے خط میں لکھوں گا۔) وہ اَپنے علاوہ سب کو الزام دینے لگا۔ پہلے وہ ہم میں سے ایک کو، دُوسرے کو، تیسرے کو ناکامی کا قصوروار ٹھہراتا تھا۔ کبھی کہتا کہ سٹریٹجی غلط تھی، کبھی یہ کہ ضرورت سے زیادہ آدمیوں کو شریک کر لیا گیا۔ آخر ایک بار کیپٹن عامر نے معنی خیز انداز میں اُس سے کہا، "بالکل ٹھیک کہتے ہو، ہمیں یہ بات آپس میں رکھنی چاہیے تھی، ایک دو باہر کے آدمیوں کو شامل کر کے ہم نے غلطی کی،" تو وہ سمجھ گیا۔ پھر وہ اُس بات کو چھوڑ کر ساری جنگ کی سٹریٹجی تک پہنچ گیا۔ ہر وقت اُس کی زبان پہ تنقید کا حرف ہُوتا تھا۔ پہلے

پہلی تو وہ ٹیکنیکل قسم کی تنقید کرتا تھا، کہ آرمر سپورٹ نہیں تھی، ایئر کوَر نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ، جو ہم سب آپس میں جنگ کا تجزیہ کرتے ہوئے کیا کرتے تھے۔ یہاں کی زندگی بسر کرتے ہوئے اب ہمارے اندر سے فتح و شکست کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ اب جنگ ہمارے لئے فتح اَور شکست کا میڈیم نہیں رہی، بلکہ ایک تھیور یٹیکل ایکسرسائز بن کر رہ گئی ہے۔ اول تو اب ہم اِس کا ذِکر ہی کم کرتے ہیں، کرتے بھی ہیں تو کبھی کبھی، وقت گزاری کی راہیں تلاش کرتے ہوئے، یا ریڈ کراس کے لئے چھوٹی چھوٹی شکایتیں درج کرتے ہوئے جو ہمیں علم ہوتا ہے کہ کیمپ کے ڈاکخانے سے آگے نہیں جائیں گی، یا اگلے وقت کے کھانے کا انتظار کرتے ہوئے، لاتعلق سے انداز میں، جیسے ہمارا اِس کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہ ہو بلکہ محض ایک کتابی مشق کی صورت ہو، اِس پہ اپنا اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ صرف ایک کیپٹن سلطان ایسا شخص ہے جو اِس موضوع کو ذہن سے محو نہیں ہونے دیتا۔ آہستہ آہستہ تنقید کی منزل سے گزر کر وہ نکتہ چینی پر آ گیا ہے۔ پچھلے ہفتے اِس کی اَور عامر کی گرماگرمی ہو گئی تھی۔

"ہم نے کوئی جنگ جیتی بھی ہے؟" سلطان نے کہا۔

"سکسٹی فائیو میں،" عامر بولا۔

"ربش،" سلطان نے کہا۔ "اگر چائنا اپنی بکریاں واپس لینے کی دھمکی نہ دیتا تو اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ہمارا ڈیفنس کولیپس ہو جاتا۔ ہمارے پاس ٹروپ ریپلیسمنٹ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ نمبرز گیم تھی جناب۔"

"تو تمہارے خیال میں نشانِ حیدر وَیسے ہی دے دیئے گئے تھے؟"

"درست دیئے گئے تھے۔ اُس جنگ میں ہمارے افسروں اَور جوانوں نے شجاعت کی داستانیں رقم کی تھیں۔ میں اُن کو سلوٹ کرتا ہوں۔ اِس دفعہ تو وہ بھی نہیں ہوا۔ نہ کوئی دِلاوری کے قصے نہ لیڈرشپ کے افسانے۔ لیٹ ڈاؤن آفٹر لیٹ ڈاؤن۔ اِس کی تاریخ کو کبھی نہ لکھا جائے گا، اگر لکھی گئی تو بدل دی جائے گی، حذف کر دی جائے گی، اپنے مطلب کی لکھی جائے گی اَور پوری قوم کو خُود فریبی کے جال میں پھنسا دیا جائے گا۔ بلڈی لیٹ ڈاؤن۔"

"کیا مطلب ہے تُمہارا؟" عامر غصّے سے بولا۔

"لک عامر، تمہیں اچھی طرح پتا ہے ہمیں کیا دیا گیا۔ آرٹلری کی کم از کم بیس رجمنٹیں ہونی چاہئے تھیں۔ اور تھیں کتنی؟ صرف چھ۔ بڑی سے بڑی فیلڈ ہاوٹزر گنیں تھیں۔ کوئی میڈیم اور ہیوی آرٹلری نہیں تھی۔ آرٹلری اور آرمر کا کوئی ڈویژنل کاپلیمنٹ نہیں تھا۔ ایک آرمرڈ رجمنٹ تھی، وہ بھی اُنیس سو بیالیس کے زمانے کے چالیس عدد چیفی ٹینک تھے۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟"

"کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے پہلے ہی مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھو لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔"

"کبھی لوجسٹکس کے بارے میں بھی سوچا ہے؟" عامر نے صبر سے کہا۔

"نو مہینے لوجسٹکس کے لئے کم تھے؟ پھر اس کے بعد ملٹری لیڈرشپ کی کیا حالت تھی؟ ہم نے فکسڈ پوزیشن ڈیفنس کر کے اینیمی کو اِدھر اُدھر سے گزر کر ڈھاکہ پہنچنے کا موقع دے دیا۔"

"سلطان، تم اُس لیول کی بات کر رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں۔ تمہاری ساری تھیوریاں مفروضوں پر مبنی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے مفروضے ہوں، مگر ان کا جواب مانگنا کیا میرا حق نہیں؟ مصیبت تو یہی ہے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، اور نہ ہی کبھی ہوگا، یہ مجھ سے لکھوا لو۔"

"یُو آر ٹاکنگ نان سینس۔"

"نان سینس کا کیا مطلب۔ یہ فیکٹس اینڈ فگرز ہیں۔"

"تم وقت سے پہلے بول رہے ہو۔ وقت آنے پر بولنا، سب پتا چل جائے گا۔ بہادری صرف فیلڈ آف بیٹل میں ہی نہیں ہوتی، بہادری یہ بھی ہوتی ہے کہ یو کیپ یور ماؤتھ شٹ۔"

لیفٹیننٹ فضل نے بحث کا یہ رنگ دیکھا تو بیچ میں کود پڑا۔ "آج بکرے آئے ہیں،" اُس نے اعلان کیا۔ "کسی نے دیکھے ہیں؟"

سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ "نہیں۔"

"میں نے دیکھے ہیں،" فضل نے فخریہ کہا۔

"کیسے ہیں؟"

"اُدھر راجستھان کے صحراؤں میں ایک علاقہ ہے جہاں صرف بکرے پائے جاتے ہیں، آدمی نہیں پائے جاتے۔"

"فضل، بی سیریئس۔"

"یہ بالکل سچ ہے۔ وہاں خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ گیا ہے۔"

"تمھیں کیسے پتا ہے؟"

"میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔" فضل نے کہا۔

"بکرے مر گئے؟"

"نہیں، بھاگ کر اِدھر آ رہے ہیں۔"

"پھر؟" کئی آوازوں نے ایک ساتھ پُوچھا۔

"ہم نہیں پکڑ پکڑ کر یہ لوگ ہمارے کیمپوں میں سپلائی کر رہے ہیں۔"

"وہ بکرے تو بڑے کمزور ہونگے۔" لیفٹیننٹ عالم نے، جو رہتک سے تعلق رکھتا تھا، کہا۔

"پہلے ہمیں کونسے پلے ہُوئے بکرے ملتے تھے،" کوئی سوگوار انداز میں بولا۔

"مگر یہ بکرے،" فضل لفٹنٹ عالم کو دیکھ کر بولا، "تو زیادہ ہی کمزور ہیں۔ جب گارڈز نے باڑ کے اُوپر سے اندر پھینکے تو جہاں گرے تھے وہیں کے وہیں پڑے رہے۔ دارے باورچی نے کہا کہ یہ ایسی رف ہینڈلنگ برداشت نہیں کر سکتے، دو منٹ میں مر جائیں گے۔"

"پھر کیا ہُوا؟" کسی نے ایسے دریافت کیا جیسے کوئی کہانی بیان کی جا رہی ہو۔

"اُس نے اُسی وقت ذبح کر دیے۔"

"خُون نِکلا؟"

"کچھ نِکلا۔"

"خُون بہنا چاہیے،" میجر صدیق، جواب ہر بات میں نیگیٹو ہو گیا ہے، بولا۔ "خُون کی دھار بہتی ہُوئی دکھائی دینی چاہیے۔ یہ دینی مسئلہ ہے۔"

"نِکلا ہی ہو گا" ایک آواز جواب میں اُٹھی۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہم یہاں بکروں کے سہارے زندہ نہیں ہیں،" میجر صدیق جوش سے بولا۔ "یہاں پر دین ہمارا سہارا ہے۔"

"ہاں ہاں، نکلا تھا، نکلا کیوں نہیں تھا،" فضل نے جلدی سے جواب دیا۔ "خون کی دھار بہتی ہوئی میں نے خود دیکھی تھی۔ بالکل مناسب طور پر جانور حلال کیے گئے ہیں۔"

"کوئی گوشت ووشت بھی تھا؟" شاہ زمان نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اوں ہوں،" فضل نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھیپھڑے تو ہوں گے،" کسی نے کہا۔

"ہوں گے۔ دکھائی نہیں دیئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہڈیوں اور پھیپھڑوں کی یکھ سے فلیور تو نکل ہی آتا ہے۔"

"یکھ کا پتا نہیں۔ ہڈیاں تو تھیں۔"

"ہڈیوں میں یکھ ضرور ہوتی ہے۔"

"اوئے فضل،" کیپٹن عامر گویا جاگ اٹھا "تو نے کہا تھا کہ وہاں بکرے ہی بکرے ہیں، آدمی کوئی نہیں۔ اس سے تیرا کیا مطلب تھا؟"

"لکھا تو یہی تھا،" فضل نے جواب دیا۔

"کہاں لکھا تھا؟"

"اخبار میں۔"

"کونسی اخبار میں؟"

"کوئی اخبار تھا۔"

اب ہر ایک اس گفتگو میں حصّہ لینے لگا۔ "میں نے تو نہیں پڑھا۔"

"نظر سے مِس ہو گیا ہو گا۔ کوئی ایک ایک خبر تھوڑی پڑھی جاتی ہے۔"

"اخبار میں ہر قسم کی خبریں ہوتی ہیں۔ ایسی ایسی خبر ہوتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں، بعض اخباروں میں ایسی خبروں کا کالم ہوتا ہے۔ اُس کا عنوان ہوتا ہے "عجوبہ روزگار" یا "عجیب و غریب" یا صرف "حیرت انگیز۔" میں وہ کالم ضرور پڑھتا ہوں۔ نئی نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔"

"دُنیا رنگ رنگیلی مولا، دُنیا رنگ رنگیلی۔۔۔۔" کسی نے آہستہ آہستہ تالی بجاتے دے گانا شروع کر دیا۔ "ایسی خبریں اکثر جھوٹی ہوتی ہیں۔"

"زیادہ ترچی ہوتی ہیں۔ جہاں پروپیگنڈا ہو وہاں فرق ہوتا ہے۔ "عجوبہ روزگا" کے کالم میں نامہ نگار کو جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"انگریزی اخباروں میں سب سے زیادہ جھوٹ ہوتا ہے۔"

اسی طرح یہ بات چیت کوئی آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔ پھر اپنی موت آپ مرگئی۔ تمہیں یہ گفتگو لایعنی اور مضحکہ خیز معلوم ہوگی، مگر ہمارے لئے یہ انتہائی دلچسپی کا باعث تھی۔ کیونکہ ہمیں اُس روز گوشت ملنے والا تھا۔ ہم اِس موضوع کو زیادہ سے زیادہ دیر تک زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ خُوش وقتی کا اِس سے بہتر سبب اَور کوئی نہ تھا۔ صرف کیپٹن سلطان نے اِس میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اُس نے جب بات کا رُخ بدلتا دیکھا تو خاموش ہوگیا، سارا وقت وہ ٹھوڑی مٹھی پہ ٹکائے دروازے سے باہر دیکھتا رہا۔

جب میں رات کے اندھیرے میں سو نہیں سکتا تو کبھی کبھی مُجھے جاگتے دیکھ کر وہ شے جسے ضمیر کہتے ہیں، اُٹھ بیٹھتی ہے۔ اُس وقت مُجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے درمیان کم از کم اِس ایک شخص نے اپنے ذہن کو، یا روح کو، یا نام خواہ کوئی بھی دے لیں، مگر اُس چیز کو جو ہمارے اَندر جذبے کو زندہ رکھتی ہے، اُسے اِس شخص نے زندہ رکھا ہُوا ہے، خبر نہیں کتنی مصیبت میں ہوگا۔ مُجھے اُس پہ رشک آنے لگتا ہے۔ مگر ہمارے پاس رشک کرنے کے لئے اتنے سارے لوگ ہیں، گارڈ ہیں، اِنڈین آفیسر ہیں، ریڈ کراس والے ہیں، سارے آزاد ملکوں کے آزاد باشندے ہیں، اَور اِس کے ساتھ ملا ہُوا رنج ہے، جو اب گو کافی حد تک کند ہوگیا ہے مگر جس کی ملاوٹ ابھی باقی ہے۔ ہمارے پاس اِن چیزوں کی اِتنی بھیڑ ہے کہ کسی ایک پر رشک کرنے کا وقت نہیں ہے۔

کل تو کیپٹن سلطان نے انتہاء کر دی۔

"میں نے ایک واقعہ دیکھا تھا" وہ کہنے لگا۔

"کب؟"

"سرنڈر سے پہلے کی بات ہے۔"

ہم دم سادھے بیٹھے رہے تو سلطان نے خُود ہی بات شروع کی۔ "ہمارے چیف

نے ایک جوان کو تھپڑ مارا تھا۔ آپ نے سُنا ہو گا۔"

ہم چپ بیٹھے رہے، گو ہم نے یہ واقع سن رکھا تھا۔ مگر تفصیل ہمیں معلوم نہیں تھی۔

"اُس نے جوان سے ایک سوال پُوچھا تھا" سلطان نے بات جاری رکھی، "جوان نے اِس کا نفی میں جواب دیا تو ٹائیگر صاحب نے ایک زوردار تھپڑ اُس کے مُنہ پر رسید کرتے ہوئے کہا، "جاوئے خُسرے۔" وہ سوال یہ تھا، جوان، تم نے کتنی۔۔۔"

اِس سے آگے کی بات اِتنی ڈِسگریسفل ہے کہ میرا اُلٹا قلم بھی اِس کی تاب نہیں لاسکتا۔ "سلطان،" آخر میجر گل نواز، جو سب میں سینئر میجر ہے، بولا، "تمہارے اُوپر کم از کم تین چار چارج لگتے ہیں۔ اِنسبارڈی نیشن، سلانڈر، برنگنگ اے سینئر آفیسر اِنٹوڈِس ریپوٹ، میوٹی نس بی ہیویئر۔ اگر تم نے ایسی باتیں کرنی ہی ہیں تو کسی اور سے جا کر کرو، یا اپنے آپ سے کرو۔ ہمارے ساتھ مت کرو۔"

سلطان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نے سوچا کہ سب آفیسرز کو اِس واقعہ کا علم ہونا چاہیے،" جاتے جاتے وہ بولا، اور میس کی بیرک سے نِکل گیا۔

مجھے ایک تند اور تیز سا احساس ہے کہ کیپٹن سلطان گہرے اور خطرناک پانیوں کی جانب رواں ہے۔۔۔

"یہاں پہنچ کر سرفراز کی انگلیاں تھک گئیں۔ اُس نے قلم سیدھا کیا اور کارڈ پر اپنے پچیس لفظ لکھنے شُروع کر دیئے:" پیاری نسیمہ۔۔۔۔

میری پیاری۔ میرا پچھلا خط تمہیں کافی دیر کے بعد ملا ہو گا۔ اور مُجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم نے باقاعدگی سے مُجھے خط لکھے ہونگے، مگر مُجھے ایک بھی نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری فرار کی سکیم ناکام ہو گئی تھی اور سزا کے طور پر، باقی باتوں کے علاوہ، تین مہینے کے لئے ہماری ڈاک بند کر دی گئی تھی۔ اب سزا کا پیریڈ ختم ہو چکا ہے۔ اِس لئے اُمید ہے

کہ حسب معمول کم از کم ایک تہائی ڈاک بل جایا کرے گی۔ کیپ یور فنگرز کراسڈ۔

ہر قیدی کے دِل میں فرار کی خواہش سب سے اُوپر ہوتی ہے۔ اور جنگی قیدی کے دِل میں تو خاص طور پہ ہوتی ہے، کیونکہ اُسے فرار کی کوشش کا حق دیا گیا ہے۔ ہم سب کے دِل بھی پہلے دِن سے نِکل بھاگنے کے متلاشی تھے۔ مگر اِس کا کوئی عملی سرا ہاتھ میں نہ آتا تھا۔ ہماری ایسکیپ پلان کی صورت اُس روز بنی جب شاہ زمان نے رات کے کھانے کے بعد ہم پانچ آدمیوں کو اپنے گرد اکٹھا کیا اور دھیمی آواز میں بات کی۔

"تنور دیکھا ہے؟"

"ہاں۔" ہم نے کہا۔

"پکا ہے،" شاہ زمان بولا۔ "اگر حساب سے الگ کیا جائے تو باہر آ سکتا ہے۔"

"آ تو سکتا ہے۔ مگر۔۔۔"

"مگر وگر کچھ نہیں،" شاہ زمان نے کہا، "مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ کام میرے اُوپر چھوڑ دو۔ ایک بار سالم حالت میں باہر نِکل آیا تو پھر واپس اندر داخل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر ٹوٹ گیا تو؟"

"پھر اگر، مگر،" شاہ زمان صبر سے بولا۔ "بھئی ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا۔ آگ کی وجہ سے مٹی کے تنور ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ بلکہ یہ تنور تو میں نے ایگزامن کیا ہے، سینڈ سٹون کا بنا ہوا ہے، اِس کے ٹوٹنے کے چانس کم ہیں۔ بہرحال، ٹوٹ گیا تو فرض کر لیا جائے گا کہ خود بخود ٹوٹ گیا ہے اور ری پلیس کر دیا جائے گا۔ اگر ثابت نِکل آیا تو ہمارا کام ہو جائے گا۔ اِس کے نیچے سرنگ لگائی جا سکتی ہے۔"

بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ اِس کے بعد پلان بنانے میں کوئی دقت نہ لگا۔ اپنی بیرک کے چھ آدمیوں میں سے کسی کو باہر نہ رکھا جا سکتا تھا۔ اُس کے بعد دو باورچی اور اُن کے تین ساتھیوں کو ملانا بھی ضروری تھا۔ شاہ زمان انجینئرز کا آدمی تھا، مگر اُسے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو سرنگ کی دیواروں اور چھت کو ایستادہ رکھنے میں ٹیکنیکل معاون کا کام کرے، چنانچہ کیپٹن سلطان کو شامل کر لیا گیا جو ایف ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں ایک سال لگا کر فوج میں آیا تھا۔ میجر گل نواز ایک روز ہماری بیرک میں

آوارد ہوا، اور بولا، "میرا دل کہتا ہے کہ اندر ہی اندر کچھ پک رہا ہے۔" وہ اُس وقت تک نہ اُٹھا جب تک کہ اُس نے ہماری سازش کا علم حاصل نہ کرلیا۔ آخر میں لفٹننٹ ذوالفقار محض اِتفاق سے ہمارے ساتھ شریک ہُوا۔ ایک روز رات کے وقت ہم ابتدائی کارروائی میں مصروف تھے کہ ذوالفقار باورچی خانے میں دبے پاؤں داخل ہوا اور ہمارے تین آدمیوں کو اندھیرے میں کام کرتے ہُوئے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اُس وقت میں بھی وہاں موجُود تھا۔ ہم نے اُسے پکڑ کر وہیں کھڑا کرلیا۔ پہلے وہ کچھ دیر تک گنگ کھڑا دیکھتا رہا۔

"آئی ایم سوری،" پھر وہ بولا۔

"اِس وقت یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" میجر شاہ زمان نے درشتی سے پُوچھا۔ ذوالفقار بتاتے ہُوئے جھجک رہا تھا، مگر دوبارہ پُوچھے جانے پر شرمندہ سا ہو کر بولا، "میں دیکھنے آیا تھا۔"

"کیا دیکھنے آئے تھے؟"

"کہ کوئی،" وہ رُک رُک کر بولا، "شاید روٹی کا ٹکڑا بچا ہُوا مِل جائے۔"

اب اُس کا الگ رکھنا ناممکن تھا۔ اِس طرح ہماری پلان میں کل چودہ آدمی شامل ہوگئے۔ سکیم یہ تھی: ہمارے کھانے کا کمرہ باورچی خانے کے ساتھ تھا۔ جہاں میزیں اور سٹول پڑے تھے۔ ہر روز رات کو تین آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی جاتی کہ کھانے کے بعد اپنی بیرک میں واپس آنے کی بجائے حیلے بہانے سے وہیں پر رُکے ہُوئے بیٹھے رہیں۔ پھر وقت مقررہ پر لائٹ آف کے بعد مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ اندھیرے میں بیٹھے اِنتظار کریں۔ جب گارڈز کو تسلی ہو جائے کہ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں، تو پھر وہ اپنا کام شروع کریں۔ پہلے چار دِن تنور کو الگ کرنے میں لگ گئے۔ بظاہر وہ کہیں سے تڑخا ہُوا نظر نہ آتا تھا، مگر بقول شاہ زمان کے، پتھر کا "اِنفراسٹرکچر" مسلسل آگ کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا اور ذرا سا جھٹکا لگنے سے ٹوٹنے کا احتمال تھا۔ دُوسرے وہ حدت کی اِنتہاء سے اپنے اردگرد کی گیلی مٹی سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ چُکا تھا۔ چنانچہ اُس کے چاروں طرف کی مٹی چاقوؤں چھریوں کی مدد سے ایسی باریکی اور مہارت سے کاٹنی پڑی جیسے سنار نازک زیوروں پر کام کرتا ہے۔ آخر چار روز کی محنت کے بعد بسم اللہ پڑھ کر اُسے صحیح سالم گڑھے سے اُٹھا لیا گیا۔ نیچے مٹی کی پتلی سی سخت تہہ کے بعد زمین نرم تھی۔ سرنگ کھودنے کے لئے

صرف دو آدمی تھے، مگر بھاری تنور کو ہر روز اُٹھانے، اور "شفٹ" ختم ہونے کے بعد اُسے دوبارہ احتیاط سے اپنی بنیادوں پر رکھنے کے لئے کم از کم تین آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ شاہ زمان اور سلطان میں سے ایک نہ ایک کو ہر روز نگہداشت کی خاطر موجُود رہنا پڑتا تھا تا کہ سرنگ منہدم نہ ہونے پائے۔ چونکہ اِن دونوں کی ڈیوٹی باقیوں کی نسبت زیادہ مُسلسل تھی اِس لئے وہ اصل کھودنے کا کام نہ کرتے تھے صرف معائنہ کرنے یا تنور کو اُٹھانے اور رکھنے میں مدد دیتے تھے۔ ڈیوٹی والے دو آدمی ہر روز رات کو باری باری سرنگ میں داخل ہو کر چمچوں، کرچھوں اور چھری کانٹوں کی مدد سے سرنگ کاٹتے تھے۔ خُوش قسمتی سے اِس زمین کی مٹی چکنی تھی اِس لئے چھت اور دیواروں کو گرنے سے بچانے کے لئے انجینیرز کو زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑی۔ کبھی کبھی جب زمین میں گڑا ہُوا کوئی پتھر سامنے آ جاتا تو شاہ زمان یا سلطان رینگتے ہُوئے جاتے اور پتھر کو پار کرنے کا سبب کرتے۔ پتھر اگر ہٹ سکتا تو ہٹا دیا جاتا، ورنہ رخ موڑ کر سرنگ پتھر کی بغل سے گزُارنی پڑ جاتی تھی۔ شُروع ہی میں ہم نے خُوب اچھی طرح سے دیکھ بھال کر سرنگ کا رُخ اُس طرف کو رکھا تھا جدھر سے کھلا اور محفوظ علاقہ نزدیک ترین پڑتا تھا۔ سرنگ کے اندر روشنی کا اِنتظام تین چار گز فلیکس اِدھر اُدھر سے حاصل کر کے اور اُس کے آگے پچیس وَاٹ کا بلب لگا کر کیا گیا تھا۔ جب سرنگ چلتی گئی اور مزید تار دستیاب نہ ہو سکی تو ایک بے بی ٹارچ حاصل کر لی گئی۔ تمہیں حیرت ہو گی کہ یہاں پر کیا کچُھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر افسر کو ایک سو دس روپے ماہانہ ریڈ کراس کی جانب سے الاؤنس ملتا ہے جس سے ہم صابن تیل، کنگھی، شیشہ، شیو کے لئے بلیڈ، کپڑے دھونے کا صابن اور دُوسری چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء خریدتے ہیں۔ ہم سب نے اپنا بچا کھچا الاؤنس ملا کر پانچ سو روپے گارڈ کو دیئے جس نے ہمیں دس پندرہ روپے والی بچوں کی ٹارچ لا کر دے دی۔ ٹارچ کے لئے ہم نے یہ بہانہ پیش کیا کہ بیرکوں میں حشرات الارض پھرتے ہیں، اور رات کو بتی بند کر دی جاتی ہے اِس لئے تاریکی میں زہریلے کیڑوں کو دیکھنے کے لئے ہمیں ٹارچ کی ضرورت ہے۔ ٹارچ بے حد کار آمد ثابت ہُوئی۔ نہ کسی پاور پوائنٹ کی تلاش، نہ مزید تار کی ضرورت، اور نہ ہی تار اور بلب کو چھپا کر رکھنے کی کوفت۔ ننھی سی ٹارچ جیب میں رکھی اور سرنگ کے اندر کام شرُوع کر دیا۔ بیٹری بچانے کے لئے ٹارچ کو کم سے کم استعمال کیا جاتا تھا۔ مٹی کے نکاس کا ایک

طریقہ تو عام فہم تھا جو شاید تم نے کبھی سیکنڈ ورلڈ وار کی انگریزی فلموں میں دیکھا ہو۔ یعنی پتلونوں کی جیبوں میں بھر کر فجر کی نماز کے وقت، گارڈز کی نظر بچاتے ہُوئے باہر میدان کے اندر زمین پر بکھیر دی جاتی، یا کھیتی کی گیلی کیاریوں میں بھر دی جاتی۔ پھر شاہ نواز نے ایک اور طریقہ بھی ایجاد کیا۔ کیوں نہ کچھ مٹی باورچی خانے کی پانی کی نوئی کے نیچے رکھ کر نالی میں بہا دی جائے۔ یہ طریقہ بھی کامیاب رہا۔ سرنگ کھودنا ہمارے لئے مشکل نہ رہا۔ اِس کی تکنیک پہ ہم نے مکمل دسترس حاصل کر لی تھی، مگر جوں جوں یہ آگے چلتی گئی اَور ہمارا جذبہ تیز تر ہوتا گیا، مٹی کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا، اَور اسے ٹھکانے لگانے میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ گارڈز کی نظر آخر ایک حد تک ہی بچائی جا سکتی تھی۔ ایک روز وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مٹی بکھیرنے کے عمل سے ہی گارڈز کے شبے نے جنم لیا۔ مگر ہم بال بال بچ گئے۔ رنگے ہاتھوں کوئی پکڑا نہ گیا، کیونکہ جب تک اِطلاع پا کر افسر موقع پر پہنچے، ہم سب اپنی جیبیں خالی کر چکے تھے، اَور تازہ مٹی پر چل چل کر زمین کے ساتھ ملا دیا گیا تھا، گو خشک زمین پر تازہ مٹی کے چٹاخ موجُود تھے، جن کا اِنڈین افسروں نے بغور معائنہ کیا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے ہمارے احاطے کی ایک ایک بیرک میں جا کر اُس کے کونے کونے کی تلاشی لی، باورچی خانے اَور کھانے کے کمرے کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیا، ایک ایک انچ زمین کو ٹھوک بجا کر دیکھا، مگر تنور تک اُن کا شبہ نہ پہنچا، جسے ہم نے اِس کمال کے ساتھ جما کر رکھا ہُوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی ہلایا نہیں گیا۔ چھ سات گھنٹے کی تفتیش کے بعد انڈین افسر خالی ہاتھ واپس چلے گئے۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اُسی وقت آپس میں مشورہ کر کے ہم نے "آپریشن سب وے" کو چند روز کے لئے معطل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مگر وقت ہاتھ سے نِکل چکا تھا۔ شام سے کچھ پہلے انڈین افسروں کی ایک ٹیم آئی اَور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، سیدھی تنور پہ جا پہنچی۔ اُن کے آدمیوں نے مِل کر تنور اُٹھایا۔ نیچے سرنگ کا مُنہ کھلا تھا۔ اُسی وقت ہمارے سارے کے سارے کیمپ کے لوگوں کو فال اِن کرا لیا گیا۔ ہم سب کو حکم دیا گیا کہ اَپنے اَپنے ہاتھ باہر نکالیں۔ مُجھے اپنا سکول ماسٹر یاد آ گیا جو بید مارنے سے پہلے کڑک کر کہتا تھا، ہاتھ نکالو۔ سب نے ہاتھ سیدھے کئے تو حکم ملا، اُلٹے کرو۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے ایک زمانے میں جاپانیوں کے جنگی قیدیوں کے کیمپ کے بارے میں ایک کتاب پڑھی تھی جو ایک ہندوستانی

سپاہی نے لکھی تھی۔ اُس میں اِس طریق کار کا ذِکر تھا۔ اُس وقت میں اَپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ مجھے پہلے اِس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ خیر، ہم سب کے ناخن چیک کئے گئے۔ ہم اَپنے ناخن کاٹ کے بھی رکھتے تھے، اُنہیں صاف بھی باقاعدگی سے کیا کرتے تھے، مگر جو باریک مٹی کی تہہ ناخن کے نیچے جلد کے اندر داخل ہو جاتی ہے وہ نکالے نہیں نکلتی۔ پھر بھی اگر ہمیں وقت پہ خیال آ جاتا تو شاید چھریوں چاقوؤں سے کرید کر اور ٹوتھ برش سے رگڑ رگڑ کر کچھ نہ کچھ کر لیتے۔ مگر ہم اِس خُوش فہمی میں مارے گئے کہ تلاشی لینے والوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا اَور وہ مطمئن ہو کر جا چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ اندر سے کسی نے مخبری کی تھی، گو ہمیں آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا۔ بہرحال، چودہ کے چودہ آدمیوں کے ناخنوں نے ہمارا راز فاش کر دیا۔ اُس کے بعد دو ہفتے تک اِنکوائری ہوتی رہی۔ کیمپ کے سینکڑوں آدمیوں میں ایک ایک کا انٹرویو ہُوا۔ جب انکوائری کمیٹی کو یقین ہو گیا کہ چودہ کے علاوہ اَور کوئی اِس سازش میں شریک نہیں تھا تو ہم پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ سزا کے طور پر ایک ماہ کے لئے ہماری چارپائیاں چھین لی گئیں، اَور اسی عرصے تک کے لئے ہمارا راشن آدھا کر دیا گیا۔ کیمپ میں ایک سے زیادہ باورچی خانے ہیں۔ ہمارے باورچی خانے کو، جہاں اسی آدمیوں کا کھانا پکتا تھا، چوبیس چوبیس کلو کے دو آٹے کے تھیلے ہر روز دیئے جاتے تھے، اَور دال کی ایک مقدار مہیا کی جاتی تھی۔ اِن میں سے صحیح حساب لگا کر چودہ آدمیوں کا آدھا راشن کم کر دیا گیا۔ اِس کے علاوہ ہماری تمام تر ڈاک تین مہینے کے لئے بند کر دی گئی۔

اب ایک واقعہ سنو۔ جو ممکن ہے تُمہارے لئے حیران کن ہو، مگر ہم لوگوں کے لئے جو میدانِ جنگ میں اِکٹھے رہ چکے ہیں، اچنبھے کا باعث نہیں ہے۔ جب رات کا کھانا ہمارے سامنے آیا تو معمول کی مقدار میں تھا۔ نہ روٹیوں کی تعداد کم تھی اَور نہ دال کے شوربے کی۔ اِستفسار پہ پتا چلا کہ ہمارے جوانوں نے اَپنی روٹی آدھی کر دی تھی تاکہ ہم پوری روٹی کھا سکیں۔ ہم نے جوانوں کو سمجھایا کہ بھئی ہم نے فرار کی کوشش کی تھی، جو ہمارا حق تھا، اَور ہمارے جیلروں نے ہمیں سزا دی ہے، جوان کا حق ہے۔ ہم سزا بھگتنے کے لئے تیار ہیں، اَور دُرست بھی یہی ہے کہ جو جرم کرے وہ سزا بھگتے۔ مگر جوان ہماری ایک سننے کو تیار نہ تھے سینہ ٹھوک کر کھڑے ہو گئے اَور بولے، "سر، جب تک ہم زندہ ہیں کسی

کی مجال نہیں کہ ہمارے افسروں کو کوئی گزند پہنچائے۔" اُن سے زیادہ بحث لاحاصل تھی۔ رات کو اُن کی چارپائیاں بھی ہمارے کمروں میں پہنچ گئیں۔ ہمیں ایک رات بھی زمین پر نہ سونا پڑا۔ دو چار روز کے بعد ہمیں پتا چلا کہ چھپن جوانوں نے آپس میں چودہ چودہ کے ٹولے بنا رکھے تھے۔ ایک ٹولہ پیٹ کاٹتا تھا اَور دُوسرا زمین پہ سوتا تھا۔ اگلے روز دونوں ٹولے اَپنے فرائض کا ادل بدل کرتے تھے۔ تیسرے دِن اگلے دو ٹولوں کی باری شرُوع ہوتی تھی۔ پھر پانچویں روز دوبارہ پہلے دو ٹولوں کی باری آتی تھی۔ اِن جوانوں نے ہم نو افسروں کے علاوہ باورچیوں اَور اُن کے تین ساتھیوں کے لئے بھی یہی قربانی دی۔ اِسی طرح ایک مہینہ گزُر گیا اَور ہم نے سزا کا ایک دن بھی نہ کاٹا، سوائے ڈاک کی بندش کے، جس میں کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ یہی اُصول ہیَں جو ہم پہ جوانوں کے ساتھ وفاداری کا فرض عائد کرتے ہیَں۔ فیلڈ میں ایک افسر کے جوان اُس کے بچوں کے برابر ہوتے ہیَں۔ اگر اُس کی غلطی سے ایک جوان کی جان کو نقصان پہنچ جائے تو اُسے یہ بات عمر بھر نہیں بھُولتی۔ اَیسے واقعات بھی ہُوئے ہیَں کہ ایکشن کے دوران ایک نوجوان افسر کی پلاٹون کا صفایا ہو گیا تو اُس نے اَپنی مرہم پٹی کرانے سے اِنکار کر دیا، اَور جب اُسے زبردستی اُٹھا کر ہسپتال میں لے جایا گیا تو اُس نے سرجن کا نشتر اُٹھا کر اپنا گلا کاٹ لیا۔ اِسی لئے ملٹری میں "افیسر اینڈ اے جنٹلمین" کی روایت قائم ہُوئی۔ اِنہی روایات کی حرمت کی خاطر سینئر افسر خاموشی سے اَپنا سروِس ریوالور نکال کر اَپنا بھیجا اُڑا دیتے ہیَں۔ رجمنٹ میں نیچے سے اُوپر تک سب کے درمیان یہ ایک بندھن ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ اب اِن روایات کے تحفظ کا تصور تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔

"ڈیَرسٹ چھیمو۔" سرفراز نے قلم سیدھا کر کے اَپنا کارڈ پہ لکھنا شرُوع کیا۔ "اُمید ہے کہ تم ٹھیک ہو گی۔ میری صحت بھی بالکل ٹھیک ہے۔ ہماری دیکھ بھال دُرست ہو رہی ہے۔ لالے کو سلام۔ تُمہارا۔ سری۔"

باب 16

اعجاز کے دماغ میں بدیع الزمان نے جو بیج بویا تھا وہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ آخر ایک روز وہ بدیع الزمان کے دفتر جا پہنچا۔

"اِس کے گراؤنڈ ورک کے لئے تین کام ہیں، ایک تو یہ سیمپل ہے،" بدیع الزمان نے ایک چھوٹی سے کھلے مُنہ والی شیشے کی بوتل، جس میں عموماً پھلوں کے جام وغیرہ بکتے ہیں، دراز سے نکال کر میز پر رکھی۔ اِس کے مُنہ پر کپڑا رکھ کر اُوپر ڈھکنا کسا گیا تھا۔ "خوش قسمتی سے میں وقت پہ ایک ایسے آدمی کے پاس پہنچ گیا جس کا سارا کنبہ اِسے کھا کر بیمار پڑ گیا تھا۔ اُس کے پاس گھی کا ڈبہ اور اندر تھوڑا سا گھی بچا ہوا رکھا تھا۔ میں دونوں چیزیں اٹھا کر لے آیا۔ گھی یہ ہے،" اُس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا، "اور ڈبہ وہ کونے میں پڑا ہے۔"

اعجاز نے شیشے کی بوتل اٹھا کر احتیاط سے اُس کا ڈھکنا کھولا، کپڑا اُٹھا کر گھی سونگھا اور چند لمحے تک اُسے ہلا جلا کر دیکھنے کے بعد کپڑا واپس رکھ کر اُوپر ڈھکنا کس دیا۔

"کیوں، کچھ پتا چلتا ہے؟"

"اُوں ہوں" اعجاز نے نفی میں سَر ہلایا۔ "بدیع صاحب، دراصل میں اِس کام کے لئے موزوں آدمی نہیں ہوں۔ ڈبے کا گھی نہ کبھی کھایا نہ سونگھا۔"

"ہاں بھئی، زمیندار آدمی ہو، دودھ دہی گھر کا ہے، ڈبے کی کیا ضرورت ہے، مگر۔۔۔۔"

"پہلے یہ بتایئے،" اعجاز نے بات کاٹ کے پُوچھا "کہ آپ کو باقی کی سب چیزیں چھوڑ کر گھی کا خیال کیسے آیا؟"

"اپنے آپ سے بھئی، اپنے آپ سے۔ خُوش قسمت ہوں کہ یہاں بیٹھا ہوں، بال بال بچ گیا۔ بات یہ ہے کہ رازمیر برانڈ گھی دو چار پیسے سستا ہے۔ ہم لوگ تو پیسے بچانے کی فکر میں زندگی گزار دیتے ہیں نا۔ چنانچہ میں نے سوچا چلو، ٹرائی کر کے دیکھتے ہیں۔ اب تُمہیں تو اِس کو سونگھ کر کچھ پتا نہیں چلا، مگر ہم تو بناوٹی گھی کھانے والے ہیں۔ ڈبہ کھولا تو

خوشبو بھی اچھی اَور ذائقہ بھی ٹھیک۔ آدھا ڈبہ بھی ختم نہ ہوا تھا کہ پیٹ میں گڑبڑ شروع ہوئی۔ ساتھ ہی میری بیوی بھی یہی شکایت کرنے لگی۔ پہلے تو جیسے ہم لوگوں کا دستور ہے، کوئی خیال نہ کیا۔ سوچا کہ موسمی خرابی ہوگی، خُود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ البتہ ذرا صفائی کا خیال کرنا شروع کر دیا۔ برتن مانجھ کر، سبزیاں وغیرہ دھو دھلا کر کھانا پکنے لگا۔ مگر جب ہاضمہ سُست سے سُست تر ہوتا گیا تو پھر ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ اُس نے ٹیسٹ وغیرہ کروائے اَور کہا کہ نسیں سخت ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے تو سگریٹ بند کرو۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب، جناب یہ تو میری لائف لائن ہے۔ کہنے لگا ٹھیک ہے، جلدی یہ تُمھاری ڈیڈ لائن بھی بن جائے گی۔ ڈیڈ لائن، سنا؟" بدیع الزمان آنکھیں چمکا کر ہنسا۔ "ڈیڈ لائن! بھئی ہم اخبار نویسوں کی زندگی تو ڈیڈ لائن کے اردگرد گھومتی ہے نا۔ اب سمجھے؟ کیسی کمال کی بات کی میرے ڈاکٹر نے۔" بدیع الزمان ہنستے، کھانستے اَور ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا۔ "خیر بہرحال، دُوسرے اُس نے کہا کہ گھی کھانا بالکل چھوڑ دو۔ کھانا ہے تو معمولی مقدار میں تیل کھاؤ، اِتنا تھوڑا کہ ہانڈی میں نظر نہ آئے۔ میں نے کہا کہ یہ میں کر سکتا ہوں۔ اُس دن سے گھی چھوڑ دیا۔ ایک دو ہفتے نہیں گزرے تھے کہ بدہضمی میں افاقہ ہونا شروع ہو گیا۔ اتفاق کی بات دیکھ کہ ڈاکٹر نے گھی اس لئے بند نہیں کیا تھا کہ جو گھی میں کھا رہا ہوں وہ خراب ہے، بلکہ سب قسم کا گھی منع کر دیا تھا۔ شک مُجھے اِس بات سے ہوا کہ پہلے بھی ڈبے کا گھی کھاتا تھا، صرف برانڈ دُوسرا تھا، اُس سے تو کبھی شکایت پیدا نہیں ہُوئی۔ ایک دو اَور جاننے والوں سے بھی اسی قسم کی شکایت سنی تو میں نے اُن کی خوراک کے بارے میں پُوچھا۔ پتا چلا کہ وہ بھی یہی گھی استعمال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں نے اُن سے کہا کہ یہ گھی کھانا بند کر دیں۔ پھر میں نے اپنے آپ سے تفتیش کرنی شرُوع کر دی۔ جیسے جیسے میں چلتا گیا، میرا شک مضبوط ہوتا گیا۔ یہ ساری کہانی اَور یہ سارا قصہ ہے۔ اِس گھی کو سونگھ کے دیکھ لو، چکھ کے دیکھ لو، ہانڈی پکا کے دیکھ لو، مجال ہے جو پتا چل جائے۔ اَور یہی ساری بات ہے۔" بدیع الزمان نے میز پہ ہاتھ مار کر کہا، جس سے اُس کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کی راکھ میز کی سطح پر بکھر گئی۔ بدیع الزمان نے پھُونک سے اُسے نیچے گرانے کی کوشش کی۔ پھُونک کے غلط رُخ کی وجہ سے راکھ گرنے کی بجائے ذرہ ذرہ ہو کر ساری میز اَور کاغذوں پہ پھیل گئی۔ اُس نے اِن ذروں کے اُوپر اُوپر ہاتھ ہوا میں ہلا کر انھیں اُڑانے

کی ناکام کوشش کی، پھر اُسے نظر انداز کر کے اُس سے پیچھا چھڑا لیا۔ "خیر بہر حال،" وہ بولا، "یہ بعد کی بات ہے۔ اب یہ قصہ سرے سے شروع کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو اِس سیمپل کا انالسس ہوگا۔ ایک نہیں بلکہ دو با اعتبار لبارٹریوں سے، تاکہ موازنے کے لئے دو انڈی پنڈنٹ رپورٹیں موجود ہوں۔ اِس کے بعد اُس ڈاکٹر سے بات کرنے کی ضرورت ہے جس نے اِن بیماروں کا علاج کیا ہے۔ میں نے اُس کا نام پتا حاصل کر لیا ہے۔ اِس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ایسے معاملات میں پڑنے سے گھبراتے ہیں جس میں کسی لیگل ایکشن کا ڈر ہو۔ پریس کے ساتھ تو وہ پبلیسٹی کے ڈر سے ہی بات نہیں کرتے۔ ہمارے پیشے میں سب سے دِقت طلب بات یہی ہے، کہ لوگوں سے حقیقت کیسے اُگلوائی جائے۔ اُنہیں بات کرنے پر کیسے اُکسایا جائے۔ لوگ بولتے ہُوئے ڈرتے ہیں۔ اِسی لئے سب سے بہترین جرنلسٹ وہ ہے جو لوگوں کا مُنہ کھلوائے، اُن کے دِل سے ڈر دُور کرے۔ یہ تمہارے جیسے تجربہ کار اَور بااثر آدمی کا میدان ہے۔ ملک اعجاز، اب تم اَپنے محلے سے نِکل کر نیشنل لیول پر کام کرو گے۔ "یہ بانگ دہل" کراچی تک جاتا ہے۔"

اعجاز خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ جب بدیع الزمان نے اعجاز کی جانب سے کوئی لفظ نہ سنا تو دوبارہ بات شُروع کی۔

"یہ بیمار کنبے کا نام پتہ ہے،" اُس نے ایک فائل سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر اعجاز کے ہاتھ میں دیا۔ "تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ جوان لوگ تو کم و بیش تندرست ہو گئے، مگر بڈھا اَور بڈھی ابھی تک چارپائی پر پڑے ہیں۔ نیچے اُس ڈاکٹر کا نام پتہ درج ہے جو اُن کا علاج معالجہ کر رہا ہے۔ یہ قصبہ تُمھارے علاقے سے دُور نہیں ہے۔ اِس سے واقف ہو؟"

"اعجاز نے کاغذ پہ لکھی ہُوئی تحریر پڑھی۔ "پِل کھنگر۔ ہاں، جانتا ہوں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ بعد ازاں تیسرا کام گھی مِل کے کسی ٹیکنیکل آدمی سے معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ اِس مِل کی بجائے کسی دُوسری مِل کے انجینئر یا کیمسٹ سے مل کر معلومات حاصل کی جائیں۔ جب ساری مکمل رپورٹیں ہاتھ میں آ جائیں تو پھر راز میر مِل میں جا کر اُن کے سامنے رکھ دی جائیں۔ دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

جو کچھ وہ کہیں اُسے بھی چھاپ دیا جائے۔"

"دوسری ملوں سے کس قسم کی معلومات حاصل کی جائیں گی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"ہاں،" بدیع الزمان ہاتھ اُٹھا کر بولا، جیسے اُسے اپنی گفتگو میں چھوڑا ہُوا کوئی حِصّہ یاد آ گیا ہو۔ اُس نے ڈبیا سے دوسرا سگریٹ نکال کر پہلے سگریٹ سے سلگایا۔ "میرے گراؤنڈ ورک سے یہ انفرمیشن نِکلی ہے کہ گھی بنانے کے عمل میں ایک آخری سٹیپ ہے جس سے مضررساں زہریلے مادوں کے ذرات صاف کیے جاتے ہیں۔ کئی ملوں والے اِسے گول کر جاتے ہیں، کیونکہ اِس عمل کو حذف کر دینے سے گھی کی ظاہری حالت، یعنی خُوشبو، ذائقہ، سختی نرمی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اِس طرح مِل مالکوں کی بچت ہو جاتی ہے، خرچہ کم ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ مشینری بچتی ہے، مزدُوریاں کم ہو جاتی ہیں، مطلب یہ کہ نفع کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ نقصان صارفین کا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اب یہ دستور بن گیا ہے، کہ پہلے پہل تو چیز ٹھیک بناؤ، جب مارکیٹ میں اسٹیبلش ہو جاؤ، تو بچتیں کرنے کے لئے کوالٹی خراب کرتے جاؤ، صارفین جائیں جہنم میں۔ یہ تو ہے موٹی موٹی بات۔ مگر پبلش کرنے کی غرض سے ہمارے پاس نہ صرف یہ کہ ٹھوس ثبوت ہونے چاہئیں، بلکہ ٹھوس تفصیلات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موٹی موٹی بات پر ایسی رپورٹیں شائع نہیں کی جا سکتیں۔"

کچھ دیر کے بعد اعجاز تہہ کیا ہُوا کاغذ جیب میں ڈال کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا،" وہ ہنس کر بولا۔ "مجھے پتا نہیں کہ کس حد تک میں اِس کام کو نبھا سکوں گا۔"

"میری جان،" بدیع الزمان بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اُترتے ہُوئے بولا، "ایک بار ہاتھ تو ڈال کے دیکھو، تمہیں خُود ہی پتا چل جائے گا۔ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، غور سے سنو۔ فرض کرو کہ تم کسی دُوسرے شہر میں سفر کرتے ہوئے پہنچتے ہو جہاں تمہارا کوئی واقف کار نہیں، کوئی جاننے والا نہیں، تھوڑی دیر کو رُکے ہو، پھر آگے نِکل جاؤ گے۔ وہاں تم ایک گمنام کی حیثیت سے ایک بک سٹال پر جاتے ہو اور ایک پرچہ اُٹھا کے دیکھتے ہو، اور ورق اُلٹ کر پڑھتے ہو،" اُس نے انگوٹھا اور پہلی اُنگلی ایک دُوسرے کے قریب لا کر ایک چوڑی سی لکیر کھینچی، "ملک محمد اعجاز۔ اب تم

اِس شہر میں گمنام نہیں ہو۔ واہ، یہ وہ نشہ ہے جو کسی دوسرے کام میں نہیں ہے۔ کیوں، ٹھیک ہے یا غلط؟" بدیع الزمان کو ایک ساتھ کھانسی اور شاں شاں کرتی ہوئی ہنسی کا مختصر سا دورہ پڑا۔ "ہاں، ایک ضروری بات تو بھول ہی گیا۔ کسی کو مت بتاؤ کہ تم پریس کے آدمی ہو۔ لوگ یہ سن کر گونگے بن جاتے ہیں۔ سوائے سیاست دانوں کے،" وہ پھر ہنستے ہنستے کھانسنے لگا۔ "کوئی اور تعلق واسطہ پیدا کرو۔ یہاں لالچ بھی چلتا ہے، منت بھی چلتی ہے، دھونس بھی چلتی ہے۔ میں ابھی تمہیں خرچہ ورچہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، مگر کارآمد انفریشن حاصل کرنے کے لئے کسی کو تھوڑا بہت لینا دینا پڑے تو اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

اعجاز نے خاموشی سے اُس کی باتیں سنیں۔ پھر وہ بدیع الزمان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہُوا۔

تین چار روز تک اعجاز کاغذ کو جیب میں رکھے سوچتا رہا۔ اُسے احساس تھا کہ ایک بار وہ اِس کام میں پڑ گیا تو اُلجھ جائے گا۔ مگر ساتھ ہی بشیر اور اُس کے ٹولے کے خلاف اُس کے دِل میں جو رنج تھا وہ اُسے مجبور کر رہا تھا کہ ایک بار تو اِن لوگوں کو دِکھائے کہ اُسے برطرف کر کے کسی کونے میں لگانا آسان کام نہیں۔ سکینہ نے دو ایک بار زمین کے بارے میں بات چلانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ہاں یا نہ میں جواب دینے کی بجائے ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ سکینہ سے کہے کہ وہ اب شہر کے ایک اَور کام میں مشغول ہونا چاہتا ہے۔ وہ تقریباً ہر روز منظور سے ملنے کے لئے جاتا اَور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ جاتا۔ منظور سے اُس نے اِس بات کا ذکر کیا تھا، جس کے جواب میں منظور نے دُشمنوں کو غلیظ گالیاں دینے اَور اِن کا سَر تن سے جدا کرنے کی پیشکش کرنے کے بعد اعجاز سے مکمل اتفاق کیا تھا۔

"ایک دفعہ تو اِن کی کارستانیاں دُنیا کو دکھاؤ، ملک جی۔ میرے ذمے جو کام لگاؤ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ضرورت ہُوئی تو بتاؤں گا" اعجاز نے کہا۔ "ابھی خاموش رہو۔ کسی سے ذکر مت کرو۔"

"بس سمجھو لو زبان بند ہو گئی، خدا میری آواز گلے سے کھینچ لے جو ایک لفظ بھی

میرے معدے سے نکلے۔"

اعجاز نے دِل میں تہیّہ کر لیا تھا کہ ایک بار، بس ایک ہی بار، اِس معاملے کو پار لگانے کے بعد اِن سب کاموں سے کنارہ کش ہو جائے گا اَور کل وقتی توجہ اپنی زمینوں کے کاروبار اَور لڑکوں کی پرورش پر دے گا۔

پُل کھنگر جانے سے پہلے اعجاز نے نور پور جانے کا ارادہ کر لیا۔ بدیع الزمان نے جو لسٹ پہلے روز اُسے دکھائی تھی اُس میں نور پور کے رہنے والے دو ناموں میں سے ایک کو اُس نے پہچان لیا تھا۔ یہ دِتا کمہار تھا۔ جوانی کے زمانے میں دِتا کمہار علاقے بھر میں مشہور تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایسا اثر تھا اَور مٹی کی اُسے ایسی پہچان تھی کہ کہا جاتا تھا اُس کے ہاتھ کی بنی ہُوئی ہانڈی میں کھانے کا مزا بدل جاتا تھا۔ یہ ہانڈیاں لوگ ایک دُوسرے کو تحفتاً بھیجتے تھے۔ دِتے کمہار کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اُس نے کسی رشتہ دار کا ایک یتیم بچہ لے کر پالا تھا جو گیارہ برس کی عمر میں بیٹھے بیٹھے مر گیا تھا۔ اب دِتا کمہار بوڑھا ہو چکا تھا۔

"ملک جی آؤ، جی آیاں نوں،" دِتا کمہار چارپائی پر لیٹا لیٹا کمزور سی آواز میں بولا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ "آج سرکار ہمارے گھر میں کیسے اُتری ہے۔"

حال احوال دریافت کرنے کے بعد اعجاز نے پُوچھا کہ دِتے کی یہ صورت کیونکر ہُوئی۔

"اللہ نے روگ لگا دیا ہے سرکار۔ معدہ بند ہو گیا ہے۔ جو مُنہ میں جاتا ہے دو دو دِن تک چھاتی پر بیٹھا رہتا ہے، یا اُسی وقت پُھر پُھر کر کے نِکل جاتا ہے۔ اندر کی خبر خراب ہے ملک جی، آٹا دانا پنڈے کو نہیں لگتا، ماس گھلتا جاتا ہے۔ دوا دارو بڑا کیا، کوئی افاقہ نہیں ہُوا۔"

"کس کا علاج کرتے رہے ہو دِتے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"حکیم حاذق کا جی، بڑا سیانا ہے۔ اُس کا باپ بھی سیانا تھا۔ حکیم حاذق نے اُسی سے علم سیکھا ہے۔ نبض دیکھ کر بماری بتا دیتا ہے۔"

"تجھے تو تندرست نہیں کیا دِتے،" اعجاز ہنس کر بولا۔

"مجھے تو اللہ نے روگ لگا دیا ہے،" دِتا کمہار ٹھنڈی سانس بھر کو بولا، "جسے اللہ مارے، اُسے کون رکھے۔"

"کوئی کھانے پینے میں تو بد پرہیزی نہیں کی تو نے؟"

"غریب آدمی سے کیا پُوچھتے ہو ملک جی۔ غریبی سب سے بڑی بد پرہیزی ہے۔ باقی دال روٹی کھا کر عمر گزاری ہے، کوئی روگ نہیں لگا۔ سب چیز گھر میں ثابت آتی ہے۔ دانے کمہاری چکی پر پیستی ہے، مرچ مسالہ ثابت لا کر دوری ڈنڈے میں رگڑتی ہے۔ نمک بھی ڈلی لے کر کُوٹتے ہیں، سستا پڑتا ہے۔"

"تیرے پاس پہلے کوئی آدمی آیا تھا؟"

"ایک خدا کا بندہ آیا تھا۔ پُوچھ گچھ کرتا رہا۔ اُس نے خیال دوڑایا کہ میں نے جو تھندا کھایا ہے اُس میں خرابی تھی۔"

"بی بی کمہاری نے بھی تو کھایا ہو گا۔"

"اُس کو بھی تکلیف ہو گئی تھی۔ پر وہ دس دن کے اندر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے اندر تو زہر بیٹھ گیا ہے۔"

"وہ تھندا کدھر سے لیا تھا؟"

"پہلے تو نائیوں سے لیتے تھے۔ پھر اُن کی بھینس مر گئی، دُوسری گبھن ہو کر سوکھ گئی۔ اُس کے بعد تھوڑا بہت ضرورت کے مطابق دکان سے ہی خرید لیتے ہیں۔"

"اُس بندے نے دکاندار سے بھی پُوچھ گچھ کی تھی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"ہاں جی۔ دُوسری دفعہ پھر آیا تھا۔ کہتا تھا دکاندار سے ڈبہ لے کر آیا ہے۔ تھندا غلط ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے دِتے؟"

"میری تو جان کو روگ لگ گیا ہے ملک جی، اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا، خیال کدھر سے آئے گا۔"

"حکیم حاذق کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے میرے اندر زہریلا مادہ پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ دال روٹی میں کیا زہر ہو گا۔ دال نہیں تو پودنے اور مرچوں کی چٹنی اور روٹی، دھنیئے مرچوں کی چٹنی اور روٹی، ٹماٹر مرچوں کی چٹنی اور روٹی، پیاز مرچوں کی چٹنی اور روٹی۔ مہینے دو مہینے میں پیسیوں سے کچھ گوشت مل جاتا ہے تو پکا لیتے ہیں۔ مگر پیٹ کو گوشت کی عادت نہیں پڑی، ہضم نہیں ہوتا،

مزے کے پیچھے کھالیتے ہیں۔"

"اچھاوِتے، اللہ اپنا کرم کرے گا۔ پھر آؤں گا۔"

"آپ کا کرم ہے ملک جی۔ آپ چل کر میرے گھر آئے ہیں۔ ہماری کیا حیثیت ہے۔"

نور پور سے واپسی پر اعجاز ملکوں کے بھٹے کے قریب سے گزرا تو اُسے ایک مانوس سی شکل دکھائی دی۔ ایک جوان مزدور عورت ساتھ والے کھیت سے نکل کر بھٹے کی جانب چلی جارہی تھی۔ اعجاز نے موٹر سائیکل روک لی اور اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے ذرا سی ذرا کو عورت کی شکل دیکھی تھی جب عورت نے بھٹے کی طرف رخ کرنے سے پہلے ایک لمحے کو سڑک کی جانب دیکھا تھا۔ وہ ایک پُرکشش عورت تھی۔ اُس کی خستہ حالی میلے کچیلے کپڑوں اور ننگے پاؤں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اعجاز ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اُس نے پہلے اُس عورت کو کہاں دیکھا تھا۔ کیا اسی بھٹے پہ، یا کسی اور پہ، یا مزدوروں کے کسی مجمعے میں، کسی جلسے جلوس میں؟ اُس عورت کی چال میں بھی اعجاز کو مانوسیت محسوس ہو رہی تھی۔ عورت جاکر دُوسری مزدور عورتوں کے ساتھ بیٹھ گئی اور سانچوں میں مٹی بھرنے لگی۔ اعجاز بے خیالی میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ ساری مزدور عورتیں اور دو چار مرد دُور سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جھینپ کر موٹر سائیکل پر سنبھلا اور وہاں سے چل پڑا۔ کچھ دُور تک اُس کے دماغ میں کھدبد لگی رہی، پھر یہ سوچ کر کہ اِس شکل و صورت کی کوئی اور عورت اُس نے کہیں دیکھی ہوگی، اِس خیال کو ذہن سے خارج کر دیا۔

دِتا کمہار حکیم حاذق کا علاج کر رہا تھا جس کی کوئی وزنی حیثیت نہ تھی۔ پل کھنگر کا ڈاکٹر ایم بی بی ایس تھا۔ صاحب فراش آدمی سے، جس کا نام رحیم چوہان تھا۔ جن معلومات کی ضرورت تھی حاصل کی جا چکی تھیں۔ اِس کے بعد سب کچھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ اب ڈاکٹر تک رسائی حاصل کرنے کی حاجت تھی اور واسطہ جہانگیر کا تھا۔ پل کھنگر شجاع آباد سے دس بارہ کوس کے فاصلے پر واقع تھا اور ملک جہانگیر کے حلقے میں آتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں پر ایک برساتی نالہ ہوا کرتا تھا۔ پھر خبر آئی کہ پیچھے پہاڑوں میں سڑک کی تعمیر کے لئے کٹائی شروع کر دی گئی۔ برساتی نالہ آہستہ آہستہ خشک ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس

کی زمین پر زمینداروں نے قبضہ کر کے کاشت شروع کر دی، مگر پُل اپنی جگہ پہ کھڑا رہا۔ پُل کے پاس ایک قدیم بوہڑ کا جلا ہُوا درخت، جس کے بارے میں روایت تھی کہ سو سال پہلے اِس پہ آسمانی بجلی گری تھی، اُسی طرح ٹنڈ منڈ کھڑا تھا اَور ہر رات کو بیسیوں گدھوں کا بسیرا ہوتا تھا۔ قصبہ بوہڑ اَور پُل سے پہلے کا تھا یا بعد میں بنا تھا، مگر ہمیشہ سے پُل کھنگر کے نام سے مشہور تھا۔

اعجاز جہانگیر کے پاس پہنچا۔

"آؤ جی آؤ، ملک صاحب،" جہانگیر اپنائیت بھرے تکلف سے بولا۔ "بڑی بڑی خبریں آ رہی ہیں۔ آپ نے تو کبھی قدم رنجہ نہیں فرمایا۔"

"کاروبار سے ہی فرصت نہیں ملی بھائی جہانگیر۔"

"کاروبار سے تو سُنا ہے تجھے فرصت ہو گئی ہے اعجاز، سچ سچ بتا۔ اپنوں سے کیا چھپانا۔"

"چھپنے چھپانے کی کوئی بات نہیں۔ کافی عرصہ ہو گیا تھا وہی کام کرتے ہوئے۔ سوچا کہ اب کچھ اَور کرنا چاہیے۔"

"سنا ہے اب تم حکومت کا اخبار چلانے جا رہے ہو۔"

اوں ہوں،" اعجاز نے نفی میں سَر ہلایا۔ "ایک آزاد اخبار۔"

"آزاد؟"

"جمہوریت میں آزاد پریس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"درست ہے،" جہانگیر بولا، "ضرورت بھی اَور اہمیت بھی ہوتی ہے۔ مگر بھائی جان، جمہوریت ہو تو پھر بات ہے نا۔"

"جمہوریت ہوتی نہیں بھائی جہانگیر، لائی جاتی ہے۔ آزاد پریس کو اَور دوسرے اداروں کو سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے، پھر کہیں بات بنتی ہے۔"

"درست۔ مگر کیا ہمارے سسٹم کا مزاج اسے برداشت کرے گا؟"

"برداشت نہیں کرے گا تو ختم ہو جائے۔ سیدھی سی بات ہے۔"

"یہ سیدھی نہیں، بڑی ٹیڑھی بات ہے۔ مگر یہ بھی دیکھ لیں گے۔ سناؤ، کوئی سرفراز کی خبر؟"

"مہینے ڈیڑھ میں خط آ جاتا ہے۔ بس خیر خیریت ہوتی ہے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں لمبے خط لکھنے کی اُنہیں اجازت نہیں ہے۔"

"اب تو میجر ہونے والا ہو گا۔"

"اُس کی منگیتر کے بھائی سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ سرفراز کے ساتھ کا ہی ہے۔ مگر اپنے باپ کی سفارشوں وغیرہ سے فوج چھوڑ کر پولیس میں چلا گیا ہے۔"

"مجھے علم ہے۔ اے۔ایس۔پی ہو گیا ہے۔ بہت اچھا ہُوا، کبھی ہمارے تمہارے کام بھی آئے گا۔"

"وہ کہہ رہا تھا سرفراز کو ایک ڈیڑھ سال میں میجر کا رینک مِل جائے گا۔ مگر مجھے اِس بات کی کوئی پروا نہیں جہانگیر۔ میں کہتا ہوں خیر خیریت سے واپس آ جائے تو سمجھو سب کچھ مِل گیا۔"

"یہ تو ہم سب کی دعا ہے اعجاز۔ سرفراز ہمارا ہیرو ہے ہیرو۔ اور سناؤ، سب خیر خیریت ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ میں پِل کھنگر جا رہا تھا، سوچا کہ آپ سے ملتا چلوں۔ بڑی دیر سے ملاقات نہیں ہُوئی۔ پھر پِل کھنگر بھی ایک غرض سے جا رہا ہوں۔"

"کیا ایسی غرض آ گئی؟" جہانگیر بات سمجھ کر بولا۔ "میں کچھ کر سکتا ہوں؟"

"وہاں ایک ڈاکٹر ہے۔ احسان الحق۔"

"ہاں، ہے۔"

"اُس کے ساتھ کام ہے۔"

"کیوں، تندرست تو ہو؟"

"میں تندرست ہوں،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "بات یہ ہے کہ کچھ لوگ خراب گھی بنا کر سپلائی کر رہے ہیں، جسے کھا کر لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ پِل کھنگر کے کئی لوگ بھی بیمار ہیں۔ ڈاکٹر سے اُن کی بیماری کی رپورٹ لینی ہے۔"

"تمہارا اِس قصے سے کیا واسطہ ہے؟"

اعجاز نے اصل بات چھپا کر رکھنے کا ارادہ کیا ہُوا تھا۔ "ایک فیکٹری ہے جس کے گھی کی رپورٹیں خراب ہیں۔ اُوپر سے وہ مزدُوروں پر زیادتی کر رہے ہیں۔ تنخواہ کم دیتے

ہیں، بونس نہیں دیتے۔ سٹاف سے بے ایمانیاں کرواتے ہیں۔"

"مگر تم تو یونین کا کام چھوڑ چکے ہو۔"

"رسمی طور پر الگ ہوا ہوں، مگر تعلق واسطہ تو رہتا ہے۔ آخر ایک عمر ان لوگوں کے ساتھ گزاری ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو یہ لوگ میرے دروازے پر آ جاتے ہیں۔ مجھ سے اِنکار نہیں کیا جاتا۔" جہانگیر نے آگے جھک کر اعجاز کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

"اعجاز" وہ جذباتی لہجے میں بولا "اِسی لئے میرے دِل میں تمہاری قدر ہے۔ تم اپنے دِل میں دُوسروں کا درد رکھتے ہوں۔ باتیں تو ہم بھی کرتے ہیں، مگر تم نے ثابت کر کے دکھایا ہے۔ اپنا نقصان کیا، مگر سیدھی راہ سے نہیں بھٹکے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ بڑا زمانہ دیکھا ہے۔ ہے کہ نہیں؟" اعجاز اُس کی غیر متوقع جذباتیت سے کچھ متعجب ہُوا۔

"درست۔ دُرست،" وہ سرہلا کر بولا۔

"کبھی تم نے ہماری مخالفت کی، کبھی ہم نے تمہاری مخالفت کی۔ سیاست کی کوئی بات نہیں، گجر کی جیت گیا تو یہ زمانے کی ہوا ہے، آج اِدھر کی چل رہی ہے، کل اُدھر کی چلے گی۔ مگر اَپنے اَپنے ہی ہوتے ہیں۔ جب اصل ضرورت پڑی تو تم میرے ساتھ آ کھڑے ہُوئے۔ ہے کہ نہیں؟ اب میری زندگی گزُر گئی ہے۔ تم سے کیا چھپانا اعجاز، میری صحت ٹھیک نہیں رہی۔ یہ مت سمجھو کہ میں نے جی چھوڑ دیا ہے۔ مگر اب تم جوان لوگوں کا زمانہ ہے۔ تمہارا اَور سرفراز اَور عالمگیر کا۔ اُدھر تمہارے بھائی پہ بوجھ پڑا ہُوا ہے، اِدھر میرے لڑکے پہ بوجھ آ پڑا تھا، خدا کا شکر ہے کہ گزُر گیا۔ تم نے میری بڑی مدد کی، سب اپنوں نے کی، میں تیرا احسان مند ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو بھائی جہانگیر۔ احسان تو آدمی غیروں پر کرتا ہے۔ اپنوں کی طرف سے فرائض ہوتے ہیں جو ادا کئے جاتے ہیں۔"

"سرفراز بھی گھر آئے گا،" جہانگیر نے اعجاز کی بات نظرانداز کرتے ہُوئے کہا، "سُرخرو ہو گا۔ ساری برادری کی نیک نامی ہوگی۔ جس دن وہ گھر آیا، ایسا جشن منائیں گے کہ دُنیا دیکھے گی۔ یہ تیرے ساتھ میرا وعدہ ہے۔"

"اِنشاء اللہ،" اعجاز نے کہا۔ "اِنشاء اللہ۔"

"یہ ڈاکٹر احسان،" جہانگیر نے کہا۔ "اپنا بچہ ہے۔ جو کہو گے کرے گا۔"

"پھر تو سمجھو کہ میرا کام ہو گیا۔"

"اُس کی تو فیس تک میں نے دی ہے،" جہانگیر گھٹنے پر ہاتھ مار کر فخر سے بولا۔

"اچھا؟"

"بھئی ملک کریم بخش کا لڑکا ہے نا۔ کریم بخش عزت دار آدمی تھا۔ مگر حیثیت کا کمزور تھا۔ میرے پاس آیا، کہنے لگا لڑکے نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا ہے، اسے ریلوے میں نوکر کرا دو۔ میں نے دیکھا کہ لڑکا پڑھائی میں ہشیار ہے۔ میں نے کہا اِسے پڑھاؤ، خرچہ میں برداشت کروں گا۔ کریم بخش کہنے لگا، ہم نے جیسا تیسا گزارہ کیا ہے، مگر کسی کا ایک پیسہ دینے کا روادار نہیں ہوں۔ میں نے کہا کریم بخش تیرے اور میرے سوا کسی کو خبر ہو جائے تو میں تیرا گناہگار، جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ آدمی سمجھدار تھا، مان گیا۔ سات سال تک لڑکے کی پڑھائی کی فیس بھرتا رہا ہوں۔ آخری دِنوں میں کریم بخش نے مجھ سے کہا جو کچھ آپ نے کیا اُس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ تھوڑی سی زمین ہے، اپنے نام رجسٹری کرا لو۔ میں نے کہا کریم بخش، تیری ملکیت کا ایک انچ میرے اُوپر حرام ہے۔ تیرا لڑکا ڈاکٹر بن گیا ہے تو اپنی ذات برادری کی نیک نامی ہے۔ تیرے اُوپر میں نے کونسا احسان کیا ہے، یہ احسان تو تیرے لڑکے نے ہمارے اُوپر کیا ہے کہ پیسہ ضائع نہیں کیا، کچھ بن گیا ہے۔ آج کریم بخش اِس دُنیا میں نہیں رہا، اور اعجاز تم پہلے آدمی ہو جس کے ساتھ میں نے اِس بات کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں تم بات کو دِل میں رکھو گے۔ میں نے اپنے لڑکے کو بھی یہ بات نہیں بتائی، تاکہ کریم بخش کے لڑکے کا سر نیچا نہ ہو۔ میرے گناہوں کی سارا زمانہ بات کرتا ہے، نیکیوں کی کوئی نہیں کرتا۔ یہ دُنیا کا دستور ہے۔ یہ میرا رقعہ لے جاؤ۔" جہانگیر نے ایک کاغذ پہ چار حرف لکھے۔ "اُسے دے دینا۔ جو کہو گے کرے گا۔ لڑکا صرف پڑھائی لکھائی والا ہی نہیں، وَیسے بھی تیز ہے۔ سیاسی ذہن والا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں دوڑ بھاگ کر کے تجھے شہر میں گورنمنٹ ہسپتال کے اندر نوکری لے دیتا ہوں۔ کہنے لگا نہیں چاچا جی، میں اپنے گاؤں کے غریب لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو یہاں بھی روزی دے دے گا۔ میرے دِل میں اُس کی قدر ہے۔"

کچھ دیر تک جہانگیر نظریں اپنے سامنے ٹھہرائے خلاء میں دیکھتا رہا۔ پھر اُداس سی ہنسی ہنس کر بولا، "تمھیں پتا ہے، میں پل ٹھنگر کے پولنگ سٹیشن سے جیت گیا تھا۔"

اُس وقت اعجاز نے گویا پہلی بار صحیح طور پہ اُسے دیکھا۔ کلف لگے کپڑوں کے اندر جہانگیر کا جسم گھل کر آدھا رہ گیا تھا۔ اعجاز کے دِل میں افسوس پیدا ہُوا۔ الوداع کے وقت وہ دیر تک جہانگیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اسے دباتا رہا۔ پھر اُس سے گلے مل کر رُخصت ہُوا۔

ڈاکٹر احسان الحق کا مطب صاف ستھرا تھا۔ بنچ پر تین چار مریض بیٹھے تھے۔ اعجاز اِن کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ جب اُس کی باری آئی تو وہ اُٹھ کر ایک طرف ہو گیا۔ کمپاؤنڈر سے اُس نے کہا کہ اُسے ڈاکٹر صاحب سے خاص کام ہے' وہ اُن سے بعد میں ملے گا۔ جب سارے مریض دوا لے کر چلے گئے تو اعجاز نے اُٹھ کر دفتر کا پردہ اُٹھایا۔

"اجازت ہے؟" اُس نے اندر جھانک کر پُوچھا۔

ڈاکٹر احسان الحق ایک پیڈ پر لکھ رہا تھا۔ اُس کا کمپاؤنڈر پاس کھڑا تھا۔ "آیئے آیئے،" ڈاکٹر نے اُوپر دیکھے بغیر کہا۔ اعجاز اندر داخل ہو کر ڈاکٹر کے سامنے کُرسی پر بیٹھ گیا۔ جب ڈاکٹر لکھنے سے فارغ ہوا تو سَر اُٹھا کر بولا، "جی؟"

"میرا نام اعجاز ہے۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ یہ ملک جہانگیر کا رقعہ ہے۔"

ڈاکٹر احسان الحق چند لمحوں تک فکرمند نظریں رقعے پر جمائے سوچتا رہا۔ "میں کچھ عرصے سے اُدھر جا نہیں سکا۔ ملک صاحب میرے مہربان ہیں۔ میری طرف سے معافی طلب کریں۔ میں جلد ہی حاضر ہوں گا۔ آپ فرمایئے۔"

اعجاز نے مدعا بیان کرتے ہُوئے اصل کہانی پیش کی اور فی الحال اِسے صیغۂ راز میں رکھنے کی درخواست کی۔ اُس نے محسُوس کیا کہ اُس کی بات کے دوران ڈاکٹر احسان الحق اُسے غیر معمولی توجہ سے دیکھتا رہا۔ جب اعجاز نے بات ختم کی تو ڈاکٹر بولا،

"آپ شجاع آباد کے ملک محمد اعجاز ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ لیبر یونین موومنٹ میں رہے ہیں؟"

"ہاں، میں نے عرض کی نا کہ۔۔۔۔"

"میں آپ کو جانتا ہوں،" ڈاکٹر احسان الحق اُس کی بات کاٹ کر بولا، "چند سال

ہوئے میں نے آپ کو ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے سُنا تھا۔ اُس وقت میں پڑھتا تھا۔ میں میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹ یونین کا جائنٹ سیکرٹری تھا۔"

"ماشاء اللہ،" اعجاز نے کہا۔

"وہ ہمارے اِنقلابی دن تھے،" ڈاکٹر احسان الحق مسکرا کر بولا۔

"اب بھی آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں،" اعجاز نے کہا۔

"اب تو اَور کسی کام کی فرصت نہیں ملتی۔ اِس پیشے میں یہی ایک نقص ہے۔ پرائیویٹ ڈاکٹری کرنے والا لوگوں کا چوبیس گھنٹے کا ملازم ہوتا ہے۔ پھر بھی حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ جو لوگ فیس دینے کی طاقت نہیں رکھتے اُن کے ساتھ رعایت کروں۔ جس معاملے کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ غریب مزارعہ ہے، میں تین ماہ سے اُس کا علاج کر رہا ہوں۔ دواء بھی اَپنے پاس سے دیتا ہوں۔"

"آپ کی خدا ترسی ہی آپ کا اِنقلابی کام ہے،" اعجاز نے کہا۔ "رحیم چوہان کے کیس میں آپ کی تشخیص کیا ہے۔"

"یہ غریب لوگ ہیں، گندی مندی شے نہیں کھاتے، معدے خراب ہوتے ہیں ضرورت سے زیادہ کھانے والوں کے، یا بہت سی چیزیں ایک ساتھ کھا لینے سے، یا بازار کا گند بلا کھانے سے۔ یہ لوگ روکھی سوکھی کھاتے ہیں، سبزیاں اُنہیں تازہ مِل جاتی ہیں، گوشت بس کبھی کبھار ہی کھاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے کہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن کی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ برصغیر کے کسان کی خوراک دُنیا کی بہترین خوراک ہے؟ دالیں، سبزیاں، گیہوں کا موٹا آٹا یا چاول، اَور چاٹی کی لسی۔ اِس خوراک سے نہ انہیں دِل کی بیماری ہوتی ہے، نہ کینسر کا مرض ہوتا ہے، اَور نہ دماغ خراب ہوتا ہے۔ یہ تینوں امراض مغربی ملکوں کی امیر دُنیا میں وبا کی صورت پھیلی ہوئی ہیں۔"

"رحیم چوہان کے معدے کی خرابی کا باعث آپ کے خیال میں کیا ہے،" اعجاز نے پُوچھا۔

"ہاں، پہلے اِس کا معدہ بند ہوا، ہاضمے کا عمل رُک گیا۔ آپ جانتے ہیں معدہ خراب ہو تو سمجھئے کہ سارا سسٹم اَپ سیٹ ہو گیا۔ پھر اِدھر اُدھر سے سو بیماریاں آ کر پکڑ لیتی ہیں۔ میں نے بڑا سَر مارا۔ عام دواؤں سے معدے کا عمل دُرست نہ ہُوا۔ پھر میں نے

الف سے یے تک سب کھانے پینے والی چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ایک ایک چیز بند کرا کے دیکھا۔ روٹی نہ کھاؤ چاول کھاؤ، ایک دال نہ کھاؤ دُوسری کھاؤ، ایک سبزی نہ کھاؤ دوسری کھاؤ۔ مرچ مصالحے نہ کھاؤ۔ یہ الرجی کی تشخیص کا سادہ طریقہ ہے۔ اس طریقے سے بھی افاقہ نہ ہُوا۔ الٹیاں، قبض، دست، بدہضمی اُسی طرح چلتی رہی۔ آخر میں نے گھی پر اُنگلی رکھی۔ یہی ایک چیز تھی جو اسی فیصد کھانوں میں کم و بیش اِستعمال ہوتی تھی اُور کہیں سے بن کر ڈبے میں آتی تھی۔ میں ڈبے سمیت گھی کا سیمپل لے آیا۔ میرا ارادہ تھا کسی لیبارٹری سے اِس کا انالس کراؤں۔ مُجھے فرصت نہیں ملی۔ اسی دوران میں ایک نوجوان آیا۔ وہ کسی سروے کرنے والی ٹیم کا ممبر تھا، جو سب جگہ سے سیمپل اکٹھے کرکے انالسس کروا رہے تھے۔ میں نے ڈبے سمیت سیمپل اُسے دے دیا۔ اُس کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔

"رحیم چوہان کو آپ نے گھی بند کرایا؟"

"ڈبے کا بند کرا دیا تھا۔"

"یہ اِزمیر برانڈ گھی تھا؟"

"جی ہاں۔ میں نے بند کرا دیا۔ کہا کہ تھوڑا کھاؤ مگر دیسی کھاؤ، توریئے کا تیل جلا کر کھاؤ۔ افسوس کہ اِس دوران ہی اُس کے سسٹم کا کافی نقصان ہو چُکا تھا۔ اب مُجھے السر کا شک ہے، کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ اِن چیزوں کے لئے ٹیسٹ کرانے کی ضرورت ہے۔ پرائیوٹ ٹیسٹ وہ افورڈ نہیں کر سکتا، گورنمنٹ کے ہسپتالوں میں دھکے کھانے کی اُس میں ہمت نہیں رہی، بوڑھا آدمی ہے۔ اَیسے کیسوں میں مُجھے اپنی ناکامی کا رنج ہوتا ہے۔ محسُوس کرتا ہوں کہ اِتنے سال کی پڑھائی اُور محنت ضائع کر دی ہے۔"

"انالسس میں گھی خراب نِکلا تو کیا آپ اپنی طرف سے اِس شخص کی بیماری کی رپورٹ دینے کے لئے تیار ہوں گے؟"

"سو فیصدی،" ڈاکٹر نے جواب دیا، "بلکہ اِس سے میرا شبہ کنفرم ہو جائے گا۔"

"بہت بہت شکریہ،" اعجاز نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ "آپ کا مزید وقت ضائع نہیں کرتا۔ انشاء اللہ جلد ہی رابطہ کروں گا۔"

پندرہ روز کے بعد اعجاز اپنے سامنے میز پہ چند کاغذات پھیلائے فخریہ انداز سے بیٹھا تھا۔ میز کے دُوسری جانب بدیع الزمان، کہنیاں میز پہ رکھے آگے جھک کر بیٹھا سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔

"ٹھہرو ٹھہرو ٹھہرو" بدیع الزمان بیتابی سے بولا۔ "مجھے سارا نقشہ ذہن میں بٹھانے دو۔ یہ" اُس نے ایک کاغذ پہ ہاتھ رکھا۔ "ایک لبارٹری کی رپورٹ ہے۔ اور یہ دُوسری لبارٹری کی ہے۔ ٹھیک؟ اور یہ ڈاکٹر احسان الحق کی ہے۔ اور یہ؟"

اعجاز جواب دینے کی بجائے خاموش بیٹھا معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

"بتاؤ بتاؤ نا بھئی، سسپنس میں مت رکھو، میری جان نکل جائے گی۔"

"جناب یہ راز میر کھی انڈسٹریز کے اپنے کیمسٹ کی رپورٹ ہے۔"

"اُن کے اپنے ملازم کی؟ سچ؟"

"جی ہاں۔"

"اُس کے دستخط ہیں؟"

"اُوں ہوں۔ اور نہ ہم اُس کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ اُس کے ساتھ میرا وعدہ ہے۔ مگر اُس نے حرف بہ حرف سب کچھ بتا دیا ہے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

"تم نے اُس سے یہ بات کیسے اُگلوائی؟"

"واقفیت نکل آئی۔ پہلے وہ میرے علاقے کی ایک صابن فیکٹری میں کام کرتا تھا جہاں ایک دفعہ سٹرائیک ہوئی تھی۔ اُس وقت سے وہ مجھے جانتا ہے۔"

"اور اُس نے تم پہ اعتبار کر لیا؟"

"کیوں نہیں۔ وہ جانتا ہے میں اپنے لفظ سے نہیں پھروں گا۔"

"زندہ باد" بدیع الزمان دونوں بازو اُوپر اُٹھا کر چلایا۔ "میں جانتا تھا صرف تم ہی یہ کام کر سکتے تھے۔ اب ہمارے ہاتھ میں سکہ بند میٹریل آ گیا ہے۔ ایک دفعہ تو اُن کے پرخچے

اُڑا دوں گا۔"

بدیع الزمان کا اسسٹنٹ شمس، جو خاموش بیٹھا سن رہا تھا، جھجکتے ہُوئے بولا، "بدی صاحب۔۔۔۔"

"یار میں نے کتنی بار تجھے بتایا ہے، میرا نام بدی نہیں بدی ی ی ع ہے۔ اخباری حلقوں میں مَیں پہلے ہی بدی العالم کے نام سے مشہور ہوں،" اُس نے ہنس کر اعجاز کو دیکھا۔ "اب میرے اُپنے گھر میں ہی مجھے اِس نام سے پکارنے لگے ہو؟ ہاں، تو بول بچے، کیا کہتا ہے۔"

"بدیع صاحب"، شمس نے حلق سے زور لگا کر آواز نکالی، "وہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُن کے گھی کی رپورٹ نہیں، کسی اَور گھی کی ہے۔"

"کیسے کہہ سکتے ہیں؟" بدیع الزمان چیخا۔ اُس نے جھپٹ کر لبارٹری کی رپورٹ اُٹھائی اَور جا کر اُسے شمس کے مُنہ کے آگے لہراتے ہُوئے کہا، "مریض کے گھر سے ڈبہ اَور سمپل آیا ہے۔"

"مگر ڈبہ کھلا ہُوا تھا۔"

"تو کیا بند ڈبے سے چھو منتر کر کے گھی نِکل آتا ہے؟"

"کیا گارنٹی ہے کہ کھلے ڈبے میں کس برانڈ کا گھی ڈالا گیا ہے؟ لبارٹری تو ذمہ داری نہیں لے گی۔"

"ہیں؟" بدیع الزمان زِچ کر بولا۔ "ہیں؟"

"بدیع صاحب، شمس بات تو دُرست کر رہا ہے،" اعجاز نے کہا۔

"ہیں؟ دُرست ہے؟ تو پھر اِس کا حل کیا ہے؟"

"کوئی حل تلاش کرنا پڑے گا۔ آپ بیٹھ جائیں۔ کوئی نہ کوئی حل نِکل آئے گا۔"

"تو بتاؤ۔ سوچو،" بدیع الزمان سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگا کر کُرسی پہ بیٹھ گیا۔ "بتا بچے، بتا،" وہ شمس سے مخاطب ہو کر بولا، "مسئلہ کھڑا کرنا کوئی کام نہیں، حل پیش کرنا اصل کام ہے۔"

شمس کے چہرے پر ہراسانی کے آثار نظر آ رہے تھے، مگر اُس نے اپنی جرات برقرار رکھی۔ "ایک حل یہ ہے کہ دکان سے اِزمیر کا بند ڈبہ لبارٹری لے جایا جائے۔ وہی

اُس کو کھولیں اَور انالسس کریں۔"

"ہیں؟" ایک اَور رپورٹ؟ وہ اعجاز کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ "کتنا مزید خرچہ آئے گا۔"

"اِس کی آپ فکر نہ کریں،" اعجاز نے کہا۔ "سمجھ لیں کہ مفت میں ہو جائے گا۔"

"مفت میں؟ واہ لبارٹریاں مفت میں چلتی ہیں؟ آج کل ہر کوئی دُوسرے کی روزی پر جھپٹا مارنے کو تیار بیٹھا ہے۔ ملک اعجاز، کیسی بات کرتے ہو۔"

"بدیع صاحب، واقفیت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ تعلق سے بھی چلتا ہے۔ آخر ہم نے اِتنی عمر اِن لوگوں کے درمیان بیکار ہی تو نہیں گزاری۔"

"زندہ باد" بدیع الزمان نے نعرہ لگایا۔ "ملک اعجاز، تم میرے ساتھ چلے تو پھر کرشمے دیکھنا۔ پٹڑہ کردوں گا۔"

اعجاز اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"اب میں رپورٹ شروع کرتا ہوں،" بدیع الزمان نے کہا۔

"میرے خیال میں دو چار دِن رُک جائیں۔ لبارٹریوں سے اگلی رپورٹیں آلینے دیں۔"

"ہاں، ٹھیک کہتے ہو،" بدیع الزمان اعجاز کے ساتھ سیڑھیاں اُترتے ہُوئے بولا۔ "یہ لو،" اُس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر آگے بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "یہ رکھ لو۔"

"اِن کی کوئی ضرورت نہیں بدیع صاحب۔"

"اوں ہوں۔ میں نہیں مانتا، اِتنی زیادتی مت کرو،" وہ اعجاز کی جیب میں نوٹ اُڑستے ہوئے بولا۔ "گھی کے ڈبوں کے لئے رکھ لو۔ لڑکا،" وہ آنکھ مار کر بولا، "ذہین ہے۔ ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"مگر اِس عمر میں انہیں زیادہ چھوٹ نہیں دینی چاہئے۔ ورنہ اِن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میں نے اَور تم نے تو ابھی بہت آگے جانا ہے۔ میں اِن کا بدی العالم بن کر دکھاؤں گا، تم دیکھتے رہو۔" ہنسی اَور کھانسی کا مخصوص امتزاج بدیع الزمان کی چھاتی سے ابھرا، جس کے دوران ہی اُس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اُسے سڑک کے کنارے

پھینک دیا، "اچھا پھر، اللہ حافظ۔"

اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اعجاز نے پہلی بار بدیع الزمان کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُسے وہاں خوف کے گہرے سائے دکھائی دیئے۔ اُسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ شخص باہر کی دنیا سے لے کر اپنے دفتر کے شمس تک، سب سے سہما ہوا پھر رہا ہے۔ صرف اپنی کامیابی کا تصور اُسے آگے ہی آگے چلائے جاتا تھا۔ اُس خوفزدہ، دلیر آدمی کے لئے اعجاز کے دل میں ایک نیا اُنس پیدا ہوا۔

"اللہ حافظ،" اعجاز نے کہا۔

"دیر نہ کرنا۔"

"جلد آؤں گا۔ فکر نہ کریں۔"

آٹھ روز گزُرنے کے بعد اعجاز تازہ رپورٹیں لئے بدیع الزمان کے دفتر پہنچا۔

"بتاؤ۔ بتاؤ۔ مجھے سسپنس میں نہ رکھو، میرا دِل دھڑکنے لگتا ہے۔" بدیع الزمان بولا۔

"ناقص ہے،" اعجاز نے کہا۔

بدیع الزمان چیخ نما نعرہ بلند کر کے کھانسی کے دَورے میں لوٹ پوٹ گیا۔ دورے سے نپٹ کر اُس نے رومال سے آنسو خشک کئے، چشمہ صاف کر کے لگایا اَور دُوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ پھر وہ اطمینان سے کہنیاں میز پر رکھ کر مسکرانے لگا گویا ایک انسانی اَور ایک ذاتی بحران سے ایک ساتھ فارغ ہو گیا ہو۔ دو چار کش لگا کر اُس نے میز کے دراز سے دو فل سکیپ کاغذ کھینچ کر نکالے۔

"یہ دیکھو، اِس دوران میں، میں نے یہ کام کیا ہے۔" پھر وہ ہاتھ اُٹھا کر تسلی کے لہجے میں بولا، "ناں ناں، رپورٹ نہیں لکھی۔ کام تم نے کیا ہے، رپورٹ تم لکھو گے۔ یہ صرف گائیڈ لائنز ہیں، چند پوائنٹ ہیں، انہیں ذہن میں رکھ کر رپورٹ تیار کرو۔ دُوسرا مقصد لیگل سائیڈ کو محفوظ کرنا تھا۔ میں نے مشورہ کر لیا ہے۔ میرے لیگل ایڈوائیزر نے ایک دو پوائنٹ کاٹ دیئے تھے۔ باقی سب ٹھیک ہیں۔ خیر بہرحال، سب کچھ یہی ہے۔ آگے تم جو کچھ لکھنا چاہو لکھو، تمہارا مال ہے، سنبھالو اَور جٹ جاؤ۔ صرف ایک بات رہ گئی ہے۔ وہ مشورے والی ہے۔"

"کیا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"یا تو ہم از خود اِسے چھاپ دیں اَور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ دُوسری صورت ہے کہ اُن سے ملاقات کر لی جائے۔ سارے ڈاکومنٹ اُن کے سامنے رکھے جائیں، اصل نہیں، فوٹو کاپیاں، اَور پھر سنیں کہ کیا کہتے ہیں۔"

"اِس طرح تو اُنہیں اَپنے ڈیفینس کا وقت مِل جائے گا۔" شمس بولا۔

"شمس، شمس بچے، پوری سٹوری کا تجھے پتا نہیں اَور بیچ میں بول پڑتے ہو۔ سنو،" بدیع الزمان سمجھانے کے اَنداز میں بولا، "ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ پریس سے آئے ہیں۔ ہم تو پبلک انالسٹ کے عہدیدار بن کر جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ اُن کی بات سنیں، اَور جو کچھ وہ کہیں وہ بھی رپورٹ میں شامل کر دیں۔ اِس طرح رائٹ اَپ مزید مکمل ہو جائے گا وَن سائیڈڈ نہیں رہے گا۔"

"خیال تو اچھا ہے،" اعجاز نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ جانے کے لئے تیار ہو؟"

"میں؟----" اعجاز نے پُوچھا۔

"بھئی یہ تمہارا اے بی ہے۔ فرسٹ پرسن رپورٹ ہے، دُوسری سائیڈ کو بھی تم ہی کوَر کرو گے۔"

"جیسے آپ کہیں۔"

"درست۔ چار ستمبر تمہاری ڈیڈ لائن ہے۔ اُس کے بعد میرا کام شروع ہو گا۔ دو ایک دِن ایڈٹ کرنے میں لگیں گے، پھر پریس میں جائے گا۔ گیارہ ستمبر کے اِشو میں نکل آئے گا۔ دُرست؟"

"درست،" اعجاز ہنس کر بولا۔

"جاؤ اَور میدان مارو۔" بدیع الزمان چیخ کر بولا۔ "بہ بانگ دہل مارو۔" ہنستے ہنستے اُسے پھر بھری ہُوئی چھاتی کی کھانسی کا دورہ پڑا۔ اُسے روکتے روکتے بے اختیار اُس کا ہاتھ سگریٹ کی ڈبیا کی طرف بڑھا اَور کپکپاتی ہُوئی اُنگلیاں اُسے کھولنے لگیں۔

رازمیر گھی انڈسٹریز کی مِل شاہدرے کے انڈسٹریل ایریا میں کئی ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اعجاز اَپنی سابقہ پوزیشن میں کسی سے ملنے کے لئے اِس سے پہلے ایک آدھ

بار اِس مِل میں جا چکا تھا۔ مِل کے کیمسٹ سے بھی اُس نے باہر باہر سے رابطہ کیا تھا اُور اُس کے گھر پہ جا کر ملاقات کی تھی۔ اعجاز نے گیٹ پہ اپنا تعارف پبلک انالسٹ کے سٹاف کے ایک آدمی کی حیثیت سے کرایا اُور گیٹ کیپر نے سیکیورٹی کے ایک آدمی کے ہمراہ اُسے ایڈمن افسر کے پاس بھیج دیا، جو ایک ریٹائرڈ میجر تھے۔ میجر قدیر نے گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا اُور چپڑاسی کو چائے لانے کا حکم دیا۔

"آپ نئے آئے ہیں؟" میجر قدیر نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔"

"پہلے ہمارا رابطہ مسٹر جعفری سے ہوا کرتا تھا۔"

"جی ہاں، جعفری صاحب کیمسٹ ہیں۔"

"اُور آپ؟"

"میں نے کیمسٹری تھوڑی بہت پڑھی تو ہے، مگر میں کیمسٹ نہیں ہوں۔ میں انوسٹی گیشن آفیسر ہوں۔"

"ٹھیک،" میجر قدیر نے اطمینان سے سَر ہلا کر کہا۔ "فرمایئے، کیسے آنا ہوا؟"

"میں دراصل حاجی کریم بخش صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"حاجی صاحب تو چیئرمین ہیں، بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ کے آفس سے میں ہی ڈیل کرتا ہوں۔"

"معاملہ ذرا اہم ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اگر آپ چیئرمین صاحب سے ملاقات کروا دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"مشکل ہے،" میجر قدیر آہستہ سے بولا۔ "جعفری صاحب کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا تو ہمارے چیف کیمسٹ سے مِل لیتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں آپ کیا ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چیف کیمسٹ صاحب کی ضرورت ہے تو انہیں بھی بلایا جا سکتا ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے، انہیں بھی شامل کرلیں۔ مگر معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر چیئرمین صاحب سے بات کرنا ضروری ہے۔"

"کوئی ہنٹ تو دیں، آخر کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"پبلک ہیلتھ سیفٹی کا معاملہ ہے۔"

"ہم تو اِس قسم کے معاملے روز ہینڈل کرتے ہیں۔"

"یہ معاملہ ذرا زیادہ سنجیدہ نوعیت کا ہے۔"

چپڑاسی چائے لے آیا۔ میجر قدیر نے اُس کی آمد کو غنیمت جانا اور چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اعجاز کو چائے کی پیالی پیش کرتے ہوئے وہ بولا، "مل میں چیف کیمسٹ کے علاوہ پروڈکشن انجینئر صاحب ہیں، پھر ورکس مینیجر صاحب ہیں۔ آپ اِن میں سے جس سے چاہیں مل لیں، میں ملوا دیتا ہوں۔ سب ذِمہ دار افسر ہیں۔"

"میں نے عرض کیا نا، میجر صاحب کہ چاہئے ساری ٹیم کو اکٹھا کر لیں، مگر چیئرمین صاحب کے علاوہ کسی سے بات کرنا میرے لئے بیسود ہے۔"

"معاف کیجئے گا، آپ نے کیا نام بتایا؟"

"محمد اعجاز۔"

"محمد اعجاز صاحب، پکی بات ہے کہ معاملہ ہماری لیول پر ڈیل نہیں ہو سکتا؟"

"جی پکی بات ہے۔"

میجر قدیر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کے چہرے سے ہلکی سی پریشانی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ "پھر میں زیادہ سے زیادہ مینیجنگ ڈائیرکٹر تک جا سکتا ہوں۔ وہ چیئرمین صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ مِل کا سارا بندوبست اُن کے ہاتھ میں ہے۔" یہ کہہ کر میجر قدیر نے ٹیلیفون گھمایا۔ "ایم ڈی صاحب دفتر میں ہیں؟" اُس نے فون میں پُوچھا۔ "فارغ ہیں؟--- کیمیکل اگزامینرز کے دفتر سے ایک صاحب تشریف لائے ہیں۔ ملنا چاہتے ہیں--- جی؟ جی اچھا۔" میجر قدیر نے فون رکھ دیا۔ "میں ابھی دو منٹ میں حاضر ہوتا ہوں،" اُس نے اعجاز سے کہا۔ وہ اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

اگر اِن لوگوں نے کیمیکل اگزامنیر کے دفتر میں فون کر کے پُوچھ لیا تو پھر؟ اعجاز کا دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ اِس آدمی نے کیمیکل اگزامنیر کہا ہے، اُس نے سوچا، کیا میں نے پبلک انالسٹ کا لفظ استعمال کر کے غلطی تو نہیں کی؟ اِس سے انہیں شک پڑ سکتا ہے۔ سارا کھیل ایک لمحے میں بگڑ سکتا ہے۔ اگر اِن کو حقیقت معلوم ہو گئی تو پھر میں کیا کروں گا؟ اعجاز دفتر میں اکیلا بیٹھا تھا اور میجر قدیر کی غیر حاضری کے چند منٹ اِتنے طویل ہو گئے تھے کہ اعجاز سے چائے نگلی نہ جا رہی تھی۔ آخر اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی، یہی ہے نا کہ

مجھے اپنی اصل حیثیت واضح کرنے پڑے گی۔ کیا کریں گے؟

اعجاز کی قسمت اُس کے آڑے آئی۔ میجر قدیر آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "پتا نہیں جعفری صاحب سے آپ کا رابطہ ہوا یا نہیں۔ اُن کے ساتھ ہماری ارینجمنٹ تھی۔ ہمیشہ وہی آیا کرتے تھے۔ سیمپل وغیرہ لے جایا کرتے تھے، بلکہ ہم خود ہی انہیں بھیج دیا کرتے تھے۔ بڑی اچھی انڈرسٹینڈنگ تھی۔" اس نے رُک کر معنی خیز نظروں سے اعجاز کو دیکھا۔ جب اعجاز اسی خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا تو میجر قدیر دوبارہ بولا، "ہماری مل ماڈرن فیکٹری ہے۔ ہر سٹیج پر کنٹرول موجود ہے۔ سٹاف ہو یا مشینری، کسی چیز کی کمی نہیں۔ فارن کنسلٹینٹس کی ہدایات کے مطابق ہم اپنا پراڈکٹ تیار کرتے ہیں۔"

"دیکھئے میجر صاحب،" اعجاز نے کہا، "میں چیئرمین صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ اگر اُن سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو بتا دیں، میں چلا جاؤں گا اور اپنے افسران کو مطلع کر دوں گا۔"

"اچھا تو پھر چلیے، مینجنگ ڈائریکٹر صاحب سے مل لیجئے۔ وہی آپ کو جواب دیں گے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر حاجی وسیم بخش کے سیکرٹری سے مل کر اعجاز اور میجر قدیر اُس کے بڑے سے ایئرکنڈیشن دفتر میں داخل ہوئے۔ لکڑی کی بھاری میز کے پیچھے پچاس کے لگ بھگ کی عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس نے قمیص اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے اعجاز سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے سامنے ایک اور آدمی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ میجر قدیر نے تعارف کرایا۔ یہ طارق صاحب ہیں، ہمارے ورکس مینجر۔" طارق اُٹھ کر اعجاز سے ملا۔

"میجر صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں،" حاجی وسیم بخش نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں نے عرض کی تھی کہ میرا مقصد چیئرمین صاحب سے ملاقات کرنے کا ہے۔ اگر آپ صاحبان بھی ساتھ ہوں تو اور بھی اچھا ہو۔ مگر میں جو بات کرنا چاہتا ہوں وہ اُن کی موجودگی میں ہو تو بہتر ہے۔"

"چیئرمین صاحب ڈے ٹو ڈے بزنس کو ڈیل نہیں کرتے۔ میں کرتا ہوں،" حاجی وسیم بخش نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کہنا ہے بلا تامل مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔ میں ہر قسم کا

ڈیسژن لینے کی پوزیشن میں ہوں۔"

"میرا ارادہ تھا،" اعجاز نے کہا۔ "کہ چیئرمین صاحب کے خیالات معلوم کروں۔ یہ ٹاپ لیول کا معاملہ ہے۔ آپ ہی کے فائدے کی بات ہے۔"

"معاملہ کس نوعیت کا ہے؟"

"پراڈکٹ کوالٹی۔ معاملہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ تک پہنچ چکا ہے۔"

"چیئرمین صاحب ہر روز مِل میں بھی نہیں آتے،" حاجی وسیم بخش بولا۔ "آپ کھل کر بات کریں۔ ہمارا کوالٹی کنٹرول فرسٹ ریٹ ہے۔ آپ کے جعفری صاحب کئی سال سے ہماری کوالٹی سے مطمئن ہیں۔"

"پھر آپ مہربانی کریں، چیئرمین صاحب سے جس روز کی اپوائنٹمنٹ ملتی ہے، لے دیں۔ میں اُس روز آ جاؤں گا۔ کوشش کریں کہ اُن کی پہلی فرصت میں وقت مِل جائے۔"

اعجاز کو علم تھا کہ وہ پاگل پن کی بات کر کے خطرناک رسک لے رہا تھا۔ ایک ہی دن کے وقفے میں اُس کا راز فاش ہو سکتا تھا اور پھر اُسے وہاں قدم دھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی پتا تھا کہ راز تو ایک دن کے اندر ویسے بھی فاش ہونے سے نہ بچ سکتا تھا، چنانچہ اب اُس نے یہ کھیل شروع کر ہی دیا تھا تو اسے آخر تک پہنچانا لازمی تھا۔ اُس کا دِل پھر سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

ایک بار پھر اعجاز کا ڈھونگ چل گیا۔ حاجی وسیم بخش نے ٹیلیفون اُٹھایا اور بہت نیچی آواز میں کوئی بات کی۔ پھر فون رکھ کر اعجاز سے مخاطب ہُوا۔

"اتفاق سے حاجی صاحب ابھی تشریف لائے ہیں۔ چلیے،" وہ اُٹھتے ہُوئے بولا، "آیئے طارق صاحب۔ میجر صاحب آپ بھی آ جائیں۔"

چاروں آدمی باہر برآمدے میں نِکل کر ایک دُوسرے کے پیچھے چیئرمین حاجی کریم بخش کے کمرے میں داخل ہُوئے۔ یہ دفتر مینجنگ ڈائریکٹر کے دفتر جتنا ہی بڑا تھا، مگر شاندار قیمتی فرنیچر سے سجا ہُوا تھا۔ چمڑے سے منڈھی ہُوئی بھاری میز کُرسیاں تھیں۔ فرش پر بڑھیا قالین اور ایک دیوار کے ساتھ سیاہ چمڑے کا صوفہ سیٹ اور کافی ٹیبل بچھے تھے۔ میز پر تین چار ٹیلیفون رکھے تھے۔ حاجی کریم بخش کی شکل اپنے بیٹے حاجی وسیم بخش سے ملتی تھی۔ اُن

کے چہرے پہ کتری ہوئی سفید ڈاڑھی تھی اَور سَر پہ موئی مشین پھرے ہوئے سفید بال تھے۔ جن کے اَندر کھوپڑی کی گلابی جلد دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ستر کے پیٹے کے صحتمند آدمی تھے۔ انہوں نے سفید ململ کا کرتا اَور لٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی اَور ایک ہاتھ میں تسبیح تھی جسے وہ باتیں کرنے کے دوران انگلیوں میں مُستقل پھیرے جاتے تھے۔ انہوں نے کسی سے ہاتھ ملائے بغیر تسبیح والے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لئے کہا اَور اُن تین آدمیوں کی جانب متوجہ رہے جو اُن کے ایئرکنڈیشنر کے بٹنوں کی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔

"بھئی یہ آپ نے کیسے آدمی رکھے ہوئے ہیں،" انہوں نے کچھ دیر بعد پلٹ کر میجر قدیر اَور ورکس منیجر طارق کو مخاطب کیا۔ "تین دن سے لگے ہوئے ہیں اَور ایک اے۔ سی ان سے ٹھیک نہیں ہوتا۔"

میجر قدیر اُچھل کر کُرسی سے اٹھا اَور ایئرکنڈیشنر کے گرد جمگھٹا کئے ہوئے تین آدمیوں کے پاس جا کھڑا ہُوا۔

"اگر اِس میں خرابی ہے تو بدل دیں،" حاجی کریم بخش نے اُکتائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"بدل دو،" میجر قدیر نے الیکٹریشنوں کو حکم دیا۔ "اُتار کر لے جاؤ اَور ابھی دوسرا فٹ کر دو۔" پھر حاجی کریم بخش نے کُرسی پہ اپنا رُخ سیدھا کیا اَور سوالیہ نظروں سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"یہ اعجاز صاحب کیمیکل ایگزامینر کے دفتر سے آئے ہیں،" حاجی وسیم بخش نے بتایا۔ "ان کا اِصرار تھا کہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

حاجی کریم بخش نے اُنہی سوالیہ نظروں سے اعجاز کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا آپ کو زحمت دی،" اعجاز نے کہا۔

حاجی کریم بخش جواب دیئے بغیر اعجاز کو دیکھتے رہے۔

"دراصل بات کی نوعیت ایسی ہے کہ میں ڈائریکٹ آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

"وہ جو پہلے آیا کرتے تھے،" حاجی کریم بخش نے اعجاز کی بات نظرانداز کرتے ہُوئے حاجی وسیم بخش سے پُوچھا۔ "کیا نام تھا؟"

"جعفری صاحب----"

"کیا وہ تبدیل ہو گئے؟"

"جی نہیں،" اعجاز نے جواب دیا، "وہ لیبارٹری کے سٹاف سے ہیں- میں اِنوسٹی گیشن آفیسر ہوں- میں دو ہفتے پہلے ہی یہاں آیا ہوں-"

"اِس سے پہلے آپ کہاں تھے؟"

"ملتان میں تھا-"

"ملتان میں ہماری دُوسری مِل ہے- اِسی نام سے ہے- آپ حاجی رحیم بخش کو جانتے ہوں گے- وہ میرے چھوٹے بھائی ہیں-"

"جی دراصل میری زیادہ تر سروس صادق آباد میں گزری ہے- ملتان میں، میں صرف ایک ماہ رہا، پھر یہاں تعینات کر دیا گیا- مگر مجھے علم ہے کہ ملتان میں آپ کی مل ہے، گو وہاں جانے کا اِتفاق نہیں ہُوا-"

"تو آپ کس معاملے پر بات کرنا چاہتے ہیں؟" حاجی کریم بخش نے تیز تیز تسبیح کے دانے گنتے ہوئے کہا- اعجاز نے گلا صاف کیا- "بات یہ ہے جناب کہ ایک وسیع علاقے میں بہت سارے لوگ معدے کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور متعدد کیسوں میں یہ بیماریاں خطرناک صورت اختیار کر گئی ہیں- خدا کا شکر ہے ابھی کوئی موت واقع نہیں ہُوئی- ڈاکٹروں کی مختلف رپورٹیں ڈسٹرکٹ ہسپتالوں میں پہنچی ہیں- اُنھوں نے ہمیں کانٹکٹ کیا ہے- ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق اِن سب بیمار ہونے والوں میں ایک قدرِ مشترک ثابت ہوئی ہے، اور وہ آپ کے گھی کا استعمال ہے- ہم نے ازخود دُکان سے آپ کا گھی خرید کر انالسس کیا ہے، اور ساتھ ہی اِنڈی پنڈنٹ لیبارٹریوں سے بھی کروایا ہے- سب رپورٹیں ایک دُوسری کے مطابق آئی ہیں- اُن سے ظاہر ہوا ہے کہ آپ کا گھی ناقص ہے-"

"ہمارا کوالٹی کنٹرول تو بڑی سختی سے چیک ہوتا رہتا ہے-" ورکس منیجر طارق بولا-

"ہماری رپورٹیں مختلف صورتِ حال ظاہر کرتی ہیں-" اعجاز نے کہا- اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا- "مثلاً ایف ایف اے، یعنی فری فیٹی ایسڈز، جن کی زیادہ سے زیادہ مقدار ہم نے زیرو پوائنٹ دو فیصد مقرر کر رکھی ہے، وہ آپ کے

گھی میں زیرو پوائنٹ چھ اور سات فیصد کی شرح تک پائی گئی ہے، جس کی وجہ سے معدے میں تیزابیت پیدا ہوتی ہے جو ہاضمے کے عمل میں خرابی پیدا کرتی ہے۔ اِس کے بعد بدبودار مادے کے ٹیسٹ ہیں، ریسنڈٹی اور پراوکسائیڈ ٹیسٹ، اُن پر بھی آپ کا گھی پاس نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ خرابی گھی میں نِکل دھات کی موجودگی سے ہے۔ اِس کی حد زیرو پوائنٹ پانچ پی۔پی۔ایم مقرر ہے۔ آپ کے گھی میں وہ اِس حد سے کافی تجاوز کرتی ہے۔ نِکل دھات کو مکمل طور پر صاف نہ کرنے کی وجہ سے اِنسانی سسٹم میں معدے کی خرابی سے لے کر السر اور کینسر تک کے مرض لاحق ہو سکتے ہیں۔"

دو چار لمحوں تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھر حاجی وسیم بخش مینجنگ ڈائریکٹر بولا "یہ ناممکن ہے۔ ہمارے پاس کوالیفائیڈ سٹاف ہے، جو چوبیس گھنٹے کوالٹی کی نگرانی کرتا ہے۔"

"آپ کے چیف سائنٹسٹ ڈاکٹر خدا بخش کھوکھر ہی ہیں نا؟" حاجی رحیم بخش نے بات کا رُخ بدل کر کہا۔

"جی ہاں،" اعجاز نے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔۔" رحیم بخش نے آہستہ آہستہ کئی بار سَر ہلایا۔ "میں اُنھیں جانتا ہوں۔ بہرحال۔ کیوں بھئی وسیم، یہ کیا معاملہ ہے۔"

"حاجی صاحب، ہمارے انالسس کی روزانہ رپورٹیں ہمارے پاس موجُود ہیں۔ ہمارے رزلٹ قطعی طور پہ اِن حدود کے اندر ہیں۔ آپ،" حاجی وسیم بخش اعجاز سے مخاطب ہُوا۔ "ہماری لیبارٹری، ہمارے ٹیسٹ پروسیجر، ہماری ٹیسٹ شیٹوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اِن کا معائنہ کر سکتے ہیں۔"

"ہماری انویسٹی گیشن کے مطابق،" اعجاز نے حملہ جاری رکھتے ہُوئے کہا، "آپ پراسیس کے اندر ایک دو ضروری عوامل کو گول کر رہے ہیں۔ مثلاً پوسٹ نیوٹرلائزیشن نہیں کرتے، کیونکہ اِس سے آپ کا دو فیصد پراسیس لاس ہوتا ہے۔ ریسنڈٹی اور پراوکسائیڈ ویلیو کے کنٹرول میں ویکیوم سٹیم ڈسٹیلیشن کرنی پڑتی ہے، وہ آپ نہیں کرتے، جس سے آپ کی سٹیم کا خرچہ بچ جاتا ہے۔ پھر نِکل کو صاف کرنے کے لئے سٹرک ایسڈ استعمال کرنا پڑتا ہے جو ایک قیمتی کیمیکل ہے۔ وہ آپ بچا جاتے ہیں۔

"یہ انویسٹی گیشن آپ نے کہاں سے کی ہے؟" ورکس منیجر طارق نے سختی سے پُوچھا۔ "یہ کانفیڈ۔نشل انفرمیشن ہے۔"

میں اسے بتانے کا مجاز نہیں ہوں۔" اعجاز نے کہا۔"

اب حاجی وسیم بخش اور ورکس مینجر طارق گُم سُم بیٹھے تھے۔ صرف چیئرمین حاجی کریم بخش طمانیت سے بیٹھے ہوا میں دیکھتے ہوئے تسبیح پر تیز تیز اُنگلیاں چلا رہے تھے۔ "ڈاکٹر کھوکھر میرے چھوٹے بھائی کے سکول فیلو ہیں۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "میرا خیال تھا ریٹائر ہو چکے ہونگے۔ دیکھئے---- اررر، کیا نام بتایا آپ نے؟"

"محمد اعجاز۔"

"دیکھئے اعجاز صاحب، میں صرف دو تین باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو یہ کہ ہماری انڈسٹری کو چلتے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ اِس عرصے میں ہمیں آپ کے محکمے سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ اب یکایک ہمارا پراڈاکٹ خراب ہوگیا؟ پھر آپ کو علم ہے کہ ہمارے ملک میں انڈسٹریلائزیشن کا عمل نیا شروع ہو رہا ہے۔ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ فیکٹریاں لگ رہی ہیں، مال پروڈیوس ہو رہا ہے، لوگوں کو روزگار مہیا ہو رہا ہے، معیشت ترقی کر رہی ہے۔ اِس میں آپ سب کا حِصّہ ہے۔ تیسرے یہ کہ کیا ڈاکٹروں کی رپورٹیں قابل اعتماد ہیں؟ ہمارے غریب لوگ خدا جانے کیا کچھ گلی سڑی چیزیں کھاتے رہتے ہیں۔ اِس میں ہمارے گھی کا کیا قصور ہے؟ کیا آپ کے پاس، یا ڈاکٹروں کے پاس کوئی ریکارڈ ہے، کہ لوگ کیا کھاتے پیتے ہیں؟ بھئی آپ لوگ،" وہ اب سیدھے صاف الفاظ میں اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا، "اِن صاحب سے معاملہ طے کرلیں،" پھر وہ دوبارہ اعجاز کی جانب متوجہ ہوا، "ہماری معیشت میں آپ سب کا حِصّہ ہے۔ سب مِل جل کر کام کریں گے تو کچھ ہو گا، ورنہ ترقی کا عمل رُک جائے گا۔ آپ منیجنگ ڈائیرکٹر صاحب سے میٹنگ کر کے معاملہ طے کرلیں۔"

"معاملہ طے کرنے کا سوال نہیں ہے حاجی صاحب،" اعجاز نے کہا، "یہ معاملہ اب ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ ہیلتھ منسٹری تک جاچُکا ہے۔ لوگ خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اِسی لئے میں نے اصرار کیا تھا کہ آپ سے ڈائرکٹ بات کروں۔ آپ کی فیکٹری بند ہو سکتی ہے۔"

"اُس کی آپ فکر نہ کریں۔ فیکٹریاں بند نہیں ہوا کرتیں۔ دیکھئے آپ بیماریوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا میں لوگ جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اُس کی وجہ سے ہماری آبادی کو بچپن سے ہی امیونٹی ہو چکی ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، جب انگریز پہلے پہل یہاں آیا تھا اُسے صبح کو ڈائریا ہوتا تھا، شام کو جان بحق ہو جاتا تھا۔ اپنے لوگوں کو آپ نے کبھی دستوں سے مرتے ہُوئے دیکھا ہے؟ گھی وغیرہ میں تھوڑی بہت اُونچ نیچ سے انہیں کیا ہوتا ہے؟ اَور دُوسری غذائی اشیاء کو دیکھیں۔ کس چیز میں ملاوٹ نہیں ہو رہی؟"

"مگر حاجی صاحب،" اعجاز نے کہا۔ "ہمارا فرض تو اِن چیزوں کو روکنا ہے۔"

"ارے اِس ملک میں سب کچھ چلتا ہے بھئی۔ آپ ہماری مینجمنٹ کے ساتھ معاملہ طے کر لیں۔ میری پُوچھتے ہیں تو آپ کو سچی بات بتاؤں؟"

"جی،" اعجاز نے کہا۔

"جب سے میں نے ہوش سنبھالی ہے میرے دِل میں صرف ایک ہی خواہش ہے، کہ خداوند تعالیٰ مجھے مدینے میں موت نصیب کرے۔"

اعجاز اچنبھے کی حالت میں بیٹھا دیر تک حاجی کریم بخش کا مُنہ دیکھتا رہا۔

"بہ بانگ دہل" کے دفتر سے بدیع الزمان کی کھانستی ہُوئی چیخ نما ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ اعجاز اَور شمس اُس کے سامنے بیٹھے ہنس رہے تھے۔

"یعنی اُس نے کوئی ایکسکیوزیشن نہیں کیا؟" بدیع الزمان حیرت اَور خُوشی کی ملی جلی کیفیت میں چلا چلا کر بول رہا تھا۔ "کوئی وعدہ نہیں کہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنائے گا؟ اپنی کسی کوتاہی کو تسلیم نہیں کیا؟"

"اُوں ہوں،" اعجاز نے نفی میں سَر ہلایا۔

"یعنی کیا واقعی صرف یہ کہا کہ اِس ملک میں سب چلتا ہے؟"

"اور یہ کہ خداوند تعالیٰ مدینے میں موت نصیب کرے۔"

"اللہ اکبر!" بدیع الزمان بولا۔ "واہ، یہ تو ایسی لائن ملی ہے کہ پشرہ کر دیں گے۔ رپورٹ کے آخر میں جب مالکان کی ری ایکشن کی بات کرو تو صرف یہی دو جملے لکھ دو، اس کے بعد۔۔۔۔ اور ہاں، یہ کہ مینجمنٹ سے معاملہ طے کر لو۔ معاملہ کو کوٹیشن مارکس میں لکھنا۔ اِس کے بعد فل سٹاپ، رپورٹ ختم۔ پردہ ڈراپ۔ پھر دیکھو اِس کا امپیکٹ کیا ہوتا ہے۔ معاملہ! ہاہاہا! معاملہ! اُسے پتا نہیں کہ اُس کے ساتھ کیا معاملہ ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک۔" اعجاز نے کہا۔

"مگر یار اعجاز،" بدیع الزمان تعریفانہ انداز میں بولا، "تم نے رِسک بڑا لیا۔ دو جگہ پر پکڑے جا سکتے تھے۔ ایک ٹیلیفون کال ہوتی اور تمہارا پول کھل جاتا۔ مگر تم نے اپنی ہمت برقرار رکھی۔ مجھے پتا تھا۔" وہ میز پر ہاتھ مار مار کر چیخا، "مجھے پتا تھا، مجھے پتا تھا، تمہارے جیسا آدمی ہی یہ کام کر سکتا ہے۔ ہم دونوں ملک میں ڈنکا بجائیں گے۔" وہ جیسے جیسے جوش میں آتا جاتا تھا، سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا جا رہا تھا۔ "اب تو میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں کہ آج وہاں پہ کیا سین ہوگا۔ تمہارے آنے کے فوراً بعد انہوں نے کیمیکل اگزامینر کے دفتر فون کھڑکائے ہونگے۔ اِس وقت حاجی سیکورٹی سے لے کر مینیجنگ ڈائیرکٹر تک سارے سٹاف کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہو گا۔ ہیں ناں؟" وہ چیخا۔

"اور تسبیح پھیر رہا ہو گا،" اعجاز نے کہا۔

"ہاں ہاں، ٹھیک، بالکل ٹھیک۔"

جب کمرہ دھوئیں سے بھر گیا اور کھڑکیاں کھولنے پر بھی کم نہ ہوا تو اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈیڈ لائن سے پہلے دے دو گے ناں،" بدیع الزمان نے پوچھا۔

"دے دوں گا۔"

"لیگل ایڈوائیزر کو بھی دکھانی ہے۔ اُس کا اصرار ہے۔"

"ہاں، سمجھ گیا،" اعجاز نے کہا۔

جس روز رپورٹ چھپی، جلی حروف میں اپنا نام پڑھ کر اعجاز کو اُپنے بدن میں ایک ایسی سنسنی کا احساس ہوا جو اُس نے پہلے شاید ہی کبھی محسُوس کی ہو، گو اُسے یہ احساس ہلکا سا مانُوس بھی لگا، مگر اِس کا مقام، کوشش کے باوجُود، اپنی یاد میں اُسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ "بہ بانگِ دہل" ابھی تک عام بکسٹالوں پہ نہ بکتا تھا۔ صرف چند دُکاندار اسے رکھنے پہ راضی ہو سکے تھے، جن میں زیادہ تر لکڑی کے پھٹوں والے اخبار فروش تھے۔ پرچے کی چند کاپیاں اُوپر نیچے رکھی ہوتی تھیں، اور ہفتے کے آخری دن تک اُوپر والی کاپی کا پہلا صفحہ گرد، پانی کے چھینٹوں اَور مکھی کی بیٹوں سے اَٹ کر سیاہ ہو چُکا ہوتا تھا۔ گیارہ ستمبر والے دِن اعجاز نے دھلے دُھلائے، تہہ کیے ہوئے کپڑوں کا جوڑا پہنا اَور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اِن دُور دُور کے بکسٹالوں پہ گیا جہاں "بہ بانگِ دہل" پہنچتا تھا۔ اِن دو چار بکسٹالوں پہ اُس نے ہر ایک پر سے پرچہ اُٹھا کر دیکھا، ورق گردانی کرتے ہُوئے اُس صفحے پہ پہنچا جہاں چوکھٹے کے اندر موٹے الفاظ میں اُس کی رپورٹ کا عنوان لکھا تھا: "گھی کا سکینڈل۔ بہ بانگِ دہل کی خصوصی رپورٹ۔" نیچے ذرا چھوٹے حروف میں، مگر الگ چوکھٹے کے اندر، اُس کا نام تھا۔ "ملک محمد اعجاز۔" ہر جگہ پر وہ چند منٹ تک اَپنے نام پہ نظریں جمائے کھڑا رہا، پھر پرچہ رکھ کر آگے چل پڑا۔ تین گھنٹے کے اندر اُس نے کئی میل کا چکر کاٹا۔ ہر بار اَپنے لکھے ہوئے الفاظ اَور پرنٹ کیا ہُوا نام دیکھ کر اُس کے دِل کی دھڑکن تیز ہو جاتی، خُون اُس کے کانوں میں سنسنانے لگتا اَور جلد جھرجھراتی۔ ایک نشے کی سی کیفیت تھی جو چند لمحوں کے لئے اُس پہ طاری ہو جاتی اَور اَپنے پیچھے ایک خُوش کن احساس چھوڑ جاتی۔ آخری بکسٹال پہ اعجاز کو اِس احساس کی دھار ذرا کند ہوتی ہُوئی معلوم ہُوئی۔ وہ اِس انوکھی سنسنی کے ماند پڑ جانے کے خیال کو سہار نہ سکا۔ اُس نے جیب سے نقدی نکالی اَور پرچے کی ایک کاپی خرید لی۔ اسے موٹر سائیکل کے ہینڈل میں اُڑسنے کی بجائے اُس نے دہرا چوہرا کر کے اُسے قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ اسے اَپنے بدن کے ساتھ لگا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اِس سے اُسے عجیب سی تن آسانی کا احساس ہُوا۔ اب وہ موٹر سائیکل بھی ایسی آزادی سے چلا رہا تھا جیسے وہ چالیس اِکتالیس سالہ دیہاتی نہ ہو بلکہ اٹھارہ سالہ شہری لڑکا ہو۔ روزمرہ کی نسبت آج اُسے اَپنے آگے ٹریفک کی بندش ایک آدھ سکینڈ پہلے ہی نظر آتی جا رہی تھی اَور وہ ایسی

مقابل سے اپنی سواری کو دائیں اور بائیں موڑتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اُس کے سامنے خُود بخود راستہ نکلتا آ رہا تھا۔ پہلے کبھی اعجاز کو اُس مشین پر ایسی قدرتی مہارت کے ساتھ ایسا ضبط حاصل نہ ہوا تھا۔ دو ایک فرلانگ ہی جا کر وہ ایک سُرخ بتی پر رُکا کھڑا تھا کہ دفعتاً اُس کے ذہن کی کسی کھڑکی کا پٹ کھلا اور اُسے اپنی اِس کیفیت کی ایک پرانی پہچان کی جھلک دکھائی دی۔ اُس کا دل یک بارگی اُچھلا۔ یہ کیفیت اعجاز پہ اس وقت وارد ہُوئی تھی جب وہ پہلی بار ایک بڑے جلسے میں سٹیج پہ چڑھ کر ایک مجمعے سے مخاطب ہوا تھا۔ چھوٹی موٹی مجلسوں میں، کمروں کے اندر، گلیوں اور احاطوں میں کُرسیوں پہ یا زمین پر بیٹھ کر مزدوروں سے گفتگو کرنے کی اور بات تھی۔ کناتوں اور شامیانوں دریوں اور سٹیج اور مائیکروفونوں والے جلسے کا ماحول مختلف تھا۔ ایسی جگہوں پہ، جہاں دُوسرے نامور لوگ مدعو ہوں، پہلے اُٹھ کر بولنا ایک بیتاب مجمعے کو قابو میں کرنے والی بات تھی۔ جب پہلی بار اعجاز ایک ایسے موقع پر چار پانچ سو چہروں کے سامنے کھڑا ہُوا تھا اور پہلے چند جملے اُس نے رُک رُک کر ادا کیے اور پھر اُس کی زبان میں روانی آتی گئی تھی، تو اُسے علم ہوا تھا کہ چھوٹی مجلسوں میں اہمیت اِس بات کی ہوتی تھی کہ آپ اصل میں کیا کہہ رہے ہیں، اور جو کہہ رہے ہیں اُس میں ربط موجُود ہے۔ یا کہ نہیں، جبکہ بڑے جلسوں میں نہ ہی الفاظ اور نہ اُن کا باہمی ربط اتنے اہم ہوتے تھے جتنا کہ بدن کی حرکات کا انداز اور آواز کا زیر و بم۔ اِن جلسوں میں، جہاں مجمعے کی تمام تر توتیں، اپنے حجم کی وجہ سے سجی ہُوئی سٹیج اور مائیکروفون اور اُوپر بیٹھے ہُوئے بڑے لوگوں کے باعث کانوں کی بجائے نظروں میں سمٹی ہوتی تھیں، بات کا ربط دلیل سے نہیں بلکہ آواز کی اُونچ نیچ سے پیدا ہوتا تھا اور یہی خطابت کا اصل راز تھا۔ ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن سے گزرا تھا کہ غالباً یہی وجہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی تحریکیں، جن کے سربراہان عقل و فہم کی باتیں کر کے لوگوں کے شعور کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے، اسی صورت میں اپنی زندگی گزار کر ختم ہو جاتی تھیں، جبکہ مجمعے کے لاشعور کو قابو کرنے کی مہارت رکھنے والے لوگ، عقل و فہم کی کمی کے باوجُود، اِس میدان میں بازی لے جاتے تھے۔ اِس بات کا اندازہ کر کے خود بخود اعجاز کی آواز، اور اُس کے سر، بازوؤں اور کندھوں کی حرکات بدل گئی تھیں۔ ہجوم اب سکون سے اُس پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ عام فہم باتیں کرتے ہوئے وہ بیچ بیچ میں، وقفے وقفے پہ کوئی جوش آور اِصطلاح استعمال کر دیتا تو مجمعے کا ردِ عمل اُس کی

توقع کے عین مطابق ہوتا تھا۔ اُس موقعہ پر اپنی قوت کا احساس کرکے اُس پہ ایک سرور کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اَور یہ وہی سنسنی خیز لہر تھی جو آج اُس کے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ اب اُس کا دھیان موٹر سائیکل چلانے سے بھی ہٹ چکا تھا اور اُس کے اعضاء بھی قطعی جبلی طور پہ، ایک مشاق ڈرائیور کی مانند اُسے قابو میں رکھے ہُوئے تھے۔ وہ گزرا ہوا وقت یاد کرتے کرتے اُس کے خیال کی ایک اَور پرت جاگی، اَور اُسے علم ہوا کہ یہ وہی کیفیت ہی تھی جو کسی عورت کے اجنبی بدن کو چھوتے وقت طاری ہوتی تھی، وہ انوکھا یا نویلا تازہ رَو احساس جو اُسے شادی کے پہلے روز سکینہ کے ساتھ، اَور پھر بعد میں اُس کھیت کے اندر کنیز کے جسم پہ ہاتھ دھرتے ہُوئے ہوا تھا۔ وہی جذبہ اِس وقت اُسے اپنے حلقے میں لئے ہُوئے تھا جب "بہ بانگ دُہل" کا پرچہ، جس کے اندر ایک چوکھٹے میں اُس کا نام درج تھا اور جو آج صبح صبح شہر میں پھیل چکا تھا، اُس کی جیب کے اندر سے اُس کی چھاتی سے مس ہو رہا تھا اور جس کے تصور سے ہی اُس کا سینہ سیرگی کے احساس سے بھر گیا تھا۔۔۔۔ ایک اَیسے تموّل کا احساس جیسے کوئی بیٹھے بیٹھے، کسی نہ کسی صورت میں صاحب ثروت ہو جائے، یا جیسے لمبی خشک سالی کے بعد کھل کر بارش ہو، یا روزمرہ کے کام کرتے کرتے جیسے اچانک ایک روز آدمی کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔۔۔۔ ایک ایسی امارت جو خُون کی گردش میں روانی بھی پیدا کرے اَور دِل کے ٹھہرنے کا سبب بھی ہو۔

دفتر میں خُوشی کے تہوار کا ساسماں تھا۔

"یہ تُمھاری جیب میں کیا ہے؟ تم نے خریدا ہے؟ یعنی پیسے خرچ کرکے خریدا ہے؟ کیوں؟" بدیع الزمان بولتا چلا گیا، "کیا ضرورت تھی؟ یہ سارا ڈھیر تُمھارا ہے، جتنے چاہو لے جاؤ، تُمھارا حلقہ احباب وسیع ہے، مزدُوروں میں بانٹ دو، ایک ہزار کا مزید پرنٹ آرڈر دیا ہے۔ نیچے جا کر ہر طرف فون کرکے آیا ہوں۔ سٹوری کا شور مچا ہُوا ہے۔ 'طلوع' والے لفٹ کر رہے ہیں، میں نے ڈیمانڈ کیا کہ 'بانگ دہل' کو کوٹ کریں اَور سٹوری حاشیے میں لگائیں ورنہ ہرجانے کا دعویٰ کردوں گا۔ دُوسرے اخبار بھی سُرخیاں لگا رہے ہیں۔ میں نے سب کو وارن کر دیا ہے۔ کوٹ کریں۔ اب پرچے کی شان دیکھنا، شمس، کل سب سے بہلا

ہم نوٹ کرلو، صبح کے سارے اخبار میرے آنے سے پہلے میز پر موجود ہوں، سن لیا؟ ٹیلیفون! ٹیلیفون کے بغیر پرچہ کیسے چل سکتا ہے، میں کب تک دُوسروں کے ٹیلیفون استعمال کرتا رہوں گا۔ اشتہار! اب تو اِشتہاروں کا وقت آیا ہے اور ٹیلیفون نہیں ہے۔"

"ٹیلی فون لگوا کیوں نہیں لیتے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"واہ، تم تو ایسی بات کر رہے ہو جیسے فون دروازے میں رکھا ہے اور میں جا کر اُسے اندر لے آوں۔ میاں، ہزاروں روپے تو محکمے والے سیکیورٹی مانگتے ہیں، اور دس ہزار روپے رشوت۔ میں کہاں سے لاؤں؟ دو چیزیں،" بدیع الزماں نے دو انگلیاں ہوا میں اٹھائیں، "دو چیزوں کے بغیر پرچہ نہیں چل سکتا۔ ایک ہیں اِشتہار۔ اور اِشتہار ٹیلیفون کے بغیر نہیں ملتے، سو دُوسری چیز ہے ٹیلیفون۔ رابطے کے لئے ٹیلیفون چاہیے۔ یہ دو چیزیں میں کہاں سے لاؤں؟ کہاں سے لاؤں؟" وہ میز پہ ہاتھ مار کر بولا، جس سے اُس کی انگلیوں میں پھنسا ہُوا سگریٹ اُچھل کر فرش پر جا گرا۔ بدیع الزماں نے جھک کر سگریٹ اُٹھایا جس کا جلتا ہُوا سرا بھی الگ ہو گیا تھا۔ بدیع الزماں نے تیز تیز سانس کھینچتے ہُوئے، کئی چھوٹے چھوٹے کش لگا کر ایک چنگاری کو جو سگریٹ کے ساتھ اٹکی رہ گئی تھی، پھیلا کر دوبارہ سگریٹ جاری کر لیا، پھر ایک آخری لمبا کش کھینچ کر کئی سیکنڈ تک دھوئیں کو پھیپھڑوں میں جذب کرتا رہا، یہاں تک کہ اعجاز کا جی گھبرانے لگا۔ بدیع الزماں کی اُنگلیوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ ہیجان کی حالت میں تھا۔ اعجاز خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب تک پرچہ کسی وسیلے کے بغیر چل رہا تھا، بدیع الزماں خُوش دِلی اور اطمینان سے بیٹھا کام کرتا رہا تھا۔ اب جبکہ ترقی کی اُمید لگی تھی، اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی، جیسے بارش کی دُعا مانگتے مانگتے سیلاب آ جائے اور سب کچُھ بہا کر لے جائے۔

جو دُھواں اُس کے پھیپھڑوں سے بچ رہا تھا اُسے ناک کے راستے خارج کر کے بدیع الزماں بولا، "میرے تو گلے میں رسہ پڑا ہُوا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ایک رستہ بند ہو تو دو کھل جاتے ہیں۔ میرے ساتھ معاملہ دُوسرا ہے۔ ایک رستہ کھلتا ہے تو دو بند ہو جاتے ہیں۔ دو،" اُس نے دوبارہ دو اُنگلیاں اُونچی کر کے اعجاز کو دکھائیں، "یہ دو چیزیں اب ازحد ضروری ہیں۔ اِشتہار اور ٹیلیفون۔ بلکہ پہلے ٹیلیفون اور بعد میں اِشتہار۔"

"بدیع صاحب،" شمس نے ڈرتے ڈرتے کہا، "بلکہ پہلے اِشتہار ہونے چاہئیں،

جن کے پیسوں سے ٹیلیفون لگوا لیا جائے۔"

"ہاں ہاں، تجویز پیش کرنے میں تو تم ہشیار ہو، مگر کام کا طریقہ بھی تو بتاؤ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ غور سے سنو۔ کل میں تم کو ایک لسٹ بنا کر دوں گا۔ نہیں نہیں، دو لسٹیں بناؤں گا۔ گریڈ ون کی اِشتہاری ایجنسیوں اور سرکاری دفتروں کی لسٹ میرے لئے ہوگی۔ وہ میں لے کر چلوں گا۔ نمبر دو لسٹ تمھیں دوں گا" دیکھوں ذرا تیری کارگزاری۔ ساتھ رائٹ اپ بھی ہوگا۔ اِشتہار حاصل کرنا ایک آرٹ ہے۔ خیر بہرحال۔" وہ اعجاز سے بولا، "کل پتا چلے گا" کل۔ صبح صبح آ جانا۔ ٹھیک ہے؟"

اگلے روز اعجاز دفتر میں پہنچا تو بدیع الزمان سب قومی اور مقامی اخبار میز پر پھیلائے بیٹھا تھا اور کمرہ دھوئیں سے بھرا تھا۔ اعجاز کو دیکھتے ہی وہ اُچھل کر کرسی سے اٹھا۔

"طلوع، نے صفحہ دو پہ اضلاعی خبروں میں رکھی ہے،" وہ اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔

اعجاز نے اُس کے ہاتھ سے اخبار لے کر خبر پڑھی۔ "چلو، ہماری سٹوری اکناکج تو کی ہے،"

"ہاں،" بدیع الزمان مایوسی سے بولا، گویا، 'یہ بانگ دہل، کا حوالہ دے کر انھوں نے بدیع الزمان سے ایک تنبیہی خط لکھنے کا موقع چھین لیا ہو،

"اور؟" اعجاز نے دُوسری اخباروں کی جانب اشارہ کرکے پُوچھا۔

"'صدائے وقت، نے پہلے صفحے پر چھاپی ہے۔"

"واہ،" اعجاز اخبار اُٹھا کر خبر پڑھنے لگا۔ "مگر اُنھوں نے ہمارا نام نہیں دیا۔ صرف 'ایک ہفت روزہ، لکھا ہے۔ اِس کا کیا مطلب ہوا؟"

بدیع الزمان پژمردگی سے سَر ہلا کر دھپ سے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"پھر؟" اعجاز نے سوال کیا۔

"پھر کیا۔ بھئی میجر اخبار ہے۔ پہلے صفحے پر خبر لگائی۔ بڑی بات ہے۔"

بدیع الزمان کا چہرہ دیکھ کر اعجاز پر ساری صورتِ حال واضح ہو گئی۔ 'طلوع، نے غیر اہم مقام پر خبر لگا کر 'یہ بانگ دہل، کا حوالہ دیا تھا۔ 'صدائے وقت، والے پہلے صفحے پر خبر چھاپ کر حوالہ گول کر گئے تھے۔ گویا بدیع الزمان پر دونوں دروازے قریب بند ہو

چلے تھے۔

"اور کسی اخبار نے نہیں لگائی؟"

"اُوں ہوں،" بدیع الزمان نے سر ہلا کر کہا اور سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگایا۔ "مگر فکر کی کوئی بات نہیں،" وہ متفکر چہرے سے بولا۔ اعجاز آہستہ سے ہنس پڑا۔ بدیع الزمان نے چونک کر اُسے دیکھا۔ "بھئی بی بی، نام نکل گیا ہے، اور کیا چاہیے۔ سب کو علم ہے کہ 'ایک ہفت روزہ' جو لکھا گیا ہے، وہ 'بہ بانگ دہل' ہی ہے۔ لوگ اتنے بے خبر نہیں ہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، اس وقت اگر یہاں پہ،" بدیع الزمان نے جوش میں آکر میز پر ہاتھ مارا، "ٹیلی فون ہوتا تو اس کی گھنٹی صبح سے شام تک سانس لینے کے لئے نہ رکتی۔ ہائے، مجھے تو ٹیلیفون کی کمی نے مار دیا۔" پھر اُس نے مزاج کو قابو میں کر کے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "انگریزی کے اخبار رسالے کچھ وقت لے کر خبر کو اٹھاتے ہیں۔ ابھی دیکھتے جاؤ۔ اُن میں بھی آئے گی۔ اُن میں آئے گی۔ میں کہتا ہوں، فکر کی کیا بات ہے، کیا کوئی پرچہ ایسا ہے جس کا آٹھواں ایشو، سُن رہے ہو، صرف آٹھواں ایشو" وہ چیخ کر بولا، "ایسا بامب شیل سکینڈل منظرِ عام پر لایا ہے؟ ہم نے جرنلزم کی تاریخ لکھی ہے۔ فکر کی کیا بات ہے؟" مگر خوش ہونے کی بجائے وہ مزید غمگین ہو کر کرسی کی پشت پہ ڈھے گیا۔ "خیر بہرحال میں آج اشتہاروں کے پیچھے جا رہا ہوں۔ جب پرچہ اُن کے سامنے رکھوں گا۔ ان دو اخباروں کی خبریں دکھاؤں گا اور پرنٹ آرڈر کے بارے میں بتاؤں گا تو دیکھتا ہوں اشتہار کیسے نہیں ملتے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ دیکھتے جاؤ۔"

بدیع الزمان نے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا تو اعجاز کو خیال آیا کہ اگر بدیع الزمان سگریٹ پینا ترک کر دے تو چھ آٹھ ماہ کے اندر ٹیلیفون کے پیسے نکل سکتے تھے۔ مگر بدیع الزمان کی حالت دیکھ کر وہ خاموش رہا۔

رپورٹ کے پورے پانچ ہفتے کے بعد "بہ بانگ دُہل" کے پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر اور فیچر رائیٹر کو ازمیر گھی انڈسٹریز کی جانب سے "دلاپانے" کا قانونی نوٹس وصول ہوا، جس کا متن یہ تھا۔

"جنابِ عالی، موکلم میسرز ازمیر گھی انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ نے مجھے اپنا وکیل مقرر کر کے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو درج ذیل قانونی نوٹس دُوں۔"

۱۔ یہ کہ اخبار ہفتہ وار "بہ بانگ دُہل" میں مورخہ گیارہ ستمبر کو آپ نے ایک مضمون شائع کیا ہے جو ملک محمد اعجاز نامی شخص نے تحریر کیا ہے۔ جس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ مؤکلم میسرز از میر گھی انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کی فیکٹری واقع جی ٹی روڈ بادامی باغ میں جو گھی تیار کیا جاتا ہے وہ محکمہ صحت کے مقرر کردہ معیار کے مطابق تیار نہیں کیا جاتا۔ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ گھی میں جو کیمیائی اجزاء قابل تلف ہیں مثلاً بدبودار مادے، نِکل دھات وغیرہ، وہ تلف نہیں کئے گئے اور اِن اجزاء کی موجودگی مضر صحت ہے اور اِس کی وجہ سے بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ مضمون میں یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ مذکورہ اجزاء کیمیائی عمل کے ذریعے اِس لئے ختم نہیں کئے گئے کہ مؤکلم کو اِن کے اِتلاف پر آنے والا خرچہ نہ کرنا پڑے اور اِس طرح مؤکلم کے منافع میں اضافہ ہو سکے۔ مضمون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اخبار کی تحقیق لبارٹری کی تجزیہ رپورٹ اور ڈاکٹر کی رائے پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ مؤکلم کے مذکورہ گھی کی کھپت اُن علاقوں میں ہُوئی جہاں جہاں گھی جاتا ہے اور بیماریاں پیدا کرنے کا موجب بنا ہے۔

۲۔ مضمون کی اشاعت سے مؤکلم کے گھی کے صارفین کی نظر میں گھی کی قدر و قیمت گر گئی ہے اور وہ خریدنے سے خائف ہیں اور کھپت گر گئی ہے اور آئندہ مزید گرنے کا خطرہ ہے۔

۳۔ یہ کہ آپ کے اخبار میں مذکورہ مضمون کی اشاعت نہ صرف ذاتی طور پر بدنامی کا باعث ہوئی بلکہ مؤکل کو مالی طور پر شدید نقصان پہنچا ہے اور آئندہ احتمال ہے۔ مضمون کی اشاعت سے مؤکلم کی قدر و عزت دوستوں احباب اور تمام پبلک کی نظر میں کم ہو گئی ہے اس طرح اِن کی سماجی حیثیت بھی متاثر ہُوئی ہے۔

۴۔ یہ کہ آپ کے اخبار میں شائع کردہ مواد بے بنیاد اور بلاجواز ہے۔ مؤکلم کی فیکٹری میں تیارہ کردہ گھی بالکل اُسی معیار کا ہے۔ جو معیار محکمہ صحت کی طرف سے اِس ضمن میں مقرر کیا ہُوا ہے۔ فیکٹری میں مستند کیمیائی ماہرین کام کرتے ہیں اور گھی کی تیاری میں جو عناصر مضر ہوتے ہیں تلف کئے جاتے ہیں اور اِس امر کی پوری احتیاط کی جاتی ہے کہ صارفین اِسے بلاخوف و خطر اِستعمال کر سکیں۔ اسی وجہ سے مؤکلم کا

تیار شدہ گھی صارفین کی نظر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مؤکلم کا برانڈ ایک معتبر نام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ مضمون کی اشاعت سے مؤکلم کے تیار کردہ گھی کے برانڈ کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

۵- یہ کہ مؤکلم کی ہدایت کے مطابق آپ اپنے اخبار میں اُسی قدرنمایاں شہ سُرخیوں کے ساتھ اپنے مذکورہ مضمون کے مندرجات کی تردید کریں اور مؤکلم سے معافی نامہ اندر سہ یوم شائع کریں ورنہ مؤکلم آپ کے خلاف دعویٰ برائے وصولی مبلغ بیس لاکھ بمع ہرجہ و خرچہ مقدمہ دائر کرے گا۔ میاں اِنتظار حسین۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ فین روڈ۔ لاہور۔"

اعجاز نے آنکھ کھولی تو سکینہ بولی، "ایک بندہ آیا بیٹھا ہے۔"

"کون ہے؟" اعجاز نے لیٹے لیٹے پُوچھا۔

"نام شمس بتاتا ہے۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں ہاں،" اعجاز نے کہا، "جانتا ہوں۔"

اعجاز باہر والے کمرے میں بیٹھے ہُوئے شمس سے علیک سلیک کر کے نہانے چلا گیا۔ سکینہ نے لسی کا گلاس شمس کے لئے باہر بھیجا۔ اعجاز نہا دھو کر ناشتہ کر رہا تھا کہ سکینہ نے پُوچھا، "کون ہے؟"

"اخبار کے دفتر کا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔"

"وہ اخبار جس میں تُمھارا نام آیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کچھ ملا ملایا بھی کہ نہیں؟"

"ملنا ملانا کیا ہے۔ نام مشہور ہو گیا ہے اور کیا چاہئے۔"

"نام سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو پہلے بھی تھا۔"

"اب سارے مُلک میں ہو گیا ہے۔"

"تو کیا ہُوا، کوئی وزیر تو نہیں بن جاؤ گے۔"
"خدا کا نام لے۔ وزیر بن گیا تو سب سے پہلے تجھے چھوڑ دوں گا،" اعجاز ہنس کر بولا۔
"روٹی اَور ہے؟"
"آٹا گوندھنے والا ہے۔"
"تو زیادہ گوندھا کرنا۔"
"لڑکے بڑے ہو گئے ہیں، اللہ کے فضل سے گھوڑوں کی طرح کھاتے ہیں۔ میرا اَندازہ کبھی غلط ہو جاتا ہے۔ اب پھر وہی کُت خانہ شُروع ہو گیا ہے؟"
"کونسا کُت خانہ؟"
"سویرے سویرے بندے بلانے آ جاتے ہیں۔ سارا سارا دن شہر میں گزارتے ہو۔ دو تین مہینے ہو گئے ہیں۔ نتیجہ کیا نِکلا، ایک اخبار میں نام آ گیا ہے۔"
"صرف نام نہیں، پورے چار صفحے میرے ہاتھ کے لکھے ہُوئے ہیں، سو دفعہ بتا چکا ہوں۔"
"تصویر تو کوئی نہیں آئی،" سکینہ نے کہا۔
"ہمارے اخبار میں تصویریں نہیں ہوتیں۔"
"اخبار کے دفتر میں عورتیں کام کرتی ہیں۔ مجھے خبر ہے۔ تم اُن کے پاس بیٹھے رہتے ہو؟"
"ہمارے اخبار میں عورتیں نہیں ہیں۔ صرف مرد ہیں۔"
"تمُہارا کیا پتا؟ نیچ ذات والیوں تک سے تو تمُہارا کوئی پرہیز نہیں۔ فیشنی عورتوں کو دیکھ کے پتا نہیں کیا کرتے ہو گے۔"
"تُو تو غیر متعلق باتیں کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔"
"غیر متلک نہیں، یہ متلک بات ہے۔ تمُہارا کیا پتا۔"
"تیرے کینے کی کوئی حد بھی ہے؟ اونٹ کا کینہ اَور ہاتھی کی یاداشت، تو جانوروں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ بڈھی ہو گئی ہے اَور مُڑ مُڑ کے وہی بات کرے جاتی ہے۔"
"تمُ بڑے جوان ہو۔" سکینہ نے کہا۔

"جوان ہوں،" اعجاز نے بدمزاجی سے جواب دیا۔ "سویرے سویرے مُنہ کا مزا
خراب کر دیتی ہے۔" دُوسری عورت کا تذکرہ اب سکینہ کے لئے محض چھیڑ چھاڑ کا
وسیلہ بن کر رہ گیا تھا۔ اُس کے چہرے پہ کوئی ناگواری نہ تھی، مگر وہ بولنے سے نہ
رُکتی تھی۔ اعجاز نے جلدی سے کپڑے بدلے اور شمس کو، جو بس پہ سوار ہو کر
گاؤں تک پہنچا تھا، موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر گھر سے روانہ ہو پڑا۔

"کیا معاملہ ہے؟" اُس نے موٹر سائیکل چلاتے ہُوئے پُوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ کل ایک دستی خط آیا تھا، سارا دِن بدی صاحب باہر ہی رہے۔
جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ صبح آپ کو بلا کر لے آؤں۔"

جب دونوں دفتر پہنچے تو بدیع الزمان کے پاس دو آدمی بیٹھے تھے۔ دونوں بدیع الزمان
کے ساتھ پُرجوش گفتگو میں مصروف تھے۔ اعجاز اور شمس کے داخل ہونے پر اُن کی
آوازیں دھیمی پڑ گئیں، گو باتوں کا جوش و خروش ویسا ہی رہا۔ بدیع الزمان نے علیک
سلیک کے بغیر ہی ایک کاغذ اپنے سامنے سے اُٹھا کر اعجاز کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ایک
نظر دیکھ کر ہی اعجاز کو پتا چل گیا کہ یہ "ولاپانے" کا نوٹس تھا۔ یونین کے کاموں میں
اکثر اُسے ایسے نوٹس وصول ہوتے رہے تھے۔ تحریر پڑھنے کے بعد اُس نے کاغذ میز
پہ رکھ دیا اور دو آدمیوں کے ساتھ والی کُرسی پر نشست سنبھال لی۔

"ہمارے پاس ثبوت ہیں،" بدیع الزمان کہہ رہا تھا۔ سکہ بند، مکمل۔ یہ،" اُس نے
چند کاغذ اُٹھا کر ہوا میں لہرائے۔ "ڈاکومنٹ پروف ہیں۔ انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔
کیوں ملک اعجاز؟" اعجاز کا نام سن کر دونوں آدمی متوجہ ہو گئے۔

"یہ ملک محمد اعجاز صاحب ہیں،" بدیع الزمان نے تعارف کراتے ہُوئے کہا۔ "یہ
رپورٹ کے رائیٹر ہیں۔" دونوں آدمیوں نے گہری شکی نظروں سے اعجاز کو دیکھا۔
وہ چپ بیٹھے رہے۔

"کیوں بھئی، کوئی عدالت ہمارے ڈاکومنٹس کو ماننے سے اِنکار کر سکتی ہے؟" بدیع
الزمان نے اعجاز سے پُوچھا۔

"میرے خیال میں تو ہمارا کیس ہر طرح سے مضبوط ہے،" اعجاز نے کہا۔

"یہی بات خواجہ صاحب بھی کہتے ہیں،" بدیع الزمان نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"خواجہ معراج دین، میرے لیگل ایڈوائیزر۔"

"دیکھ بھائی بدی،" دو آدمیوں میں سے ایک بولا، "اِن وکیلوں کے چکر میں آ کر بڑے لوگوں نے نقصان اٹھایا ہے۔ تجھے چاچے مسُود کا قصہ یاد نہیں رہا۔ اُس کی ساری جیداد وکیل کھا پی گئے تھے۔ یہ تیری میری وکالت کرتے ہیں، مگر اصل کے اندر ان کو صرف اَپنے پیسے سے مطلب ہوتا ہے۔"

"یہی تو ساری بات ہے،" بدیع الزمان نے دوبارہ زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ "خواجہ صاحب ایک پیسہ فیس نہیں لے رہے۔ مفت مقدمہ لڑیں گے۔ یہی تو ساری بات ہے۔"

"اور تو عدالتوں کو بھی نہیں جانتا،" دُوسرا آدمی بولا، "آج کل کے ججوں کا کوئی اِتبار نہیں۔ تو نے کوئی مکدما بھگتا ہے؟"

بدیع الزمان جزبز ہو کر چند لمحے تک دونوں کا مُنہ دیکھتا رہا۔ دونوں آدمیوں کی آپس میں مشابہت تھی۔ اُنھوں نے سفید لٹھے کی شلوار قمیض کے سوٹ پہن رکھے تھے، اور گو وہ کرسیوں پر آگے جھُک کر بیٹھے تھے، اُن کے پیٹ قمیضوں کے اندر سے نکلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے چہروں پہ موٹے موٹے گل تھے، اور مضبوط سیاہ بال تنگ ماتھوں پر ایک سیدھ میں نیچے تک اُگے ہُوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اعجاز نے اندازہ کیا کہ دکانوں سے اُٹھ کر آئے تھے۔

"ملک اعجاز صاحب ٹریڈیونین کے مشہور لیڈر رہ چکے ہیں،" بدیع الزمان نے کہا۔ "عدالتوں وغیرہ سے واقف ہیں۔"

"وہ اَور بات ہے،" پہلا آدمی جو مُستقل پان چبا رہا تھا، بولا، "ساری یونین کی سپوٹ ہوتی ہے۔ عدالتیں جلوسوں کا سامنا نہیں کرتیں۔ وہ اَور بات ہے۔"

"اور بات کیسے ہے؟ یہ بھی عوام کا معاملہ ہے۔ ہم مقدمہ لڑیں گے اَور پرچے میں اسے عوامی اِیشو بنا کر پیش کریں گے۔ شمس، چائے بنا۔ کیا مُنہ دیکھ رہا ہے۔ ہماری اخبار نویسوں کی بھی یونین ہے۔ میں اُس کا ممبر ہوں۔"

"بدی، بدی، تُو تو سادہ آدمی ہے۔ ایک دفعہ مُدما عدالت میں پہنچ گیا تو اخبار میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ یہ کانون کی بات ہے۔"

"قانون وانون کو چھوڑ یار سلیم۔ پریس آزاد ہے۔ بات کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ کیس کی بات کرنے کی ضرورت نہیں اَور کئی اینگل ہیں۔ ہم اشاروں اشاروں میں آخر اسے عوام کے حقوق کے تحفظ کا ایشو بنا سکتے ہیں۔ کیوں اعجاز؟"

اعجاز نے ہولے سے سَر ہلا دیا۔

"تو ضد کرتا ہے بدی،" دُوسرا آدمی اُکتائے ہُوئے لہجے میں بولا، "میری مان تو چپ کرکے اندر کے کسی ورقے پر تردید چھاپ دے۔ ملوں والے بھی بات بڑھانا نہیں چاہتے۔ بری خبر جتنی بھی چھوٹی ہو اچھی ہے' یہ اُن کی پالسی ہے۔ خاموش ہو جائیں گے۔ معاملہ ٹھپ کر دے۔ خواہ مخواہ پیسا برباد کرے گا۔"

"تجھے پیسے کی پڑی ہے' میری ساری زندگی کا یہ کام ہے۔"

"پیسا ہے تو زندگی بھی ہے ہی' پیسے کے بغیر زندگی کس کام کی۔"

"فکر نہ کرو وسیم بھائی' تیرا پیسہ کہیں نہیں جاتا۔ میں ذمہ دار ہوں،" بدیع الزمان نے کہا۔ دونوں آدمیوں نے چائے حلق میں اُنڈیلی اَور اُٹھ کر کسی سے بات کیے بغیر دفتر سے نِکل گئے۔

"کون تھے؟ اعجاز نے پُوچھا۔

"میرے قرض خواہ تھے' بھڑوے سالے۔"

"قرض خواہ؟"

"اِن ہی سے پیسا لے کر تو پرچہ چلایا تھا۔"

"تُمھارے رشتہ دار تھے؟"

"بتایا تو ہے۔ میرے سالے ہیں بھڑوے۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "کاروباری آدمی لگتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایک کا کپڑے کا کاروبار ہے' دُوسرے کا شیشے کا۔ پرچے میں دو ہی تو مفت میں اِشتہار چھپ رہے ہیں۔ ایک کپڑے کا' دُوسرا شیشے کا۔ بھئی میں اِن کو بلیم نہیں کرتا۔ کاروباری ہیں' پیسا اِن کا دین ہے۔ مذہبی آدمی ہیں' خدا کی راہ میں پیسا لگاتے ہیں' مگر کسی غریب کو دیتے ہیں تو کاپی میں لکھ لیتے ہیں۔ حج پہ جاتے ہیں تو پائی پائی کا حساب پہلے لگاتے ہیں' پھر واپس آکر اسے چیک کرتے ہیں۔ میں اِن سے

کہتا ہوں یہ کاپیاں اپنے ساتھ قبر میں لے جانا، فرشتے آنے پائیوں کے حساب میں ایسے پھنسیں گے کہ عذاب دُنیا بھول جائیں گے۔" بدیع الزمان ہنسا، پھر راز داری سے آگے جھک کر، آواز دھیمی کرکے بولا، "ایک دُوسری بات ہے، مانو یا نہ مانو، عزیزداری وغیرہ سب ٹھیک ہے، مگر اندر سے کاروباری طبقے کی ہمدردیاں ایک دُوسرے کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جب ایک پر وار ہوتا ہے تو دُوسرے کو فکر پڑ جاتی ہے کہ آگے اُس کی باری ہے۔ میں نے اِن کی جیب سے پیسا نکلوا تو لیا، نکلوانے کے لئے کیا کیا کب کرنے پڑے، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مگر اب انھیں جان کے لالے پڑے ہُوئے ہیں کہ اِن کا پیسا غرق ہو جائے گا۔ میری بیوی کی ناک میں دم کیا ہُوا ہے۔ اُس نے میرا ٹینٹوا دبایا ہُوا ہے۔ مگر میں بھی چھوڑنے والا نہیں۔ خواجہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اوپن اینڈ شٹ کیس ہے۔ عوام کا درد رکھنے والے آدمی ہیں، کوئی فیس نہیں لے رہے۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا تو کیس کا خرچہ بھی از میر والوں پر پڑ جائے گا۔ اَور جو پبلسٹی ہو گی وہ الگ۔ تم دیکھنا، ایک ایک اخبار اِس کی تفصیل لکھے گا۔ "بہ بانگ دُہل" اگلے پندرہ سال کے لئے اسٹیبلش ہو جائے گا۔ سرکولیشن فش!" بدیع الزمان نے ہاتھ سے ہوا میں آتشبازی چلائی، "فش! کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔۔۔۔"

آخر بدیع الزمان نے اپنے قرض خواہوں سے بغاوت کرکے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

باب 17

جب دُشمن ملک سے فوجیں واپس ہُوئیں اَور سرفراز نے ارضِ وطن پہ قدم رکھا تو گھر والوں سے ملنے ملانے کے لئے دو مہینے کی کمپلسری لیو ملی۔ گاؤں جانے سے پہلے سرفراز نسیمہ سے ملنے اُس کے باپ کے گھر پہنچا۔

بریگیڈیئر صاحب بلند بانگ مزاج اَور خشمناک مونچھیں رکھنے کے باوجُود سرفراز سے گلے ملتے ہُوئے آنکھیں پرنم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر نسیمہ اُس ہڈیوں کے ڈھانچے کو خاموشی سے آنکھیں کھولے دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو" بریگیڈیئر صاحب رومال سے آنکھیں خُشک کرکے گونجدار آواز میں بولے، "کھانے پکواؤ۔ چکن سوپ، بیف شوربہ۔ وی وِل فیٹن یو اِن نو ٹائم،" اُنھوں نے سرفراز کے کندے پہ ایک دھپ جمایا۔ سرفراز آہستہ سے مسکرایا۔

"پاپا۔۔۔" نسیمہ سرفراز پہ نظریں جمائے دُکھ سے بولی، "آپ کو سب پتا تھا؟"

"تو کیا میں تجھے سب حال بتا دیتا" کہ پی او ڈبلیو کو کیسے رکھا جاتا ہے، کیا کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ تم دِل کو روگ لگا کے بیٹھ جاتیں اَور اپنی صحت خراب کرلیتیں۔ ایک پالیسی کے انڈر سب کام کئے جاتے ہیں۔ کیوں بھئی سرفراز، میں نے کیا غلط کیا؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا سر۔"

"ناؤ ڈونٹ یو وری اباؤٹ اے تھنگ بوائے۔ اِیٹ اینڈ ریسٹ۔ اِیٹ اینڈ ریسٹ۔ لیمب چاپس اینڈ واٹ ناٹ۔ بیفور یو نو یو وِل بی آن یور فیٹ۔

"آئی ایم آن مائی فیٹ سر،" سرفراز نے ہنس کر کہا۔

"وِیل ڈن، ویل ڈن،" بریگیڈیئر صاجب نے آہستہ سے سرفراز کے کندھے پر ایک اور دھپ جمایا اَور فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہُوئے اُنہیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

نسیمہ اُن عورتوں میں سے نہ تھی جن سے کسی کمزوری کی توقع کی جاسکتی ہو۔ مگر اپنی حیرت پہ قابو پانا اُس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ دسمبر کی دُھوپ میں لان کے اندر وہ سرفراز کے سامنے والی کُرسی پر بیٹھی تھی۔ باپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھی اَور

پھولوں کی ایک کیاری پر نظر ڈال کر لوٹ آئی۔ واپسی پر وہ آ کر سرفراز کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اَور ڈرتے ڈرتے ہاتھ اُٹھا کر سرفراز کے سینے پر رکھا۔ سویٹر اَور قمیض کے نیچے سرفراز کی ہڈیوں پر اُس کا ہاتھ تھم تھم کے چلنے لگا، جیسے کسی خطرناک شے پہ پڑ رہا ہو۔ پسلیوں کے بیچ ہلکے ہلکے نشیب کو اُس کی اُنگلیوں کے پورے نرمی سے دبا کر محسوس کر رہے تھے، گویا جلد کی پائیداری کو پرکھ رہے ہوں۔ سرفراز کے جسم میں جھرجھری پیدا ہُوئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے دو سال نہیں بلکہ پچاس برس کے بعد ایک نرم ہاتھ اُس کے بدن پہ آ کر ٹھہرا تھا۔ ساتھ ہی، اُس کے ہاتھ میں جہاں اپنائیت کا لمس ہونا چاہیے تھا، وہاں اجنبیت کا احساس تھا۔

"تم نے اپنا پرفیوم نہیں بدلا" سرفراز نے کہا۔

"اونہوں" نسیمہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہُوئے سَر ہلا کر جواب دیا۔

یہ اجنبیت، سرفراز نے سوچا، نسیمہ کے ہاتھ کی ہے یا کہ میرے بدن کی؟

"سری" نسیمہ نے چھوٹی سی آواز میں پُوچھا، "کیا ہُوا تھا؟"

"سرفراز کوشش کر کے ہنسا۔ "جیسے تمھارے پاپا نے کہا، اِٹ واز نٹ اے فور سٹار ہوٹل۔"

"میری ایک دوست کے انکل بھی واپس آئے ہیں" نسیمہ بولی۔ "وہ ٹھیک ٹھاک دِکھائی دیتے ہیں۔"

"انھوں نے ڈاڑھی بڑھالی ہُوئی ہے اَور اُن کے ماتھے پہ بیضوی شکل کا سیاہ چٹاخ پڑا ہُوا ہے؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ہاں۔ تُمھیں کیسے پتا ہے؟ انھیں جانتے ہو؟"

"نہیں۔ مگر ایسے لوگ ٹھیک ٹھاک رہے ہیں۔"

"یعنی جو لوگ نمازیں پڑھنے اَور خدا کو یاد کرنے لگے تھے؟"

"ہاں۔"

"تم بھی تو ایسا کر سکتے تھے" نسیمہ نے کہا۔

"کر تو سکتا تھا" سرفراز نے کہا اَور خاموش رہا۔ نسیمہ اُسے نیم سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا "یاد ہے ایک دفعہ میں نے پُوچھا تھا کہ تم بار بار ہاتھ

اٹھا کر ماتھے سے بال کیوں پرے کرتی ہو؟"

"یاد ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ یہ تمھاری عادت ہے۔"

"ہاں۔"

"بس سمجھ لو کہ میری عادت نہیں بن سکی۔"

نسیمہ ہنسی۔ "یہ تو عجیب نیگیٹو دلیل ہے۔"

"ہماری زندگی ہی نیگیٹو تھی۔" سرفراز نے کہا۔ "اس کے علاوہ ہمیں فرصت ہی کہاں ملتی تھی؟"

"کیا کرنے سے؟"

"کھانے کے وقت کا اِنتظار کرنے سے۔"

"اچھا؟ کھانا کیا بہت اچھا ملتا تھا؟"

"دودھ، دہی، انڈے، مکھن، چکن بریانی۔"

"نہیں بھئی سچ سچ بتاؤ۔"

"کبھی کبھی دال روٹی مِل جاتی تھی۔ نو ٹیمب چانس اینڈ واٹ ناٹ۔"

دونوں نے ہنسنے کی سعی کی۔

"اور کیا کرتے رہتے تھے؟"

"باتیں۔"

"کیا باتیں؟"

"فرار کی سکیمیں بناتے رہتے تھے۔"

"ہائے، یہ تو بڑا رِسکی کام نہیں تھا؟"

"رِسکی تو تھا۔ مگر پی اور ڈبلیو کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جیسے وہ ملک کی حفاظت کے لئے جان لڑا دیتا ہے، اِسی طرح دُشمن کی قید سے نِکل بھاگنے کی حتی الوسع کوشش کرتا رہے خواہ اُسے موت کا سامنا کرنا پڑے۔ سروس کی عزت رکھنے کی خاطر یہ اُس کا فرض بھی ہے۔"

"اگر ناکام ہو جائے تو؟"

"تو اُسے سزا ملتی ہے۔"

"ظاہر ہے ناکام ہی ہو گئے ہو گے۔"

"ہاں۔"

"پھر تمہیں سزا ملی تھی؟"

"ملی تھی۔"

"ہائے۔ بتاؤ کیا ہُوا تھا؟"

"یہ لمبی کہانی ہے، پھر کبھی بتاؤں گا۔ سنو، میں بھی دراصل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ جھوٹ نہیں بول رہا۔ یہ میں نے بھیس بدلا ہُوا ہے۔"

دونوں ذرا کھل کر ہنسے۔ سرفراز نے نسیمہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ جیسے ہی اُس کی ہتھیلی کندھے سے مس ہُوئی، سرفراز کے اندر ایک ایسا ردِ عمل ہوا کہ وہ ہاتھ کھینچتے کھینچتے رہ گیا۔ ہاتھ کے نیچے اُس نے بے معلوم طور پہ نسیمہ کی جلد کو سکڑتے ہُوئے محسوس کیا۔ جب سے وہ کیمپ 98 سے آزاد ہو کر گھر کے راستے پہ چلا تھا اُس کے دِل میں سینکڑوں باتوں کا خیال آتا رہا تھا۔ یہ ایسے ہو گا، وہ وَیسے ہو گا، کہاں ہو گا، کیوں ہو گا، کیونکر ہو گا۔ اُس کے ذہن میں خیالات کی، وسوسوں اَور اندیشوں کی دوڑ لگی رہی تھی۔ آج جب وہ گھر پہنچ گیا تھا تو وہ سارے کے سارے معاملات نہایت صفائی کے ساتھ نِکل کر ایک طرف کو ہو گئے تھے۔ صرف ایک بات جس کا اُسے کبھی تردد نہ ہوا تھا، اس پہ آ کر وہ اٹک چکا تھا۔ اُس کے خواب و خیال میں کبھی نہ آیا تھا کہ اُس کے اَور نسیمہ کے درمیان بیگانگی کا بال تک بھی آ سکتا تھا۔ دُو سال کی دوری کے دوران نسیمہ کے تصور سے ہی اُس کی بوٹی بوٹی پھڑک اُٹھتی تھی۔ پھر ایکاایکی یہ کیا ہو گیا تھا؟ اب وہ نسیمہ سے چند انچ کے فاصلے پہ بیٹھا تھا، مگر یُوں جیسے میلوں دُور ہو۔ نسیمہ گو اُس کی آنکھوں کے قریب تھی مگر اُس کی نظر سے دُور ہو گئی تھی۔ آخر وہیں بیٹھے بیٹھے، چند سیکنڈ کے اندر اُسے احساس ہوا کہ انسانوں کے درمیان وقت کی، فاصلے کی اَور اکیلے پن کی اجنبیت کس درجہ آسانی سے حائل ہو جاتی تھی---- وہ تصور کہ سامنا ہوتے ہی دونوں ایک دُوسرے میں سما جائیں گے، کس قدر غلط ثابت ہوا تھا، کہ اب نئے سرے سے ایک دُوسرے کی قربت حاصل کرنے کی سعی درپیش تھی، گویا دونوں گو واقف کار ہوں مگر کچُھ دُور سے مِل رہے

ہوں اَور بیچ میں رکاوٹ کھڑی ہو۔ اِس وقت سرفراز میں اِتنی توانائی نہ تھی کہ اُس رکاوٹ کو عبور کرنے کی ہمت کرتا۔ اُس کا جی بڑے زور سے چاہنے لگا کہ کاش وہ دونوں تعلیم اَور ایک ذہن اَور ایک روح رکھنے والے اِنسان ہونے کی بجائے جنگل کے دو جانور ہوتے تو اِن رکاوٹوں سے شاید پالا نہ پڑتا۔

"شبو شام کو آئے گا" نسیمہ نے کہا۔ اُس کی آواز میں تناؤ تھا۔

"ہاں" سرفراز نے کہا "تمہارے ایک خط سے اُس کی تبدیلیوں کی خبر ملی تھی۔ پولیس کی نوکری اُسے کیسی لگی؟"

"خوش ہے" نسیمہ نے مختصراً کہا۔

"بریگیڈیئر صاحب نے وائیر پلنگ کی ہوگی۔"

"پاپا تو تمہیں پتا ہے اِن باتوں سے کتنا گھبراتے ہیں۔ مگر آخر میں اُنہیں اُٹھ کر لوگوں سے کہنا ہی پڑا۔"

"یہ آرڈر تو ٹاپ سے آیا ہوگا۔"

"ہاں۔ سی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔"

"ہوں ں ں!" سرفراز نے حیرت سے بھویں اُٹھا کر کہا۔

"یہ شاید زندگی میں پہلی بار اُنھوں نے کسی کی سفارش وغیرہ کا کام کیا ہے۔ پاپا کے کانٹکٹ تو اَیسے ہیں کہ چاہتے تو چار بزنسوں کے مالک ہو سکتے تھے۔ سب بڑے بڑے جنرل، کور کمانڈر وغیرہ اِن کے گروپ کے ہیں۔ انکل شبیر کو دیکھو، اِن کے ساتھ ہی ریٹائر ہُوئے تھے۔ اب آرمز ٹریڈنگ کر رہے ہیں۔"

"آرمز ٹریڈنگ؟"

"بالکل لیگل۔ آرمی کو سپلائی کرتے ہیں، مڈل مین کی حیثیت سے کمیشن لیتے ہیں۔ کروڑ پتی ہو گئے ہیں۔ پاپا تو اَپنے لئے کچھ کرتے ہی نہیں۔"

"بس ہنستے کھیلتے ہیں اَینڈ واٹ ناٹ۔"

"ڈونٹ میک فن آف مائی پاپا" نسیمہ مصنوعی غصّے سے بولی۔

اب دونوں کے درمیان تنی ہُوئی فضا قدرے ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔

"اور اَپنے شہر میں ہی اپوائنٹمنٹ بھی کرا لی۔" سرفراز نے کہا۔ "یہ کمال ہے۔"

"ایک سال تو سرحد میں شب قدر کوئی جگہ ہے وہاں پہ رہا۔" نسیمہ نے بتایا۔ "اب کہ کہلوا کر یہاں پہ آیا ہے۔"

"شرفی سے ملاقات ہوتی ہے؟"

"ملاقات!" نسیمہ طنز سے بولی۔ "وہ تو رہتا ہی یہاں ہے۔ اگست سے اُس کی پوسٹنگ کھاریاں میں ہو گئی ہے۔ ہر ویک اینڈ پر آ دھمکتا ہے۔ تمھیں تو چھٹی نہیں ملا کرتی تھی۔ شرفی کی حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں کو کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔"

"بکرے کو نہیں ہوتا۔" سرفراز نے ہنس کر کہا۔

"کیوں؟"

"بس، اپنا اپنا وطیرہ ہے۔ مجھے لگتا ہے میجر بن کر بیٹھا رہے گا۔ افسوس کی بات ہے۔ آدمی بڑا کھرا ہے۔ اُسے میرے آنے کی خبر ہے؟"

"خبر؟ تم تو جب انڈیا سے چلے ہو اُس وقت سے یہ لوگ تمھاری پراگریس کا گراف بنا رہے ہیں۔"

"پھر آیا کیوں نہیں؟"

"کہتا تھا دیر سے آؤں گا۔"

سرفراز نے نسیمہ کا چہرہ سُرخ ہوتا ہُوا دیکھا تو دفعتاً اُس کے فہم میں یہ بات آ گئی کہ سب لوگ اُن دونوں کو اکیلے میں ملنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ نسیمہ کی جانب پیش قدمی کے خیال سے سرفراز کے دِل میں ایک عجیب سے مزاحمت پیدا ہونے لگی---- ایک ہچکچاہٹ، ایک موہوم سا ڈر، کوئی نامعلوم سا خوف! وہ دو برس کا اشتیاق کہاں گیا؟ اُس نے سوچا؟ کیا بات کروں، اُس نے ذہن پر زور دے کر سوچا؟

"کیا بات ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہنہ؟" نسیمہ نے چونک کر پُوچھا۔

"کہ بکرا آئے گا؟"

"کہتا تو تھا۔" نسیمہ نے بے دِلی سے کہا۔

"سرفراز نے نسیمہ کے کندھے سے اپنا سہما ہُوا ہاتھ اُٹھا لیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سرفراز نے پُوچھا۔ "واک کے لئے چلتی ہو؟"

"کہاں؟"

"یہیں سڑک پہ۔"

نسیمہ نے اُس کی جانب مُنہ موڑ کر عجیب سی سُرخ سُرخ نظروں سے اُسے دیکھا جیسے پپوٹوں کے عقب میں آنسوؤں پر بند باندھ کے بیٹھی ہو۔

"چلو،" وہ بولی۔

سڑک کے کنارے خاموشی سے ٹہلتے ہُوئے دونوں کچھ دُور تک چلے گئے۔ پھر پلٹ آئے۔ "تُمہارے نوکری کیسی جا رہی ہے؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ٹھیک ہے۔"

"تُم پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں کر رہیں؟"

"کر رہی ہوں۔"

"ساتھ ساتھ پڑھاتی بھی ہو؟"

"ہاں---- سری؟"

"ہوں،" سرفراز نے مُنہ کھولے بغیر حلق سے آواز پیدا کی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تُم چپ ہو۔"

"چپ نہیں ہوں، باتیں کر رہا ہوں۔"

"مگر اُوپر اُوپر کی باتیں کر رہے ہو۔"

"بھئی ابھی ابھی تو آیا ہوں۔ تھوڑی دیر انتظار کرو تو بولنے لگوں گا۔"

"سری؟"

"ہوں۔"

"وہاں کیا ہُوا تھا، بتاتے کیوں نہیں؟"

"کیا بتاؤں؟"

"کھانے کو نہیں ملتا تھا؟"

"ملتا تھا۔"

"کیا کھاتے تھے؟"

"دال روٹی۔"

"ہر روز؟"

"ہفتے میں دو دن گوشت ملتا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"پھر تمھاری یہ صورت کیسے ہو گئی؟"

"جی نہیں لگتا تھا" سرفراز نے کہا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بتایا تو تھا۔"

"کب؟"

"خطوں میں۔"

"جھوٹ" نسیمہ نے ہولے سے چیخ کر کہا۔ "تم ہمیشہ لکھتے تھے کہ بالکل ٹھیک ہو، کوئی تکلیف نہیں، خُوب اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے۔"

"اگر لکھتا کہ جی نہیں لگتا تو تم کیا کر لیتیں؟"

"کم از کم حقیقت تو معلوم ہو جاتی۔"

"میں جہاں پہ تھا وہاں حقیقت موجُود نہیں تھی۔ میں تُمھیں تفصیل سے خط لکھتا رہا ہوں۔"

"کب؟"

"جھوٹ موٹ کے۔"

"جھوٹ موٹ کے کیسے؟"

"پنسل کا دُوسرا سرا ہوتا ہے نا، جس کا سکہ بند ہوتا ہے، اُس سے لکھتا تھا۔"

"ارے جاؤ، گپیں نہ ہانکو۔"

"سچ مچ۔ لفظوں کی شکل نہیں بنتی تھی، مگر اُن کا عکس کاغذ پہ موجُود ہوتا تھا۔ یہ وفاداری کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"
"جو عورتیں وفادار ہوتی ہیں وہ پڑھ لیتی ہے۔ جو بے وفا ہوتی ہیں، نہیں پڑھ سکتیں۔"
"اب تم نے فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔"
"تم ہی تو کہتی ہو کہ باتیں نہیں کرتا۔"
"ایسی باتیں کرنے کو نہیں کہتی۔ چلو بتاؤ، کیا لکھا کرتے تھے۔"
واپسی پر لان میں داخل ہو کر وہ کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ اب نسیمہ سرفراز کے سامنے ایک دوسری کرسی پر بیٹھی تھی۔
"بتاؤ ناء،" نسیمہ نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں پُر سکون سرور کی لہر تھی، جس سے اُس کے پپوٹے بھاری اَور لب نیم وا تھے، گویا جس کے جواب کی وہ طلبگار تھی اُس سے زیادہ اہم سوال اُس کے اَندر پوشیدہ ہو۔
سرفراز نے سَر اُٹھا کر دیکھا اَور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ سرفراز کے مقابل سب سے دُور والی کرسی پہ بیٹھی تھی اَور لمحے بھر کے لئے سرفراز کی نظر دھندلا گئی تھی۔ سرفراز کو اُس کے نقش و نگار صرف سرسری، مانُوس شکل و صورت میں ہی نظر آ رہے تھے، کوئی باریکی دِکھائی نہ دے رہی تھی۔ اُس نے کوشش کی کہ نسیمہ کے چہرے کو اپنی آنکھوں کے قریب لا کر دیکھے، مگر وہ اُسی جگہ پہ رہا جہاں پہ ٹھہرا تھا۔ اِن دونوں کے درمیان جو چند گز کا فاصلہ تھا وہ قابلِ حمل و نقل نہ رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟
اُس وقت سرفراز کو پہلی بار یقین کے ساتھ اِس بات کا علم ہوا کہ وہ اپنی نگاہ کی لچک کو کھو چکا تھا۔ وہ اہلیت جو بچپن سے ایک اچھوتے راز کی مانند اُس کے اَندر موجُود رہی تھی، اب غائب ہو چکی تھی۔ اب فاصلے مقرر اَور متعین تھے۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کب اَور کیسے اَور کس مقام پر اُس کی یہ قوت ختم ہُوئی تھی، مگر وہ اُس مقام کو سوچ کی گرفت میں نہ لا سکا۔ اب نسیمہ ایک نپے تلے فاصلے پر اپنا معمول کا ٹھوس وُجُود لئے بیٹھی تھی، جس کا سوال "بتاؤ ناء" سرفراز کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ مگر سرفراز کا ذہن اِس وقت کیمپ 98 سے دُور اُن مختلف کیفیات میں اُلجھا ہُوا تھا جن سے نسیمہ کے ہمراہ اُس کا گزر ہوا تھا۔ اول اول ایک دُوری کی، لاحاصل کشش، پھر محبوبہ، اُس کے بعد منگیتر، پھر دو برس کی

جدائی کے دوران دوبارہ ایک لاحاصل، تصوراتی محبوب، اور اب؟؟ ایک جسمانی کشش رکھنے والی، اِنتہائی ذہین، سیدھی، سادی عملی عورت تھی، جس کے اندر کسی تاریکی کسی خطرے، کسی بدعنوانی کا اِسرار نہ تھا اور وہ عورت سوال پُوچھ رہی تھی۔

یہ عورت، سرفراز نے سوچا جس کی اپنی حقیقت کے اندر اخلاص ہے، مجھ سے میری حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہے۔۔ میں اِس کو کیا بتاؤں؟ کیا میں اِسے بتاؤں کہ جب حقیقت بے اصل ہو گئی تھی اُس وقت میں وہاں پہ موجُود تھا؟ جب ایک یونیورسٹی ہوسٹل میں داخل ہو کر اٹھارہ استادوں اور طالبعلموں کا صفایا کر دیا گیا تھا تو میں وہاں پہ موجُود تھا؟ یہ عورت میری حقیقت کو کیسے جان سکتی ہے؟ ہاں، کچھ لطیفہ گوئی کی باتیں بتا دوں گا۔

"پھر بتاؤں گا" سرفراز نے کہا۔

"پھر، پھر، پھر! پھر کب بتاؤ گے؟"

"پھر کبھی۔۔۔۔"

نسیمہ خاموش ہو رہی۔

میری حقیقت، سرفراز نے سوچا، خُود مجھے معلوم نہیں۔ دو برس تک میرے دِل کا راز نسیمہ کا ہیولا تھا جو تصور میں اُجالے کی مانند پھیلا، زندہ رہنے کی قوت عطا کرتا رہا تھا۔ اب جو اُس کا بولتا چالتا ہُوا بدن میرے سامنے ہے تو اجالا ماند پڑ گیا ہے۔ یہ کیا ظلم ہے؟ دِل کی اِس وحشت کا کیا کروں؟؟

"ایک بات بتاؤں؟" نسیمہ نے کہا۔

"بتاؤ۔"

"مجُھے بتانی تو نہیں چاہیے۔"

"کیوں؟"

"میں نے رازداری کی قسم کھائی ہے۔ مجھے گناہ ہو گا۔"

"میں گناہ اپنے سَر لیتا ہوں۔"

"گناہ ٹرانسفر نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیسے؟"

"میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، تعمیل کرنا تمہارا فرض ہے۔"

"واہ، میں کوئی تمہاری سیکنڈ لفٹننٹ ہوں؟"

"تم میری اسسٹنٹ ہو۔"

"جاؤ جاؤ، میں کسی کی اسسٹنٹ نہیں ہوں۔"

"اچھا اب بتا بھی دو۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔"

"کیا؟"

"جو کچھ میں کہوں گی۔"

"پہلے بات تو بتاؤ۔"

"پہلے وعدہ کرو۔"

"ٹھیک ہے، وعدہ کرتا ہوں۔"

"شبو اَور شرفی اَور دُوسروں نے آج رات کو تمہارے لئے سرپرائز پارٹی رکھی ہے۔" الفاظ ہتھوڑے کی مانند سرفراز کے دماغ پہ لگے۔

"کیوں؟" بے اختیار ہو کر اُس نے پُوچھا۔

"کیوں کا کیا مطلب؟"

"کس لئے، کیوں؟"

"تمہارے آنے کی خُوشی میں، اَور کس لئے؟"

"خوشی میں؟ کیسی خُوشی میں؟ میں کوئی پارٹی وارٹی نہیں چاہتا۔"

نسیمہ متعجب ہو کر اُس کا مُنہ دیکھنے لگی۔ الفاظ جو سرفراز نے ادا کئے تھے بے ارادہ اُس کے مُنہ سے نِکل گئے تھے، مگر اُن کے اَندر سے ایک حقیقت برآمد ہُوئی تھی۔ "ویل ڈن!" بریگیڈیئر کرار کے یہ دو الفاظ سرفراز کے لاشعور کے کسی گوشے میں مُستقل کھٹکتے رہے تھے اَور اِس وقت وہ بے ساختہ الفاظ میں یُوں ظاہر ہُوئے تھے کہ اُسے بھونچکا کر گئے تھے۔ "ویل ڈن --- شاباش!" اب اُسے اِس حقیقت کا یہ علم ہوا کہ بریگیڈیئر صاحب کے اِن الفاظ کے جواب میں ایک خاموش چیخ --- "کیسی شاباش؟" --- گردش کرتی رہی تھی جس کے اظہار کی اُس میں اِستطاعت نہ تھی، مگر جو اَندر ہی اَندر

کانٹوں کی مانند اُس کی روح پہ خراشیں ڈالتی ہُوئی گھُوم رہی تھی اَور تھمنے میں نہ آتی تھی، جیسے کہ اُس کا خُون خراب ہو چُکا ہو۔

"تُم شام کو گاؤں جانے کا ارادہ کر رہے تھے،" نسیمہ آہستہ سے بولی، "اس لئے میں نے سوچا کہ بتا دوں۔ لالہ اعجاز شاید ابھی آئے، اُسے تُمھاری اِطلاع ہے۔ پارٹی وارٹی نہیں، بس تُمھارے دوست آ کر اِکٹھے ہوں گے۔"

اپنے آپ سے کچھ دیر جدوجہد کرنے کے بعد سرفراز اپنی حالت پہ قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتھ ہی معاملات کو سنبھالنے کی قدرتی خواہش اُس کے اَندر لوٹ آئی۔ اُسے اعجاز، سکینہ، حسن، حسین اَور اپنے گاؤں کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ اپنا گھر اُس کے تصور میں ایک ایسی پناہ گاہ کی صورت میں ابھر کر آیا جہاں اُس کے دِل کے رخنے پُر ہونے کا اِمکان موجُود تھا۔

وہ وہیں پہ بیٹھے تھے کہ اعجاز، حسن اَور حسین آ پہنچے۔ بھائی کو بازوں میں سمیٹ کر گلے لگاتے ہُوئے اعجاز کے آنسو بہنے لگے۔ باپ کی موت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سرفراز نے اعجاز کو روتے ہُوئے دیکھا تھا۔ اُس نے محسُوس کیا کہ جیسے اُس کا دِل پگھل کر بہنے لگا ہے۔ وہ دیر تک اعجاز کے سینے سے لگا آہستہ آہستہ کپکپاتا رہا۔ جب جدا ہُوا تو اُس کے دِل کو عجیب سی ڈھارس مِل چکی تھی۔ اُس نے لڑکوں کو بھی گلے لگا کر، دبا دبا کر پیار کیا۔ "یہ بچو نگڑے ہیں؟" اُس نے حیرت سے پُوچھا "یہ تو بڑے بڑے جوان نِکل آئے ہیں لالہ۔ اِن کا قد تو مجھ سے بھی اُوپر جا رہا ہے۔" لڑکے جو دُھلے سفید کپڑے اَور نئے جوتے پہن کر آئے تھے، شرما کر ہنستے رہے۔ کچھ دیر تک وہ مکمل خاموشی میں بیٹھے رہے، جیسے جذبات آڑے آ رہے ہوں۔ اِسی دوران میں سب کے لئے چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہُوئے اعجاز نے آہستہ آہستہ گھر کے حالات بتانے شرُوع کئے۔ سکینہ، چاچے احمد، عباس، جمیلہ، زمین مکان، فصل اَور کاروبار کا مختصر ذکر کرنے کے بعد اُس نے پُوچھا "گھر کب چل رہے ہو ـــ"

"صبح آ جاؤں گا" سرفراز نے جواب دیا۔

"تیری صحت اچھی نہیں،" اعجاز نے کہا، "چھٹی گھر میں گزار، کھلی ہوا میں رہ، بُوری نے کٹی دی ہے، دودھ مکھن وافر ہے، کھل کر کھا، تیری جان میں جان آئے۔ سـ

تیری راہ تک رہے ہیں۔"

"بُوری اَور کٹی بھی؟" سرفراز نے مذاقاً پُوچھا۔

"ہاں ہاں،" اعجاز نے ہنس کر جواب دیا۔

"کٹی بھی بُوری ہے؟"

"نہیں چاچا،" حسن بول پڑا، "کالی ہے۔"

بریگیڈئیر صاحب اندر سے نکل کر آئے۔ "اہا---- نیمس مین،" بریگیڈئیر صاحب نے نعرہ لگا کر ہاتھ ملایا۔

سرفراز نے سوالیہ نظروں سے پہلے بریگیڈئیر، پھر اعجاز کو دیکھا۔

"تمہیں بھائی نے نہیں بتایا؟" بریگیڈئیر صاحب نے سرفراز سے پُوچھا۔ "کیوں ملک؟ مجھے چھیمی نے بتایا تھا، میں نے خُود نہیں پڑھا۔ اِس کے پاس پیپر ہے۔ چھیمی، سرفراز کو پیپر نہیں دکھایا؟" وہ اعجاز کے کندھے پر تھپکی دے کر بولے، "فرسٹ کلاس ورک۔ کیپ اِٹ اپ۔" بریگیڈئیر صاحب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

سرفراز ناسمجھی سے باری باری سب کو دیکھ رہا تھا۔ آخر نسیمہ نے کہا، "لالہ جرنلسٹ بن گئے ہیں۔ ایک بڑا سکینڈل ایکسپوز کیا ہے۔ ایک وِیکلی جرنل میں پوری رپورٹ لکھی ہے۔"

"کب؟ کہاں؟ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"پرچہ میرے پاس پڑا ہے۔ پڑھ لینا۔"

"لالہ، تم نے بھی نہیں بتایا۔"

"ساری باتیں کیا ایک دم بتا دوں؟ اعجاز ہنس کر بولا۔ "گھر آؤ گے تو پھر کیا باتیں کریں گے؟"

"یس، یس،" بریگیڈئیر صاحب بولے، "کیپ سم بیک، کیپ سم بیک۔ گڈ پالیسی۔"

"چاچا، ابے کی تصویر بھی اخبار میں آئی تھی،" حسن بول اُٹھا۔

"اچھا؟ رپورٹ کے ساتھ؟"

"نہیں بھئی، نورپور کی لوکل اخبار نے خبر دے کر تصویر چھاپ دی تھی۔ میری

رپورٹ تو ایک نئے ہفتہ وار پرچے میں نکلی ہے۔"

نسیمہ اَور بریگیڈیئر کرار کے اِصرار کے باوجُود اعجاز کھانے کے لئے رُکنے پر راضی نہ ہوا۔ "پیچھے کام بہت ہے۔ میرا جانا ضروری ہے۔ کل تو تم آ ہی رہے ہو،" اُس نے سرفراز سے پُوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

اعجاز ایک بار پھر اُسے دیر تک سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ سرفراز نے محسُوس کیا کہ اُس کے اَور دُنیا کے درمیان جو فاصلہ حائل ہو گیا تھا وہ اعجاز کے سینے میں سمائے جاتا تھا۔ وہ بھی اعجاز کے سینے سے چمٹا کھڑا رہا۔

"ملک، تُمہارا گڑ روز کھاتا ہوں،" بریگیڈیئر کرار نے باآواز بلند کہا۔ "کسی اور کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ میرے ہاضمے کے لئے بہت مفید ہے۔"

"ہماری خُوش قسمتی ہے بریگیڈیئر صاحب،" اعجاز نے کہا۔ "آپ کا سرٹیفیکٹ مل جائے تو اور کیا چاہیے۔"

"مل گیا، مل گیا" بریگیڈیئر صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "تھینک یو، اِیئی وے۔"

دونوں لڑکے شلواروں کے پائینچے اُٹھ کر اعجاز کے پیچھے موٹر سائیکل پر اٹک گئے۔ پھر اعجاز ہاتھ ہلا کر وہاں سے رُخصت ہُوا۔ اُس کے جاتے ہی اعجاز نے نسیمہ سے "بہ بانگ دُہل" کا پرچہ لیا اَور ایک ہی نظر میں اعجاز کی رپورٹ پڑھ ڈالی۔ جب اعجاز کی سکول ماسٹری چھوٹی تھی اُس وقت سرفراز بہت چھوٹا تھا۔ اُس کے بعد اعجاز لیبر یونین کے کاموں میں مصروف ہو گیا، اَور گو سرفراز نے لڑکپن میں اُس کی ایک آدھ تقریر سنی تھی، مگر اعجاز کے قلم کی تحریر پڑھنے کا اُسے پہلی بار موقع ملا۔ سرفراز کا سینہ فخر سے پُھول گیا۔

رات کو سرفراز کے دوست جمع ہُوئے۔ شعیب، شرفی، آصف، برکی، ظفر چوہدری، اور سلطان۔ سلطان کو آزادی سے دو ماہ پہلے کسی وجہ سے دُوسرے "کیج" میں منتقل کر دیا گیا تھا اَور وہ اُس پہلے گروپ میں شامل تھا جو نومبر میں وطن واپس پہنچا تھا۔ سلطان سرفراز سے بیس پچیس روز پہلے لوٹا تھا اَور کھاریاں کے قریب اپنے گاؤں میں چھٹیاں گزُار رہا تھا۔ سلطان سے اگرچہ لوگ اب قدرے خائف رہنے لگے تھے، مگر وہ سرفراز کے علاوہ اُن کے گروپ کا واحد آدمی تھا جو پی۔ او۔ ڈبلیو رہ چکا تھا، چنانچہ اِس موقعہ

پر اُسے الگ رکھنا ممکن نہ تھا۔ آج رات کی مجلس میں اِن دوستوں کی معمول کی سرمستیاں نہ تھیں، یہاں تک کہ شرفی بھی دبا دبا تھا۔ کسی غم دُکھ کا اِظہار نہ تھا، مگر سب پر گویا متانت کی چادر پڑی تھی جیسے کسی عمر رسیدہ شخص کی موت پر ہوتی ہے۔ بیچ بیچ میں کوئی نیم مزاحیہ سی بات ہو جاتی، جس پہ ہلکی سی خُوشدلی کی لہر اُٹھتی، پھر خاموشی چھا جاتی۔ سب اپنے گلاسوں اَور سگریٹوں کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ سنگترے کے رس سے بھرے جگ میزوں پہ رکھے تھے۔ اِس مجلس کے لوگ پہلے جنگی قید سے لوٹنے والے ایک دو افسروں سے مِل چکے تھے، جن میں سلطان اُن سے قریب ترین تھا، مگر کسی کے ساتھ بھی اُن کا تعلق اَیسا نہ تھا جیسا سرفراز کے ساتھ تھا۔ بریگیڈیئر صاحب بھی جنہیں ڈھنگ سے بیٹھ کر سرفراز سے بات کرنے کا موقع نہ ملا تھا، خلاف معمول آس پاس منڈلا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ کُرسی آگے کھینچ کر بیٹھ گئے۔

سرفراز کے ذہن کی لہر ایک آدھ چھلا کا مار کر دب گئی تھی اَور اُس کے دِل کی کثافت کافی حد تک دُور ہو چکی تھی، مگر اِس وقت وہ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کے ساتھی اُس کی طویل قید کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اُن کی توقعات کا بوجھ سرفراز پہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر نسیمہ تھی، جس کی سوالیہ نظریں سرفراز کے دماغ میں چھید کر رہی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ کوئی اُس سے سیدھا سوال نہ کر رہا تھا، جیسے اُن کو سرفراز کے بارے میں کسی بات کا اندیشہ ہو۔ کئی بار سرفراز نے بات شروع کرنے کی سعی کی، پھر رُک گیا۔ آخر ایک موقعے پر کسی کی بات پہ ہنستے ہُوئے اچانک اُس نے محسُوس کیا کہ اُس کے اندر کا بند ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ وہ ماحول کی خُوشدلی پہ یُوں جھپٹا جیسے ہاتھ سے نِکل گئی تو پھر قابو میں نہ آئے گی۔

"چلیئے آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔"

"ہاں ہاں،" دو تین آوازیں ایک ساتھ اُٹھیں۔

"یہ ایک نُماز کا قصہ ہے۔" وہ سلطان کی جانب دیکھ کر بولا، "تُم نے اِن کو سُنا تو نہیں دیا؟"

"بھئی سلطان تو فلسفی ہو گیا ہے،" ظفر چوہدری نے کہا۔ "سوچتا زیادہ ہے، بولتا کم ہے۔"

"دِس اِز ناٹ فیئر" آصف بولا۔ "ایسکیپ کی کہانی سلطان نے ہی بتائی ہے۔"

"یس" برکی نے سرفراز کو مخاطب کر کے کہا۔ "گریٹ جاب۔ جسٹ اَن فورچونیٹ۔"

سرفراز نے ہونٹ دبا کر ہولے سے اِثبات میں سَر ہلایا۔

"بلڈی اِنفار مرز" سلطان نے دبے ہُوئے غصّے سے کہا۔

سلطان کے تیور دیکھ کر آصف نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ شرفی نے کوئی بات شرُوع کی تو دو تین جانب سے "شش" کی آواز اُٹھی۔

"رولڈ گولڈ کی بات سنو یار" برکی نے کہا۔

"ٹماٹر" آصف گولڈ چلایا۔ "ٹماٹر سٹوری۔"

"یس یس" سب بہ یک آواز بولے۔ "وی وانٹ ٹوماٹو سٹوری۔"

"آل رائٹ، آل رائٹ" سرفراز نے کہا۔ "یہ ایک ایسے ٹماٹر کی سٹوری ہے جس کو کوئی چکھ نہ سکا۔"

"کیوں؟"

"وہ پودے پہ لگا لگا غائب ہو گیا۔"

"غائب ہو گیا؟"

"ہاں" سرفراز نے کہا۔ "جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔"

"اُسے کوئی بکرا کھا گیا ہو گا" ظفر چوہدری بولا۔

"شرفی تو اِدھر ہی رہ گیا تھا بھئی" شعیب نے کہا۔ "چلا جاتا تو اَور کیا چاہیے تھا۔ چھٹکارا ہو جاتا۔"

"ہاں ہاں۔ جی ایچ کیو سے ریکویسٹ بھیج دی جاتی کہ اِسے وہیں پر رکھ لو، باقیوں کو بھیج دو۔"

"سائلینس" برکی ہاتھ بلند کر کے بولا۔ "رائٹ، لیٹ اَس گیٹ آن وِد دی ٹوماٹو۔"

"وہ ٹماٹر کوئی جن ہو گا" شرفی نے کہا۔

"بی کوائیٹ شرفی" شعیب نے سختی سے کہا۔ پھر وہ سرفراز سے مخاطب ہُوا۔

"رائٹ دی نومائنو۔"

مجلس پہ خوشگواری کا ایسا موڈ طاری تھا کہ سب لوگ بے اختیار بولے جا رہے تھے۔ وقتی طور پہ انہیں سرفراز کی بات سننے سے بھی سروکار نہ رہا تھا۔ ماحول کا تناؤ ختم ہوا تو ذہن اور دہن ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ لوگ جو باتیں کئے جا رہے تھے اور دُوسرے جو انہیں چپ کرا رہے تھے، اُن دونوں کا شور یکساں تھا۔ سلطان بھی اب مسکرا رہا تھا۔ صرف بریگیڈیئر صاحب اور نسیمہ خاموش تھے۔ بریگیڈیئر صاحب اِس سارے منظر سے محظوظ ہو رہے تھے، جبکہ نسیمہ چہرے پہ ہلکی سی بیزاری اور بیتابی کے آثار لئے ٹک ٹک سب کا مُنہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں بار بار سرفراز پہ جاتیں، جیسے وہ اُس کو بات کرنے پہ اُکسا رہی ہو۔ مگر سرفراز اُس رو میں اب تن آسانی سے بیٹھا بیچ بیچ میں سب کے ساتھ بات لگا رہا تھا۔ آخر چند منٹ کے اضطراب کے بعد سب اطمینان سے خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

"چلو بتاؤ،" نسیمہ نے سرفراز سے کہا۔

"اپنے اپنے ایک سو دس روپے میں سے پیسے بچا کر لوگوں نے گارڈ کے ذریعے پھولوں اور دو ایک سبزیوں کے ذرا ذرا سے بیج حاصل کئے۔ ایک مٹر کے کے تھے، کیوں سلطان، وہ جس پودے پہ ایک مٹر بھی نمودار نہ ہوا تھا؟"

سلطان نے لاتعلقی سے اِثبات میں سَر ہلایا، گویا اُسے اِن تفصیلات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ "اور ایک بیج،" سرفراز نے کہا، "بھلا کس کا تھا؟"

"ٹماٹر،" ایک نعرہ بلند ہُوا۔

"رائٹ۔ ٹماٹر کے پودے نِکلے مگر سب مر گئے۔"

"ہاآآآ۔۔۔۔" سوگواری کا نعرہ لگا۔

"سوائے ایک کے،" سرفراز فاتحانہ انداز میں بولا۔

"اوہ ہ ہ!" سامعین سے گہرے اطمینان کی سانس نکلی۔

"وہ ایک پودا ایسا اُگا، ایسا اُگا کہ سَر سے نکلنے لگا۔ مگر۔۔۔" سرفراز رُکا۔

"مگر کیا؟" نسیمہ نے پُوچھا۔

"مگر ٹماٹر کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ ہم لوگ جو دال میں ٹماٹر ملا کر کھانے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے اور اپنے خوابوں میں ٹماٹروں سے لدے ہُوئے پودے دیکھا کرتے

تھے، روز بروز مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ گارڈز نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا، پھولوں کے اصلی اور سبزیوں کے بانجھ بیج لا دیئے تھے۔"

"ہائے بے ایمان،" نسیمہ نے کہا۔

سرفراز اب پورے اعتماد کے ساتھ ایک مکمل قصہ گو کی مانند کرسی پہ جم کر بیٹھا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ "پیشتر اس کے ہم بالکل ہی اُمید کھو دیتے، ایک روز صبح سویرے شور ہوا کہ پودے کو ایک ٹماٹر لگا ہے----"

"براوو۔" سب نے ایک ساتھ پکار کر کہا۔

جیسے جیسے سرفراز ٹماٹر اور میجر صدیق کا واقعہ سناتا جاتا تھا، قہقہے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ سرفراز کو ایک عرصے کے بعد ایسے سامعین میسر آئے تھے جو اُس کے ایک ایک لفظ کو اُٹھا رہے تھے۔ یہ موافق ماحول اُس کی رگ رگ میں سرائیت کر رہا تھا اور بدن کی اتنی طویل خشک سالی کے بعد دوستوں کی ایسی گرمجوشی سے نکلنے کو اُس کے حواس راضی نہ ہو پا رہے تھے۔ چنانچہ میجر صدیق اور ٹماٹر کا قصہ ختم کرنے کے ساتھ ہی سرفراز نے اِس چڑیا کی بات شروع کر دی جو قسمت کی ماری پنکھے کے پروں میں اُلجھ کر کمرے کے باسیوں کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھی تھی۔ قہقہوں کے شور میں سرفراز نے چڑیا کی کہانی مکمل کی ہی تھی کہ اُس انڈے کے بیان کی ابتداء کر دی جسے کمال ہوشیاری سے حاصل کرنے کے بعد اُس کی دعوت اُڑائی گئی تھی۔ ساری مجلس ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ صرف بریگیڈیئر صاحب کے مشہورِ عام قہقہے سنائی نہ دے رہے تھے۔ وہ محفل میں برابر شریک تھے، مگر خلافِ معمول ضبط کی کیفیت میں تھے۔

سرفراز دم لینے کو رُکا تو کچھ دیر کو خاموشی ہو گئی۔ اُس وقت تقریباً سب کو ایک ایسی بات کا احساس ہوا جو سب کے دِل کے اندر پوشیدہ تھی اور خُوش وقتی کے زیرِ زیر دبائی جاتی رہی تھی۔ سرفراز کو احساس تھا کہ اُس کے دوستوں کو اُس کی قید کے قصوں سے اِتنی دلچسپی نہ تھی جتنی اُس کی ذہنی حالت سے تھی، اور اُن کی بیشتر خوشی کا اظہار یہ جان کر ہو رہا تھا کہ سرفراز قید کاٹ کر کم و بیش نارمل حالت میں واپس آیا تھا۔ دُوسرے لوگوں کے اندر ایک دبا دبا احساس یہ تھا کہ وہ آخر کس بات پہ ہنس رہے تھے؟ قیدیوں کی کس مپرسی کی داستان پہ، یا کہ سرفراز کی باتوں کی مضحکہ خیزی پہ؟ اسی کے ساتھ ملا ہُوا اُن کے دِل

میں ایک تاثر ندامت کا بھی تھا، کہ وہ اِس جاں گسل تجربے میں شریک نہ ہُوئے تھے، دُوسروں کو آگے کر کے وہ خُود پیچھے رہ گئے تھے۔ اِس بے معلوم شرم کی مہین جھلی سارے ماحول پہ تنی تھی، جیسے وہ معمولات کے اندر گم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِس بات کا اِدراک سرفراز کو اپنی سرزمین پہ قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا کہ ماضی کے حالات نے، ان کی کارکردگی اَور دُشمن کی کارگزاری نے اُس کے دوستوں، اُس کے جانے اَور انجانے ساتھیوں کی طبیعتوں کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ اُن کے شعور کا تانا بانا شدید دباؤ کے اندر تھا اَور اُسے بکھرنے سے بچانے کو اُن سب کے دِل اَور دماغ ایک خاموش، ان دیکھا واویلا کر رہے تھے۔ سرفراز کے دِل میں ایک اندیشہ راہ پا گیا تھا۔

جب ملازم نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی تو نسیمہ اُٹھنے کی تیاری میں آخری بات کے طور پہ سادگی سے بولی، کیا ہی اچھا ہوتا اگر ایسکیپ پلان کامیاب ہو جاتی۔"

"یس،" کسی نے کہا۔ "وونٹ اِٹ بی نائیس؟"

"بلڈی اِنفارمرز،" سلطان غصّے سے بولا۔"

"ٹیک اِٹ ایزی اولڈ مین،" شعیب نے کہا۔"

"واٹ ڈو یو مین ٹیک اِٹ ایزی۔ یو ور ناٹ دیئر۔"

"دِس از ناٹ فیئر، سلطان،" برکی نے کہا۔

"آئی ایم سوری،" بلطان نے کہا۔ آئی مین کہ ٹریٹرز کی ہمارے ہاں کبھی بھی کمی نہیں رہی۔"

"اووو۔۔۔۔" دو تین آوازوں نے ناگواری کا اِظہار کیا۔

"آپ کو پتا ہے،" سلطان بولا۔ "کہ سکسٹی فائیو کی وار کے بعد جو جنرل ریٹائر ہُوئے تھے انھوں نے نوکریوں کے لئے درخواستیں دی تھیں؟ کیا آج آپ اِس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ کوئی ریٹائیرڈ جنرل کسی بیوروکریٹ یا سیٹھ کے سامنے جاب اِنٹرویو کے لئے بیٹھا ہو گا؟ انھیں سب کچھ دے دِلا کر کرپٹ کر دیا گیا ہے۔"

محفل پہ یکدم خاموشی چھا گئی۔ نوجوانوں نے سب سے پہلے بریگیڈیئر کرار کی جانب، پھر نسیمہ اَور اُس کے بعد سرفراز کی جانب دیکھا۔ حیرت انگیز طور پہ، بریگیڈیئر صاحب کی طرف سے کوئی متوقع ردِ عمل ظاہر نہ ہُوا۔ وہ کرسی کے بازوؤں پہ ہاتھ رکھے،

ذرا سا جھک کر بیٹھے اپنے پاؤں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ چند لحظے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد انھوں نے تاسف سے دوبار دائیں بائیں سر ہلایا، پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور مڑ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ اُن کے ساتھ ہی نسیمہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بھئی کھانا لگ گیا ہے،" وہ ہولے سے بولی۔

سب لوگ ڈرائینگ روم سے اٹھ کر کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ میز کے گرد بیٹھ کر سب نے خاموشی میں کھانا کھایا۔ بریگیڈیر صاحب نے سوپ کے ساتھ چند خشک بسکٹ کھائے اور معذرت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی جوان لوگوں کا ساتھ دینے کا اپنے میں دم نہیں رہا۔" انھوں نے پہلی بار ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں تو سونے چلا۔"

"قہوہ؟ کافی؟" نسیمہ نے پوچھا۔

"قہوہ۔"

قہوے کی پیالیوں کے ساتھ سگریٹ سلگائے گئے اور ہولے ہولے باتیں شروع ہوئیں، جو جلد ہی ختم ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سب لوگ جذباتی طور پر تھک چکے ہوں۔ پھر برآمدے میں رک کر کچھ دیر تک مختصر گفتگو ہوئی اور ایک ایک کر کے سب نے جانے کی اجازت چاہی۔ رخصت کے وقت گرمجوشی اور ہنسی کی ہلکی سی لہر پیدا ہوئی۔ "آئی ایم سوری، شعیب،" سلطان نے کہا۔ "آئی شڈنٹ ہیو سیڈ دیٹ۔ اِٹ واز اَن فیئر۔"

"ٹیک اِٹ ایزی اولڈ مین،" شعیب نے اپنا جملہ دہرایا۔

دونوں ہنس پڑے۔

پھر سرفراز، شعیب اور نسیمہ اکیلے رہ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، کوئی بات کرنے کا ارادہ کیا، پھر شعیب نے خاموشی سے ہنس کر سر دائیں اور بائیں کو ہلایا، جیسے محفل کی کارروائی پہ متحیر ہو رہا ہو، اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سرفراز اور نسیمہ برآمدے میں رک کے باہر رات کی تاریکی میں دیکھتے رہے۔ "سری،" پھر نسیمہ بولی۔ "تم نے مجھے خط میں لکھا تھا؟"

"کیا؟"

"یہ سب کچھ جو تم نے بتایا ہے؟"

"ہاں۔"

"چین کے اُلٹے سرے سے؟"

"ہاں۔"

"سچ؟"

"سچ نہیں تو کیا جھوٹ؟"

"لفظ کیسے دکھائی دیتے تھے؟"

"جہاں پہ ہم تھے وہاں دکھائی دیتے تھے۔ وہاں مجھے تم بھی دکھائی دیتی تھیں۔"

"جاؤ، میں نہیں مانتی۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیسے؟"

"کیا مطلب؟"

"تم مجھے کس شکل میں دیکھتے تھے؟"

"میں تمھیں اپنے لان کی ایک کیاری میں گوڈی کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔"

"اور؟"

"تم پاؤں کے بل بیٹھی ہوتی تھیں اور تمہارے نیچے کھمبیاں اُگ رہی ہوتی تھیں،" سرفراز شرارت سے بولا۔

نسیمہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "جھوٹ،" وہ بولی اور منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر سرفراز کا خیال اِس وقت نسیمہ سے اور اِن باتوں سے دُور تھا۔ اُسے رہ رہ کے سوچ آ رہی تھی کہ شاید سلطان کا خُون بھی خراب ہو چُکا تھا۔ اُس کے دِل میں اِس وقت سلطان کے لئے، اپنے لئے، اور دُوسرے کئی ساتھیوں کے لئے جنہیں وہ جانتا بھی نہ تھا، گہرے رنج کا احساس تھا۔

ملک جہانگیر اپنی بات کا پکا نکلا۔ اُس نے اپنے ڈیرے پر شامیانہ نصب کروا کر چاروں طرف دو دو سو پاور کے بلب لگائے تھے جن کی روشنی میں رات کے اندر دن چڑھا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ دیسی بکرے ذبح کروا کر گوشت والے چاولوں کی دیگیں چڑھائی گئی تھیں جن کی خُوشبو دُور سے سونگھی جا سکتی تھی۔ ڈیرے کی چار دیواری کے باہر کئی چوڑی چوڑی چارپائیاں بچھی تھیں جن پر ڈھول باجے والے اور گاؤں بھر کے کمی کمین بیٹھے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ ایک دیوار کی اوٹ میں دم پخت دیگیں، اینٹوں کے سہارے پہ کھڑی، جھلملاتے ہُوئے گرم کوئلوں کی حدت میں اندر ہی اندر پک رہی تھیں۔ اُن کے مُنہ پہ رکھی کنالیاں معائینے کی خاطر ایک لحظے کو اُٹھائی جاتیں تو لونگ اور دار چینی ملی باسمتی کی خُوشبودار بھاپ کے بھبکے خارج ہوتے جو پکانے والے نائیوں کے چہروں پہ یُوں حملہ آور ہوتے جیسے اژدہوں کی آتشیں سانسیں، اُن کے سامنے پسینے اور طمانیت سے دمکتے ہوئے چہرے یکدم پیچھے کو جھٹک جاتے، جیسے کسی نے ٹھوڑی کے نیچے اچانک گھونسہ جما دیا ہو۔ پکانے والے بھاپ سے بچنے کے لئے آنکھیں سکیڑے، کمر ٹیڑھی کرکے، کفگیر کی مدد سے چاولوں کے چند دانے نکالتے، اُن کو اُنگلیوں میں مسل کر دیکھتے، اور کنالیوں کو واپس دیگوں کے مُنہ پہ رکھ کر دوبارہ اُنہیں دم پر لگا دیتے۔ ڈیرے کے احاطے میں شامیانے کے نیچے پچیس تیس کُرسیاں رکھی تھیں جن میں سے چند ایک پہ کچھ ادھیڑ عمر، خُوش لباس، مرد بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے سروں پہ کلاہ اور شملا والی کلف لگی پگڑیاں اور قراقلی کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ یہ گاؤں اور نواح کے معززین تھے جن میں زیادہ تر اعوان برادری کے لوگ تھے۔ باقی کی کُرسیوں پہ چھوٹے بڑے بچے، شوخ رنگ کپڑے پہنے، کود پھاند کر رہے تھے۔ کُرسیوں کے آگے زمین پر دریاں بچھی تھیں، جن پہ سفید تہمدوں اور بڑی بڑی بلدار پگڑیوں والے کسان اور چھوٹے زمیندار، دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے حقوں کے کش لگا رہے تھے۔ کام کاج کرنے والے اُن کے درمیان، اندر اور باہر آ جا رہے تھے۔ ایک کونے میں جلتے ہُوئے اُپلوں کا ڈھیر، راکھ کی تہہ کے اندر اپنی آگ کو پیٹ میں بھرے آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے زمیندار کے ساتھ اُن کے اپنے اپنے کمی تھے جن کو وہ تہمدوں کی ڈب سے اپنا پسندیدہ تمباکو نکال کر دیتے۔ کمی تمباکو کو ہتھیلیوں میں مل مل کر تیار کرتے اور بجھتی ہُوئی چلموں کو اُپلوں کے ڈھیر تک لے جاتے۔ وہاں پہ وہ

ایک کونے پہ پھونک کر راکھ کی تہہ کو اُڑاتے اور ننگے ہاتھوں سے دھکتے ہوئے اُپلے کو چلم پر جما دیتے تھے۔ تازہ چلم کا کش لگانے والے کے حلق میں کھانسی کا گہرا مگر مختصر دورہ اُٹھتا اور دوسرے تعریفانہ نظروں سے اُسے دیکھتے۔

"چوہدری کا تماکو علاقے میں نمبر ایک پر ہے،" کوئی کہتا۔

"زمین کی خصلت ہے بھائی،" دُوسرا بولتا۔

"ٹھیک ہے، زمین کی لیاکت اپنی جگہ پر، پر بی بھی تو نیاب ہے۔"

"ساری مقدر کی بات ہے جی۔ نہ زمین نہ پانی نہ بی۔ مقدر ساتھ نہ دے تو تگڑی سے تگڑی زمین بی مار دیتی ہے۔"

"بس یہ اصل بات کی ہے تو نے ملک، سارا کسمت کا کھیل ہے۔ یاد نہیں ملک الہ یار نے پشور سے مٹی کے ٹرک اور بی منگایا تھا؟ پر اُس کی کسمت اُس کے ساتھ نہیں چلی۔" ایک کے بعد ایک بات کو چلائے جاتا اور دُنیا بھر کے تمباکوؤں کی قسمیں، اُن کے بیجوں، بھاؤ اور علاقوں کی مٹی تک کا ذکر ہوتا۔ جو کچھ کسی کے علم میں ہوتا وہ بتائے جاتا۔

ملک جہانگیر نے قریب قریب ساری اعوان برادری اور سرفراز کے آدھے گاؤں کو مدعو کیا تھا۔ لوگ آتے جا رہے تھے۔ جو آتا وہ اپنے جاننے والوں سے حسب تعلق مصافحہ کرتا یا بغل گیر ہوتا، پھر چاروں جانب نظر دوڑا کر اپنی مرضی کی جگہ پر جا بیٹھتا۔ احاطے کے دروازے کے اندر سب سے پہلے ایک بید کے بنے ہوئے صوفے پر، جس پہ مخملیں گدیاں رکھی تھیں، جہانگیر بیٹھا تھا۔ اپنی کمزوری کے پیش نظر وہ ہر آنے والے سے بیٹھا بیٹھا آگے جھک کر مصافحہ کرتا اور ہاتھ کے اِشارے سے پنڈال میں بیٹھنے کی دعوت دیتا۔ کئی لوگ اُس کے پاس چند منٹ رُک کر حال احوال پُوچھتے اور آگے چلے جاتے۔ اُس سے چند قدم کے فاصلے پر عالمگیر سفید شلوار قمیض اور سیاہ شیروانی پہنے کرسی پہ بیٹھا تھا۔ وہ ہر نئے آنے والے سے اُٹھ کر ملتا، حال پُوچھا اور ساتھ چل کر جائے نشست تک پہنچاتا۔ مجمعے میں لوگوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ کہیں کہیں پہ کسی وقت کوئی متنازعہ مسئلہ چھڑ جاتا تو آوازیں بلند ہو جاتیں اور لوگ لحظہ بھر کو سر موڑ کر اُس طرف دیکھنے لگتے۔ آوازیں دبنے لگتیں تو سب اپنی اپنی باتوں میں دوبارہ مشغول ہو جاتے۔ شادی بیاہ کا سا سماں تھا۔ مدعوئین میں صرف اعجاز کے کنبے کی عورتوں کو دعوت دی گئی تھی۔ ڈیرے سے کچھ فاصلے پر گھر تھا،

جہاں عورتوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

سرفراز پانچ چھ روز سے گھر پہ تھا۔ چاچا احمد، ماسی اَور جمیلہ بھی آ پہنچے تھے۔ جمیلہ کی منگنی پانچ سال پہلے بیاسی کے راٹھوروں میں ہُوئی تھی اَور چند ماہ کے اندر شادی ہونے والی تھی کہ لڑکا مقامی جھگڑوں میں اُلجھ کر پہلے قید میں چلا گیا، جب دو برس بھگت کے آیا تو قتل ہو گیا تھا۔ تین سال مزید گزُر گئے۔ جمیلہ چوبیس برس کی ہونے کو آئی تھی، مگر کوئی مناسب رشتہ دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب جا کر دوبارہ اُس کی شادی کی بات چل چکی تھی۔ چاچے احمد کے ماموں زاد بھائی کا بیٹا نہروں کے محکمے میں اوورسیئر تھا۔ کچھ دیر پہلے اُس کی بیوی، جس کے ساتھ بچپن سے ہی اُس کی منگنی ہو چکی تھی، شادی کے دس ماہ بعد زچگی کی حالت میں فوت ہو گئی تھی۔ حال ہی میں اُس لڑکے کے ساتھ جمیلہ کی بات پکی ہو گئی تھی اَور شادی کے لئے کھلے موسم کا اِنتظار تھا۔ پانچ سال کے عرصے کے بعد جمیلہ پر دوبارہ رنگ آیا تھا۔ اسی دوران میں اُس نے نورپور کے سکول سے میٹرک پاس کر لیا تھا۔

عباس کو چھٹی نہ مِل سکی تھی۔

"شہر میں اُس کی کسی گورنر کے ساتھ ڈیوٹی لگی ہُوئی ہے،" چاچے احمد نے فخر سے بتایا۔

سرفراز سارا دن اَور رات گئے تک چارپائی پہ لیٹا گھر والوں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ "جیلو، میں تین دن سے تجھے کہہ رہا ہوں ایک سویٹر بُن دے۔ تُو تو کسی بھی کام کی نہیں۔ تیرا اوورسیئر تجھے اپنی نہر میں ڈبو دے گا۔"

"کل میں نے لالے سے کہا تھا شہر سے سفید اُون خرید کر لا دے۔ بے شک پُوچھ لو۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

"لالے سے کیا پُوچھتے ہو، تیرے لالے کو نہ اپنی ہوش نہ گھربار کی،" سکینہ بولی۔ "ایک کام سے خدا خدا کر کے چھٹکارا ہُوا تو دُوسرا گلے پڑ گیا۔ اب دُشمنوں نے مقدمے کر دیئے ہیں۔"

"بی بی، لالے کی مرضی کا کام ہے،" سرفراز نے کہا، "دنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ مقدمے ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ لالہ سُرخرو ہو گا، دیکھ لینا۔"

"اِسے تو اپنی دال روٹی کی فکر لگی رہتی ہے،" اعجاز بولا۔

"لالہ، دال روٹی کی یاد نہ دلاؤ" سرفراز نے برا سا مُنہ بنا کر کہا" میں نے عمر بھر کی دال روٹی ایک ہی دفعہ کھا لی ہے۔ اب مجھے دال کہیں دِکھائی دی تو اُٹھ کر بھاگ جاؤں گا۔"

"اللہ رحم کرے سرفرازے، تیرے سامنے روز مرغی رکھوں گی" سکینہ نے کہا۔

"بی بی میں سو بار کہہ چکا ہوں مجھے اب سرفرازا مت کہا کرو۔"

"اچھا اچھا لفٹین صاب، سن لیا ہے۔"

"اُوں ہوں" سرفراز نے نفی میں سَر ہلایا۔

"سرفراز اب کپتان ہو گیا ہے، بیوقوف۔ تیرے مُنہ پر چڑھا ہُوا لفظ اُترتا ہی نہیں۔" اعجاز نے کہا۔

"کپتان ہو لفٹین ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہے تو افسر نا۔"

"بڑا فرق پڑتا ہے" اعجاز بولا۔ "اب لفٹین اِسے سلام کرتے ہیں۔"

"سلام کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ تنخواہ بھی زیادہ ہُوئی کہ نہیں؟"

"ہوئی ہے۔" سرفراز نے جواب دیا۔

"چلو کچھ تو ہوا" سکینہ نے کہا۔ "اللہ خیر کرے۔ کسی دن ہمارا باسا بھی تھانیدار ہو جائے گا۔"

"اِنشاء اللہ" چاچا احمد بولا "اِنشاء اللہ۔ گورنروں وزیروں کے ساتھ اُس کی ڈیٹیاں لگتی ہیں۔ سارے ممبر اُس کے واقف کار ہیں۔ ہو گا کیوں نہیں۔ اے اِنشاء اللہ ہو گا۔"

ایسی ہی باتیں کرتے کرتے رات ہو جاتی۔ ایک زمانہ تھا کہ سرفراز اِن باتوں کو وقت کا زیاں ٹھہراتا تھا۔ مگر قید سے واپس آنے کے بعد اُسے سب سے زیادہ راحت اِس ماحول اور اِن چھوٹی چھوٹی باتوں سے حاصل ہُوئی تھی۔ اِس حقیقت سے وہ پہلی بار آشنا ہُوا تھا کہ اُپنے گھر کی یہ باتیں زندگی کی ایسی مرہمیں تھیں جو کلفتوں کو زائل کرتی تھیں۔

سرفراز نے اپنی سی کوشش کی کہ وہ ملک جہانگیر کی دعوت گول کر جائے۔ مگر اعجاز بضد تھا کہ اُس نے دعوت قبول کر لی ہُوئی ہے، اور کہ جہانگیر نے محض سرفراز کی خاطر اتنی بڑی تقریب منعقد کر کے اُن کی بے حد عزت افزائی کی ہے۔ اصل اشتیاق سکینہ کو تھا۔ اُس نے صبح سے اپنا ساٹن کا جوڑا اِستری کر کے بستر پر پھیلا دیا ہُوا تھا۔ جو بھی اُس کمرے

میں جاتا، سکینہ اُسے سختی سے تنبیہہ کرتی۔ "بستر پر میرے کپڑے پڑے ہیں۔ انھیں خراب نہ کرنا۔" حسن ہو یا حسین ہو، جمیلہ ہو یا ماسی یا اعجاز ہی ہو، وہ کسی کو ہدایت کرنے سے نہ چوکتی۔ ایک بار سرفراز کسی کام سے اُس کمرے میں جانے لگا تو اُسے بھی یہی سننا پڑا۔

"بی بی، سویرے سے تیرے کپڑے سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ میں تو دیکھنے جا رہا ہوں یہ کیسے کپڑے ہیں۔"

"ہائے تو نے دیکھے نہیں؟ تیری منگنی پر پہلی دفعہ پہن کر گئی تھی۔ اُس دن کے بعد آج نکالے ہیں۔"

"منگنی پر تو گئی تھی بی بی،" سرفراز سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ لالہ تجھے لے کر ہی نہیں گیا تھا۔"

"واہ، تیرے لالے کی مجال تھی جو لے کر نہ جاتا۔"

سکینہ کے کپڑوں کا دن بھر چرچا رہا۔ اب شام ہونے والی تھی۔ جانے کا وقت قریب تھا۔ سکینہ تندہی سے اپنا کالا برقعہ استری کر رہی تھی۔ سب چھوٹے بڑے اپنے بہترین کپڑے پہن کر تیار ہو رہے تھے۔ اعجاز نے اپنے دوست فضل اللہ گڑ کے آڑھتی سے اُس کی گاڑی مانگی تھی۔ یہ ایک پرانے ماڈل کی فورڈ سٹیشن ویگن تھی جس کے دروازوں پر باہر کی جانب اخروٹ کی لکڑی کے چوکھٹے جڑے تھے۔ گاڑی معہ ڈرائیور گلی کے سرے پر آ کر کھڑی تھی۔ اعجاز نے حسن کے ہاتھ ڈرائیور کو دودھ پتی کی چائے اور سگریٹ کی ڈبی بھیج دی تھی۔ مغرب کی اذان سے کچھ دیر بعد سکینہ اور جمیلہ اپنے چمکدار ساٹن کے سوٹ اور لال گرگابیاں پہن کر تیار ہو گئیں۔

"جیلو، آج تیرے اُوپر بڑا روپ چڑھا ہے،" سرفراز نے کہا۔ "چادر کو لپیٹ لے، تجھے کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔"

"ہائے سرفرازے ایسی بات نہ کر،" سکینہ بولی، "میری بہن تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کوئی اِسے دیکھ کر لے جائے تو بیاہ کے خرچے کے بغیر ہی خلاصی ہو جائے گی۔" جمیلہ نے شرما کر پہلے سے لپٹی ہوئی گرم چادر کو مزید سر کے اوپر کھینچ لیا۔ سکینہ نے کالا ریشمی برقعہ پہنا اور نقاب اُلٹ کر دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

"تم سب گاڑی میں چلو" اعجاز نے سفر کی ہدایت دی، "میں پیچھے موٹر سائیکل پر آتا ہوں۔"

"ابا، میں تمہارے ساتھ جاؤں گا" حسین نے ضد کی۔

"آجاؤ" آخر اعجاز نے کہا۔

اپنی عورتوں کے زرق برق لباس، اُن کی اچھی شکلیں اَور چہکتی ہُوئی آوازیں سن کر سرفراز کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ وہ گھر سے نکلنے پر آخرکار خُوش تھا۔

ملک جہانگیر سرفراز کی صورت دیکھ کر چونک پڑا اَور لحظہ بھر کو اُسے دیکھتا رہا۔ مگر اُس سے زیادہ حیرانی سرفراز کو جہانگیر کی حالت دیکھ کر ہُوئی۔ وہ اِتنا کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا بھی نہ جاتا تھا۔ آخر جہانگیر اَپنے صوفے سے اُٹھا۔ جیسے ہی وہ سرفراز اور اعجاز کو گلے لگا کر ملا، باہر میراثیوں نے ڈھول پر تھاپ دی۔ ایک نوکر جہانگیر کے اِشارے پر ڈیرے کے اَندر سے گیندے کے پھُولوں کے ہار لئے نمودار ہُوا۔ سرفراز نے ہار پہننے سے ہچکچاہٹ ظاہر کی تو جہانگیر بولا،

"سرفراز، تو ہماری قوم کا ہیرو ہے۔ تو نے ہماری سَربلندی کی ہے۔ یہ تو گیندے کے پھُول ہیں، تیرے لئے تو نوٹوں کے ہار بھی کم ہیں۔ یہ لے، پہن۔" اُس نے نوکر کے ہاتھ سے ہار لے کر سرفراز کے گلے میں پہنائے۔ پھر وہ نوکر سے بولا، "اب ہمارے دوسرے ہیرو کے گلے میں بھی ہار ڈال۔ تجھے پتا چل ہی گیا ہو گا سرفراز، تیرا بھائی تیرے پیچھے نامور جرنلسٹ بن گیا ہے۔"

"لالے نے نہیں بتایا، مگر مجھے پتا چل گیا تھا" سرفراز نے کہا۔ "میں نے اِس کی رپورٹیں بھی پڑھی ہیں۔"

"بھئی بریگیڈیئر صاحب اَور اُن کے بیٹے ایس۔پی صاحب کیوں تشریف نہیں لائے؟ میں نے خاص آدمی کے ہاتھ رقعہ بھیجا تھا۔"

"شعیب کو چھٹی نہیں مِل سکی، اَور بریگیڈیئر صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ اُنہوں نے ایک آدمی کے ذریعے معذرت بھیجی ہے۔ میں کل سویرے اُنہیں دیکھنے کے لئے جاؤں گا۔"

"آؤ بھئی عالمگیر، کیپٹن سرفراز سے ملو" جہانگیر نے بیٹے کو بلایا۔ "سرفراز تم اِس

سے ملے ہُوئے تو ہو۔ اب بی۔اے کا امتحان دے کر آیا ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں،" سرفراز نے گرمجوشی سے عالمگیر کے ساتھ مصافحہ کیا، "حالانکہ یہ مجھ سے تین چار سال چھوٹا ہے، مگر ہم ایک آدھ مرتبہ اِکٹھے کھیلتے بھی رہے ہیں۔ یہ دیر کی بات ہے۔ میرے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ اِتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

"اِمتحان کیسے رہے؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ٹھیک ہی ہو گئے ہیں۔"

"پاس ہو جاؤ گے؟" سرفراز نے ہنس کر پُوچھا۔

"اُمید تو ہے جی۔" عالمگیر نے جواب دیا۔

"آؤ، میرے پاس بیٹھو،" جہانگیر نے سرفراز کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایک وقت تھا میں دس دس پندرہ پندرہ کوس پیدل چلا جاتا تھا۔ ملک اعجاز نے میرا وقت دیکھا ہے۔ اب مجھ سے پانچ مِنٹ کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ آؤ بیٹھو۔"

سرفراز صوفے پر جہانگیر کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے ہار گلے سے اُتار کر صوفے کے بازو پر لٹکا دیئے۔ دُوسری طرف اعجاز ہار پہنے پہنے فخر سے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر پہلے جب یہ خاندان وہاں پہنچا تھا تو ایک نوکر جھپٹ کر آگے بڑھا اور خواتین کو ہمراہ لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ چاچے احمد نے آ کر دونوں ہاتھوں سے جہانگیر کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"کیا حال ہیں احمد خاں،" جہانگیر نے پُوچھا۔ "پُلسیا کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"اُس کی گورنر کے ساتھ ڈیوٹی لگی ہُوئی ہے،" چاچے احمد نے کہا۔ "دِن رات کا ملازم ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے۔ چھٹی نہیں ملتی۔"

"واہ بئی مبارک ہو۔ اب تو وہ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہو گا۔"

"اللہ کی دین اور آپ کی دعا ہے ملک صاب۔ سارے ممبر شمبر اُس کے واقف کار ہیں۔"

"بس، پھر تو اُس کی ترقی سمجھو کہ ہو گئی۔"

"انشاءاللہ۔"

"آپ کی صحت اَب کیسی ہے؟" سرفراز نے جھجکتے ہُوئے پُوچھا۔

"تُم دیکھ ہی رہے ہو سرفراز۔ ایک گردے پر گزارا کر رہا ہوں۔ جب وہ بھی گیا تو سمجھو کہ میری جگہ اِس دُنیا سے ہٹ گئی۔"

سرفراز قریب سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے اَور ہاتھوں کی جلد ہڈیوں پہ یُوں کھنچی تھی جیسے کسی لکڑی کے بت پر باریک چمڑہ منڈھا ہو۔ مگر اُس کی رنگ لگی، لمبی لمبی سیاہ مونچھیں گھی سے چپڑے ہُوئے توے کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ دیکھنے میں خُود اپنے پچھلے جنم کا سایہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر اُس کی آواز میں لرزش نہ آئی تھی۔ اُس کے ایک ایک اِشارے پہ لوگ اِدھر سے اُدھر حرکت میں آ رہے تھے۔ باہر ڈھول والے دھمادھم بجا رہے تھے اَور دو نوجوان کمر میں سُرخ لاچے اَور سر پہ سبز پٹکے باندھے بازو ہوا میں اُٹھائے اُن کی تال پہ ناچ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے رات کی سیاہی تھی اَور آگے بجلی کی روشنی، اَور اِن کے درمیان ناچنے والوں کے سُرخ اَور سبز رنگ پلو اِس سرعت سے لہرا رہے تھے جیسے آتشبازی کی لڑیاں ہوں۔ سب بچے احاطے سے نِکل کر اُن کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اَندر بیشتر لوگوں کے کان اِن پر ہی لگے تھے۔ صرف جہانگیر اُن کی جانب کوئی توجہ نہ دے رہا تھا۔

"تیری صحت بھی بگڑی ہُوئی ہے سرفراز،" اُس نے بات جاری رکھی، "مگر آپ لوگوں پر تو مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ مین میڈ پرابلم،" وہ ہنسا۔ "میری گاڈ میڈ پرابلم ہے۔ اِس کا کوئی علاج نہیں۔ تم لوگ کھاؤ پیو گے، جوان آدمی ہو، چند روز میں جان بن جائے گی۔ میں نے اَپنی زندگی اچھی گزاری ہے، مُجھے خدا تعالیٰ سے کوئی شکایت نہیں۔ میرا بیٹا بت شریف لڑکا ہے اَور لائق ہے۔ اب تُمھارا اَور اُس کا وقت ہے۔"

جہانگیر نے ہاتھ اُٹھا کر ڈھول والوں کو رُکنے اَور دُوسرے ہاتھ سے کھانا کھولنے کا اشارہ کیا۔ ڈھولچیوں نے دھم دھم دھم کی آخری دُڑکی بجائی اَور ہاتھ روک لئے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہُوئے لوگوں کے آگے چھوٹی چھوٹی، سٹول نما میزیں رکھ دی گئیں۔ ملک جہانگیر، سرفراز اَور اعجاز کے سامنے ایک لمبی سی نیچی میز بچھا دی گئی اَور سب سے پہلے کھانا اُس پہ سجایا گیا۔ پلاؤ اَور آلو گوشت کے سالن کی خُوشبو سے سارا پنڈال مہک اُٹھا۔ میز

کے ایک کنارے پر عالمگیر بھی ایک کرسی بچھا کر اُن میں شامل ہوگیا۔ دیوار کے عقب سے دیگوں میں کفگیروں اور چمچوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نوکروں کی ایک قطار کی قطار کھانے کی پلیٹیں لا لا کر دریوں پہ بیٹھے ہوئے مہمانوں کو پکڑا رہے تھے، جو چاولوں کی پلیٹوں میں انگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر گوشت کی بوٹیاں اٹھانے اور انہیں تیزی کے ساتھ دانتوں سے کاٹ کر، کھانے میں جتے ہوئے تھے۔ بچے اپنی اپنی پلیٹیں اٹھائے درمیان میں اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ مہمانوں کی اشتہاء زوروں پہ تھی۔ پنڈال کی خاموشی میں صرف جبڑوں کی چپ چپ، چینی کی پلیٹوں اور لوہے کی تھالیوں کی کھنکار اور اکا دکا باتوں کی آوازیں تھیں۔

نمکین کھانے کے بعد مٹی کی ٹھوٹھیوں میں جمی ہوئی کیوڑے والی فیرنی پیش کی گئی۔ کھانا ختم ہوا تو ملک جہانگیر کی میز کے آگے نوکر چلمچی، لوٹا اور تولیہ لے کر آ گئے، اور انہوں نے چاروں پانچوں کے ہاتھ دھلائے۔ کچھ مہمان اُٹھ کر نلکے پر ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے لئے گئے، باقیوں نے جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنی چادروں کے پلوؤں سے منہ اور ہاتھ پونچھ لئے۔

"واہ بھئی واہ کھانے کا لطف آ گیا بھائی جہانگیر،" اعجاز نے ڈکار بھر کر کہا۔

"ہمیں کیا لطف آئے گا اعجاز، ہم اور تم تو دِن بھر چرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ سرفراز سے پُوچھ جس نے دو سال تک لالوں کی دال کھائی ہے۔ کیوں سرفراز؟"

"شکر ہے آپ کے کھانے میں دال نہیں تھی،" سرفراز ہنس کر بولا۔ "آپ کو پتا ہے بھائی جان، اُدھر جانے سے پہلے میرا من پسند کھانا گوشت میں پکی ہوئی چنے کی دال ہوا کرتی تھی۔ لالہ اِس کی گواہی دے گا۔"

"بالکل،" اعجاز نے کہا۔ "ضد کر کے پکوایا کرتا تھا۔ مرغی کی ہانڈی بھی چڑھاؤ تو کہتا تھا اِس میں چنے کی دال ڈال کر پکاؤ۔ اِس کی بھرجائی اپنا سر پیٹ لیا کرتی تھی۔"

"اب دال کو دیکھتے ہی مجھے اُلٹیاں آنے لگتی ہیں۔"

ملک جہانگیر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "مجھے سب علم ہے۔ اسی لئے میں نے دال نزدیک نہیں آنے دی۔ ورنہ میراثائی دال گوشت ایسا پکاتا ہے کہ لوگ تیتر کو بھول جاتے ہیں۔ تم ذرا اِس صدمے پر حاوی ہو جاؤ تو تمہیں کھلاؤں گا۔"

"ناں، بھائی جان، ناں،" سرفراز نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر کہا۔
"عالمگیر، بھائی کو ڈیرہ تو دکھاؤ" جہانگیر نے کہا۔ "سرفراز تم تو کئی سال سے اِدھر نہیں آئے۔ پچھلے سال میں نے پیچھے نئے کمرے بنوائے ہیں۔ وہ عالمگیر کا پورشن ہے۔ جاؤ دیکھ کے آؤ۔ آکر بتاؤ کہ میں نے ٹھیک کیا یا غلط۔"
عالمگیر باپ کے کہنے پہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سرفراز بھی اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔ وہ دونوں مہمانوں کے بیچوں بیچ چلتے، سامنے والے برآمدے کی بغل سے ہو کر جہاں پیپل کے دو پرانے درخت کھڑے تھے، عمارت کے عقب کی جانب نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد جہانگیر نے پوچھا،
"مقدمہ کس سٹیج پر ہے؟"
"تاریخ مِل گئی ہے۔ وکیل کہتا ہے ابھی ایک آدھ تاریخ تو ابتدائی کاروائی میں گزر جائے گی۔"
"وکیل قابل ہے؟"
"تجربہ کار ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ بدیع الزمان کا دوست ہے۔ مفت مقدمہ لڑ رہا ہے۔"
"دوست دوست سب ٹھیک ہے بھائی، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ جب انہیں پیسے کے بغیر مقدمہ لڑنا پڑے تو وکیل دِل لگا کر کام نہیں کرتے۔"
"دیکھیں کیا ہوتا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "آدمی تو مخلص نظر آتا ہے۔"
"اللہ اپنا کرم کرے گا" جہانگیر نے کہا۔ "تُم لوگ حق پر ہو۔"
"سننے میں آیا تھا بھائی جہانگیر کہ آپ علاج کی خاطر بیرونِ ملک جا رہے تھے؟"
"ہاں بھئی، ارادہ تو تھا۔ سارا انتظام مکمل ہو گیا تھا۔ پھر میں نے خُود ہی ذہن بدل دیا۔"
"کیوں؟ ولایت میں تو سُنا ہے بڑی بڑی بیماریوں کا علاج موجُود ہے۔"
"علاج کیا ہے بھائی، چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ بس سمجھ لو جی نہ مانا کہ پردیس میں جا کر رسک لوں۔ اللہ جانے زندگی کتنی ہے کتنی نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے، میں یہیں پہ اپنے دِن پورے کرنا چاہتا ہوں۔" جہانگیر ایک لمحے کو رُکا، پھر وہ اعجاز کا ہاتھ پکڑ کر بولا،

"دراصل میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جہانگیر کی بات بیچ میں ہی تھی کہ ایک بوڑھا کسان اُس کے سامنے آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ "سرکار ایک عرض ہے۔" وہ بولا۔

"اللہ وسایا، اِس وقت میں اپنے مہمان کے ساتھ ضروری بات کر رہا ہوں۔ تو سویرے ہونے تک رُک نہیں سکتا؟"

"جیسے حضور کی مرضی۔ میں تو اِدھر ہی بیٹھا رہتا ہوں۔ منشی سے بھی عرض گزاری ہے۔"

"اچھا، تڑکے آ جانا۔ میں تجھے یہیں پر ملوں گا۔" جہانگیر نے کہا۔ پھر وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چل اعجاز، اندر چل کر بیٹھیں۔ یہاں تو اب اِن لوگوں کا پیٹ بھر گیا ہے، ساری رات آتے جاتے رہیں گے۔"

اعجاز جہانگیر کے پیچھے پیچھے ڈیرے کے کمرے میں چلا گیا۔ باہر اب کرسیاں خالی ہو چکی تھیں۔ اُن پر جو لوگ بیٹھے تھے وہ یا گھر جا چکے تھے، یا اُٹھ کر دریوں پر دوسروں کے پاس جا کر بیٹھ گئے تھے۔ دسمبر کی سردی اپنا رنگ دِکھا رہی تھی۔ دریوں پر اب زیادہ تر غریب کسان اور درمیانے درجے کے زمیندار، موٹے موٹے کھیس لپیٹے اِس طمانیت سے حقے گڑگڑا رہے تھے جیسے رات بھر اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے۔ کئی اپنے کھیسوں میں سکڑے سکڑائے وہیں پہ لیٹ کر سو چکے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر جہانگیر نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ "اعجاز، میرے دِن اب چار ہیں یا بیس، یہ سمجھ لو کہ کچھ پتا نہیں۔ میں نے اپنی زندگی اچھی گزاری ہے، مجھے کوئی افسوس نہیں۔"

"ایسی بات نہ کرو بھائی جہانگیر۔ تمہاری عمر کم از کم نوے سال ہوگی۔ مجھ سے لکھوا لو۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ مگر اعجاز میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میرا دِل جانتا ہے۔ اب زمانہ تم لوگوں کا ہے۔ تیرا اور سرفراز کا اور عالمگیر کا۔ میرے خاندان کو تو تم جانتے ہی ہو۔ بڑے بہنوئی جہاں زیب صاحب نے عیاشیوں میں پڑ کر جائیداد بھی گنوائی اور زندگی بھی۔ اب میری بہن اور اس کے بیٹے میرے دُشمن بنے ہوئے ہیں۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے،" اعجاز نے کہا۔ "مگر اندر کی بات کا مجھے علم نہیں۔"

"اندر کی بات کیا ہوگی۔ بھائی صاحب، خدا انہیں جنّت نصیب کرے، ہر مہینے دو مہینے اپنی عیش عشرت کے واسطے مجھ سے پیسے لے جاتے تھے اور زمین کے کاغذ میرے نام لکھ کر دے جاتے تھے۔ لاکھوں لے گئے اور اسی طرح دُنیا سے رُخصت ہوگئے۔ شراب نے اُن کا جگر جلا کے رکھ دیا تھا۔ اب میں وہ جائیداد چھوڑ تو نہیں سکتا۔ میری کمائی اُس پہ لگی ہوئی ہے۔"

"یہ تو دُرست ہے،" اعجاز نے کہا۔

"میری بہن کہتی ہے کہ میں نے اُسے اندھیرے میں کیوں رکھا۔ میں تم سے پُوچھتا ہوں اعجاز، اگر تمہارا کوئی بہنوئی ہوتا اور وہ تمہارے پیر پکڑ کر منت کرتا کہ بات باہر نہ نکلنے پائے، تو تم کیا کرتے؟"

"میں بھی وہی کرتا جو تم نے کیا، بھائی جہانگیر۔"

"میرے اور کوئی سگے رشتہ دار نہیں ہیں، جو تھے وہ دُشمن بن چکے ہیں۔ خیر، چھوڑ ان باتوں کو۔ مقصد میرا بات کرنے کا یہ ہے کہ عالمگیر اب اکیلا ہے۔ ہماری قوم برادری میں اب تم ہی ہو، یا سرفراز ہے۔ تو نے دُنیا کے کاموں میں تجربہ حاصل کیا ہے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تجھے کامیابی ہُوئی ہے۔ سرفراز نے بھی میدان مارا ہے۔ اِنشاء اللہ ایک دن حکومت کا ستون بنے گا۔ میں چاہتا ہوں عالمگیر کو تم اپنے سائے میں رکھو۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے،" اعجاز بولا "اول تو اللہ تعالیٰ ہم سب کے اُوپر آپ کا سایہ قائم رکھے۔ مگر جو بھی حالات ہُوئے، عالمگیر اپنا بھائی ہے۔"

"بس بس، میں یہی چاہتا ہوں کہ تم اُسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھو۔ سرفراز سے بھی کہو اُس سے میل جول رکھے۔"

"تمہارے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں بھائی جہانگیر۔"

"عالمگیر اچھا لڑکا ہے۔ شریف ہے، تابعدار ہے، ہوشیار بھی ہے۔ بی۔اے کرلے گا۔ پھر ایل۔ایل۔بی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کالج کی سیاست میں بھی حصّہ لیتا رہا ہے۔ میرے ساتھ ملکی حالات پر بات کرتا ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر اگر سیاست میں گیا تو تُمہارے تجربے اور گائیڈنس کا بدل اسے کہیں سے نہیں ملے گا۔"

"تمہاری نوازش ہے بھائی جہانگیر، ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

"یہ نہ کہو اعجاز، اب تم بیس سال پہلے کے سکول ماسٹر نہیں رہے۔ تمہاری دنیا میں ایک حیثیت ہے، تعلق واسطے ہیں، رشتہ داریاں ہیں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ جو میں نے کہا ہے اُس پر عمل کرو گے۔"

"بھلا اپنوں سے بھی وعدہ لیا جاتا ہے؟ وعدے کی بات تو غیروں سے کی جاتی ہے۔"

"اونہوں، ایسے نہیں۔ یہ مت سمجھو کہ میں نے تمہیں اس مقصد کے لئے کھانے پر بلایا ہے۔ میں دِل سے سرفراز کی قدر کرتا ہوں۔ اُس نے ملک بھر کے اعوانوں کا سربلند کیا ہے۔ مجھے بجا طور پر اُس پر فخر ہے، مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جو حالات بھی ہوئے، تم عالمگیر کی پشت پر ہاتھ رکھو گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں جہانگیر، سو بار وعدہ کرتا ہوں۔"

"بس، میں یہی چاہتا ہوں۔ اب میرے دِل کو چین آ گیا ہے۔" جہانگیر اپنے دونوں ہاتھوں میں اعجاز کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ جذبات کی شدت سے اُس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی۔ "اِتفاق میں بڑی برکت ہے۔ تو نے دیکھا ہے، جو کمی کمین طبقہ ہے وہ اتفاق کی وجہ سے دُنیا میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ایک دُوسرے کو بندوقیں مارتے ہیں اور ضمانتیں کرانے ہمارے پاس آتے ہیں، مگر جب مقابلے کی بات آتی ہے تو" جہانگیر نے پانچوں انگلیوں کی مٹھی کس کر دکھائی، "ایسے ہو جاتے ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ ہماری قوم کا نام ہی فخر کی علامت تھا۔ آج ہرا یرا غیرا ملک اور چوہدری بنا پھرتا ہے۔ اپنے نام کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔ تیرا میرے اُوپر بڑا احسان ہے۔ اب میں تسلی سے اپنے دن پورے کروں گا۔"

"ایسی بات مُنہ سے نہ نکالو بھائی جہانگیر۔ وقت وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔" اعجاز نے کہا۔

جہانگیر دیر تک اعجاز کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبائے بیٹھا رہا۔ نوکر نے آ کر اطلاع دی۔ "جی بیبیاں گڈی میں بیٹھ گئی ہیں۔" دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر برآمدے میں سرفراز اور عالمگیر، سردی سے 'سی سی' کرتے ہوئے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ دریوں پر

وگ اسی طرح بیٹھے اور لیٹے ہوئے سوتے جاگتے ہوئے حقے گڑگڑا رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

"تیری کچہری تو بھائی اسی طرح لگی ہوئی ہے،" اعجاز نے ہنس کر کہا۔

"یہ نامراد اب کوئی جانے والے ہیں؟" جہانگیر نے کہا۔ "یہیں پر لمبے پڑ جائیں گے۔ سویرے اُٹھ کر اُلٹا اپنا رات گزارنے کا حق مانگیں گے، چاء پراٹھے طلب کریں گے، پھر کہیں جا کر ان سے خلاصی ہوگی۔"

ہنستے ہنستے جہانگیر اور عالمگیر، اعجاز اور سرفراز سے گلے مِل کر رخصت ہوئے۔ سرفراز نے لباس کے اندر جہانگیر کے ہڈیوں کے ڈھانچے کو محسُوس کیا، مگر اُس کے معانقے میں زور تھا۔ اُس وقت سرفراز نے اپنے اندر جہانگیر کے لئے عجیب سی یکجہتی کا جذبہ محسُوس کیا۔

"پھر پروگرام پکا ہے ناں؟" عالمگیر نے سرفراز سے پُوچھا۔

"کیا پروگرام بنا ہے بھئی،" جہانگیر نے پُوچھا۔

"شکار کا،" عالمگیر نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں، سرفراز کو تیتر بٹیر کھلاؤ، اس کی صحت بحال ہو۔ مگر سنو،" جہانگیر منہ آگے کر کے اُونچی سی سرگوشی میں بولا، "چنے کی دال کا نام نہ لینا۔"

چاروں قہقہہ لگا کر ہنسے۔ سب دوبارہ ہاتھ ملا کر رُخصت ہوئے۔

"کیوں بھئی غفار خان، کھانا ٹھیک ٹھاک ملا؟" اعجاز نے ڈرائیور سے پُوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک کیا ملک صاب، بہوت ودھیا ملا،" غفار خان لبوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

گاڑی میں تینوں عورتیں اور دونوں لڑکے پٹر پٹر کر رہے تھے۔

"حسینے، میرے ساتھ آؤ گے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"ابا سردی ہے۔"

"ہاہا۔ جی چھوڑ گئے ناں" اعجاز نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

سرفراز گلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی تھوڑی دُور ہی گئی کہ حسن اور حسین کرسیوں پر لٹکا کر سو گئے۔

وہ خاکی کوٹ والا ملک جہنگیر تھا؟" سکینہ نے سرفراز سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم نے اُسے کہاں دیکھا بی بی؟"

"جب ہم موٹر سے اُترے تو سامنے ہی بیٹھا تھا۔ ہائے، میں نے اُسے پہچانا ہی نہیں۔ سوکھ کر لکڑی ہو گیا ہے۔"

"ہاں" سرفراز نے کہا۔ "بیمار ہے۔"

سکینہ، جمیلہ اَور اُن کی ماں دوبارہ جہانگیر کے گھر کی عورتوں، اُن کے لباسوں اَور زیوروں اَور اُن کی آپس کی باتوں کے ذکر میں مشغول ہو گئیں۔ جب گاڑی اُن کی گلی کے سرے پر جا کر رُکی تو سرفراز کا جی ہلکا ہو چلا تھا اَور نیند اُس کی آنکھوں میں بھری آتی تھی۔

"ملک صاب،" ڈرائیور غفار خان اعجاز سے بولا، "اجازت ہے؟"

"ہاں غفار خان،" اعجاز اُس کی جیب میں دس کا نوٹ اُڑستا ہُوا بولا۔ "حاجی صاحب سے میرا سلام کہہ دینا۔ ایک دو دِن میں آ کر ملوں گا۔"

"بہت اچھا جناب۔ سلاواں لیکم۔"

"وعلیکم سلام غفار خان۔ خدا حافظ۔"

صحن میں داخل ہو کر سرفراز نے اعجاز سے کہا، "میرا کل شہر جانے کا ارادہ ہے۔"

"جلدی کیا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "دو مہینے پڑے ہیں۔ چلے جانا۔"

"ہمارے ایک کورس میٹ جمال کی خبر ملی ہُوئی ہے۔ اُس کی پوسٹنگ یہاں کی ہو گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا اُس سے جا کر مل آؤں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ موٹر سائیکل لے جانا۔ شام تک آ جاؤ گے نا؟"

"ہاں۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں تک رُکوں گا۔ تمھیں موٹر سائیکل تو نہیں چاہیے، لالہ؟"

"نہیں۔ میں دو چار روز گھر پر ہی رہوں گا۔"

مگر سرفراز نہ ایک روز، نہ دو روز بلکہ پورے سات دن تک شہر سے نہ لوٹا۔ پہلے ہی روز، جمال کی جیپ میں شہر کی بڑی سڑک سے گزرتے ہُوئے اِتفاق سے اُس کی ملاقات نسرین سے ہو گئی۔ اگلے ہی روز اُس کی ملاقات گاؤں کے ایک آدمی سے ہُوئی جس کے ذریعے اُس نے اعجاز کو پیغام بھیج دیا کہ ضروری کام سے اُسے شہر میں چند روز رُکنا پڑ گیا

ہے۔ شام کے وقت سرفراز شعیب کے گھر آ جاتا اور نسیمہ اور شعیب سے کچھ دیر باتیں کرتا، مگر جلد ہی سونے کے لئے چلا جاتا۔ دن کے وقت وہ مختلف جگہوں پہ نسرین سے ملتا۔ جمال کو، جسے سرفراز اور نسیمہ کی منگنی کی خبر تھی، سرفراز نے نیم مذاق اور نیم سنجیدگی سے اِس راز میں شریک بننے پر راضی کر لیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب جمال نے دیکھا کہ معاملہ بڑھتا جا رہا ہے تو اُس نے اِس بات پر سرفراز کو لعنت ملامت بھی کی، جسے سرفراز نے نظر انداز کر دیا۔ نسیمہ کو بھی سرفراز کے اندر اِس تبدیلی کا احساس ہو چکا تھا، تاہم اُس نے سرفراز کی زندگی میں پچھلے دو برس کے حالات کے پیشِ نظر اِس کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ سات روز تک نسیمہ اور شعیب اسی اندازے میں رہے کہ سرفراز دن کے وقت گاؤں چلا جاتا ہے اور ہر شام کو صرف اُنہیں ملنے کی خاطر شہر آتا ہے۔ سرفراز نے بھی اِس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے دُنیا کے ساتھ سرفراز کی اپنی فریب کاری کی اِبتدا ہو چکی تھی۔

سات روز کے بعد سرفراز گاؤں گیا تو جھوٹ سچ کہانی سُنا کر دو دِن کے بعد ہی پلٹ آیا۔ اب اُس نے جمال کے ذریعے اُس کے میس میں کمرہ لے کر مہمان کے طور پر رہنا شروع کر دیا۔ اپنی بقیہ پونے دو ماہ کی چھٹی کے دوران سرفراز نے گاؤں میں صرف دس روز گزارے، نسیمہ اور شعیب سے بھی ساتھ آٹھ بار ہی ملا۔ باقی کے دِن وہ ہر روز نسرین سے ملتا رہا۔ اِس کے باوجُود سرفراز ہر روز ایک اجنبیت لے کر واپس آتا تھا۔ وہ نسرین کی یاد پر کبھی بھی حاوی نہ ہو سکا۔ نسرین میں اُسے ایک ایسی عورت نظر آئی تھی جو ایک بچے کی سی معصومیت رکھتی تھی مگر ساتھ ہی ایک پوری عورت کی نامعلوم آلائش کی حامل بھی تھی۔۔۔۔ جو کہ ایک فریب تھی یا نہیں، مگر جو سرفراز کے دو لخت قلب سے کسی نہ کسی طور میل کھاتی تھی۔

اعجاز نور پور سے دِتے کمہار کے جنازے میں شریک ہو کر واپس آ رہا تھا کہ ملکوں

کے بھٹے پر ایک ہجوم کو دیکھ کر رُک گیا۔ اُس نے موٹر سائیکل کا رخ اُس کچے رستے پر موڑ دیا جو بھٹے تک جاتا تھا۔ ساٹھ ستر آدمیوں کی ریل پیل تھی۔ آٹھ دس پولیس والے تھے۔ ایک پولیس کی گاڑی تھی۔ بھٹے پر کام کرنے والے مزدور ادھر اُدھر خاموش کھڑے تاسف سے سَر ہلا رہے تھے۔ اُن کی عورتیں مُنہ پہ کپڑا رکھے رو رہی تھیں۔ اعجاز موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہجوم میں جا گھسا۔ درمیان میں دو کُرسیاں رکھی تھیں جن پر نور پور تھانے کا ایس۔ایچ۔او چوہدری اظہر اَور اُس کے نائب محرر تھے۔ نائب محرر ایک گتے پر چند کاغذات رکھے، اُسے گھٹنے پر ٹکائے، ہاتھ میں قلم پکڑے بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے، ہجوم کے دائرے کے بیچ میں کوئی شے چادر سے ڈھکی ہُوئی، زمین پہ پڑی تھی۔ ہوا میں ایک عجیب سی بو پھیلی تھی۔

"کیا ہُوا؟" اعجاز نے گاؤں کے ایک آدمی کو پہچان کر پُوچھا۔

"ملک حمید قتل ہو گیا ہے۔"

"ہیں؟" اعجاز چونک کر تقریباً اُچھل پڑا۔

مجمعے میں سب کی نظریں اُس چادر پہ جمی تھیں جو ایس۔ایچ۔او کے پاؤں سے چند انچ کے فاصلے پہ پھیلی تھی۔ ملک لطیف جو ملک حمید سے دُوسرے نمبر پر تھا، کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے، دونوں ہاتھوں سے سَر کو پکڑے ہُوئے ایک طرف زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ آنکھوں کو ڈھانپے ہُوئے تھے۔ یُوں لگتا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اُس کے چاروں پانچوں بھائی اُس کے پیچھے خاموش بیٹھے تھے۔ اعجاز کو حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کو اِس واقعے کی خبر کیوں نہیں ہُوئی۔ مگر وہ صبح سویرے ہی گھر سے نِکل پڑا تھا اور مختلف راستے سے، جہاں ایک دُوسرے گاؤں میں اُسے کسی سے ملنا تھا، نور پور پہنچا تھا۔ واپسی پر وہ پکی سڑک سے آیا تھا۔

"قاتل پکڑا گیا؟" اعجاز نے پُوچھا۔

آدمی نے نظریں چادر سے ہٹائے بغیر، ایک لمحے کے توقف سے نفی میں سَر ہلایا، جیسے کہ اُسے اِس سانحے کی موجودگی میں اعجاز کے سوال سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اِتنے میں سڑک کی جانب سے ایک موٹر سائیکل آئی جس پہ تین فیتوں والا حوالدار اَور اُس کے پیچھے ایک سپاہی سوار تھے۔ موٹر سائیکل ٹھہرا کر وہ نیچے اُترے اَور سیدھے تھانیدار کے سامنے آ

کھڑے ہُوئے۔ سپاہی کے ہاتھ میں ایک لمبا سا پلاسٹک کا تھیلا تھا۔

"ہٹ جاؤ اوئے،" تھانیدار مجمعے پر چیخا "یہ تمھاری ماں کا نکاح ہو رہا ہے؟ ساروں کو پکڑ کر اندر کر دوں گا بدمعاشو۔ سویرے سے کہہ رہا ہوں جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔ چلو چلو، جاؤ اپنے کام پر جاؤ، پیچھے ہٹو، جگہ خالی کرو۔"

تین چار سپاہی ڈنڈے سونٹے لہرا لہرا کر مجمعے کو پیچھے ہٹانے لگے۔ لوگ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ کر رُک گئے۔ دائیرہ کچھ وسیع ہُوا۔ تھانیدار اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے اِشارے پر ایک سپاہی نے بڑھ کر زمین پر پڑا چادر کا پردہ اُٹھایا۔ مجمعے سے ایک ملفوف سی ہوک بلند ہوئی۔ لوگ ہلنے جلنے لگے۔ کچھ آگے آنے کو ہاتھ مارنے لگے، کچھ ایک نظر ڈال کر پیچھے ہٹ گئے۔ عورتوں نے ایک ساتھ "ہائے" کر کے مُنہ پھیر لئے۔

سامنے اِنسانی جسم کے متعدد اعضاء الگ الگ پڑے تھے جو جل کر تقریباً کوئلہ بن چکے تھے۔ گردن سے اُوپر چہرہ اَور سَر آگ نے یُوں مسخ کر دیا تھا کہ کسی قسم کی شناخت سے بعید تھا۔ پہلی نظر میں یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے جلی ہُوئی لکڑی کے ٹکڑے ہوں۔ مگر ہاتھ پاؤں کی اُنگلیوں کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ شخصیت کی شناخت کے لئے صرف ایک شے تھی جو قاتل کی نظر سے چھٹ گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی چوتھی اُنگلی میں ملک حمید کی فیروزے کی انگوٹھی موجُود تھی۔ اُس کی چاندی آگ کی حدت سے ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی، مگر انگلی سے گوشت اُتر جانے کے باوجُود اُنگوٹھی اُنگلی پر قائم تھی۔ فیروزے کا پتھر بدرنگ ہو گیا تھا، مگر حیرت انگیز طور پہ وہیں کا وہیں جڑا تھا۔ تھانیدار کے ساتھ ایک آدمی اُٹھ کر مختلف زاویوں سے اُن اعضاء کی تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ ایک سپاہی چاک کے ٹکڑے سے اُن کے گرداگرد لکیر کھینچ رہا تھا، گویا اُنھیں ایک حصار میں مقید کر رہا ہو۔ دونوں آدمی ایک دُوسرے کے رستے میں حائل ہو رہے تھے، مگر اَپنا کام جاری رکھے ہُوئے تھے۔ جب دونوں فارغ ہو چکے تو لکیر کھینچنے والے سپاہی نے چادر جو ایک طرف رکھی تھی، اُٹھائی اَور اُس کے ایک کونے کو ہاتھ پر لپیٹ کر نہایت احتیاط کے ساتھ ایک ایک سیاہ عضو کو اُٹھا کر پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالنے لگا، جس کا مُنہ حوالدار کھولے ہُوئے کھڑا تھا۔ تھیلا بھر گیا تو حوالدار نے ایک ڈوری سے اُس کا مُنہ کس کر باندھ دیا۔ تھانیدار نے اَپنے ہاتھ کے چھوٹے سے ڈنڈے کو ہلا کر روانہ ہونے کا اشارہ کیا۔ اُسی اشارے سے

اُس نے ملک حمید کے سب بھائیوں اَور تین دُوسرے آدمیوں کو، جو ایک دُوسرے کے ساتھ لگ کر ایک جانب بیٹھے تھے، چلنے کا حکم دیا۔ تھانیدار جانے کے لئے مڑا تو اُس کی نگاہ اعجاز پر پڑی۔ اعجاز کے ساتھ اُس کی قریبی واقفیت تھی، مگر تھانیدار نے شناخت کا کوئی عندیہ نہ دیا۔

موٹر سائیکل پر تین پولیس والے سوار ہوگئے۔ باقی سب، بمعہ تھانیدار، ترپال کی چھت والی ٹرک نما گاڑی میں بھر کر وہاں سے رُخصت ہُوئے۔ چاک سے لگائے ہُوئے ٹیڑھے میڑھے نقشے پر ایک سپاہی ڈیوٹی کے لئے پیچھے رہ گیا۔ وہ تھانیدار کی خالی کی ہُوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اعجاز چند منٹ تک وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کرے، کسی آدمی سے پُوچھے یا سپاہی سے بات کرے۔ پھر ارادہ بدل کر موٹر سائیکل پہ جا بیٹھا۔ اُسے سٹارٹ کر کے اعجاز نے اُس کا رُخ نور پور کی جانب موڑ دیا۔

تھانے کے اَندر خاصی گہماگہمی تھی۔ کئی جان پہچان والے لوگ ملک حمید کے بھائیوں کے پاس بیٹھے تھے۔ اعجاز نے اُن سے علیک سلیک کی۔ چند منٹ تک وہ اُن کے پاس خاموشی سے بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر تھانیدار کے کمرے کو چل پڑا۔ دروازے پر لٹکی ہُوئی چک اٹھا کر اُس نے سَر اَندر داخل کیا۔ تھانیدار محرر کی کرسی پر بیٹھا کچھ کاغذات اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ تھانیدار نے سَر اُٹھا کر دیکھا اَور کچھ بولے بغیر دوبارہ کاغذات دیکھنے لگا۔ اعجاز کی چوہدری اظہر کے ساتھ اُس وقت سے واقفیت تھی جب چوہدری اظہر تھانہ مغلپورہ میں اے۔ایس۔ آئی تھا۔ ابھی تک اُس کے ساتھ اعجاز کے تعلقات ایسے تھے کہ میوے والے گڑ کی ٹوکریاں اُسے بھیجا کرتا تھا۔ اعجاز اَندر داخل ہُوا۔

"اسلام علیکم، چوہدری صاحب۔"

تھانیدار سلام کا جواب دیئے بغیر کاغذات پہ نظریں جمائے جمائے بولا "میں کسی اخبار وخبار والے سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"میں اخبار والا نہیں، چوہدری صاحب، مقامی آدمی ہوں۔ اِن لوگوں سے میرا تعلق واسطہ ہے۔"

"میں تیرا تعلق واسطہ تیری پیٹھ میں گھسیڑ دوں گا اعجاز،" چوہدری اظہر گرجا، گو اُس کی گرج میں اپنائیت کی جھلک تھی۔ "کبھی تو یونین کا لیڈر بن کر آ جاتا ہے، کبھی صحافی

ٹھانی بن کر میری گانڈ پر آ سوار ہوتا ہے۔ اب تو اپنا تعلق واسطہ لے کر آگیا ہے۔ تیرا اپنا مقدمہ چل رہا ہے۔ تجھے مزا آئے گا جب عدالت تیری جائیداد قرق کر کے دو سال کے لئے اندر بھی کر دے گی۔ تو اپنی خیر منا۔ چل جا کر اُدھر بیٹھ۔'' تھانیدار نے ہاتھ سے اپنے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ ''میں قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔''

اعجاز اُٹھ کر چپکے سے ایس۔ایچ۔او کے ملحقہ کمرے میں جا بیٹھا۔ کمرہ خالی تھا۔ میز پر کوئی کاغذ نہ تھا، صرف ایک ٹیلیفون رکھا تھا۔ اُس کی گھنٹی جب بولتی تو ساتھ والے کمرے سے ایک سپاہی آ کر جواب دیتا، جو مستقل طور پر ایک ہی طرز کا ہوتا۔ ''چوہدری صاحب مصروف ہیں۔ جی اِس وقت وہ تین سو دو کی تفتیش میں مصروف ہیں۔ جی؟ نہیں جی، اِس وقت ممکن نہیں ہے، بعد میں رابطہ کریں، کوئی دو تین گھنٹے کے بعد۔ کیا کہا؟ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ اُن کے آنے جانے کا کوئی علم نہیں۔۔۔۔''

صرف ایک مرتبہ وہ ''اچھا سر'' کہہ کر فون نیچے رکھ کر گیا، اور اعجاز نے سنا کہ وہ تھانیدار سے جا کر بولا، ''ڈپٹی صاحب کا فون ہے۔''

چوہدری اظہر آیا اور فون سننے کے بعد ''بہت اچھا سر'' کہہ کر اعجاز کی جانب دیکھے بغیر واپس چلا گیا۔ ساتھ والے کمرے سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں، جو وقفے وقفے پر دب جاتیں۔ اعجاز نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر اُسے کوئی بات صاف سنائی نہ دی، صرف اِتنا پتا چلا کہ ملک حمید کے بھائیوں اور دُوسرے آدمیوں کو ایک ایک کر کے اندر بلا کر بات ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک ٹیلیفون کی گھنٹی نہ بجی۔ دو تین راتوں سے اعجاز کی نیند پوری نہ ہو سکی تھی۔ کرُسی پر بیٹھے بیٹھے وہ اونگھ گیا۔ اسی حالت میں اُس نے چند آدھے پونے خواب دیکھے۔ آخری خواب میں ایک شخص ایک دوسرے آدمی کے ہاتھ پاؤں کو ٹوکے سے کاٹ کر ٹکڑے کر رہا تھا اور خُون کے فوارے اِدھر اُدھر چھوٹ رہے تھے، مگر اُسی وقت وہ ٹکڑے آپس میں مِل گئے اور آدمی ثابت و سالم اُٹھ کر چلنے پھرنے لگا۔ گہری نیند سے اعجاز اپنے ہی خراٹوں کی آواز سے جاگا۔ کمرہ اُسی طرح خالی تھا۔ ساتھ والے کمرے سے اب دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس نے گھڑی پہ وقت دیکھا تو چونک پڑا۔ ایک گھنٹہ گزُر گیا تھا۔ وہ کرُسی سے اُٹھا تو اُس کی کمر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ تھانے کے احاطے میں اعجاز کو وہ چھوٹا سا مجمع دکھائی دے رہا

تھا جس میں ملک حمید کے بھائی شامل تھے۔ اب اُن کے ساتھ مزید لوگ آ کر مل گئے تھے جن میں کئی کو اعجاز نے دُور سے دیکھ کر پہچانا۔ تھانیدار چوہدری اظہر کمرے میں داخل ہوا اور جا کر اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اعجاز پلٹ کر اُس کے پاس پہنچا۔

"کوئی مُنہ سر بنا؟" اُس نے پُوچھا۔

"دیکھ اعجاز" چوہدری اظہر بولا، "تفتیش ابھی شروع ہُوئی ہے۔ میری ساری رات یہاں لگ جائے گی۔"

"چوہدری صاحب کچُھ نہ کچُھ تو بتائیں، آخر معاملہ کیا ہے۔"

"دیکھ، تفتیش جاری ہے، اِس کا ایک لفظ تیرے مُنہ سے نِکلا تو شے میں پکڑ کر بند کر دوں گا۔"

"اگر میرے مُنہ سے نِکلا تو مجُھے اُلٹا لٹکا دیں۔"

"یہ عشق عاشقی کا معاملہ ہے۔"

"عشق عاشقی کا؟" اعجاز کا مُنہ کھلا رہ گیا۔

"دُشمنی کا بہانہ کر کے جان بچانا چاہتے ہیں۔ مگر مجُھے گواہیاں مِل جائیں گی۔"

"کس کا عشق اَور عاشقی تھی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"ایک مزدُور عورت تھی۔ خُوش شکل اَور جوان تھی۔ ملک حمید اَور لطیف دونوں کے ساتھ اُس کا تعلق ہو گیا۔ آخر لطیف نے حسد میں حمید کو کاٹ کر بھٹے کی چمنی میں پھینک دیا۔ میرے پاس عینی شہادت موجُود ہے۔ وہ تو لطیف کی بدقسمتی کہ آگ اِتفاقی طور پر بجھ گئی، بھڑکتی رہتی تو ہڈیاں بھی جل کر بھسم ہو جاتیں۔ آگ ہلکی ہوتی گئی اَور بو آہستہ آہستہ پھیلتی گئی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ عشق اَور مشک نہیں چھپتے؟" چوہدری اظہر طنز سے ہنسا "یہاں عشق بھی تھا اَور مشک بھی۔ پکڑے گئے۔"

"اور وہ عورت؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"غائب ہو گئی ہے۔۔۔۔" چوہدری اظہر موٹی سی گالی دے کر بولا۔ "ایسے جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔"

"اُس کا سراغ تو ملنا چاہیے" اعجاز نے کہا۔

"چھوڑوں گا نہیں، مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی، قبر تک پیچھا کروں گا۔ چل اب

جا۔ وقت آنے پر پھر بات کروں گا۔ مگر یاد رکھ اِس کا ایک لفظ باہر نکلا تو تجھے دھرلوں گا۔"

"چوہدری صاحب، آپ نے پہلے بھی واضح کر دیا تھا" اعجاز ہنس کر بولا۔ "مجھے یاد ہے۔"

"آج گرفتاری لوں گا" تھانیدار بولا۔ "اب چلا جا۔"

واپسی پر اعجاز چند منٹ ملکوں کے پاس بیٹھا۔ "میں نے پوری کوشش کی کہ اُس کے ذہن کا پتا لگاؤں" اُس نے بتایا، "مگر اُس نے ایک بات بھی میرے ہاتھ میں نہیں پکڑائی۔ بہرحال، فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔" وہ شام کو واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے رُخصت ہُوا۔

اعجاز موٹر سائیکل سڑک پر دوڑائے چلا جا رہا تھا کہ بھٹے کے سامنے سے گزرتے ہُوئے کوئی بات اچانک اُس کے دِل میں کھٹکی۔ وہ رُک گیا۔ وہاں پہ رُکا وہ ذہن پہ زور دے کر سوچتا رہا کہ وہ کیا بات تھی جو اُس کے دِل پر پھر رہی تھی مگر ہاتھ نہ آتی تھی۔ پھر یکبارگی جیسے کسی معمے کا کھویا ہُوا حرف مِل جائے، اُسے یاد آ گیا کہ وہ عورت جو کچھ دیر پہلے وہاں سے گزرتے ہُوئے اُس نے دیکھی تھی، جس کی چال ڈھال میں اُسے مانوسیت کی جھلک نظر آئی تھی، وہ تو وہی عورت تھی جس کو اُس نے ملتان میں کنیز کے دفتر میں دیکھا تھا۔

دو مزدُور بھٹے سے سڑک کی جانب آ رہے تھے۔ اعجاز نے اُنہیں اِشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"وہ عورت،" اُس نے پُوچھا "جو دو دِن سے غائب ہے، لمبے قد کی، گوری سی، گول مُنہ والی عورت تھی؟"

"ہاں جی،" ایک مزدُور نے جواب دیا۔ "ایسی ہی تھی۔" پھر وہ خُود بخود باتیں کرنے لگا۔ "کسی بھٹے سے نہیں آئی تھی جی، نہ اُس کے پاس پرچی تھی نہ کوئی پیشگی کا معاملہ تھا۔ بس آ کر کام پر لگ گئی تھی۔ کسی کے ساتھ بولتی چالتی بھی نہ تھی۔ ہمیں تو اُس کی سمجھ نہیں آئی ملک جی۔"

"میرے خیال کے اندر تو وہی سارے فساد کی جڑ تھی،" دُوسرا مزدُور بولا۔

"اچھا؟" اعجاز کا مُنہ وا تھا۔

"ہاں جی۔ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی۔ بڑے ملک صاحب نے ایک ٹبر کو بے دخل کر کے اُس زنانی کو سب سے اچھی کوٹھڑی دی تھی۔ کبھی بڑے ملک اَور کبھی چھوٹے ملک صاب اندر گھس جاتے تھے۔ مگر ہم تو بات نہیں کرتے، نہ گواہی کے لئے آگے آئیں گے۔ غریب آدمی ہیں، ہماری روزی کا مالمہ ہے جی۔ ہمیں کیا پڑی ہے بڑے لوگوں کی باتوں میں آئیں۔ آپ تو ہمارے ہمدرد ہیں اِس لئے بات سچی سچی بتا دی ہے۔ ہمیں پتا ہے آپ ہماری طرفداری کے آدمی ہیں۔"

مگر اعجاز اُس کی بات نہ سن رہا تھا۔ اُس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اَور دِل اُچھل رہا تھا۔ مزدُور کوئی جواب نہ پا کر اَپنے راستے پہ چل دیئے تھے۔ اعجاز دیر تک وہاں پر بھونچکا بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے مشکل سے، کئی کک لگا کر موٹر سائیکل سٹارٹ کی اَور دھیمی رفتار سے اُسے چلاتا ہُوا گھر کو چل دیا۔ اُس کے بدن میں لرزش تھی، جسے روکنے کی وہ سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

حصّہ ہفتم

"میں تنگ آ چکا ہوں۔
"میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔
اب میں صرف ایسی باتیں لکھوں گا
جنہیں لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

اَیرش فریڈ۔ (جرمن سے ترجمہ۔ منیر الدین احمد)

باب 18

"اب تم اِتنی دُور چلے جاؤ گے؟" نسرین نے پُوچھا۔

"ہو سکتا ہے اِس سے بھی آگے چلا جاؤں۔"

"اِس سے بھی آگے؟" نسرین نے کہا۔ گو اُس کے الفاظ سوالیہ تھے، مگر اُس کے لہجے میں ایک بے اعتنائی کا رُخ تھا۔

چار ماہ ہو چلے تھے اَور سرفراز ابھی تک نسرین کے اَنداز کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اول تو نسرین کی ظاہری بناوٹ میں ایک عجیب تضاد تھا۔ اُس کا جسم اَیسا منحنی تھا کہ ہاتھ لگاتے جی ڈرتا تھا کہیں کٹک کر کے ٹوٹ نہ جائے۔ پھر سرفراز اُس کو چھونے کی حد تک بڑھا تو ایسی سہج سے ہاتھ رکھتا تھا گویا نوزائیدہ کو تھپک رہا ہو۔ مگر پہلے روز سے ہی نسرین کے اِنتہائی بے ہیجان چہرے اَور پُرسکوت آواز نے سرفراز پہ اُس کی شخصیت کے تنازعے کو عیاں کر دیا تھا۔ اِس دورخی نے نسرین کے اَندر ایک ایسی کشش پیدا کر دی تھی جس کے طلسم سے وہ آج تک نہ نِکلا تھا۔ نسوانیت کے ساتھ سرفراز کا تجربہ صرف نسیمہ کی حد تک تھا۔ نسیمہ کی خاصیت بھاری بھرکم، ٹھوس اَور گہری تھی۔ مگر سرفراز کے دِل میں جو بے راہ رو خصلت در آئی تھی وہ نسیمہ کی اِس پائیدار ہمواری سے خم کھانے لگی تھی۔ نسرین کی مختلف اَور متضاد شکلوں میں ایک مستقِل تناؤ کی کیفیت تھی جو سرفراز کو پنجوں کے بل کھڑے رکھے ہُوئے تھی۔ ایسی چاہت سے پہلے کبھی اُس کا واسطہ نہ پڑا تھا۔ ڈی بریفنگ وغیرہ کے عمل سے گزُرنے کے بعد سرفراز کی پوسٹنگ جہلم کی ہو چکی تھی اَور وہ ہر آٹھ دس دن کے وقفے پر کسی نہ کسی طور ایک دِن کے لئے شہر پہنچ کر کبھی کسی ریستوران میں، کبھی پارک میں، یا جمال کے میس کے کمرے میں نسرین سے ملتا تھا۔ اِس دوران سرفراز کو نسرین کے بارے میں صرف چند ایک معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ وہ ایک عمر رسیدہ ریٹائرڈ کرنل کی دُور کی رشتہ دار تھی جسے کرنل کا کنبہ گیارہ برس کی عمر میں اَپنے ہاں لے آیا تھا۔ کرنل کے بچے اب جوان ہو کر بیٹا امریکہ میں بس گیا تھا اَور بیٹی اَپنے خاوند کے ساتھ کراچی میں رہتی تھی۔ کرنل کی بیوی فوت ہو چکی تھی اَور وہ چھاؤنی کے علاقے میں اَپنی کوٹھی میں

نسرین اور ایک ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔ کرنل کی دیکھ بھال اور گھر کا تمام تر بندوبست نسرین کے ہاتھ میں تھا اور نسرین کے اخراجات کرنل کے ذمے تھے۔ نسرین نے پرائیویٹ بی۔اے کیا تھا اور اب یونیورسٹی میں فائن آرٹس کا ایم۔اے کر رہی تھی۔ سرفراز کو ٹیلیفون کی آزادی تھی۔ گھنٹی کا جواب شام کے وقت ہمیشہ نسرین دیتی تھی۔ کرنل کی کوٹھی بریگیڈیئر کرار کی کوٹھی کی عقبی سڑک پر تھی، اور بریگیڈیئر صاحب کی کرنل کے ساتھ تھوڑی بہت واقفیت بھی تھی۔ سرفراز اُس جانب سے گزرنے سے بھی احتراز کرتا تھا۔ آخر ایک روز نسرین نے اُس کا یہ خوف بھی دُور کر دیا۔

"میں مس نسیمہ کرار حسین کو جانتی ہوں"، وہ کمال متانت سے بولی۔

"نیمہ؟" سرفراز ایسے چونکا جیسے کسی نے اُس کے سر پہ ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ نظر جھکا کر خاموشی سے ریستوران کی میز پر گرے ہوئے روٹی کے ذرے چننے لگا۔ نسرین اِس موضوع پر مزید ایک لفظ نہ بولی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد اُس نے اطمینان سے اپنے امتحانات کی بات چھیڑ دی۔ نسرین نے نسیمہ کا ذکر ایسے انداز میں کیا تھا جیسے یہ کوئی عام فہم بات ہو۔ سرفراز نے سر اُٹھا کر متلاشی نظروں سے اُسے دیکھا۔ نسرین کے چہرے پہ کسی جذبے کی رمق نہ تھی۔ اِس بات کا احساس سرفراز کو اِس رشتے کے شروع میں ہو چکا تھا۔ جب وہ پہلے پہل نسرین کی شخصیت کا سراغ لگانے میں محو تھا اور اُس کی بُھول بھلیوں میں داخل ہونے کی سعی کر رہا تھا تو ایک طرف اُس نے جسمانی لمس کی تمام تر منزلوں کو حیرت انگیز طور پہ سہل پایا تھا، دُوسری جانب وہ اُس کے چہرے پہ کوئی معمول کا جذبہ دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ وہ خوش ہوتی تو ہولے سے مسکراتی، ناخوش ہوتی تو اپنی آزردگی کو کبھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔ عام طور پر جس مہم کو سر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی وہ سرفراز کے لئے کسی دقت کی حامل نہ ہُوئی تھی۔ اِختلاط کے سب مرحلے اُس کے آگے اِس طرح ڈھیتے چلے گئے تھے جیسے پکی دیواریں نہ ہوں بلکہ کچے گھروندے ہوں، اور وہ اپنی "قسمت" پہ انتہائی خوشگوار تعجب کرتا ہُوا اِس راستے سے سرپٹ گزر گیا تھا۔ تاہم بدنوں کی ملاوٹ کے ہر پڑاؤ پر سرفراز اِس احساس سے چھٹکارا نہ پا سکا تھا کہ ہو نہ ہو، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی رخنہ تھا جو پُر نہیں ہو رہا تھا، کہ نسرین کے اندر کسی نہ کسی مقام پر ایک دروغ کی عملداری تھی جس کے حصار میں سرفراز کا دخل نہ

ہو پا رہا تھا۔ آخر ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے وقتی حد تک یہ گتھی سلجھا دی۔

نسرین اُس سے ملنے آئی تو اُس نے آنکھوں پہ دُھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اُس کی زردی مائل سفید جلد پہ سیاہ شیشے دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ گفتگو کے دوران جب اُس نے ایک لحظے کو چشمہ اُتارا تو سرفراز نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور اُن کے گرد ہلکی سی سوجن نمایاں تھی۔

"تُم روتی رہی ہو؟" سرفراز نے پُوچھا۔

نسرین نے جواب دیے بغیر فوراً آنکھیں شیشوں سے ڈھک لیں۔ بعد میں، قربت کے لمحوں کے دوران، جب وہ دونوں جمال کے کمرے میں لمبے صوفے پہ دراز تھے، سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُس کا چشمہ اُتار لیا۔

"کیوں روتی رہی ہو؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"میرے گلاسز دو۔"

"پہلے بتاؤ پھر دوں گا۔"

"کیا بتاؤں؟"

"تُم روتی کیوں رہی ہو؟"

"ایک جلُوس میں پھنس گئی تھی۔ پولیس نے آنسو گیس پھینکی تھی۔"

"جھوٹ۔ آج شہر میں کوئی جلُوس نہیں نکلا۔"

"تُمھیں کیسے پتا ہے؟"

"مُجھے پتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کیوں روتی رہی ہو؟"

"میرے گلاسز دو۔" نسرین نے ہاتھ بڑھا کر چشمہ اُچکنا چاہا۔

سرفراز نے بازو لمبا کر کے چشمہ اُس کی زد سے باہر کر لیا۔ "پہلے بتاؤ۔"

"کیوں بتاؤں؟ کوئی دھونس ہے؟ میری ذاتی زندگی سے تُمھیں کوئی مطلب نہیں۔"

"مطلب ہے تبھی تو پُوچھ رہا ہوں۔"

"کوئی مطلب نہیں۔ تم اپنی ذاتی زندگی کی خیر مناؤ۔"

"منا تو رہا ہوں۔ میری ذاتی زندگی تُمھارے ہاتھ میں ہے۔"

"زیادہ باتیں مت بناؤ۔ صرف میری ذاتی عینک تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اِدھر لاؤ۔"

"نہیں دیتا۔"

چند لمحے چشمہ چھیننے کی کوشش کرنے کے بعد نسرین ہار کر بیٹھ رہی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ سرفراز نے جیب سے رومال نکال کر اُس کی آنکھوں پہ رکھنا چاہا تو نسرین نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر قمیض کے دامن سے آنکھیں خشک کریں۔

"یہ لو،" سرفراز پشیمانی سے بولا۔ "آئی ایم سوری۔"

نسرین نے چشمہ لے کر آنکھوں پہ لگا لیا۔ مگر وہ لیٹی نہیں۔ پہلو صوفے کی پشت سے ٹیکے، سَر جھکا کر بیٹھی رہی۔ اُس کا بدن کسی بے جان شے کی مانند ڈھیلا پڑا تھا جس سے اُس کی پشت کی گہری کمان بنی تھی۔ سرفراز نے اُس کی پشت پہ ہولے سے ہاتھ رکھا۔

"نسرین؟"

"ہُوں۔"

"کوئی پرابلم ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

نسرین نے خاموشی سے سَر جھٹکا۔

"نسرین، مائی لَو،" سرفراز نے کہا، "تمہیں اِس حالت میں دیکھ کر مجھے دُکھ ہوتا ہے۔"

نسرین نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور کئی لمحوں تک ٹھہری ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، "تم واقعی جاننا چاہتے ہو؟"

"ہاں، قسم لے لو جو مذاق کر رہا ہوں۔ میرے دِل کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

کمرے کی نیم روشنی میں سرفراز کو سیاہ شیشوں کے پار نسرین کی آنکھیں مدہم سی نظر آ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ حسب معمول سپاٹ تھا جس سے کچھ بھی ظاہر نہ ہوتا تھا۔

"میرے ماں باپ گاؤں سے آئے تھے؟" پھر اُس نے کہا۔

"تمہارے والدین؟" سرفراز نے بے خیالی سے پُوچھا۔ "پھر تم اَپ سیٹ کیوں ہو؟"

"باسٹرڈ کرنل،" نسرین نے یُوں کہا جیسے گلے کی گندگی نکل رہی ہو۔

"کیوں؟" سرفراز اچنبھے سے بولا۔ "کرنل نے کیا کیا؟ تمہاری اُس سے رشتہ داری نہیں ہے؟"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میرا خیال ہے شاید تم نے ہی ذکر کیا تھا۔"

"تم نے فرض کر لیا ہے۔ میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"آئی ایم سوری۔ میرا خیال تھا۔۔۔۔۔"

"ہم اِن لوگوں کے مزارعے ہیں۔ میرے ماں باپ گھر کے اندر بھی نہیں آ سکتے۔"

سرفراز نے اُسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ وہ سرفراز کے ہاتھ آہستگی سے پرے کر کے صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ منہ موڑ کر خلاء میں دیکھ رہی تھی۔ کالے شیشوں کے مقابل اُس کی جلد کی پیلاہٹ نمایاں ہو رہی تھی۔ سرفراز اُس کی جلد پہ ہمیشہ متعجب ہوتا تھا۔ اُس نے ایسی شفاف جلد کسی اور کی نہ دیکھی تھی۔ نسرین کے بالوں کی ایک سیاہ لٹ اُس کے گال پہ لٹکی تھی۔ سرفراز کا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ وہ اُس جبتلا بدن کو اپنے بازوؤں میں سنبھال کر چھپا لے، مگر اُس پتھر کی سی شبیہ کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

سرفراز کے دِل میں جہاں گہری ہمدردی کا جذبہ اُبھر رہا تھا وہاں اُسے ایک عجیب سے تحفظ کا احساس بھی ہو چکا تھا جیسے میدانِ جنگ میں دُشمن کی کمزوری کو بھانپ کر ہوتا ہے۔ اِس احساس سے اُس کے دل کے چور کو کچھ صبر آ گیا تھا گویا اِس لڑکی سے اب اُسے کوئی خدشہ نہ رہا تھا۔ نسرین کا درجہ کمتر ہو چکا تھا جس نے اِس تعلق کو کسی حد تک جائز بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ، اپنے اندر کھٹکتی ہوئی خرابی کو اُس نے ایک نظر نسرین کے دِل میں چھپے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جس سے اُسے نسرین کے ساتھ ایک انوکھی یکجہتی کا احساس ہوا تھا جیسے کہ روحوں کی اِس بدعنوانی میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ منضبط ہوں۔

اب جب کہ اُس کی یونٹ حیدر آباد جا رہی تھی تو جدائی کے خیال سے سرفراز کا دماغ جل رہا تھا۔

"اب تم اِتنی دُور چلے جاؤ گے؟" نسرین نے سپاٹ لہجے میں پوچھا تھا۔

"ہاں۔ ہو سکتا ہے اِس سے بھی آگے چلا جاؤں۔"

"اِس سے بھی آگے؟" نسرین نے کہا۔ "اس سے آگے تو کراچی ہے۔"

"وہاں بھی ہماری عملداری ہے۔"

"سرفی؟" کچھ دیر کے بعد نسرین نے کہا۔

"کیا ہے۔"

"احتیاط سے رہنا۔"

نسرین نے پہلی بار اُس کے بارے میں کسی قسم کی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مگر اُس کے لہجے میں تردد کی کوئی جھلک نہ تھی۔ نسرین کی یہی خاصیت تھی جو سرفراز کی خواہش کو مُستقِل الاؤ کی حدت پہ رکھتی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"وہ گڑبڑ والے علاقے ہیں۔"

"گڑبڑ والے علاقوں میں ہی تو ہماری ضرورت ہوتی ہے۔"

"میرا مطلب ہے تم لوگوں کے اپنے اندر بھی گڑبڑ ہے۔ احتیاط سے رہنا۔"

"کیا بات کر رہی ہو، میں نہیں سمجھا۔"

"تُمہارے دوست گرفتار کئے جا رہے ہیں۔"

سرفراز چونک اُٹھا۔ "تُمھیں کس نے بتایا ہے؟"

"بُھول گئے ہو؟ خُود ہی تو بتایا تھا۔ تُم نے کیپٹن سلطان کا نام لیا تھا۔"

"ہاں، وہ" سرفراز بولا۔ "سلطان میرا دوست نہیں ہے۔ انڈیا میں ہمارا ساتھی تھا، بس۔ باقی لوگوں کو میں صرف دور سے جانتا ہُوں۔ میرا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ احتیاط کی ضرورت اُن لوگوں کو ہوتی ہے جو اپنا کنٹرول کھو دیتے ہیں۔"

"اور تُم اپنے کنٹرول میں ہو؟" نسرین آنکھیں چمکا کر بولی۔ صرف یہی ایک نشانی تھی جس سے اظہار ہوتا تھا کہ وہ شرارت پر آمادہ ہے۔

"ہاں، میں مکمل کنٹرول میں ہُوں۔ یہ دیکھو۔ تُم بھی میرے کنٹرول میں ہو۔"

"سرفی چھوڑو مُجھے۔۔ ہر موقعہ بے موقعہ ہاتھ چلانے لگتے ہو۔"

"خود مُجھے بھڑکاتی ہو اور پھر میرے ہاتھ پکڑتی ہو؟"

"میں بھڑکاتی ہوں؟ تمہیں بھڑکانے کے لئے کیا محنت کی ضرورت ہے؟ ہر وقت بھڑکے رہتے ہو۔ میں تو تمہیں احتیاط کی نصیحت کر رہی ہوں۔"

"تو کیا میں محتاط نہیں ہوں؟ جب بھی تم سے ملتا ہوں تو کیا احتیاط نہیں برتتا؟"

"سرفی بڑے بے شرم ہو۔"

"احتیاط برتنے میں بے شرمی کی کیا بات ہے؟"

"ہاتھ پرے کرو۔ تمہیں تو کسی بات کی تمیز ہی نہیں ہے۔ دیکھو پھر میں تمہیں سرفرازا کہنا شروع کر دوں گی جیسے تمہاری بھابھی کہتی ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"تم نے۔"

"افسوس صد افسوس۔ کیسی کیسی باتیں میں نے تمہیں بتا دی ہیں۔"

"اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اِن باتوں کو۔"

"کن باتوں کو؟"

سرفراز کے دِل میں ایک ہوک تھی، کہ وہ دور جا رہا تھا اور نسرین اِسے معمول کی بات تصور کر رہی تھی۔ "تمہیں پتا ہے کہ میں اب تم سے مِل نہیں سکوں گا؟"

"کیوں، پھر پی۔ او۔ ڈبلیو ہو جاؤ گے؟"

"نہیں، مگر روز روز تو نہیں آ سکتا۔"

"اب کوئی روز روز آتے ہو؟"

"ہفتے میں ایک بار تو آ جاتا ہوں۔"

"وہاں سے کتنی دیر میں آیا کرو گے؟"

"کچھ پتا نہیں۔ اِٹ ڈپنڈز۔"

"آون واٹ؟"

"چھٹی۔ جیب۔ حالات۔"

"تینوں چیزیں تمہارے اختیار سے باہر ہیں۔"

سرفراز نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ "تم میرے اختیار میں ہو؟"

نسرین نے نہایت دھیمی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "ہاں" گویا اثبات میں جواب دے رہی ہو اور اِس بارے میں سنجیدہ بھی نہ ہو۔

سرفراز کا لہجہ یکدم بدل گیا۔ "ایسے نہیں" وہ بولا۔ "سچ سچ بتاؤ۔"

نسرین کی آنکھوں میں بھی گہرائی کی جھلک ابھر آئی تھی۔ وہ چند لمحے تک خاموش بیٹھی ایک تار سرفراز کو دیکھتی رہی، پھر بولی، "کون کسی کے اختیار میں ہوتا ہے سرفی۔"

"کیوں نہیں ہوتا" سرفراز نے کہا۔ "سب کچھ اختیار میں ہوتا ہے۔ صرف ارادے کی بات ہے۔"

"کس کے ارادے کی؟ میرے ارادے کی، تمہارے کی، یا کسی دُوسرے کے ارادے کی؟"

"کس دوسرے کی؟"

"ہر ایک کے اُوپر کسی دُوسرے کا سایہ ہوتا ہے۔"

"نان سینس،" سرفراز نے کہا۔ "یہ کتابی فلسفے ہیں۔ آدمی خُود اپنے ارادے کا مالک ہوتا ہے۔"

نسرین کے چہرے کا تاثر فوراً اپنی اصلی حالت پہ آگیا۔ وہ بے معلوم سے انداز میں ہنس کر خاموش ہو رہی۔ سرفراز کے دِل کی خلش نہ تھمی۔ وہ یہ دیکھنا اور سننا چاہتا تھا کہ نسرین اُس کی جدائی کے خیال سے آزردہ خاطر تھی، اور گو وہ نسرین کی خصلتوں سے واقف تھا، تاہم اپنے تمام تر اندیشے کے خلاف، اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ جب تک وہ جہلم میں تھا اُسے اِس بات کی تسلی رہی تھی کہ وہ کسی وقت بھی اپنی خواہش کے مرکز تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جب سے اُسے پتا چلا تھا کہ وہ چار چھ سو میل دور جا رہا تھا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا خدشہ آخر کار سچ ثابت ہونے والا تھا، کہ نسرین جس پہ کبھی اُس کی مکمل عملداری نہ رہی تھی، اب اُس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ اُس کی بیتابی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی۔

"تم کیا کرو گی؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کیا مطلب کہ کیا کرو نگی؟"

"مجھے یاد کرو گی؟"

"ہاں۔"

"اپنی سہیلیوں اور ہم جماعتوں سے ملتی رہو گی؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"تمہاری زندگی یوں ہی چلتی رہے گی؟"

"ہاں ہاں" نسرین زچ ہو کر بولی۔

"اور کیا کرو گی؟"

نسرین اچانک مُنہ کھول کر ہنس دی۔ "تمھیں یاد کرتے کرتے شہید ہو جاؤں گی۔"

"مذاق مت کرو۔"

"مذاق کون کر رہا ہے؟"

"ایک بے وجہ غصہ سرفراز کے دماغ کو چڑھ رہا تھا۔ نسرین کی ہنسی ٹھٹھا بن کر اُسے لگی تھی۔ اُس نے لپک کر نسرین کے کندھے دبوچ لیے اور اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"میرا مذاق مت اُڑاؤ" وہ چیخ کر بولا۔

سرفراز کے طاقتور ہاتھوں کی گرفت میں نسرین ایک نازک پرندے کی مانند ٹھٹھر کر رہ گئی۔ سرفراز نے دوبارہ اُسے جھنجوڑا تو گردن پر اُس کا سریوں آگے پیچھے جھٹکے کھانے لگا جیسے کھلونے کا سر اپنی کلوں پر ہلتا ہے۔ جھٹکوں کے درمیان نسرین کی ہکلاتی ہوئی زبان سے الفاظ رُک رُک کر نکل رہے تھے۔

"سرفی۔۔۔ سرفی۔۔۔ میں م م مذاق نہیں۔۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔ تم پ پ پاگل۔۔۔۔" سرفراز کے سر پر بھوت سوار تھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک طمانچہ نسرین کے گال پہ مارا۔ نسرین ٹھٹک کر بت کی مانند ساکت ہو گئی۔ آنسو اُچھل کر اُس کی آنکھوں پہ چھا گئے، جیسے چپت کی ضرب نے اُس کے بدن سے کشید کئے ہوں۔ دونوں سناٹے کے عالم میں آمنے سامنے کھڑے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ دفعتاً سرفراز کا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ ایک ہزیمت خوردہ جانور کی مانند بازو لٹکائے نسرین کے سامنے کھڑا تھا۔

پھر وہ اچانک گڑگڑانے لگا۔ "مجھے معاف کر دو نسرین۔ خُدا جانتا ہے مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ خُدا کے لئے۔۔۔۔" اُس نے نسرین کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ نسرین ایسے اچھل کر دور ہٹ گئی جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ سرفراز نے دوبارہ اُسے

پکڑ لیا اور اُسے باہوں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے بازو نسرین کی کمر کے گرد کسے تھے۔ نسرین اپنا بدن اس سے جدا نہ کر سکی، مگر اُس نے اپنے ہاتھ سرفراز کی چھاتی پہ جما کر پورے زور سے اُس کے چہرے کو پیچھے دھکیل دیا۔ اِسی کشمکش میں دونوں بستر پہ جا گرے۔ سرفراز بستر سے کھسک کر گھٹنوں کے بل فرش پہ بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھوں میں نسرین کے ہاتھ تھامے، وہ آنکھیں اٹھا کر بلبلانے لگا۔

"میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے تمہارا گناہ کیا ہے۔ خُدا کے واسطے مجھے معاف کر دو، مجھ پر رحم کرو، میری جان تُمہارے ہاتھ میں ہے۔"

نسرین کا جسم لکڑی کی طرح اکڑا تھا۔ اُس کے زرد گال پہ سرفراز کی انگلیوں کے سرخ نشان اُبھر آئے تھے، اور اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اُس کی نظر سامنے ایک نقطے پہ ٹھہری تھی۔ "نسرین، کچھ منہ سے بولو، مجھ سے بات کرو، مجھے تُم سے ایسی---- ایسی محبت ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آئی لو یُو، لو یُو، لو لو لو لو یُو----" نسرین کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔ کئی منٹ تک وہ سرفراز کی لجاجت بھری آواز سنتی رہی۔ پھر اُس نے نرمی سے اپنے ہاتھ سرفراز کے ہاتھوں سے الگ کئے اور دونوں ہاتھ سرفراز کے سر پر رکھ کر اُسے اپنی گود میں چھپا لیا۔

وہ اِسی انداز میں بیٹھے تھے کہ جمال نے ہولے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دونوں جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نسرین نے اپنے کپڑوں پہ ہاتھ پھیر کر انہیں سیدھا کیا اور بستر سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ سرفراز نے ہاتھ سے اپنے بال بٹھائے، جیب سے رومال نکال کر چہرہ خشک کیا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

"آئی ایم سوری،" جمال نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "میں ریکٹ لینے آیا ہوں۔"

"ہم تو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں،" سرفراز نے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

"زلفی سے ایک سیٹ کی شرط لگی ہے،" جمال کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کتنے کی؟"

"سو روپے کی۔"

"بس؟"

"پیسوں کی بات نہیں، ذرا اُس کی ہوا نکالنی ہے۔ جب سے اُس نے مار کر کے ساتھ کھیلنا شروع کیا ہے بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔"

کچھ دیر تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نسرین اپنے گال پہ ہتھیلی رکھے کہنی گھٹنے پہ ٹکائے، خاموش بیٹھی رہی۔ پھر جمال اُٹھ کر اپنا ٹینس کا کٹ اِکٹھا کرنے لگا۔ سرفراز نے اجازت چاہی۔

"یار گاڑی تو منگوا دو،" سرفراز نے کہا۔

"باہر کھڑی ہے۔" جمال نے دروازے سے سر نکال کر ڈرائیور کو ہدایت کی وہ بیبین صاحب کو ڈراپ" کر آئے۔

سرفراز ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پہ بیٹھا اور نسرین پچھلی سیٹ پہ تھی۔ سارا راستہ خاموشی میں طے ہوا۔ سرفراز کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے۔ جب نسرین کے یونیورسٹی گیٹ پر جیپ رُکی تو سرفراز نے نیچے اُتر کر اپنی سیٹ اُٹھا دی۔ نسرین جھک کر باہر نکلی تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کے لبوں پر بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ اُس کی رنگت میں سرخی کی جھلک تھی اور گال کے نشان ماند پڑ گئے تھے۔ میکانکی طور پر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر رخسار کو چھوا۔

"فون کرنا" وہ سرگوشی میں بولی اور مڑ کر گیٹ کے اندر چلی گئی۔

کچھ دور جا کر جیپ ایک چوراہے پر گاڑیوں کے بے ہنگم جمگھٹے میں پھنس گئی۔ بائیسکل سے لے کر ٹرک تک ہر نوع کی سواری ایک دُوسرے کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ چوراہے میں دو تین سپاہی اور ایک سارجنٹ بازو لہراتے، سیٹیاں بجاتے ہوئے دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ ٹریفک کا عفریت ہر طرف پھنکار رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا یہ گانٹھ کبھی نہ کھلے گی۔ سرفراز اُکتایا بیٹھا ڈیش بورڈ پر بیتابی سے اُنگلیاں بجا رہا تھا کہ ایک سپاہی نے جیپ کے دروازے پر ہاتھ مارا۔ سرفراز نے دروازہ کھولا۔ پہچاننے میں اُسے ایک دو سیکنڈ لگے، پھر وہ ہنس کر بولا۔ "اوئے عباس؟"

عباس اُس کے سامنے کھڑا دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سرفراز کی نظر اُس کی رانوں کے بیچ میں گئی، جہاں اُس کی خاکی پتلون کے اندر ایک بُنچہ سا بنا ہوا تھا۔

"تو اِدھر کیا کر رہا ہے عباس؟"

"دیکھ لو، سڑکوں کے سردار بنے ہوئے ہیں۔ آؤ کوئی چاء پانی ہو جائے۔"

"چھوڑ یار، بس تو ادھر سے ہمیں نکال۔ میں جلدی میں ہوں۔"

عباس نے ایک نظر سرفراز کے باوردی ڈرائیور کو دیکھا اور اُس کا سینہ فخر سے پھول کر چوڑا ہو گیا۔ اُس نے زور شور سے تین چار بار سیٹی بجائی۔ سارجنٹ نے ادھر دیکھا تو عباس نے ہاتھ کے تیز تیز اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔

"کیا بات ہے؟" سارجنٹ نے قریب آ کر پُوچھا۔

"یہ کرنل صاب ہیں" عباس نے سرفراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔

سارجنٹ نے شبے کی نظروں سے سرفراز کو دیکھا جو سادہ کپڑوں میں تھا۔ عباس نے سارجنٹ کی نظریں دیکھ کر باوردی ڈرائیور کی جانب اِشارہ کیا اور فوجی جیپ پر ہاتھ مار کر بولا،

"کرنل صاب میرے بھائی ہیں۔"

سرفراز سارجنٹ کو دیکھ کر مسکرایا۔ سارجنٹ کے چہرے پہ ٹریفک کی بدنظمی کی ہراسانی پھیلی تھی۔ عباس اور سارجنٹ نے مِل کر سیٹیاں بجائی اور بازو لمبے کر کے چاروں طرف اِشارے کرنے شروع کر دیئے۔ عباس اردگرد کی گاڑیوں پر ہاتھ مار مار کر چیخ رہا تھا "کرنل صاب کی جیب کو نکلنے دو۔ رستہ چھوڑو۔ فوجی ڈیوٹی ہے۔ جلدی کا معاملہ ہے۔ اِدھر موڑو، بس بس، اب رورس کرو۔ بس۔ باس۔ یا آس اب پورا موڑو پورا، پورا، پورا، چلو نِکل جاؤ۔" عباس دُوسری گاڑی کو نکال کر سرفراز کے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ "آؤ ڈرائیور صاب، میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ---- چوہدری صاب آپ کدھر گھس کر جا رہے ہیں، ساری سڑک بند کر دی ہے، کچھ خیال کرو----"

"ایک گھنٹے سے پھنسے ہوئے ہیں بھئی، نہ آگے رستہ ہے نہ پیچھے۔ آپ لوگوں نے تماشا لگایا ہوا ہے۔"

"حوصلہ کر چوہدری، گھنٹے کا مکام نہیں۔"

"کرنل صاب کو جلدی ہے تو ہم کیا آلو چھولے بیچنے آئے ہیں، ہم بھی امرجنسی میں جا رہے ہیں۔"

"ملٹری افیسر سے اُوپر کوئی امرجنسی نہیں،" عباس رعب سے بولا "چلو نکلو، چلان

کروانا ہے؟"

"گاڑیوں پہ ہاتھ مارتا، سائیکل سواروں کو دھکیلتا، چیختا چلاتا اور سنیاں بجاتا ہوا عباس آگے پیچھے بھاگتا رہا۔ سرفراز ہونٹوں پہ مسکراہٹ لئے عباس کی کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ میں رستہ صاف ہوگیا۔ سرفراز کا ڈرائیور نکلنے لگا تو عباس بھاگ کر برابر آ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ عباس جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ پتلون کے آسن میں اُس کا بٹوہ گتھل متھل کر رہا تھا۔ سرفراز نے دیکھا عباس خاموشی سے ہنس رہا تھا اور انگلی سے اپنے شانے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر ایک سرخ فیتی لگی تھی۔ سرفراز ہنس پڑا۔

"ہاں" وہ بولا، "مبارک ہو۔ مجھے چاچے سے خبر مل گئی تھی۔"

"گھر گئے تھے؟"

"پچھلے جمعے کو گیا تھا۔"

"سب ٹھیک ٹھاک تھے؟"

"سب ٹھیک تھے۔ سنا تھا تیری تبدیلی بھی ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔ باڈر پر" عباس نے کہا۔ "آڈر آ گئے ہیں۔"

"چلو، تیری مرضی کی جگہ مل گئی ہے۔"

"پھر چاء پانی نہ ہو جائے؟"

"نہیں، میں جلدی میں جا رہا ہوں۔ تو اپنا کام کر۔"

"پکی بات ہے؟"

"ہاں ہاں۔" سرفراز نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور جیپ بھگا کر لے گیا۔ عباس وہاں کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ سرفراز سیٹ پہ دراز، لبوں سے ہلکی ہلکی سیٹی بجانے لگا۔ نسرین کے الوداعی انداز، اور عباس کے ساتھ اچانک ملاقات سے اُس کی طبیعت کچھ کھل گئی تھی۔

جمیلہ کی شادی شروع تھی۔

چاچے احمد کے گھر کے صحن کی ایک دیوار مدت ہُوئی درمیان سے ٹوٹ چکی تھی۔ اُس کا گھر چک بیاسی کے ایک سرے پر واقع تھا اَور دیوار سے ملحقہ ایک کھلا میدان تھا جس کے مالکانہ حقوق کا پچھلے اٹھائیس برس میں فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ اِس ساٹھ ستر مرلے قطعہ زمین کے لِئے تین دعویداروں، راٹھوروں، قریشیوں اَور ڈوگروں کے درمیان مقدمے بازی چل رہی تھی جو اب دُوسری تیسری نسل تک آ پہنچی تھی۔ چنانچہ اِس میدان کی نہ حد بندی ہو سکی تھی نہ ہی اِس پہ کوئی عمارت تعمیر ہُوئی تھی۔ صرف اس کے کناروں پہ غلاظت کے ڈھیر لگے تھے۔ یہ دیسی کھاد کے ذخیرے تھے جو گلے سڑے پتوں اَور اِنسانی و حیوانی فضلات کا مرکب تھے۔ سفیدہ زمین کے برعکس، اِن کھادوں کی ملکیت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ روڑی کی ڈھیری رحمٰن بھٹی کی تھی اور وہ علی راٹھور کی اَور تیسری فلاں کی تھی، اَور مالک کے سوا اس میں کوئی دُوسرا دخل اندازی نہ کرتا تھا۔ مالکان مقرر موسموں میں اپنے اپنے حصوں سے کھاد اُٹھا کر فصلوں میں بکھیرتے رہتے تھے۔ گو یہ ذخیرے گندگی اَور بدبو کے ڈھیر تھے، مگر ماحول کھلا ہونے کی وجہ سے گردو پیش کے گھروں کے لِئے ناقابل برداشت حد تک تکلیف کا باعث نہ بنتے تھے۔ چاچے احمد کے صحن کی مسمار شدہ دیوار کے رستے گاؤں کی کچی سڑک تک جانے میں صرف چند قدم کی سہولت ہوتی تھی، پھر بھی گھر کے سب لوگ عموماً اِسی رستے سے آمدورفت رکھتے تھے، تاآنکہ اُنہیں گلی میں دُوسری طرف جانے کی ضرورت پیش نہ آئے، جس صورت میں وہ پھر گھر کا اصل دروازہ استعمال کرتے تھے۔

بارات کے بیٹھنے کے لِئے چاچا احمد اُسی میدان میں زمین پر دریاں بچھانے کا انتظام کر کے اپنے تئیں مطمئن ہو بیٹھا تھا۔ اعجاز نے گندگی کو دیکھ کر ناک مُنہ چڑھایا، مگر چپ رہا۔ سرفراز کو شادی میں شریک ہونے کے لِئے چُھٹی نہ مِل سکی تھی۔ عباس چُھٹی لے کر پہنچا تو اُس نے سارے کام رُکوا دیئے۔ نور پور سے دریاں ریڑوں پر لد کر آئیں تو عباس نے اُنہیں صحن میں اُتروا دیا۔ ریڑوں کو اُس نے کرسیاں لانے کے لئے واپس بھیج دیا۔ گول گول لپٹی ہُوئی دریاں دِن بھر صحن میں پڑی رہیں۔ دسترخوانوں کے بندھے ہوئے گٹھے اُن

کے اُوپر رکھے گئے تھے تاکہ مٹی سے خراب نہ ہوں۔ شام کے وقت جب چاچا ایک بچھڑی حلال کرنے کے لئے خرید کر لایا تو عباس نے اُس کا سامنا کیا۔

"ابا تجھے، یہ ڈھیریاں نہیں دکھائی دیں؟"

"اِدھر ہی پڑی ہوتی ہیں۔ تو نے پہلے نہیں دیکھیں؟"

"مخول کی بات نہیں ابا۔ اِن کے سامنے بٹھا کر کھانا کھلاؤ گے؟"

"اوئے روڑی ہی ہے، کوئی زہر تو نہیں ہے۔"

"ابا گند ہے گند۔ یہ زہر ہوتا ہے۔ ہوا چل گئی تو اُڑ کر مُنہ میں آئے گا۔"

"چھوٹا موٹا تِل تنکا کچھ نہیں کہتا۔ اپنی بیری کے نیچے والی روڑی یاد ہے؟"

"ہاں۔"

"وہاں سے بیر چن چن کے کھایا کرتا تھا کہ نہیں؟ تیری جان کو تو کوئی روگ نہیں لگا۔"

"ابا تو کس زمانے کی بات کرتا ہے۔ چل چھوڑ۔ میں اِس کا اِنتظام کرتا ہوں۔ کرسیوں کے لئے میں نے ریڑے بھیج دیئے ہیں۔"

"کیوں، سرورے کے چوتڑوں کو دریاں چبھتی ہیں؟"

"ابا، ابا تو سمجھتا کیوں نہیں۔ تائے سرورے کی بات نہیں ہے۔ اگلی عہدے دار ہے۔ اُس کے تعلق والے لوگ آئیں گے۔ سرکاری ملازمین وغیرہ۔"

"تیرے اَیرہ وغیرہ کے لِئے ایک طرف پلنگ رکھ دیں گے۔ اُوپر کھیس بچھا دیں گے۔"

"وہ بھی رکھوا لیں گے۔ کرسیاں ضروری ہیں،" عباس نے کہا۔

"کرسیوں کے لِئے میزیں کدھر سے آئیں گی؟"

"وہ بھی آ رہی ہیں۔ میں پہلے اس کا بندوبست کرتا ہوں،" عباس نے گندگی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"شہر میں پہنچ کر سب اب باؤ ہو گئے ہیں،" چاچا بڑبڑایا۔

عباس نے حسن اَور حسین کو روڑی کے مالکان کے پیچھے دوڑایا۔ پولیس کا ملازم ہونے کے واسطے سے گاؤں کے اندر عباس کی ایک حیثیت تھی۔ کچھ ہی دیر میں تین چار

آدمی اکٹھے ہو کر آ گئے۔

"چوہدری باس،" مدعا سن کر ایک بولا "ہمارے کلن میں حرف پڑ جاتا تو ایک پہر میں صفایا کر دیتے۔ چوہدری اچھے نے ایک بول مُنہ سے نہیں نکالا۔ یہ کوئی بات ہے۔ ہمارے گاؤں کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ ہماری عزت ہے۔"

"ٹھیک ہے،" عباس نے کہا۔ "ابھی وقت نہیں گیا۔ ایک دِن بیچ میں ہے۔ کل اُٹھا دو۔ جگہ برات کے بیٹھنے کے لائق ہو جائے گی۔"

روڑی کے مالکان، جن کا خیال تھا کہ معاملہ ٹل جائے گا اپنی سادگی میں بات کر کے پھنس گئے تھے۔ چاروں کے چاروں کمر پہ ہاتھ رکھے، اپنی ڈھیریوں کو یوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی دفعہ نظر آ رہی ہوں۔ پھر ایک نے دُوسرے سے کہا،

"کدھر کو لے جائیں؟"

"بلّو رائیں نے ابھی چارہ کاٹا ہے،" عباس نے کہا "اُس کے کھیت میں لگا دو۔"

"ہاں جی ہاں" بلّو ارائیں، جو پاس ہی کھڑا تھا، سر ہلا کر بولا۔ "میں حاضر ہوں۔"

"تُو تو حاضر ہو گا بلّو،" علی راٹھور خشمگیں نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "اُدھر سے اُٹھاتے اُٹھاتے آدھی روڑی تیری زمین میں رہ جائے گی، تو حاضر نہیں ہو گا تو اَور کیا ہو گا؟ اِتنا ہی دیانت والا ہے تو جو روڑی تیرے کھیت میں رہ جائے اُس کی قیمت چکا لے۔"

"غریب آدمی ہوں چوہدری علی، کُل آدھے کِلّے کی میری پیلی ہے، میں کہاں سے قیمت ادا کر سکتا ہوں؟"

"تالاب کے کنارے ڈال دو،" عباس نے کہا۔

"سارے گاؤں کی بھینسیں اُدھر نہاتی ہیں، آتے جاتے مُنہ مار مار کے صفایا کر دیں گی۔"

"تو کیا سارا دِن اِدھر کوے چڑیاں مُنہ نہیں مارتے؟"

"خدا کا نام لے چوہدری باس۔ بھینس میں اَور چڑی میں فرق تو دیکھ۔"

"اوئے باسے،" چاچا احمد دور سے پکارا، "دفعہ کر ان کیوں کو، میں برود مار کے اِن کی ڈھیریاں اُڑا دوں گا۔ دیکھوں گا کیا کرتے ہیں۔"

"ابا تو چپ کر،" عباس نے کہا "مجھے اِنتظام کرنے دے۔"

"چوہدری احمو، غصّہ نہ کر،" رحمن بھٹی بولا۔ "تیری بیٹی نہیں، ہماری بیٹی کا بیاہ ہے۔ ہم تو بات چیت کے ذریعے کوئی رستہ تلاش کر رہے ہیں۔"

"تیری بات چیت کا مجھے علم نہیں۔ میں نے رستہ بتا دیا ہے،" چاچا بدمزاجی سے بولا۔

"تلاب دُوسری طرف ہے،" ولی ڈوگر نے ایک دشواری کی نشاندہی کر دی۔

"ہاتھوں پیروں کی بات ہی ہے ناں،" عباس نے جواب دیا۔ "کچھ بندے میں دیتا ہوں، باقی کے تُم لے آؤ۔ رِل جل کر زمین صاف کر دیں گے۔"

"کچھ ریہڑے رِل جائیں تو کام جلدی ہو جائے۔"

"ریہڑوں والے روڑی کو قریب نہیں آنے دیتے،" بلو ارائیں بولا، "دُگنے پیسے دو پھر بھی حامی نہیں بھریں گے۔"

"عیسائیوں کا ریہڑا بھی ہے، اُن سے لے لو،" عباس نے کہا، "پیسے میں دے دونگا۔"

اگلے روز بیس پچیس آدمیوں اور بچوں نے رِل کر ٹوکریوں، ہاتھ والی ریہڑیوں اور عیسائیوں کے ریہڑے کی مدد سے میدان کی ایسی شکل نکالی کہ جیسے وہاں گندگی کا کبھی نشان بھی نہ تھا۔ پھر بیلچوں والے دو چار آدمی لے کر عباس میدان کی اُونچ نیچ کو ہموار کروانے لگ گیا۔

"پلین کر دو۔ بالکل پلین ہو جائے جیسے سڑک ہوتی ہے۔"

جب میدان ہموار ہو چکا تو آسمان صاف دیکھ کر دریاں بچھا دی گئیں۔ دریوں کے اُوپر کرسیاں اوندھی کر کے رکھ دی گئیں تاکہ گاؤں کے بچے اُن پر کود کود کر خراب نہ کریں۔ صحن کی دریوں پر بارات کی عورتوں کا انتظام تھا۔ دریوں کے علاوہ چند پھولدار بھاری بھاری پایوں والی چارپائیاں بچھائی گئی تھیں جو معتبر عورتوں کی نشست کے لئے مقرر تھیں۔ کچھ خاص مہمانوں کے طعام کی خاطر عباس نے دو بکرے مزید منگوائے تھے، جن کی چاچے احمد نے مخالفت کی تھی مگر عباس کے آگے اُس کی ایک نہ چلی تھی۔ نماز مغرب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بارات آ پہنچی۔ اُن کے بیٹھنے کے اِنتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ عباس کے دوستوں میں تین سپاہی ایک موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آئے تھے۔ اُن کے علاوہ ایک چھوٹا

تھانیدار شادی میں شریک ہونے کے لیئے آیا تھا۔ وہ اپنے تعلق والے کسی آدمی سے کار اور ڈرائیور مستعار لے کر آیا تھا' جو گاؤں سے نکلنے والی کچی سڑک پر کھڑی تھی۔ اُدھر بارات کے ساتھ محکمہ انہار کا ایس۔ڈی۔او۔ اپنی چھوٹی سی فیئٹ کار میں آیا تھا جس میں اُس کے ساتھ دُولہا سوار تھا اور پچھلی سیٹ پر دُولہے کی ماں اور بہنیں پھنس کر بیٹھی تھیں۔ اِس گاؤں میں یہ پہلا بیاہ تھا، جس میں تین کاریں شامل ہُوئی تھیں اور بارات کے ساتھ بینڈ باجے والوں کا دستہ آیا تھا۔ سرور راٹھور کا گاؤں تین کوس کے فاصلے پر پکی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ وہاں سے بینڈ والے تانگوں پہ' گاؤں کے چوہدری اپنی گھوڑیوں پہ اور عام مدعوئین بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر اور کئی پیدل چل کر آئے تھے۔ اُن کے بیچ دُولہا کا سرخ جھنجھنوں والا سجا سجایا گھوڑا بے سوار آیا' جس کی باگ ایک کمی تھامے ہُوئے تھا۔ وہی کمی سر پہ ایک ٹوکرا اُٹھائے ہُوئے تھا جس میں تازہ پھولوں کا سہرا رکھا تھا۔ سب کو ہدایت تھی کہ وہ بیاسی کو جانے والی کچی سڑک کے سرے پر بوہڑ درخت کے نیچے جمع ہوں اور اُس وقت تک ٹھہریں جب تک کہ بارات مکمل نہ ہو جائے۔ لوگ آ آ کر دُولہا کی آمد کے انتظار میں وہاں بیٹھتے گئے۔ باجے والے اپنے اپنے ساز کے کل پرزے کستے ہُوئے بیچ بیچ میں کوئی اکلوتی تان بلند کرتے رہے۔ اِدھر بیاسی کے میزبانوں کو علم ہو چکا تھا کہ بارات پکی سڑک پہ جمع ہو رہی ہے۔ کبھی کوئی نائی کا لڑکا یا میراثی وہاں تک جاتا اور اُنہیں دیکھ کر آتا۔ "آ گئے ہیں" واپس آ کر وہ کہتا۔ سب مُنہ اُٹھا کر دیکھنے لگتے۔ چھ سات برس سے لے کر دس بارہ برس تک کے لڑکے بھاگتے ہوئے جاتے اور لوٹ کر اطلاع دیتے کہ "آ گئے ہیں" اور پھر اُسی طرف کو بھاگ جاتے۔ پکی سڑک پر بوہڑ کے نیچے جب سب باراتی آ چکے تو آخر میں ایس۔ڈی۔او کی کار پہنچی جس میں دولہا اکرم راٹھور شادی کے کپڑے پہنے ننگے سر بیٹھا تھا۔ کار کے پیچھے پیچھے اکرم کا باپ سرور راٹھور اپنے سفید گھوڑے پہ نو سالہ نواسے کو اپنے پیچھے بٹھائے آ پہنچا۔ اکرم کار سے اُتر آیا۔ ٹوکرے میں سہرے والی پگڑی اُٹھا کر اُس کے سر پہ جمائی گئی اور نوعمر بھانجے کا ہاتھ' جو خود بھی چھوٹا سا دُولہا بنا ہوا تھا' اُس کے ہاتھ میں پکڑایا گیا۔ باجے والوں نے اپنے ساز زور شور سے بجانے شروع کئے اور یوں فضا کے اِس اِرتعاش سے بارات کی آمد کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ میزبانوں میں اِضطراب کی ایک کیفیت تھی۔ اِنتظامات مکمل تھے، مگر ہر کوئی، کسی خاص

بھم کے بغیر، آگے پیچھے دوڑنے بھاگنے میں لگا ہوا تھا۔ اُدھر بارات پکی سڑک سے اُتر آئی تھی اور بینڈ باجے کی معیشت میں کچی سڑک پہ آہستہ آہستہ گاؤں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ دو ڈھائی سو گز کا یہ فاصلہ اُنھوں نے رُک رُک کر کوئی آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ اُن کے استقبال کے لِئے اعجاز اَور تھانیدار مجیب اللہ کے علاوہ گاؤں کے پانچ سات معزز لوگ موجود تھے۔ چاچا احمد اَور عباس دور دور ہی چل پھر رہے تھے۔ بارات کو درجہ بدرجہ کرسیوں، پلنگوں اَور دریوں پر بٹھا دیا گیا۔ بیٹھتے ہی دودھ کی کچی لسی سے بھرے گلاس اُن کی تواضع کے لِئے پیش کئے گئے۔ میٹھی لسی کے گلاس چڑھاتے چڑھاتے مردوں کی بارات پہ نسبتاً خاموشی چھا گئی۔ مگر صحن میں عورتوں کی ہلچل مچی تھی۔ ڈھولکی جو گزشتہ تین چار دن سے وقتاً فوقتاً بجائی جا رہی تھی، اب مسلسل بج رہی تھی۔ میراثنوں کے ساتھ مِل کر گاؤں بھر کی لڑکیاں رخصتی کے گیت گا رہی تھیں۔ بارات کے ہمراہ آنے والی عورتیں بھی ایک ڈھولکی لے کر آئی تھیں۔ لڑکے اَور لڑکی والی ڈھولکیوں کا مقابلہ جاری تھا۔ ہر دو فریق ایک دُوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھے۔ عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھیں۔ باہر باجے والوں نے یکے بعد دیگرے تین چار گانوں کی دُھنیں بجائیں اَور اپنے کمال کے عروج پر پہنچنے کے بعد رُک گئے۔ پسینہ اُن کے چہروں سے بہہ بہہ کر گردنوں کے راستے اُن کے سفید کوٹوں کی کالروں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ باجے اَور طوطیاں ایک طرف رکھ کر اُنھوں نے اپنے لمبے لمبے میلے رومالوں سے پسینہ خشک کیا اَور دریوں پہ بیٹھ کر لسی کے گلاسوں سے پیاس بجھانے لگے۔ بینڈ کی جانب سے خاموشی ہوتے ہی بھانڈوں کی ٹولیاں آ گئیں جنھوں نے اپنا تماشا شُروع کر دیا۔ اُنھوں نے لڑکے والوں کی قوم، برادری اَور عادات و اطوار کے بارے میں اَیسے اَیسے لطیفے سنائے اَور پھبتیاں کسیں کہ عام حالات میں واجب القتل قرار پاتے، مگر اِس موقعہ پر بارات والوں نے ہنستے ہنستے دُولہا اَور اُس کے باپ کے سر سے وار وار کر نوٹوں کی ویلیں بھانڈوں کو دیں۔ بھانڈوں کی دو ٹولیاں تھیں۔ ایک چپ ہوتی تو دُوسری شُروع ہو جاتی۔ آخر جب لوگوں نے دیکھا کہ کافی ہو چکی تو بھانڈوں کو پکڑ کر نکال باہر کیا گیا۔ وہ کھانے کی اُمید میں مہمانوں سے ہٹ کر زمین پہ بیٹھ رہے۔ اب بارات کے آگے میزوں اور دریوں پہ دسترخوان بچھائے جانے لگے۔ اِسی دوران میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ چند بزرگ اَور کچھ نماز روزے کے پابند نوجوان

اِجازت لے کر مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ گھر کے اندر ڈھولکی اَور عورتوں کی چیخ و پکار اُسی طرح قائم تھی۔ کچھ دیر کے بعد نمازی مسجد سے لوٹ آئے۔ نکاح تین ماہ پہلے، بات پکی ہونے کے ساتھ ہی خاموشی سے ہو چکا تھا۔ اب صرف کھانا کھانے کی دیر تھی اَور دُلہن کی رخصتی کا مرحلہ تھا۔ دسترخوان لگ گئے تھے، دیگیں دم پر لگائی جا چکی تھیں، پاس ہی تنور لگا تھا جہاں سے گرم گرم روٹیاں نکال کر بڑے بڑے چھابڑوں میں ڈھیر کی جا رہی تھیں۔ مگر کھانا شروع نہ ہو رہا تھا۔ اصل میں ملک جہانگیر کا اِنتظار ہو رہا تھا۔ وہ چند روز پیشتر اعجاز کو ایک دُکھ بھرا پیغام بھیج چکا تھا۔ "ملک صاحب نے کہا ہے،" منشی نے آ کر بتایا تھا، "بیٹی کی رخصتی میری موجودگی کے بغیر نہ ہو۔ جیسے بھی ہو سکا میں آؤنگا۔ ہو سکتا ہے یہ آخری شادی ہو جس میں مَیں شمولیت کروں۔"

اِنتظار کرتے ہُوئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تو سب کو یہ بات بتا دی گئی۔ باراتیوں میں جو بے صبری کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، کچھ دیر کے لِئے رُک گئے۔ لوگوں نے آپس میں باتیں کرنا اَور پیٹ کو سہارا دینے کے لِئے مزید لسی مانگ کر پینا شروع کر دی۔ اس کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک گاڑی کی بتیوں کی روشنی کچی سڑک پہ آتی ہُوئی دکھائی دی۔ پنڈال سے کچھ فاصلے پر آ کر جیپ رُک گئی۔ چاچا احمد ایک طرف سے نمودار ہو کر آہستہ آہستہ گاڑی کی جانب بڑھا۔ اعجاز اُس سے پہلے جیپ تک پہنچ گیا۔ جہانگیر کو سہارا دے کر جیپ سے باہر نکالا گیا۔ زمین پہ پاؤں دھر کر وہ ایک موٹی سی چھڑی کی مدد سے ڈگمگاتا ہوا کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی اُس کے دو نوکر دائیں اَور بائیں بازو سے پکڑ کر چلاتے ہُوئے اُسے آگے لے کر آئے۔ سہاروں کے باوجود وہ قدم قدم، چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ عالمگیر، اعجاز اَور چاچا احمد اُس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہُوئے آدھے لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

"اِدھر آؤ ملک صاحب۔ یہاں تشریف رکھو،" درمیان والے آدمیوں نے اپنی کرسیاں پیش کیں۔

"بیٹھو بیٹھو جی،" اعجاز اُن سے بولا۔ "اور کرسیاں آ جاتی ہیں۔ جا اوئے زلفی، کرسیاں لے کر آ، آرام کرسیاں لے کر آ اندر سے۔" مگر اُن آدمیوں نے اِصرار کر کے جہانگیر اَور عالمگیر کو اپنی کرسیوں پہ بٹھا لیا۔ اَور خود سامنے کھڑے حال احوال پُوچھنے لگے۔

جہانگیر خاموشی سے سر ہلا کر جواب دیتا رہا۔ پھر اُس نے سر ہلا کر چاچے احمد سے پُوچھا۔
"سب کام ٹھیک ہو گیا ہے؟"
"اللہ کے فضل سے،" چاچے احمد نے جواب دیا۔

جہانگیر نے پہلی بار مُنہ کھول کر بات کی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تو وہ پہلے ہی تھا اَور اب اُسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہاتھ لگانے سے ہی مسمار ہو جائے گا۔ پھر بھی اعجاز کو خیال نہ تھا کہ اُس کی آواز، جو اُس کی شخصیت کا اہم جزو تھی، اتنی ناتواں ہو چکی ہو گی کہ مشکل سے کانوں تک پہنچے گی۔

"اللہ راکھا" جہانگیر نے دوبارہ ہاتھ اُٹھا کر کہا، اَور خاموش ہو گیا۔

دیگوں کے ڈھکنے اُٹھے اَور فضا میں بکھری ہُوئی کھانے کی دھیمی دھیمی خوشبو تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی۔ دیگی لوہے سے کفگیر ٹکرانے کی مخصوص آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ پلیٹوں کے چھوٹے چھوٹے مینار دسترخوانوں کے کناروں پر لا کر رکھ دیے گئے۔ چند منٹ کے اندر کھانے کی بڑی بڑی طشتریاں مہمانوں کے آگے پہنچ گئیں۔ باراتی، جن کی اشتہاء عروج پر تھی، کھانے پر پل پڑے۔ عشاء کی اذان ہُوئی، مگر نماز کے لئے پوری رات پڑی تھی۔ صرف اعجاز نے ایک بچے کو امام صاحب کی جانب پیغام دے کر دوڑایا کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی طعام میں شرکت کے واسطے تشریف لے آئیں۔

صحن میں عورتوں کا شور اُسی طرح جاری تھا۔ آٹھ دس نوجوان لڑکوں نے مسمار شدہ دیوار تک قطار بنا کر کھانے کی طشتریاں اندر پہنچانے پر اپنے آپ کو معمور کر لیا تھا۔ دیوار کے دوسری طرف اِسی طرح نوجوان لڑکیوں کی ایک قطار بنی تھی جو پلیٹیں اَور طشتریاں پکڑ پکڑ کر صحن میں مہمان عورتوں کے آگے رکھتی جا رہی تھیں۔ مردوں، عورتوں اَور بچوں کے ہجوم میں معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہی دو ٹولیاں ہیں جنہیں نہ بھوک محسوس ہو رہی تھی نہ کھانے کی فکر تھی۔ لڑکوں نے خوب اِستری کی ہُوئی سفید شلوار قمیض کے سوٹ اور کئی ایک نے بوسکی کی قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ انہوں نے سر میں تیل ڈال کر کنگھی سے بال جمائے تھے اَور چند ایک نے گلے میں پھولوں کے ہلکے ہار پہنے ہُوئے تھے۔ لڑکیاں رنگ برنگ ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھیں جو گیس لیمپوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ برتنوں کی کھنک کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار اَور نوجوان شرمیلی ہنسی کی آوازیں بلند

ہو رہی تھیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی آنکھوں میں چاہت کی چمک تھی۔ عالمگیر جوان لڑکوں لڑکیوں سے چند سال بڑی عمر کا تھا، لبوں پہ ہلکی مسکراہٹ سے انکھیوں سے اُن کی جانب نگاہیں پھینک رہا تھا۔ مگر اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا جہانگیر، لقمے منہ میں ڈالتا ہوا، ٹکٹکی باندھے اُن نوجوانوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اگر کوئی آس پاس سے جہانگیر کے ساتھ مخاطب ہو کر بات کرنے کی کوشش کرتا تو عالمگیر اُس کے بازو پہ نرمی سے ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہتا کہ ملک صاحب کو باتیں کرنے سے تھکاوٹ ہو جاتی ہے، جسے سن کر مخاطب کرنے والا پیچھے ہٹ جاتا، یا عالمگیر سے بات شروع کر دیتا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اب کھانے کی رسد ختم کر کے ٹوٹی ہوئی دیوار کے آر پار کھڑے باہم باتیں کرنے کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اچانک کسی بات پہ لڑکوں کے غول سے بلند قہقہوں کی آواز اُٹھی اور لڑکیوں کی طرف سے چیخ نما ہنسی پیدا ہوئی۔ پنڈال میں بیٹھے ہوئے سب ثانیۂ اُن کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"اوئے مسخریاں بند کرو،" اعجاز نے دور سے آواز دی۔ "چلو اُدھر چل کر بیٹھو،" وہ ہاتھ سے ہانکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا، "چلو چلو چلو۔"

لڑکیاں سر نیچے کر کے دیوار کے پیچھے چھپ گئیں۔ لڑکے مُنہ موڑ کر آہستہ آہستہ چند قدم پیچھے کو چلے۔ جیسے ہی اُنہوں نے اعجاز کی توجہ دُوسری طرف مبذول ہوتے دیکھی، فوراً پلٹے اور وہیں آ کھڑے ہوئے جہاں پرلی طرف لڑکیاں اپنے مورچے پر قائم تھیں۔ جہانگیر اپنے آگے رکھا بکرے کے گوشت کا سالن اور روٹی کھاتے کھاتے برابر اس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اعجاز نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جہانگیر کی کرسی کے عقب میں گاؤں کے دس بارہ کتے اور پانچ چھ بلیاں جمع تھیں۔ اعجاز کو اُن کی موجودگی کا علم اُس وقت ہوا جب ایک بار کتے بلیوں پر حملہ آور ہوئے اور دونوں نے مل کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ جہانگیر روٹی کا نوالہ توڑتا اور اُسے شوربے میں بھگو کر منہ میں رکھ لیتا۔ مگر اُس کے جبڑے روٹی کو چبانے کے لئے متحرک نہ ہوتے۔ اس کی بجائے یوں دکھائی دیتا کہ وہ اُس نوالے کو چوس رہا ہے۔ ایک دو منٹ کے بعد وہ روٹی کے ٹکڑے کو اصلی حالت میں منہ سے اُگلتا اور انگلیوں میں پکڑ کر عقب کی جانب اُچھال دیتا۔ کتے اُس پہ جھپٹ پڑتے۔ اِسی طرح وہ گوشت کی ایک بوٹی اُٹھا کر منہ میں رکھتا، کچھ دیر تک اُسے چوستا رہتا، پھر نکال کر پیچھے

پھینک دیتا۔ کتوں کو کسی نہ کسی طور علم ہو جاتا کہ ہوا میں اچھلا ہوا ٹکڑا روٹی کا ہے یا گوشت کا اور گوشت کی بوٹی پر وہ واضح تندی سے حملہ آور ہوتے۔ اِس کارروائی کے دوران جہانگیر نہ روٹی کو دیکھتا نہ میز پہ رکھی ہُوئی گوشت کی پلیٹ کو اور نہ ہی وہ اپنے پیچھے کتوں بلیوں پہ نظر ڈالتا، بلکہ اندھوں کی مانند ہاتھ سے ٹٹول کر روٹی توڑتا اور بوٹی اُٹھاتا، مُنہ میں چوس کر اُسے پیٹھ کے پیچھے گرا دیتا۔ یوں وہ برابر اپنے سامنے لڑکے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے، جو اب کاغذ کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر ایک دُوسرے پر پھینک رہے تھے، اِس عمل کو مکمل کرتا اور اِسے دہرائے جاتا۔ اُس شخص کو جس نے اِنتہائی وضعداری سے اپنی زندگی گزاری تھی اب اِس بات کا ذرہ برابر خیال نہ رہا تھا کہ لوگ اُس کی ٹکٹکی کو نامناسب خیال کر رہے ہوں گے۔ اُس کی نظروں میں لپک اور لچک، لالچ اور لجاجت----- زندگی اور موت کا ایک ایسا ملا جلا تاثر تھا جو اعجاز کے تصور پہ ثبت ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مسحور ہو کر جہانگیر کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک باراتی نے آ کر اعجاز سے بات شرُوع کر دی اور یوں اُس کی توجہ جہانگیر سے ہٹی۔ جب جہانگیر ختم کر چکا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے برتن اُٹھانے کو کہا۔ ایک آدمی لوٹا، صابن دانی، تولیہ اور چلمچی لے کر آیا۔ ہاتھ دھو کر جہانگیر نے عالمگیر سے اعجاز کو بلانے کے لیے کہا۔ عالمگیر نے ایک نوکر کو بھیجا۔ اعجاز گھر کے صحن سے نِکل کر آیا۔ جہانگیر کے پاس آ کر وہ اُس کی بات سُننے کو جھکا تو ایک آدمی نے کرسی لا کر اعجاز کے پیچھے رکھ دی۔ جہانگیر نے جیب سے نقدی کے دو تین بڑے نوٹ نکالے اور اعجاز کی جانب بڑھائے۔

"احمد خاں تو اُلٹے دماغ کا آدمی ہے، کبھی گرم، کبھی سرد۔ یہ لو۔ بیٹی کو جا کر دے دو۔"

"اِس کی کیا ضرورت ہے بھائی جہانگیر۔ آپ بیماری میں اُٹھ کر آ گئے ہیں، ہماری عزت دُگنی ہو گئی ہے۔ بس اِسی سے ہماری بیٹی کا بیاہ رچ گیا ہے۔"

"اُوں ہُوں۔" جہانگیر نے نفی میں سر ہلاتے ہُوئے نوٹ اعجاز کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ "یہ تمہاری ڈیوٹی ہے، بیٹی کے ہاتھ میں جا کر پکڑاؤ۔ یہ اُس کا حق ہے۔ سمجھ گئے؟" پھر اُس نے دو نوٹ عالمگیر کے ہاتھ میں دیئے۔ "لو عالم۔ لڑکے کو سلامی دے آؤ۔"

عالمگیر سلامی دے کر واپس آیا تو جہانگیر جانے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا فرض پورا ہو گیا ہے۔" وہ بولا۔ "میں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔"

چھڑی، عالمگیر اور نوکر کے سہارے سہج سہج چلتا ہوا جہانگیر اپنی جیپ تک پہنچا۔ چاچا احمد بھی کسی گوشے سے نکل کر اُسے الوداع کہنے کو اُس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد جہانگیر نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر اعجاز کے کندھے پر رکھا۔

"جو وعدہ تم نے میرا ساتھ کیا تھا وہ یاد ہے؟" وہ بولا۔ "عالمگیر تمہارا بھائی ہے۔"

"جی جی جی،" اعجاز نے کہا۔ "بھائی جہانگیر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مَیں اپنے لڑکپن میں،" جہانگیر نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دور کی جھلک تھی، "ایک بار کبیرے گیا۔ میں نے تمہارے دادا کو دیکھا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ بڑھاپے میں بھی اُس کی کیا جان تھی۔ کالی ٹاہلی کی طرح مضبوط اور سایہ دار تھا۔ تجھے دیکھ کر مجھے تیرا دادا یاد آتا ہے۔"

"عالمگیر ہمارا بھائی ہے، بیٹا بھی ہے۔ ایک آواز دے کر دیکھیے،" اعجاز نے کہا۔ "اِس کے پیچھے ہماری جان لڑے گی۔ مگر ابھی تو ہمارے سر پر آپ کا سایہ موجود ہے۔ آپ جلدی سے تندرست ہو جائیں۔ ابھی ہم نے بڑے کام کرنے ہیں۔"

جہانگیر نے کوئی جواب نہ دیا، نہ اُس کے چہرے پہ کوئی تاثر ابھرا۔ اُس نے ہاتھ کھڑکی سے اندر کھینچ لیا اور جیپ چل پڑی۔

جہانگیر کی روانگی کے چند ہی منٹ کے بعد صحن میں ہلچل مچ گئی۔ اعجاز کو اندر بلایا گیا۔ ڈولی اُٹھنے والی تھی۔ چارپائیوں پہ پھیلا ہوا جہیز سنبھالا جا چکا تھا۔ جمیلہ کو سہارا دیئے ماسی نقاہت بھری چال چلتی، ڈولی کے پاس لے آئی جو صحن کے بیچ میں رکھی تھی۔ سسرال کی عورتوں میں روانگی کی کھلبلی تھی اور وہ خوشی سے ہنس رہی تھیں۔ دوسری جانب میکے کی عورتیں خاموش کھڑی تھیں۔ جب اعجاز نے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر جمیلہ کو ڈولی میں بٹھایا تو ماسی، سکینہ اور اُس کی پھوپھی زاد بہنوں کی زاری کی آواز اُٹھی۔ بارات کے ساتھ آئی ہوئی تین میراثنوں نے ڈھولکی کے بغیر ہی رخصتی کا گیت گانا شروع کر دیا۔ اعجاز، جمیلہ کے پھوپھا اور اُس کے دو بیٹوں نے ڈولی اُٹھا کر اُس کے ڈانڈے کندھوں پہ رکھے اور اُسے باہر لے چلے۔ ڈولی جب صحن سے نکلی تو سکینہ اور اُس کی ماں بین کرنے لگیں۔

کچی سڑک پہ پہنچ کر ڈولی کہاروں کے حوالے کر دی گئی۔ تازہ دم بینڈ والوں نے ایک ساتھ اپنے سارے ساز اَور باجے بجانے شروع کر دیئے۔ چند منٹ تک اِسی طرح زور شور سے بجانے کے بعد وہ ایک دم رُک گئے اَور صرف طوطی والے کے لئے وقت چھوڑ دیا گیا۔ اکیلے طوطی والے کے ہاتھ میں میدان آیا تو مردوں اَور عورتوں کا وہ مجمع اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ آسمان صاف اَور پُرسکوت تھا' اَور آدھے چاند کی اُس رات میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طوطی کی پیاسی' نوکدار' دِل جھپٹ لینے والی آواز کے سحر تلے تمام مرد و زن ایک سکتے کی حالت میں آ گئے ہُوں۔ طوطی والا گالوں کو حد تک پھلائے' ماتھے اَور گلے کی رگیں ابھارے' لپک لپک کر بیٹی کی الوداعی کے مانوس سُر ہوا میں اچھال رہا تھا اَور آنسو بہاتی ہُوئی عورتوں کو اِس بات کا علم تھا کہ اُن سروں کی کسک ڈولی میں بیٹھی ہُوئی دُلہن کے دِل میں اُتر جائے گی اَور مرتے دم تک جب بھی کبھی اُس پہ کوئی مشکل کا لمحہ آئے گا تو وہ صرف اپنی ماں اَور باپ اَور بھائی کو یاد کرے گی اَور اِس مدفن کو لئے اُن کی جانب دوڑنے کو زنجیریں تڑائے گی۔

چند منٹ کے بعد بے دم ہو کر طوطی والے نے اسے لبوں سے جدا کیا تو سارا بینڈ ایک ساتھ دوبارہ شروع ہو گیا اَور ساکن مجمعے میں حرکت آ گئی' جیسے کسی تصویر میں یکدم جان ڈال دی گئی ہو۔ کہاروں کے کندھوں پہ ڈولی اَور بارات بینڈ کی جلو میں پکی سڑک کی جانب روانہ ہُوئی جہاں تانگوں' بیل گاڑیوں اَور گھوڑوں کی سواریاں کھڑی تھیں۔ کچھ دُور تک ماسی اَور سکینہ کے آنسوؤں کی کُوک نے بارات کا تعاقب کیا' پھر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ اعجاز اَور سکینہ کا پھوپھا نیاز راٹھور بارات کے پیچھے سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں پہ دولہے کی بہنوں نے دُلہن کو سہارا دے کر ڈولی سے نکالا اَور کار کے اندر بٹھا دیا' پھر وہ خُود بھی پھنس پھنسا کے بیٹھ گئیں۔ خالی ڈولی کو جہیز کے صندوقوں' پیٹیوں اَور پلنگوں کے ہمراہ ایک بیل گاڑی پہ رکھا گیا اَور اِس طرح بارات اپنے گھر کو روانہ ہُوئی۔

اعجاز اَور نیاز راٹھور خاموشی سے ٹہلتے ہُوئے وہاں سے واپس ہُوئے۔

"کام ٹھیک ہو گیا" اعجاز نے کہا۔

"ہاں" نیاز راٹھور بولا۔ "انتظام میں کوئی رخنہ نہیں پڑا۔"

"کھانے میں کمی نہیں آئی' نہ کوئی شکایت سننے میں آئی۔"

"اُون ہوں" نیاز راٹھور نے طمانیت سے نفی میں سر ہلا کر اتفاق کیا۔

صحن میں چاچا احمد اپنی پگڑی گود میں رکھے، سر کو ہاتھوں میں سنبھالے ایک شکستہ چارپائی کے کونے پہ بیٹھا تھا جو بارات کے دوران عورتوں کے بوجھ تلے ایک طرف سے ٹوٹ گئی تھی۔ اعجاز اُس کے سامنے والی چارپائی پہ جا کر بیٹھ گیا۔

"شکر ہے کام ٹھیک ٹھاک نبٹ گیا" اعجاز نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔

"نقصان ہو گیا ہے" چاچا احمد سر اُٹھائے بغیر بولا۔ "میرا کلیجہ بیٹھ گیا ہے۔"

"حوصلہ کر چاچا۔ خُدا کا شکر کرنے کا مقام ہے۔ کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا کسی طرف سے اُلٹی آواز نہیں آئی۔ یہ لے۔"

"کیا ہے؟"

اعجاز نے نوٹ چاچے کی گود میں پگڑی کے اُوپر رکھ دیئے۔ "جہانگیر نے سلامی کے دیئے ہیں۔"

چاچے احمد میں ایک دم گویا جان پڑ گئی۔ اُس نے نوٹ اُٹھا کر مٹھی میں دبا لئے۔

"کیوں" وہ سر اُٹھا کر بولا "میرے ساتھ اُس کی زبان نہیں ہلتی تھی؟"

"چاچا، تم اُس وقت سامنے نہیں تھے۔ جہانگیر نے جاتے وقت مجھے پکڑا دیئے تھے۔"

"میرے ساتھ وہ بات نہیں کر سکتا" چاچے احمد نے کہا۔ "تجھے پتا ہے کیوں؟ میں کبھی اُس کے پاس کوئی غرض لے کر نہیں گیا۔ جب اُس نے تیرے کماد کا نقصان کرایا تھا تو اگر تو میرا ہاتھ نہ روکتا تو میں برود مار کے اُس کا ڈیرہ اُڑا دیتا۔"

"چل چھوڑ چاچا۔ پُرانی بات ہے۔"

"پُرانی نہیں اعجاز، جھنگیر بدماش ہے۔"

"چاچا مرتے مرتے تو وہ ہمارے بیاہ میں آ کر شریک ہو گیا ہے۔ تو اَور کیا چاہتا ہے؟"

"اس کی شکل پر نہ جا، بڑا چلاک ہے۔ قبر میں جاتا جاتا دس سال کاٹ جائے گا۔"

چاچے احمد نے نوٹ اُٹھا کر احتیاط سے گنے اَور تہمد کے کونے میں لپیٹ کر مضبوطی سے گانٹھ دے لی۔ نوٹوں کی برآمدگی سے لے کر تہمد کی گانٹھ میں جانے تک ماسی رونا بند

کر کے، آنکھیں کھولے اُنہیں دیکھتی رہی۔ رات کے اندر ہوا کا جھونکا تک نہ تھا، اَور اِس ساکن چاندنی کے اندر، جس کی خاموشی میں برتن اَور سامان اُٹھانے والوں کی اِکا دُکا آوازیں مزید اضافہ کر رہی تھیں، چاچے احمد نے دوبارہ سر کو ہاتھوں میں ڈھانپ لیا تھا، اَور ماسی نے ایک بار پھر دھیمی، سپاٹ، بے آنسو آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

باب 19

جب اعجاز "بے بانگ دُہل" کے دفتر پہنچا تو کمرے میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ اُن کی گفتگو کے درمیان ہیجان، اِنتشار اَور اختلاف کی ملی جلی کیفیت تھی جس نے فضا میں ایک بھاری تناؤ پیدا کر رکھا تھا۔ سگریٹوں کا گھنا دُھواں ماحول کی ابتری میں مزید اِضافہ کر رہا تھا۔ بدیع الزمان اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اُس کی بغل والی کرسی پہ خواجہ معراج دین ایڈووکیٹ میز پہ کاغذات پھیلائے اُن کے ملاحظے میں مصروف تھا۔ بدیع الزمان کہنیاں اُوپر رکھے میز پہ اِس طرح جھکا تھا کہ اُس کے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا وکیل صاحب کے کاغذوں سے تقریباً مس ہو رہا تھا۔ خواجہ معراج دین ہر ایک دو منٹ کے بعد آہستہ سے ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ کر اُسے پرے ہٹاتا، مگر چند ہی لمحے بعد بدیع الزمان دوبارہ اُسی جگہ پر آ جھکتا۔ خواجہ معراج اپنا بایاں بازو لمبا کر کے میز پہ رکھے، انگلیوں میں سگریٹ دبائے، دائیں ہاتھ سے فائلوں کے ورق پلٹتا جا رہا تھا۔ کبھی وہ اپنا بایاں بازو سیدھا اُوپر اٹھا دیتا اَور دیر تک اُسے بے سہارا ہوا میں اُٹھائے رکھتا، جیسے کہ سگریٹ سے چھت کی جانب اشارہ کر رہا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سگریٹ کو اپنے سے دور رکھنا چاہتا ہو مگر اُس کو ہاتھ سے چھوڑنے پہ بھی آمادہ نہ ہو۔ اُس کے دُوسری جانب شیخ سلیم کرسی پہ بیٹھا دونوں کا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ وقفے وقفے پر وہ کرتے کی جیب سے کپڑے کی تھیلی نکال کر چھالیہ پھانکتا جا رہا تھا۔ بہنوئی کے اِس پرچے میں شیخ سلیم کے پیسے ہی نہیں لگے تھے بلکہ قانونی طور پہ بھی وہ مقدمے میں پوری طرح ملوث ہو چکا تھا۔ اُس کا نام پرنٹر کی جگہ پر داخل کر دیا گیا تھا۔ تفصیل اِس واقعہ کی یوں تھی:

اِبتدائی نوٹس میں بدیع الزمان اَور اعجاز کے ساتھ اصل پرنٹر کا نام شامل تھا۔ سید اسلم شاہ پرنٹر بدیع الزمان کا دیرینہ دوست تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے پریس کا مالک تھا جو ایک کمرے اَور روناپرنٹ کی واحد مشین پہ مشتمل تھا اَور کئی سال سے معمولی کام کی آمدنی پہ چل رہا تھا۔ اُس کو اطلاع ہُوئی تو وہ حواس باختہ حالت میں بدیع الزمان کے پاس پہنچا۔

"بدی، میں نے آج تک تجھ سے ایک پیسا نہیں کمایا، صرف خرچے پر تیرا کام چلا رہا ہُوں۔ تو جرنلسٹ آدمی ہے، تیرا کیا ہے، پرچہ بند ہو جائے گا تُو تو کہیں اَور جا کر نوکری

کر لے گا۔ میرا سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ کوئی لاکھوں کا بزنس نہیں، تجھے پتا ہے، صرف روٹی چلتی ہے۔ میرے سات بچے ہیں۔"

"اس میں تو میرا کوئی دخل نہیں،" بدیع الزمان ہنس کر بولا۔

"بدی، میری جان شکنجے میں آئی ہے، تجھے مذاق سوجھا ہے۔ میں تیرے نامراد رسالے کا ایک لفظ نہیں پڑھتا، کبھی خیال بھی نہیں کیا کہ تو کیا اڑم شڑم لکھتا رہتا ہے۔ تیرے اُوپر اعتبار کرنے کا مجھے یہ صلہ ملا ہے؟ ایک پیسہ تک معاوضے کا کبھی چارج نہیں کیا، صرف کاغذ اور کاریگر کا خرچہ وصول کرتا ہوں۔ وہ بھی وصول کہاں کرتا ہوں، تین مہینے سے کریڈٹ پر کام کر رہا ہوں۔ میں قانونی چارہ جوئی میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ میری روزی ماری جائے گی۔"

"اچھو، تو خواہ مخواہ گھبرا گیا ہے۔ یہ کوئی قانونی وانونی نہیں، بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس تو دیکھتا رہ، اوپن اینڈ شٹ کیس ہے۔ ہمارے پاس سکہ بند ثبوت ہیں۔ سرخروئی ہوگی۔ ہم الٹا ازالہ حیثیت عرفی کا کیس کریں گے۔ مخالف کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خرچہ بھی اُٹھائے گا اور ہرجانہ بھی دے گا۔ تماشا ہوگا تماشا۔" توضیح کی خاطر بدیع الزمان نے میز پہ رکھی ہوئی فائل کو کھولا۔ "اوپن؟" وہ چیخ کر بولا، اور دھپ سے فائل کو بند کر دیا، "اینڈ شٹ۔"

"بدی، بدی، تو اپنے تماشے اپنے پاس ہی رکھ۔ میری جان چھوڑ دا۔"

"اچھو، تو چھاپنے والا ہے۔ بتا کہ جب سے رپورٹ چھپی ہے، پرچے کی تعداد بڑھ نہیں گئی؟"

"بڑھ گئی ہے تو پھر کیوں تو ہر وقت پیسے کا رونا روتا ہے۔ میرا خرچہ دے، معاوضہ ادا کر اور اپنا بزنس چلا۔ تیری تعداد بڑھنے سے میرا تو اُلٹا نقصان ہو رہا ہے۔"

بدیع الزمان ایک لحظے تک چین بجبیں ہو کر اسلم شاہ کو دیکھتا رہا۔ پھر فوراً بولا، "اوورہیڈز۔"

"ہشہ؟"

"اوورہیڈز، اچھو، اوورہیڈز۔ تو بھی بزنس مین ہے۔ بتا کہ جیسے جیسے کاروبار ترقی کرتا ہے، کیا اُوپر کے خرچے بڑھتے نہیں جاتے؟"

"تو مجھے سبق نہ پڑھا بدی، مجھے سب پتا ہے۔ میں تجھے بتا رہا ہوں میرے گھر کے گیارہ فرد ہیں اور میں اکیلا کمانے والا۔ تو اپنا فیشنی کاروبار چلاتا رہ، مگر اس ٹنٹے سے میری خلاصی کرا۔"

"اسلم شاہ، اب تو میرا اور تیرا ساتھ ہے، دونوں مل کر دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اب خلاصی مشکل ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں۔ ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"میری جگہ پر کسی اور کا نام لکھوا دے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں اپنی طرف سے قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

"کیسی قربانی؟"

"پریس کی ملکیت میں کسی اور کا نام درج کرا دو۔"

"نام تو تُو آج درج کروائے گا، دعویٰ پچھلی تاریخوں میں دائر ہوا ہے۔"

"وہ سب میں کرلونگا۔"

"مگر پریس تو پھر بھی زد میں آئے گا۔"

"پریس جائے جہنم میں۔ میری جان تو بچ جائے گی۔"

"تاریخوں کا معاملہ مجھے ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ گورنمنٹ کے ریکارڈ۔۔۔۔"

"گورنمنٹ کے ریکارڈ تبدیل کروانا بھی کوئی کام ہے؟" اسلم شاہ نے بیتابی سے ہاتھ آگے نکالا اور انگلیوں پہ انگوٹھا رگڑتے ہوئے بولا، "سب پیسے کا کھیل ہے بھائی جان، یہاں کوئی چیز غیر ممکن نہیں۔ سب کام میرے اُوپر چھوڑ دے۔ بس تو بندہ پیدا کر۔ میرا تو دِل گلے میں پھنس گیا ہے۔ رات دِن کا خفقان لگا ہوا ہے۔ یہ دیکھ،" اسلم شاہ نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر بدیع الزمان کی آنکھوں کے سامنے ہلائی، جس سے شیشی میں گولیوں کے کھنکنے کی آواز پیدا ہوئی۔ "دِل کو پکڑ کے بیٹھا ہوں، اِن گولیوں پر دِن کاٹ رہا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے تو اس ٹینشن سے نہ نِکلا تو ایک دِن بیٹھا بیٹھا ڈھیر ہو جائے گا۔ بدی، تو یاد رکھ،" وہ بدیع الزمان کی ناک کے آگے انگلی ہلا کر بولا، "میں ڈھیر ہو گیا تو

میرے بوڑھے ماں باپ اَور سات چھوٹے بچے بھوکے مرجائیں گے، تو یاد رکھ، ساری عمر تجھے چین نہیں آئے گا۔" اسلم شاہ رونے لگا۔ "میری بیوی،" وہ لرزتی ہُوئی آواز میں بولا، "مزدوری کرنے لگے گی۔"

آخر شیخ سلیم کو سوجھ بوجھ دیئے بغیر کاغذ اُس کے سامنے رکھ کر دستخط کروا لیئے گئے، اور خواجہ معراج کو بھی کچھ اُلٹا سیدھا بتا کر عدالت میں ملکیت کا ریکارڈ درست کرانے کی درخواست دینے کو کہا گیا۔ خواجہ معراج دیر تک شکی نظروں سے بدیع الزمان کو دیکھتا رہا۔ "بدیع، دال میں کالا والی کوئی بات تو نہیں؟ میرے دِل کو یہ بات پسند نہیں آ رہی۔"

"دال میں کالا چھوڑ کر نیلا پیلا بھی نہیں ہے خواجہ صاحب۔ بس شُروع میں نام لکھانا بھول گئے تھے، اُس کی درستی کرانی ہے۔ شیخ سلیم سینئر پارٹنر ہے۔" شیخ سلیم سے بدیع الزمان نے الگ سے کہا، "اِسی حالت پر سارا اِنحصار ہے۔ فیصلہ بھی اپنے حق میں ہو گا، پیسا بھی بچے گا۔ ورنہ سب غرق۔"

شیخ سلیم جو اِس بکھیڑے میں پھنس کر پہلے ہی آدھے ہوش حواس گنوا بیٹھا تھا، اب ہونقوں کی طرح بیٹھا سب کا مُنہ دیکھتا، پان کھاتا اَور چھالیہ پھانکتا رہتا تھا۔ وہ کپڑے کا سوداگر اب اُس قصے کے سر پیر سے ناواقف ہو چکا تھا۔ اُسے اپنے پیسے کی فکر بھی نہ رہی تھی۔ اب وہ کبھی کبھی صرف اِتنا پُوچھ لیتا کہ کیا جیل جانے کا کوئی اِمکان تو نہیں تھا؟

"خیر کا کلمہ بول چھیمے،" بدیع الزمان اُسے تسلی دیتا۔ "تو خواجہ صاحب کی بات نہیں سن رہا؟ اِس معاملے کی ساری کنجیاں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ جیل جائیں ہمارے دُشمن۔ اَور دیکھ، میری بات کو آج نوٹ کر لے، کہ جیل جانے والا مقدمہ یہ ہے ہی نہیں۔ یہ دیوالہ نِکلنے والا کیس ہے۔ اَور دیوالہ نِکلے گا اُن کا۔ کباڑا ہو گا کباڑا۔ تو دیکھتا رہ۔ فیکٹری سیل ہو گی۔" بدیع الزمان نے اپنی ایک ہتھیلی پہ دُوسرے ہاتھ کا مکا کس کر مارا۔ "سیل! بند!! بی مان حاجی کے دِل کی خواہش پوری ہو گی، اُس کی موت مدینے میں ہی آئے گی۔ بخشش پھر بھی نہیں ہو گی۔ تو گھبرا نہیں، خواجہ صاحب کا ایک اِسسٹنٹ تیری طرف سے پیش ہو گا، دُوسرا ملک اعجاز کی جانب سے۔"

شیخ سلیم چند لمحوں تک بے سمجھ نظروں سے اُسے دیکھتے رہنے کے بعد بولا، "ہم جیت جائیں گے؟"

"ہاں ہاں ہاں۔"

"ہرجانے کے بدلے فیکٹری ہمیں مل سکتی ہے؟"

"فیکٹری لے کر کیا کرے گا؟ تو کپڑے کا کاروبار کرتا ہے۔ فیکٹری چلانا پڑھے لکھے لوگوں کا کام ہے۔ خیر بہرحال، یہ بعد کی بات ہے۔ تو ابھی صبر کر۔"

پہلی پیشی خواجہ معراج نے خُود ہی بھگتا دی۔ دُوسری پہ بھی گو اُس نے کہا کہ کسی اَور کے جانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر بدیع الزمان کے اصرار پر کہ، "عدالت کے ماحول کی واقفیت ابھی سے حاصل کر لینی چاہیے،" وہ سب کو ساتھ لے گیا۔ معمول کی ابتدائی کاروائیاں تھیں۔ دِقت صرف شیخ سلیم کے ساتھ پیش آئی۔ اُس کو اِس طرح سہارا دے کر عدالت میں لے جانا پڑا جیسے کسی سولی چڑھنے والے کو لے جایا جاتا ہے۔ اُسے اپنے منہ سے پان کی بہتی ہُوئی پیک کا بھی ہوش نہیں تھا۔ شیخ سلیم ایک لمبا چوڑا، میز پوش نما، رومال اپنے ساتھ رکھتا تھا جس کو وہ پسینہ، پیک، ناک اَور دُوسرے مائع فضلات کو پونچھنے کے کام میں لاتا تھا۔ رومال جیب میں نہ سما سکتا تھا، اِس لِئے شیخ سلیم اُسے کندھے پر رکھنے کی بجائے شلوار کے نیفے میں اُڑسے رہتا تھا۔ جب ضرورت پڑتی تو ایک طرف سے قمیض اُٹھا کر وہ لمبا سا ریشمی رومال کھینچتا اَور استعمال کرنے کے بعد پھر وہیں رکھ لیتا۔ جب پہلی دفعہ عدالت میں گیا تو منظر یہ تھا کہ بدیع الزمان باربار سلیم کی قمیض کا دامن اُٹھاتا، رومال کھینچتا اَور اُس کے لبوں سے بہتی ہوئی پیک کو صاف کرکے رومال اُس کے کندھے پر لٹکا دیتا، جس کو سلیم عادتاً ہاتھ میں سمیٹ کر پھر نیفے میں اُڑس لیتا۔ جب پان کی تھوک دوبارہ بہنے لگتی تو بدیع الزمان اُس عمل کو دُہراتا۔ ایک بار بدیع الزمان نے رومال نکالا تو ساتھ ہی ازار بند کا سرا اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس نے جلدی میں کھینچا تو ملائم کپڑے کی شلوار ڈھلک کر ٹخنوں پہ جا گری۔ بدیع الزمان اَور خواجہ معراج کا جونیئر وکیل جھپٹ کر بڑھے۔ پیشی پہ آئے ہوئے، ہتھکڑیاں لگے چند کسان، محافظ سپاہی، اَور کچھ دُوسرے لوگ یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے۔ تینوں آدمی شلوار کے ساتھ کشمکش میں مصروف تھے کہ رومال اَور ازار بند آپس میں اُلجھ گئے۔

"چھیچھے چھیچھے ہوش کر،" بدیع الزمان بولا، "عدالت کا معاملہ ہے۔ لباس درست کر۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔"

شیخ سلیم نے تلملا کر پہلی بار مُنہ کھولا۔ "مت تیری ماری گئی ہے کہ میری؟ تجھے کس نے کہا تھا کہ میرا نالا کھول۔"

"میں تو تیری مدد ہی کر رہا ہوں چھیمے۔ خفا نہ ہو۔ ناراضگی کا مقام نہیں دیکھتا نہیں کہ ازمیر والوں کا وہ مینیجر جو سوٹ بوٹ پہنتا ہے اَور انگریزی بولتا رہتا ہے؟ آج شلوار پہن کر آیا ہے اَور تسبیح پھیر رہا ہے بہروپیا۔ اَور تو اپنا حلیہ دیکھ، ہونٹوں سے پان بہتا جا رہا ہے۔ عدالت پر کیا اثر پڑے گا؟ کم از کم اپنا مُنہ ہی بند رکھ۔ تجھے ایک لفظ بولنے کی ضرورت نہیں، سب گفتگو وکیل کریں گے۔ عدالت پر ہم نے اچھا امپریشن پیدا کرنا ہے۔"

"اور تو جو ہر وقت سگریٹ پھونکتا رہتا ہے؟"

"عدالت میں سگریٹ پینا منع ہے،" بدیع الزمان نے بے خیالی سے کہا۔

"یہی تو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے،" بدیع الزمان بدمزاجی سے بولا۔

"چل پرے ہٹ۔ مجھے ہاتھ نہ لگا۔ میں تنگ آگیا ہوں،" شیخ سلیم نیفے کو تھامے پرے کھسکتا ہوا بولا، جیسے اُس کو بدیع الزمان سے مزید خطرہ ہو۔

"جیسے تیری مرضی،" بدیع الزمان صلح جوئی سے بولا۔ "اب آگے آگے چل۔"

"آگے آگے تو چل، میں کیوں چلوں؟ یہ تیرا معاملہ ہے۔ تو نے مجھے خوامخواہ پھنسا لیا ہے۔"

"اچھا بھائی،" بدیع الزمان نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "یہ دیکھ، میرے ہاتھوں کو دیکھ۔ مجھے معاف کر دے۔ غلطی ہو گئی ہے۔"

شیخ سلیم نے دھکا دے کر اپنے وکیل کو پرے ہٹایا اَور شلوار اَور رومال پر اپنا قبضہ حاصل کر لیا۔ "میرے قریب مت آ،" وہ بتدریج دور ہٹتا ہوا بولا۔ "ناں بھائی ناں،" بدیع الزمان نے ہاتھ جوڑے جوڑے کہا، "میرے واسطے تو حرام سور۔"

"ہیں؟ حرام سور؟" شیخ سلیم آنکھیں نکال کر بولا۔ یوں لگتا تھا جیسے شلوار گرانے سے اُس کے تمام تر حواس بیدار ہو گئے تھے اَور اب وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کو تیار تھا۔

"حوصلہ کر چھیمے،" بدیع الزمان نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ تجھے ہاتھ لگانا میرے واسطے حرام ہے۔ چل اب، وقت ہو رہا ہے۔ آواز پڑنے والی ہے۔"

اِس پیشی کے بعد شیخ سلیم کی طبیعت ٹھہر گئی۔ اُس کے دِل سے عدالت کا خوف ہی نہ اُترا بلکہ اپنے وکیلوں کا جارحانہ انداز اور سفید بالوں والے جج کا نرم رویہ دیکھ کر، اور یہ جان کر کہ اُس کے ساتھ ذاتی طور پہ کسی سوال جواب کی ضرورت نہ تھی، بلکہ ساری کارروائی وکیلوں کے ہاتھ میں ہوگی، اب اُسے گویا پیشیاں بھگتنے کا چسکا پڑ گیا تھا اور وہ اپنے فارغ وقت میں بے خوف ہو کر پُوچھتا رہتا تھا "اگلی پیشی کب ہے؟"

تیسری پیشی سے دو روز پہلے "بہ بانگ دہل" کے دفتر میں میٹنگ ہوئی تھی جس میں چار آدمی پہلے سے موجود تھے اور اُن میں پانچواں اعجاز جا کر شامل ہوا تھا۔ اُس سے اگلے روز خواجہ معراج کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ خواجہ معراج کے آگے میز پر فائلیں پھیلی تھیں اور بدیع الزمان، اعجاز اور شیخ سلیم میز کے گرد کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ دُوسری طرف خواجہ معراج کے جونیر وکیلوں میں سے ایک بیٹھا تھا جس کے سامنے دو ایک فائلیں رکھی تھیں۔ خواجہ معراج ایک کے بعد دُوسرا ورق اُلٹتے ہوئے ساتھ ساتھ بولتا جا رہا تھا۔ وہ نصف بات اپنے جونیئر وکیل سے، ایک چوتھائی اپنے آپ سے اور آخری چوتھائی دوسرے سامعین سے کر رہا تھا۔

"ہوں ں ں----" ہوں ں ں---- جواب دعویٰ ہو گیا" اُس نے دو تین صفحات اِکٹھے پلٹ دیئے۔

"ابتدائی اعتراضات کا کیا بنا؟" بدیع الزمان نے بیتابی سے پُوچھا۔

"ہو گئے، ہو گئے۔ ابتدائی اعتراضات، تنقیحات، واقعات جوابات سب ہو گئے۔"

"مخالف فریق کا کیس کمزور تو ضرور ہو گیا ہو گا؟"

"اُونہوں،" خواجہ معراج نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "ٹرن ڈاون ہو گئے۔"

"ہیں؟" بدیع الزمان اُچھل پڑا۔

"مجھے پہلے ہی علم تھا۔ فریمنگ آف ایشوز بھی ہو گئے ہیں۔"

"پھر اس سارے کام کا فائدہ کیا ہوا؟"

"بھئی مثل کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔ اِزالہ حیثیت عرفی کے مقدمات میں مدعی کی مثل کا پیٹ پھولا ہوا ہوتا ہے۔ خاص طور پہ ایسے مدعی کا جس کے پاس سورس بھی ہیں اور ریسورس بھی۔ اپنے ریکارڈز، میل ملاقات والوں کی گواہیاں، داد رسی کے لئے رونا

رہنا۔ ہمارے پاس کیا ہے؟ گھی کھانے والے، مر مرا گئے۔ مُردوں کی گواہیاں کوئی عدالت تسلیم نہیں کرتی۔" خواجہ معراج طنز سے ہنسا۔ "دو ایک لیبارٹری رپورٹیں ہیں، وہ بھی شخصی گواہیاں نہیں، کاغذی ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر ہے، وہ بھی تڑپھس ہی لگتا ہے۔"

"نہیں خواجہ صاحب" اعجاز نے کہا، "ڈاکٹر تگڑا ہے۔ اُس کا کِلّا اپنے ہاتھ میں ہے۔ فکر نہ کریں۔ مضبوط ہے۔"

"خیر، پتا چل جائے گا۔ ہمارا سب سے سٹرانگ پوائنٹ بہرحال اخلاقی بالادستی ہے۔ اِن کیسوں میں سب سے بڑی اہمیت جج کی ہمدردی حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ پریس کا مقصد ہی پبلک اِنٹرسٹ ہے۔ یہ پوائنٹ ہمارے حق میں جاتا ہے۔"

"بالکل، بالکل،" بدیع الزمان بولا۔ "پبلک اِنٹرسٹ اِز فورموسٹ۔"

"ایک بات سے مجھے ذرا سی تشویش ہے،" خواجہ معراج بے خیالی کے لہجے میں بولا، یوں جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

"کس بات سے، خواجہ صاحب؟"

"سینئر سول جج نے مقدمہ کسی لوئیر جج کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے۔"

"ابھی تک تو تارڑ صاحب اپنے ہمدرد ہی لگتے ہیں۔"

"بدیع صاحب، اِس میں ایک پوائنٹ ہے۔"

"کیا پوائنٹ ہے؟"

"چوہدری محمد حسین تارڑ ریٹائر ہونے والے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"اِس بارے میں، میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ اِنفرمیشن اکٹھی کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ اِس وقت تو میرا سارا دھیان اگلی پیشی پر ہے۔ ٹائم بار، جیورس ڈکشن کا پوائنٹ کہ مدعی اپنے قول و فعل سے دعویٰ دائر کرنے سے مانع ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ سب گئے۔ مگر میں فکر مند نہیں ہوں۔ بس آپ لوگ حوصلہ رکھیں۔"

شہر کے مشہور دیوانی وکیل میاں اِنتظار حسین، جن کی معاونت کے لیے جونیئر وکیلوں کی ایک ٹیم موجود تھی، مدعی کے بیان کرانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے تین باحیثیت افراد کے کوائف پیش کرنے کے بعد اُن کی گواہی درج کرائی، جس میں تینوں نے اِس بات کی تائید اور تصدیق کی کہ وہ مدعی کو عرصہ متعدد برس سے ذاتی طور پہ جانتے تھے، اور کہ مدعی اُن کی دانست میں ایک ایماندار، صوم و صلوٰۃ کا پابند، تہجد گزار اور صالح مسلمان تھا اور اُن کی رائے میں وہ جانتے بوجھتے ہوئے کسی بے ایمانی کا مرتکب نہ ہو سکتا تھا۔ خواجہ معراج نے اپنی جرح میں باری باری اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ نہ تھا کہ پہلا گواہ اِزمیر گھی انڈسٹریز کے مالک حاجی کریم بخش کا سالا، دوسرا اُن کا چچازاد بھائی، اور تیسرا، حاجی ذوالفقار، شہر میں اِزمیر مارکہ گھی کا سب سے بڑا ایجنسی ہولڈر تھا؟ تینوں سے تصدیق حاصل کرلینے کے بعد خواجہ معراج نے طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ وہ مزید کوئی سوال پُوچھنا نہیں چاہتا۔

اگلا گواہ فیکٹری کا پروڈکشن انجینئر معین الدین شاہ تھا، جس نے پچھلی دو سہ ماہیوں کی پیداواری رپورٹ پیش کی۔

"کیا یہ رپورٹیں معمول کے مطابق ہیں؟" اِنتظار حسین نے گواہ سے سوال کیا۔

"جی نہیں۔ دُوسری سہ ماہی کی پیداوار میں لگ بھگ سو ٹن کی کمی واقع ہوئی ہے۔"

"کیا اِس کی وجہ خام مال کی کمیابی یا مشین کی خرابی ہے؟"

"جی بالکل نہیں۔ اس کی واحد وجہ گرتی ہوئی سیلز ہیں، جس کے باعث اِنتظامیہ کو مجبوراً پیداوار میں کٹوتی کرنی پڑی۔"

"کیا یہ دُرست ہے،" میاں اِنتظار حسین نے پُوچھا، "کہ اِس صورتِ حال سے اِنڈسٹری کو شہرت کی بدنامی ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ بزنس کو لاکھوں کا خسارہ۔۔۔"

"خواجہ معراج اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "یہ لیڈنگ کوئسچن ہے جنابِ عالی۔"

جج نے نقطۂ اعتراض تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے گواہ کو بیان جاری رکھنے کا

اشارہ کیا۔

"جی یہ دُرست ہے،" پروڈکشن انجینئر نے کہا، "کہ اِس رپورٹ سے ہماری کمپنی کی شہرت اور بزنس دونوں کو انتہائی نقصان پہنچا ہے۔"

"جھوٹ!" بدیع الزمان پکار اُٹھا۔

جج تارڑ نے سر موڑ کر خشمگین نگاہوں سے بدیع الزمان کو دیکھا مگر مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ خواجہ معراج غصے سے مُنہ میں بڑبڑاتا ہوا بدیع الزمان کو گھورنے لگا۔

"اور جو کولیسٹرول نقصانات دُوسرے لوگوں کو پہنچے ہیں؟" میاں اِنتظار حسین نے سوالیہ انداز میں معین الدین شاہ سے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ مالی اَور معاشرتی خسارے کے علاوہ جو متفرق لوگوں کو نقصانات پہنچے ہیں ان کا اندازہ بے حدو حساب ہے۔"

خواجہ معراج اَور دفاعی فریق کے سب افراد اچانک کرسیوں پر آگے جھک کر سننے لگے۔

"مثال کے طور پر،" معین الدین شاہ نے بیان جاری رکھا۔ "پیداوار میں مجبوراً کٹوتی کرنے کی وجہ سے متعدد دہاڑی دار محنت کش اَور عارضی نوکری والے کارگیروں کو ملازمت سے فارغ کر دینا پڑا ہے، اور ـــــ"

بدیع الزمان نے گال پھلا کر سانس کو یکدم خارج کیا تو اُس کے ہونٹوں سے "پھاہ!" کی اُونچی، اِستہزائیہ آواز پیدا ہُوئی۔ جج تارڑ نے غصے سے اُس کی جانب دیکھا۔ خواجہ معراج پھر اُچھل کر اُٹھا۔ "جنابِ والا! یہ غیر متعلق سوال ہے۔"

اِس بار جج نقطۂ اعتراض کو تسلیم کرتے ہُوئے وکیل اِستغاثہ سے مخاطب ہوا۔ "یہ لوگ جن کا ذکر گواہ نے کیا ہے اِس مقدمے میں فریق نہیں ہیں۔ آپ اِیشوز کے فریم میں رہیں اور مقدمے کو مزید توسیع دینے سے اِجتناب کریں۔"

خواجہ معراج نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہُوئے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ عدالت میں باتوں کی بھنبھناہٹ اُبھری۔ جج تارڑ نے اپنا چوبی ہتھوڑا میز پر مارا اور سختی سے خواجہ معراج کو مخاطب کیا۔

"اور میں دفاعی پارٹی کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر اُن کے کسی فرد کی جانب سے عدالت

کے ضابطے کے خلاف مزید کاروائی ہُوئی تو میں اُس کے خلاف ایکشن لونگا۔"

سامعین کی بھنبھناہٹ ایک بار دب کر دوبارہ اُبھر آئی، جس کے دوران جج نے میز کھٹکھٹا کر لوگوں کو خاموش کرایا۔ کچھ دیر کے بعد گواہ معین الدین شاہ کو جرح کے واسطے خواجہ معراج کے حوالے کر دیا گیا۔

"شاہ صاحب،" خواجہ معراج نے کہنا شروع کیا" آپ کا عہدہ پروڈکشن انجینئر کا ہے، آپ پیداوار کے اعداد و شمار بیان کر سکتے ہیں۔ مگر نفع یا نقصان کا تخمینہ تو آمدنی اور خرچے کے بیلنس شیٹ سے ہی لگایا جا سکتا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"اور بیلنس اکاؤنٹنٹ تیار کرتا ہے۔ غلط یا درست؟"

"درست ہے۔"

"پھر آپ نفع یا نقصان کی بات کیسے کر سکتے ہیں؟"

"جی میں اکاؤنٹ آفیسر بھی ہوں،" معین الدین نے جواب دیا۔

"اخاہ، تو آپ دو مختلف شعبوں کے انچارج ہیں؟"

"ہمارے چیف اکاؤنٹنٹ بیماری کی وجہ سے لمبی چھٹی پر ہیں۔ اُن کی غیر موجودگی میں، میں ہی اُس ڈیپارٹمنٹ کا نگران ہوں۔"

"کیا چیف اکاؤنٹنٹ صاحب کے کوئی اسسٹنٹ ہیں جو اُن کی جگہ پر کام کر سکیں؟"

"وہ تھے۔ مگر چند ماہ پیشتر استعفیٰ دے کر بیرون ملک جا چکے ہیں۔"

"اکاؤنٹ کے شعبے میں آپ کی تعلیمی قابلیت کیا ہے؟"

"جی میرا پچیس سالہ تجربہ ہے۔"

"میں تجربے کے بارے میں استفسار نہیں کر رہا، آپ کی پیشہ ورانہ تعلیمی قابلیت کے بارے میں پُوچھ رہا ہوں۔"

"میں عے اِمتحان پاس کر رکھا ہے۔"

"کونسا امتحان؟ کہاں سے؟"

"اِنسٹیٹوٹ آف آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سے۔"

"کیا یہ حکومت کا تسلیم شدہ ادارہ تعلیم ہے؟"

"جی یہ ادارہ عرصہ پندرہ سال سے قائم ہے۔"

"معین شاہ صاحب' میری درخواست ہے کہ آپ میرے سوال کا صاف صاف جواب دیں۔ میں سوال دُہراتا ہوں۔ یہ ادارہ جہاں سے آپ نے اِمتحان پاس کیا ہے۔ کیا حکومت کا تسلیم شدہ ہے؟"

"جی--- نہیں۔"

"یہ اِنسٹیٹوٹ کہاں پہ واقع ہے؟"

"گوالمنڈی میں ہے جناب۔ بہت مشہور ادارہ ہے۔"

"مشہور تو آپ کا گھی بھی بہت ہے۔" خواجہ معراج نے طنزیہ کہا۔ عدالت میں چند لوگ ہنس پڑے۔ "آپ نے کتنا عرصہ وہاں پہ کلاسیں اٹینڈ کیں؟"

"جی؟"

"میرا خیال ہے شاہ صاحب کہ سوال سیدھا سادا ہے۔ آپ نے کتنے عرصے تک اِس ادارے میں کلاسیں اٹینڈ کرنے کے بعد امتحان پاس کیا؟"

"میں نے---- جناب میں نے---- میرا مطلب ہے کہ میں نے کارسپانڈنس کورس کیا تھا۔"

"آپ کی بنیادی تعلیم کیا ہے؟"

"جی؟"

"بنیادی تعلیم۔"

"جی--- ایف۔ایس۔سی۔" معین الدین شاہ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تو گویا آپ محض ایف۔ایس۔سی پاس ہیں۔ آپ کے پاس انجینئرنگ کی کوئی تعلیم نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ آپ نے ایک بیک سٹریٹ کے غیر تسلیم شدہ ادارے سے ایک کارسپانڈنس کورس کر رکھا ہے اور اپنے آپ کو پروڈکشن انجینئر اور اکاؤنٹنٹ ظاہر کر رہے ہیں۔ میں پُوچھتا ہوں کہ کیا آپ اِس انتہائی پیچیدہ اِنڈسٹری کے دو اہم شعبوں کی سربراہی کے اہل ہیں؟"

"میرا پچیس سالہ تجربہ----"

پیشتر اس کے معین الدین شاہ بات ختم کرتا، میاں اِنتظار حسین بول اُٹھا۔ "جناب والا، گزارش ہے کہ یہاں گواہ معین الدین شام ملزم نہیں ہے۔ معزز عدالت سے میری اِستدعا ہے کہ اِس طرز جرح کو بند کیا جائے۔"

جج نے اعتراض کو رد کرتے ہُوئے کہا، "گواہ نے مستغیث کی جانب سے تائیدی رپورٹ پیش کی ہے۔ اُس کی اہلیت کا تعین کرنا اِس موقعہ پر نامناسب نہیں ہے،" اور ہاتھ سے خواجہ معراج کو جرح جاری رکھنے کا اِشارہ کیا۔

"میں جناب کا ازحد شکرگزار ہوں،" خواجہ معراج نے کہا، "اور صرف ایک آخری سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا،" اُس نے معین الدین شاہ سے پُوچھا، "آپ کے ریکارڈ کا ایکسٹرنل آڈٹ کیا جاتا ہے؟"

"جی ہاں۔ کمپنی کا فل آڈٹ، مالی سال کے اِختتام پر ہوتا ہے۔"

"آپ کے ایکسٹرنل آڈیٹر کون ہیں؟"

"عبدالوحید، عبدالمجید اینڈ کمپنی لیمٹڈ آف میکلوڈ روڈ۔"

"کیا یہ دُرست نہیں،" خواجہ معراج نے پُوچھا، "کہ آڈیٹرز کی یہ فرم ازمیر گھی انڈسٹریز کے مالکان کے عزیزدار ہیں؟"

"مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔"

"معین شاہ صاحب، یہ نہ بھولئے کہ بیان شرُوع کرنے سے پہلے آپ نے سچ بولنے کا حلف دیا ہے۔"

معین الدین شاہ کے چہرے پہ اب پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

"جی---- یہ ممکن ہے۔"

"یعنی آپ کے خیال میں اِس بات کا محض اِمکان ہے کہ آڈیٹرز اَور مغیث آپس میں عزیزدار ہوں؟"

"میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں،" معین الدین شاہ نے گھبرا کر کہا۔

اِس مقام پہ خواجہ معراج نے عدالت کو اِطلاع دی کہ وہ اِس گواہ سے اَور کوئی سوال پوچھنا نہیں چاہتے۔ عدالت میں لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں پیدا ہُوئیں۔ جج نے دوبارہ میز کھٹکھٹائی اَور اگلی پیشی پر فیکٹری کے کیمسٹ اَور کیمیکل انالسِس کو پیش کرنے

کے احکام دے کر عدالت برخاست کر دی۔

"حق میں جا رہا ہے۔ حق میں جا رہا ہے۔" عدالت سے نکل کر بدیع الزمان چلایا۔ "کیوں خواجہ صاحب، کیا خیال ہے؟"

"ہوں ں ں۔۔۔" خیال میں ڈوبے ہوئے خواجہ معراج نے سر ہلایا۔ "ابھی خوش ہونے کا موقعہ نہیں آیا۔"

"کیوں خواجہ صاحب، کیوں ہوں اوں اونہہ۔۔۔۔" بدیع الزمان سگریٹ کے کش اور اپنے الفاظ کے اِمتزاج پر اٹک کر رہ گیا۔ کھانسی کا دورہ اُس کی شوں شوں کرتی ہوئی چھاتی سے اُٹھا اور سانس کو اُلٹ گیا۔ اعجاز نے اُس کی پُشت پر ایک دھول جما کر اُس کی سانس برابر کی۔ "کیوں خواجہ صاحب، جج نے اُن کے گواہ کو تو کھری کھری سنا دی۔ مزدوروں کا نام لے کر ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا بھڑوا۔"

"ہاں، مگر جج نے سیدھی سادی قانون کی بات کی۔" خواجہ معراج نے کہا۔

"قانون کی بات تو دُرست ہے، پھر بھی ہمارے ساتھ اُس کی ہمدردی کا عندیہ ملتا ہے کہ نہیں؟"

"اِس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شروع شروعات ہیں۔ جج کا موڈ کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔ تم ذرا اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔ جج کو خفا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"یار خواجہ، ایک تو میں گھنٹوں سے نشے کا ٹوٹا ہوا، اُوپر سے مقدمے کی ٹینشن۔ مُنہ سے بات نِکل ہی جاتی ہے۔"

"باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ جا کر کش لگا آیا کرو۔"

"اور کیا عدالت کی کاروائی مِس کر دوں؟ میں تو ایک ایک بات دِماغ میں سٹور کر رہا ہوں۔ مقدمہ نبٹ گیا تو ایسی سٹوری لکھونگا کہ آنکھیں کھل جائیں گی۔ آج جرنلزم

میں کون ہے جو ایسا کام کر رہا ہے؟ سب کے سب اپنے تئیں قوم کے سپاہی بنے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آدھے خوشامدی ٹٹو ہیں، آدھے بلیک میلر ہیں، باقی کے اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہیں۔"

خواجہ معراج ہنسا۔ "اِس میں ایک سقم ہے۔"

"کیا سقم ہے؟"

"قانونی نہیں، حسابی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"آدھے ایک طرف ہو گئے اَور آدھے دُوسری طرف تو باقی کیا بچا؟"

"میں بات یہ کر رہا ہوں خواجہ کہ میں گراونڈ بریکنگ کام کر رہا ہُوں۔ نام ہسٹری میں جائے گا۔" خواجہ معراج چائے کی دوکان کے آگے رکھی ہُوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ دُوسرے سب لوگ بھی میز کے گرد لوہے کی کرسیاں سیدھی کر کے بیٹھ گئے۔ اعجاز نے دوکان کے لڑکے سے سب کے لِئے چائے طلب کی۔

"نام تو تُمھارا اب ہسٹری میں داخل ہو گیا ہے،" خواجہ معراج اُسی خوشگوار لہجے میں بولا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ کونسا نام؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی دیکھنے میں آیا ہے،" خواجہ معراج شرارت سے مسکرا کر بولا، "کہ پہلے تُم شیخ بدیع الزمان لکھا کرتے تھے۔ اب کچھ عرصے سے بدیع الزمان شیخ لکھنے لگے ہو۔"

بدیع الزمان ہلکا سا جھینپ گیا۔ "شَیخ بھئی، شَیخ، زبر کے ساتھ، شے اَے خ۔ ہم لوگ کشمیری شیخ ہیں، جو مذہبی پیشوا ہوا کرتے تھے۔"

"گویا پہلے نہیں تھے؟"

"پہلے بھی تھے۔ پہلے بھی تھے،" بدیع الزمان بات ٹالتے ہُوئے بولا۔

"اصل میں ذات کو آخر میں لکھنے سے نام میں وزن پیدا ہوتا ہے،" اعجاز ہنس کر بولا۔ "میرے ایک دوست ہیں، جب سے سید غضنفر علی شاہ کی بجائے غضنفر علی سید لکھنے لگے ہیں اُن کی عزت میں اضافہ ہو گیا ہے۔"

"یعنی اگر میں معراج الدین خواجہ لکھنے لگوں تو زیادہ وزن دار ہو جاؤں گا؟"

"آزما کر دیکھ لیں،" اعجاز نے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ کی پریکٹس اور بھی چمک جائے۔"

سب ہنس پڑے۔

"یار چھوڑو، کیا بات کا مذاق بنا رہے ہو،" بدیع الزمان بولا "یہ سیرئیس معاملہ ہے۔ میں تو آج بہت پُرامید ہوں۔"

"اِسی لیے تو ہم خوش ہو رہے ہیں،" اعجاز نے کہا۔

"دیکھو نا، جج نے میاں اِنتظار کو چپ کرا دیا۔"

"بات تو دُرست ہے،" اعجاز بولا۔

خواجہ معراج نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"خواجہ صاحب، آپ کچھ بجھے بجھے نظر آ رہے ہیں،" بدیع الزمان نے اِصرار کرکے پُوچھا۔

"بجھا ہوا نہیں ہوں، بس آپ کی طرح چمک نہیں رہا۔"

"بھلا کیوں؟"

"یہ اِن کے پیشے کی مجبوری ہے بھئی،" اعجاز بولا۔ "ڈاکٹر اور وکیل کبھی مسرت کا اظہار نہیں کرتے۔"

"اِس کی وجہ؟" بدیع الزمان نے پُوچھا۔

"ڈاکٹروں کو مریض کے مرنے کی فکر رہتی ہے۔"

"اور وکیل کو جج کے فیصلے کی؟" بدیع الزمان نے پُوچھا۔

"اونہوں،" اعجاز نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر؟"

"اپنی فیس کی۔"

سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔

"صرف مولوی لوگ ہمیشہ خوش دکھائی دیتے ہیں،" ایک نوجوان جونیئر وکیل نے جھجکتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی بات کو ڈھکنے کی خاطر فوراً ہی مدلل لہجہ اختیار کرلیا۔ "حالانکہ منطقی طور پر دیکھا جائے تو جس کثرت سے وہ دوزخ کی سزاؤں کا ذکر کرتے ہیں، اُنھیں

غمگین ہی رہنا چاہیے۔"

"دیکھو معیظ الرحمٰن،" خواجہ معراج بھاری بھرکم لہجے میں مخاطب ہوا۔ "اول تو اُن کی فیس کم ہوتی ہے۔ صرف کھانا وغیرہ کھا کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ اِس سے لوگوں کی زندگی آسان ہو جاتی ہے، اور اُن پیشواؤں پر اُن کا اعتماد بھی قائم رہتا ہے۔ یہ دلیل کی بات ہے۔ مگر تمہیں کسی قانون کی کتاب میں نہیں ملے گی۔ قانون بجا طور پر آپ کو تحفظ مہیا کرتا ہے، مگر سستے داموں نہ خوش ہوتا ہے اور نہ خوش کرتا ہے۔ قانون کی خصلت خشک اور غمگین ہے۔"

"جب قانون حق میں جا رہا ہو پھر تو خوشی ہوتی ہے نا،" بدیع الزمان نے کہا۔

"جب تک فیصلہ نہ دے دیا جائے اُس وقت تک قانون کسی کے حق میں نہیں جایا کرتا۔ تُم آج کی کاروائی سے ہی خوش ہو رہے ہو، مگر مجھے ایک آدھ بات کے بارے میں فکر ہے۔"

"وہ کیا ہیں؟"

"ایک تو جج جلد جلد تاریخیں دے رہا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہے؟ جتنی جلد فارغ ہو جائیں اچھا ہی ہے۔"

"اِس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ریٹائیر ہونے سے پہلے کیس کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بلکہ ایک ہی عدالت سے چھٹکارا ہو جائے گا۔"

"یہ ایک فائن پوائنٹ ہے بدیع۔ میں ابھی اِس بارے میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتا۔ خاموشی سے آگے آگے دیکھتے جاؤ۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ کام ٹھیک ہی ہو جائے گا۔"

اگلی پیشی پر کیمیائی انالسِس کی رپورٹوں کی باری تھی۔ رازمیر گھی انڈسٹریز کے چیف کیمسٹ عامر محمود کے بیان کرائے جا رہے تھے۔ اُس کی انالسِس رپورٹ اور گھی کے اجزاء

کی مقرر کردہ حدود کی ایک ایک کاپی جج، گواہ اور میاں اِنتظار حسین کے سامنے تھی۔ تعلیم وغیرہ کے بارے میں چند اِبتدائی سوال کرنے کے لئے بعد کیمیائی اجزاء کا ذِکر آیا تو اِنتظار حسین نے کہا۔

"اگر آپ اِن اجزاء کی تشریح ذرا آسان زبان میں کریں تو عدالت کو اِن کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مثلاً ایف۔ ایف۔ اے کیا چیز ہے؟"

"ایف۔ ایف۔ اے مخفف ہے فری فیٹی ایسڈز کا۔ یہ ایسڈٹی کا پیمانہ ہے۔"

"یعنی تیزابیت؟"

"جی ہاں۔ گھی میں اس کی مقدار صفر اعشاریہ دو یا اس سے کم ہونی چاہئے۔ ورنہ یہ معدے میں زخم پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔"

انتظار حسین نے تائید میں کئی بار سر ہلایا۔ "اب بتایئے کہ ریسنڈٹی کیا ہوتی ہے؟"

"اِس کا مطلب ہے جی کہ گھی پُرانا ہو گیا ہے اور اِس میں بدبودار مادے پیدا ہو گئے ہیں۔"

"یعنی گھی میں بدبو پیدا ہو گئی ہے؟"

"ضروری نہیں کہ ایسی بو پیدا ہو جو سونگھی جا سکتی ہو، گو معمولی سی تبدیلی آنا لازمی ہے جو تیز قوت شامہ رکھنے والے جان سکتے ہیں۔ مگر اصل خرابی کیمیکل طور پر واقع ہوتی ہے۔"

"اسے روکنے کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ہم لبارٹری میں اس کے لیے مسلسل پراوکسائیڈ ٹیسٹ کرتے رہتے جن سے اس کی پراوکسائیڈ ویلیو کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔"

"پراوکسائیڈ ویلیو کو کنٹرول میں رکھنے سے کیا آپ بدبودار مادے پیدا ہونے سے روک سکتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ مگر اس سے ہم اُس عرصے کا تعین کر سکتے ہیں جس عرصے کے بعد ریسنڈٹی، یا بدبودار مادے پیدا ہو جائیں گے۔"

"اِس سے کیا مقصد حاصل ہوتا ہے؟"

"اِس سے ہم اِس قابل ہو جاتے ہیں کہ گھی کے ٹین پر ایک مقررہ تاریخ پرنٹ کر

دیں جس کے گزر جانے کے بعد گھی قابل استعمال نہیں رہتا۔"

"کیا آپ کے ہر ایک پیکج پر یہ تاریخ درج ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

خواجہ معراج اور بدیع الزمان نے منہ سے بولے بغیر نفی میں اپنے سر ہلائے۔ چیف کیمسٹ عامر محمود نے اپنا بیان جاری رکھا اور گھی بنانے کے عمل کے دوران مختلف مراحل پر کیمیائی کنٹرول کے بارے میں بتاتا رہا۔ ایک مقام پہ میاں اِنتظار حسین نے اُسے روکا۔

"عامر صاحب، ہائیڈروجی نیشن کے عمل تک تو میرا خیال ہے ہم سب سمجھ چکے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ نِکل دھات، جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اور جو مضر رساں ہوتی ہے، گھی میں کیونکر داخل ہوتی ہے؟"

"یہ ایک کیٹالسٹ کے طور پر نِکل فارمیٹ کی شکل میں ڈالا جاتا ہے۔"

"یہ کس مقصد کے لِئے کیٹالسٹ کا کام کرتا ہے؟"

"تیل کی ہائیڈروجی نیشن کے لئے۔"

"تو پھر یوں کہیے ناء۔ سلسلہ وار عمل کو واضح کرنے کے لِئے بیان بھی سلسلہ وار ہونا چاہئے۔"

"جی بہتر۔"

"نِکل دھات کی مقدار کتنی ہوتی ہے؟"

"مقررہ کردہ حد صفر اعشاریہ پانچ پارٹس پر ملین ہے۔"

"یعنی دس لاکھ حصص گھی کے ہوں تو اُن میں زیادہ سے زیادہ ایک اعشاریہ پانچ حصہ نِکل کا ہونا چاہئے۔"

"جی دُرست ہے۔"

"پھر اسے تلف کرنے کے لِئے آپ کیا کرتے ہیں۔"

"یہ ایک پراسس کے ذریعے سٹرک ایسڈ کی ملاوٹ سے تلف کر دیا جاتا ہے۔"

"آخر میں یہ معلوم کرنے کے لِئے کہ گھی مضر رساں اشیاء سے پاک ہو گیا ہے کیا آپ کوئی ٹیسٹ کرتے ہیں؟"

"جی مسلسل چوبیس گھنٹے کرتے رہتے ہیں۔"

"یعنی آپ کی سب اچھا والی رپورٹ کے بغیر گھی دُکانوں کو سپلائی نہیں کیا جاتا؟"

"ہرگز نہیں جناب۔ ہماری سب طرح کی کلین رپورٹوں کے بغیر گھی کی کوئی لاٹ پیکنگ پلانٹ میں نہیں جا سکتی۔"

"ٹھیک۔ ٹھیک" میاں اِنتظار حسین نے تائید، جبکہ خواجہ معراج اُور بدیع الزمان نے نفی میں سر ہلائے۔

دو چار منٹ کے بعد چیف کیمسٹ کا بیان ختم ہوا تو جرح کے لِئے خواجہ معراج الدین اُٹھا۔ جو گواہان کو عموماً نام سے مخاطب کیا کرتا تھا، اپنی روش سے ہٹ کر عامر محمود کے ساتھ اُس کے عہدے سے مخاطب ہوا، تو بدیع الزمان کو اندازہ ہو گیا کہ خواجہ معراج اب کمر کس کر اِس گواہ پر حملہ آور ہونے والا تھا۔ اُس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہُوئی۔

"چیف کیمسٹ صاحب،" خواجہ معراج نے کہا، "آپ کو اِزمیر گھی اِنڈسٹریز میں سروس کرتے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"کم و بیش آٹھ برس جناب۔"

"آپ کے بیان کے مطابق آپ نے سن پینسٹھ میں بی۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا تھا۔ تو گویا اُس کے کچھ ہی عرصے کے بعد آپ نے اِزمیر گھی انڈسٹریز کی ملازمت اختیار کر لی؟"

"جی ہاں۔ کوئی آٹھ دس مہینے کے بعد۔"

"اس سے پہلے آپ نے کسی اُور جگہ پر ملازمت کی؟"

"جی بہت تھوڑے عرصے کے لِئے ایک دُوسری جگہ پہ کی تھی۔ پھر وہاں سے چھوڑ کر موجودہ ملازمت پہ آ گیا۔"

"کیا آپ عدالت کو بتائیں گے کہ موجودہ ملازمت سے پہلے آپ نے کہاں اُور کتنے عرصے کے لِئے ملازمت کی تھی؟"

عامر محمود کے انداز سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔ مگر اُس نے اپنی آواز برقرار رکھی۔ "تقریباً چار ماہ تک تدبیر سیمنٹ فیکٹری میں ملازمت کی تھی۔"

"درست،" خواجہ معراج اثبات میں سرہلا کر بولا۔ "اُس صورت میں آپ کو علم ہو گا کہ اُس زمانے میں وہاں ایک ہائی لیول انکوائیری ہُوئی تھی جب اُس فیکٹری نے منگلا ڈیم کو ناقص سیمنٹ سپلائی کیا تھا۔"

عامر محمود کا رنگ پہلے سرخ، پھر زرد پڑ گیا۔ "جی؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"میرے خیال میں سوال دُہرانے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہئے۔ یہ ایک بڑا سکینڈل تھا جس سے آپ بے خبر نہیں رہ سکتے۔ ڈیم کا ایک حِصّہ ناقص سیمنٹ کی وجہ سے منہدم ہو گیا تھا اور اِس ایکسیڈنٹ میں دو مزدور دب کر مر گئے تھے۔"

"جی---جی۔" عامر محمود نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"جی ہاں؟ یا جی نہیں؟"

"جی ہاں۔"

اگر میں کہوں کہ اُس کی انکوائیری میں آپ کو قصور وار ٹھہرا کر برخاست کر دیا گیا تھا تو آپ کیا کہیں گے؟"

اب عامر محمود کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ "جی نہیں،" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو انکوائیری کے بعد برخاست نہیں کیا گیا تھا؟"

"جی نہیں---- میرا یہ مطلب نہیں۔"

"تو پھر آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"جی میرا مطلب ہے کہ قصور اُوپر والے لوگوں کا تھا، مگر میں چونکہ سب سے جونیئر تھا اِس لِئے الزام میرے سر تھوپ دیا گیا تھا۔"

"اور اگر میں کہوں کہ آپ کا بیان کہ آپ وہاں سے چھوڑ کر موجودہ ملازمت پہ آ گئے تھے، درست نہیں ہے، کیونکہ آپ کو وہاں سے اپریل چھیاسٹھ میں برخاست کیا گیا اور قریب سات ماہ بیکار رہنے کے بعد آپ نے نومبر چھیاسٹھ میں اِزمیر گھی انڈسٹریز کی ملازمت اختیار کی؟"

عامر محمود اب یک لفظی جوابات پہ آ چکا تھا۔ "جی،" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

یہاں پہ خواجہ معراج نے اُس سوال کو چھوڑ کر دُوسرا سوال شروع کیا۔

"آپ سے پہلے اِزمیر گھی انڈسٹریز کی ملازمت میں ایک چیف کیمسٹ تھے جو

ایم۔ایس۔سی۔ کے ڈگری یافتہ تھے اَور کئی برس کا تجربہ رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"عامر محمود اِطمینان کا سانس لیتا ہوا دکھائی دیا۔ "جی وہ بہت اچھے آدمی تھے اَور ایک قابل کیمسٹ تھے۔"

"آپ نے چند سال تک اُن کے ساتھ کام کیا تھا۔"

"جی ہاں۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ تین ساڑھے تین سال پہلے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

خواجہ معراج نے اچانک ایک انوکھا سوال کر دیا۔ "آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟"

عامر محمود نے بوکھلا کر پہلے اِنتظار حسین کی جانب، پھر عدالت میں موجود اپنی فیکٹری کے ورکس منیجر اَور اُس کی پارٹی کو دیکھا جیسے جواب دینے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔ اُس وقت میاں اِنتظار حسین نے اعتراض اُٹھا دیا۔

"جناب، اِس سوال کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ قطعی غیر متعلق سوال ہے۔"

جج کے استفسار پر خواجہ معراج نے جواب دیا۔ "جنابِ عالی، میں جس مقصد کی جانب آ رہا ہوں اُسے حاصل کرنے کے لِئے یہ سوال اِنتہائی ضرورتی ہے۔"

جج نے ناگواری سے یہ کہہ کر کہ "یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ زیرِ غور کارروائی سے سوال کا تعلق ثابت کریں، ورنہ میں اسے عدالت کا وقت ضائع کرنے کی کوشش تصور کروں گا" اعتراض رد کر کے خواجہ معراج کو جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ معراج نے جج کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے سوالیہ نظروں سے عامر محمود کی جانب دیکھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد عامر محمود نے جواب دیا،

"سات سو روپے۔"

"اب اگر میں یہ کہوں کہ سابقہ چیف کیمسٹ کیر شاہ، جو اپنی اعلیٰ تعلیم اور تجربے کی بنا پر بارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتا تھا، اب از خود ملازمت چھوڑ کر نہیں گیا بلکہ اُس کو برخاست کر دیا گیا تھا، اَور اُس کی جگہ آپ کو ترقی دے کر متعین کر دیا گیا تو کیا آپ اس سے اِتفاق کریں گے؟"

عامر محمود جس نے کچھ دیر پیشتر انتہائی پُراعتماد لہجے میں گواہی کا بیان شروع کیا تھا، اب ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا، "جناب یہ مینجمنٹ کا معاملہ ہے، میرا اس میں کوئی قصور ---یعنی مطلب یہ کہ میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔"

خواجہ معراج کے چہرے پہ اِستہزائی مسکراہٹ پیدا ہوئی، مگر وہ تسلی آمیز لہجے میں عامر محمود سے بولا، "آپ بالکل دُرست فرماتے ہیں۔ اِس معاملے میں آپ کا قطعی کوئی دخل نہیں، بلکہ آپ کی مینجمنٹ نے فیصلہ کیا کہ سابقہ چیف کیمسٹ کو فارغ کرکے آپ کو اُس کی جگہ پر لگانے سے ایک تو تنخواہ کی بچت ہو گی، دُوسرے آپ مینجمنٹ کے زیرِبار احسان رہیں گے۔"

یہ کہنے کے بعد خواجہ معراج نے جج سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اس گواہ سے مزید کوئی سوال نہیں پُوچھنا چاہتے۔ جج نے میز بجا کر عدالت دوپہر کے بعد تک کے لئے برخاست کر دی۔

سہ پہر میں مدعیان کی جانب سے ایکسٹرنل کیمیائی رپورٹ اَور اُس کے مصنف کے بیان کرائے جا رہے تھے۔ میاں اِنتظار حسین نے اس پہ زیادہ وقت نہ لیا، صرف گواہ سے ایک آدھا سوال کرنے کے بعد کہا کہ "آپ کی رپورٹ اَور راز میر کی اِنٹرنل رپورٹ میں تھوڑا بہت فرق ہے، گو اِس اُونچ نیچ کے باوجود آپ کا انالسس بھی مقررہ کردہ سپیسی فیکیشن کے اندر ہی ہے،" اَور جج سے کہا "جنابِ والا، دونوں رپورٹیں اَور سپیسی فیکشن چارٹ آپ کے سامنے ہے، آپ اِس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔" مگر جب خواجہ معراج کی جرح کا وقت آیا تو جو کاروائی ہُوئی وہ مدعیان کے لِئے ایک حادثے سے کم نہ تھی۔

"میں رپورٹ پر آپ کی لبارٹری کا نام وغیرہ نہیں دیکھ رہا۔" خواجہ معراج نے پُوچھا۔

کمزور سا نوجوان کیمسٹ ذوالقرنین نقوی، جو ابتداء سے ہی کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا، جواب دینے کی بجائے بولا، "جی؟"

"میں پُوچھ رہا ہوں کہ آپ کس لبارٹری سے تعلق رکھتے ہیں،" خواجہ معراج نے پُوچھا۔

"جی میں یونیورسٹی میں کام کرتا ہوں۔"

"یونیورسٹی میں؟ کس یونیورسٹی میں؟"
"پنجاب یونیورسٹی میں۔"
"یعنی آپ کا کسی انڈی پنڈنٹ لیبارٹری سے تعلق نہیں ہے؟"
"جی یہ انالسس بالکل صحیح ہے۔"
عدالت میں بیٹھے ہوئے سامعین میں سے چند لوگ ہنس پڑے۔
"میں اِس کے دُرست ہونے پر اعتراض نہیں کر رہا" خواجہ معراج نے کہا۔
"میں یہ دریافت کر رہا ہوں کہ ایکسٹرنل رپورٹ کے قواعد کے مطابق کیا یہ انڈی پنڈنٹ ہے؟"
"جی ہاں۔" ذوالقرنین نقوی نے جواب دیا۔
"آپ نے اِس کا سمپل کہاں سے حاصل کیا تھا؟"
"اِس کا سمپل اِنڈی پنڈنٹ حاصل کیا گیا تھا" ذوالقرنین نے کہا۔
"ذوالقرنین صاحب، اِنڈی پنڈنٹ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے سمپل کہاں سے اَور کیسے حاصل کیا؟"
"میں نے دوکان سے اِزمیر گھی کا دو کلو کا ڈبہ خریدا تھا۔"
"آپ نے خُود خریدا یا کہ آپ کو خرید کر دیا گیا تھا؟"
"میں نے خُود خریدا تھا۔"
"آپ نے اِس کی قیمت خُود ادا کی؟"
"اُس وقت میں نے اپنی جیب سے ادا کی تھی۔ جب میں نے رپورٹ کے معاوضے کا بل دیا تو اُس میں ڈبے کی قیمت شامل کر دی تھی۔"
"درست،" خواجہ معراج نے اطمینان بخش لہجے میں کہا۔ "ذوالقرنین صاحب، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی گئی۔ آپ تسلی سے جواب دیں۔ میں آپ کو ایک منٹ کا وقفہ دیتا ہوں تاکہ آپ اپنے خیالات کو مجتمع کر لیں۔"
عدالت میں لوگوں کی باتوں کا ہلکا سا شور پیدا ہوا تو جج نے چوبی ہتھوڑے کی مدد سے میز بجا کر خاموشی کا اِشارہ کیا۔ اگلا ایک منٹ جج نے رپورٹوں کے کاغذات دیکھنے اور عدالت کے ایک اہلکار سے کوئی بات کرنے میں صرف کیا۔ اِسی دوران میں میاں اِنتظار

حسین نے بھی گواہ سے سرگوشی میں بات کی۔

"ذوالقرنین صاحب،" خواجہ معراج بولا، "آپ نے اپنی کوالیفیکیشن بتائی ہے کہ آپ کے پاس ایم۔ایس۔سی کیمسٹری کی سند ہے۔ مگر آپ کے عہدے وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔"

"جی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ڈیمانسٹریٹر کے طور پر تعینات ہوں۔"

"چنانچہ اگر میں یہ فرض کرلوں کہ آپ نے یہ انالسس اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لیبارٹری میں کیا، تو کیا یہ دُرست ہوگا؟"

"جی ہاں۔"

"اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے یونیورسٹی کے وقت میں اُن کے ریسورسز اِستعمال کرکے پرائیویٹ کام کیا ہے۔"

"جی۔۔۔۔" ذوالقرنین کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "جی پریکٹیکل کی کلاس میں پروگرام کے مطابق گھی کا انالسس ہی ہو رہا تھا۔"

"تو آپ نے کوئی عام گھی لینے کی بجائے اِزمیر گھی حاصل کرلیا۔"

"جی ہاں۔"

"اُس ڈبے کی قیمت آپ نے یونیورسٹی سے بھی وصول کی؟"

"جی نہیں۔"

"یونیورسٹی کی لیبارٹری میں جو مواد اِستعمال ہوتا ہے کیا اُس کے اخراجات یونیورسٹی ادا نہیں کرتی؟"

"جی عام طور پہ کرتی ہے۔ مگر اس موقعہ پر میں نے بتا دیا کہ یہ سیمپل میری جانب سے استعمال ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کی مینجمنٹ نے اِس پہ کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ وہ تو ایسی بات کو خوشی سے تسلیم کرلیتے ہیں۔ یونیورسٹی کی لیبارٹریوں میں خرچ ہونے والے سامان کے لیے اُن کے بجٹ میں پورے پیسے ہی نہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ جس طرف سے بھی پیسے بچ سکیں، بچا لیے جائیں۔"

"پھر بھی، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ نے اپنی ملازمت کے وقت میں

پرائیویٹ پارٹی کا کام کر کے پیسے کمائے۔ یعنی دُوہرا معاوضہ حاصل کیا؟"

ذوالقرنین خالی خالی نظروں سے خواجہ معراج کو دیکھنے لگا۔ میاں انتظار حسین اب بے چین ہو رہا تھا، مگر اِس تاثر کو دبانے کی کوشش میں تھا۔

"چلئے چھوڑیئے اِس قصے کو،" خواجہ معراج نے کہا۔ "یہ بتائیں کہ اِزمیر کمپنی کے ساتھ آپ کی واقفیت کس بنا پر ہے؟"

"جی۔۔۔۔ واقفیت؟"

"بھئی انہوں نے آخر آپ کو رپورٹ لکھنے کے لئے منتخب کیا، تو ظاہر ہے کہ اُن کا آپ کے ساتھ کسی نہ کسی ذریعہ سے رابطہ ہوگا، جس کی بنیاد واقفیت ہی ہو سکتی ہے۔"

"میں نے ایک بار اِس کمپنی میں ملازمت کے لئے درخواست دی تھی،" ذوالقرنین نے آخر بتایا۔

"آپ کو ملازمت کی پیشکش ہوئی یا نہیں؟"

"اُس موقعہ پر نہیں ہوئی۔"

"اُس وقت آپ یونیورسٹی کی ملازمت میں تھے؟"

"میں نے وہ ملازمت نئی نئی شروع کی تھی۔"

"پھر آپ کو اِس پرائیویٹ کمپنی میں درخواست دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"یہاں پر۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ترقی کے چانس زیادہ تھے۔ اور۔۔۔۔"

"کیسے کیسے۔"

"کچھ تنخواہ کا فرق بھی تھا۔"

"پھر اُس کے بعد۔۔۔۔"

اِس مقام پہ میاں انتظار حسین نے ایسی عجلت میں مداخلت کی کہ خواجہ معراج کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "جنابِ والا،" وہ جج سے بولا، "میں اِس گواہ کو منحرف کروانا چاہتا ہوں۔"

"کس بنا پر، میاں صاحب،؟" جج نے پُوچھا۔

"گواہ کا ذہن اِنتشار کی حالت میں ہے۔"

"منحرف قرار دلوانے کے لئے یہ کوئی گراونڈز نہیں ہیں۔ میری دانست میں وہ سوچ سمجھ کر سچ سچ جواب دے رہا ہے۔"

جج نے ہاتھ کے اشارے سے خواجہ معراج کو جرح جاری رکھنے کو کہا۔ مگر خواجہ معراج کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اُس نے ہنس کر کہا کہ وہ کوئی اَور سوال نہیں کرنا چاہتا۔ عدالت میں سامعین کا شور اُبھرا، جسے جج نے میز بجا کر بند کرنے کی کوشش کی۔ ذوالقرنین نے بوکھلا کر پہلے اپنے وکیل اَور پھر جج کو دیکھا۔ "یہ انالسس بالکل دُرست ہے جناب،" وہ بلبلا کر بولا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

جج نے اُسے ایک نظر دیکھ کر اِنتظار حسین سے پُوچھا۔ "میاں صاحب، کیا آپ کے بیان ختم ہوئے؟"

میاں اِنتظار نے کرسی سے اُٹھنے کی زحمت نہ کی۔ "جناب تائیدی شہادت ختم ہوئی۔ تردید کا حق محفوظ رکھتا ہوں،" اُنھوں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ اُن کے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری کا تاثر تھا۔

جج نے متعدد بار میز کو چوبی ہتھوڑے کی مدد سے بجا کر عدالت کا شور ختم کرنے کی کوشش کی، پھر اُسی شور میں عدالت برخاست کر دی اَور فریقین کو اگلی پیشی کی تاریخ کے لئے عدالت کے اہلکار سے رجوع کرنے کی ہدایت کر کے اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

عدالت کے اندر ہی بدیع الزمان اَور اس کے ساتھیوں کی باچھیں کھلی ہُوئی تھیں اَور اُنھوں نے آپس میں باتیں شرُوع کر رکھی تھیں۔ باہر آ کر وہ گویا باقاعدہ طور پر بغلیں بجانے لگے۔ بدیع الزمان نے کپکپاتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اَور مکا ہوا میں لہرا کر نعرہ لگایا۔ "بوکاٹا۔"

اعجاز نے بھی اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔ "یار جج نے تو کمال کر دیا،" اعجاز نے کہا۔

"بھئی پبلک اِنٹرسٹ کا معاملہ ہے،" بدیع الزمان بولا، "ہمارے خلاف جا کر اُس نے اپنی گنڈی چڑھوانی ہے؟"

خواجہ معراج کے چہرے سے گو مسرت مترشح تھی، مگر وہ سوچ میں تھا۔

"خواجہ صاحب،" اعجاز نے پُوچھا "یہ بتائیں کہ اِزمیر والوں نے اتنی کمزور گواہی کیوں پیش کی؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں،" خواجہ معراج بولا۔ "بڑی عجیب بات ہے۔"
"آپ کا کیا اندازہ ہے؟"
"میرے خیال میں اُن سے غلطی ہو گئی۔"
"کوئی غلطی سی غلطی!"
"بس ہو گئی۔ بڑے بڑے لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی بڑی بارزی سے رپورٹ بنوا سکتے تھے۔ مِل ملا کر کام نکلوا لیتے، ان کے لئے پیسے خرچ کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اُن کا خیال ہو گا کہ کوئی اِتنی پڑتال نہیں کرے گا۔ ٹیکنیکل قسم کے معاملے میں ایک کوالیفائیڈ آدمی کو کم ہی چیلنج کیا جاتا ہے۔ مگر سمجھو کہ ہماری قسمت اچھی ہے۔ جج نے اِنٹرسٹ لیا۔"
"اِنٹرسٹ کیا بھئی، اُس نے تو واضح طور پر ہماری طرف داری کی۔"
"بدیع ہوش کرو،" خواجہ معراج سختی سے بولا۔ "تم یہ بات پھیلانا چاہتے ہو کہ جج ہمارا طرفدار ہے؟ کیس کا بیڑا غرق کرنا چاہتے ہو؟ زبان بند رکھو۔"
"خواجہ صاحب غلطی ہو گئی،" بدیع الزمان گڑگڑایا۔ "اب جو میری زبان سے ایسا لفظ نکلا تو جو چور کی سزا وہ میری۔"
"زیادہ اِترانے کی ضرورت بھی نہیں۔ ابھی بڑا لمبا قِصّہ باقی ہے۔ آج آثار اچھے ہیں، کل کا پتا نہیں۔ کل جج کی اپنی بیوی سے چخ چخ ہو جائے تو کیس کو اُلٹ کر رکھ دے۔ بس کنٹرول میں رہو۔"
"خواجہ صاحب، جو آپ کا حکم وہ سرکار کا حکم۔ آج سے میری زبان بندی ہو گئی۔"
سب ٹھنڈے پڑ گئے۔ دُکان پہ بیٹھ کر اُنھوں نے چائے کا آرڈر دیا۔ بدیع الزمان نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اطمینان سے مسکرا کر فضا میں دیکھنے لگا۔

اگلی پیشی پر مدعاعلیہان کی جانب سے بیان کرائے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر احسان الحق سکنہ پُل کھنگر گواہ کے طور پر پیش کیا گیا۔

"عرصہ تقریباً تین سال سے میرے علم میں کچھ ایسی بیماریاں آ رہی ہیں جو پہلے دیکھنے میں نہیں آئیں۔"

"کس قسم کی بیماریاں؟" خواجہ معراج نے پُوچھا۔

"زیادہ تر معدے اُور انتڑیوں کی بیماریاں۔"

"جس نوع کی بیماریوں کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ عموماً کن وجوہات کی بنا پر لاحق ہوتی ہیں؟"

"یہ ایک بہت وسیع سوال ہے جناب۔ ہر بیماری کی درجنوں وجوہات ہو سکتی ہیں، جس کی تشخیص مختلف عوامل کو مدنظر رکھ کر کرنی پڑتی ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ جو حالات پہلے سے موجود تھے اُور بیماری لاحق نہیں ہُوئی تھی اُن کو تشخیص کے عمل سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اُس کے بعد مختلف کیسوں میں جو مزید عوامل مشترک پائے جاتے ہیں اُن کو بھی ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ تشخیص دراصل چھانٹی کا عمل ہوتا ہے۔ اس طرح چھانٹی کرتے کرتے آخرکار آدمی ایک یا دو جزئیات تک پہنچ جاتا ہے جن کا ظاہری طور پر کسی دُوسرے فیکٹر کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ اِس مسٹری فیکٹر تک پہنچنے کے بعد پھر اس کے بارے میں مکمل تفتیش کی جاتی ہے۔"

"آپ نے اِس مسٹری فیکٹر تک پہنچنے کے لِئے کس طرح سے مرحلہ وار تفتیش کی؟"

"اَیسے کیس میں سب سے پہلے ہمیں وائرس کا خیال آتا ہے، کہ یہ شاید مریض کے کسی اِختیاری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی جرثومہ وغیرہ کہیں سے آ کر سسٹم میں داخل ہو گیا ہے۔ اس مقصد کے لِئے میں نے چند لوگوں کے خون، پیشاب، پاخانہ، تھوک وغیرہ ٹیسٹ کرائے۔ بہرحال وائرس کو خارج کر دیا گیا۔ اُس کے بعد میں نے دیکھنا چاہا کہ یہ کوئی بڑھاپے یا غربت کی بیماری تو نہیں جو کہ قدرتی امور میں ہی شامل ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک نسبتاً خوشحال اُور جوان شخص کو یہ بیماری لاحق ہُوئی تو وہ امکان بھی ختم ہو گیا۔ یہ ایک افسوسناک کیس تھا۔ اُس کے معدے میں ناسور پیدا ہو گیا تھا جو پھٹ گیا۔ آخری وقت میں

ے ہسپتال داخل کرایا گیا مگر جان نہ بچ سکی۔ اب میں نے اختیاری عوامل کی جانب توجہ
دی، جن میں خوراک اور طرزِ زندگی کو زیرِ غور لانا پڑتا ہے۔ طرزِ زندگی میں عرض یہ ہے
جناب کہ دیہاتی لوگوں کے رہن سہن میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ کاشتکار ہو زمیندار ہو
یا چھوٹا موٹا سرکاری اہلکار، تقریباً سبھی ایک سی زندگی گزارتے ہیں، سبھی کو ایک سی امیونٹی
ہوتی ہے اور حادثاتی اموات کو چھوڑ کر، سب کم و بیش ایک سی عمر ہی پاتے ہیں۔ اِختیاری
عارضے کی صرف ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے، وہ خوراک ہے۔ اس کے بعد بھی درجنوں
اشیائے خوردنی کو ایک ایک کرکے خارج کرنا پڑتا ہے۔ گو کام کافی آسان ہو جاتا ہے۔"

"آمدن بر سرِ مطلب،" خواجہ معراج بولا۔ "آپ آخر اِس نتیجے پر پہنچے کہ مضر
صحت گھی کھانے کی وجہ سے معدے اور انتڑیوں کی بیماریاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ جو بدہضمی
کی شکل میں شروع ہو کر مہلک بیماریوں کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ اِس کی تمام تر تفصیل میری رپورٹ میں موجود ہے۔"

خواجہ معراج، بیان ختم کرکے بیٹھ گیا اور جرح کے لیے گواہ کو وکیل مدعی کے
حوالے کر دیا۔

"کیا یہ دُرست نہیں ہے؟" میاں انتظار حسین اُنگلی کے اشارے سے ڈاکٹر احسان
الحق کو مخاطب کرکے بولا۔ "کہ جب آپ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے تو آپ کی فیس
آپ کے علاقے کے زمیندار اور سابق ایم۔پی۔اے۔ ملک جہانگیر اعوان، جو مدعا علیہ محمد
اعجاز اعوان کی برادری کا سربراہ ہے-----"

خواجہ معراج تیزی سے اُٹھا اور میاں انتظار حسین کی بات کاٹ کر بولا۔ "اوبجیکشن!
جناب والا، اِس طرزِ سوال سے ایک ایسے شخص کو ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو
نہ یہاں پہ موجود ہے نہ اِس مقدمے میں نامزد ہی ہے۔"

جج تارڑ نے اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے ہدایت کی کہ کہ محترم ایڈووکیٹ
استغاثے کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے سوال کریں۔"

"بہتر جناب،" میاں انتظار حسین نے کہا۔ "میں سوال واپس لیتا ہوں۔ ڈاکٹر
صاحب، آپ اپنے مریضوں اور اُن کے علاج معالجے کا ریکارڈ رکھتے ہیں؟"

"دیہات میں جناب کہاں ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ میں نے البتہ رجسٹر رکھا ہوا ہے

جس میں میرا کمپاؤنڈر نام، بیماری اور تاریخ لکھتا ہے۔"

"اور ایڈریس؟"

"جی نہیں۔ گاؤں میں تو ایڈریس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سب ایک دُوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ آپ کو علم ہو گا کہ ڈاک وغیرہ بھی صرف آدمی اور گاؤں کے نام پر ہی آتی ہے۔"

"اگر آپ کا کمپاؤنڈر رجسٹر میں کوائف درج کرتا ہے تو آپ اِس کا حساب کیسے رکھتے ہیں؟"

"جناب میں ہر روز، بلکہ ہر ایک مریض کے ساتھ رجسٹر دیکھتا ہوں۔"

"آپ کے مریضوں کی تعداد کتنی ہے؟"

"اِس کا اندازہ تو مشکل ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"پھر بھی، جو لوگ اپنی شکایات لے کر ہمیشہ آپ ہی کے پاس آتے ہیں اُن کا تخمینہ تو لگایا جا سکتا ہے۔"

"تقریباً ڈیڑھ دو سو ہوں گے۔"

"اور جو کوئی نیا آدمی آتا ہے آپ اُس کی پہچان رکھتے ہیں؟"

"جناب مُجھے پریکٹیس کرتے ہُوئے آٹھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس عرصے میں آخر اِتنی مشق تو ہو جاتی ہے کہ ایک پیشہ ور آدمی چہروں مہروں کو پہچاننے لگے۔"

"مُجھے آپ کی یاداشت کے بارے میں قطعی کوئی شک و شبہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ مگر اِس کے باوجود کیا آپ تسلیم نہیں کریں گے کہ نامکمل اور سرسری ریکارڈ رکھنے کی صورت میں مریضوں اور ان کی بیماریوں کے درمیان مکس اپ ہو جانے کا احتمال ہے؟"

"میرے تجربے میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا جناب۔"

"خاص طور پہ جبکہ ہمارے ہاں،" میاں اِنتظار حسین نے احسان الحق کے جواب کو نظر انداز کر کے سوال کو طول دیا، "بعض نام از حد مقبول اور عام ہیں۔ مثلاً میں ایسے ایسے گاؤں کو بھی جانتا ہوں جس کی آبادی کا پندرہ بیس فیصد حصہ ایک ہی نام کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اور آپ کو بھی علم ہو گا کہ ایسی باتوں کی بنا پر ہسپتالوں میں بڑی بڑی غلطیاں

سرزد ہو جاتی ہیں۔"

"ہسپتالوں میں تو سینکڑوں ہزاروں مریض ہوتے ہیں اور ریکارڈنگ وغیرہ کا سسٹم کئی ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہاں غلطی ہونے کا اِمکان ہے۔"

"شکر ہے کہ آپ نے اِسے ممکنات میں تو تصور کیا" میاں اِنتظار حسین نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا ہے، جس میں ایک جوان زمیندار کو یہ بیماری لگ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ وہ 'بہت دیر' سے آپ کے پاس آیا اور زیرِ علاج ہوا۔ اس بارے میں دو سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اِس مریض کو آخری وقت میں ہسپتال لے جایا گیا، مگر بیماری بگڑ چکی تھی اور مریض کی جان نہ بچائی جا سکی۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کتنا عرصہ آپ کے زیرِ علاج رہا؟"

"تقریباً تین ماہ تک۔"

"اگر آپ کے کہنے کے مطابق وہ بہت دیر سے، آپ کے پاس علاج کی غرض سے آیا تو کیا میں اِس سے یہ سمجھوں کہ اُس کی بیماری کافی حد تک ترقی کر چکی تھی؟"

"جی ہاں، اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔"

"تو کیا اُس وقت آپ کی یہ ذمہ داری نہ تھی کہ اُسے فوراً ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیتے، تاکہ آپ کو پھر یہ نہ کہنا پڑتا کہ آخری وقت میں اُسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا جب اُس کے صحت یاب ہونے کے امکانات بہت ہی کم رہ گئے تھے؟ دُوسرے لفظوں میں آپ کے زیرِ علاج ہونے کے دوران اُس کی بیماری اِس حد تک بگڑ گئی کہ وہ لاعلاج ہو گیا؟"

"جناب پہلے تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی ڈاکٹر بھی کسی مریض کی گارنٹی نہ دیتا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ وہ اُمید لے کر میرے پاس آیا تھا، میں نے اُس کے متعدد ٹیسٹ کروائے، جن میں کچھ وقت صرف ہو گیا۔ پھر میں نے اپنے تجربے کے مطابق اُس کا علاج شرُوع کیا۔۔۔"

"اور پھر یہ بات بھی تو ہے ناہ کہ اگر آپ سب مریضوں کو ہسپتال بھیجنے لگیں تو آپ کی اپنی پریکٹس کیسے چلے!"

"جناب یہ بات ہرگز دُرست نہیں ہے،" ڈاکٹر احسان الحق کی آواز میں غصے کی

جھلک تھی۔ "میرا اندازہ تھا کہ اُسے افاقہ ہو گا اور اِسی لیئے میں نے اُسے دوا دینی شروع کی تھی۔"

"مگر اِس کیس میں آپ کا اندزہ غلط نِکلا۔"

"کوئی شخص بھی اندازے کی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔"

گو ڈاکٹر احسان الحق نے اپنا ضبط برقرار رکھا ہوا تھا، تاہم اُس کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

"میرا دُوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ مریض آپ کے پاس دیر کر کے پہنچا تو ظاہر ہے کہ اُس نے پہلے بھی کسی سے علاج کرایا ہو گا۔"

"دیہاتی علاقوں میں نسبتاً متمول لوگ بھی سب سے پہلے حکیموں اَور دم درود والوں کا رُخ کرتے ہیں۔"

"خیر، دم درود کو تو چھوڑا جا سکتا ہے،" میاں اِنتظار حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دم درود سے افاقہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی نیا عارضہ لاحق نہیں ہوتا۔" سامعین میں سے دبی دبی ہنسی کی آواز اُٹھی۔ اِنتظار حسین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ بیماری کی اصل اِبتدا کسی حکیم کی اُلٹی سیدھی دواء سے ہوئی ہو؟"

"ممکن تو ہے۔"

"ممکن ہے یا عین ممکن ہے؟"

"جو بھی کہہ لیں، کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ ممکنات کا دائرہ ڈھیلا ڈھالا اَور وسیع ہوتا ہے۔ جبکہ 'عین ممکن' بات کا دائرہ تنگ اَور زیادہ واضح ہوتا ہے اور اصل اِیشوز کی نشاندہی آسانی سے ہو جاتی ہے۔"

"آپ کا یہ خیال ہے تو یونہی سہی۔"

"یعنی آپ مجھ سے اِتفاق کر رہے ہیں کہ یہ عین ممکن ہے کہ۔۔۔۔"

"اگر آپ اَیسا سمجھتے ہیں تو یونہی سہی،" ڈاکٹر احسان الحق نے وکیل کی بات کاٹ کر کہا۔ اُس کے لہجے میں بے صبری اَور غصے کی ملی جلی آواز تھی۔

خواجہ معراج، بدیع الزمان اَور اُن کی پارٹی کے دُوسرے لوگوں کو اب اس بات کا

اندیشہ لاحق ہو چلا تھا کہ ڈاکٹر احسان الحق، میاں اِنتظار حسین کی باتوں میں آ کر اپنا اعتماد کھوتا چلا جا رہا تھا۔ خواجہ معراج اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جنابِ والا" اُس نے جج کو مخاطب کر کے کہا۔ "فاضل کونسل گواہ کے مُنہ میں اپنے مطلب کی باتیں داخل کر کے-----"

اِس سے پہلے کہ خواجہ معراج اپنی بات ختم کرتا، اِنتظار حسین، چہرے پہ طمانیت بخش تاثر لئے، عدالت کو مخاطب کر کے بولا کہ وہ اِس گواہ پہ اپنی جرح کو ختم کر رہا ہے۔

عدالت میں سامعین ایک دُوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ اِس شور میں جج تارڑ نے میز بجا کر دس منٹ کے لئے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کیا۔

باہر آ کر بدیع الزمان نے سگریٹ سلگایا، شیخ سلیم نے تازہ پان مُنہ میں ڈالا، اور خواجہ معراج نے صرف اِتنا کہا، "بھڑوا لومڑ کی طرح چالاک ہے۔ اِس کے پاس آرگومنٹ نہ ہو تو لفظوں میں پھنسا لیتا ہے۔ آخر نام اس نے مفت میں تو نہیں کمایا۔" اُس کے لہجے میں رشک کی جھلک تھی۔

عدالت دوبارہ لگی تو ہجویری کیمیکل لبارٹریز لیمٹڈ کا جواں سال کیمسٹ کامران خان گواہی کے لئے حاضر ہوا۔

"کامران صاحب،" خواجہ معراج نے کہا، "کیا آپ عدالت کو شُروع سے گھی بنانے کے عمل کی تفصیل بتائیں گے؟"

"بہتر جناب،" کیمسٹ کامران نے جواب دیا۔ "پہلی سٹیج نیوٹرلائزیشن کی ہے، جسے پری نیوٹرلائزیشن کہا جاتا ہے۔ دُوسری سٹیج پر بلیچنگ کی جاتی ہے۔ اِسے بھی پری بلیچنگ کہا جاتا ہے۔"

"'پری'، کا لفظ کیوں استعمال ہوتا ہے؟"

"کیونکہ یہ دونوں عمل شُروع میں پہلی بار کئے جاتے ہیں، اَور پھر بعد میں پانچویں اَور چھٹی سٹیج پر پہنچ کر انہیں دوہرایا جاتا ہے۔ بہرحال، تیسری سٹیج پر آئل کو فلٹر کیا جاتا ہے۔ اب آئل ہائیڈروجی نیشن کے لِئے تیار ہو جاتا ہے، جو کہ چوتھی سٹیج ہے۔ ہائیڈروجی نیشن کے بعد، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، پانچویں اَور چھٹی سٹیج پر دوبارہ نیوٹرلائزیشن اَور بلیچنگ کی جاتی ہے۔ آگے اِس مرکب کو دوبارہ فلٹر کیا جاتا ہے۔ اِس کے

بعد ڈی اوڈو رائیزلیشن کا عمل کیا جاتا ہے جو پرواکسائیڈ کے ذریعے ٹریٹمنٹ، یعنی بدبودار مادوں کا ٹریٹمنٹ ہے۔ پھر نویں سٹیج پر آخر میں ایک دفعہ پھر فلٹریشن ہوتی ہے اور گھی کی تیاری عمل میں آتی ہے۔"

"مدعی کی پیش کردہ انالسس رپورٹ اور آپ کی رپورٹ میں خاصا فرق ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟"

"جی اس کی وجہ کا تو مجھے علم نہیں۔ مگر ہماری لیبارٹری شہر کی ٹاپ لیبارٹریوں میں سے ہے، جس پہ ہر سال گورنمنٹ کا چیک ہوتا ہے اور سرٹیفکیٹ ایشو کیا جاتا ہے۔"

"انالسس کی خاطر آپ کا سمپل لینے کا طریقہ کار کیا تھا؟"

"ہم نے گھی دوکان سے خریدا تھا۔"

"کونسی دوکان سے؟"

"داتا سٹور سے۔ یہ ایک درمیانے سائز کا جنرل سٹور ہے۔"

"اُن کے پاس دُوسرے مارکے کے گھی بھی تھے؟"

"جی ہاں، مختلف مینوفیکچررز کے گھی رکھے تھے۔"

"اِز میر بناسپتی کا ایک ڈبہ تھا یا متعدد تھے؟"

"مختلف سائز کے کئی ڈبے تھے۔"

"اور آپ نے کوئی سا ایک خرید لیا؟"

"جی ہاں۔ ملک اعجاز صاحب نے خریدا تھا۔ میں اُن کے ہمراہ تھا۔ رسید رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے۔"

"اور ڈبہ؟"

"وہ بھی موجود ہے،" کیمسٹ نے کہا۔ "عدالت میں ایگزبٹ کے طور پہ داخل کر دیا گیا۔"

"ڈبہ آپ نے سٹور میں کھولا یا اپنے دفتر میں؟"

"لیبارٹری میں لا کر کھولا۔"

"آپ اور ملک محمد اعجاز موجود تھے؟"

"جی ہاں۔ ہمارے علاوہ ہمارے چیف، جو کیمسٹ بھی ہیں اور پیتھالوجسٹ بھی، وہاں

موجود تھے۔ ڈبہ کھولنے کے بعد سیمپل نکال کر سیل کر دیا گیا تھا۔ انالسس رپورٹ پر چیف صاحب کے کاؤنٹر سائن بھی ہیں۔"

"میں نے پیچھے آپ کی اور مدعی کی پیش کردہ رپورٹوں میں فرق کا ذکر کیا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کی رپورٹ کے مطابق گھی میں تیزابیت مقررہ حد سے تین گنا زیادہ پائی گئی ہے، یعنی صفر اعشاریہ چھ فیصد ہے۔ اِس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟"

"جناب اِس بات کا تو مجھے علم نہیں۔ میں صرف ایک کیمسٹ ہوں۔ مگر ظاہر ہے کہ جو اجزاء بھی سپیسی فیکیشن سے تجاوز کریں گے مضر رساں ہی ہوں گے۔"

"ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق تیزابیت معدے میں السر پیدا کر سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"آپ نے کچھ دیر پہلے عدالت کو گھی کی تیاری میں آنے والے نو مختلف سٹیج بتائے ہیں۔ اپنی رپورٹ کی روشنی میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِزمیر گھی کی تیاری میں یہ سارے عوامل پورے کیے گئے ہیں؟"

"جو کچھ اِس فیکٹری میں ہوتا ہے اُس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ انالسس کے مطابق چونکہ گھی کے مختلف اجزاء حدود سے تجاوز کرتے ہیں اِس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تیاری کے دوران کوئی نہ کوئی اُونچ نیچ ضرور ہوتی ہے۔" یہاں پہ خواجہ معراج نے اپنے بیان ختم کیے تو جرح کی خاطر میاں اِنتظار حسین اُٹھا۔

"کامران صاحب،" وہ اپنے مخصوص تسلی آمیز، مہذب لہجے میں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دُنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر اُس کی طمانیت میں فرق نہیں آ سکتا، مخاطب ہُوا۔ "آپ نے اپنی تعلیم ایم۔ ایس۔ سی کیمسٹری بتائی ہے۔"

"جی ہاں،" کامران نے جواب دیا۔

"یعنی ایم۔ ایس۔ سی ٹیکنالوجی جسے عرفِ عام میں ایم۔ ایس۔ سی ٹیک کہا جاتا ہے، نہیں بلکہ آپ نے ایم۔ ایس۔ سی پیور کیمسٹری کی ہے۔"

"جی دُرست ہے۔ اِسی لیے میں لیبارٹری انالسس کرتا ہوں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔ میرا مقصد کہنے سے یہ ہے کہ چونکہ آپ انڈسٹریل کیمسٹ نہیں ہیں، چنانچہ انڈسٹری کے مختلف طریقِ کار سے گہری واقفیت نہ رکھتے ہوں گے۔ تاہم

میں باور کرتا ہوں کہ خواہ کتابی سہی، مگر انڈسٹری کا کچھ نہ کچھ علم تو آپ کو ہوگا۔"

"جی کچھ نہ کچھ تو ہے۔"

"اس صورت میں آپ کو علم ہو گا کہ دن رات چلنے والی مشینری میں خام مال سے لے کر تیار شدہ مرکب تک ہر ایک مرحلے پر گھنٹے گھنٹے یا آدھ آدھ گھنٹے کے بعد لبارٹری کے ملازمین سیمپل حاصل کرتے ہیں اور ساتھ اُن کے ٹیسٹ ہوتے رہتے ہیں، نتائج کا اندراج ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ راؤنڈ دی کلاک جاری رہتا ہے۔"

"جی دُرست ہے۔"

"اس صورت میں، میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں کہ چوبیس گھنٹے کے دوران کسی وقت، کچھ عرصے کے لئے، جو ایک منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک کا ہو سکتا ہے، کسی وجہ سے، کسی ایک مرحلے پر، جو خام مال سے لے کر فنشڈ پراڈکٹ تک کوئی بھی سٹیج ہو سکتی ہے، انسانی سہو، یا مشینی خرابی کے باعث، ہزاروں پیداواری یونٹوں میں سے سو پچاس یونٹ ایسے بھی نکل جائیں جن کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہو جائے؟"

"جناب میرا ذاتی تجربہ نہیں ہے،" کامران نے جواب دیا، "مگر جیسا آپ فرماتے ہیں، ممکن تو ہو سکتا ہے۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلسل پیداواری پلانٹ میں کبھی کبھار ایسا حقیقتاً ہوتا ہے۔ اور اگر کسی ایسی چھوٹی بڑی ناقص کھیپ کے بارے میں شکایات موصول ہوں تو اِس مال کو فوری طور پہ واپس منگوا لیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دُرست مال مہیا کر دیا جاتا ہے۔"

"یہ تو مالکان کی پالیسی پر منحصر ہے جناب۔"

"میرے مؤکلان کی شروع دن سے یہی پالیسی رہی ہے، جس کی تصدیق اُن کے ایجنسی ہولڈرز سے لے کر پرچون فروش اور عام صارفین تک سے کی جا سکتی ہے۔ کیا آپ اِس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایسے واقعات، گو روز روز نہیں ہوتے، مگر جب ہوتے ہیں تو انسانی قدرت سے باہر ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے کسی پر عمداً گناہگاری کا الزام عائد کرنا ناانصافی ہے؟"

"جی---" کیمسٹ میاں اِنتظار حسین کی باتوں میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ آخر وہ بولا"

"جی ہاں۔"

"میرا اَور کوئی سوال نہیں۔" یہ کہہ کر انتظار حسین بیٹھ گیا۔

معمول کی ابتدائی کاروائی کے بعد عدالت نے اعجاز کو بیان شروع کرنے کی اجازت دی۔

"کامران کیمسٹ صاحب نے گھی کی تیاری کے جو صنعتی مراحل بیان کئے ہیں، کیا وہ دُرست ہیں؟" خواجہ معراج نے پُوچھا۔

"جی بالکل دُرست ہیں۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"آپ کے خیال میں اِزمیر فیکٹری کے اندر گھی کی تیاری میں یہ تمام عوامل مکمل طور پر تکمیل پاتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میری معلومات کے مطابق اِزمیر فیکٹری والے پہلے تو پانچویں اَور چھٹی سٹیج، یعنی پوسٹ نیوٹرلازیشن اَور پوسٹ بلیچنگ کو حذف کر دیتے ہیں۔"

"اِس کی کیا وجہ ہے؟"

"اِس سے گھی کی ایک خاص مقدار ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اگر وہ یہ عمل صحیح طریقے پر انجام دیں تو یہ مقدار ضائع ہو جاتی ہے، جسے پراسس لاس کہتے ہیں۔ اِس مقدار کا تعین ایک فارمولے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے: تیزابیت، ضرب صفر اعشاریہ تین، جمع دو۔ چونکہ تیزابیت، یعنی ایف ایف اے، پہلے ہی حد سے زیادہ ہے، یعنی صفر اعشاریہ چھ سات فیصد ہے' اِس لئے پراسس لاس کافی ہو جاتا ہے۔ اِس نقصان کو بچانے کے لئے یہ لوگ پوسٹ نیوٹرلائزیشن اَور پوسٹ بلیچنگ کو گول کر جاتے ہیں۔۔۔"

"گول کر جاتے ہیں؟" جج تارڑ نے بات کاٹ کر پُوچھا۔

"جناب حذف کر دیتے ہیں، اَور ساتویں عمل، یعنی فلٹریشن پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھویں اَور نویں عمل کو بھی یہ کھا جاتے ہیں۔۔۔"

جج تارڑ نے دوبارہ بات کاٹ کر سوال کیا۔ "کھا جاتے ہیں؟"

سامعین میں چند ایک ہنس پڑے۔

"میرا مطلب ہے جناب کہ حذف کر دیتے ہیں،" اعجاز نے کہا۔

اب خواجہ معراج نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ڈی اوڈو رائیزیشن اور آخری فلٹریشن کے عمل بھی نہیں کرتے؟"

"جی ہاں،" اعجاز نے جواب دیا۔

"اِس سے اُن کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور گھی کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟"

"ڈی اوڈو رائیزیشن کا تعلق بدبودار مادے پیدا ہونے کی میعاد سے ہے۔ نتیجتاً گھی میں پرواکسائیڈ ویلیو حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کی نفی کرنے کے لِئے یہ لوگ مرکب میں ایک کیمیکل بنام بیوٹیرک ایسڈ ڈال دیتے ہیں جو اصلی گھی کی طرح کی خوشبو پیدا کرنے کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ بدبودار مادوں کے پیدا ہونے کا تعیّن کبھی نہیں ہو پاتا۔ نویں سٹیج پر فلٹریشن ایک ایسے عمل کے ذریعے کرنی پڑتی ہے جسے ویکیوم سٹیم ڈِسٹی لیشن کہتے ہیں۔ اِس کے نہ کرنے سے انہیں بھاپ پیدا نہیں کرنی پڑتی اور بھاپ کے لئے بوائلر میں جو ایندھن جلانا پڑتا ہے اُس کی بھی بچت ہو جاتی ہے۔ گھی کو نقصان یہ پہنچتا ہے کہ آخری فلٹریشن نہ کرنے سے کئی ناخالص اجزاء اندر ہی رہ جاتے ہیں۔ پھر نِکل کی ٹریسز کو تلف کرنے کے لِئے سٹرک ایسڈ ڈالنا پڑتا ہے جو نہیں ڈالا جاتا، کیونکہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اور بھی کئی ہاتھ کی صفائیاں دکھاتے ہیں۔ مثلاً سیلیکٹو ہائیڈروجی نیشن کر کے گھی کا دانا موٹا کر دیتے ہیں، جس سے صارفین کو گمان ہوتا ہے کہ گھی کی کوالٹی عمدہ ہے۔ مگر جنابِ عالی، سب سے بڑی بے ایمانی جو یہ لوگ کرتے ہیں-----"

میاں اِنتظار حسین نے اُچھل کر لفظ 'بے ایمانی' پر اعتراض کیا، جس کے ساتھ جج نے اِتفاق کیا اور اپنے اہلکار کو ہدایت کی اِسے کاروائی سے حذف کر دیا جائے۔ ساتھ ہی اُس نے گواہ اعجاز کو تنبیہہ کی کہ عدالت کا فیصلہ صادر ہونے تک ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔ پھر اُس نے بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"سب سے بڑی خرابی شروع میں ہی کی جاتی ہے،" اعجاز نے کہا، "جب خام مال ہی ناخالص حاصل کیا جاتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" خواجہ معراج نے تشریح کی خاطر پُوچھا۔

"جو تیل دِساور سے درآمد کیا جاتا ہے اُس میں جو ناخالص اور سستا ہوتا ہے وہ خرید کیا جاتا ہے۔ خالص، یعنی ریفائین کیا ہوا تیل بھی آتا ہے، مگر وہ مہنگا ہوتا ہے۔ جو نان

ریفائین تیل ہوتا ہے اُس سے گھی بنایا جاتا ہے۔ وہ سخت جما ہوا ہوتا ہے۔ آپ ازمیر گھی دیکھیں تو چھوٹی بڑی ڈلیوں کی شکل میں ملے گا۔ اِس کا بڑا آسان سائیسٹ بھی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"خالص بناسپتی گھی کا نقطۂ پگھلاؤ چونتیس سے چھتیس ڈگری سنٹی گریڈ تک ہونا چاہیے۔ چنانچہ اگر اسے ہتھیلی پہ رکھا جائے تو چند سکینڈ میں اِنسانی بدن کی حرارت سے پگھلنا شروع ہو جائے گا۔"

"خواجہ معراج نے جج کو مخاطب کیا۔ "اگر عدالت یہ ٹیسٹ دیکھنا چاہے تو ابھی دکھایا جاسکتا ہے جناب۔ گھی کا ڈبہ یہاں بطور ایگزبٹ موجود ہے۔"

جج تارڑ کی آنکھوں میں پہلی بار دِلچسپی کی چمک پیدا ہُوئی۔ اُس نے اِثبات میں سر ہلایا۔ گھی کا ڈبہ، جو کہ سمپل حاصل کرنے کے بعد ٹیپ سے سیل کر دیا گیا تھا اَور ٹیپ پہ چیف کیسٹ باقر رضوی، کیسٹ کامران اَور اعجاز کے دستخط موجود تھے، کھولا گیا۔ اعجاز نے ہاتھ اندر داخل کر کے ایک ڈلی سے بڑے بیر کے برابر حصہ توڑا اَور اُسے دُوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پہ رکھ کر سب کے سامنے ہوا میں پھیلا دیا۔ عدالت کے اندر یہ ڈرامائی صورت پیدا ہونے سے لوگوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ متعدد لوگ اپنی جگہوں سے اُٹھ اُٹھ کر اَور ایڑیاں اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ اعجاز کے ہاتھ کا رُخ جج کی جانب تھا جو گردن لمبی کر کے دِلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ گزر گئے، اَور سفیدی مائل گھی کی ڈلی اُسی کی اُسی طرح ہتھیلی پہ جمی رہی۔ ہوا میں بازو پھیلائے پھیلائے اعجاز کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو چلی تھی۔

"ٹھیک ہے،" جج نے آخر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ پھر خوش دلی سے بولا۔ "اب تو آپ نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی ہے۔"

عدالت میں موجود سب لوگ ہنس پڑے۔ اب خواجہ معراج بھی خوش دکھائی دے رہا تھا اَور بدیع الزمان کی باچھیں کھلی تھیں، حتیٰ کہ شیخ سلیم بھی اپنے پان خوردہ سیاہ دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ صرف مدعی پارٹی، جس میں آج دُوسری بار حاجی کریم بخش شامل ہوئے تھے، غصے سے منہ پھلائے بیٹھے رہے۔ اعجاز نے ہاتھ اُلٹا کر گھی کی ڈلی ڈبے میں گرائی اَور رومال سے ہتھیلی کو صاف کیا۔ خواجہ معراج اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اَور میاں

اِنتظار حسین گھوری دار ماتھا اُور رائفل کی نالی کی سی کالی آنکھیں لیے اُٹھا۔

"جناب ملک صاحب" وہ بولا، "آپ دھوکہ دہی اُور جعلسازی سے اپنے آپ کو گورنمنٹ کا اِنسپکٹر ظاہر کر کے میرے مؤکل کی فیکٹری میں داخل ہُوئے اُور غیر قانونی طور پہ اِدھر اُدھر گھومتے اُور کمپنی کے ملازمین سے جھوٹی سچی خبریں حاصل کرتے رہے۔ کیا آپ اِس حقیقت سے اِنکار کرتے ہیں؟"

"جناب یہ ایک پریس رپورٹر کے فرائض میں شامل ہے کہ جہاں سے ہو سکے وہ خبر حاصل کرے۔ اگر ہم لوگوں کو اپنی ڈیوٹی ادا کرنے سے روک دیا جائے تو سارے کا سارا پریس کالعدم ہو کر رہ جائے۔ مگر پھر ملک کا اللہ ہی حافظ۔"

"ملک کا ہر حال میں اللہ ہی حافظ ہوتا ہے ملک صاحب۔ پریس کے فرائض بجا، لیکن اُنہیں دھاندلی، دھونس یا دھوکے سے ٹریس پاس کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ پریس رپورٹر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ پیشہ ور صحافی بھی نہیں ہیں۔ آپ پہلے سکول ماسٹر تھے، جہاں سے غیر پیشہ ورانہ حرکات کی بنا پر آپ کو برخاست کر دیا گیا۔ پھر آپ ٹریڈ یونین لیڈر بنے رہے۔ وہاں سے بھی کچھ عرصے کے بعد آپ کی اپنی ہی پارٹی نے آپ نکال باہر کیا۔ اب آپ نام نہاد صحافی بن کر دندناتے پھر رہے ہیں۔"

خواجہ معراج اُچھلا۔ "جناب والا، فاضل کونسل کو اچھی طرح علم ہے کہ اِن باتوں کا زیرِ کاروائی مقدمے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف ایک مدعا علیہ کے کردار کو سیاہ کر کے عدالت کے فیصلے پر اثرانداز ہونا چاہتے ہیں۔"

جج اُس اعتراض سے اتفاق کرتے ہُوئے بولا، "میاں صاحب، آپ ایک سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ بیان قابل اعتبار ہے یا نہیں۔ برائے مہربانی گواہ کو بیان بھگتانے دیں۔"

انتظار حسین نے معذرت کر کے اپنا انداز جرح ترک کر دیا۔ "آپ کی سائنس کی تعلیم کس حد تک ہے؟" اُس نے قدرے نرمی سے پُوچھا۔

"میری سائنس کی تعلیم تو صرف میٹرک تک ہے،" اعجاز نے کہا۔ "مگر یہ رپورٹ لکھنے کی غرض سے میں نے لائبریری سے کتابیں حاصل کر کے مطالعہ کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ٹیکنیکل لوگوں سے گفتگو کر کے معلومات اِکٹھی کی ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ

کی تیاری کے نقائص کو جانچنے کے لیے کسی بڑی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے، اِسے عام فہم طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ سائنس کا بنیادی علم موجود ہو۔"

"آپ نے،" انتظار حسین بولا، "ابھی ابھی عدالت کو 'ہاتھ کی صفائی' کے طور پہ ایک 'ٹرِک' دکھایا ہے۔ اِسے سیکھنے کے لیے تو آپ نے کئی گھی کی فیکٹریوں میں ریسرچ کی ہوگی؟"

"جناب یہ کوئی جادو کا تماشا نہیں، بلکہ ایک سکہ بند ٹیسٹ ہے جسے عام لوگ بھی جانتے ہیں۔ اور میں صرف اِز میر فیکٹری میں ہی گیا ہوں۔"

"ظاہر ہے کہ آپ نے دِہاڑی داروں سے تو یہ معلومات حاصل نہیں کی ہوں گی۔ کسی پڑھے لکھے ٹیکنیکل شخص نے ہی آپ کو یہ باتیں بتائی ہوں گی۔"

"جی ہاں۔"

"اور اگر آپ صرف میرے مؤکل کی فیکٹری میں ہی گئے ہیں، تو پھر یہ کوئی اُس کمپنی کا ملازم ہی ہو سکتا ہے۔"

"ممکن ہے۔"

"کیا آپ عدالت کو بتا سکتے ہیں کس نے آپ کو یہ معلومات فراہم کیں؟"

"نو----" بدیع الزمان اپنی سیٹ پہ بیٹھا بیٹھا ہاتھ اُٹھا کر چلایا۔ "نو!"

ساتھ ہی خواجہ معراج بھی بول پڑا۔ "جناب یہ پریس کے آداب کے خلاف بات ہے۔"

"اِس معاملے کی وضاحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ عدالت کے علم میں لایا جائے کہ یہ معلومات کسی کوالیفائیڈ شخص کی جانب سے آئی ہیں،" انتظار حسین نے کہا۔

"جنابِ عالی، یہ بات غیر اہم اور غیر ضروری ہے۔ قانونی طور پر عدالت کے لیے جن باتوں کا جاننا ضروری ہے وہ تصدیق شدہ صورت میں ریکارڈ پر موجود ہیں،" اعجاز نے جواب دیا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ معلومات آپ کو کسی ذمہ دار شخص نے فراہم کی ہیں، نہ کہ کسی نے شخصی عداوت اور عناد کی بنا پر دی ہیں۔"

"میں نے عرض کیا ہے کہ اِس کی ضرورت ہی نہیں ہے،" اعجاز نے کہا۔ "جو

باتیں ریکارڈ پر اور زبانی گواہان کی مدد سے پیش کی گئی ہیں وہ ہمارے مئوقف کی تائید کے لِئے کافی سے زیادہ ہیں۔"

"آپ کو علم ہے کہ عدالت آپ کو یہ اِنفریشن دینے پر مجبور کر سکتی ہے؟"

"جی ہاں۔ اگر عدالت چاہے تو سزا کی دھمکی کے زیرِ اثر مجھے فورس کر سکتی ہے۔"

"پھر بھی آپ کیا عدالت کا حکم ماننے پر تیار نہ ہوں گے؟"

جج نارڈ جو صبر سے بیٹھا یہ سب سن رہا تھا، بول اُٹھا "میاں صاحب، آپ اپنے تئیں میری جانب سے کوئی بیان نہ دیں۔ اپنے ارادے اور فیصلے کا میں خُود مالک ہوں۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔"

"جناب والا، نہایت ادب کے ساتھ میں گزارش کرتا ہوں کہ اس معاملے کی صفائی کے لِئے بیحد ضروری ہے کہ مدعا علیہ کی معلومات کا سورس عدالت کے علم میں لایا جائے۔ اِس کی اہمیت میں آگے چل کر اپنے دلائل میں واضح کروں گا۔"

جج چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر اعجاز کو مخاطب کر کے بولا۔ "کیا آپ اِس بات پہ رضامند ہوں گے کہ قریب آکر میرے کان میں، یا میرے چیمبر میں آکر اُن لوگوں کے نام اور مقام بتا دیں؟ عدالت اِس انفریشن کو جب تک ضروری ہوا اُس وقت تک اخفائے راز میں رکھے گی۔"

"جنابِ عالی، میرے سورسز کا میرے ساتھ ایک اعتماد قائم ہے، میں اِسے توڑ نہیں سکتا۔ یہ ایک راز ہے اور اپنے قول کے مطابق میں اِس کا محافظ ہوں، افشاء نہیں کر سکتا، چاہے اِس کے بدلے میں مجھے سزا ہی کیوں نہ بھگتنی پڑے۔"

اچانک بدیع الزمان چلا اُٹھا "ہیشاباشے بچے۔ صحافی کی آبرو میزر کی بیوی کی آبرو کی مانند ہے، شک و شبے سے بالا تر۔"

"خواجہ صاحب،" جج تلخی سے بولا، "اپنے مئوکل کو کنٹرول میں رکھیں جو مدعا علیہ ہے۔ یا اُسے سٹینڈ پر لے کر آئیں تاکہ حلف کے زیرِ اثر بات کرے۔ اگر اُس نے اس طرح عدالت کی کارروائی میں مداخلت کی تو میں اُس پہ چارج لگا دوں گا۔"

"جناب والا، میرا مئوکل جذبات کی رو میں بہہ کر بول گیا ہے۔ میں اُس کی جانب

سے معذرت خواہ ہوں۔۔۔۔"

ابھی خواجہ معراج نے بات ختم نہ کی تھی کہ بیچ میں حاجی کریم بخش بول اُٹھا۔ اُس کا چہرہ لال بھبوکا تھا اَور اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "جناب یہ سارا واقعہ چوری اَور ڈاکے کی طرح ہے۔ اِس شخص نے میرے گھر میں ڈاکہ ڈالا ہے، میرے وفادار ملازمین کو بہکایا ہے۔ اِس کے جھانسے میں آکر اُنھوں نے اُس کی آؤ بھگت کی اَور اُس نے اُن کی باتوں کو توڑ موڑ کر میری۔۔۔۔ میری۔۔۔" حاجی کی آواز روہانسی ہوگئی، "عمر بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔۔۔۔" بیچ میں میاں اِنتظار حسین کی آواز آ رہی تھی۔ "جناب میں اپنے مؤکل کی جانب سے معذرت پیش کرتا ہوں۔۔۔۔"

اِسی دوران اعجاز نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ "حاجی کریم بخش صاحب نے مجھے گورنمنٹ اِنسپکٹر سمجھ کر رشوت کی پیشکش کی تھی۔۔۔۔"

بیچ بیچ میں جج کی چوبی ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک اَور "خاموش، خاموش، آپ بیٹھ جائیں، بیٹھ جائیں۔۔۔۔ میں عدالت خالی کرا دوں گا" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک وقت میں خواجہ معراج، میاں اِنتظار حسین اَور اعجاز تینوں ایک ساتھ بولتے چلے جا رہے تھے۔ سامعین کی بھنبھناہٹ تیز ہو گئی تھی اَور کئی لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ اُن کی آوازوں کے اُوپر اُوپر بدیع الزمان کی چیختی ہُوئی کھانسی کی آواز اُٹھ رہی تھی۔ اِس سارے منظر کے اوپر جج کا غصیلہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ عدالت میں چند منٹ تک مکمل اِنتشار کی کیفیت رہی۔ دونوں وکیل اپنے اپنے مؤکلان کو خاموش کرانے کی کوشش میں مصروف، ہاتھ پھیلائے، جج کو معذرت طلب نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد آوازیں دبنی شروع ہو گئیں اَور آہستہ آہستہ، سامعین کی ایک آدھ آواز کے علاوہ، عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ جج تارڑ نے غضبناک نگاہوں سے عدالت میں چاروں طرف دیکھا، چوبی ہتھوڑا اُٹھا کر سختی سے میز پہ مارا اَور دوپہر کے بعد تک عدالت برخاست کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ اُٹھ کر تیزی سے اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ اُس کی چال سے برہمی مترشح تھی۔

عدالت کے احاطے سے ذرا باہر نکل کر نانبائی کی دوکان تھی جہاں خواجہ معراج، بدیع الزمان، اعجاز، شیخ سلیم اَور دو جونیئر وکیل میز کرسیوں پہ بیٹھے ماش کی دال کے ساتھ

روٹی کھا رہے تھے۔ سب خاموش تھے۔ آخر بدیع الزمان نے جرات کر کے بات کی۔
"مقدمہ تو خواجہ ہماری فیور میں جا رہا ہے۔"
"تمہاری بات میں دو سقم ہیں بدیع،" خواجہ معراج نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ مقدمہ ہماری فیور میں نہیں جا رہا۔ ایک حد تک جا رہا تھا' آپ لوگوں نے جج کا موڈ بگاڑ کر کام خراب کر دیا ہے۔ دُوسرا یہ کہ مقدموں کے فیصلے ججوں کے ارادوں پر ہی منحصر ہوتے ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ اُس کا ارادہ کس کے حق میں فیصلہ دینے کا ہے۔ میری ریسرچ بتاتی ہے کہ آدمی چالباز ہے۔ اِس کے ارادے کوئی بھانپ نہیں سکتا۔ جہاں جہاں سے تبدیل ہو کر آیا ہے وہاں سے خبریں ملی ہیں۔"
"مگر کھاجہ صاب،" شیخ سلیم نے معصومیت سے پُوچھا' "کنون بھی کوئی چیز ہے کہ نئیں؟"
"میاں صاحب، یہاں کنون شنون نہیں چلتا،" خواجہ معراج شیخ سلیم کے لہجے کی نقل میں بولا۔ "آپ نے کوئی مقدمے بھگتے ہیں؟"
"توبہ جی توبہ،" شیخ سلیم کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "مجھے تو بدی نے گھسیٹ لیا ہے' میں کہاں اِس گند میں پیر رکھتا ہوں۔"
"تو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کنون کوئی اینٹ پتھر کی طرح پکی چیز نہیں ہوتی۔ یہ جج کے ہاتھ میں گیلی مٹی ہوتی ہے، جیسی شکل چاہے وَیسی بنا دے۔"
خاموشی سے سب نے کھانا ختم کیا۔ اُن سے اگلی میز پر ایک آدمی سوٹ بوٹ پہنے اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا اَور مستقل اُنہیں دیکھتا جا رہا تھا۔ اعجاز نے ایک آدھ بار اُس پر سرسری نظر ڈالی۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ شخص عدالت کے سامعین میں بھی موجود تھا۔ مگر وہاں پہ متعدد لوگ عدالتوں سے فارغ ہو کر اکیلے دُکیلے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ اعجاز نے اپنے لوگوں کے لِئے چاء کا آرڈر دیا۔ بدیع الزمان نے چائے کی پیالی کے ساتھ دو تین سگریٹ پئے۔ پھر سب وہاں سے فارغ ہو کر اُٹھے اَور عدالت کی جانب چل دیئے۔

ابھی عدالت لگی ہی تھی کہ میاں اِنتظار حسین کا ایک جونیئر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی فائل میں سے دو تین کاغذ نکال کر اِنتظار حسین کو دیئے۔ اِنتظار حسین اُنہیں غور سے پڑھتا رہا جبکہ جونیئر اُس کے کان میں کھسر پھسر کرتا رہا۔ اِنتظار حسین نے اُٹھ کر عدالت کو مخاطب کیا۔

"جناب والا' ہمیں کچھ نئی معلومات دستیاب ہُوئی ہیں' جن کی سنگین نوعیت کے پیش نظر میں اپنے مئوکلان کی جانب سے مدعا علیہان کے خلاف جعلسازی کی ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہُوں۔ برائے مہربانی بغرض اِنصاف اِسے پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ اِس کے علاوہ ہم ایک ایسا ریکارڈ بھی پیش کریں گے جس کے مطابق وہ توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں جس کا فیصلہ جناب خُود کریں گے۔ ہمیں چند گھنٹے کی مہلت عنایت فرمائی جائے تا کہ ہم درخواست تیار کر سکیں۔"

جج تارڑ کے چہرے پہ اب شدید اُکتاہٹ طاری تھی۔ اُس نے کوشش کر کے معمول کا لہجہ اختیار کیا۔ "کونسی نئی معلومات کی بناپر آپ مہلت طلب کر رہے ہیں؟"

"جناب میں پیش از وقت اِن واقعات کا بیان کرنا نہیں چاہتا۔"

"بھئی آپ کی تازہ ریکویسٹ کی گراوٴنڈ کیا ہے۔ عدالت کا وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں آپ کے قریب آ کر بتانے کی اجازت چاہتا ہُوں۔"

جج کے اِثبات میں سرہلانے پر میاں انتظار حسین جج کے قریب کھڑا ہو کر سرگوشی میں بات کرنے لگا۔ ساتھ ہی اُس نے چند کاغذات جج کو پکڑائے۔ جج نے اُنہیں ایک نظر دیکھ اُلٹا پلٹا پھر اگلے روز تک التواء دے کر عدالت برخاست کرنے کا اشارہ دیا۔

خواجہ معراج اُٹھا۔ "جنابِ عالی' جس بنیاد پر التواء دیا جا رہا ہے وہ ہمارے علم میں بھی لائی جائے۔"

"خواجہ صاحب' میں زبانی بات کو ریکارڈ پر نہیں لا سکتا۔ کل مدعیان کی جانب سے درخواست موصول ہو گی تو ساری بات ریکارڈ پر آ جائے گی اُور آپ کو علم ہو جائے گا۔"

"اُس صورت میں اگر ہمیں بھی جواباً مہلت کی ضرورت پڑی تو اُس پر ہمدردانہ غور فرمایا جائے۔"

"کل کا دِن تو آنے دیں۔ سب کچھ سامنے آ جائے گا۔" جج تارڑ نے کہا۔
عدالت میں سامعین کی باتوں کا شعور پیدا ہوا، جو عدالت کے خالی ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ مدعیان کی پارٹی کے چہروں پر بشاشت تھی۔ خواجہ معراج اور ساتھیوں کے چہرے تفکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عدالت سے نکل کر وہ سب، کوئی بات کیے بغیر، ایک دوسرے کو دیکھ کر پریشانی سے سرہلاتے ہوئے سیدھے خواجہ معراج کے دفتر پہنچے۔
خواجہ معراج نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پُوچھا "کوئی ایسی بات جس کا مجھے علم نہیں؟"

"ایک ایک بات آپ کے سامنے ہے،" بدیع الزمان نے کہا "ہمارا کیس تو بڑا سٹرانگ جا رہا ہے۔ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے؟"
خواجہ معراج چند منٹ تک ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے سوچتا رہا۔ اُس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اُس کا دماغ نہایت تیزی سے کام کر رہا ہے۔ "اچھا" پھر وہ بولا، "اب ہمیں سٹریٹجی کا رُخ تبدیل کرنے پڑے گا۔ آپ اب گھر جائیں اور کل صبح سات بجے سب یہاں پہ جمع ہوں۔ بدیع، اعجاز، شیخ صاحب، صبح سات سے ایک منٹ بھی دیر نہ ہو۔ اِن بھڑوؤں کی تازہ اِنفرمیشن کا میں پتا نکالتا ہوں۔ صبح سات بجے،" اُس نے اُنگلی کی نوک میز پہ رکھ کر کہا۔ "یاد رہے۔" تینوں آدمی خواجہ معراج اور اُس کے دو جونیئر وکیلوں کو دفتر میں چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔
اگلی صبح پونے سات بجے، جونیئر وکیلوں سمیت، سب لوگ دفتر میں حاضر تھے۔ ٹھیک سات بجے خواجہ معراج آ پہنچا۔ اُس کے ماتھے پہ تیوری تھی، جس سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ نیند کی کمی کے باعث تھی یا کسی اور وجہ سے تھی۔ اپنی کرسی پہ بیٹھنے سے پہلے ہی وہ پھٹ پڑا۔
"تاپو پریس کا مالک کون ہے؟"
"شیخ سلیم،" بدیع الزمان نے اشارہ کر کے بتایا۔
"یہ مجھے علم ہے۔ میں پُوچھتا ہوں اصل مالک کون ہے؟"
بدیع الزمان نے ایک دو سیکنڈ تک لاجواب سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میں بتا رہا ہوں خواجہ،" وہ بولا، "کہ شیخ سلیم ہی مالک ہے۔ اِس نے اسلم شاہ سے پریس خرید لیا

تھا۔"

"بدیع، مجھے غلط راستے پہ لگانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم نے جو ملکیت کا ریکارڈ دُرست کرنے کی درخواست دی تھی اُس میں شیخ سلیم کو سینیئر پارٹنر قرار دیا گیا تھا۔"

"استغاثے میں صرف پریس کا نام لکھا گیا ہے اور مدعا علیہ میں 'پروپرائٹر' درج ہے۔ اُس وقت شیخ سلیم سینیئر پارٹنر کی حیثیت سے پروپرائٹر ہی تھا۔"

"گڑ بڑ والی بات ہے،" خواجہ معراج بولا۔ "جج کو صرف ایک بہانے کی ضرورت ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ اِس ملکیت کے معاملے میں مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔ اِس کے علاوہ اور کوئی بات میرے ذہن میں نہیں آ رہی۔ ہو نہ ہو، کچھ اُسی کا قصّہ نِکل سکتا ہے۔ مگر میں بھی سویا نہیں رہا۔ سب معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ اب تُم تینوں میری بات کان کھول کر سنو۔ تُم میں سے کوئی بھی ایک لفظ مُنہ سے نہیں بولے گا۔ جج کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی کو تھکّا بلا سکتا ہے۔ مگر میں سنبھال لونگا۔ تُم اپنے پبلک اِنٹرسٹ اور اپنے اصولوں کو اندر کی جیب میں رکھو۔ یہ قانون کا معاملہ ہے۔ اب قانون کی لڑائی ہوگی۔ سمجھ لیا؟"

"ہاں جی،" شیخ سلیم نے سب سے پہلے جواب دیا۔

عدالت کے اندر جب میاں اِنتظار حسین نے درخواست پیش کی تو ایک مزید دھماکہ ہوا۔ بیان یہ کیا گیا کہ "ٹائپو پریس" سے ایک چالو رونا پرنٹ مشین نکال کر اُسے نامعلوم مقام پر پہنچا دیا گیا ہے، اور اُس کی جگہ پر ایک چالیس سال پرانی ناکارہ مشین غالباً کسی کباڑی کی دوکان سے اُٹھا کر رکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ اِس وقت پریس میں ایک دستی پیپر کٹر، چند ایک دُوسرے چھوٹے موٹے اوزار اور یہ ناکارہ مشین رکھی ہے۔ اس کل سامان کی قیمت چند سو روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ مدعا علیہان کی یہ حرکات توہین عدالت میں آتی ہیں کیونکہ عدالت کے حکم نامے میں واضح طور پر ہدایت ہے کہ مدعا علیہان کی جائیداد میں سے کوئی شے اُٹھائی یا فروخت نہ کی جائے جب تک کہ اِستغاثے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ اِستدعا ہے کہ مدعا علیہان کے خلاف جعلسازی اور توہین عدالت کے مقدمے درج کئے جائیں۔"

یہ بات مدعا علیہان میں سے کسی کے علم میں نہ تھی۔ چند لمحوں تک وہ سب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہے۔ شیخ سلیم کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اُس نے بے

اختیار کرسی سے آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کیا، جیسے اُسے احساس ہو کہ عدالت اُس پہ فردِ جرم عائد کرنے والی ہے۔ اُس کی دُوسری جانب بیٹھے ہوئے جونیئر وکیل معین الرحمن نے یہ دیکھا تو اُسے یوں لگا جیسے شیخ سلیم عدالت سے اُٹھ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس نے شیخ سلیم کی کمر کو دونوں بازوؤں کے حلقے میں مضبوطی سے پکڑا اور کھینچ کر اُسے کرسی پہ بٹھا دیا۔

خواجہ معراج اٹھا۔ "جنابِ عالی، کوئی گواہان پیش نہیں کئے گئے جو اِس امر کی تصدیق کریں کہ یہ واقعہ عمل میں آیا ہے۔ اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ پریس میں رکھی ہوئی مشین درحقیقت وہی مشین نہیں ہے کہ جو اول روز سے موجود تھی۔"

میاں انتظار حسین جواب میں بولا، "غالب امر ہے کہ یہ حرکت رات کے اندھیرے میں کی گئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے عینی شاہد موجود نہیں ہیں۔ اور پریس کے دو ملازمین کے لب بھی سیئے ہوئے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ وہ کیسے اپنے مالکان کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں؟"

خواجہ معراج حاضر دماغی سے کام لیتا ہوا بولا، "فاضل کونسل سچ فرما رہے ہیں، بالکل اِسی طرح جیسے ان کے موکلان کے اکاؤنٹنٹ اور کیمسٹ ملازمین اُن کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔"

عدالت کے مجمعے سے دو چار لوگوں کی ہنسی کی آواز اُٹھی۔ جج نے اپنا چوبی ہتھوڑا اٹھا کر میز بجائی۔ عدالت میں خاموشی ہو گئی۔

"خواجہ صاحب،" جج بولا۔ "اب ہم اِس بات سے آگے نکل آئے ہیں۔ میاں صاحب کو بیان جاری رکھنے دیں۔"

"میں یہ عرض کر رہا تھا،" میاں اِنتظار حسین نے کہا، "کہ گواہان کی عدم موجودگی کے باوجود، الزام کو ثابت کرنا آسان ہے۔ کسی بھی پریس مشین کا علم رکھنے والے انجینئر میکینک یا پرنٹر کو بھیج کر مشین کی اِنسپکشن کرائی جا سکتی ہے تا کہ پتا چلے کہ کیا یہ مشین پرنٹنگ کر بھی سکتی ہے یا کہ عرصہ تیس سال سے چلی ہی نہیں اور نہ ہی چلنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ 'بہ بانگ دُہل' کا پرچہ سامنے رکھ کر ایکسپرٹ سے رپورٹ حاصل کی جا سکتی ہے کہ یہ پرنٹنگ اس مشین کا کام ہے یا کسی دُوسری کا۔"

اس وقت خواجہ معراج اس مخمصے میں تھا کہ عدالت سے وقت مانگے یا کہ کاروائی چلنے دے۔ اگر وقت لیتا ہے تو عدالت کو ازخود حقائق کی تصدیق کا موقع فراہم ہو جاتا تھا۔ اگر کاروائی جاری رہنے دیتا ہے تو اُس کے پاس جوابی دلائل میں وزن پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ اِس موقعہ پر مہلت مانگنا فائدہ مند رہے گا۔ اُس نے حقائق کی تصدیق کرنے کی بنا پر عدالت سے مہلت کی درخواست کر دی۔ جج نے اگلے روز تک وقت دیتے ہُوئے کہا، "یہ سوچ لیں کہ اِس معاملے میں اگر آپ نے مدعیان کے دعویٰ کی مخالفت کرنے کی ٹھانی تو پھر اگلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ عدالت خُود جا کر موقعہ کا معائنہ کرے۔"

مقدمے کے دوران کسی کو پریس کی جانب توجہ دینے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ "ٹائپو پریس" پہنچ کر اُنھوں نے دیکھا کہ ایک زنگ آلود مشین پڑی تھی جسے ایک نظر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ کسی کباڑی کی دُکان کے باہر کھلے آسمان تلے سال ہا سال تک پڑی رہی ہے اور لوہے کے بھاؤ بھی نہیں بک سکی۔ کاغذ کا سارا سٹاک بھی غائب تھا۔ اس کے بعد اسلم شاہ کی تلاش شروع ہُوئی۔ مگر اسلم شاہ گویا روئے زمین سے غائب ہو چکا تھا۔ اُس کے گھر پہ تالا پڑا تھا اور محلے داروں، دوستوں، عزیزوں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں تھا۔ مایوس ہو کر سب خواجہ معراج کے دفتر میں جمع ہُوئے۔ شیخ سلیم کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اُس کے پان کی پیک کُرتے کے دامن پہ لمبی لمبی خونی لکیریں بناتی ہُوئی بہتی رہی تھی جو راستہ چلتے ہُوئے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ آخر لگ بھگ آدھی رات کے وقت اُن کی آپس کی بحث ختم ہُوئی۔

"اب مقدمہ فی الحال یہیں پہ چھوڑنا پڑے گا" خواجہ معراج نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"چھوڑنا پڑے گا؟" بدیع الزمان نے چونک کر پُوچھا۔

"یہ میری ریپوٹیشن کا سوال ہے۔ انتظار حسین نے آج تک مجھ سے کوئی مقدمہ نہیں جیتا۔"

"تو کیا۔۔۔" بدیع الزمان ہکلاتا ہوا بولا، "تو خواجہ کیا تُم ہمیں فارغ کر رہے ہو؟"

"فارغ؟ کیا بکواس کر رہے ہو بدیع، فارغ تو تجھے میں مر کر بھی نہیں کروں گا۔ اپنی فیس تیرے ذِمے چھوڑ جاؤں گا، جو تو میرے وارثوں کو ادا کرے گا۔" وہ مُنہ کھول کر ہنسا، پھر فوراً سنجیدہ ہو کر بولا۔ "مقدمے کا رُخ بالکل بدل چکا ہے۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ جج ہوسٹائل ہو گیا ہے۔ لیکن میں بھی آپ لوگوں کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھا رہا۔ میرے پاس بھی ایک ہتھیار ہے۔ میں اُسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب کرنے پڑے گا۔"

"وہ کیا ہے خواجہ؟"

"تمہیں میں ابھی سے بتا دوں تو کل سارے شہر کو پتا چل جائے گا۔ بس خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ کل جج کا عندیہ اَور اُس کا رُخ دیکھ کر فیصلہ کرونگا۔ اب آپ سب گھر جائیں اَور کل عدالت لگنے سے آدھ گھنٹے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

اگلے روز جج محمد حسین تارڑ نے فریقین سے اپنے خطاب میں مقدمے کو مختصراً نمٹانے کے لئے کہا، جس کے دوران اُس نے استغاثے کی غیر معمولی طوالت کے علاوہ مدعیان کی آخری درخواست کا بھی ذکر کیا۔ اِس کے بعد اُس نے میاں اِنتظار حسین کو آخری دلائل کی شکل میں عدالت سے خطاب کی دعوت دی۔ اِنتظار حسین نے دلائل شروع کئے تو خواجہ معراج اُس کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے جونیئر کو درخواست کی نوک پلک دُرست کرنے کی ہدایت دینے لگا۔

"میں نے جو دلائل پیش کئے ہیں،" میاں اِنتظار حسین کہہ رہا تھا، "اور جو مزید شواہد عدالت کے روبرو رکھے گئے یا عدالت کے نوٹس میں آئے، اُن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ رپورٹ کو لکھنے اَور شائع کرنے میں بدنیتی کارفرما تھی، کیونکہ یہ نام نہاد صحافی، جس کا اصل پیشہ زمینداری اَور گڑُ کا بیوپار ہے، اور جو مختلف اوقات میں ٹریڈیونین کے کام میں بیرونی ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا اَور آخر میں شرانگیزی کے اِلزام میں اس کی اپنی پارٹی نے اِسے نکال باہر کیا تھا، جعلسازی کے ذریعے میرے مئوکلان کی پراپرٹی کی حدود میں داخل ہوا، اَور وہاں اِس نے دھوکے کی آڑ میں اُن کے ملازمین کو ورغلا کر جھوٹی رپورٹ تیار کی۔ پھر وہ ایک ایسے شخص کے پاس گیا جس کا پیشہ ہی اپنے نام نہاد ہفتہ وار اخبار میں شریف لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا اَور اُنہیں بلیک میل کرنا ہے۔ اِن دونوں

نے ایک سازش کے تحت یہ رپورٹ چھاپی اور پبلک میں تقسیم کی۔ ان کا اصل مقصد کیا تھا اُس کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا موقعہ آنے سے پہلے ہی میرے مؤکلان نے قانون کا سہارا لیا۔ مدعا علیہان کی بدنیتی کا اگر مزید کوئی ثبوت درکار تھا تو وہ اُن کی تازہ ترین حرکات سے سامنے آ گیا ہے۔ چنانچہ شواہد آمدہ سے مدعی کا مقدمہ ہرجانہ پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ مطلوبہ یا متدعویہ رقم حاصل کرنے کا حقدار ہے، اور اس روشنی میں دعویٰ بمعہ خرچہ ڈگری فرمایا جائے۔"

جج نے خواجہ معراج کو اپنے دلائل دینے کی دعوت دی ہی تھی کہ خواجہ معراج نے اُٹھ کر کہا "میں اپنے مؤکلان کی جانب سے اِس عدالت پر عدم اعتماد کی درخواست دے رہا ہوں جس میں اِستدعا کی گئی ہے کہ اِس مقدمے کو کسی دُوسری عدالت میں تبدیل کیا جائے۔"

جج نارڈ، منہ سے کچھ بولے بغیر، غصے اور حیرت کے ملے جلے جذبات لئے وکیل کو دیکھتا رہا۔ پھر سامعین کے شور کو دبانے کے لِئے اُس نے دو تین بار اپنا چوبی ہتھوڑا میز پہ مارا۔ خواجہ معراج کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے ہوا میں لہرا کر وہ بولا،

"ہمارے پاس یہ ایک شہادت ہے جس کی ٹھوس بنیاد پر ہمارا مؤقف ہے کہ آپ اِس مقدمے میں غیرجانبداری سے انصاف نہیں کر سکتے۔ اُس نے آگے بڑھ کر وہ کاغذ جج کے سامنے رکھ دیا۔ جج نے ایک نظر اُسے دیکھا اور آنکھیں ہٹا لیں۔ کوشش کر کے اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"آپ نے پہلے ہی عدالت کا بہت وقت ضائع کیا ہے،" وہ کم و بیش متوازن آواز میں بولا۔ "اب آپ توہین عدالت کے جرم سے بچنے کے لِئے یہ کاغذ کا ٹکڑا خُدا جانے کہاں سے بنوا کر لے آئے ہیں۔ میں اِس لیٹ شہادت کو نہیں مانتا۔ آپ واپس لے جائیں۔ دس منٹ کے لئے عدالت برخاست کرتا ہوں۔ اُس کے بعد فیصلہ سناؤں گا۔" اُس نے چوبی ہتھوڑا میز پہ مارا اور اُٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ اُس کے جاتے جاتے خواجہ معراج چلایا،

"آپ اِس شہادت کی روشنی میں نہ اِس مقدمے کی سماعت کے اہل ہیں نہ فیصلہ سنانے کے۔ ہم کاروائی کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔"

جج سی ان سی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسی وقت خواجہ معراج نے اُس بڑے سائز کے کاغذ کی پانچ سات کاپیاں سامعین میں تقسیم کر دیں۔ کاپیاں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور ایک سے دُوسرے کو منتقل ہونے لگیں۔ ایک کاپی میاں افتخار حسین تک پہنچی، جسے دیکھ کر میاں انتظار حسین نے رد کرنے کے انداز میں ہاتھ ہوا میں لہرایا اور کاپی اپنی پارٹی کے دُوسرے افراد کو پکڑا دی۔ اُسے دیکھ کر دُوسروں کے چہرے پہ کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ چند ماہ پُرانی اخبار کی ایک تصویر تھی جس میں حاجی کریم بخش کی پوتی کی شادی کے موقع پر جج محمد حسین تارڑ کو دولہا دُلہن اور حاجی کے علاوہ چند دوسرے عزیزوں کے ہمراہ درمیان میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ خواجہ معراج نے جونیئر وکیل معیظ الرحمن کو عدالت میں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور باقیوں کو لے کر باہر نکل گیا۔

عدالت کے دروازے سے کچھ فاصلے پر چار آدمی جیبوں میں ہاتھ دیئے کھڑے تھے۔ خواجہ معراج، ایک جونیئر وکیل، اعجاز اور شیخ سلیم۔ پانچواں شخص بدیع الزمان تھا جس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔ وہ ایک سگریٹ سلگاتا، دو طویل کش لے کر دیر تک کھانستا رہتا، جس سے اُس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں، پھر سگریٹ پھینک کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دُوسرا سلگاتا۔ دُوسرے چاروں پاس کھڑے خفیف سی پریشانی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"صبر کر بدیع" خواجہ معراج نے کہا۔ "صبر کر۔ دھوئیں کی چمنی بن کر ماحول کو کثیف کر رہا ہے۔"

"خواجہ،" بدیع الزمان کھانسی کے دورے سے فارغ ہو کر روندھی ہوئی آواز میں بولا، "کہیں معاملہ ہاتھ سے تو نہیں نکل جائے گا؟"

"نکل کے کہاں جائے گا؟ اب یہ معاملہ تیرے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہے۔ قانون کا میدان ابھی کھلا پڑا ہے۔"

"تارڑ فیصلہ تو ہمارے خلاف دے گا۔"

"دینے دو۔ ایسا فکس کرونگا کہ یاد رکھے گا" خواجہ معراج نے کہا۔

بدیع الزمان کو ایک کش کے بعد ایسا اچھو لگا کہ اُس کی سانس رُکنے کو آئی۔ اعجاز نے اُس کی پُشت پر ہاتھ مار کر اُس کا دم ہموار کیا۔ چند منٹ کے بعد عدالت

میں ایک شور اٹھا۔ سب کی توجہ اُس طرف مبذول ہو گئی۔

"اللہ رحم کرے،" شیخ سلیم نے کہا۔

معیظ الرحمن بھاگتا ہوا کمرہ عدالت سے باہر آیا۔ اُس نے ایک کاغذ پہ اپنے شکستہ خط میں لکھی ہُوئی عبارت خواجہ معراج کے ہاتھ میں تھمائی۔ "خلاف چلا گیا" وہ بولا۔ "جلدی میں اِتنا ہی لکھ سکا ہُوں۔"

سب خواجہ معراج کے دائیں بائیں اَور عقب میں کھڑے ہو کر پڑھنے لگے۔

"مدعی---- نے اپنا کیس---- ثابت کر دیا ہے۔ مدعا علیہان کے عدم تعاون کے رویے کے باوجود---- مختلف عوامل کے پیش نظر---- نرمی کا رویہ اختیار کرتا ہوں۔ تاہم---- انصاف کے تقاضے کے مطابق مدعی کے حق میں فیصلہ ناگزیر---- مدعا علیہان---- ازالہ حیثیت عرفی---- مجموعی طور پہ پچھتر ہزار روپے مدعی کو ادا کریں---- سات یوم کی رخصت برائے اپیل----"

خواجہ معراج نے دونوں ہاتھوں میں کاغذ کو چر مر کر کے اُس کا چھوٹا سا گولہ بنایا اَور زمین پر پھینک دیا۔ ایک منٹ تک سب خاموش ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھتے رہے۔

"کھاجا صاب،" پھر شیخ سلیم بولا، "بس؟"

"بس کا کیا مطلب؟"

"قید کی سزا تو نہیں ہُوئی؟"

"شیخ صاحب، تمھیں قید کی پڑی ہُوئی ہے، میں اِسے ایک پائی بھی دے جاؤں تو میرا نام خواجہ معراج دین سے بدل کر سراج دین ارائیں رکھ دینا۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا۔"

قید کی فکر سے آزاد ہو کر شیخ سلیم کو زبان لگ گئی۔ "مگر کھاجا صاب، کنون تو ہمارے حق میں جا رہا تھا؟"

"بالکل جا رہا تھا۔ مگر شیخ صاحب، یہ----" خواجہ معراج نے ہاتھ آگے بڑھایا اور شیخ سلیم کی آنکھوں کے قریب انگلیوں پر انگوٹھا رگڑ کر دکھایا۔

"ہیں جی؟"

"ہیں جی کیا مطلب؟ پیسہ شیخ سلیم، پیسا۔ نارڑ پیسا کھا گیا ہے۔ اوکاڑے کے

قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہے جہاں کل چار ایکڑ اِس کی زمین ہے اَور ایک کچا پکا مکان ہے۔ کھائے گا کیسے نہیں؟ پیسا چل گیا ہے۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں جی۔ مگر اللہ کا شُکر ہے قید کی سزا سے بچ گئے۔"

"یار شیخ" خواجہ معراج اِنتہائی اُکتاتے ہُوئے لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا، "جا، اب تو جا۔" پھر اُس نے دونوں ہاتھ جدا کر شیخ سلیم کے سامنے اِس طرح لہرائے جیسے اُس کو ہوا دے رہا ہو۔ "جا۔ گھر جا۔ تُجھے کچھ نہیں ہوتا۔"

شیخ سلیم حیران کھڑا خواجہ معراج کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا، "میں نے تو کچھ نہیں کہا کھاجا صاب۔ شُکریئے کا لفظ ہی بولا ہے۔"

"میرا شُکریہ ادا کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔"

"نہیں جی، خُدا کا شُکریہ ادا کیا ہے۔"

خواجہ معراج چند لمحوں تک اُسے ایسے اچنبھے سے دیکھتا رہا جیسے اُس کو اپنی آنکھوں پہ اعتبار نہ آرہا ہو۔ پھر اُس نے تسلی کے انداز میں شیخ سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تو جا، مسجد میں شُکرانے کے نفل ادا کر، صدقہ دے۔ چار چھ دِن آرام کر، تُجھے کوئی نہیں پُوچھے گا۔ میری بات پہ یقین کر تو اُس کے بعد بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔"

شیخ سلیم اسی حیرانی کے عالم میں بڑبڑایا، "کھاجا صاب تو ایسے ہی ناراض ہو رہے ہیں۔"

بدیع الزماں کو یکے بعد دیگرے متعدد گہری بلغمی کھانسی کے دورے پڑے۔ جب وہ سنبھلا تو خواجہ معراج سے مخاطب ہوا۔ "اب؟"

"اب کیا؟ دیکھو، عدالت پر عدم اعتماد اَور منتقلی کی درخواست دی جا چکی ہے۔ مگر بیچ میں اُس نے فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔ یہ اُس کے اِختیار میں تھا۔ اب تین رستے ہیں،" خواجہ معراج تین اُنگلیاں اُٹھا کر بولا۔ "ہماری درخواست کا فیصلہ ایک۔ مِس ٹرائیل کی درخواست اَور ری ٹرائیل کی استدعا، دو۔ اَور تیسری تو پھر عدالت عالیہ میں اپیل ہے ہی۔ میں نے بتایا ناں کہ قانون کا میدان کھلا پڑا ہے۔ تُم گھر جاؤ اَور لمبی تان کر سو جاؤ۔ اگر اپیل کرنی پڑی تو پھر چند ہزار کی ضرورت پڑے گی۔ مگر وہ اسٹیج ابھی دور ہے۔ تُم نے دیکھا کہ تارڑ نے فیصلے میں 'نرمی' اَور 'درگزر' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟ یہ باتیں بدمعاش نے

ویسے ہی نہیں کر دیں، اپنی تصویر دیکھ کر اُس کے پیر اُکھڑ گئے ہیں۔ اُسے پتا ہے کہ اگر ہم تندہی سے جٹے رہیں تو فیصلہ کالعدم ہو سکتا ہے۔ تارڑ نے اپنے آپ کو اِس مقدمے کی سماعت سے دست بردار کر لیا ہے۔ عدالت عالیہ ری ٹرائیل کے لئے کسی دُوسرے جج کے پاس واپس بھیج سکتی ہے۔ تُم فکر نہ کرو۔"

"خاص طور پہ جب کہ سب اخبار اِس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں اور کمنٹ آ رہے ہیں۔" بدیع الزمان نے تائیداً کہا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی موٹی سی فائل کھول کر دکھائی۔ "سب تراشے میں نے جمع کئے ہیں۔ یہ دیکھو، پا کپتن کے ایک ہفتہ وار نے تو اداریہ بھی بڑا سٹرانگ لکھ مارا ہے۔ حالانکہ کیس سب جیوڈس تھا۔ مگر دلیر آدمی ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے اضلاع کا پریس قومی پریس کی نسبت کہیں زیادہ جرات مند ہے۔ یہ نام نہاد قومی اخبار تو حکومت کے اِشتہاروں کے چکر میں گھومتے رہتے ہیں اور ساٹھ ساٹھ صفحے کے بیکار اخبار چھاپ کر ہمارا سرمایہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کو اُس روز ہوش آئے گا جب اِن کے پاس کھانے کے لِئے کچھ بھی نہ رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے،" خواجہ معراج بے صبری سے بولا۔ "اب تُم جاؤ۔ جب ضرورت پڑی تو بلوا لونگا۔"

"درست۔ درست۔" بدیع الزمان نے کہا۔ "بالکل درست۔"

مگر اُس کا لہجہ اَیسا تھا جیسے سکتے کی حالت میں بول رہا ہو۔

اعجاز نے ابھی موٹر سائیکل پہ پینگ جمائی ہی تھی کہ عقب سے ایک آدمی اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اُس کی شکل اعجاز کو مانوس سی لگی۔ پھر اُس نے پہچانا کہ یہ وہ خوش پوش آدمی تھا جسے وہ تقریباً ہر روز عدالت میں دیکھتا تھا اور جو عموماً اعجاز کے کے پیچھے والی سیٹ پہ بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ بھوسلے رنگ کے کوٹ پتلون، سفید قمیض اور ٹائی میں ملبوس ہوتا تھا۔ شکل سے وہ کوئی متمول شخص دکھائی نہ دیتا تھا بلکہ درمیانے درجے کا دفتری اہلکار معلوم ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اعجاز نے اُسے عدالت کے باہر بھی دیکھا تھا، جہاں وہ اعجاز اور اُس کے ساتھیوں سے کچھ فاصلے پہ کھڑا انہیں اِس طرح دیکھ رہا ہوتا تھا جیسے اسی مقصد کے لئے وہاں کھڑا ہو۔ اعجاز کو اپنی سابقہ زندگی میں سینکڑوں ناواقف لوگوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ شخص اُن میں سے ہی کوئی ایک ہو گا جو اُسے شاید پہچاننے کی کوشش کر

رہا تھا، اعجاز نے اُس کی جانب زیادہ توجہ نہ دی تھی۔

"السلام علیکم،" وہ آدمی بولا۔ وہ اپنی بائیسکل تھامے کھڑا تھا۔ اُس نے پتلون کے پائینچے لپیٹ کر اُن کے گرد کلپ چڑھائے ہُوئے تھے تاکہ پتلون سائیکل کی چین میں اُلجھنے نہ پائے۔ اعجاز نے موٹر سائیکل پہ بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا۔

"میں 'بہ بانگِ دہل' کا مستقل خریدار تھا،" وہ شخص بولا۔ "میں عدالتی کاروائی کے دوران بھی موجود تھا۔ میرے دِل میں آپ کے لِئے اِنتہائی احترام کے جذبات ہیں۔ میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہُوں۔"

"جی،" اعجاز نے کہا۔ "فرمایئے۔"

"ذرا باہر سڑک تک تشریف لے جا سکتے ہیں؟ آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر پانچ سات مِنٹ کی بات ہے۔ میں آگے آگے چلتا ہُوں۔" یہ کہہ کر جواب کا اِنتظار کئے بغیر وہ سائیکل پہ سوار ہو کر تیز تیز چلاتا ہوا عدالت کے احاطے سے نِکل گیا۔ اعجاز ہلکی رفتار سے موٹر سائیکل پر اُس کے پیچھے روانہ ہوا۔ سڑکوں پر اِدھر اُدھر دو تین موڑ کاٹنے کے بعد بائیسکل سوار ایک ایسی تنگ سی سڑک پہ پہنچا جس کے ایک جانب کچھ کھلی زمین تھی اور دُوسری جانب مکان بنے تھے۔ سڑک کا نقشہ ویران تھا۔ سائیکل روک کر اُس نے آگے پیچھے دیکھا۔ کوئی آدمی دِکھائی نہ دے رہا تھا۔ جیسے ہی اعجاز نے اُس کے پاس پہنچ کر موٹر سائیکل روکی، اُس شخص نے بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ لٹکا ہوا ایک سفید رنگ کا پلاسٹک کا عام سا تھیلا اُتارا اور اعجاز کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ کچھ کاغذات ہیں،" وہ بولا۔ "دستاویزات ہیں جو کسی ذریعے سے میرے پاس پہنچی ہیں۔ میں ایک معمولی آدمی ہوں، اِنہیں رکھنے کا اہل نہیں ہُوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے زیادہ اِن کا کوئی حقدار نہیں ہے۔ غالباً آپ کو بھی اِن سے دِلچسپی ہو گی۔"

اعجاز نے اُس کے ہاتھ سے لفافہ لیا ہی تھا کہ اُس کے غیر معمولی وزن سے ایک لمحے کے لِئے اُس کا ہاتھ لٹک گیا۔ لفافہ سنبھالتے سنبھالتے اُس نے دیکھا کہ دوسرا آدمی جواب کا اِنتظار کئے بغیر سائیکل پہ سوار ہو کر چل دیا تھا۔

"بات تو سُنیئے،" اعجاز نے آواز دی۔ "آپ کی تعریف----"

اُس آدمی نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سڑک چھوڑ

کر دائیں جانب بنے ہُوئے مکانوں کی گلیوں میں داخل ہوا اور مُڑتا مُڑتا ہوا غائب ہو گیا۔
اعجاز کچھ دیر تک حیرت سے اُسے نظروں سے اوجھل ہوتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لفافے کا مُنہ کھول کر اندر جھانکا۔ سینکڑوں ٹائپ شدہ کاغذات کا ایک بنڈل دھاگے کی مدد سے بندھا رکھا تھا۔ اُس نے لفافے کا مُنہ بند کر کے اُسے گانٹھ دی اور مضبوطی سے اپنے پیچھے کیریئر پر جما دیا۔ گھر پہنچ کر اُس نے لفافے کو کھولے بغیر اپنی میز کے ایک دراز میں رکھ دیا۔ اُس کے ذہن پر کہیں زیادہ اہم معاملات کا بوجھ پڑا تھا۔
رات کو سوتے وقت اعجاز نے سکینہ سے بات کی۔
"ہو سکتا ہے میں جائیداد اور کاروبار تقسیم کر دوں۔"
"سرفراز کا حساب تو تُم نے پہلے ہی الگ رکھا ہوا ہے،" سکینہ نے کہا۔
"حساب کی بات نہیں کر رہا۔ قانونی طور پہ حصے الگ کر کے اپنا حصہ تیرے اور لڑکوں کے نام لگا دوں۔"
"پہلے کاروبار جداو کی کون رکھوالی کرتا ہے، ہیں؟ ایک میری جان ہے۔ تمہیں تو بکار کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ اب کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟"
"مقدمہ شاید ہمارے خلاف چلا جائے،" اعجاز نے آدھی بات چھپاتے ہُوئے کہا۔
"ہائے،" سکینہ چارپائی پہ لیٹی تھی، اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "جیل ویل جانے کی بات تو نہیں؟"
"تُو تو بس کدھر کی کدھر پہنچ جاتی ہے۔ میں کہہ رہا ہوں شاید ہمارے خلاف فیصلہ ہو جائے۔"
"شید کا کیا مطلب۔ میں تمہارے شید کو جانتی ہوں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مقدمہ ہار گئے ہو۔"
"دیکھ، آرام سے میری بات سن، زیادہ چھلانگیں نہ لگا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ ---- وہ ایک لفظ ہوتا ہے حفظ ماتقدم، اس کا مطلب ہوتا ہے ----"
"مجھے پتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے پہلے سے انتظام کر لینا۔"
"ہاں۔ اصل میں یہ مقدمے نہ جلدی جلدی ہارے جاتے ہیں نہ جیتے جاتے ہیں۔ قانون کے رستے لمبے ہیں۔ وَیسے تو میں اِس وقت قانونی طور پر جائیداد کو اِدھر اُدھر

نہیں کر سکتا۔ مگر ایک رستہ ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"سرفراز اور تم حق شفع کر کے جائیداد تقسیم کرا لو۔"

"ساری عمر تمہاری گزر گئی ہے۔ بکار کی مقدمے بازی کرتے ہوئے۔ کوئی گھر برادری کا مقدمہ ہو تو پھر بھی کوئی بات ہے، لوگوں میں عزت بنتی ہے، چار آدمی ساتھ چلتے ہیں، بندے ڈیرے پر آتے جاتے ہیں۔ تمہارے مقدمے خدا جانے کدھر سے آتے ہیں، کدھر کو چلے جاتے ہیں۔ پیسے کا اُجاڑ، وقت کا اُجاڑ۔ نہ گھر کا پتا، نہ لڑکوں کی کوئی خبر۔۔۔"

"کیوں، لڑکوں نے دسویں پاس کر لی ہے، اور تو کیا چاہتی ہے؟"

"اسی بات کو تو رو رہی ہوں۔ تمہیں کیا خبر کہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے؟ بتا تو سہی۔"

"عالمگیر کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔"

"اس میں کیا حرج ہے؟"

"اُس نے ہمارے لڑکوں کو آگے لگایا ہوا ہے۔ اُن کی جیب میں پیسے ڈالتا ہے، کپڑے بھی لشم پشم بنوا کر دیتا ہے۔ تم نے نہیں دیکھے؟"

"میں سمجھا تو بنوا کر دیتی ہے۔"

"واہ، میں نے تمہارے لیے کبھی بوسکی کی قمیض نہیں بنوائی تو انہیں بنوا کر دوں گی؟ اگلے دن دروازہ بند کر کے اندر بیٹھے بندوقوں کی باتیں کر رہے تھے۔ میرے کان میں آواز پڑی تو میں نے پوچھا کیا بات کر رہے ہو؟ حسن نے کہا کچھ نہیں بی بی۔ میں نے زور دے کر پوچھا تو حسینا اُچھل کر بولا، کچھ بھی نہیں بی بی، آپس میں باتیں کر رہے ہیں، اور میرے آگے دروازہ بند کر دیا۔ میری تو پھر ہمت نہیں ہوئی کہ دروازہ کھول کر کوئی بات کروں۔"

"تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" اعجاز نے غصے سے پوچھا۔

"میں نے نہیں بتایا۔ تم خواہ مخواہ طیش میں آ جاتے ہو۔"

"میں بدمعاشوں کو درست کر دونگا۔"

"اب تُم چھلانگیں مارنے لگے ہو۔ احتیاط سے بات کرنا، لڑکے جوان ہو گئے ہیں، اب بچے نہیں رہے۔ میرے خیال میں تو تُم ملک جھگیر سے ملو، ابھی اُس میں کچھ سانس باقی ہیں، وہ بیٹے کو سمجھا دے گا۔"

"بس اب تو یہ بات میرے اُوپر چھوڑ دے۔ مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے۔"

چند منٹ کے بعد اعجاز نے سکینہ کے سینے پہ ہاتھ رکھا تو اُس نے اعجاز کا ہاتھ اُٹھا کر پرے کر دیا۔

"پہلے جداد میرے نام لگا، پھر ہاتھ چلانا،" سکینہ بے تکلفی سے بولی۔

"یہ بات ہے؟ میری بلی اَور مجھی کو میاؤں؟"

"پھر میرے کان میں تیری کسی کمی کمین شہزن کی آواز پڑی تو تجھے بے دخل کر دوں گی۔"

"ٹھہر جا، پہلے میں تجھے بے دخل کروں۔"

اعجاز نے چادر کے نیچے سکینہ کو دبوچ لیا۔

صبح سویرے بدیع الزمان کا بھتیجا اعجاز کو بلانے گھر پہ آ پہنچا۔ "چاچا بیمار ہے،" اُس نے صرف اتنا کہا۔ اعجاز نے اُس سے کچھ مزید تفصیلات معلوم کر کے لڑکے کو چلتا کیا اور خود ناشتہ کرتے ہی ہسپتال کی راہ لی۔ ہسپتال کے برآمدوں میں دو بچے کھیلتے ہوئے ایک دُوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وارڈوں میں لائف بوائے صابن کی طرح کی مخصوص بو پھیلی تھی۔ اعجاز پُوچھتا ہوا اندر پہنچا تو پتا چلا کہ بدیع الزمان اِنتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھا۔ وارڈ کے باہر برآمدے میں اُس کے سب عزیز جمع تھے۔ اُس کی بیوی اور دو بڑے بچے، بڑا بھائی فصیح الزمان اَور اُس کا بیٹا شیخ سلیم اور وسیم، شمس اَور دو تین دُوسرے لوگ جنہیں اعجاز نہ جانتا تھا، برآمدے کے بنچوں پہ بیٹھے یا پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اعجاز کو دیکھتے ہی شیخ سلیم اُس سے لپٹ گیا۔

"ہم تو مارے گئے ملک صاب،" وہ بسورتا ہوا بولا، "بدی کو دل کا دورہ سخت پڑ گیا ہے۔ مشینیں لگی ہُوئی ہیں۔ گیس بھی لگی ہُوئی ہے۔ اندر جانے کی اجازت نہیں۔"

"اوہو،" اعجاز نے کہا۔ "کوئی بھی اندر نہیں گیا؟"

"اونہوں،" شیخ سلیم سر ہلا کر بولا۔ "دروازے میں شیشہ لگا ہوا ہے۔ وہاں سے

دکھائی دیتا ہے۔"

اعجاز نے کمرے میں قدم رکھا تو ایک مرد نرس اُسے دیکھ کر بولا، "آپ ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ آپ اِن کے عزیز ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں صرف دروازے سے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

نرس توقف سے بولا، "دیکھ لیں۔"

بدیع الزمان کے دونوں جانب ٹیوبیں اور نالیاں پیوند تھیں اور ناک پر آکسیجن کا کھوپا چڑھا تھا۔ وہ سیدھا پُشت پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ایک بازو کے ساتھ ڈرپ لگی تھی۔ دوسری جانب دو نالیاں تھیں جو ای۔سی۔جی۔ مشین کو جاتی تھیں۔ مریض میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔ اعجاز دروازے سے پلٹ آیا۔

"کونسے ڈاکٹر صاحب کے زیرِ علاج ہیں؟" اعجاز نے نرس سے پُوچھا۔

"کارڈیالوجسٹ، ڈاکٹر سعد اللہ خان۔ صبح دیکھنے آئے تھے۔ اب راؤنڈ پر ہیں۔ راؤنڈ ختم کر کے پھر آئیں گے۔"

"اِس وقت کونسے ڈاکٹر صاحب موجود ہیں؟"

"ڈیوٹی ڈاکٹر عرفان صاحب ہیں۔"

"وہ کہاں ملیں گے؟"

"ابھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ شاید اپنے آفس میں ہوں۔ وہ سامنے والے کوریڈور میں تیسرے نمبر پر کمرہ ہے۔ باہر بورڈ لگا ہے۔"

ڈاکٹر عرفان کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اُس کی میز کے گرد دو تین دوسرے نوجوان ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ کسی موضوع پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ اعجاز دروازے کے اندر قدم رکھ کر رُک گیا۔ تمام ڈاکٹر خاموش ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ اعجاز نے ڈاکٹر عرفان کے سفید کوٹ پہ لگا نام کا لیبل پڑھا۔

"میں بدیع الزمان صاحب کو دیکھنے آیا تھا،" اُس نے ڈاکٹر عرفان کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی۔ اُن کا علاج ہو رہا ہے،" ڈاکٹر نے مختصراً جواب دیا۔

"انہیں دِل کی تکلیف ہُوئی ہے؟"

"جی ہاں۔ لیفٹ وینٹریکولیر فیلیور ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب،" اعجاز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پُوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

ڈاکٹر کے لبوں پہ تھکی ہُوئی سی مسکراہٹ پیدا ہُوئی۔ "دِل کی بائیں جانب کا حصہ کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔"

"یعنی اُنھیں باقاعدہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ڈاکٹر صاحب، معذرت خواہ ہوں، آپ کا وقت لے رہا ہُوں۔ مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ اِس کی وجہ کیا تھی؟"

"اُن کا بلڈ پریشر ایک سو پچاس اَور دو سو سے اُوپر تک پہنچ چکا تھا۔ سموکنگ کی وجہ سے اُن کی سانس کی نالی میں پہلے ہی رکاوٹ تھی۔ پھیپھڑوں میں پانی بھرنا شروع ہو چکا ہے۔ شریانوں کی سختی اَور سٹریس اصل وجہ ہے۔" پھر اعجاز کے چہرے پہ فکرمندی کے آثار دیکھ کر بولا۔ "ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔"

"اُن سے ملا جا سکتا ہے؟" اعجاز نے توقف سے پُوچھا۔

"ابھی تو نہیں۔ سیڈیشن میں ہیں۔ کچھ دیر میں ہمارے کنسلٹنٹ اُنھیں دوبارہ دیکھنے آئیں گے۔ اُن سے اپڈوائیس لے کر شاید آپ سب ایک آدھ منٹ کے لِئے ایک ایک دو دو کر کے اُن سے مِل سکیں۔ آپ چاہیں تو انتظار کر لیں۔"

اعجاز جا کر بدیع الزمان کے گھر والوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دو بنچوں پر عورتیں اَور بچے بیٹھے تھے۔ فصیح الزمان کی بیوی اَور چند بچے بھی آ پہنچے۔ ایک بنچ کے کونے سے دو نو عمر لڑکوں نے اُٹھ کر اعجاز کے لِئے جگہ خالی کر دی۔ اعجاز 'نہ، نہ' کرتا ہوا آخر مردوں کے اصرار کرنے پر وہاں بیٹھ گیا۔ سب نے متوقع نظروں سے اُسے دیکھا جیسے وہ ڈاکٹر سے کوئی اُمید افزا خبر لے کر آیا ہو۔ اعجاز کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا بات کرے۔ آخر اُس نے کہا۔ "ابھی ڈاکٹر دُوسری بار پھر دیکھنے آئے گا۔ نگہداشت بہت اچھی ہو رہی ہے۔"

کسی نے جواب نہ دیا۔ سب خاموش بیٹھے اَور کھڑے تھے۔ اعجاز کے آنے سے پہلے اُن کی تھوڑی بہت باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ وقفے وقفے پر بدیع الزمان کی بیوی کے سینے

سے ہلکی سی سسکی نما آواز پیدا ہوتی، پھر خاموشی چھا جاتی۔

"کس وقت تکلیف ہُوئی تھی؟" اعجاز نے دوبارہ بات کرنے کی سعی کی۔

"رات کے ایک بجے۔" فصیح الدین نے جواب دیا۔

"خراب وقت تھا۔"

"ہاں۔ کوئی سواری بھی دستیاب نہ تھی۔ ہمسائے بڑے نیک لوگ ہیں۔ اُن کو جگایا، اُنھوں نے اپنے کسی عزیز کو فون پر اطلاع دی تو وہ لوگ اپنی کار لے کر آئے۔ ہم اُن کے بے حد احسان مند ہیں۔"

اسی اِثناء میں بدیع الزمان کی بہن اَور بہنوئی بھی آ پہنچے۔ عورتوں نے آپس میں گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ فصیح الزمان نے تنبیہہً کہا، "چپ کر جاؤ برا شگون ہے۔ اللہ نے چاہا تو دو دِن کے اندر اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ اب دعا کا وقت ہے۔ دعا کرو۔"

آدھے گھنٹے کے بعد کنسلٹنٹ کارڈیالوجسٹ اپنے سفید کوٹوں والے قافلے کے ساتھ آ پہنچا۔ اُس کے ہمراہ ڈیوٹی ڈاکٹر عرفان کے علاوہ ایک مرد اَور ایک عورت ڈاکٹر، اَور چند نوجوان لڑکیاں لڑکے تھے جو زیرِ تربیت نرسیں یا ڈاکٹر دکھائی دیتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر بدیع الزمان کے آدھے سے زیادہ عزیز و اقارب اُٹھ کھڑے ہوئے، جیسے وہ گروہ کوئی تریاق اُٹھائے ہُوئے وارد ہوا ہو۔ ڈاکٹر اپنے ساتھیوں کو لیے اندر داخل ہو گیا۔ جو لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے اُن میں سے ایک دو بیٹھ گئے، باقی کے خاموشی سے کھڑے رہے یا سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگے۔ سب پہ ایک نیم ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اعجاز جا کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ڈاکٹروں کا گروپ اندر والے کمرے سے نِکلا، چند منٹ تک باہر والے کمرے میں رُکا رہا، پھر نکل کر برآمدے سے ہوتا ہوا دُوسری جانب مڑ گیا۔ صرف ڈاکٹر عرفان کمرے میں رُکا رہ گیا۔ وہ کچھ کاغذات ہاتھ میں لیے نرس کے ساتھ کھڑا کوئی بات کر رہا تھا۔ پھر اُس نے کاغذ نرس کو پکڑا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے پر آ کر وہ اعجاز سے بولا، "اب ان کی حالت بہتر ہے۔ سیڈیشن کچھ کم ہُوئی ہے۔ آپ مِل سکتے ہیں۔ مگر دو ایک مِنٹ سے زیادہ ان کے پاس رکنا مناسب نہیں، اَور ایک وقت میں دو یا تین سے زیادہ کا کراوڈ نہ ہو تو بہتر ہے۔ پانچ سات مِنٹ میں فارغ کر دیں۔ کل کا اِنتظار کریں، حالت مزید بہتر ہو گئی تو پھر

زیادہ دیر تک ہل سکتے ہیں۔" وہ واپس جا کر نرس کی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ "سب سے پہلے،" وہ سر اٹھا کر بولا، "اُن کے بیوی بچوں کو بھیجیں، مریض پر اچھا اثر ہوگا۔ اور اُنہیں ہدایت کر دیں کہ بہت زیادہ جذبات کا مظاہرہ نہ کریں تو اچھا ہے۔"

دس منٹ کے اندر تین تین، چار چار لوگ نرس کے ہمراہ اندر گئے اور پلٹ آئے۔ اُن کے چہروں پہ اُسی طرح رنج کی چھاپ تھی، مگر ہلکی سی طمانیت کے آثار بھی تھے۔ آخر میں اعجاز اندر گیا۔ ڈاکٹر اور نرس کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اِس ملاقات کو ختم کرنے کے خواہشمند تھے۔

"میں ایک دو منٹ سے زیادہ نہ لوں گا" اعجاز نے معذرت کے انداز میں ڈاکٹر سے کہا۔

بدیع الزمان اعجاز کو دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کا رنگ زرد اور جلد بے جان سی لگ رہی تھی۔ اُس نے ناک اور منہ سے آکسیجن کا کھوپا اُتار کر ماتھے پہ جمایا۔ اعجاز نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا اور اُسے پکڑ کر کھڑا رہا۔ کئی سکینڈ تک وہ دونوں خاموشی سے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اعجاز نے کہا،

"ڈاکٹر کہتا ہے ہلہ آیا تھا، گزر گیا ہے۔ اب ایک دو روز کی بات ہے۔"

بدیع الزمان نے کوئی جواب نہ دیا، ٹکر ٹکر اعجاز کو دیکھتا رہا۔ اُس کی نگاہوں میں سینکڑوں سوال و جواب تھے۔

"بس اب جلدی سے تندرست ہو جائیں بدی صاحب،" اعجاز خوشدلی پیدا کرنے کی کوشش میں بولا۔ "ابھی تو ہم نے بڑے معرکے مارنے ہیں۔"

بدیع الزمان کے چہرے سے مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کونوں کے راستے کنپٹیوں پہ بہنے لگے۔ "کیسے معرکے اعجاز؟" وہ کمزور سی آواز میں بولا، "میں تو بس 'طلوع' والے بھڑووں کو دکھانا چاہتا تھا۔ سب انا کا کھیل ہے بھائی۔"

اعجاز چند سکینڈ تک چپ چاپ کھڑا حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس کا ہاتھ دباتے ہُوئے بولا، "بھائی بدیع، مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ خواجہ معراج اب رُکنے والا نہیں۔ اور نہ ہی ہم پیچھے ہٹنے والے ہیں۔ بس آپ ایک دفعہ اپنے پیروں پہ اُٹھ کھڑے ہوں، پھر

دیکھیں ہم کیا کھیل کھیلتے ہیں۔

بدیع الزمان کی سانس سینے کے اندر شاں شاں کرنے لگی اور اُس کی چھاتی ہلکے ہلکے جھٹکوں کے ساتھ اُٹھنے اور بیٹھنے لگی۔ نرس نے جلدی سے آکسیجن کا کھوپا ماتھے سے کھینچ کر اُس کے منہ پہ جمایا اور گیس کے سلنڈر پہ نصب چھوٹے سے پہیے کو آہستہ سے گھما کر پریشر دُرست کیا۔ پھر نرس نے آنکھ کے اِشارے سے اعجاز کو جانے کا اشارہ کیا۔ اعجاز آخری بار بدیع الزمان کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کمرے سے نِکل گیا۔

"ڈاکٹر صاحب،" اُس نے باہر کے کمرے میں رُک کر پُوچھا۔ "صحیابی کے کیا چانس ہیں؟"

ڈاکٹر ایک منٹ تک اُسی طرح بیٹھا اپنے آگے رکھے کاغذوں کو اُلٹتا پلٹتا رہا، جیسے اُس نے سنا ہی نہ ہو۔ پھر سر اُٹھا کر بولا، "کل رات کو تو ففٹی ففٹی تھے۔ اب بہتر ہے۔ ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہے ہیں۔"

بدیع الزمان کی بیوی اور بھائی کو وہاں دِن رات ٹھہرنے کی اجازت مِل گئی تھی۔ کمرے سے نِکل کر اعجاز نے اُن سے کہا، "ڈاکٹر نے کہا ہے دو تین روز میں تندرست ہو جائیں گے۔ خطرے کا وقت اللہ کے فضل سے گزر گیا ہے۔ فکر کی ضرورت نہیں۔"

ہسپتال کے باہر باقی کے لوگ بچوں سمیت کھڑے، واپس جانے کے لِئے سواریوں کا انتظام کر رہے تھے۔ اعجاز نے اُن سے بھی یہی بات کہہ کر رخصت لی۔

"کل صبح آؤں گا" اُس نے شیخ سلیم سے کہا۔

اگلے روز اعجاز ہسپتال پہنچا تو بدیع الزمان کے ملنے والوں کا جمگھٹ لگا تھا۔ کئی رشتہ دار دُوسرے شہروں سے آ پہنچے تھے۔ بنچوں پہ آج کوئی نہ بیٹھا تھا، سب ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بے ترتیب سے دائرے کے اندر کھڑے تھے۔ بدیع الزمان کی بیوی اور بہن چپکے چپکے آنسو بہاتی ہُوئی بار بار آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ ایک عمر رسیدہ عورت اُنہیں دلاسہ دیتی جا رہی تھی۔

"اعجاز صاب،" شیخ سلیم اُسے دیکھتے ہی سرگوشی میں بولا، "بدی کی حالت خراب ہو گئی ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟"

شیخ سلیم اعجاز کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ "بھائی فصی تو ادھر ہی تھا۔ فجر کی اذان کے وقت پر سانس اُلٹی ہو گئی۔ بھائی فصی کہتا ہے کہ مشین کی سوئی پہلے اس طرح بھٹکنے لگی تھی جیسے دماغ ہی خراب ہو گیا ہو، پھر ایک دم ہولی ہوتی ہوئی تقریباً رُک گئی۔ ڈاکٹر نرسیں سب دوڑے۔ سانس والی مشین لے کر آئے اَور وہ لگا دی۔ اب بناوٹی سانس بدی کی بازی کے اندر جا رہا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد یہاں سے" اُس نے رانوں کے بیچ اشارہ کر کے بتایا، "ایک نالی اندر داخل کی اَور اُس کے سرے پر پلاسٹک کا بیگ باندھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں گردے کام چھوڑ رہے ہیں۔ ہا۔۔۔" شیخ سلیم رونے لگا۔ "بچارہ مشینری سے چل رہا ہے۔ اعجاز بھائی، کیا خیال ہے؟ ڈاکٹر تو اب ہم سے بات بھی نہیں کرتے۔ نہ ہی کسی کو اندر جانے دیتے ہیں۔ خُود ہی اندر باہر آتے جاتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔۔۔"

"اللہ رحم کرے گا شیخ صاحب،" اعجاز نے تسلی دی۔ "بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ آخر کوئی معمولی آدمی تو نہیں، اخبار کا مالک ہے۔ آج کل تو تُمھیں پتا ہے مقدمے کے سلسلے میں ہر روز اخباروں میں ذکر آتا رہتا ہے۔ بلکہ بدیع کی بیماری کی خبر بھی چھپ گئی ہے۔"

"اچھا؟" شیخ سلیم نے رونا بند کر کے پُوچھا۔

"ہاں، اَور کیا؟"

"تصویر کے ساتھ؟"

"ہاں ہاں،" اعجاز نے تسلی کی خاطر جھوٹ موٹ کہہ دیا۔

"پھر تو بڑی پوزیشن ہے بھائی اعجاز۔ ڈاکٹروں کو تصویر دکھانی چاہئے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اِنہیں پتا ہے۔ ڈاکٹر اتنی آسانی کے ساتھ اِس سے ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے۔ حوصلہ رکھو۔"

اتنے میں خواجہ معراج بھی آ پہنچا۔ آتے ہی اُس نے پُوچھا۔ "کیا صورت ہے؟"

"ٹھیک نہیں،" اعجاز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اوہو۔ کیا ہوا؟"

اعجاز نے تفصیل بیان کی۔

"میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں،" خواجہ معراج نے کہا۔

"ڈاکٹر اپنا کام کر رہے ہیں خواجہ صاحب۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم رُکو تو سہی۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔"

خواجہ معراج کمرے میں داخل ہو کر ہولے ہولے قدم دھرتا ہوا آگے بڑھا۔ کمرے میں دو جونیئر ڈاکٹر اور دو نرسیں کھڑی تھیں۔ ایک صفائی کرنے والی عورت گیلے کپڑے سے فرش چمکا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اندر والے کمرے کے دروازے کے شیشے کے بیچ سے ایک نرس مریض کے بسترِ کے آس پاس دکھائی دے رہی تھی۔ خواجہ معراج کی جانب کسی نے دھیان نہ دیا۔ وہ خاموشی سے جا کر ڈاکٹروں کے پاس رُک گیا۔ آدھا منٹ گزر گیا تو ایک ڈاکٹر نے سر موڑ کر اُکتائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔ خواجہ معراج نے وکیلوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس نے اپنے سیاہ کوٹ کے دامن کو ہاتھوں سے ذرا سا کھینچ کر سیدھا کیا۔ ٹائی پہ اعتماد سے انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ایک دو جملوں کے بعد ہی ڈاکٹر نے بات ختم کر کے اُس کی طرف پُشت کر لی۔ خواجہ معراج وہاں سے پلٹ آیا۔ باہر نکل کر اُس نے بدیع الزمان کے گھر والوں کو مخاطب کر کے کہا،

"حالت سنبھل رہی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔"

"اچھا جی؟" شیخ سلیم نے پُوچھا۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"میں نے بتایا نا، حالت سنبھل رہی ہے۔ مکمل علاج ہو رہا ہے۔ اِنشاء اللہ صحت ہو گی۔" پھر خواجہ معراج اعجاز کو بازو سے پکڑ کر اُن سے دور لے گیا۔ "اعجاز، تم سے کیا چھپاؤں۔ اِن لوگوں سے میں نے دِل رکھنے کو بات کر دی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے وہ اِس وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔ مریض کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سب کچھ کر رہے ہیں۔ بیٹا بلاکرز تک دے رہے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتے ہیں؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"جان بچانے کی دوا ہوتی ہے۔" خواجہ معراج نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ "میں چاہتا تھا ایک دفعہ بدیع سے بات کر لوں، بتا دوں کہ اپیل تیار ہو چکی ہے۔ قانون کے مطابق کارروائی شروع کرنے والا ہوں۔ سب کچھ ہماری فیور میں ہے۔ اگر

ایک بار بدیع کو یہ بتا دیتا تو اُس پہ اچھا اثر ہوتا، اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔" خواجہ معراج ایک لحظے کو رُکا۔" سمجھ گئے ناء اعجاز؟ مقدمہ میرے قابو میں ہے۔ میں تو ایک بار اِنتظار کو دکھانا چاہتا تھا کہ مقدمہ کیسے لڑا جاتا ہے۔ پیسے چڑھانے کے باوجود اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی۔ نکال کے دکھاؤنگا، تُم فکر نہ کرو، اَیسا سبق دونگا کہ عمر بھر اِس مقدمے کو یاد رکھے گا۔ اچھا، میری اب کورٹ میں پیشی ہے۔ شام کو پھر پتا کرونگا۔" یہ کہہ کر خواجہ معراج وہاں سے رخصت ہوا۔

آدھ گھنٹہ گزُر گیا۔ بنچ پر تین چار بچوں اور عورتوں کے علاوہ کوئی نہ بیٹھا، سب کھڑے کھڑے باتیں کرتے یا اِدھر اُدھر چل پھر کر وقت کاٹتے رہے۔ پھر دفعتاً اندر کمرے سے باتوں کی آواز آئی، تیز تیز قدموں کی چاپ پیدا ہُوئی، اَور ساتھ ہی ایک بھگڈر مچ گئی۔ کسی برقی آلے نے ٹیں ٹیں کی آواز پیدا کرنی شرُوع کر دی۔ برآمدے کے کسی دُوسرے کمرے میں کسی ڈاکٹر کا جیبی آلہ تیزی سے پیں پیں پیں کرنے لگا۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ برآمدے کے کمروں سے دو ڈاکٹر اَور دو نرسیں نمودار ہوئیں اَور چاروں بھاگتے ہُوئے بدیع الزمان کے کمرے میں داخل ہُوئے۔ گھر والے سب لوگ دروازے پر جمع ہو گئے۔ دو تین نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو ایک مرد نرس نے اُن کا رستہ روک کر دروازہ بھیڑ دیا، مگر لوگوں کے دباؤ سے اِس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا رہا۔ نرس اُسے مضبوطی سے تھامے ہُوئے وہیں پہ کھڑا رہا۔ بدیع الزمان کے عزیزوں میں متوحش آوازوں کی ایک لہر اُٹھی۔ "ہائے میرے اللہ، رحم کر،" بہن نے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے،" فصیح الزمان نے سختی کے ساتھ نرس سے سوال کیا۔ "کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔ یہ بھاگ دوڑ کیسی ہے؟"

"کچھ نہیں ہوا،" نرس نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر مریض کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریں۔"

"یہی ٹھہریں، یہیں ٹھہریں، کیوں یہیں ٹھہریں؟ تُمہارے لِئے وہ مریض ہے، میرا وہ بھائی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ بتایا جائے یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"صبر کریں بھائی جان،" نرس بولا، "میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں، زیرِ تربیت نرس ہُوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں میں اندر بھی نہیں گیا، آپ کے سامنے کھڑا ہُوں۔ میں آپ کو

کچھ نہیں بتا سکتا۔ ابھی ڈاکٹر صاحبان باہر آئیں گے تو سب کچھ بتا دیں گے۔"
نرس نے ہجوم کے عقب میں دیکھا تو فوراً سامنے سے لوگوں کو ہٹا کر رستہ بنانے لگا۔ برآمدے میں کنسلٹینٹ چلا آ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑے ہُوئے سب لوگ اُس کے آگے سے ہٹ گئے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہونے لگا بدیع الزمان کی بیوی ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "ڈاکٹر صاحب" وہ روتی ہُوئی بولی "ان کی جان بچا لیں۔ مجھے اَور کچھ نہیں چاہئے۔"
ڈاکٹر نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔ "بی بی" وہ بولا "اگر آپ یہاں سے ہٹ جائیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔" اَور اندر چلا گیا۔
"ڈاکٹر صاحب خفا ہوں گے" نرس نے اِن لوگوں سے کہا۔ "مجھے دروازہ بند کر لینے دیں۔"
فصیح الزمان دروازے سے مڑا۔ "چلو بھئی، ہم یہاں کھڑے کچھ نہیں کر سکتے۔ اِن لوگوں کو اپنا کام کرنے دیں۔"
آہستہ آہستہ لوگ پیچھے ہٹنا شروع ہُوئے۔ دباؤ کم ہوا تو نرس نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے اعجاز نے، جو اَیسے مقام پہ کھڑا تھا جہاں سے اندر والا کمرہ دکھائی دیتا تھا، ایک نظر دیکھا کہ اُس کمرے کا دروازہ کھلا ہے اَور ایک ڈاکٹر نے بدیع الزمان کی چھاتی ننگی کی ہے اَور سینے پہ پورے زور سے دھپ دھپ کر کے چیت رسید کر رہا ہے اَور کبھی دونوں ہاتوں سے اُس کی چھاتی پہ اپنے بدن کا پورا وزن ڈال کر دبا رہا ہے۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔
اُس کے بعد جو آدھ گھنٹہ گزرا وہ اَیسا تھا کہ ایک ایک منٹ گھنٹے کے برابر لگا۔ بنچوں پر سے بچے اب اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے اَور دیواروں کے ساتھ لگ کر کھڑے اپنے بڑوں کی جانب منہ اُٹھائے ہُوئے یا کھڑکیوں میں کھڑے ایڑیاں اُٹھائے باہر دیکھ رہے تھے۔ مرد ہاتھ پیچھے باندھے، سر جھکائے، پانچ دس قدم کے اندر اندر چکر کاٹتے ہوئے ایک دُوسرے سے ٹکراتے جا رہے تھے۔ عورتیں ایک دُوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے خشک سوگوار آنکھوں سے بند دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ کوئی کسی سے بات نہ کر رہا تھا۔ جو بھی منہ کھولتا وہ سر اُٹھا کر اُوپر دیکھتا اَور زبان سے اللہ کا نام لیتا۔ مرد آگے پیچھے چلتے

ہوئے بار بار کلائی کی گھڑیوں پہ نظر ڈالتے، جیسے کسی معین وقت کے اِنتظار میں ہوں، گو کوئی معین وقت اُن کے سامنے نہ تھا۔ ان کی گھڑیوں کی سوئیاں کبھی اتنی بیکار نہ چلی تھیں۔

آخر دروازہ کھلا۔ سب کے سب بلہ کرکے دروازے پر گئے۔ مگر جونیئر ڈاکٹر نے فصیح الزمان کو اِشارے سے اندر بلایا اَور دروازہ بند کر دیا۔ تین چار منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور فصیح الزمان ماتھے پہ ہاتھ مارتا ہوا باہر نکلا۔ اُس نے اپنی بہن اَور بدیع کی بیوی کو بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگالیا اَور اُن کے سروں پہ اپنا چہرہ رکھ کر رونے لگا۔ اُس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ اعجاز نے دروازے سے اندر دیکھا۔ بدیع الزمان کے بدن سے سب ٹیوبیں اَور نالیاں اتار دی گئی تھیں اَور وہ سفید چادر سے ڈھکا پڑا تھا۔ اِردگرد کہرام مچا تھا۔ اعجاز سر کو ہاتھوں میں لے کر بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

"ہائے تُمھارا وکیل تھا؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"سو بار تو تُجھے بتایا ہے۔ اخبار کا مالک تھا۔"

"مُجھے کیا پتا۔ کل سے تُم نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ تُمھارے مشکل مشکل ناموں والے بندے مُجھے کب یاد رہتے ہیں۔ نہ میں نے دیکھے نہ سنے۔ بچارے کے بیوی بچے تھے؟"

اعجاز نے اِثبات میں سرہلایا۔

"ہائے بچارہ۔ جنازہ پڑھ آئے ہو؟"

"نہیں،" اعجاز تیزی سے بولا، "کھیت میں پھینک کر آ گئے ہیں۔"

سکینہ نے روٹی پکاتے پکاتے رُک کر اُسے دیکھا۔ "تُمھیں تو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت بدمزاجی کرتے رہتے ہو۔"

اعجاز اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب سے اعجاز واپس گھر آیا تھا اُس وقت سے وہ ایک سکتے کی حالت میں تھا۔ نہ اُس کے دِل میں کوئی بات ٹھہرتی تھی نہ دِماغ میں۔ زیرِ سطح ایک ہیجان کی لہر تھی جس کے اُوپر اُوپر سکوت کی چادر تنی تھی۔ وہ دو مختلف دنیاؤں کے بیچ تیر رہا تھا۔ اُس کا دایاں اَور بایاں بازو، الگ الگ، اِن دو دھاروں سے رگڑ کھا کر اپنی اپنی برقی رو پیدا کر رہا تھا، جو اعجاز کے اندر سے گزرتی ہُوئی اُس کے بدن کے پردے اُدھیڑتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کی نظر کے سامنے دنیا کی اصل حقیقتیں واضح طور پر عیاں ہو رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی باتوں سے اُس کی توجہ اُٹھتی جا رہی تھی۔ جن بنیادوں پہ اُس نے اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کی تھی، بدیع الزمان کی موت نے اُن میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے فالتو چڑھی ہُوئی تہیں ایک ایک کرکے اُس کے جسم سے اُتر رہی ہوں اَور اُس کی نگاہیں دور تک مار کرتی جا رہی ہُوں۔ پچھلی رات کو بھی وہ کھانا کھانے کے بعد دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھا رہا تھا، مگر آدھی رات کے وقت سونے کو گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ آج وہ اپنے کمرے میں گیا تو کافی دیر تک دروازہ بند کرکے وہیں بیٹھا رہا۔ سکینہ کھانے دانے سے فارغ ہو کر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ جب آدھی رات ہونے کو آئی اَور اعجاز کے آنے کا کوئی نشان دکھائی نہ دیا تو سکینہ جمائیاں لیتی ہُوئی اپنی پیڑھی سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ صحن پار کرکے اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اعجاز کرسی پہ بیٹھا، کہنیاں میز پہ ٹکائے، سر کو ہاتھوں میں لئے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے سو رہا ہو۔ مگر دروازے کی آواز سنتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اَور سر کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا جیسے کئی من کا بوجھ اُس کے کندھوں پہ رکھا ہو۔

"روٹی ٹھنڈی ہو گئی ہے،" سکینہ نے کہا۔ "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

"بھوک نہیں ہے،" اعجاز نے جواب دیا۔

"سارا دِن خوار ہوتے رہے ہو۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے؟"

"اونہوں،" اعجاز سر ہلا کر بولا۔

"پھر نیند کیسے آئے؟ پیٹ میں کچھ ڈالو تو آنکھ بھی آرام کرے۔"

اعجاز نے جواب دیئے بغیر دوبارہ سر کو ہاتھوں پہ رکھ کر اُنگلیوں سے ڈھانپ لیا۔ سکینہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی اَور دو چار منٹ میں توے پہ روٹیاں گرم کرکے، ہانڈی سے گرم

سالن پلیٹ میں ڈال کر لے آئی۔

"یہ لو" وہ چنگیر میز پہ رکھ کر بولی۔ "اِتنا غم کس کام کا؟ موت تو بندے کا سایہ ہوتی ہے۔ مگر جب تک جان ہے اُس کا دھیان کرنا اللہ کا حکم ہے۔ کچھ کھالو۔"

اعجاز نے جواب نہ دیا تو سکینہ پلٹ کر گئی اَور باورچی خانے سے ایک خالی پلیٹ اُٹھا لائی جو اُس نے سالن والی پلیٹ پر اوندھی کر کے رکھ دی۔

"روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ دی ہیں، گرم رہیں گی" وہ جاتے جاتے بولی، "جب بھوک لگی کھالینا۔ فاقے سے کمزوری ہو جاتی ہے۔"

اعجاز کو وقت کا ہوش نہ تھا۔ اُس کے اعصاب کا صدمہ جو بدیع الزمان کی موت سے شروع ہوا تھا، اب پھیل کر کسی اَور ہی کیفیت میں داخل ہو چکا تھا، جس میں بہت سی آگے پیچھے کی باتیں شامل ہو گئی تھیں۔ پُرانی پُرانی اَور بیچ کے وقت کی اَور موجودہ باتیں آپس میں اِس طرح گھل مِل گئیں تھیں کہ وقت کا وجود ان کے اندر معدوم ہو گیا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری باتیں ایک ہی لحظے میں، ایک ہی مقام پر قائم و دائم تھیں۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو رات کے ڈھائی بجے تھے۔ اُس نے ایک نظر کلائی کی گھڑی اَور دوسری کھانے کی چنگیر پہ ڈالی، ہاتھ بڑھا کر دسترخوان کے اندر ٹٹولا تو روٹیاں ٹھنڈی ہو کر اکڑ چکی تھیں۔ اُس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ کرسی پہ بیٹھا وہ چند منٹ تک دیوار کے ساتھ بچھی چارپائی کو دیکھتا رہا۔ پھر جا کر اُس پہ لیٹ گیا۔ کافی دیر تک وہ سوتا جاگتا ہوا کروٹیں بدلتا رہا، مگر فجر کی اذان سے ذرا پہلے گہری نیند سو گیا۔

اِس جکڑ سے اعجاز آخر بدیع الزمان کے سوئم والے روز آزاد ہوا جب اُس نے دیکھا کہ اِس نچلے طبقے کے رہائشی علاقے کی ایک خستہ گلی میں جہاں بدیع الزمان کا گھر تھا، زمین پر میلی اَور کٹی پھٹی کرائے کی دریاں بچھی تھیں، اَور اُن دریوں پر سفید دُھلے ہوئے کپڑے پہنے شہر بھر کے نامور صحافی اَور اُن کے مشہور و معروف دانشور لکھاری بیٹھے، بھنے ہُوئے چنے اَور کھجور کی گٹھلیوں کو ہاتھوں میں رولنے کا خود کار عمل کرتے ہوئے، آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ صحافت کی دنیا میں اعجاز کی زندگی کا بہت کم حصہ گزرا تھا مگر جو گزرا تھا اُس دوران بھی وہ زیادہ تر اپنے گھر اَور زمینداری کے کاروبار میں مصروف رہا تھا۔ چنانچہ صحافت کی برادری کے اِن لوگوں کو اعجاز نے اُن کی تصویروں وغیرہ سے پہچانا۔

مگر جیسے ہی وہ وہاں پہنچ کر ایک کونے میں بیٹھا، کئی جانے پہچانے اَور اجنبی لوگوں نے دور سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، گویا اُس کے واقف کار ہوں۔ اعجاز نے جھجکتے ہُوئے جواب میں ہاتھ اٹھایا۔ قل شریف اَور دعا کے بعد سب اُٹھ کھڑے ہُوئے تو ایک ایک کر کے یہ لوگ اعجاز کے پاس آئے۔ انہوں نے گرمجوشی سے اعجاز کے ساتھ مصافحہ کیا اَور اُس کی خیریت دریافت کی۔ اعجاز اُن میں سے بہت سوں کے ناموں سے واقف نہ تھا مگر اُن کی آنکھوں میں آشنائی اَور اپنائیت کی جھلک دیکھ کر اُس کا جی کچھ کچھ ٹھہرنے لگا۔ آخر میں روزنامہ 'طلوع' کے چیف ایڈیٹر نے اعجاز کے پاس رُک کر بات کی۔

"ابتدا گئے دو ایک ایشوز میں بدیع نے ہمارے بارے میں کچھ باتوں کا اشارۃً ذکر کیا تھا، جیسے مرحوم کو کوئی رنج ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بدیع کے لِئے ہمارے دِل میں احترام اور محبت کے سوا اَور کچھ نہیں تھا۔ آپ کو علم ہو گا کہ مالکان کے لِئے اخبار ایک بزنس ہوتا ہے اَور اُن کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ ہم لوگ خُود عمر بھر کمپرومائیز کر کر کے بُرا بھلا رستہ نکالتے رہے ہیں اَور اب تھوڑی بہت عزت لِئے پھرتے ہیں۔ مگر بدیع ایک ہی بات پہ اڑا رہا، کہ اپنے اصولوں سے منحرف نہیں ہو گا۔ میں نے بذاتِ خُود اُس کی منت کی کہ رک جاؤ، کوئی نہ کوئی رستہ نِکل آئے گا۔ مگر آخر میں وہ چھوڑ کر چلا ہی گیا۔ طبیعت کا بھی تیز تھا، مگر خُدا اُسے جنت میں جگہ دے، ایک پیور جرنلسٹ تھا۔ میں خود ایک تعزیتی نوٹ لکھ کر نمایاں جگہ پہ چھاپ رہا ہُوں۔ ہو سکتا ہے اداریئے کی شکل میں لکھوں۔"

اعجاز آہستہ سے ہنسا۔ "تعزیتی کالموں سے کیا ہوتا ہے زیدی صاحب۔ بھائی بدیع الزمان تو اب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اُسے کیا فرق پڑے گا۔"

"یہ ہمارا فرض ہے اعجاز صاحب، وہ ہمارے قبیلے کی ایک معزز ترین شخصیت تھی۔"

"اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو پسماندگان کے لِئے کچھ مالی امداد کا بندوبست کریں۔" اعجاز نے کہا۔ "بھائی بدیع پر قرضے کا بھی کافی بوجھ چڑھ چکا ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں" زیدی پہلو بچانے کے انداز میں بولا، "میں اپنی آرگنائزیشن کو اپروچ کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

زیدی مصافحہ کر کے رخصت ہوا تو خواجہ معراج، جو دور کھڑا دیکھ رہا تھا، اعجاز کو

فارغ ہو کر اُس کے پاس آیا اور اُسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ "میں تو بدیع کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اپیل تیار کر لی گئی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ سن کر وہ اُٹھ بیٹھتا۔ کاش میں اُس کو یہ خوشخبری سنا سکتا۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

اُن کے پاؤں تلے سے دریاں جو آدھی گلی میں بچھائی گئی تھیں، لپٹی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پر بھنے چنے اور کھجور کی گٹھلیاں بکھری پڑی تھیں۔ اعجاز جواب دیئے بغیر کھڑا خواجہ معراج کی بات سنتا رہا، جو اپنے آپ میں مگن بولتا جا رہا تھا۔

"مجھے تو یہ دُکھ ہے کہ اِنتظار حسین میرے پنجے سے نِکل گیا۔ قسمت کا دھنی ہے، ورنہ ایسی مات دیتا کہ اُس کی ساری حکمت عملی دھری کی دھری رہ جاتی۔ ججوں کا ٹاؤٹ بن کر ریپوٹیشن بنا رکھی ہے۔ خیر ایک اور کیس میرے پاس آیا ہے، اُس میں پھانس لوں گا۔ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔"

اعجاز چہرے پہ اتھاہ حیرت کا تاثر لئے، آنکھیں پھاڑے خواجہ معراج کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ اعتبار نہ آ رہا تھا۔ خواجہ معراج باتیں کئے جا رہا تھا اور اعجاز سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سب ان دو وکیلوں کے مقابلے کا کھیل تھا؟ پھر اُسے یاد آیا کہ بدیع الزمان کے لِئے بھی، اُس کے اپنے قول کے مطابق، یہ "طلوع" والوں کے ساتھ اُس کے مقابلے کا کھیل تھا۔ ساتھ ہی اعجاز نے ہلکی سی پشیمانی سے سوچا کہ اُس کے اپنے لِئے بھی کیا یہ صرف بشیر کو مات دینے اور کنیز کو زور بازو دکھانے ہی کی لڑائی نہ تھی؟؟ "سب اناء کا کھیل ہے بھائی،" بدیع الزمان کے آخری الفاظ اُس کے کانوں میں بدیع الزمان کی سانس کی مانند شاں شاں کرنے لگے۔

"سیدھا راستہ تو یہ ہے کہ اپیل کے ساتھ معافی نامہ داخل کر دیا جائے،" خواجہ معراج کہہ رہا تھا۔ "مگر ایک آسان رستہ ہے۔ قانون میں اس کی گنجائش ہے۔ فریقین کی رضامندی سے عدالت کا فیصلہ کالعدم کرنے کی درخواست دی جا سکتی ہے، جس کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ مگر اس سے پہلے ایک قدم اُٹھانا پڑے گا۔"

"وہ کیا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"پرچہ بند کرنے کا پریس میں اعلان کرنا پڑے گا۔"

"یہ کیوں ضروری ہے؟"

"بھائی جی ---" خواجہ معراج اعجاز کو بازو سے پکڑ کر غیر ضروری طور پہ مزید پرے لے گیا۔ "پرچہ عملی طور پہ تو اب بند ہو ہی چکا۔ شیخ سلیم اپنے نقصان پہ صبر شکر کرکے بیٹھ گیا ہے۔ ایڈیٹر اور پروپرائٹر مر چکا ہے۔ پیسہ ویسہ کوئی نہیں آئے گا۔ پرچہ چلائے گا کون؟ تم ایک اچھے رپورٹر ثابت ہوئے ہو، عبارت اچھی لکھ لیتے ہو۔ مگر تم اخبار نویس نہیں ہو۔ اِس بزنس کی الف بے کا تمہیں پتا نہیں۔ یہ بھیڑیوں کا کچھار ہے بھیڑیوں کا۔ دو دِن میں تمہیں ہڑپ کر جائیں گے۔ وہ بدیع ہی تھا جو اِتنے دِن نکل گیا۔ تیس سالہ تعلقات کی بنا پر لوگ اُسے اشتہارات وغیرہ خیرات کے طور پہ دے دیا کرتے تھے۔ میں قانونی مشیر کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ اب ایک ہی راستہ ہے، کہ جلد از جلد پرچہ بند کرنے کا اعلان کر دیا جائے۔ اور یہ ڈیوٹی تم ادا کرو۔"

"قانونی مشیر کی حیثیت سے آپ بھی پریس نوٹ جاری کر سکتے ہیں۔"

"کر سکتا ہوں۔ مگر میں مناسب یہی سمجھتا ہوں کہ تم کرو۔ مجھے پریس میں کوئی نہیں جانتا۔ تم آدھے پونے رپورٹر تو تھے ہی، مگر مقدمے کی وجہ سے پوری طرح پہچانے جا چکے ہو۔ تمہاری بات میں ایک اتھارٹی ہوگی۔ ازمیر والوں کی رضامندی کے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ اعلان تمہارے منہ سے ہو۔ اِس پہ تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بس دو تین بڑی اخباروں کے سٹی ڈیسک والوں کو مدعو کرکے مختصراً کہہ دیا جائے کہ ایڈیٹر پبلشر کی افسوسناک، افسوسناک کہنا ضروری ہے، بلکہ نہایت افسوسناک موت کی وجہ سے 'بہ بانگِ دُہل' ہمیشہ کے لئے بند کیا جا رہا ہے۔ اور گول مول کرکے بات کر دینا۔ بلکہ بیان میں لکھ دونگا کہ 'بہ بانگِ دُہل' کی اشاعت کے تمام تر دورانیئے میں کسی شائع شدہ مواد کے باعث اگر کسی شخص یا ادارے کو دانستہ یا نادانستہ رنج پہنچا ہے تو ہمیں دِلی افسوس ہے جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بس یہ کافی ہے۔ ازمیر والوں کو اور کیا چاہیے؟ نہ رہا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ کل کا دِن چھوڑ دو، میں رپورٹروں سے رابطہ کرتا ہوں۔ دو ایک بڑی اخباروں کے تراشے چاہئیں۔ زیادہ کی ضرورت نہیں۔ کل میں یہ انتظام کر دیتا ہوں۔ پرسوں صبح --- اونہوں" خواجہ معراج نے اپنے آپ سے نفی میں سر ہلایا۔ "صبح کو پریس والے کہاں سے آئیں گے، بھڑوے بارہ بجے تو سو کر اُٹھتے ہیں۔ آفٹرنون ٹھیک ہے۔ دو بجے بلا لیتے ہیں۔ مگر تم بارہ بجے پہنچ جانا۔ میں تم اور شیخ سلیم تینوں 'بہ بانگِ دہل'

کے دفتر میں اُن سے ملیں گے۔"

خواجہ معراج اعجاز کا بازو تھپتھپا کر رخصت ہوا۔

گو خواجہ معراج کی جانب سے اُسے مایوسی سی ہُوئی تھی، مگر بدیع الزمان کے سوئم پہ اتنے سارے چیدہ چیدہ اخبار نویسوں کو موجود پا کر اَور پھر اپنے ساتھ اُن کا رویہ دیکھ کر اعجاز کے جی کو ڈھارس ہُوئی تھی اَور اُس کا مزاج قدرے کھل گیا تھا۔ تین چار دِن میں پہلی بار اُس نے گھر پہ سکینہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔

"تمہیں کچھ ہوش آئے تو لڑکوں کے معاملے پر ملک جہنگیر سے جا کر مِل آؤ۔ اُس کا کوئی پتا نہیں، آج ہے کل نہیں۔ عالمگیر بالکل ہی بے مہار ہو جائے گا۔"

"پرسوں شہر سے واپسی پر جاؤں گا۔" اعجاز نے کہا۔

"آج اخبار والے کا قتل بھی ہو گیا ہے۔ اب شہر کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"پرسوں مقدمہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"کیسے ختم ہو گا؟"

"نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔"

"بجھارتیں نہ ڈالو، سچ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہے۔"

"بھئی اخبار کا مالک مر گیا، اخبار بند ہو گیا، مدعیوں کو اَور کیا چاہئے۔ پرسوں ہم اِس بات کا اعلان کر دیں گے، معذرت بھی کر لیں گے۔ معاملہ ٹھپ۔"

"شکر ہے۔ ایک اَور مصیبت ختم ہُوئی۔ اب کسی اَور کام میں ہاتھ نہ ڈال دینا۔"

"اب کونسا کام رہ گیا ہے۔"

"سب سے ضروری لڑکوں کا کام ہے۔ اُن کا دھیان کرو۔ ہاتھ سے نِکل جائیں گے۔"

"تجھے تو سب کچھ ہاتھ میں رکھنے کی فکر رہتی ہے۔ جوان لڑکے ہیں، زمانہ دیکھیں گے تو خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"باپ کے ہوتے ہُوئے اپنے آپ کوئی ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"تو میں کہیں چلا جاؤں۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"تو جو کہتی ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کوئی ٹھیک نہیں ہوتا، تو میں چلا جاتا ہوں، پھر شاید اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں۔۔۔"

"تمہیں تو بات اُلٹی طرف لے جانے کی عادت ہو گئی ہے۔" سکینہ بات کاٹ کر بولی۔ "میں کہتی ہوں باپ کا ہاتھ سر پر ہو تو لڑکے آپے میں رہتے ہیں۔"

اعجاز آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا۔ سکینہ بھی شرارت میں آ گئی۔

"پھر جداد میرے نام کب لگا رہے ہو؟"

"جائیداد تیری ہی ہے، سارا بندوبست تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

"زبانی کلامی کو میں نہیں مانتی۔ کاغذوں میں میرے نام کب کرو گے؟"

"دیکھ، جائیداد آج بھی تیری، آگے بھی تیری۔"

"آج میری ہے، آگے کا مجھے پتا نہیں۔ تمہارا کوئی اِتبار ہے، کل کوئی نیچ ذات کی لا کر گھر میں ڈال لو۔"

اعجاز ہنس پڑا۔ "کسی بے گناہ کو لا کر تیرے ہاتھوں حرام کی موت مروانا ہے؟ تو اُس کا خون پی جائے گی۔"

"بات نہ ٹالو۔ کب رجسٹری کروا رہے ہو؟"

"کہا تو ہے، جائیداد ساری تیری ہاتھ کے نیچے ہے۔ آگے بھی رہے گی۔"

"آگے شاگے کا مجھے پتا نہیں۔ زبان کر کے پھر گئے ہو؟"

"آگے کا تجھے کیسے پتا نہیں۔ تو چاچے کی اولاد ہے۔ چاچے کی لڑی میں عورتیں سو سو سال کی ہو کر کھاتی پیتی رہتی ہیں۔ تیری دادی پچانوے سال کی دوڑی پھرتی ہے۔ دو خصموں کی جائیداد کھا بیٹھی ہے۔"

"چل چل، میری دادی کو باتیں نہ کر،" سکینہ بے تکلفی سے بولی، "دادے تو بچارے بماری کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔"

"ہاں، اُن کی بیماری تیری دادی تھی۔"

"ہائے، تجھے تو شرم بھی نہیں آتی،" سکینہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اور ایک دو بار مڑ کر اعجاز کو دیکھنے کے بعد گھر کے اندر چلی گئی، گویا خاموش نظروں سے اُسے بلا رہی ہو۔

اعجاز کا جی کو ہلکا ہو چکا تھا، مگر اُس کا دِل ابھی گھر کے اندر جانے کو نہ کر رہا تھا۔

جیسے ہی سکینہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہُوئی وہ باورچی خانے سے نِکل کر اپنے صحن والے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک وہ کرسی کی پُشت سے پُشت جمائے، اُس کے بازوؤں پہ اپنے بازو رکھے، بے حرکت بیٹھا اپنے سامنے میز کی خالی سطح کو دیکھتا رہا، گویا اپنے اجزاء کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ کئی پردے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے اُتر گئے تھے، مگر ابھی مزید کئی مختلف اَور متضاد نوعیت کے بوجھل غلاف اُسے اپنی لپیٹ میں لئے ہُوئے تھے۔ اِن پردوں کی تہوں میں چھپا، کبھی اِدھر اَور کبھی اُدھر سے جھانکتا ہوا، بدیع الزمان کا چہرہ تھا جو ہٹائے نہیں ہٹتا تھا اَور اعجاز کے تصور سے آنکھ مچولی کھیلے جا رہا تھا۔ اعجاز کی عجیب حالت تھی کہ وہ ابھی تک دِل میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ بدیع الزمان کے بارے میں اُس کے کیا جذبات تھے۔ کیا وہ ایک بے وقوف آدمی تھا جس نے اپنی حماقت سے صحت گنوا دی تھی؟ کیا وہ انا پرست تھا جس نے سب کو اندھیرے میں رکھا اَور محض اِتفاق سے نام پیدا کر گیا تھا؟ یا کہ وہ حقیقی طور پہ ایک انصاف پرست اَور عظیم شخص تھا جس نے اپنے اصولوں کی خاطر قربانی دی تھی؟ اعجاز کی روح میں ایک کشمکش جاری تھی جس نے اُس کے اندر خواہش پیدا کی کہ کم از کم اِس ایک رات کو وہ اِسی طرح خاموشی کی حالت میں وہاں بیٹھا رہے اَور کوئی اُسے بلانے کو نہ آئے، حتیٰ کہ وہ آنکھ مچولی کھیلتا ہوا چہرہ اُس کے تصور سے خارج ہو جائے۔

قدرت نے اُس کی مدد کی اَور سکینہ اعجاز کے تصور میں گھر کے اندر بستر پہ لیٹی رہی۔ آخر اُس کے چالیس سالہ تھکے تھکائے بدن نے اُس کا ساتھ نہ دیا اَور وہ وہیں پہ سو گئی۔ ایک گھنٹہ کرسی پہ بیٹھے رہنے کے بعد اعجاز نے تھک کر پہلو بدلا اور خالی خالی نظروں سے کمرے میں دیکھنے لگا۔ پھرتی پھراتی ہُوئی اُس کی نظر نیچے گئی تو اُس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ والا سب سے نچلا دراز پوری طرح بند نہیں تھا، اَور اُس کی پتلی سی درز میں سے ایک سفید سی چیز جھانک رہی تھی۔ کئی لمحے تک وہ اُسی طرح کرسی پہ بیٹھا انجان سی نظروں سے اُس درز کے اندر دیکھتا رہا۔ دائیں اَور بائیں جانب کے چار درازوں میں اُس کے کاغذات، خطوط، قلم اَور پنسلیں، کاپیاں اَور سادہ کاغذ وغیرہ رکھے تھے۔ ضروری کاغذات جیسے زمینوں کی رجسٹریاں، کاروبار کا حساب کتاب اَور بنک کی چیک بکیں وہ گھر کے اندر اپنی تالہ لگی الماری میں رکھتا تھا۔ مگر اُس کے حافظے کے مطابق، میز کے دونوں نیچے والے دراز

خالی رہا کرتے تھے۔ اس درز میں یہ کیا چیز ہو سکتی تھی اَور کب اور کیسے یہاں پہنچی تھی؟ ایک انوکھی بات یہ تھی کہ اِس شے کو دیکھنے کا تجسس بھی اِس کے دل میں ناپید تھا۔ اُس وقت اعجاز کے لیے اِس بات کی کوئی حقیقت نہ تھی کہ یہ کوئی کپڑا تھا یا کاغذ--- یا اُس کی نظر اَور سوچ کو مصروف رکھنے کا محض ایک بہانہ تھا؟ اُس نے جوتے سے پیر نکال کر انگوٹھا اُس درز میں داخل کیا اَور اُس کے زور سے دراز ذرا سا باہر کو کھسکایا۔ اندر ایک بڑا سا پلاسٹک کا لفافہ رکھا تھا۔ اعجاز چند لمحوں تک اُس لفافے پہ نظریں جمائے ہُوئے بیٹھا اپنی یاد کے دھندلکے میں اُس کی شناخت کرتا رہا۔ اُس کا دماغ ماؤف تو نہ ہوا تھا، مگر وقتی طور پہ کسی حد تک شل ہو چکا تھا، اِسی طرح جیسے اُس کے بیشتر اعضاء صدمے کے اثر سے سر نکالنے کے بعد، ابھی تک نیم مفلوج حالت میں تھے۔ اُس نے دماغ پہ زور دینے کی کوشش سے چھٹکارا پانے کی خاطر پیر سے دھکیل کر دراز بند کر دیا۔ اعجاز کے خیال میں دراز اندر سے اٹکتا تھا، چنانچہ اُس کے پیر کا دباؤ کچھ زیادہ پڑا، جس سے دراز کھٹاک سے بند ہو گیا۔ جیسے ہی دراز کے بند ہونے کی آواز کمرے میں گونجی، گویا کسی نے اعجاز کی یاداشت کا بٹن دبا دیا ہو۔ وہ اجنبی آدمی، جس نے ایک ویران سی سڑک پہ لیجا کر یہ بھاری لفافہ اعجاز کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اَور خُود اپنی بائیسکل سمیت آبادی کی گلیوں میں گھس کر غائب ہو گیا تھا، وہ اَور اُس کا سارا منظر اعجاز کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے بدن کی تمام تر آلکس ہوا ہو گئی، جیسے کہ وہ کسی ایسی ہی شے کی تلاش میں ہو جو اُس کے دھیان کی گرانی کو کم کر کے اُس کے ذہن کو اِس موجودہ بکھیڑے سے نکال کرلے جائے۔

اُس نے جلدی سے جھک کر دراز کھولا اَور لفافے کے اندر سے کاغذوں کا پلندہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ یہ انگریزی میں ٹائپ شدہ تین چار سو کھلے کاغذوں کا بنڈل تھا، جس پہ کسی قسم کی جلد نہ تھی۔ پہلے صفحے سے، بغیر کسی عنوان کے، عبارت کی اِبتدا ہوتی تھی، اَور پہلی سطر سے پتا چلتا تھا کہ کہیں بیچ سے ہی شُروع کر دی گئی تھی۔ صفحوں کے نمبر لگے تھے مگر فوٹو کاپی مدھم ہونے کی وجہ سے تقریباً مٹ چکے تھے۔ آخری صفحے کا حال بھی وہی تھا، کہ جملے کے درمیان میں ہی صفحہ ختم ہو جاتا تھا۔ پہلے اَور آخری صفحے کو دیکھنے کے بعد اعجاز نے پلندے کو بیچ بیچ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کاغذ بے جلد ہونے کے باوجود بے ترتیب نہ تھے اَور جتنے بھی موجود تھے وہ عبارت کے لحاظ سے ایک کے بعد ایک سلسلہ وار چلتے

تھے۔ اعجاز نے اُن کھلے کاغذوں کو چاروں طرف سے دبا اور ملا کر ایک دستے کی شکل میں نہ کیا اور سامنے رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔

اعجاز گو انگریزی بخوبی پڑھ لیتا تھا، مگر اُسے اِس کی مشق نہ تھی۔ پہلے چند صفحات اُس نے یوں پڑھے جیسے وہ کوئی مبتدی ہو۔ لیکن اُس تحریر نے اعجاز کے ہوش اُڑا دیئے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا تھا اُس کے پڑھنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آخر دو گھنٹے کے عرصے میں دس بارہ صفحے پڑھ لینے کے بعد وہ ایک لحظے کو رُکا۔ نیند کا ایک ریلا آیا اور اس کے بدن سے گزر گیا۔ وہ پڑھتا رہا۔ پچاس صفحے پڑھ چکنے کے بعد اُس نے گھڑی دیکھی تو دو بجے تھے، مگر اُس کی آنکھیں اُس تحریر سے جدا نہ ہوتی تھیں۔ پڑھتے پڑھتے اچانک اعجاز کے اوپر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو گیا۔ اُس نے مڑ کر چاروں طرف کمرے میں دیکھا، پھر اُٹھ کر دروازے سے سر نکالا اور تاریک صحن میں باہر کے دروازے تک نظر دوڑائی۔ کوئی بندہ بشر اُسے نظر نہ آیا، صرف صحن کے دُوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی بھینس نے اندھیرے میں سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور تین ماہ کا بچھڑا ایک کر اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ ایک لحظے کو اعجاز نے ارادہ کیا کہ جا کر باہر کے دروازے کی کنڈی دیکھے کہ لگی ہے یا نہیں، پھر اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور باہر نکلنے کا اِرادہ ترک کر دیا۔ ایک آخری نظر چوبارے پہ ڈال کر، جس کی چھت کے کنگرے ستاروں بھرے آسمان کے مقابل صاف نظر آ رہے تھے، وہ دروازے سے ہٹ آیا۔ اندر قدم رکھ کر اُس نے دروازے کے پٹ مضبوطی سے بند کر دیئے، گو کنڈی نہ چڑھائی۔ پھر اُس نے جا کر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور اُوپر روشندانوں پہ نگاہ ڈالی، جو بند تھے۔ جب وہ ہر طرف سے اپنے آپ کو محفوظ پا کر مطمئن ہو چکا تو واپس کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا اور بلا توقف جہاں سے چھوڑ کر گیا تھا وہاں سے آگے پڑھنے لگا۔ اِس تحریر میں جگہ جگہ قانونی نکتوں کے حوالے جلت دیئے گئے تھے جو اعجاز کے علم سے باہر تھے، گو بیشتر تحریر کا متن بخوبی اعجاز کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ اپنی محویت میں اعجاز اُن قانونی حوالوں کو بغیر پڑھے چھوڑتا ہوا، باقی عبارت کے ایک ایک لفظ کو اپنی آنکھوں سے گویا پیئے جا رہا تھا۔ مزید ایک گھنٹہ گزرنے پر جب اعجاز نے رُک کر دیکھا کہ وہ اِس عرصے میں چالیس صفحات پڑھ گیا تھا تو اُسے اپنی رفتار پہ ہلکی سی حیرت ہوئی۔ مگر اِن باتوں کے لیے اُس کے پاس وقت نہ تھا۔ وہ اُن سینکڑوں

صفحات کو وہیں بیٹھے بیٹھے محض پڑھنا ہی نہیں بلکہ اپنے ذہن میں محفوظ کرلینا چاہتا تھا، گو جانتا تھا کہ یہ کام اُس کی استطاعت سے باہر تھا۔ اِن صفحات کے اِنکشاف در اِنکشاف نے اُسے حیرت زدہ کر رکھا تھا۔

فجر کی اذان ہوئی، جس کی صدا اعجاز کی سماعت کے کسی زیریں حصے سے اِس طرح گزر گئی کہ اُس کے شعور سے مس تک نہ ہوئی۔ جب روشندانوں کے شیشوں سے صبح صادق کا اجالا ابھرا تو اعجاز پر نیند نے غلبہ پالیا۔

سورج نکلنے کے ساتھ ہی سکینہ کی آنکھ کھلی تو اُس نے چارپائی سے اُتر کر اعجاز کے کمرے کا رُخ کیا۔ دروازہ بند پا کر اُس نے ہولے سے دوبار اُسے دھکا دیا، جس سے اُسے اندازہ ہوا کہ دروازہ دبا کر بند کیا گیا تھا مگر اندر سے چٹخنی نہ چڑھی تھی۔ ”ساون بھادوں میں تو دروازے لوہے کے ہونے چاہئیں،“ وہ بڑبڑائی۔ اُس نے دائیں پٹ کے دستے کو پکڑے رکھا اور بائیں پٹ کو اُوپر، جہاں سے وہ انکتا تھا، ایک ہلکا سا دھپ رسید کیا۔ دروازہ یوں آسانی سے کھل گیا جیسے اُس پہ کوئی پکڑ ہی نہ ہو۔ اندر اعجاز کرسی پہ بیٹھا بیٹھا، سر میز پہ رکھے سو رہا تھا۔ اُس کا ایک گال کاغذ کے دستے پہ ٹکا تھا اور دونوں بازو میز پر اُن کاغذات کے گرد یوں حلقہ کیے تھے جیسے اُنہیں قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔ سکینہ دروازے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ ”تھ تھ تھ“ اُس نے تاسف سے سر ہلایا۔ چند سیکنڈ کے بعد اعجاز نے ایک زوردار خراٹا لیتے ہوئے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”تھ تھ تھ،“ سکینہ نے دوبارہ متاسف انداز میں سر ہلایا۔

”ہنہ،“ اعجاز نے پُوچھا۔ وہ لاعلم نظروں سے سکینہ کو دیکھے جا رہا تھا جیسے اُس کو پتا نہ چل رہا ہو کہ وہ کہاں پر تھا اور گردوپیش کیا ہو رہا تھا۔

”تمہاری تو مت ماری گئی ہے،“ سکینہ بولی۔ ”نہ اُٹھنے کا ہوش نہ بیٹھنے کا۔“

سکینہ کی بات سے گویا وہ پورے ہوش میں آگیا۔ اُس نے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر کے دو حصے کیے، جن کو وہ پڑھ چکا تھا اُنہیں ایک دراز میں اور جو باقی تھے اُن کو دوسرے دراز میں رکھا۔

”چلو،“ وہ کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”ناشتہ تیار ہے۔ جا کر کھالو۔ میں اِدھر صفائی کرواتی ہوں۔“

"اونہوں،" اعجاز نے سر ہلا کر منع کیا، "کل کروا لینا۔ آج مجھے اِدھر کام کرنا ہے۔"

"صفائی میں کوئی سارا دِن لگتا ہے؟ تُمھارے فارغ ہوتے ہوتے صفائی ہو جائے گی۔"

"کل کروا لینا" اعجاز سکینہ کے بازو پہ نرمی سے ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے آیا۔ رفع حاجت اَور غسل سے بھی پہلے جو کام اُس نے کیا وہ گھر کے اندر سے ایک تالا لے کر آنے کا تھا۔ وہ تالا لے جا کر اُس نے اپنے کمرے کے دروازے کو لگایا، ایک دو بار اُسے کھینچ کر تسلی کی اَور چابی جیب میں ڈال لی۔ سکینہ باورچی خانے کی کھڑکی میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"ہائے ہائے، میں کوئی زبردستی صفائی کرانے لگی تھی؟" وہ بولی۔

اعجاز غسل خانے کو جاتا ہوا سکینہ کی جانب خاموشی سے ہاتھ ہلا کر گزر گیا۔

"اب یہ کاغذ کہاں سے آئے ہیں؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"کونسے کاغذ؟" اعجاز بے خیالی سے بولا۔ وہ پیڑھی پہ بیٹھا اچار کے ساتھ پراٹھا کھا رہا تھا۔

"ہائے وہ تھبے کا تھبا جو ساری رات پڑھتے رہے ہو۔"

"ضروری کاغذ ہیں،" اعجاز نے مختصراً کہا۔

"اوہو کیا ضروری ہیں، کوئی رجسٹریاں ہیں، بنک کے ہیں، آڑھتیوں کے ہیں، کیسے کاغذ ہیں؟"

"اِس طرح کے کاغذ نہیں ہیں؟"

"پھر کس طرح کے ہیں؟"

"تیرے مطلب کے نہیں ہیں۔"

"پھر کس کے مطلب کے ہیں؟" سکینہ تنگ کر بولی۔

"کسی کے مطلب کے نہیں۔"

"ہیں؟ تمھارا دماغ چل گیا ہے؟ ساری رات لگا کر پڑھتے رہے ہو اور کسی کے مطلب کے ہی نہیں ہیں؟"

"ایک مقدمے کی کاروائی ہے،" اعجاز نے کہا۔

"تمھارے مقدمے کی ہے؟"

"نہیں۔"

"اپنا مقدمہ تو ہار گئے ہو، اب کوئی اَور مقدمہ لے بیٹھے ہو؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟ تمھارا اِس کے ساتھ کوئی مطلب تو نہیں نا؟

"نہیں۔"

"پھر پڑھ کیوں رہے ہو؟"

"معلومات حاصل کرنے کے لئے۔"

"مالومات، مالومات،" سکینہ بولی۔ "مالومات کرتے کرتے تمھاری عمر گزر گئی ہے۔ کیا فائدہ ہوا؟ نہ کچھ حاصل نہ وصول۔ شکر کرو ایک مقدمے سے چھٹکارا ہوا ہے۔ دفع کرو اِس قصے کو۔"

"معلومات سے تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ فائدے کی بات ہے،" اعجاز نے کہا۔

"تو مجھے بھی کچھ بتاؤ۔"

"میں نے ابھی تک آدھا بھی نہیں پڑھا، تجھے کیا بتاؤں؟ تُو تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہے۔"

"پیچھے کیوں نہ پڑوں؟ مجھے کیا تمھارا پتا نہیں؟ کوئی اَور مقدمہ اُٹھا لوگے اَور وہ بھی ہار جاؤ گے۔"

"تیری دعا شاملِ حال رہی تو ہار ہی جاؤں گا۔"

"خدا کا نام لو۔ میری دعا سے کوئی نہیں ہارتا۔"

"اچھا اب دیکھ، میں پڑھنے جا رہا ہوں۔ مجھے بلانے کے لِئے نہ آنا۔ کھانے کے لِئے آ جاؤں گا۔ اَور اگر کوئی دروازے پر آئے تو اُس سے کہنا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے،" سکینہ نے بے دلی سے جواب دیا۔ "میں تو کہتی ہوں نیند پوری کر لو۔ سارا دن پڑا ہے۔"

"کر لونگا۔ کر لونگا۔" اعجاز بے صبری سے بولا' اور لسی کا گلاس پی کر اپنے کمرے کو چلا گیا۔

رات بھر جاگنے اور پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سونے سے اعجاز کی کمر اور کندھوں میں جو تھوڑا بہت اکڑاؤ پیدا ہو گیا تھا وہ چلنے پھرنے اور غسل کرنے سے دور ہو چکا تھا' اور گو وہ ایک گھنٹے سے بھی کم عرصہ سویا تھا' مگر اس قدر چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا گویا آٹھ گھنٹے نیند کرنے کے بعد اٹھا ہو۔ اس کا ذہن مکمل طور پہ جاگ گیا تھا اور قریب دو سو صفحے کی تمام تر روداد اس کے دماغ میں رقم تھی۔ وہ کسی مقید جانور کی مانند اپنے پنجرے سے نکل کر کمرے کی آزادی میں جانے کے لئے بیتاب تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دبا کر دروازہ بند کر دیا۔

دوپہر تک وہ کرسی پہ بیٹھا پڑھتا رہا۔ اسے کچھ تھکاوٹ محسوس ہوئی تو کمر سیدھی کرنے کو اٹھ کر چارپائی پہ جا لیٹا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ دس پندرہ منٹ ہی سویا ہو گا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اب اپنے بدن میں اسے تھوڑی بہت نقاہت کے آثار محسوس ہونے لگے تھے' مگر اس کے اندر ایسی ہلچل مچی تھی کہ اسے آرام سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ کمرے سے نکل کر اس نے نلکے پر ہاتھ منہ دھویا اور باورچی خانے میں جا کر کھانا کھایا۔ بھوک کی کمی کی وجہ سے اس نے چند ہی نوالے لے کر کھانا چھوڑ دیا۔ سکینہ کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دے کر وہ اپنے کمرے کو لوٹ آیا۔ ایک سو سے کم تعداد میں صفحے پڑھنے کے لئے رہ گئے تھے اور فطرت کے ساتھ اعجاز کی جنگ جاری تھی۔

پیٹ میں پڑی خوراک اعصاب پہ نیند کے جھونکے لئے آ رہی تھی' مگر وہ تھا کہ اس تحریر میں جتا تھا۔ ایک دو بار وہ اٹھ کر چارپائی پہ جا لیٹا' پانچ دس منٹ سویا اور پھر جاگ اٹھا' گویا ان ان پڑھے اوراق کو ہاتھ لگ گئے ہوں اور وہ اشارے کر کر کے اسے اپنی طرف بلا رہے ہوں۔ ساتھ ہی ایک اور آفت بھی اس پہ نازل ہو رہی تھی۔ جوں جوں وہ اس تحریر کو پڑھتا جاتا تھا' اعجاز کا ذہن بدیع الزمان کی موت کے واقعہ سے دور جانے کی بجائے مزید اس کے اندر اور اس سے متعلقہ واقعات میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔ ان صفحات کے

بیان کا اعجاز کے حالیہ واقعات سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا، مگر ایک اندرونی خلفشار تھا جس نے گویا کیکنچوئے کی مانند اپنی باہیں پھیلا کر ان واقعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور اِن کاغذات پہ پھیلے ہوئے سینکڑوں کردار اعجاز کی اپنی زندگی کے کرداروں میں مدغم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُس کا ذہن دو مستقل سطحوں پہ کام کر رہا تھا۔ ایک سطح پہ اِس مقدمے کے کردار تھے جو اُس مسودے میں بند تھے۔ دُوسرے سطح پر بدیع الزمان، جج محمد حسین تارڑ، خواجہ معراج، حاجی کریم بخش، شیخ سلیم اَور دُوسرے درجنوں لوگ تھے، اَور یہ دونوں "فریق" کسی عجیب و غریب کیمیائی عمل کے تحت ایک دُوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس مسودے کے کرداروں کے چہرے بے شناخت تھے جبکہ اعجاز کے اپنے لوگوں کی شکلیں نہایت واضح طور پہ اُس کے ذہن کی آنکھوں کے سامنے سرگرم عمل تھیں۔ اِس انتشار کے بیچ اعجاز اُس مسودے کو پڑھتا چلا جا رہا تھا اَور اس کے کرداروں کی صورتیں صرف اُن کے ناموں کی مناسبت سے اپنے ذہن میں وضع کرتا جا رہا تھا۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کا نام محمد امین تھا تو اعجاز کے ذہن میں ایک نہایت دیانتدار چہرے والے آدمی کی شکل ابھر کر آتی تھی، اَور اِسی طرح علیٰ ہٰذالقیاس۔ عصر کے وقت وہ آخری صفحے تک جا پہنچا۔ ختم کرتے کرتے اعجاز کو احساس ہوا کہ اُس نے اِس مسودے کی کاروائی کا ایک چوتھائی حصہ بھی نہیں پڑھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ آدمی کون تھا جو یہ تھیلا اُس کے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا اَور اُس نے اعجاز کو محض اونی پونی رپورٹ ہی کیوں دی تھی، اَور اِس کا بقیہ حصہ کہاں تھا؟ مگر یہ باتیں اضافی تھیں اَور جلد ہی اُس کے خیال سے نِکل گئیں۔ اُس کے ذہن میں اب نہ طیش تھا نہ تلاطم، بس ایک مصمم ارادے کی تیز دھار تھی، اَور ذلالت کا ایک قدیم، انمٹ احساس جسے وہ دانتوں میں پیستا ہوا کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اب اعجاز کی ساری سیاسی سمجھوتہ بازی اُس کے مزاج سے خارج ہو چکی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نیم اُبلتا ہوا پانی اُچھال مار کے اُس کے دِماغ کے پردوں پہ گرا تھا اَور جلن کی دھیمی آگ اُسے چین نہ لینے دیتی تھی۔

آخر وہ رُکا اَور میز سے موٹر سائیکل کی چابی اُٹھا کر کمرے سے نِکل آیا۔ کمرے کو تالا لگا کر اُس نے گھر کی جانب دیکھا۔ سکینہ کہیں نظر نہ آئی تو اُس نے موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر سے اُتارا۔ اُس کو وہ بڑے دروازے کی دہلیز سے نکال رہا تھا کہ سکینہ کی آواز آئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا شہر تک جا رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں،" اعجاز نے جواب دیا۔

اعجاز کو علم تھا کہ اخبارات کے دفاتر سہ پہر اور شام کے وقت آباد ہوتے تھے۔ سب سے پہلے اُس نے بدیع الزمان کے سابقہ اخبار روزنامہ "طلوع" کا رُخ کیا۔ چیف ایڈیٹر زیدی کسی سیاسی دعوت میں جا چکا تھا۔ اُس کا ایگزیکٹو ایڈیٹر بدر الحق دفتر میں موجود تھا۔ اعجاز اُسے پہچانتا نہ تھا، مگر وہ اعجاز کو دیکھتے ہی گرمجوشی سے ملا۔

"میرا نام بدر الحق ہے۔"

"میرا نام اعجاز----"

"ہاں ہاں جناب، آپ کو کون نہیں جانتا" بدر الحق بات کاٹ کر بولا۔ "آیئے آیئے، تشریف رکھیے۔"

"معاف کیجیے، آپ کو تکلیف دی،" اعجاز نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا، "میں اصل میں زیدی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ بدیع صاحب کے قُل پہ اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"میں بھی وہیں پہ تھا جناب،" بدر الحق نے کہا۔ "جب آپ زیدی صاحب سے بات کر رہے تھے تو میں پاس ہی کھڑا تھا۔ پھر آپ کے پاس اَور لوگ پہنچ گئے، مجھے اپنا تعارف کرانے کا موقعہ نہیں مِل سکا۔ چائے پئیں گے؟"

"جی نہیں، شکریہ۔ مجھے ابھی کچھ اَور لوگوں سے جا کر ملنا ہے۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ کل بعد دوپہر "بہ بانگ دہل" کے دفتر میں ہم پریس کو ایک بیان دے رہے ہیں۔ اگر آپ اپنا کوئی آدمی بھیج دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"جی ہاں، ضرور، ضرور۔ دراصل ہمیں پہلے ہی آپ کے لیگل ایڈوائیزر کی جانب سے اِطلاع مِل چکی ہے،" بدر الحق نے کہا، پھر وہ آگے جھک کر رازدارانہ انداز میں بولا، "افواہ ہے کہ پرچہ بند کرنے کا اعلان ہوگا؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے،" اعجاز نے کہا۔ "لیکن اِس کے علاوہ ایک بہت اہم معاملے کے بارے میں بھی بات ہوگی۔"

"اچھا؟" بدر الحق کی آنکھوں میں ایک پُرانے رپورٹر کی سی چمک پیدا ہوئی، جیسے

بلی کو گوشت کی خوشبو آ جائے۔ "کس بارے میں؟"

اعجاز ایک لحظہ توقف سے بولا' "یہ آپ کل پہ ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔"

"درست، درست،" بدرالحق نے کہا' مگر پیچھا نہ چھوڑا۔ "نہایت اہم معاملہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اُس صورت میں، میں خُود آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ایک پیالی چائے پی لیں، اِس دفتر میں چائے ہر وقت تیار ملتی ہے،" بدرالحق ہنسا۔

"جی بہت شکریہ، اب میں اجازت لوں گا۔ مجھے اور جگہوں پہ بھی جانا ہے۔"

"اگر آپ کہیں تو میں اپنے جاننے والوں کو بھی خبر کر دوں؟"

"کر دیں تو آپ کی نوازش ہوگی،" اعجاز نے کہا' گو اُسے پتا تھا کہ خبر کے سلسلے میں ایک اخبار نویس دُوسرے کو اطلاع نہیں دیا کرتا۔

"اچھا' تو آپ نے کہا کہ نہایت اہم معاملہ ہے؟" بدرالحق نے اصرار جاری رکھا۔

"جی ہاں۔"

"درست، درست۔ میری جانب سے تسلی رکھیں، بہترین رپورٹر لے کر آؤں گا۔ بدیع صاحب نے مجھے اِس اِدارے میں بھرتی کرایا تھا' میرے اُوپر اُن کا بہت احسان ہے، بلکہ میرے اُوپر اُن کا قرض ہے،" وہ دوبارہ آگے جھک کر سرگوشی میں بولا' "راز میر کیس میں اُن کو رگڑا دینے کا کوئی ٹوپ ہول نکلا ہے؟"

اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کل بات ہو گی بدر صاحب۔ آپ کا شکریہ، آپ نے میرے لئے وقت نکالا۔"

"نہیں صاحب، کیا بات کرتے ہیں، آپ کی ذات ہم سب کے لِئے فخر کا باعث ہے۔ آپ کے لئے سارا دِن حاضر ہے۔"

وہاں سے رخصت ہو کر اعجاز "بہ بانگ دُہل" کے دفتر کے نیچے بدیع الزمان کے دوست کی دکان پہ پہنچا۔ وہاں سے اُس نے دو ایک پریس رپورٹروں کو فون کیا جن سے اُس کا رابطہ رہ چکا تھا۔ پھر وہ واپس گھر آ گیا۔ رات کا کھانا اُس نے خاموشی سے کھایا۔ سکینہ نے اُس کا مزاج دیکھا تو خُود بھی چپ ہو رہی۔ کھانے کے بعد اعجاز نے نکّے پہ جا کر

کلی کی اور منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔
بتی جلا کر اُس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کرسی پہ بیٹھ کر وہ اُس بھاری مسودے کے
کاغذوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ تین چار مختلف جگہوں پہ اُس نے پنسل سے نشان لگائے۔ اس
کے بعد ایک دراز کھول کر دو فل سکیپ سادہ کاغذ اور فاؤنٹین پین نکالا۔ کاغذوں کو میز پر
جما کر اُس نے فاؤنٹین پین کھولا تو اُس میں روشنائی ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے دوبارہ دراز
کھول کر نیلی روشنائی کی شیشی نکالی تو وہ بھی خالی تھی، صرف اِس کے پیندے میں خشک سی
تہہ جمی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ فاؤنٹین پین استعمال کیے ہوئے اُسے کئی ماہ ہو چکے تھے۔
سارے دراز کھول کر اُس نے آگے پیچھے ہاتھ مارے مگر اُس وقت اُس کو کوئی اور قلم نہ
ملا۔ اُس نے دِل میں اپنے بیٹوں کو کوسا جو اُس کے قلم غائب کر دیا کرتے تھے۔ پنسل جو میز
پہ رکھی تھی اُس کا سکہ گھس چکا تھا۔ اعجاز نے جیبی چاقو سے پنسل تراشی تو جو سکہ اندر سے
برآمد ہوا وہ ٹوٹا ہوا نِکلا اور اُس کی انگلیوں سے پھسل کر زمین پہ جا گرا۔ اعجاز نے دوبارہ
پنسل تراشنی شروع کی۔ سنبھل سنبھل کر، نرمی سے چاقو کو لکڑی پہ چلاتے ہُوئے اعجاز کی
ناک میں تازہ تراشی ہُوئی گلابی لکڑی کی تیز چوبی بو چڑھی اور اُسے یاد آیا کہ کسی پنسل کو
تراشے ہوئے بھی اُسے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ کئی برس سے وہ لکھنے کا کام اب بال پوائنٹ
سے کیا کرتا تھا جو اِس وقت دستیاب نہیں تھا۔ اعجاز نے پنسل کو ناک کے قریب لا کر اُس
کی مانوس بو کو سونگھا اور کئی منٹ تک سونگھتا رہا۔ پھر اُس نے سکے کی نوک تراشی اور کاغذ
سیدھے کرکے، پنسل تھام کر، مسودے کے اندر سے وہ پُہلا پیرا نکالا جس پہ اُس نے نشان
لگا رکھا تھا۔ اُردو میں ترجمہ کرنے کی خاطر وہ دیر تک اُسے پڑھتا اور سوچتا رہا، پھر سادے
کاغذ پر آہستہ آہستہ لکھنے لگا۔ آدھی سطر لکھ کر اُس نے دوبارہ اُسے پڑھا اور پنسل ایک
طرف رکھ دی۔ عبارت گو واضح طور پہ پڑھی جا سکتی تھی مگر کسی وجہ سے اعجاز کی تسلی نہ
ہُوئی۔ اُسے کچھ ایسا احساس ہوا کہ پنسل کے عارضی اور مٹ جانے والے الفاظ اِس تحریر
کی حرمت کو زک پہنچاتے تھے، کہ جیسے پنسل کی لکھائی اِس عبارت کی توہین کر رہی ہو۔
چند منٹ تک سوچنے کے بعد وہ اُٹھا اور خالی دوات اُٹھا کر صحن مین نِکل گیا۔ نلکے پہ جا کر
اُس نے ایک بار اُسے چلایا اور اوک میں تھوڑا سا پانی بھر لیا۔ پھر اُس نے ہاتھ دوات کے
مُنہ پر رکھ کر انگلیاں ڈھیلی چھوڑیں تو پانی قطرہ قطرہ کرکے دوات میں گرنے لگا۔ دوات کی

تہ میں جمی ہُوئی ٹکڑیاں پانی میں حل ہونے لگیں۔ صحن اندھیرے میں تھا مگر بے چاند کی رات میں ستاروں کی روشنی اِتنی تھی کہ اعجاز دوات کو آسمان کے مقابل اُٹھا کر اُس کے اندر پانی کی سطح کو دیکھ سکتا تھا۔ جب اُس کے اندازے کے مطابق پانی کی مقدار پوری ہو گئی تو اعجاز قمیض کے دامن سے گیلا ہاتھ خشک کر کے دوات کو چھوٹے چھوٹے گول چکروں میں تیزی سے ہلاتا ہوا کمرے میں لوٹ آیا۔ فاؤنٹین پین بھر کر اُس نے پنسل سے لکھی ہُوئی آدھی سطر کو کاٹا اور نئی سطر لکھنی شروع کر دی۔ لفظ لفظ، سطر سطر کر کے ایک پیرا اُس نے چالیس منٹ میں ختم کیا، پھر دوبارہ اُسے پڑھ کر دو ایک لفظوں کو دُرست کیا۔ جب اس کی تسلی ہو چکی تو اُس نے تیزی سے ایک تیسری نظر اُس پہ دوڑائی۔ نیلی روشنائی میں اپنے اصلی رنگ کی شوخی اور گہرائی نہ رہی تھی، مگر اُس کی انمٹ خاصیت نے عبارت میں جو وزن پیدا کیا تھا اُس سے اعجاز کے دِل کو اِطمینان حاصل ہوا۔

مسودے کے کاغذات کو اُتھل پتھل کر اعجاز نے اگلا نشان زدہ پیرا نکالا۔ ترجمہ کرنے کے محاورے پر اب اُسے کچھ نہ کچھ عبور حاصل ہو چکا تھا۔ تاہم اگلے پیرے پر، جو قدرے طویل تھا، اعجاز کو ایک گھنٹے سے اُوپر وقت لگا۔ پھر اُس نے شُروع سے اُسے پڑھ کر کئی جگہ سے دُرست کیا۔ ایک ورق کے دونوں صفحات عبارت سے بھر چکے تھے۔ دوسرا ورق شروع کرنے سے پہلے اعجاز دم لینے کو رُکا۔ چند منٹ کے بعد مسودے کے اندر سے تیسرا پیرا نکال کر جب اُس نے نیا صفحہ شُروع کرنے کا ارادہ کیا تو دیر تک فاؤنٹین پین کو ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اُس نے سر کو ایسے انداز میں جنبش دی گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو، "کافی ہو گیا۔" اُس نے خالی ورق کو واپس دراز میں رکھا، عبارت والے ورق کو دُہرا چوہرا کر کے اپنے بٹوے میں داخل کیا، اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ساون کے موسم کا حبس لگا تھا۔ سکینہ پہلو پہ لیٹی تھی، اور دونوں لڑکے قمیضیں اُتارے اپنی اپنی چارپائیوں پہ سیدھے پڑے، گہری نیند سو رہے تھے۔ اعجاز نے میز سے مسودہ اکٹھا کر کے اُسے اُس کے تھیلے میں رکھا اور اُوپر مضبوطی سے گانٹھ دے کر تھیلے کا مُنہ باندھ دیا۔ اُسے لیے لیے وہ صحن میں آ کھڑا ہوا۔ چند منٹ تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اُس بوسیدہ سے کمرے میں داخل ہوا جہاں گیہوں کی بوریاں، دالوں اور چاول کے مٹکے، کپاس کی سوکھی سنٹھیاں اور رضائیوں کی پیٹی رکھی تھی۔ بھری ہُوئی بوریوں پر پیر رکھتا ہوا اعجاز لوہے کی پیٹی

پہ جا کھڑا ہوا۔ اُس کا سر چھت کی کڑیوں سے چھو رہا تھا۔ چھت میں اُسے اُس جگہ کا علم تھا جہاں دیمک نے کاٹ کاٹ کر سوراخ کر دیا تھا اور جس کو بعد میں ابابیلوں نے مزید کھلا کر کے اندر گھر بنا لیا تھا۔ ایک بار اعجاز نے اندر ہاتھ لے جا کر دیکھا تھا تو اُس کا سارا بازو سوراخ میں گھس گیا تھا۔ شام ہوتے ہی ابابیلیں بے پٹ کے دروازے اور کھڑکی کے رستے اندر باہر اُڑتی پھرتی تھیں۔ اعجاز نے تھیلا سوراخ کے مُنہ پہ رکھ کر ہلایا تو ایک ابابیل ہلکی ہلکی چیخیں مارتی ہُوئی پھڑپھڑا کر نکلی اور کمرے سے باہر اُڑ گئی۔ اعجاز نے مسودے کے تھیلے کو مروڑ کر گول کیا اور سوراخ میں داخل کر دیا۔ پھنسے ہُوئے تھیلے کو اُس نے ہاتھ سے دھکیلنا شروع کیا تو آخر وہ سارے کا سارا سوراخ کے اندر داخل ہو گیا۔ پیچھے جگہ کھلی تھی۔ ایک آخری دھکے سے تھیلا آسانی کے ساتھ اُس جگہ پہ جا کر بیٹھ گیا۔ ابابیلوں اور چوہوں کا رستہ روکنے کے لِئے اعجاز نے جھک کر منجھٹی کی چند ٹہنیاں توڑیں اور انہیں ہاتھ میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے سوراخ میں دھکیل دیا۔ دُوسری بار مزید منجھٹی توڑ کر سوراخ میں بھرنے کے بعد اعجاز کو اطمینان ہو گیا کہ اَب کوئی چھوٹا بڑا جانور اُس جگہ میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ نیچے اُتر آیا۔ کمرے کے نیم اندھیرے میں اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ باہر سے خالی سوراخ نظر آتا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر اعجاز نے بتی بجھائی اور دروازہ بند کیا۔ پھر وہ اپنی چارپائی پہ جا کر لیٹ گیا۔

وہ رات اعجاز نے سوتے جاگتے میں گزاری۔ کبھی گہری نیند میں خراٹے لینے لگتا، کبھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ صبح جب وہ اُٹھا تو اُس کے پٹھوں میں جگہ جگہ درد اُٹھ رہا تھا، جیسے میلوں چل کر آیا ہو۔ مگر نہانے اور ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو چوکس محسوس کرنے لگا۔ قریب ایک گھنٹے تک گھر میں اِدھر اُدھر پھرنے اور سکینہ اور لڑکوں سے باتیں کرنے کے بعد اُسے پھر نیند محسوس ہونے لگی۔ وہ جا کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ تین گھنٹے تک وہ وہاں پہ گہری نیند سویا رہا۔ جب اُٹھا تو اُس کا ذہن حیرت انگیز طور پر شفاف اور خاموش تھا، جیسے پت جھڑ کے موسم کی دوپہر ہو۔ دِن کا کھانا کھا کر وہ گھر سے نِکل گیا۔

جب اعجاز "بہ بانگ دہل" کے دفتر میں پہنچا تو سوائے شمس کے وہاں پہ کوئی موجود نہ تھا۔ شمس کو اطلاع ہو چکی تھی اور وہ دفتر میں صفائی کرا کے، چائے کا سامان تیار کئے بیٹھا تھا۔

اعجاز کرسی پہ جا بیٹھا۔ دفتر کی مخصوص، اخباری کاغذ اَور سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی بو اُس کی ناک میں داخل ہُوئی۔ اِس مانوس بو کو سونگھتے ہُوئے اعجاز نے بدیع الزماں کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کیا۔ شمس نے اُس کو چائے کی پیالی پیش کی۔ دو بج چکے تھے۔ ایک آدھ بات کرنے کے بعد دونوں آدمی خاموش ہو کر انتظار کرنے لگے۔ ڈھائی بجے خواجہ معراج آ پہنچا، جس کے ہمراہ شیخ سلیم تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے تین چار رپورٹر دفتر میں داخل ہُوئے۔ اُنہوں نے خواجہ معراج کو سر ہلا کر سلام کیا اور اعجاز سے گہری مانوسیت کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ اُن میں سے صرف ایک کو اعجاز شکل سے جانتا تھا، گو نام سے اُس کے بھی وہ واقف نہ تھا۔ اُن سب نے باری باری اعجاز سے مخاطب ہو کر اپنے اپنے اَور اخبار کے نام سے تعارف کرایا۔ شمس اُن کے لِئے چائے بنانے لگا تو خواجہ معراج ہاتھ اُٹھا کر بولا،

"ابھی کچھ اَور مہمان آنے والے ہیں۔ رُک جاؤ۔" اُس نے جیب سے ایک کاغذ کا پرچہ نکال کر اعجاز کو دیا۔ پھر وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں بات کرنے لگا۔ "یہ مختصر سا مضمون میں نے بنایا ہے، اِسے پڑھ لو۔ بس اِتنا ہی کہنا کافی ہے۔ البتہ تُم کچھ رسمی باتیں اضافی طور پہ کہنا چاہو تو کہہ دینا۔ مُجھے ایسی باتیں نہیں آتیں۔ اِسی لئے یہ ڈیوٹی تُمہیں دے رہا ہُوں۔"

اب مزید لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ روزنامہ "طلوع" سے ایک شخص بنام افضال احمد آیا، جس نے اپنا تعارف کراتے ہُوئے کہا کہ "ہمارے ایگزیکٹو ایڈیٹر بدر صاحب کو امریکن سفیر کی پریس کانفرنس میں جانا پڑ گیا۔ اُنہوں نے معذرت بھیجی ہے۔ میں اِسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں، اُنہوں نے مُجھے اَور محمد یاسین صاحب کو" وہ اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کر کے بولا، "بھیجا ہے۔"

اعجاز نے دونوں سے مصافحہ کیا۔ لوگ ایک ایک دو دو کر کے آتے جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ کھچا کھچ بھر گیا۔ اعجاز کو اندازہ تو تھا کہ اس قصے میں پریس کی غیر معمولی دلچسپی تھی، تاہم اُسے اتنے لوگوں کی آمد کی توقع نہ تھی۔ کرسیاں کم پڑ گئیں۔ کچھ لوگ میز کے کونوں پہ بیٹھ گئے، باقیوں نے فرش پہ بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اعجاز نے معذرت کی تو سب بولے، "کوئی بات نہیں اعجاز صاحب۔ فکر نہ کریں۔" افضال احمد نے

اجازت لے کر سگریٹ سلگا لیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی آدھے سے زیادہ لوگوں نے اپنے
اپنے، یا دُوسروں سے مانگ کر سگریٹ جلائے۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ خواجہ معراج نے
ہوا میں ہاتھ سے پنکھا ہلاتے ہُوئے شمس کو کھڑکی کھولنے اور اُسی اِشارے سے چائے پیش
کرنے کو کہا۔ پیالیاں صرف آٹھ تھیں، جس جس کو ملیں وہ اُٹھا کر پینے لگا۔ اعجاز نے ایک
بار پھر معذرت کی تو کرسی پہ بیٹھا ایک نوجوان چائے کی سرکی لیتے ہوئے بولا
"یہ تو اپنی قسمت کی بات ہے جناب۔"
میز کے کونے پہ بیٹھا ہوا دُوسرا نوجوان بولا، "جی ہاں یہ سب کرسی اور چائے کا قِصّہ
ہی تو ہے جناب۔ اِسی سے قسمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔"
سب لوگ ہنس پڑے، سوائے خواجہ معراج کے، جس کے چہرے سے بیتابی کے
اثرات ظاہر تھے۔ آخر اُس نے اعجاز کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر کاروائی کی اِبتدا کرنے کا اشارہ
دیا۔ اعجاز کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔
"حضرات،" اُس نے کہنا شُروع کیا، "میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ یہاں
تشریف لائے ہیں۔ ہم ایک پریس نوٹ بھی جاری کر سکتے تھے، مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ
لوگوں کو یہاں آنے کی تکلیف دی جائے، کیونکہ جو باتیں میں کہنا چاہتا ہوں اُن کا اِس ملک
کے سارے عوام کے ساتھ اخلاقی، سیاسی اور آپ لوگوں کے ساتھ براہ راست پیشہ ورانہ
تعلق ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج اِس دفتر میں ہم لوگوں کی
موجودگی کے باوجود یہ کمرہ، "بہ بانگ دہل" کی مختصر زندگی کے روحِ رواں برادرم بدیع
الزمان کی غیر موجودگی میں قطعی طور پر ایک بے آب و گیاہ ریگستان معلوم ہو رہا ہے۔
کھڑکیاں کھلی ہیں مگر سانس گلے میں اٹکتی ہے، کیونکہ ہماری رگوں میں آکسیجن پہنچانے والا
شخص ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ مگر اللہ کے کاموں کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ اِس
سے پیشتر کہ میں اُس آدمی کی ودیعت کی ہُوئی شے، یعنی "بہ بانگ دہل" کے بارے میں
کچھ عرض کروں، میں آپ لوگوں کی اجازت سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔
"جنابِ عالی، میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ آپ اگر اِس معاشرے کے سب
سے زیادہ عقلمند لوگ نہیں ہیں،" اعجاز ایک لحظے کو رُکا۔ سامعین کے درمیان ہلکی ہنسی کی
آواز پیدا ہُوئی، "تو کم از کم سب سے زیادہ باخبر لوگ ضرور ہیں۔ چنانچہ آپ کو خبر ہو گی کہ

ربع صدی سے اُوپر کا عرصہ گزُر چکا ہے، اور یہ ملک افواہوں پہ چل رہا ہے۔ ہمارے اخباروں کا یہ حال ہے کہ کبھی کوئی اصل خبر نہیں چھپتی، بلکہ مختلف لوگوں کے اُلٹے سیدھے بیان چھاپ دیئے جاتے ہیں۔ اگر کبھی کبھار کوئی اصل خبر نِکلتی بھی ہے تو اِس کا اجراء نامعلوم یا جعلی ذرائع کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے، اِسی طرح وہ ایک افواہ کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ افواہوں کی شروعات کہاں سے ہُوئی؟ اُس وقت سے جب یہ ملک وجود میں آیا۔ ہمارے پہلے وزیرِ اعظم کے قتل سے لے کر دو جنگوں، دو مارشل لاؤں، سیاست کی متفرق قلابازیوں سے لے کر تیسری جنگ تک، ہمارے علم میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، کس نے کیا کیا، کیا فیصلے ہُوئے اور کس وجہ سے ہُوئے اور اُن کے نتیجے کے طور پر جو مصیبتیں ہم پہ نازل ہُوئیں ان کا ذمہ دار کون تھا؟ ہمارا یہ ملک تباہ کن ادوار میں سے گزُرا ہے، مگر ظلم خُدا کا کہ ہمیں کچھ بتایا نہیں گیا۔ ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اِدھر سے ایک افواہ آتی ہے، ہم اُس پہ اعتبار کرلیتے ہیں۔ دُوسری طرف سے افواہ آتی ہے تو ہم پہلی کو چھوڑ کر دُوسری پہ اعتبار کر لیتے ہیں۔ ہمارا ہر کسی پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ سچ کی عدم موجودگی میں ہمارے دماغوں کے اندر سے ایک ایسی دھند چھا چکی ہے کہ ہماری نظر چند قدم تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس دھند میں سے ظاہر ہوتا ہوا جو کوئی بھی ہمیں دِکھائی دیتا ہے ہم اُس کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ کیا نِکلا ہے؟ اِس کا منطقی نتیجہ یہ رو پذیر ہوا ہے کہ سارے معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے ساتھ اِس طور سے دغے پر دغا ہوا ہے کہ ہمیں کچھ علم نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ہمارے دِلوں میں اندیشوں نے گھر کرلیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں وَیسا نہ ہو جائے، اور جو ہو گا وہ ہمارے اختیار سے باہر ہو گا، کیونکہ ہم لاعلم رہیں گے۔ ہم مستقل دغے کی توقع کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ اِس عدم تحفظ کا کیا نتیجہ سامنے آیا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نِکلا کہ ہمارے دِلوں کے اِرادے تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے اندر سے ایک قدرتی خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ جو کچھ سمیٹا جا سکتا ہے آج ہی سمیٹ لیا جائے۔ یعنی بقولِ شاعر، کل کی خبر نہیں، اس لئے سو برس کا سامان آج ہی بنا لیا جائے۔ اِس کے علاوہ عدم تحفظ کا ایک اَور شاخسانہ بھی نِکلا ہے۔ سارے کا سارا معاشرہ ایک ان دیکھے خطرے کے احساس میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اندر کے خطرے کا خدشہ، باہر کے

خطرے کا خدشہ- اجتماعی خطرے کی جگہ انفرادی خطرے کے شبہات نے جنم لے لیا ہے۔
ہر کوئی اپنے تحفظ کے لِئے دوسرے پر حملہ کرنے کو تیار بیٹھا ہے اور ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ہر ایک معاملے میں، خواہ وہ گھر کا ہو خواہ باہر کا، خواہ روزمرہ کا ہو خواہ دور ازکار ہو، ہر ایک انسانی تعلق کے اندر صبر کا دامن ہاتھ سے چھٹ گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نزع کا عالم ہے اور زندگی کے لِئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، مگر کوئی سہارا نہیں ملتا۔ یہ زنجیر ہے اُس زہریلے چکر کی جس کی تفصیل میں نے بیان کی ہے۔ ہم گردش کر رہے ہیں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ کس وجہ سے دِکھائی نہیں دیتا؟ کیونکہ اندر اور باہر اندھیرا ہے۔ یہ تاریکی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ کیونکہ ہمیں آگہی مہیا نہیں کی گئی۔ اور یہ وہ جڑ ہے جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی۔ میں نے آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کو کوئی "خبر" مہیا نہیں کی جس کی تلاش میں آپ یہاں تشریف لائے ہیں، بلکہ ایک لمبی چوڑی بات کر کے آپ کی سامع خراشی کی ہے۔"

"نہیں نہیں، اعجاز صاحب، بالکل نہیں،" سامعین سے کئی آوازیں آئیں۔ "کہیئے کہیئے۔ فرمایئے۔"

"یہ لمبی بات میں نے اِس لِئے آپ کے آگے کی ہے کہ آپ اِس کے پاسدار ہیں۔ اور اگر پاسداری کرنے میں کچھ تکلیفیں آئیں جو آپ کی قوت برداشت سے باہر ہوں تو پھر کم از کم آپ ایک گواہ کی حیثیت سے تو زندہ رہیں گے۔"

"جی بالکل، دُرست فرمایا،" چند آوازیں اُٹھیں۔

"یہ بھی کافی ہے،" اعجاز نے کہا۔

"صرف گواہ کی حیثیت سے کیوں جناب، ہم سب کچھ کریں گے،" ایک منچلا بولا۔

خواجہ معراج کے حلیئے سے اب بے چینی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ حرکت میں تھے۔ کبھی وہ سامنے میز پر رکھے کاغذات کو اُلٹتا پلٹتا، کبھی جیب سے کوئی پرزہ نکال کر اُسے پڑھتا اور دوبارہ جیب میں رکھ لیتا۔ پھر چشمہ اُتار کر اُسے منہ کی بھاپ دیتا اور شیشے صاف کرتا، اُس کے بعد اپنی چائے کی پیالی میں بے وجہ چمچہ ہلانے لگتا۔ وہ بیتابی سے اعجاز کی بات ختم ہونے کے اِنتظار میں تھا اور بار بار اُس کی جانب دیکھتا اور پھر کلائی کی

گھڑی پہ نگاہ ڈالتا جا رہا تھا، جیسے کہ اُس کی دانست میں اعجاز اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہو۔ مگر وہ سامعین کی گہری دلچسپی کے باعث اعجاز کو روکنے سے قاصر تھا۔

"ابھی تک میں نے آگہی کے بارے میں محض زبانی کلامی بات کی ہے،" اعجاز نے بولنا شروع کیا۔

"آگہی شاگہی چھوڑو ملک جی،" سب سے پیچھے زمین پہ بیٹھا ہوا ایک شخص سر اٹھا کر بولا۔ "سیدھی بات کرو کہ حکومتیں سچی سچی بات بتایا کریں۔"

اعجاز نے ایک لمحے کو رُک کر اُسے دیکھا۔ وہ اُس نوجوان سے واقف تھا، جو نور پور کا رہنے والا تھا اَور ہر پند ہواڑے ایک بڑے سے کاغذ کے شیٹ پر ہاتھ سے لکھ کر اَور پچاس ساٹھ فوٹو کاپیاں بنوا کر، "نور پور گزٹ" کے نام سے تقسیم کیا کرتا تھا، جس میں چھوٹی موٹی مقامی مقدمہ بازیوں، پانی کے تنازعوں، شادی بیاہ اَور فوتیدگیوں اور دیہی حکام کے دَوروں کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا نام فرخ غوری تھا۔ اُس کی تعلیم شاید میٹرک بھی نہ تھی، جو اُس کی غلط سلط تحریر سے ظاہر ہوتی تھی۔ مگر اُس کے شعور کی سطح اُسکی رسمی تعلیم سے اُونچی تھی۔ ماضی میں ایک آدھ بار اعجاز نے سوچا بھی تھا کہ اگر وہ ٹریڈیونین کے پیشے میں لگا رہتا تو فرخ غوری تنظیم کے کام میں مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اِس وقت فرخ غوری کی بات سن کر اعجاز کے اندر احساس کی ایک نئی تہہ نمودار ہوئی۔۔۔۔ کہ وہ بات تو عام غریب اَور نادار لوگوں کی قوم کے بارے میں کر رہا تھا، مگر الفاظ مخاطبین کی سطح کے برابر استعمال کرتا جا رہا تھا۔ اِس دُوئی نے اعجاز کے اندر ہلچل سی پیدا کر دی۔ چند لمحوں کے لئے رُک کر اُس نے دوبارہ بات کرنے کو اپنے خیالات مجتمع کئے۔ "فرخ،" وہ بولا، "تم دُرست کہتے ہو۔ آخر آگہی کا مطلب ایک ہی تو ہے، یعنی سچی بات۔ اب میں تمھیں ایک سچی بات سناتا ہوں۔ ہمارے ملک پر ایک انتہائی تباہ کن حادثہ گزر چکا ہے۔ مجھے اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ سب کو اِس کا علم ہے۔ اس کے بارے میں ایک چیف جسٹس کی سربراہی میں اِنکوائیری ہوئی تھی جس کی ہزاروں صفحوں پر مشتمل رپورٹ تیار کی گئی ہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح اُسے بھی باہر کی ہوا لگنے نہیں دی گئی۔ میں اُس میں سے ایک چھوٹا سا حصہ پڑھ کر آپ کو سنانا چاہتا ہوں، جو مجھے بھی فقط حادثاتی طور پر دستیاب ہوا ہے۔ میں جب آپ کے روبرو اِسے پڑھونگا تو آپ کو خود بخود علم ہو جائے گا کہ یہ کس

واقعہ کے بارے میں ہے۔"

سامعین میں اچانک آوازوں اور بدنوں کی حرکت پیدا ہوئی۔ کمرے میں بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ پھر فوراً ہی یکسر خاموشی چھا گئی اور تمام رپورٹر اپنے قلم روک کر سننے کو تیار بیٹھ گئے۔ خواجہ معراج اب اعجاز کو ایسی نظروں سے ایک تار دیکھے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اعجاز اُس کی نظروں سے بے خبر، جیب سے ایک فل سکیپ کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔ ابھی اُس نے ایک دو لفظ ہی بولے تھے کہ خواجہ معراج کا صبر جواب دے گیا۔ وہ اُچک کر اپنی کرسی سے اُٹھا اور اعجاز کے ہاتھ سے کاغذ چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے سارا خُون نچڑ گیا ہو۔ اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل رہی تھی، صرف اُس کے ہاتھ چل رہے تھے۔ کمرے میں جتنے لوگ تھے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب کم و بیش نوجوان رپورٹر تھے، مگر اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ وہ خاموش کھڑے خواجہ معراج اور اعجاز کی ہاتھا پائی کو دیکھ رہے تھے۔ صرف بیچ بیچ میں آوازیں اُٹھ رہی تھیں،

"ارے، ارے، بھئی کیا، یہ کیا، جناب، بات کریں، چھوڑیں-----"

اعجاز نے پہلے بازو لمبا کر کے اپنا کاغذ خواجہ معراج کی پہنچ سے دور ہٹایا اور اُسے روکنے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ رُکا تو اعجاز نے دُوسرے ہاتھ کے ساتھ سختی سے اُسے پرے کیا۔ خواجہ معراج دھپ سے کرسی پہ یوں گرا کہ جیسے قاعدے سے بیٹھ گیا ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے میں وہ میکانکی طور پر اُٹھا اور اپنی کاروائی دوبارہ شُروع کرنے ہی والا تھا کہ ناکامی کے امکان کو دیکھ کر رُک گیا۔ اُس نے جھک کر میز سے اپنا کاغذ اُٹھایا اور لرزتی ہُوئی آواز میں بولا،

"آپ صاحبان کو یہ فالتو باتیں سنانے کے لیے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اصل مقصد یہ اعلان کرنا تھا جو میں اب اِس ادارے کے لیگل ایڈوائیزر کی حیثیت سے کرتا ہُوں۔ اور یہ نوٹ کیجیے،" وہ ہوا میں اُنگلی اُٹھا کر بولا، "کہ میں اپنی اِس حیثیت میں ادارے کی جانب سے یہ اعلان کرنے کا مکمل حقدار ہُوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑے ہُوئے کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ "ادارہ بنام رحمانیہ پبلی کیشنز اور اس کے زیرِ اہتمام و ملکیت چھپنے والا ہفت روزہ اخبار

بنام بانگ دُہل، ناگزیر وجوہات کی بنا پر، جن میں ادارے کے ایڈیٹر و پروپرائیٹر کی ناگہانی وفات شامل ہے، ہر کاروباری و اشاعتی مقصد کے ضمن میں حتمی طور پر بند کیا جاتا ہے۔ ادارے کے ٹائیٹل میں دو بنک اکاؤنٹ ہیں جن کے اندر معمولی رقم کی تفصیل ادارے کے اکاؤنٹنٹ کے پاس موجود ہے۔ اِس بارے میں ملکی قوانین کے مطابق بقیہ اَور مزید کارروائی کی جا رہی ہے۔ اخبار کے ڈیکلیریشن کے رکھنے، بیچنے یا سرنڈر کرنے کے بارے میں فیصلہ حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ میں ادارے کی جانب سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اخبار "بہ بانگ دہل" کے دورِ اشاعت میں اگر کسی شائع شدہ مواد سے کسی شخص یا ادارے کو شکایت کا موقع ملا ہے تو ادارہ اِس کے لیے معذرت خواہ ہے۔"

اعلان ختم کر کے خواجہ معراج نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"آپ لوگوں کی آمد کا بہت بہت شکریہ،" وہ بولا۔ "اب آپ لوگ ہماری جانب سے فارغ ہیں۔"

کوئی رپورٹر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ وہ سب آنکھیں پھاڑے خواجہ معراج کو دیکھ رہے تھے۔ خواجہ معراج ٹکٹکی باندھے اُنھیں دیکھتا رہا۔ "خدا حافظ" اُس نے چند لمحوں کے بعد کہا، گویا اُنھیں اپنی نظروں سے زیر کر کے پسپا ہونے پر مجبور کر رہا ہو۔

چند لمحے مزید خاموشی رہی۔ پھر سامعین میں سے ایک بولا، "خدا حافظ۔"

سب اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھے گئے۔ خواجہ معراج صورتِ حال کو تاڑ گیا۔

"تو ٹھیک ہے،" وہ بولا۔ "جو جی چاہے کرو۔ مگر میں یہ اعلانیہ کہتا ہوں کہ جو بیان میں نے پڑھ کر سنایا ہے اُس کے علاوہ کسی معاملے سے میرا کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہاں پہ جو کچھ مزید کارروائی ہوئی ہے، یا ہو گی، اُس سے میں اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیتا ہوں اَور اِس کے بارے میں ہر کسی ذمہ داری سے، گواہان کی موجودگی میں، دستبردار ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ مہربانی فرما کر یہ لکھ لیں۔" خواجہ معراج پلٹا اَور شیخ سلیم کو اشارہ کر کے بولا، "چلو۔"

شیخ سلیم اُٹھ کر اُس کے پیچھے ہولیا۔ ہجوم کے بیچ پھنس پھنسا کر گزرتے ہوئے وہ دونوں دروازے تک پہنچے۔ وہاں پہ خواجہ معراج ایک بار پھر پلٹ کر بولا، "درحقیقت اب آپ میں سے کسی کو بھی یہاں موجود رہنے کا حق نہیں۔ میں چاہوں تو اِس دفتر کو سیل کروا

سکتا ہوں۔"

"جاؤ جی وکیل صاحب،" فرخ غوری بولا، "سیل کروانے کا بندوبست کرو۔ اِتنی دیر میں ہم ملک اعجاز کی بات سن لیں گے۔"

چند لوگ ہنس پڑے۔ خواجہ معراج غصے کی حالت میں دہلیز پار کرتے ہوئے پیر اٹکنے سے لڑکھڑا گیا۔ شیخ سلیم نے اُسے دونوں جانب سے پکڑ کر سہارا دیا۔ دونوں سیڑھیاں اُتر گئے۔

اعجاز کچھ دیر تک اپنا کاغذ ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر عقب سے فرخ غوری کی آواز آئی،

"چلو جی، وکیل صاب سے تو خلاصی ہوئی۔ ملک اعجاز، اب اگلی بات سناؤ۔"

"اِس سے پہلے،" ایک اَور آواز آئی، "کہ دفتر سیل کرنے کے لیے داروغہ جی آ جائیں۔"

سب ہنس پڑے۔ ماحول کا سکوت کچھ ٹوٹا تو اعجاز اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اَور کاغذ سامنے رکھ کر پڑھنے لگا۔

"پاکستان کے دو ٹکڑے کیونکر ہوئے؟ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی بنا پر پاکستانی فوج کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دینے پڑے؟

اِن وجوہات کا تعین کرنے کی خاطر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے سمیت تین اعلیٰ ترین ججوں پر مشتمل ایک کمیشن آف انکوائری مقرر کی گئی۔ اپنی تفتیش اَور تحقیق کے نتیجے کے طور پر کمیشن اِس فیصلے پر پہنچی کہ یہ محض ایک عسکری شکست نہ تھی بلکہ ایک عظیم سیاسی اَور اخلاقی ہار تھی۔ دو مارشل لاؤں کے دوران پاکستان کے فوجی حکمران اخلاقی طور پہ اِس قدر گر چکے تھے اَور اتنے بدعنوان ہو چکے تھے کہ اُن میں جنگ لڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔

کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹ اُس وقت شروع ہوئی جب سینئر افسران اُنیس سو اٹھاون کے مارشل لاء کی اِنتظامیہ میں ملوث ہوگئے۔ اِس صورتِ حال نے اُس وقت اِنتہائی شکل اختیار کر لی جب مارچ اُنیس سو اُنہتر میں جنرل یحییٰ خان نے دُوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا۔ کمیشن کی رائے میں مشرقی پاکستان کے اندر حالات اُس وقت سنگین

نوعیت اختیار کر گئے جب پچیس مارچ کو یحییٰ خان نے وہاں ملٹری ایکشن شروع کر دیا۔

(•) محمد اشرف نے، جو اُس وقت ڈھاکہ کا ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھا، کمیشن کو بیان دیتے ہوئے کہا: "مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے ہی ملک کے اندر اجنبی بنا دیئے گئے تھے۔"

(•) بریگیڈیئر اقبال الرحمٰن شریف نے کمیشن کو بیان دیتے ہوئے کہا: "جنرل گل حسن اپنے جوانوں سے پوچھا کرتا تھا، تم نے کتنے لوکل آدمی مارے ہیں؟"

(•) ایک اَور گواہ نے کمیشن کو بیان دیا: "لفٹننٹ جنرل اے۔کے۔نیازی نے کمانڈر، مشرقی پاکستان، کا عہدہ سنبھالتے ہی ماتحت فوجیوں سے کہا: "یہ دشمن کا علاقہ ہے۔ جو اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ برما میں ہم یہی کیا کرتے تھے۔"

(•) کمیشن کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ میجر جنرل نذر حسین شاہ، جی۔او۔سی ۱۶ ڈویژن، میجر جنرل اے۔ ایچ۔انصاری، جی۔او۔سی۔ ۹ ڈویژن، اور بریگیڈیئر باقر صدیقی، چیف آف سٹاف، ایسٹرن کمانڈ، نے کمیشن کے روبرو اپنے بیانات میں انکشاف کیا کہ سات سینئر افسران اَور اُن کی یونٹیں وسیع پیمانے پر لوٹ مار میں ملوث تھے۔ اِس لوٹ مار میں نیشنل بنک کی سراج گنج برانچ سے ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے کی چوری بھی شامل تھی۔ اِن سات افسران میں ایک بریگیڈیئر چار لفٹننٹ کرنل اَور ایک میجر شریک تھا۔ اُن کے نام، جو کمیشن کی رپورٹ میں شامل ہیں، یہ ہیں:۔۔۔۔۔"

اعجاز پڑھتا جا رہا تھا اَور سننے والوں کے قلم تھم چکے تھے۔ وہ لکھنا لکھانا بھول کر منہ اٹھائے، آنکھیں پھاڑے، اعجاز کو دیکھ رہے تھے، جیسے کہ اُن کی تمام تر قوت کانوں اَور آنکھوں میں مجتمع ہو چکی ہو۔

"کمیشن کی رپورٹ میں،" اعجاز کہہ رہا تھا، "مندرجہ ذیل سفارشات شامل ہیں:"

۱۔ کہ جنرل یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید خان، لفٹننٹ جنرل ایس۔جی۔ایم پیرزادہ، میجر جنرل عمر، لفٹننٹ جنرل گل حسن، اَور میجر جنرل مٹھا نے آپس میں مجرمانہ سازش کر کے پچیس مارچ اُنیس سو اُنہتر کو فیلڈ مارشل ایوب خان سے غیر قانونی طور پر اِقتدار چھینا تاکہ اِقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کیا جائے اَور اگر اِس مقصد کے لئے طاقت استعمال کرنی پڑے تو وہ بھی کی جائے۔ اِس حرکت کے بدلے مذکورہ افسران پر کھلا مقدمہ چلایا جائے۔ علاوہ ازیں، اپنے مشترکہ مقصد کے حصول کی خاطر افسران کا

یہ گروہ دھمکی اَور لالچ کے ملے جلے حربے کو استعمال کر کے سیاسی جماعتوں پر اثرانداز ہوا تاکہ انتخابات کا نتیجہ اُن کی مرضی کے مطابق بر آمد ہو۔ بعد ازاں یہی حربے استعمال کر کے مذکورہ افسران کے گروہ نے سیاسی جماعتوں کو مجبور کیا کہ وہ تین مارچ، اُنیس سو اکہتر کو نیشنل اسمبلی کے ڈھاکہ اجلاس میں شریک نہ ہوں۔ اِس کے علاوہ آپس میں مشترکہ فیصلہ کر کے مشرقی پاکستان میں اَیسے حالات پیدا کئے جو وہاں پر سول نافرمانی کی تحریک کے موجب بنے۔ اِن افسران پر کھلا مقدمہ چلا جائے۔

۲۔ مشرقی اَور مغربی پاکستان کے اندر اپنے جنگی فرائض میں مجرمانہ کوتاہی برتنے پر ان افسران پر یا کھلا مقدمہ چلایا جائے یا کورٹ مارشل کیا جائے۔

۳۔ کہ ایک اعلیٰ اختیاری کورٹ آف انکوائیری قائم کی جائے جو اُس دور کے مشرقی پاکستان کے حالات کی تفتیش کرے، اَور اِس کورٹ کی تمام تر کاروائی کا کھلا اعلان کیا جائے، تاکہ اپنے قومی ضمیر کو مطمئن کیا جا سکے۔

۴۔

کہ اِن حالات کی ڈیپارٹمنٹل انکوائیری کی جائے جن میں کہ میجر جنرل رحیم خان، جو آج کل پاکستان فوج کے چیف آف جنرل سٹاف ہیں، اَور جو کہ مشرقی پاکستان میں اپنے زیرِ کمان ۳۹ ایڈہاک ڈویژن کی فوج کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، کیسے اور کیونکر، کسی ڈی بریفنگ یا انکوائیری کے بغیر، اپنے موجودہ اعلیٰ عہدے پر فائض کئے گئے ہیں۔

۵۔ کہ اِسی طرح ڈیپارٹمنٹل انکوائیری پاکستان نیوی کے کمانڈر گل زرین کے بارے میں کی جائے جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ احکامات کے بغیر، کھلنا نیول بیس سے اپنے جہاز پی۔این۔ایس۔ تیمور کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

۶۔ کہ اسی طرح کی ڈیپارٹمنٹل انکوائریاں مندرجہ ذیل افسران کے بارے میں کی جائیں:

لفٹنٹ جنرل اِرشاد احمد خان، کمانڈر ۱ کور

میجر جنرل عابد زاہد، جی۔او۔سی۔ ۱۵ ڈویژن۔

میجر جنرل بی۔ایم مصطفیٰ، جی۔او۔سی۔ ۱۸ دویژن۔

۷۔ کہ مذکورہ افسران کو محض ریٹائر کر دینا کافی نہیں ہے۔ اگر ان پر اپنے فرائض میں مجرمانہ کوتاہی برتنے یا بزدلی دکھانے کا الزام ثابت ہو جائے تو ان پر مقدمہ چلا کر سزا دی جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اعجاز نے اپنا کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا، مگر یوں لگتا تھا جیسے وہاں پہ کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ ایک ہو کا عالم تھا۔ کسی جانب سے سانس کی آواز تک نہ آ رہی تھی۔ "یہ تو رہے اعلیٰ افسران" اعجاز نے کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ کیا ایک معمولی سپاہی کو بھی عدالت کے سامنے لایا گیا ہے؟ کیا اِس سانحے کا سارا بوجھ ہم کروڑوں غریب لوگوں پر ہی ڈال دیا گیا ہے، جو اِس کی جکڑ سے آج تک آزاد نہیں ہو پائے اور اندھیرے کے گہرے غار میں بتدریج گرتے ہی چلے جا رہے ہیں؟ خدارا کوئی آؤ اور ہمیں اِس قید سے آزاد کرو! کہا جاتا ہے کہ اگر کمیشن کی رپورٹ کو منظرِعام پر لا کر اِس پر عمل درآمد ہوتا تو فوجی جوانوں کے مورال پر برا اثر پڑ سکتا تھا۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو ایسا سوچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا سچ بولنے سے مورال ڈاؤن ہوتا ہے یا کہ جھوٹ کے پردے ڈالنے سے ہوتا ہے۔"

سچ بولنے سے تو ساکھ بحال ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اعجاز اپنی رو میں بولتا چلا گیا۔

باب 20

حیدر آباد چھاؤنی میں اپنے دفتر کے اندر سرفراز نے ایک ٹیلیفون سنا۔ اُس کے پاس اُس وقت چند جونیئر افسر بیٹھے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر سرفراز نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا تو ساتھ ہی وہ کرسی سے قریب قریب آدھا اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے نیچے سے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ پھر اُس نے فون میں کہا، "ایک منٹ" اور ریسور کو دوسرے ہاتھ سے ڈھانپ کر سامنے بیٹھے ہوئے افسروں کو سر کی ہلکی سی جنبش سے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "سوری،" وہ اُن سے بولا۔ کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے لوگوں نے اشارہ سمجھ کر جلدی سے اپنے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات اُٹھائے۔ خاموشی سے اُٹھ کر وہ کمرے سے چل دیے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک صوبیدار صاحب، جو سرفراز کی بغل کی جانب ایک فائل ہاتھ میں اُٹھائے کھڑے تھے، کمرے سے نکل گئے۔ سرفراز نے نہایت آہستگی سے ریسیور میز پہ رکھا اور جلدی سے جا کر دفتر کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ بھاگ کر آیا اور سرعت سے ریسیور اُٹھا کر بولا۔ "ہیلو، ہیلو؟ ----- کہاں سے بول رہی ہو؟ ---- تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟----- ہاں ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟---- تم نے فون کیوں نہیں کیا؟---- میں نے؟ میں تو ہر روز تمہیں فون کرتا رہا ہوں۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟--- جھوٹ مت بولو۔ تمہارے نوکر نے کہا تم اپنے گاؤں گئی ہوئی ہو---- کون؟---- تمہارے والد؟ اوہو، آئی ایم سوری۔ اب وہ کیسے ہیں؟---- ٹھیک ہیں؟---- مگر ظالم، مجھ سے کانٹیکٹ تو کیا ہوتا۔ میں تو پاگل ہو رہا تھا، بلکہ ابھی تک ہو رہا ہوں، یہ سوچ سوچ کر کہ اب تم مجھ سے کبھی نہیں ملوگی---- کیا بات ہے، تمہاری ہنسی کہاں گئی، تم تو میری ایسی باتوں پہ ہنسا کرتی تھیں، خاموش کیوں ہو؟---- نہیں ہو؟---- غلط، تمہاری تو آواز میں ہی خاموشی بھری ہوئی ہے----- امتحان، اچھے نہیں ہوئے؟---- آئی ایم سوری۔ چلو فکر کی کیا بات ہے، اگلے برس سہی---- ہاں یہ بات تو ہے، ساتھ والے آگے نکل جائیں گے۔ مگر ایسی بھی کیا بات ہے، تم ابھی اوورایج نہیں ہوئیں---- سوری، میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں تم سے مذاق

کرونگا؟---- ہیں؟ بھئی اتنی جلدی بھی کیا ہے، اتنی مدت کے بعد تمہاری آواز سنی ہے، میرے تو جسم میں جان پڑ گئی ہے----- کیا کہا؟---- اونہوں، جھوٹ بولوں تو کافر---- ہیں؟---- چلو غدار سہی، جھوٹ بولوں تو غدار۔ جب سے تم غائب ہوئی ہو میں مُردوں کی طرح زمین پہ چل پھر رہا ہوں---- کیا؟---- تمہیں یقین نہیں آ رہا؟ کیوں نہیں آ رہا؟---- ڈیوٹی؟ بھئی ڈیوٹی دینا تو ایک نوکری ہے، عادتاً بھی چلتی رہتی ہے۔ تم نے اپنے سول کے دفتروں میں نہیں دیکھا، سب مُردے بیٹھے ڈیوٹیاں دے رہے ہوتے ہیں---- اونہوں، مذاق نہیں کر رہا۔ اب میرے اندر صرف ڈیوٹی کرنے کی جان رہ گئی ہے، باقی تمہارے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی---- اب؟ اب ساری جان واپس آ گئی ہے---- ہاں، کیوں نہیں، اب میں اکیلا ہندوستان کو فتح کر سکتا ہوں---- ہنسومت، دیکھ لینا، ایک دن دکھا دوں گا، بس تمہارا ساتھ چاہئے---- بھئی ابھی مت جاؤ، کچھ دیر رُک جاؤ---- اچھا فون رکھو، میں تمہیں رِنگ کرتا ہوں---- کیا؟ گھر پر نہیں ہو؟ کہاں پر ہو، نمبر دو، میں فون کرتا ہوں---- کیوں، کیوں نہیں کر سکتا؟---- ہاں، سن رہا ہوں، کیا بات ہے؟---- بھئی کہا تو ہے سن رہا ہوں---- اچھا؟ کیا ضرورت ہے؟---- تمہاری سہیلی کو ہے؟---- کتنے چاہئیں؟---- ٹھیک ہے، بھیج دیتا ہوں---- ہاں ہاں، آج ہی بھیجتا ہوں---- کیا کہا؟ تمہیں نہ بھیجوں؟---- پھر کس پتے پر بھیجوں؟---- ٹھیک ہے، لکھوا دو۔ شہلا رضوی، گلی لوہاراں، رنگ محل---- ہاں ہاں، مگر دیکھو، ایک بجنے والا ہے، بنک اگر بند نہیں ہو گئے تو آج ہی ورنہ کل صبح سویرے---- بھئی میں نے کبھی جھوٹا وعدہ کیا ہے؟ جھوٹے وعدے کرنے میں تم ماہر ہو---- ٹھیک ہے، ابھی آزما لیتا ہوں، مجھے فون کرو گی---- کب؟---- کل؟ ٹھیک ہے، چار بجے کرنا، میرے کمرے میں کرنا---- وعدہ؟ پکا وعدہ؟---- میں انتظار کرونگا---- اچھا ٹھہرو ٹھہرو، ایک ضروری بات پوچھنا تو بھول ہی گیا، تم مجھے اسی طرح پیار کرتی ہو نا؟---- ہیلو---- ڈیم!"

سرفراز نے رسیور واپس رکھ دیا۔ ایک منٹ تک وہ اُسی طرح بے حرکت بیٹھا، ہونٹوں پہ حیرت زدہ مسکراہٹ لئے سامنے دیوار کو دیکھتا رہا۔ پھر جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو، اُس نے تیز تیز میز کے دراز کھولے اور بند کئے، ایک میں سے چیک بک نکالی اور گھنٹی

دے کر اپنے باوردی ڈرائیور کو بلایا۔

"جلدی سے یہ چیک لے جاؤ ریاض۔ اِسے کیش کرا کے ڈاکخانے جاؤ اور یہ ایڈریس ہے، اِس پر منی آرڈر کر دو۔"

"سر منی آرڈر کی فیس اِن پیسوں سے ادا کر دوں؟"

"نہیں نہیں، یہ لو تیس روپے ہیں، اِن میں ایکسپریس منی آرڈر کی فیس پوری ہو جائے گی۔ ایکسپریس کرنا۔ مگر جلدی کا کام ہے ریاض، دس منٹ ہیں بنک بند ہونے میں----"

"سر چار منٹ کا راستہ ہے۔ سیدھا جا رہا ہوں۔"

"ہاں۔ یہ کام آج ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"ڈرائیور کے جانے کے بعد سرفراز کے لئے ایک منٹ تک کرسی پہ بیٹھنا محال ہو گیا۔ اُس نے اُٹھ کر کمرے میں اِدھر سے اُدھر دو چار چکر لگائے۔ پھر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور سامنے میدان میں چلتے پھرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھتا رہا۔ اُس کو چین نہ آیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بجلی کی ایک رو اُس کے اندر چل رہی ہے جو پاؤں کے رستے زمین میں اُترتی جا رہی ہے، اور زمین کی لرزش اُس کے جسم میں منتقل ہو کر اُس پہ تھرتھری طاری کئے ہوئے ہے۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے دفتر کے دروازے کے پاس جا کر اُسے بند کیا اور اِس قدر آہستگی سے اُس کی چٹخنی چڑھائی کہ خُود سرفراز کو بھی اُس کی آہٹ سنائی نہ دی۔ اپنے آپ کو یوں دفتر میں محبوس کر کے سرفراز نے ایسی آزادی محسوس کی کہ جیسے وہ لق و دق میدان میں اکیلا کھڑا ہو، اور اچانک اُس کے شانوں پہ پَر اُگ آئے ہوں اور اُس نے آسمان پہ اُڑنا شروع کر دیا ہو۔ مگر وہ زمین پہ کھڑا تھا۔ اڑنے کی سکت نہ ہونے کے سامنے اُسے ایک ہی رستہ دکھائی دیا۔ وہ اپنے دفتر کے فرش پہ بچھی دری پر لیٹ گیا اور لیٹا لیٹا لوٹنے لگا۔ اُس کے اندر بجلی کی قوت اُسی طرح لرزاں تھی۔ لوٹتے لوٹتے وہ ایک دیوار سے دُوسری دیوار تک چلا گیا۔ ایسا کرنے سے اُسے ایک ایسی آزادی کا احساس ہوا جس سے وہ ایک مدت ہُوئی نا آشنا ہو چکا تھا۔ کبھی بچپن میں وہ دُوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا چارے کے ہرے بھرے کھیتوں میں اِس طرح قلابازیاں کھایا کرتا تھا۔ اِس

وقت کھردری دری اور درمیان میں ایک مختصر سے پرانے گھسے ہوئے قالین پہ لوٹتے لوٹتے سرفراز نے چارے کے سبز نرم پتوں کی مخصوص بو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا۔ اُس کے ساتھ ملی جلی نسرین کے بدن کی خوشبو بھی تھی۔ اِس یاد نے اُس کے اندر کی رو پہ ایک کرنٹ کا کام کیا اور چت لیٹ کر اُس نے دونوں ٹانگیں اور دونوں بازو اُوپر اُٹھائے اور اُنہیں ہوا میں بے تک چلانے لگا۔ پھر رک کر وہ لوٹتا لوٹتا دور تک لڑھکتا گیا اور وہاں پہ بازو اور ٹانگیں اُٹھا کر پوری قوت سے اُنہیں بے سمت اِدھر اور اُدھر ہلانے لگا۔ اُس کے دِل میں مسرت کا ایک طوفان تھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ چند منٹ تک یہی حرکت کرتے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک مانوس منظر اُبھر آیا۔ گاؤں میں گدھے اپنی گاڑیاں کھینچنے سے آزاد ہو کر یوں مٹی میں لوٹتے ہوئے چاروں ٹانگیں اُٹھائے خوشی سے اُنہیں ہوا میں چلایا کرتے تھے۔ سرفراز بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ گدھے کی مانند ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دے۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یہ اُس کا دفتر تھا۔ ایک لمحے کے اندر وہ اپنی دنیا میں واپس پہنچ گیا۔ اُسے اپنی حرکت پہ ذرّہ برابر شرمندگی کا احساس نہ ہوا، صرف اپنی حیثیت کا خیال آیا۔ اُس نے اپنی وردی پہ لگی گرد کو جھاڑا، دروازے پہ جا کر ہولے سے چٹخنی اُتاری، اور ایک پٹ وا کر کے واپس اپنی کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے دِل میں خُدا کا شکر ادا کیا کہ اُس چند منٹ کے وقفے کے دوران کسی نے اُس کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا۔

چار روز کے بعد سرفراز کو سب سے پہلے حسن کا فون پہنچا کہ اُس کا باپ تین دِن سے گھر نہیں آیا۔ حسن کو مزید کسی تفصیل کا علم نہیں تھا۔ سرفراز نے کئی سوالات کیے، جن کے جواب میں حسن نے صرف اتنا کہا کہ "بی بی نے کہا ہے چاچے کو فون کرو کہ ابا تین دِن سے 'غیب' ہے۔" سرفراز نے اُس سے کچھ اور سوال کیے اور کہا کہ اُن کے جواب معلوم کر کے دوبارہ فون کرے۔ پھر اُس نے نسیمہ کو فون کیا اور اُسے اطلاع دینے

کے بعد اپنے سوال دہرائے۔ "لالہ گھر سے اکیلا گیا تھا؟ اگر نہیں تو کس کے ساتھ گیا تھا؟ جاتے وقت کیا کہہ کر گیا تھا؟ پہلے بھی وہ دو دو چار دِن گھر سے باہر رہا کرتا تھا۔ اب تشویش کی کیا وجہ تھی؟ کوئی اَور متعلقہ بات؟؟ خُود جاؤ اَور جتنی معلومات بھی مِل سکتی ہیں حاصل کرو۔۔۔۔"

اگلے روز نسیمہ کا فون موصول ہوا۔ "کچھ پتا نہیں چلا۔ بی بی کہتی ہے ایک آدمی آیا تھا، سادے سے لباس میں تھا، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک پیغام دے کر چلا گیا۔ اُس کے فوراً بعد لالہ یہ کہہ کر کہ ابھی واپس آتا ہے، موٹر سائیکل پر سوار ہو کر گھر سے نِکل گیا تھا۔ آج چوتھا روز ہے، مڑ کے نہیں آیا۔"

"مَیں کب سے اِنتظار کر رہا ہوں،" سرفراز نے چیخ کر کہا، "اِتنی دیر لگا دی؟"

"بھئی میں نے پھر شبو کو بتایا۔ اُس کی طرف سے اطلاع ابھی ملی ہے۔"

"کیا اطلاع ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اُس نے سارے تھانے وغیرہ کھنگال مارے ہیں، کوئی خبر نہیں ملی، نہ ہی لالے کا موٹر سائیکل ہی کہیں دکھائی دیا ہے۔"

"عجیب بات ہے!"

"ہاں۔ شبو کہتا ہے اُس کی کوشش ابھی جاری ہے، نااُمید نہیں ہونا چاہیے۔ مگر بی بی بہت پریشان ہے۔ تُم اگر۔۔۔۔"

"کیا کہا؟ آواز نہیں آ رہی۔"

"لائن خراب ہے۔ میں کہہ رہی ہوں اگر تُم چند دِن کے لِئے آ سکو تو۔۔۔۔"

"زور سے بولو۔ آواز بند ہو گئی ہے۔"

"تمہاری آواز بھی بہت ہلکی آ رہی ہے۔ میں نے کہا تُم آ سکتے ہو؟"

"بہت مشکل ہے۔ ہماری یونٹ اگلے ہفتے بلوچستان جا رہی ہے۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرو۔ بی بی بیحد اَپ سیٹ۔۔۔۔"

"ہیلو۔۔۔۔ بلاسٹ!"

سرفراز دو دِن کی ایمرجنسی چھٹی لے کر آیا تو اعجاز ایک روز پیشتر ہی گھر پہنچ چکا تھا۔ "جب تُم نے فون پہ بتایا کہ آ رہے ہو تو کچھ ہی دیر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ لالہ گھر

پہنچ گیا ہے۔" نسیمہ نے اُسے بتایا۔ "میں نے سوچا کہ اول تو تُم چل پڑے ہوگے، ویسے بھی تُمہارا آنا ضروری تھا۔ لالے کی حالت ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔"

اعجاز تانگے پہ سوار ہو کر گھر پہنچا تھا۔ وہاں سے اُسے بیوی اور بیٹوں نے سہارا دے کر اندر چارپائی پہ آ لٹایا۔ اُس کے کپڑے صحیح سلامت تھے، مگر اُس کا بدن ٹوٹ چکا تھا۔ اُس نے اپنی چھ روزہ غیر حاضری کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ سب سے پہلے اُس نے سب کو ہدایت کی کہ سرفراز کو اِس واقعہ کی اِطلاع نہ دی جائے۔ "حسن نے اُسے ٹیلیفون کر دیا تھا" سکینہ نے بتایا۔ "نسیمہ بھی آئی تھی۔" "یہ تو نے ٹھیک کام نہیں کیا" اعجاز نے کہا۔ "اُس کی نوکری ہے، اِن قصوں میں اُسے شریک کرنا درست نہیں۔"

"ہمارا اَور کون ہے؟ ایک سرفراز ہے جس کی کوئی پزیشن ہے۔ ابا اَور باسا تو بس مرنے مارنے پر تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ لڑکے بھی اُن کے ساتھ لگے ہُوئے ہیں۔ ذرا کوئی دُوسرا کام آ پڑے تو سب صفر ہیں۔ نسیمہ کچھ عقل والی ہے، اُس نے دوڑ بھاگ کی۔ چھ دِن اَور چھ راتیں تُمہاری نہ کوئی خبر نہ اخبار۔ سیکل تک کا نشان نہیں ملا۔ میں پھر کیا کرتی؟" سکینہ نے ایک بار پھر رونا شُروع کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد روتی اور پھر خاموش ہو جاتی، جیسے رونے سے اُس کے وقت کا حرج ہو رہا ہو۔

"چل اب چپ کر جا" اعجاز نے کہا۔ "کچھ بگڑا بگڑایا نہیں۔ چھوٹے موٹے زخم ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"چھوٹے موٹے ہیں؟ ایک ٹانگ سوج کر کپا ہو گئی ہے۔ اندر پتا نہیں کیا گند بلا پک رہا ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ اب چھوڑ اِس بات کو۔"

جب سرفراز اَور نسیمہ پہنچے تو سکینہ سرفراز سے لپٹ کر ایک بار پھر چند لمحے کے لئے روئی۔ مگر اب اُس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھی اَور اُن میں سے وحشت جھانک رہی تھی۔

"تُم اِتنی دور سے کس لے آئے ہو" اعجاز نے سرفراز سے کہا۔ "اَیسی بھی کیا بات تھی۔"

"چھ دِن تک تُم گھر سے غائب رہے ہو، کوئی انفرمیشن نہیں، کوئی پیغام نہیں، کسی

کو کچھ پتا نہیں کہ کہاں پر ہو، بی بی پریشان ۔۔۔۔"

اعجاز بستر پر کروٹ لیتے ہوئے درد کے مارے آنکھیں سکیڑ کر ہنسا۔ "بی بی تو کہتی تھی میں کسی عورت کے ساتھ بھاگ گیا ہوں۔"

"ہائے میری زبان پہ کوئلہ، میں نے کب کہا تھا" سکینہ نے دہائی دی۔

"چاچے نے بتایا ہے۔"

"ہائے ہائے، ابّے کی تو عقل ماری گئی ہے۔"

"تو نہیں کہتی تھی کسی چڑیل کو لے کر نکل گیا ہو گا؟" چاچا احمد بولا۔

"ابا تو زیادہ باتیں نہ بنا۔ پہلے یا دُوسرے دن میرے مُنہ سے کوئی بات نکل گئی ہو گی۔ تو نے بات ہی پکڑ لی ہے۔"

چاچا احمد یوں لاپروائی سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ "اوئے باسے،" اُس نے بیٹے کو آواز دی۔ "پتا کر، پتا اندر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی پلس کے ذریعے پتا لگا کہ کس نے اعجاز کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ برود مار کے اُن کو برباد نہ کر دوں تو میرا نام احمد خاں رٹھور نہیں۔"

اعجاز نے عباس کو اپنے پاس بلایا۔ "حسن کو ساتھ لو اور پُرانی یونیورسٹی ہے نا، توپ والے چوک کے پاس، اُس کے اِرد گرد کے علاقے میں کسی جگہ میرا موٹر سائیکل کھڑا ہو گا۔ اسے لے آؤ۔"

"تجھے پتا نہیں کہاں کھڑا کیا تھا؟" چاچے احمد نے پُوچھا۔

اعجاز چاچے کو جواب دینے کی بجائے عباس مخاطب ہوا۔ "ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ اُس علاقے کے آس پاس کی ساری بلڈنگوں میں گھُوم پھر کر تلاش کرنا، کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔"

"اور چابی؟" عباس نے پُوچھا۔

"کاٹھی کے نیچے ہاتھ مارنا، وہیں اٹکی ہو گی۔"

"کاٹھی کے نیچے چابی؟ لالہ،" سرفراز نے پُوچھا، "قصہ کیا ہوا ہے، کچھ تو بتاؤ۔"

"سرفراز، تو اِن باتوں سے سروکار نہ رکھ،" اعجاز نے کہا۔ "تیری بی بی تو بیوقوف ہے۔ تجھے فون شون کروانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیوں سروکار نہ رکھوں لالہ۔ کیا بات کرتے ہو!"

"تیری نوکری فوج کی ہے، اُس پر دھیان دے، ترقی کر، ہم سب کا فائدہ اِسی میں ہے۔ تو نے اپنے حصے کی سزا کاٹ لی ہے۔ میری خیر ہے۔"

"یہ خیر ہے؟" سرفراز اُس کی ٹانگ اور گردن کی جانب اشارہ کرکے بولا، جہاں بڑے بڑے اُبھرے مُوئے سرخ چٹاخ دکھائی دے رہے تھے۔ جواب دینے کی بجائے اعجاز دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

"کوئی قِصّہ نہیں بچے،" چاچا احمد حقہ گڑگڑا کر بولا۔ "اعجاز کبھی ایک کام میں ہاتھ ڈال دیتا ہے کبھی دُوسرے میں، ایک جگہ پر ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ بس یہ قِصّہ ہے۔ اِس طرح دشمن پیدا ہوتے ہیں۔ اوئے باسے۔" اُس نے آواز دی۔

"باسا موٹرسیکل لینے چلا گیا ہے،" سکینہ نے سٹپٹا کر باورچی خانے سے جواب دیا، جہاں وہ اپنی ماں اور نسیمہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"بس دشمن کا پتا لگا کر مجھے بتا دو۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔ دشمن کا بیج فنا کر دوں گا۔"

"ابا تجھے فنا کرنے کے سوا کوئی اور کام بھی آتا ہے؟ چپ کرکے بیٹھ۔ سرفراز کو بات کرنے دے۔"

"لالہ؟" سرفراز نے آہستہ سے بلایا۔

اعجاز اُسی طرح مُنہ پرے کیے بے حرکت لیٹا رہا۔

"سکینے،" چاچا احمد بولا۔ "جیسے تجھے بتایا ہے اُس طرح پُلٹس تیار کر۔ میرے جثے پر ایک سے ایک بڑی چوٹ لگی ہے۔ اعجاز کو پُلٹس لگا، دو دِن میں اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔"

"لالہ؟" سرفراز نے دوبارہ اعجاز کو بلایا تو نسیمہ باورچی خانے سے اُٹھ آئی۔

"آرام کرنے دو" وہ ہولے سے بولی۔ "بعد میں بات کر لینا۔ چاچا آپ بھی باہر چل کر بیٹھیں۔ لالے کو آرام کی ضرورت ہے۔"

سرفراز اور چاچا احمد اُٹھ کر صحن میں چارپائی پہ جا بیٹھے۔ چاچے احمد نے حقے کا لمبا کش لیا۔ "سرفرازے، تیری منگیت عقل والی ہے،" وہ بولا جیسے اُس کو پہلی بار اس کا دھیان آیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد سکینہ اُٹھ کر سرفراز کے پاس چارپائی پہ آ بیٹھی۔ ”تیرا لالہ جب سے آیا ہے،“ وہ نیچی آواز میں بولی، ”کاغذوں پہ کاغذ لکھتا جا رہا ہے۔ کل سارا دِن اور آدھی رات تک لکھتا رہا ہے۔ ورکے کالے کر دیئے ہیں۔“

”اچھا؟ وہ کہاں ہیں؟“

”اُس کے تکیئے کے نیچے ہیں۔“

سرفراز کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا، ”میں لے کر آتا ہوں۔“

”دھیان سے نکالنا۔ تسلی کر لینا کہ سو رہا ہے۔“

”تمہارے خیال میں سو رہا ہے؟“

”ہاں۔ اگر جاگتا ہوا تو ہاتھ نہ ڈالنا۔ اُنہیں جان سے لگا کر رکھتا ہے۔“

سرفراز نے دبے پاؤں جا کر چارپائی کے سر کی جانب سے اعجاز پہ نظر ڈالی۔ اعجاز ہولے ہولے خراٹے لے رہا تھا۔ سرفراز نے کمال احتیاط کے ساتھ دُوسری جانب سے تکیہ اُٹھایا تو اُسے چند اوراق کا ایک کونہ دکھائی دیا۔ اُن کو اُنگلی اور انگوٹھے میں پکڑ کر نہایت آہستگی سے انچ انچ سرکاتے ہُوئے سرفراز کو تین چار منٹ لگ گئے۔ آخر وہ ورق اُس کے ہاتھ میں آ گئے اور اعجاز اُسی طرح محوِ خواب رہا۔ کسی کسی وقت نیند میں اُس کے مُنہ سے درد کی ہلکی سی کراہ خارج ہوتی، مگر اگلے ایک گھنٹے تک وہ گہری نیند سویا رہا۔ اُس ایک گھنٹے کے دوران سرفراز صحن والے کمرے میں، دروازہ بند کیئے، اعجاز کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے ہلکے پیلے رنگ کے اوراق کو لیئے بیٹھا رہا۔ اوراق کی تعداد کل چودہ تھی، جن میں سے پانچ لکھائی سے بھرے تھے، باقی کے سادہ تھے۔ اعجاز کی تحریر ابھی جاری تھی۔ یہ اُن دِنوں کی روداد تھی، جن کے دوران وہ گھر سے غیر حاضر رہا تھا۔

جس وقت سرفراز اُن اوراق کو لے کر کمرے میں آیا تھا اُس وقت اُس کا اِرادہ تھا کہ جلدی سے پڑھ کر اُسی طرح اُنہیں واپس تکیئے کے نیچے رکھ دے گا۔ مگر وہ ابھی تیسرے صفحے کے شروع میں ہی تھا کہ اُس سے آگے نہ پڑھا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

تحریر یہ تھی۔

”پندرہ اگست کو صبح سویرے ایک آدمی میرے گھر ایک پیغام لے کر آیا۔ اُس نے اپنا تعارف خواجہ معراج کے ایک ملازم کی حیثیت سے کرایا اور کہا کہ ”رحمانیہ

پبلیکیشنز" کے اثاثوں کی ڈسپوزل کے سلسلے میں خواجہ معراج نے "بہ بانگ دہل" کے دفتر میں گیارہ بجے ایک میٹنگ رکھی ہے اَور اور مجھے اُس میں شرکت کرنے کو کہا ہے۔ میں یہ پیغام سن کر دِل میں حیران ہوا۔ اول تو اس ادارے کے کاروباری معاملات سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ دُوسرے خواجہ معراج سے میری آخری ملاقات خاصی ناخوشگوار رہی تھی۔
میں نے پیغام لے کر آنے والے سے استفسار کیا تو وہ بولا کہ شیخ سلیم، شیخ وسیم، اَور ان کی ہمشیرہ، یعنی بدیع الزمان کی بیوہ بھی میٹنگ میں شرکت ہوں گی، اَور کہ اُس نیک خاتون کا اِسرار تھا کہ وہاں پہ میری موجودگی بھی ضروری تھی۔ یہ سن کر میں نے آنے کی حامی بھر لی۔ میں وقت سے چند منٹ پہلے "بہ بانگ دہل" کے دفتر پہنچا۔ وہاں ایک بڑی سی نیلے رنگ کی فورڈ ٹرانزٹ وین کھڑی تھی۔ وہ شخص جو مُجھے بلانے آیا تھا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ پرائیویٹ سرویئرز کی گاڑی تھی جو دفتری سامان کا سروے کریں گے، اَور یہ کہ خواجہ صاحب ابھی نہیں پہنچے۔ دفتر بند تھا۔ اُس آدمی نے مُجھے تسلی دی کہ خواجہ صاحب دُوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر آتے ہی ہوں گے اَور چابی سے دفتر کھولیں گے۔ پھر اُس نے مُجھے وین میں آ کر سرویئر صاحب سے ملنے اَور وہاں اِنتظار کرنے کی دعوت دی۔ میں اُس کے ساتھ وین تک گیا۔ ڈرائیور کی سیٹ خالی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر ایک موٹا سا پینتیس چالیس برس کا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس نے گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔

"آیئے آیئے" وہ وین کا دروازہ کھول کر بولا۔

میں نے کہا کہ سامنے ہمارے ایک جاننے والی کی دکان ہے، میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں۔

"میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا۔ "آپ کو دفتر کے سامان کا کچھ اندازہ ہے؟"

"تھوڑا بہت ہے" میں نے کہا۔ "اندازے سے ہی بتا سکتا ہوں۔"

"تو آیئے۔ کچھ دیر باتیں ہو جائیں۔ ہمیں بھی کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ خواجہ صاحب نے مجھے کوئی ڈیٹیل نہیں بتائی۔ آپ جانتے ہیں، ہمارا تو یہ بزنس ہے۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

میں اُس کے ساتھ گھس کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دُوسرے آدمی نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ دُوسری طرف سے جا کر ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے چابی گھمائی اَور شررررر کر کے وین کو لے اُڑا۔ جیسے ہی وہ وین ٹائیروں سے آگ اُگلتی ہُوئی سڑک پر چڑھی، پیچھے سے دو آدمیوں نے میرے دونوں بازو قبضے میں لئے، تیسرے نے میرے سر کو قابو میں کر کے میری آنکھوں اَور مُنہ پر کالی پٹی باندھ دی۔ پھر اُنھوں نے مجھے سیٹ سے گھسیٹ کر کھینچا اَور پچھلے حصے میں وین کے فرش پر لٹا دیا۔ مُجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ میں مزاحمت تو ایک طرف، آواز بھی نکال سکوں۔ دو آدمی میرے بدن کے اُوپر بیٹھے تھے اَور تیسرا ایک رسی سے میرے دونوں ہاتھ اَور دونوں پیر باندھ رہا تھا۔ گاڑی شہر سے باہر نکلی تو میرے اوپر بیٹھے آدمی اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا، کیونکہ میرے دونوں ہاتھ پُشت پہ بندھے تھے، اَور میرے اپنے جسم کے علاوہ دو مزید آدمیوں کے بوجھ تلے پسے جا رہے تھے۔ دو روز قبل سے مُجھے زکام کی شکایت ہو رہی تھی جس کی وجہ سے میری ناک بند تھی۔ میرے مُنہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ کئی منٹ تک میری سانس رُکی رہی۔ پھر میں نے سر کی بائیں جانب کو زور سے وین کے فرش پر پٹکا، جس سے میرا دہنا نتھنا کچھ کھل گیا۔ میری سانس جاری ہُوئی، مگر صرف اتنی حد تک کہ جان آتی جاتی رہے۔ وین کئی گھنٹے تک متواتر چلتی رہی۔ کچھ عرصے کے بعد میرے اندر سے وقت کا تصور جاتا رہا۔ مُجھے یوں لگا جیسے وین سارا دِن ہی چلتی رہی تھی۔ آخر کار ایک جگہ پر وین پکی سڑک کو چھوڑ کر کسی نوکیلے پتھروں والے راستے پر چل نکلی، جہاں وہ دھکے کھا کھا کر چلنے لگی، جیسے گڑھوں یا پتھروں پر لڑھک رہی ہو۔ جلد ہی ایک مقام پر جا کر وین رُک گئی۔ وہاں پہ مُجھے کھینچ کر نیچے اُتارا گیا، میرے پاؤں پہ بندھی ہُوئی رسی کھول دی گئی اور دو آدمی مُجھے پکڑ کر چلاتے ہُوئے لے چلے۔ اُس وقت میں نے خُدا کا شُکر ادا کیا کہ مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا کیا گیا تھا۔ دِن بھر لوہے کے فرش پہ لیٹے لیٹے میرے بائیں جانب کا سارا بدن یوں درد کر رہا تھا جیسے پھوڑا بن چکا ہو۔ پہلے ہم پندرہ بیس سیڑھیاں چڑھے۔ پھر آگے تھوڑی دور تک چلنے کے بعد ایک دروازے سے گزُر کر کمرے میں داخل ہُوئے۔ دروازے کا اندازہ مُجھے یوں ہوا کہ اس کی دہلیز پہ میرے پیر کو ہلکی سی ٹھوکر لگی تھی۔ اندر داخل ہو کر مُجھے ایک دیوار کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد چند آدمیوں کے کمرے میں داخل ہونے

اور کرسیاں کھینچنے کی آوازیں آئیں۔ بیٹھتے ہی انھوں نے میرے اوپر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"وہ کاغذ جو تم نے پریس کانفرنس میں پڑھ کر سنایا تھا، تمھارے اپنے کہنے کے مطابق ایک بڑی دستاویز کا حصہ تھا۔ وہ دستاویز تمھیں کہاں سے حاصل ہوئی؟"

میں نے انھیں بتایا کہ ایک مکمل اجنبی شخص ایک جگہ پہ مجھے ٹھہرا کر ایک پلاسٹک کا تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑا گیا تھا، جس میں یہ کاغذات تھے۔

"اب وہ کاغذات کہاں پر ہیں؟"

میں نے کہا کہ وہ میں نے جلا دیئے تھے۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اِس دیوانے کی بڑ پر ہم یقین کر لیں گے؟"

میں نے بتایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے، اور میں مزید کچھ بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ اِس کے علاوہ مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے۔ "ہمیں تمھارے سارے کیریئر کا علم ہے۔ تمھارے سیاسی لوگوں کے ساتھ تعلقات رہے ہیں۔ تم پہلے حکومتی پارٹی میں تھے۔ اس پارٹی نے اِنتظامی بدعملی کے الزام میں تمھیں پارٹی سے نکال دیا تھا۔ اب تمھارے رابطے اپوزیشن کے ساتھ ہیں۔ اور اپوزیشن کے رابطے ملک کے بیرونی دشمنوں سے ہیں۔ کیا تمھیں یہ دستاویز اُن لوگوں سے حاصل ہوئی ہے؟"

اِس سے مجھے کم از کم ایک بات کا احساس ہوا، کہ یہ دستاویز دُرست تھی۔ میری آنکھوں پہ پٹی، اور پُشت کے پیچھے ہاتھوں پہ رسی بندھی تھی۔ اُسی اندھیرے میں کھڑے کھڑے میں نے جواب دیا کہ میں جو کچھ پہلے بتا چکا ہوں وہ حقیقت پہ مبنی ہے اور اس کے علاوہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔

"تو انتظار کر۔ تجھے خود بخود بہت سی باتوں کا علم ہو جائے گا" سوال والے نے طنز سے کہا۔

پھر اُس نے غالباً میرے پہرے داروں کو ہدایت دی، جس پہ وہ دونوں مجھے پکڑ کر چلاتے ہوئے اس کمرے سے نکال کے لے آئے۔ آگے شاید کئی برآمدے آئے، جن کے اندر ہم مڑتے مڑاتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ میری ناک میں سیلی سی بدبو داخل ہوئی۔ ہم شاید کسی تہہ خانے میں اُتر چکے تھے۔ کئی سیڑھیاں اُترنے اور موڑ کاٹنے اور پھر

مزید سیڑھیاں اُترنے کے بعد مجھے لے کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ ان دو آدمیوں نے باہر سے ایک مسلح پہرے دار کو بلایا جس نے وہ رسی جس سے میرے ہاتھ بندھے تھے، کھول کر پُشت پر ہی میرے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ وہ دو آدمی جو مجھے لے کر آئے تھے، مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی پہلے دو آدمیوں کی جگہ لینے کے لئے دو نئے آدمی آگئے تھے۔ اُنھوں نے مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا جیل کی طرح کا کمرہ تھا جس کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا۔ پہرے دار دروازے پہ تالا لگا کر چلا گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں اندھا سا بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ دیواروں میں کوئی کھڑکی، دروازہ یا روشندان نہ تھا۔ کمرے کی بُو سے محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں سے وہاں تازہ ہوا کا دخل نہ ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ زمین پر پتلا سا کمبل بچھا تھا۔ وہ دو آدمی اُس کمبل پر بیٹھے تھے۔ میں تھک کر بیٹھتا تو دونوں آدمی اُٹھتے اَور مجھے بالوں سے کھینچ کر کھڑا کر دیتے۔ میں بے سہارا کھڑا تھا۔ کبھی میں دیوار سے ٹیک لگانے لگتا تو وہ آدمی دوبارہ مجھے بالوں سے پکڑ کر دیوار سے دور لا کھڑا کرتے۔ نیند یا نقاہت کی وجہ سے میرے پاؤں لڑکھڑاتے تو وہ آدمی میرے مُنہ پہ طمانچے مار کر مجھے جگا دیتے۔ کئی گھنٹے تک میں اِسی طرح کھڑا رہا۔ گو مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا، مگر میرے حساب سے ایک دِن اَور رات گُزر چکے تھے۔ اس کے بعد دور کہیں ایک لوہے کا بھاری دروازہ کھلنے اَور بند ہونے کی آواز آئی۔ برآمدے میں بوٹوں کی آواز کے ساتھ ہی دو آدمی نمودار ہوئے۔ پہرے دار نے میرے کمرے کا تالا کھولا اَور وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے پہلی بار اُن کی شکلیں دیکھی تھیں، مگر اُن کی آوازوں سے مجھے پہچان ہو گئی کہ یہ وہی آدمی تھے جنھوں نے یہاں پہنچنے کے ساتھ ہی مجھ سے سوال جواب کئے تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی میرے سامنے وہی سوال دہرائے۔ میں نے اُنھیں الفاظ میں اُن کا جواب دیا جن میں پہلے دے چکا تھا۔ یہ مکالمہ اِتنی بار دہرایا گیا جیسے کہ ایک ریکارڈ کہیں اٹک گیا ہو۔

"اُس آدمی کا نام پتا تمھیں معلوم نہیں۔ کیا اُس کی شکل صورت بتا سکتے ہو؟"

"نہیں،" میں نے کہا۔

"کیا تُمھارا خیال ہے کہ ہمیں اس شخص کا علم نہیں؟ ہمیں سب علم ہے۔ اُس

غدار کو بھی گرفتار کیا جا چکا ہے۔"

"تو پھر آپ سب کچھ اُس سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مجھے کیوں پُوچھتے ہیں؟"

"ہم تو تُمھارے جھوٹ کی اِنتہا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ تُم پہلے سیاست میں اور پھر اخباوں میں لمبے چوڑے کام کرتے رہے ہو۔ کیا تُمھاری یاداشت اب اِتنی بھی نہیں رہی کہ اُس شخص کا حلیہ ہی بیان کر سکو؟"

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو حشر کیا ہے، کیا اُس کے بعد میری یاداشت قائم رہ سکتی ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "کم از کم چوبیں گھنٹے سے مجھے سونے نہیں دیا گیا، میرے پیٹ میں دانہ اُڑ کر نہیں گیا۔ کھڑے کھڑے میرے پیر سوج گئے ہیں۔۔۔۔"

اُس شخص نے، جو سوال کر رہا تھا، میرے دو پہرے داروں میں سے ایک کو میرے لِئے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔

"مجھے ناشتہ کی بھوک نہیں ہے،" میں نے کہا۔ "ایک چائے کی پیالی لا دیں۔"

تھوڑی ہی دیر میں گرم چائے آ گئی۔ میں نے جلدی سے پیالی کی چائے جو لانے والے نے میرے مُنہ سے لگائی تھی۔ پی لی۔

"بیٹھ کر آرام کرنا چاہتے ہو؟" اُس شخص نے پُوچھا۔

"ہاں۔"

اُس نے مُجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔

"میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں،" میں نے کہا۔ "مُجھے علم نہیں کہ میں کہاں پر ہوں اَور کس عقوبت خانے میں بند ہوں۔ ہر طرف تالے لگے ہیں۔ میں یہاں سے بھاگ کر کیسے اَور کہاں جا سکتا ہوں؟ کیا آپ لوگ میرے ہاتھوں کو نہیں کھول سکتے؟ کم از کم ہاتھوں کو آگے لا کر ہی ہتھکڑی لگا دیں۔ میرے کندھوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔"

وہ شخص ایک مِنٹ تک سوچتا رہا۔ پھر اُس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اُس آدمی نے باہر پھرتے ہُوئے پہریدار کو آواز دی۔ پہریدار دروازہ کھول کر اندر آیا اَور اُس شخص کی ہدایت پر اُس نے پُشت پر سے میری ہتھکڑی اُتار دی۔

"اب تُمھاری یادداشت کچھ تازہ ہُوئی ہے؟" اُس شخص نے سوال کیا۔ گرم چائے کی پیالی نے میری یاداشت تازہ کرنے کی بجائے اُلٹا میرے ذہن کو منتشر کرنے کا کام

کیا۔ ساتھ ہی زمین پر بیٹھنے اور ہاتھوں کو آرام پہنچنے سے میرے اُوپر غنودگی طاری ہونے لگی۔

جواب میں، میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"منہ سے کچھ بولو۔"

"مجھے اُس کے آدمی کے بارے میں کچھ علم نہیں،" میں نے کہا۔ "میں قسمیہ کہتا ہوں۔"

"اُس کا حلیہ؟ چال ڈھال؟ لباس؟ بات چیت؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں----۔"

اب وہ شخص بولا تو اُس کے لہجے میں پہلی بار غصے کی جھلک سنائی دی۔ "تم لاتوں کے بھوت ہو۔ مگر یاد رکھو، جلد یا بدیر تم اپنے ہی منہ سے ساری بات اُگلو گے۔ اِنتظار کرو۔"

دونوں آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پہریدار نے دروازہ کھولا تو وہ باہر نکل گئے۔ اُن کے جاتے ہی دُوسرے آدمیوں نے میرے دونوں ہاتھ پُشت پر کھینچ کر دوبارہ ہتھکڑی ڈال دی اَور بالوں سے کھینچ کر کمرے کے وسط میں کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد اُن کی جگہ لینے کے لِئے دو نئے آدمی آکر ڈیوٹی پر مامور ہو گئے-----------۔"

سرفراز کی ہمت نہ ہُوئی کہ اس سے آگے پڑھے۔ اُس نے دھپ سے کاغذ بند کر کے میز پہ رکھ دیئے۔ دیر تک وہ میز کی خالی سطح پہ نظر جمائے بیٹھا رہا۔ آخر اُس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں اَور کاغذ ہاتھ میں لِئے کمرے سے نِکل آیا۔ اعجاز جاگ اُٹھا تھا۔ سرفراز جا کر اُس کی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ سکینہ نے سرفراز کو یوں کاغذ ہاتھ میں اُٹھائے دیکھا تو ایک چھوٹی سی سانس اُس کے حلق میں اٹکی۔ جیسے اچانک اُسے خطرے کا احساس ہوا ہو۔

"لالہ،" سرفراز نے کوشش کر کے متوازن آواز میں کہا "یہ کیا معاملہ ہے؟"

ایک لحظے تک اعجاز ان اوراق کو پہچان نہ سکا۔ پھر اُس نے فوراً اپنا تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ "یہ تو نے کب یہاں سے اُٹھائے ہیں؟"

"اِس بات کو چھوڑو لالہ۔ میں پُوچھ رہا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"کوئی معاملہ نہیں ہے،" اعجاز نے کہا۔ "اِدھر لاؤ، یہ مجھے دو۔ میں انہیں چھپوانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔"

"کون اِسے چھاپے گا؟"

"کوئی نہ کوئی چھاپ ہی دے گا۔"

"ہاں ہاں،" سکینہ بولی، "ابھی تو گھر میں چھاپہ ہی پڑا ہے۔ اب یہ ہم سب کو جیل کی ہوا بھی کھلائے گا۔"

"چھاپہ پڑا ہے؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"نسیمہ نے تُجھے نہیں بتایا؟ چار بندے آئے اور ایک ایک چیز اُلٹ پلٹ کر چلے گئے۔ شُکر ہے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آیا، ورنہ ہم سب کو پکڑ کر لے جاتے۔ سارا دِن لگا کر میں نے گھر کی شکل سیدھی کی۔" سکینہ نے کہا۔

اعجاز اُس کی بات کو نظرانداز کر کے سرفراز سے بولا، "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تُم اِس معاملے سے لاتعلق رہو۔ لاؤ، یہ کاغذ مجھے دو۔"

"ٹھیک ہے، کاغذ لے لو، مگر لالہ حق کی بات کرو، میں لاتعلق کیسے رہ سکتا ہوں؟"

"دیکھ سرفراز،" اعجاز کچھ دیر توقف سے بولا، "اب تو بچّہ نہیں ہے، اور نہ مَیں تیرا سرپرست ہُوں۔ ہمارا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا، مگر ہماری زندگیاں الگ ہیں۔ تو حق کی بات کرتا ہے۔ تیرا حق اپنی زندگی پہ ہے، میرا حق اپنی زندگی پر۔ کیا میں غلط بات کرتا ہوں؟"

سرفراز چند لمحے تک خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا، "ٹھیک ہے۔"

"تو پھر بات کو یہیں چھوڑ دے۔"

"تُم کہتے ہو تو چھوڑ دیتا ہُوں۔ مگر یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ بہرحال، یہ تو بتاؤ کہ وہ دستاویز کیسی تھی جس کے بارے میں یہ لوگ تُمھیں پُوچھ رہے تھے؟"

"وہ بھی تُمھارے مطلب کی چیز نہیں۔"

"میرے مطلب کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟ یہ بات بھی میرے مطلب کی نہیں، وہ بات بھی میرے مطلب کی نہیں۔ تُمھارے اُوپر انتہا درجے کا تشدد کیا گیا ہے اور تم مُجھے کسی بات میں شریک کرنا نہیں چاہتے؟"

"بس میں یہی چاہتا ہوں،" اعجاز نے کہا۔ "دیکھو، میری بات کا برا نہ مانو، تم میری

ہر بات میں شریک ہو، مگر اس معاملے کو الگ رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔"

"میرے لئے کیا بہتر ہے اس کا تمہیں پتا ہے یا کہ مجھے پتا ہے؟ ابھی تم نے کہا تھا کہ تم میرے سرپرست نہیں ہو۔ تو پھر مجھے اپنی رائے قائم کرنے کی آزادی کیوں نہیں دیتے؟"

"کیونکہ یہ میرا معاملہ ہے اور میرا اپنا فیصلہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اِس میں کسی طور بھی ملوث ہو۔"

"تو اگر کل کو مجھ پر کوئی زیادتی ہو جائے تو تم اِس میں ملوث نہیں ہو گے؟"

اعجاز نے دیکھا کہ وہ دلیل ہارتا جا رہا ہے۔ "دیکھو سرفراز" وہ بولا "یہ کوئی بحث کی بات نہیں ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بہتری اسی میں ہے کہ تمہیں اِس قصے کا علم نہ ہو۔"

"میری بہتری تمہاری بہتری میں ہے لالہ۔ یہ قصہ آخر ہے کیا جس کی اِتنی شدید تفتیش ہوئی ہے؟ تم نے کوئی بغاوت کر دی ہے؟"

اعجاز کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بغاوت ہی سمجھو۔"

"ہاں ہاں" سکینہ بول اُٹھی۔ "اب بغاوت کر کے سب کو اندر کراؤ گے۔ بھائی کی بہتری سوچو مگر اپنے بچوں کی فکر نہ کرو۔"

"تو چپ رہ، تجھے کچھ پتا نہیں" اعجاز نے کہا۔

سکینہ کا صبر اب ٹوٹ گیا تھا۔ "کیوں چپ رہوں؟" وہ چیخ کر بولی، "تجھے مجھ سے زیادہ پتا ہے؟ میں تو ٹانگیں تڑا کے نہیں آئی، تو آیا ہے۔ تجھے تو سارے جہان کا علم ہے نا؟"

سکینہ نے پہلی بار اِس لہجے اور اِن الفاظ میں اعجاز کو مخاطب کیا تھا۔ مگر صاف دکھائی دیتا کہ اُس کی جان حلق میں آ گئی ہے۔ حسین گھر میں داخل ہوا۔ وہ رات کا گیا ہوا اب واپس آیا تھا۔

"تو کہاں سے آیا ہے؟" سکینہ نے اِدھر سے ہٹ کر لڑکے پر چڑھائی کر دی،

"کہاں گیا تھا؟ کہاں آوارہ پھرتا رہا ہے؟"

"اِدھر ہی تھا" حسین لاپروائی سے بولا۔

"میں پُوچھتی ہوں اِدھر کدھر تھا؟"

حسین جواب دینے کی بجائے جا کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ سکینہ اُس کے سر پہ جا کھڑی ہوئی۔ "بولتا کیوں نہیں۔ یہ تیرے نیفے میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ہے۔"

"کیوں کچھ نہیں ہے؟ نکال۔"

"کچھ نہیں ہے،" حسین غصے سے بولا۔

لڑکے کی نظروں میں گستاخی دیکھ کر سکینہ کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ اُس نے تڑاخ سے ایک طمانچہ اس کے مُنہ پر مارا۔ ساتھ ہی وہ لڑکے کی قمیض کا دامن اُٹھا کر اُس پہ پل پڑی۔ حسین اپنے آپ کو اُس سے بچانے کی کوشش کرتا رہا مگر اُسے بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ سکینہ نے جھپٹا مار کر اُس کے نیفے کو کھینچا تو بنچہ کھل گیا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا پستول زمین پہ گر پڑا۔ سکینہ نے حسین کو دھکا دے کر ہٹایا اور جھک کر پستول اُٹھا لیا۔

"یہ کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے تُجھے دیا ہے؟" وہ چیخی، "عالمگیر نے دیا ہے؟ اُس بدماش نے دیا ہے؟ وہ تجھ سے کیا کرواتا ہے؟ ڈاکے مرواتا ہے؟"

"ہم نے بدلہ لینا ہے،" لڑکا دلیری سے بولا۔

"بدلہ لینا ہے؟ کس کا بدلہ لینا ہے؟ باپ کا بدلہ لینا ہے؟"

"ہاں" لڑکا بولا۔

"اِس سے؟" وہ پستول کو ہوا میں لہرا کر بولی، "اِس کے ساتھ تو نے پلس سے مکابلہ کرنا ہے؟ اِس سے؟ ہیں؟ اِس سے؟" یہ کہتے کہتے اُس کی اُنگلی سے پستول کی لبلبی دب گئی۔ ٹھاخ کی آواز آئی اور سکینہ کا ہاتھ دھچکے سے لرز گیا۔ گولی مرغیوں کے غول کے درمیان زمین میں جا کر دھنس گئی۔ مرغیاں چیختی چلاتی ہُوئی چاروں طرف اُڑنے لگیں۔ اُن میں سے ایک دور جانے کی بجائے اُڑ کر سکینہ کے سامنے چارپائی پہ آ بیٹھی اور کلاک کلاک کرنے لگی۔ سکینہ کی ماں، نسیمہ اور سرفراز اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ اعجاز بستر پہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب کے چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ سکینہ اپنی ہی حرکت سے خوفزدہ ہو کر

تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سرفراز پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا بڑھا اور سکینہ سے ایک قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔

"بی بی،" وہ نرم آواز میں ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "یہ مجھے دے دو۔"

سکینہ نے پستول اُس کی جانب بڑھایا، مگر اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پہ گر پڑا۔ سرفراز نے پستول اُٹھا کر اُس کا بٹن دبایا اور میگزین نکال لی۔ سکینہ کی کوک صحن میں گونج اُٹھی۔

"ہائے ئے ئے---- پہلے چور ڈاکو بدماش،" وہ روتی ہوئی چلائی، "اب باغی۔ حکومت کے باغی۔ ہائے ئے ئے----" ماسی اور نسیمہ اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر اندر لے گئیں۔

اس واقعہ کے دوران چاچا احمد اپنی جگہ پہ حقہ تھامے بیٹھا رہا۔ صرف گولی چلنے کی آواز پہ اُس نے ایک لمحے کو سر موڑ کر دیکھا، پھر حقہ گڑگڑانے لگا۔

"سکینو،" کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ "گھبراہٹ کو چھوڑ۔ تو پلپس بنا۔ اجاز تندرست ہو جائے گا۔"

سرفراز نے اپنے کمرے میں جا کر پستول اور میگزین اپنی الماری میں رکھی اور اُسے تالا لگا دیا۔ پھر وہ آ کر اعجاز کی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ تک سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہے۔ دروازے پر موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ عباس اور حسن اُسے لئے گھر میں داخل ہوئے۔ موٹر سائیکل کو دیوار کے ساتھ سٹینڈ پر کھڑا کر کے عباس نے چابی لا کر اعجاز کو دی۔

"ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارا تو برا حال ہو گیا،" حسن نے کہا۔

"کہاں سے ملا؟"

"عجیب گھر کے پیچھے کھڑا تھا۔ مگر ٹھیک ٹھاک ہے۔"

حسن نے جا کر حسین سے نیچی آواز میں کوئی بات کی۔ حسین نے جو سر نیہوڑائے بیٹھا تھا، اُوپر دیکھے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ عباس اور حسن دُوسری چارپائی پر جا بیٹھے۔

"لالہ،" سرفراز نے پُوچھا، "اخبار کا دفتر تو دُوسری طرف ہے۔ یہ تُمھیں کیسے پتا تھا کہ موٹر سائیکل اِس علاقے سے ملے گا؟"

"جب مجھے شہر میں لا کر چھوڑا تو جاتے جاتے کہنے لگے اپنا موٹر سائیکل اِس علاقے میں ڈھونڈ لینا۔" اعجاز نے اُکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اوئے باسے،" چاچا احمد بولا' "تیری چھٹی کتنی ہے؟"

"دو دِن کی باقی رہتی ہے۔"

"میں اَور تیری ماں ابھی چلے جائیں گے۔ پیچھے ڈنگروں کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ تو اِدھر اپنی بہن کے پاس رہ۔ جاتی دفعہ گھر سے ہو کر جانا۔"

"اچھا ابا۔"

"اور دشمن کی خبر کر۔ مجھے تو یہ مخبری کا مملہ لگتا ہے۔ پتا کر کس نے مخبری کی ہے۔"

"اچھا ابا۔"

سکینہ اندر کمرے میں منہ سر لپیٹ کر چارپائی پہ لیٹی لیٹی سو گئی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا' مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ مانگے' نہ ہی کسی کو بھوک نے تنگ کیا تھا۔

"لالہ،" کچھ دیر کے بعد سرفراز بولا' "اُس شخص کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت بتا کر چھٹکارا حاصل کیوں نہیں کر لیا؟"

"کس شخص کے بارے میں؟" اعجاز نے بے خیالی سے پُوچھا۔

"وہی جس کا یہ لوگ پُوچھ رہے تھے۔"

"مجھے اُس کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں تھا اَور نہ اب ہے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"تو تُم نے کیسے یہ----- یہ تحریریں کاغذات دستاویزیں جو کچھ بھی یہ ہے' کیسے اُس سے حاصل کیں؟"

"میں نے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے خُود میرے ہاتھ میں پکڑائیں' اَور پھر یہ جا وہ جا گلیوں میں غائب ہو گیا۔ میں اُس کا نام تک نہیں جانتا' کسی کو کیا بتاتا؟"

"اُس نے کسی اَور کو یہ کیوں نہ دیئے' تُمھیں کیوں دیئے؟"

"مجھے کیا خبر؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر ایک یا دو

جملے کہے تھے، یہ کہ میں نے آپ کے مقدمے کی کارروائی دیکھی ہے، اَور یہ شاید آپ کی دلچسپی کی چیز ہو: بس۔ یہ کہہ کر اُس نے پلاسٹک کا تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑایا اَور پلٹ کر چلا گیا۔"

"تُمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ اُس کا حلیہ کیا تھا؟"

"تھوڑا بہت یاد ہے۔"

"تو یہ لوگ اُس کا حلیہ ہی تو پُوچھ رہے تھے۔ وہ ہی بتا دیتے۔ خلاصی کروا لیتے۔"

"کیسے بتا دیتا؟"

"کیوں،" سرفراز نے کہا، "تُمہیں یاد تو تھا۔"

"ہاں،" اعجاز نے جواب دیا۔ پہلی بار اُس کی آنکھوں میں ایک دور کی جھلک پیدا ہُوئی۔ "اپنی جان بچا کر اُس کی جان مصیبت میں ڈال دیتا؟"

"صرف حلیہ بتانے سے کیا ہوتا ہے۔"

"تُم اِن لوگوں کو نہیں جانتے سرفراز۔ یہ جوتے کا رنگ دیکھ کر آدمی کو کھینچ نکالنے والے لوگ ہیں۔ تُمہارا خیال ہے وہ دِل لگی کے لِئے حلیہ پُوچھ رہے تھے؟"

"ٹھیک ہے، بچ جاتا تو بچ جاتا، پکڑا جاتا تو اُس کی قسمت۔ کونسا تُمہارا تعلق واسطے والا آدمی تھا۔"

"تعلق واسطے کی بات نہیں،" اعجاز اُسی طرح ایک تار اُسے دیکھتا ہوا بولا، "اُس نے میرے اُوپر اعتماد کیا تھا۔"

سرفراز ایک منٹ تک برابر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ پھر کچھ کہے بغیر مُنہ پھیر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لاؤ یہ کاغذ مُجھے دو،" اعجاز نے کہا۔

"دے دوں گا،" سرفراز غصے سے بولا اَور دروازے کی طرف چل پڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں جا رہا،" سرفراز نے مختصراً کہا اَور گھر سے نِکل گیا۔

چند منٹ کے بعد گلی کے سرے پر کھڑی نسیمہ کی کار کے چلنے کی آواز آئی۔ اِدھر سرفراز گھر سے نِکلا، اُدھر سائیں جلا دروازے میں داخل ہوا۔ وہ کئی ماہ کے بعد اپنے

پھیرے سے لوٹا تھا۔

"گھر گیا تھا" وہ چاچے کے پاس چارپائی پہ بیٹھ کر بولا۔ "پتا چلا کہ اعجاز کے ساتھ کوئی مالمہ ہو گیا ہے۔"

"تیرا تو میں نے فاتحہ بھی پڑھ لیا تھا، تو اُسی طرح مشٹنڈا پھر رہا ہے۔ اِتنی دیر تک کدھر بیٹھ کر بھنگ پیتا رہا ہے؟"

"میرے پیروکار مجھے آنے نہیں دیتے تھے۔" سائیں جلاّ فخر سے بولا۔

"تیرے پیروکار! بھنگی چرسی کے پیروکار!!"

"جلندر تک ہو کر آیا ہوں۔ میرے پیروکار بڑے امیر ہیں۔ اُن کے پاس موٹریں ہیں۔"

"ہنہ! موٹریں ہیں!" چاچا احمد تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

"کیا مالمہ ہوا ہے؟" سائیں جلّے نے پُوچھا۔

"کوئی مالمہ نہیں ہوا۔ مخبری ہُوئی ہے۔ پتا لگا رہے ہیں۔"

"میں اپنے مرشدوں سے مخبر کا پتا مالوم کر سکتا ہوں۔"

"تیرے مرشدوں کو کیا خواب آ جائے گی؟"

"ہاں۔ وہ سخارہ کرتے ہیں اور ساری بات خواب میں صاف کھل جاتی ہے۔"

"اوئے تو یہ بے فضول باتیں چھوڑ۔ یہ بتا کہ تیرے مرشد تجھے کوئی تماکو شماکو بھی دیتے ہیں یا سخارے ہی کرتے رہتے ہیں؟"

"لے کر آیا ہوں۔"

"تو پھر نکال۔ کیا قبر میں لے کر جائے گا؟"

"فروزپور کا اول نمبر تماکو ہے۔"

"چل چل، ابھی پتا چل جائے گا۔"

سائیں جلّے نے اپنی پوٹلی سے ذرا سا تمباکو نکال کر ہتھیلی میں رگڑا۔ پھر اُس نے حقے کی ٹوپی اُتاری اور چولہے کے پاس جا بیٹھا۔

اے-ایس-پی شعیب کے باہر والے دفتر میں ایک انسپکٹر، ایک اے-ایس-آئی وردی میں، اور ایک آدمی شلوار قمیض میں میز کے گرد کچھ فائلیں کھولے بیٹھے تھے۔ آگے شعیب کا کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ سرفراز سیدھا اُس دروازے تک بڑھا۔ اُن تین میں سے ایک آدمی جلدی سے بولا، "ٹھہریئے ٹھہریئے جناب، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

سرفراز نے اُس کی بات کو نظرانداز کر کے آگے قدم بڑھایا تو اے-ایس-آئی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ایس-پی صاحب مصروف ہیں،" وہ سرفراز کے سامنے آ کر بولا، "آپ اپنا نام اندر بھیج دیں، وہ فارغ ہو کر آپ کو بلالیں گے۔"

سرفراز ایک لمحے کو رُکا اور اے-ایس-آئی کے پہلو سے نِکل کر آگے بڑھنے لگا تو تھانیدار دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"جناب ایس-پی صاحب کی سخت اِنسٹرکشن ہے کہ اُنھیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ وہ ایک سائل کے ساتھ ہیں۔" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"میں بھی مصروف ہوں،" سرفراز نے برابر کے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "میرے پاس انتظار کا وقت نہیں ہے۔ میرا نام میجر سرفراز ہے۔" تھانیدار کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ "سر----" اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، "سر-----" مگر اتنے میں سرفراز نے ایک جانب سے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا ہینڈل پکڑا اور اُسے کھول دیا۔ پھر اُس نے اے-ایس-آئی کے شانے کے اوپر سے، جس سے وہ قد میں اونچا تھا، سر نکال کر کمرے کے اندر دیکھا۔ شعیب دروازہ کھلنے کی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ اپنی کرسی کی پُشت سے ٹیک لگائے، ٹانگیں میز پہ پھیلائے بیٹھا تھا۔ دفتر میں وہ اکیلا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے مکمل طور پر فارغ ہو۔ سرفراز کا چہرہ دیکھتے ہی وہ ٹانگیں سمیٹ کر کرسی پہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور تقریباً چلاتے ہوئے بولا، "سرفراز!"

نوجوان تھانیدار دروازے سے ہٹ گیا۔ سرفراز میز تک پہنچا۔ شعیب نے مصافحے کے لِئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سرفراز نے اُس سے ہاتھ ملانے کی بجائے اعجاز کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اوراق اُس کے آگے میز پر دے مارے۔ کاغذوں کا پلندہ دھپ سے

میز کی ہموار سطح پر گرا اور پھسلتا ہوا میز کے کنارے تک چلا گیا جسے شعیب نے آگے ہاتھ رکھ کر روکا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پڑھ کے دیکھ لو" سرفراز نے کہا۔

شعیب نے تحریر کو ایک نظر دیکھا پھر کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر دو چار لمحوں کے لیے اُسے پڑھا اور دوبارہ کمرے میں اپنے آگے پیچھے دیکھا۔ وہ اُس تحریر کو دھیان کے ساتھ پڑھنے کی بجائے ایک ایک نظر دیکھ کر پھر آگے پیچھے، دائیں اور بائیں دیکھتا جا رہا تھا، جیسے اُس کو کسی جانب سے کوئی خطرہ درپیش ہو۔ خلافِ معمول اُس نے سرفراز کو بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہا۔ سرفراز جا کر کھڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ شعیب کے چہرے سے شدید سراسیمگی مترشح تھی۔ وہ معمول سے زیادہ بلند آواز میں بولا،

"سرفراز، یہ لالے اعجاز نے لکھا ہے؟"

"ہاں،" سرفراز نے جواب دیا۔ وہ پلٹ کر وہیں پہ دیوار سے ٹیک لگا کر، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے کھڑا، شعیب کو پڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ شعیب نے جب یہ دیکھا تو اُس نے ایک دو صفحے جلد جلد پڑھے، گو بیچ بیچ میں کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔

"ہوں ں----" وہ تحریر کو آدھے میں چھوڑ کر بولا۔ "یہ ہماری فورس کا کام نہیں ہے۔"

"کس کا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ کوئی دُوسرے لوگ ہیں۔ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پتا لگانے کی کوشش کرونگا۔"

"کوشش کرو گے؟" سرفراز طیش میں بولا، "کوشش کرو گے؟ لالے کا جسم نیلا اور پیلا ہو گیا ہے۔ اُس کی ہڈیاں مروڑی گئی ہیں۔ اور تُم ابھی کوشش کرو گے؟"

"سرفراز۔ سرفراز،" شعیب پھر غیر معمولی اُونچی آواز میں بولا۔ گویا کسی بہت دور کھڑے شخص سے مخاطب ہو۔ "یہ سیدھا سادا معاملہ نہیں۔ تُم اب جاؤ۔ کُول ڈاؤن۔ کل میں خُود جا کر لالے سے ملونگا۔ شاید کوئی سراغ نِکل آئے۔ لو وہ کاغذات کو سرفراز کی

جانب بڑھا کر بولا' "انہیں لے جاؤ۔"

"تم نے انہیں پڑھا تو ہے نہیں۔"

"جتنا معلوم کرنا تھا کر لیا ہے' اب پتا لگانا ہے کہ یہ قصہ کیا ہے۔ اِس میں کوئی اور آرگنائزیشن اِنوالو ہے۔ اب جاؤ۔ مجھے کل تک کا وقت دو۔"

سرفراز آگے بڑھ کر کاغذ اُس کے ہاتھ سے لینے ہی والا تھا کہ دفتر کے کونے میں غسل خانے کے بند دروازے کی کنڈی اندر سے کھلنے کی آواز آئی۔ شعیب اَور سرفراز نے ایک ساتھ اُدھر دیکھا۔

"سرفراز' خدا حافظ'" شعیب چلایا۔

مگر اُس کا داؤ نہ چلا۔ دروازہ کھلا اَور اندر سے نسرین لباس دُرست کرتی ہوئی برآمد ہُوئی۔ ایک قدم باہر آ کر اُس نے سرفراز کو دیکھا اَور وہیں کی وہیں ساکت ہو گئی' جیسے زمین نے اُسے پکڑ لیا ہو۔ سرفراز مُنہ کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔ نسرین کے گال پہ ایک نمایاں سرخ نشان تھا جیسے وہاں پہ جلد کو رگڑ لگی ہو۔

"تم---'" سرفراز کے مُنہ سے نِکلا۔ "تم----؟"

"یہ----" شعیب نے سرفراز سے کہا' "ایک درخواست لے کر----"

سرفراز کی سماعت رُک گئی تھی۔ اُس کے کان میں شعیب کے کسی کسی لفظ کی آواز آ رہی تھی---- "مقدمہ---- درخواست---- انوسٹی گیشن-----"

نسرین اب بار بار اپنے سر پہ دوپٹہ اوڑھ رہی تھی' جیسے سر ننگا ہونے سے کسی کی بے ادبی ہو رہی ہو۔ سرفراز بے اختیار اُس کی جانب بڑھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں'" نسرین نے کمزور سی آواز میں کہا۔

سرفراز نے مڑ کر ایک نظر شعیب کو دیکھا۔ پھر ایک زور دار تھپڑ نسرین کے گال پہ مارا۔ نسرین لڑکھڑا گئی' مگر اپنے قدموں پہ کھڑی رہی۔ شعیب کرسی چھوڑ کر دو قدم آگے بڑھا' پھر رُک گیا۔ نسرین کے چہرے کا رنگ آناً فاناً تبدیل ہو گیا۔ اُس کا مُنہ رنج کے اثر سے بگڑ گیا' مگر اُس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔

"ہاں'" وہ اکڑ کر بولی' "مجھے سب نے استعمال کیا ہے۔ بڈھے کرنل سے لے کر

نوجوان افسروں تک۔ تم ایک اَور طمانچہ لگا دو۔ میں تو اس کی عادی ہوں۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ لو۔ مارو۔" وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ سرفراز پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اچانک وہ پلٹا اَور لمبے لمبے ڈگ بھرتا شعیب کی میز کی طرف لپکا۔ وہاں ایک لحظہ رُک کر اُس نے شعیب سے آنکھ ملائی۔

"تجھے شرم نہیں آتی؟" وہ بولا۔

"شعیب اب ایک وار سہ کر سنبھل چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی استہزائی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ "واہ میجر صاحب، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

سرفراز تلملا کر میز پہ جھپٹا اَور اعجاز کے اوراق کا پلندہ ہاتھ میں دبا کر بازو اَور ٹانگیں چھڑکاتا ہوا کمرے سے نِکل گیا۔

جب نسیمہ اُسے سٹیشن پہ چھوڑنے جا رہی تھی تو سرفراز نے سرسری طور پہ کہا، "مجھے رینک مِل گیا ہے۔"

"ہاں،" نسیمہ آہستہ سے بولی۔ "شبو نے بتایا تھا۔"

حصہ ہشتم

There is no properly history
only biography.

R. W. Emerson

THERE IS PROPERLY NO

HISTORY, ONLY BIOGRAPHY

R.W.EMERSON

There is properly no history,
Only Biography

R. W. EMERSON

باب 21

سوتے جاگتے خوابوں میں اُلجھا ہوا، اعجاز اور نسرین کی اُڑتی ہوئی جھلکیوں کو قابو میں کرنے کی سعی کرتا ہوا، میجر سرفراز جنوب کی جانب بھاگتی ہوئی ریل گاڑی میں سفر کرتا رہا۔ ریل گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو گویا کسی غیر مرئی قوت نے ٹھوکا دے کر سرفراز کو جگا دیا۔ سورج کو نکلے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ سرفراز نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ رات بھر کی کسلمندی کے بعد آخری ایک گھنٹہ وہ گہری نیند سویا رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے باہر کا منظر سندھ کی لاکھوں ایکڑ پر پھیلی ہوئی سرزمین کا تھا جس سے وہ واقف ہو چکا تھا۔ مدہم رنگ کی سرخی مائل مٹی اور وہی خودرَو جھاڑیوں کا جال جس پہ صبح سویرے ہی سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ہرے رنگ کے شاداب کھیت تھے جو تیزی سے پیچھے کو دوڑتے ہوئے مخملیں ٹکڑوں کی مانند نظر آتے تھے، مگر ریل کی رفتار دھیمی ہو جاتی تو اُن کی فصلوں کے سبز پتے ہوا میں آہستہ آہستہ سرسراتے ہوئے دکھائی دیتے۔ کہیں کہیں کوئی تاریک باغ نظر آ جاتا جس نے زمین کو سائے میں ڈھکا ہوا ہوتا۔ پھر وہی بھربھری مٹی اور خودرو کرخت جھاڑیاں، اور اُن پہ منہ مارتی ہوئی بھیڑبکریاں اور گائیوں کے ریوڑ، جن میں سے کوئی کوئی منہ اٹھا کر بھاگتی ہوئی ریل کو دیکھ رہی ہوتی تھی۔ سو کر اُٹھنے سے سرفراز کا مزاج نرم پڑ چکا تھا۔ ایک بکری کے میمنے کو دیکھتے ہوئے، جو ریل گاڑی کی جانب متوجہ تھا، سرفراز کا جی چاہا کہ ہاتھ ہلا کر اُسے خوش آمدید اور الوداع کہے۔ مگر اُس کے ڈبے میں اب متعدد لوگ آ چڑھے تھے۔ ایک لمبا چوڑا میمن خاندان تھا جن کے چار سال کی عمر سے لے کر سولہ سال تک کے پانچ بچے تھے۔ ماں باپ اور بچوں نے کھلے کرتے اور تنگ تنگ سے پاجامے پہن رکھے تھے اور میمنی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُوپر کی سیٹوں پر سامان رکھا تھا اور سامان کے ساتھ دونوں سیٹوں پر ایک ایک بچہ بیٹھا تھا۔ درمیان والے دو بچے کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ سرفراز کے سامنے والی سیٹ پر ماں باپ اور چھوٹا بچہ بیٹھے تھے۔ اُسی سیٹ پر کونے میں پتلون کوٹ پہنے، ٹائی لگائے ہوئے ایک نوجوان سکڑا سکڑایا بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ سیٹوں کی رزرویشن کا کوئی حساب نہ رہا تھا۔

سرفراز کی گہری نیند کے دوران ڈبے کا نقشہ بدل چکا تھا۔ جب وہ اِس ڈبے میں سوار ہوا تھا تو اُس کے سر میں آگ بھری تھی اَور اپنی زندگی کے واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزُرنا شرُوع ہُوئے تھے، جیسے انسان کے آخری وقت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یاد کی اِس آمد سے اُسے کسی نہ کسی حد تک حقیقی دنیا پہ اپنی گرفت کا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ چند منٹ کو اُونگھ گیا تو اُسے علم ہوا تھا کہ خوابوں پہ اَور خوابوں کی ہیئت پہ کسی صورت اُس کا قابو نہ تھا۔ آہستہ آہستہ، اُس رات کے سفر کے دوران اُس پہ یہ بات آشکار ہُوئی کہ گزُرے ہوئے اَور موجودہ اَور آنے والے نامعلوم وقت کی رفتار پہ اُس کی دسترس نہ تھی۔ گو کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ ایسی ہی تھی مگر اِس سے پہلے نہ اُسے کبھی حقیقت کو ہاتھ تلے رکھنے کی ضرورت محسوس ہُوئی تھی اَور نہ ہی خوابوں کے ناقابلِ گرفت ہونے سے وہ پریشان ہوا تھا۔ اُس کے اندر اَور باہر ایک توازن تھا جسے اُس کی زندگی کے چھوٹے بڑے حادثے بگاڑ نہ سکتے تھے، یہاں تک کہ اُس کی دو سالہ نظربندی نے بھی اُس کے اندر کسیلے خُون کی جو لہر دوڑا دی تھی وہ بھی نسیمہ سے اُس کی دوری اَور نسرین کی جانب ایک والہانہ اور بے جواز کشش پر ہی منتج ہُوئی تھی۔ اپنے خُون کی کڑواہٹ میں جذب ہو کر، اَور اُس سودا میں شامل ہو کر جسے اُس نے اپنے آس پاس دیکھا تھا، اپنے دِل میں اِس تنازعے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی یہ اُس کی غیر شعوری کوشش تھی جو شعور کی سطح پر پہنچتے ہی مسمار ہو گئی تھی۔ تاہم اُس کی شخصیت کے اِنضباط کی وہ عمارت جس کی تعمیر اُنیس برس کی عمر میں ملٹری اکیڈمی کے اندر شرُوع ہُوئی تھی، اپنی بنیادوں پہ بے لرزش قائم رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دِن کے اندر جو کچھ ہو گزُرا تھا اُس نے آخر کار اُس عمارت کی دیواروں میں دراڑیں ڈال دی تھیں، گو ابھی تک وہ اپنی زمین پہ اِیستادہ تھیں۔ رات بھر وہ گویا ہاتھ سے اُنہیں تھامے رہا تھا۔ پھر صبح کا ایک گھنٹہ ایسی سربستہ نیند میں گزرا تھا جس سے بیدار ہونے پر اُسے دنیا میں اپنی تازہ آمد کا احساس ہوا تھا۔ اس کے باطن کے اجزاء اب آہستہ آہستہ اِکٹھا ہونے شرُوع ہو گئے تھے۔ اب اُس کی منزل کے آنے میں ایک گھنٹے سے کم کا سفر رہ گیا تھا۔

سرفراز ہمسفروں کو دیکھ کر مسکرایا اَور اپنے ٹائیلٹ کا چھوٹا سا بیگ اُٹھا کر غسل خانے کو چل دیا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا رہے، مگر دُوسرے

مسافروں کے خیال سے شیو کر کے جلد ہی فارغ ہو کر نکل آیا۔ اپنے بیگ سے اُس نے تازہ کپڑے نکالے اَور دوبارہ غسل خانے میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ پھر وہ آ کر کھڑکی کے پاس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سٹیشن پر اُس کے لِئے جیپ کھڑی تھی۔ سپاہی غلام رسول نے اُسے سلوٹ کیا۔ سرفراز نے جواب دے کر سامان کے دو بیگ اُسے پکڑائے۔ جیپ روانہ ہُوئی۔

"یونٹ کا کیا حال ہے غلام رسول،" سرفراز نے پُوچھا۔

"سب ٹھیک ہے سر۔"

"مُوو کے لِئے تیاری ہے؟"

"بالکل سر۔ آڈر کا اِنتظار ہے،" ڈرائیور نے جواب دیا، پھر مناسب وقفے کے بعد پوچھا "پیچھے سب خیر تھی سر؟"

سرفراز اپنے خیال میں تھا۔ "ہنہ؟ اوہ، ہاں،" وہ بولا، "سب خیر تھی۔"

"شُکر ہے اللہ تعالیٰ کا سر۔"

"کوئی اَور خبر، غلام رسول؟"

"سب ٹھیک ہے سر۔ کل کرنل صاحب کی اِنسپکشن تھی۔"

"مُجھے علم ہے۔ انسپکشن خیر خیریت سے گزُر گئی؟"

"جی سر۔ کرنل صاحب شاباش دے کر گئے۔"

"بہت اچھا ہوا۔ ان سے شاباش مِل جائے تو بڑی بات ہے۔"

"ہاں سر، بہت اچھے افسر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اَیسے شریف افسر سب کو نصیب کرے۔"

"ہاں،" سرفراز نے مختصراً کہا۔

فوج کے ہر شعبے کے یونٹ بلوچستان کی شورش سے نبٹنے کے لِئے بھیجے جا رہے تھے۔ دس روز کے بعد سرفراز کا بریگیڈ بھی روانہ کر دیا گیا۔ بریگیڈ ہیڈ کواٹر خضدار میں تھا۔ وہاں سے چملانگ کے علاقے میں مری قبائل سے جنگ کرنے والی فورس کی کمک کے طور پر سرفراز کا یونٹ وہاں پہنچا۔ اِس سے قبل چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہی تھیں اور چند ایک بڑے مقابلے بھی ہو چکے تھے، جن میں فوج کا اِتنی تعداد میں جانی نقصان ہوا تھا کہ آخر اعلیٰ سطح پر اِسے "ناقابل قبول" تصور کیا گیا۔ اب ایک بڑے "آپریشن" کی تیاریاں ہو

رہی تھیں۔ اس کا نام "آپریشن ماؤنٹین گوٹ" رکھا گیا تھا۔ فارمیشن میں فضائی مدد بھی حاصل تھی جس میں میراج طیارے اور ایران سے مستعار لیے گئے ہلی کاپٹر "گن شپ" شامل تھے۔ سرفراز کی اپنی اِنفنٹری بٹالین تھی جس کا اپنا مارٹر یونٹ تھا۔ چملانگ کے گاؤں میں "پراریوں" کی پناہ گاہوں اور اسلحہ کے ذخیروں کی مخبری ہوئی تھی۔ سحری کے وقت حملہ شروع کیا گیا۔

سب سے پہلے مارٹر یونٹ سے گولہ باری کر کے ٹارگٹ کو "نرم" کیا گیا۔ اس کی آڑ میں سپاہیوں نے پہاڑوں پہ چڑھ کر گاؤں سے ذرا باہر، ایک سٹریٹجک مقام پہ پتھروں سے "پشتے" تیار کر دیئے، جن کی دیواروں کے سوراخوں میں اِنفنٹری نے مشین گنیں نصب کر دیں۔ جیسے ہی اجالا ہوا، کوبرا "گن شپ" آ گئے۔ اُنھوں نے اپنی انتہائی سبک گنوں سے سات سو پچاس فی منٹ کے حساب سے گاؤں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے بیمار لوگ، جو مارٹر کی گولہ باری سے پہلے ہی دہشت زدہ تھے، گھروں میں دبکے رہے، باقی، کیا پراری اور کیا عام دیہاتی، بھاگ اُٹھے۔ اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔ "پشتوں" سے مشین گنوں کے منہ کھل گئے۔ اِسی دوران گاؤں سے جوابی فائر بھی آنے لگا۔ یہ فائر ایک ایک گولی والی پُرانی طرز کی رائفلوں کا تھا۔ صرف ایک آٹومیٹک ہتھیار اِستعمال ہو رہا تھا، وہ بھی ایک وقت میں چند گولیاں چلا کر رُک جاتا، جس سے فوج کو اندازہ ہوا کہ ہتھیار یا تو پُرانا تھا یا دیسی ساخت کا تھا جو چلتا چلتا اٹک جاتا یا گرم ہو جاتا تھا گو جام نہ ہوتا تھا۔ یا پھر اس کے راؤنڈ محدود تعداد میں تھے جنھیں دشمن جلدی میں ختم کرنا نہ چاہتا تھا۔ اِنٹیلی جنس کی رپورٹ کہ پراریوں کے پاس مُزوکا ٹائپ گن یا کسی بڑی توپ کا ہونا ممکن تھا، غلط ثابت ہُوئی تھی۔

جوان لڑکے اور ادھیڑ عمر آدمی رائفلیں اُٹھائے گھروں سے بھاگتے ہُوئے نکلتے اور کھلی زمین پر کسی پتھر کے پیچھے یا چھوٹے سے گڑھے میں لیٹ کر جوابی فائر کرتے۔ پھر "گن شپ" آتے اور اپنی تررررر کرتی ہُوئی گولیوں سے گھروں کے پتھروں پہ چنگاریاں اور زمین پہ دھول کی لکیر اُڑاتے ہُوئے گزر جاتے۔ پتھروں اور گڑھوں کی اوٹ میں چھپے ہُوئے لوگ ہیلی کاپٹروں کے پنکھوں کی گڑگڑ سنتے ہی اُٹھ کر بھاگ نکلتے۔ کچھ دوڑتے اور فائر کرتے ہُوئے ایک طرف کو مسجد کی جانب بھاگتے، کچھ واپس گھروں کو دوڑتے ہوئے

جاتے۔ ان میں سے کوئی پشتوں سے آتی ہُوئی مشین گن کی گولی کی زد میں آ جاتا تو ہوا میں بازو پھیلا کر زمین پہ گرتا اَور ڈھیر ہو جاتا۔ گھروں سے عورتوں، مردوں اَور بچوں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اِس علاقے کے درختوں اَور جھاڑیوں کی مخصوص خوشبو کے ساتھ بارود کی تیز بو مِل کر فضا میں بکھری تھی، جسے سونگھ سونگھ کر فوجی جوان بھپرے جا رہے تھے۔

سرفراز اپنی کمپنی کے ہمراہ کھڑا کاروائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ پاس ہی ایک سپاہی وائرلیس کا ہلکا سا سیٹ لِئے زمین پہ بیٹھا تھا۔ سرفراز کو خود فائر کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح، پراریوں کے ہاتھوں فوج کے جانی نقصان کی خبریں سن سن کر غصے اَور اِنتقام کے جذبے سے مغلوب تھا۔ اُس نے پہلے ایک برسٹ مارا تو ایک آدمی اپنی رائفل سمیت زمین پہ گرپڑا۔ سرفراز اُسے دیکھتا رہا۔ اُس شخص نے صرف ایک کروٹ لی اَور سیدھا پُشت پہ لیٹ گیا۔ اُس کے بعد اُس کے بدن میں کوئی حرکت نہ ہُوئی۔ ایک دُوسرا بھاگتا ہوا پاس سے گزُرا اور اپنے گرے ہُوئے ساتھی کی طرف توجہ دیئے بغیر، اُس کی رائفل اُٹھا کر مسجد کی جانب بھاگ نِکلا۔ ایک طرف سرفراز کو ہلکی سی مسرت کا احساس ہوا کہ اُس کا وار کاری لگا تھا، دوسری جانب یہ دیکھ کر کہ ساتھی کی جان سے زیادہ اِس شخص کو اُس کی رائفل عزیز تھی سرفراز کے دِل سے خیال گزُرا کہ یہ لوگ جنگ سے مُنہ پھیرنے والے نہیں تھے۔ اِس کے علاوہ ایک تیسرا جذبہ اُس کے اندر کارفرما تھا۔ اِتنے فاصلے سے بھی اُسے نظر آ گیا تھا کہ تقریباً سب کے بدنوں پہ میلے کچیلے کپڑے تھے اَور کئی کے پھٹے ہوئے تھے۔ پھر اِن سب باتوں کے سوا ایک چوتھا امر بھی تھا۔ اِس امر کی خاصیت ایک خودکار حرکت کی سی تھی۔ سرفراز کی اُنگلی ایک آٹومیٹک ہتھیار کی لبلبی پہ تھی اَور اُنگلی کے ایک دباؤ کے بعد دُوسرے دباؤ کو روکنا ایک دشوار عمل تھا۔ جب اُس نے دوسرے شخص کو زد میں لینے کے لِئے نالی کا رخ موڑ کر لبلبی دبائی تو برسٹ نے اُس آدمی کو مسجد کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا۔ مگر سرفراز نے آخری وقت میں نالی کی نوک عمداً ٹارگٹ کے بدن کے نچلے حصے کی سیدھ میں کر دی تھی۔ ساتھ ہی اُس کے دل میں خواہش پیدا ہُوئی کہ گولیاں اُس شخص کو لگنے کی بجائے زمین میں دھنس جائیں۔ دونوں ہاتھوں میں دو رائفلیں اُٹھائے بھاگتا ہوا آدمی دھکے سے مُنہ کے بل زمین پہ جا گرا، مگر فوراً ہی اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا دوبارہ دوڑ اُٹھا اَور مسجد کے

دروازے میں داخل ہو گیا۔ گولیاں اُس کی ٹانگ پہ لگی تھیں۔ سرفراز کو احساس ہوا گویا ایک بوجھ اُس کے سر سے اُتر گیا ہو، گو یہ محسوس کر کے دِل میں اُسے ہلکی سی شرمندگی بھی ہوئی۔ اُس نے اپنی سٹین گن کی سیفٹی چڑھائی اَور اُسے ایک پتھر کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اُس کے بعد وہ دیوار کے ساتھ رکھے ہُوئے ایک بڑے پتھر پہ پاؤں رکھ کر اُس کے اوپر چڑھا اَور دیوار سے سر نکال کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"سر۔۔۔" سیکنڈ لفٹننٹ اِمتیاز تشویش سے بولا، "سر۔۔۔" ابھی الفاظ امتیاز کے مُنہ میں ہی تھے کہ ایک گولی "شاں" کر کے سرفراز کے کان سے تقریباً رگڑ کھاتی ہُوئی گزر گئی۔ سرفراز کو محسوس ہوا کہ اُس نے گولی کو دور سے آتے اَور اپنے پاس سے گزرتے ہُوئے دیکھا ہے۔ اُس کا سر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اُس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ گولی کے خطرے سے بے خبر وہ دیوار سے سر نکالے کھڑا رہا۔ اُسے اپنے جسم میں ایسی قوت کا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ وہیں پہ کھڑا کھڑا جست بھر کر ہوا میں اڑنا شروع کر سکتا تھا۔

"سر۔۔۔" اُس نے اپنے بازو پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

"سر، گیٹ ڈاؤن۔"

سرفراز نے چونک کر لفٹننٹ اِمتیاز کو دیکھا اَور پتھر سے چھلانگ لگا دی۔ گولی گزرنے کے بعد وہ بمشکل دو یا تین سیکنڈ وہاں کھڑا رہا۔ مگر اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک عمر تک اُس جگہ پر ہوا میں سر اٹھائے اُس بارود بھری بو کو سونگھتا رہا ہو۔ اُس نے اپنی سٹین گن اُٹھائی اَور اُس کا سیفٹی کیچ اتار دیا۔

"گن شپ" ہیلی کاپٹروں نے تین چار اُڑانیں لگائیں اَور کچے پکے مکانوں کے پرخچے اُڑاتے گزر گئے۔ پھر مزید جہاز گولیاں برساتے ہُوئے آئے۔ اب میدان میں کوئی بھاگتا دوڑتا ہوا شخص نظر نہ آ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُنھوں نے پکے مورچے لگا لیے تھے۔ اِکا دُکا جوابی فائر آ رہا تھا۔ یہ مقابلہ تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ میدان میں ایک درجن کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ جب آخری بار ایک ہیلی کاپٹر اپنی مانوس گڑگڑ لیے آیا اَور چھوٹے چھوٹے تیز آہنی دھماکوں سے، جیسے کوئی آرا لوہے کی سلاخ پہ چل رہا ہو، گولیاں برساتا ہوا گزر گیا اَور گھروں کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو کئی منٹ تک دِل ہلا دینے والا مکمل سناٹا چھایا رہا۔ جوابی فائر بھی بند ہو چکا تھا۔ اچانک وائرلیس سے تڑختی ہُوئی

آوازیں نکلیں، آرڈر آگے دیا گیا، اور فوجیوں نے مکانوں پہ ہلہ بول دیا۔ وہ بندوقوں کے دستوں اور بوٹوں کی ٹھوکروں سے گھروں کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہونے لگے۔ اب گھروں میں سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ اِس واویلے کے درمیان فوجی، اپنی گنیں نشانے پہ تیار رکھے، مسلسل دروازے توڑ توڑ کر گھروں میں داخل ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے تلاشی لینے والے ایک کے بعد دوسرے مکان میں آگے بڑھتے جاتے تھے، کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے مکینوں کا ملا جلا شور بلند ہوتا جا رہا تھا۔

یکایک ایک مکان کے ندر سے ایک بوڑھا معذور شخص بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا نکلا اور انتہائی بے خطر طور پہ اُس کھلی زمین کے درمیان میں آ کر رُک گیا۔ اُس کے بدن پہ بھی پُرانے اور میلے کپڑے تھے، گو پھٹے ہوئے نہ تھے۔ صرف اُس کی شلوار کا ایک پائنچہ ٹخنے سے کچھ اُوپر تک اُٹھا ہوا تھا، جیسے نیفے سے مروڑ کر چڑھایا گیا ہو۔ سرفراز کو اُس کا سوجا ہوا ٹخنہ نظر آ رہا تھا، اور جہاں پنڈلی دکھائی دیتی تھی وہاں تک سوجن نمایاں تھی۔ یہ وہ ٹانگ تھی جسے وہ آدمی زمین سے اُٹھا کر رکھے ہوئے تھا اور جس کی وجہ سے وہ چلنے کے لئے بیساکھیوں کی مدد لے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میدان میں رُکا اُس نے بیساکھیوں پہ اپنے آپ کو سہار کر بایاں بازو آزاد کیا۔ بازو کو ہوا میں بلند کر کے وہ مُنہ سے کچھ بولا، مگر اُس کی آواز عقب سے آتی ہوئی گولیوں کی آواز میں دب کر رہ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوابی فائر اُس کی تائید میں آیا تھا۔ فوجیوں کے پشتوں سے مشین گنوں نے دو تین بوچھاڑیں ماریں، مگر اِس احتیاط کے ساتھ کہ اُن کا نشانہ صرف اُدھر کو جائے جدھر سے فائر آیا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے درمیان وہ بھاری بھرکم بدن اور چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی سفید ڈاڑھی والا آدمی اپنی جگہ سے ہلے بغیر کھڑا رہا۔ ہوا میں بلند کیا ہوا بازو اُس نے چند لمحے کو نیچے گرایا اور بیساکھی پر ٹٹول کر دوبارہ بلند کیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی رائفل تھی، جو بیساکھی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہونے کے باعث اس سے قبل دِکھائی نہ دی تھی۔ یہ ایک ایسی کہنہ رائفل تھی جو قدیم زمانے میں، جب آتشیں ہتھیار ایجاد ہوئے تھے، استعمال کی جاتی تھی، اور جس کے اندر، نالی کے اگلے سرے کے رستے، ایک گز کی مدد سے بارود بھرا جاتا تھا۔ اِس کی نالی لمبی اور دورمار ہوتی تھی۔ اِسے سر سے اُوپر اُٹھائے، وہ شخص اب اکیلا میدان میں کھڑا تھا

اور دونوں جانب سے فائر بند ہو چکا تھا۔

"میں سردار علمبند خان ہوں،" وہ اپنی بھاری، خرخراتی ہوائی آواز میں پکار کر بولا۔ "اِس سے پیشتر کہ ہماری خواتین تمہارے ہاتھوں بے عزت ہوں، میں لڑ کر مرجانا پسند کروں گا۔"

سرفراز اُس کی بندوق کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا، اور دل میں توقع کر رہا تھا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا سردار عورتوں اور بچوں کو نکال کر میدانِ جنگ سے لے جانے کی تجویز پیش کرے گا، یا۔۔۔۔ سب سے خوش کن توقع۔۔۔۔ ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کرے گا۔ ایک اور مزاحیہ سا خیال اُس کے دل میں تھا کہ ابھی یہ شخص بندوق کی نالی کے نیچے نصب کیا ہوا گزالگ کرے گا، جیب سے بارود اور باقی ماندہ سامان نکالے گا، اور سامنے سے نالی کے اندر گز پھیر پھیر کر اسے بھرنا شروع کرے گا۔ سرفراز گہرے اشتیاق سے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا کہ ایک اِنتہائی غیر متوقع حرکت اُس کے دیکھنے میں آئی۔ سردار نے دائیں بیساکھی اور بائیں ٹانگ پہ اپنے آپ کا توازن کر کے، صرف بائیں ہاتھ میں اُس بھاری بندوق کو اُٹھایا اور اُس کے دستے کو کندھے پہ جمالیا۔ اُس کی اُنگلی لبلبی پر تھی اور بندوق کا نشانہ ایک پشتے کی دیوار پہ تھا۔ سرفراز اپنے پشتے کے ایک سوراخ سے آنکھ لگائے ہوئے تھا اور اُسے یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ نالی پشتے کے ساتھ لگی تھی اور اُس میں واضح لرزش تھی۔ بوڑھے سردار کا بازو بندوق کے بوجھ سے کپکپا رہا تھا۔ سرفراز کو محسوس ہوا کہ اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا مشین گنر سردار کو گولی مارنے والا تھا۔ اُس نے گنر کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر رُکنے کا اِشارہ کیا۔ سرفراز کو یقین نہ آ رہا تھا وہ شخص اِس مضحکہ خیز بندوق کو چلائے گا۔ مگر یکایک سردار نے لبلبی دبا دی۔ اُس عجیب و غریب ہتھیار سے اِس قدر بلند دھماکہ ہوا جیسے کوئی چھوٹی موٹی توپ داغی گئی ہو، اور اُس کی نالی سے اُسی مقدار میں شعلہ اور دُھواں برآمد ہوا۔ فائر کے دھچکے سے نالی لپک کر اُوپر کو اُٹھی اور گولی کے سکے اپنے نشانے سے کوئی دو فٹ اُوپر دیوار کے پتھروں پہ آ کر لگے۔ اس کے دھکے سے بوڑھا سردار پیچھے کو لڑکھڑایا، مگر اُس نے بندوق پھینک کر دُوسری بیساکھی کو جو اُس کی بغل میں پھنسی تھی، قبضے میں کیا اور دونوں کی مدد سے اپنے آپ کو گرنے سے بچالیا۔ سرفراز کا ہاتھ ابھی تک اپنے گنر کے بازو پہ رکھا تھا جو خاموشی سے سوراخ میں دیکھ رہا تھا۔ اُسی وقت تیسری جگہ پر نصب مشین گن

سے ایک برسٹ نکلا اَور سردار بری طرح لڑکھڑاتا ہوا زمین پہ جا گرا۔ اُس کے بھاری جسم نے زمین پہ دو کروٹیں لیں، ناکارہ ٹانگ ایک بار ہوا میں اُٹھی جس سے اُس کا پائنچہ پھسل کر گھٹنے تک جا چڑھا، پھر وہ ساکت ہو گیا۔

"ذیم----" سرفراز چیخا "ذیم----" وہ اُٹھا اَور پتھر کی بے در دیوار کی جانب رُخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

اب جوابی فائر تڑاتڑ آنا شروع ہو گیا تھا، جیسے دشمن نے اپنا گولی بارود ایک ہی وار میں ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ اِدھر سے مشین گنوں کے دہانے بھی کھل گئے۔ فضا بارود کے دھوئیں اَور گرد کے غبار کی بو سے بھری، چھوٹے بڑے دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ کوئی بندہ بشر اب دکھائی نہ دیتا تھا۔ دونوں جانب کی گولیاں صرف پتھروں سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر سے اُڑ رہی تھیں یا مٹی کی دیواروں میں دھنسی جا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ سرفراز اِس عالم میں خاموش کھڑا دیوار کو تکے جا رہا تھا، جیسے اُس کا اِس کاروائی سے براہ راست کوئی سروکار نہ ہو۔ اُس کے سب آدمی احکامات کے مطابق اپنا اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ صرف سرفراز کے سامنے ابھی تک بوڑھے سردار کی اُس ٹانگ کا منظر تھا جو ایک لمحے کو ہوا میں اُٹھی اَور پھر گر گئی تھی مگر سرفراز کی نظر میں وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔ یہ ٹانگ ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک سوج کر کپا سی بن چکی تھی اَور دیکھتے دیکھتے ہی اُس ٹانگ میں تبدیل ہو گئی جو سرفراز نے اپنے گھر میں اعجاز کے دھڑ پہ دیکھی تھی۔

یہ میدان کار زار تین گھنٹے تک گرم رہ کر آخر فوج کی فتح میں انجام کو پہنچا۔ باہر میدان میں، گھروں کے اندر اَور مسجد میں کل پینتیس پراری مارے گئے، باقیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ ستر سے زائد کی گرفتاری عمل میں آئی، سات فوجی جوان کام آئے، اسلحہ بارود کا کوئی ذخیرہ برآمد نہ ہوا۔ "آپریشن ماؤنٹین گوٹ" کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد یونٹ خضدار میں بریگیڈ ہیڈکوارٹر پہنچ چکی تھی۔

سرفراز کا بٹالین کمانڈر لفٹننٹ کرنل اِسلام الدین میس میں میز کے گرد چند جونیئر افسروں کو لیے بیٹھا تھا۔ ڈنر ختم ہو چکا تھا۔ مشن کامیابی سے مکمل ہو جانے کے ماحول میں خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ سرفراز نے اُن میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا ختم کر کے "ایکسکیوزمی" کہتا ہوا اُٹھ گیا۔ کرنل اِسلام الدین اپنے ٹُو او-سی- کو میس سے باہر

جاتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو گئی۔

"میجر سرفراز شاید میجر اشرف سے ملنے گئے ہوں گے،" کیپٹن اسرار نے کہا۔

"میجر اشرف؟" کرنل اسلام نے سوال کیا "وہ آرٹلری والا؟ ہاں، آئی نو، سرفراز کا بیچ میٹ ہے۔ مگر اُس کی یونٹ تو کوئٹہ میں ہے۔"

"آج صبح اُنہیں دیکھا تھا،" کیپٹن اسرار نے کہا۔

بات ختم ہو گئی۔ گفتگو دوبارہ شروع ہوئی۔ سرفراز پانچ سات منٹ تک اِدھر اُدھر چل پھر کر ایک جگہ پہ رُک گیا۔ شرفی دِن کے وقت اُس سے مِل کر واپس جا چکا تھا۔ سرفراز فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ دِن کو خیرباد کہہ کر اپنے بستر پہ جائے یا کہ واپس میس میں۔ رات ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہ ہوئی تھی اور نیند کا اُس کے آس پاس نام و نشان تک نہ تھا۔ آخر اُس نے کچھ دیر کے لِئے واپس میس میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ چند قدم جو سرفراز چل کر میس تک گیا اُنہوں نے اُس کی تقدیر بدل دی۔

میس میں داخل ہو کر سرفراز نے چاروں طرف دیکھا۔ کسی میز کے گرد سیٹ خالی نہ تھی، سوائے اُس کرسی کے جہاں سے وہ اُٹھ کر گیا تھا۔ مجبوراً اُسے جا کر وہیں پہ بیٹھنا پڑا۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔

"کیوں بھئی، ہوا کھا آئے؟" کرنل نے خوشدلی سے پُوچھا۔

"جی ہاں، سر،" سرفراز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سر وہ قِصّہ تو سنائیں،" کسی نے کرنل سے کہا۔

"کونسا قِصّہ؟"

"وہ جو سیکنڈ ورلڈ وار کا آپ سنانے لگے تھے۔"

"ہاں، انگریزوں کی فوج کا قِصّہ ہے۔ سیکنڈ ورلڈ وار کا نہیں، گریٹ وار کا ہے۔ بیٹل فیلڈ میں ایک ٹرینچ کے اندر دو افسر ایک دُوسرے کے سامنے آ گئے۔ ٹرینچ تنگ تھی، اُن میں سے ایک کو راستہ دینا پڑتا تھا۔ مگر دونوں میں سے کوئی راستہ دینے کو تیار نہ تھا، ایک دُوسرے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہے۔ آخر ایک نے پُوچھا "ہو آر یو؟" دوسرے نے جواب دیا، "آئی ایم کیپٹن وائی کاؤنٹ لنکن آف دی لائف گارڈز۔ ہو آر یو؟" پہلا بولا، "آئی ایم میجر لارڈ لیوئن آف دی گرینیڈیئر گارڈز اینڈ آئی بیٹ یو آن آل

تھری کاؤنٹس۔ گیٹ آؤٹ آف مائی وے۔"

میز کے گرد دوبارہ قہقہے بلند ہوئے۔ سرفراز نے یہ لطیفہ سن رکھا تھا۔ وہ آہستہ سے مسکرا دیا۔

"یو سی،" کرنل بولا، "دس اِز ہاؤ رجمنٹس آر میڈ۔"

"ٹرو سر، ویری ٹرو،" ایک کیپٹن بولا۔

"کیا بات ہے سرفراز،" کرنل اسلام الدین نے اچانک پُوچھا۔ "تم کچھ خاموش دِکھائی دے رہے ہو۔ اِز ایوری تھنگ آل رائٹ؟"

"اِٹس آل رائٹ سر،" سرفراز نے جواب دیا۔

"یو وانٹ تو سپیک ٹو می اِن پرائیویٹ؟"

"نہیں سر، کوئی بات نہیں۔"

"تم پہلے ایکشن تو دیکھ چکے ہو نا؟"

"سر؟" سرفراز نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے پُوچھا۔

"ایسٹ پاکستان میں۔۔۔۔"

جیسے ہی کرنل نے یہ کہا سرفراز کا پارہ چڑھنا شروع ہوگیا۔

"ہاں سر، دیکھ چکا ہُوں۔ مگر میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"نیور مائینڈ،" کرنل بولا۔ "میں سمجھا شاید کل کے ایکشن نے تمہیں اَپ سیٹ کر دیا ہو۔"

"اَپ سیٹ کرنے والا تو تھا،" سرفراز بدلی ہُوئی آواز میں بولا، جسے کرنل نے، اور دوسرے سُننے والوں نے بھی محسوس کیا۔

"کس لحاظ سے؟" کرنل نے پُوچھا۔

"اُس بوڑھے آدمی کو شوٹ کرنا غیر ضروری تھا،" سرفراز نے کہا۔

"وہ تو اُن کا لیڈر تھا۔ سردار تھا۔ تم اِس علاقے کے قبائیلیوں کو نہیں جانتے۔ اِن کا سردار ہر لحاظ سے اِن کا کمانڈر ہوتا ہے۔"

"مگر اُس کمانڈر نے تو بندوق ہی پھینک دی تھی۔ اُسے ختم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ڈی سورلائیز کرنے کے لیے یہ ٹیکٹک ضروری تھا۔ حیرت ہے سرفراز کہ تم ایک ایسی بات کر رہے ہو جو ابتدائی مینوئلز میں پڑھائی جاتی ہے۔"

"آپ کے مینوئلز کی وجہ سے تو ہمارا نقصان ہوا ہے۔"

"کیسا نقصان؟"

"ہمارے جو سات سولجرز کالاس ہوا ہے اُن میں سے تین اُس حملے میں مارے گئے جو سردار کے مرنے کے بعد دشمن کی طرف سے ہوا۔"

"ٹھیک ہے، ٹروپس لاس جنگ میں سٹریٹجک کیلکولیشن ہوتی ہے۔ اگر اُس بڈھے کو ختم نہ کرتے تو اس وقت تک ہم وہیں بیٹھے ہوتے اور دشمن کبھی سرنڈر نہ کرتا۔"

"سر" ایک لفٹننٹ بولا" اُس سردار کی اٹھارویں صدی کی رائفل دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔"

"شٹ اپ،" سرفراز نے طیش میں لفٹیننٹ سے کہا۔

کرنل اُٹھ کھڑا ہوا۔ "آئی تھنک دیٹ از اینف جنٹلمین۔" وہ بولا۔ "سرفراز، آئی وانٹ تو ہیو اے ورڈ وِد یو۔"

"آئی ڈونٹ وانٹ تو ہیو اے ورڈ وِد اینی باڈی رائٹ ناؤ،" سرفراز نے غصے میں کہا۔

دفعتاً سرفراز کی آنکھوں کے آگے چند لمحے کے لِئے اندھیرا چھاگیا جیسے خون کا دباؤ اُس کی پتلیوں کو چڑھ آیا ہو۔ اِس اندھیرے میں اُسے صرف سرداو کی سوجی ہوئی ٹانگ ہوا میں ڈنڈے کی طرح اُٹھی ہوئی، اور پھر اعجاز کی ٹانگ کی شکل اختیار کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، حتیٰ کہ سردار کی اپنی شکل اعجاز کی صورت میں بدل گئی۔ سرفراز اس تاریکی سے نکلنے کے لِئے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

جب اُس کی آنکھوں میں روشنی لوٹ کے آئی کرنل اِسلام الدین کرسی پہ گرا پڑا تھا اور سرفراز اُس کے اُوپر جھکا اُسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا۔ "تم اپنے ہی آدمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟" سرفراز نے اپنے آپ کو چیخ کر بولتے ہوئے سنا۔ میس میں موجود سارے کے سارے لوگ اُن کے گرد جمع تھے۔ وہ سرفراز کو کھینچ کر کرنل سے جدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چند منٹ کی کشمکش کے بعد وہ سرفراز کو پکڑ کر میس سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس وقت تک سرفراز ہوش میں آ چکا تھا اور دُوسرے افسروں کے ہمراہ خاموشی سے بے مزاحمت چلا جا رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اُس نے کیا کیا ہے۔

رات کے بارہ بجے کے قریب سرفراز کو گرفتار کر لیا گیا۔

باب 22

سرفراز کا سارا اندرونی زہر ایک ہی ہلے میں خارج ہو چکا تھا۔ اُسے رات بھر نیند نہ آئی، مگر ایک عجیب طمانیت کی کیفیت اُس پہ طاری رہی۔ اُس کے خیال میں یہ ڈسپلنری ایکشن، اَور اِنتہائی صورت میں کورٹ مارشل کا کیس ہو سکتا تھا۔ مگر خلاف توقع، اگلی صبح اُسے ایف آئی ٹی (فیلڈ اِنٹیروگیشن ٹیم) کے سپرد کر دیا گیا۔ ایف آئی ٹی کا کمانڈر میجر نواز کھوکھر تھا۔ اکیڈمی سے نکلنے کے بعد پہلی بار سرفراز کا نواز کھوکھر سے سامنا ہوا تھا۔

نواز کھوکھر کی ظاہری شکل وصورت میں ان آٹھ برسوں کے اندر بہت کم فرق آیا تھا۔ وہی گول مٹول، بڑی بڑی آنکھوں والا بچوں کا سا چہرہ، وہی بھاری کولہے اَور ہلکی سی مٹکتی ہُوئی چال۔ صرف اُس کی جلد میں کھردرا پن اَور پیلاہٹ آ گئی تھی اَور ٹھوڑی پہ چند بالوں کا اضافہ ہوا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ میں اعتماد آ گیا تھا۔

"ہلو سر،" وہ 'سر' پہ زور دے کر بولا۔

سرفراز ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک کرسی پہ بیٹھا تھا۔ کمرے میں ایک دوسری کرسی اَور ایک میز تھی۔ کمرے کا فرش اَور دیواریں ننگی تھیں۔

"ہلو نواز،" سرفراز نے جواب میں مسکراتے ہُوئے کہا۔

"بھئی یہاں کیسے آ پہنچے؟" نواز نے کہا۔

سرفراز نے محسوس کیا نواز کھوکھر اب اُسے برابری کی سطح پر مخاطب کر رہا تھا۔

"بس دیکھ لو،" سرفراز نے کہا۔ "تُم سے اِن حالات میں ملاقات کی توقع نہ تھی۔"

"سیم ہیئر،" نواز نے کہا۔ "بٹ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ اینڈ دِس" وہ سرفراز کے سامنے کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا، "اِز وہیئر اِٹ سٹارٹس۔"

سرفراز اطمینان سے نظر جمائے اُسے دیکھتا رہا۔

"دیکھو بھئی سرفراز،" نواز نے دونوں ہاتھ میز پہ رکھتے ہُوئے کہا۔ "ہم اولڈ کولیگز ہیں، مگر اِس وقت ہم آپوزٹ سائیڈز پر ہیں۔ اِس لیئے میں صاف صاف بات کرونگا۔ دو طریقے ہیں۔ یا تو تُم سچ سچ ساری بات بتا دو، یا پھر ہم اپنی ڈیوٹی ادا کریں گے۔

یہ سب تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

سرفراز اُس کے انداز سے ذرا چونکا۔ اُس نے پُوچھنا چاہا "کیا ڈیوٹی دو گے؟" مگر رُک گیا۔ اُس کے دل میں غصہ تھا مگر اُس کے اندر جو ایک گہرے اطمینان کا بنیادی پتھر تھا اُس میں کوئی ہل جل نہ ہوئی تھی۔

آخر اُس نے پُوچھا۔ "سچ سچ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں کرنل اِسلام کی کسی بات سے اَپ سیٹ ہو گیا تھا۔ یہی ساری بات ہے۔"

"کس بات سے اَپ سیٹ ہو گئے تھے؟"

"میرے تین سولجر ناجائز مارے گئے تھے اَور کرنل نے اِس پہ افسوس کرنے کی بجائے کہا کہ یہ،" سرفراز زور دے کر بولا "سٹریٹجک کیلکولیشن کا معاملہ تھا۔ میری جگہ پر اگر تم بھی ہوتے۔۔۔۔" سرفراز رُک گیا۔ نواز کی آنکھوں کا تاثر دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ نواز کی مسکراہٹ میں اُس نے جو اعتماد کا تصور کیا تھا وہ دراصل مکاری کی نشانی تھی، جو اب آہستہ آہستہ عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بات بدل کر بولا "بس میں آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔ اُس وقت مُجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ آئی ایم سوری۔"

"تمہارا اوفینس سوری کرنے سے ذرااا سا بڑا ہے،" نواز طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

"بہرحال، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں کوئی اَور بات کر رہا ہُوں۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟"

نواز کھوکھر کہنیاں میز پہ رکھے، سر جھکا کر ماتھے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کسی سوچ میں ہو۔ پھر اُسی انداز میں سر اُٹھائے بغیر بولا "تمہاری سٹوری اِنڈیا سے شروع ہوتی ہے۔"

"اِنڈیا سے؟" سرفراز نے حیرت سے پُوچھا۔

"پی او ڈبلیو کیمپ میں گارڈ سنتونت سنگھ سے تُمہاری گھڑی چھنتی تھی۔"

"کیا مطلب؟ ہم پی او ڈبلیو تھے، وہ گارڈ تھا، گھڑی کیسے چھن سکتی تھی؟"

"وہ خاص طور پہ تُمہاری ریکوائیرمنٹ پر اخبارات لا کر مہیا کرتا تھا۔"

سرفراز بے ساختہ ہنس پڑا۔ "یہ تُم کیا بات کر رہے ہو؟ میں نے کبھی اُسے یا کسی

اور گارڈ کو کسی چیز کی کوئی ریکوائرمنٹ نہیں دی۔ اخبارات سب کے لئے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ چن کر وہی اخبارات بھیجے جاتے تھے جن میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا تھا۔"

"حوالدار ستونت سنگھ نے تمہارا پیغام کیمپ کے میجرست پال ٹھاکر کو پہنچایا تھا، اور میجرست پال نے تمہاری ملاقات ریڈ کراس کے ایک افسر سے کرائی تھی۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے کسی ریڈ کراس کے آدمی سے علیحدگی میں ملاقات نہیں کی۔ ریڈ کراس کی ٹیم نے خود ہمارے کوارٹرز کا دورہ کیا تھا۔ ہمارا ایک گروپ اُن سے مطالبات کے سلسلے میں ملا تھا، جس کے نتیجے کے طور پر ہمارے کوارٹروں میں پنکھے لگے تھے۔ اس گروپ میں کیپٹن فاروق ------- "

"یس یس،" نواز کھوکھر ہاتھ اٹھا کر بولا، "وی نو ہو واز ان دی گروپ۔ وہ تندور ایسکیپ کی جو مخبری ہوئی تھی وہ ستونت سنگھ کے ذریعے ہوئی تھی۔"

"ہمیں اِس کی کوئی خبر نہیں۔ تمہارے پاس اِس کا کیا سورس ہے؟"

"ہماری معلومات کے کئی مختلف سورسز ہیں،" نواز بولا۔ "ستونت سنگھ سے صرف تمہارے رابطے کا ثبوت ملتا ہے۔"

"کیا ثبوت ہے؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے پری لمنریز کا فیصلہ ہو جائے۔"

"تو تمہارے خیال میں کیا میں نے خود ہی مخبری کر کے سزا کاٹنے کا بندوبست کیا تھا؟ ہم لوگوں نے سزا کاٹی تھی۔ تمہیں کیا خبر ہے؟ تم تو یہاں آرام سے بیٹھ کر اپنی،" سرفراز زور دے کر بولا، "انٹیلجنس، چلاتے رہے۔ اور اب تمہارا خیال ہے کہ میں نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی؟"

"وسیع تر مقاصد کی خاطر تاریخ میں ایسے واقعات لوگوں کے ہاتھوں ہو چکے ہیں۔"

"تاریخ! تمہیں تاریخ کا کیا پتا ہے؟ میں تمہارے ساتھ کوئی بات کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جو مرضی ہو کرتے رہو۔"

اُن کا پہلا سیشن اِس مقام پہ ختم ہوا۔ سرفراز اپنے آپ پہ قابو رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک کسی نے اُس کے ساتھ رابطہ نہ کیا۔ گارڈ کے اندر آئے

باقاعدہ آفیسرز میس سے کھانا دیا جاتا رہا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت نواز کھوکھر پھر آ موجود ہوا۔ آتے ہی اُس نے پہلے روز کی طرز پہ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک نیا حربہ اُس نے یہ اپنایا کہ ایک ہی سانس میں تین تین مختلف سوال تابڑ توڑ کرنے لگا جیسے کہ وہ سرفراز کو درہم برہم کرنا چاہتا ہو، گو ابھی وہ براہ راست الزام تراشی سے اجتناب برت رہا تھا۔ سرفراز ابھی تک اطمینان کی حالت میں تھا، گو وہ دِل میں نواز کی مہارت کا معترف ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے جوابی حکمت عملی یوں اختیار کی کہ اپنے جواب مختصر سے مختصر کرتا چلا گیا۔ اُسے علم تھا کہ نواز---- جنگی اصطلاح میں---- توپخانے کا کام کر رہا تھا، تا کہ "دشمن" اَور اُس کی زمین کو بھرپور حملے کے لِئے سازگار بنایا جا سکے۔ اِس کا تدارک سرفراز کے علم میں یہی تھا کہ نیم خاموشی میں پناہ لی جائے، تا کہ اپنا نقصان بھی محدود ہو اَور وقتاً فوقتاً ایک آدھ فائر کر دینے سے اپنی موجودگی اَور جنگ جاری رکھنے کے عزم کا پتا بھی پہنچایا جاتا رہے۔ دُوسرا روز بھی اِسی طرح گزُر گیا۔ نواز اپنے حربے کارگر نہ ہوتے دیکھ کر اب اپنی روش سے کچھ اُکھڑنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ تیسرے روز نہایت نرمی سے بات شروع کرنے کے کچھ دیر بعد اُس نے اچانک پینترا بدلا۔

"ہماری رپورٹ کے مطابق تُم اِنڈیا سے برین واش ہو کر آئے ہو، اَور تمہارا مشن پاک آرمی کے مورال کو سب ورٹ کرنا ہے۔"

سرفراز اِس مُنہ در مُنہ حملے کے لِئے تیار نہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک، آنکھیں پھاڑے نواز کو دیکھتا رہا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نواز کھوکھر تھا جس کے ساتھ چھ سات برس پہلے پی ایم اے میں اُس کی واقفیت ہُوئی تھی، اَور جس کی ایک موقع پر اُس نے مدد بھی کی تھی، گو اس واقعہ کی تفصیل وہ بھول چکا تھا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود اب غصہ سرفراز کے سر کو چڑھنے لگا تھا۔

"یہ مجھ سے کہہ رہے ہو جس نے جنگ لڑی ہے اَور قید کاٹی ہے؟" اُس نے کہا۔

"قید کاٹنے والے ہی اَیسے کام کرتے ہیں۔ جو آرام سے زِندگی بسر کر رہے ہوں اُن کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اِس قسم کا رِسک لیں۔"

"اِنڈیا میں، میں کبھی قید تنہائی میں نہیں تھا" سرفراز نے کہا۔ "میرے ساتھی وہاں پر میرے کانڈکٹ کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

"جو عرصہ تُم نے ہسپتال میں گزارا اُس دوران تُمہاری رپورٹ ڈاؤٹ فُل ہے۔"

"ابھی تو تُم بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ میں برین واش ہو کر آیا ہوں، اب تُم ڈاؤٹ فل پر آ گئے ہو۔ اور ہسپتال میں ستونت سنگھ کہاں تھا؟"

نواز اپنی بات سے صرف ایک لمحے کو ٹھٹکا اور فوراً سنبھل گیا۔

"ڈی بریفنگ" وہ مختصراً بولا۔

"ڈی بریفنگ؟ واٹ ڈی بریفنگ؟ کیا اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو؟ ڈی بریفنگ سے کلیئر ہوئے مجھ آٹھ ماہ ہو چکے ہیں۔"

"تمہاری ڈی بریفنگ رپورٹ میں سب کچھ موجود ہے۔ اِنٹیلیجنس۔"

"کونسی اِنٹیلیجنس؟ تُمہاری سوکالڈ انٹیلیجنس جس نے سب کا بیڑا غرق کیا؟ اُدھر وہاں کا بھٹہ بٹھایا، اِدھر اپنے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی؟ یو اینڈ یور بلڈی اِنٹیلیجنس۔"

"یہ تو آہستہ آہستہ پتا چلے گا کہ کیا ہوا۔ یہی پتا چلانا ہمارا کام ہے۔"

"تو اِسی جھوٹ کو سچ کرکے دکھانے کا 'کام' تُمہیں سونپا گیا ہے؟ میں تُمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا" سرفراز تیزی سے بولا "میں جنرل ایڈووکیٹ سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ تُمہارے جیسے جانوروں سے میرا چھٹکارا کرایا جائے۔ یہ میرا رائٹ ہے۔ ڈپارٹمنٹل انکوائری کے بعد اگر میں قصور وار ثابت ہو جاؤں تو میرا کورٹ مارشل کیا جائے۔ مُجھے ایف آئی ٹی کے حوالے کیوں کیا گیا ہے؟"

"پہلے تو اِس کا فیصلہ میں کرونگا" نواز کھوکھر مسکرا کر بولا۔

یوں تیسرا دِن بھی ختم ہوا۔ چوتھے روز معاملہ آخر حد کو پہنچ گیا۔ سب سے پہلے لنچ میں تاخیر ہُوئی۔ سرفراز نے پچھلے دو وقت سے کچھ نہ کھایا تھا۔ رات کو بھی دو نوالے لے کر چھوڑ دیا تھا، اور صبح کو آدھی پیالی چائے پی کر باقی ناشتہ واپس بھیج دیا تھا۔ اب اُس کے معدے میں خوراک کی مانگ پیدا ہو چکی تھی۔ ایک بجے اُسے بھوک کی طلب پیدا ہُوئی۔ دو بجے اُس کی انتڑیاں مروڑ کھانے لگیں۔ ایک آدھ بار اُس نے سوچا کہ گارڈ سے معلوم کرے، مگر عزت نفس اُس کے آڑے آ گئی۔ تین بجے وقت گزُر گیا۔ بھوک معدوم ہو

گئی۔ وہ دو کھیسوں والی چارپائی پہ، جس پہ وہ سوتا تھا، جا کر لیٹ گیا۔ وہ ہلکی غنودگی کے عالم میں تھا کہ نواز کھوکھر آ پہنچا۔ سرفراز نے آنکھیں کھولیں مگر لیٹا رہا۔

"لنچ کر لیا؟" نواز نے پُوچھا۔ اُس کے چہرے پہ دو متضاد عنصر آپس میں جنگ کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے---- بچوں کی سی معصومیت، اور مکاری بھری مسکراہٹ۔ سرفراز نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ کوئی جواب نہ پا کر نواز کرسی پہ جم کر بیٹھ گیا۔

"بھئی بات یہ ہے،" نواز نے بات شروع کی، "کہ اب تک جو باتیں ہُوئی ہیں وہ محض اضافی تھیں۔ درحقیقت ہم پچھلے کئی مہینے سے تمہیں واچ کر رہے تھے۔"

سرفراز چپکا لیٹا رہا۔

نواز نے ایک منٹ اِنتظار کیا، پھر بولا، "جو تُم بار بار چھٹیاں لے کر گھر کا رستہ لیتے رہے ہو، یہ کیا قصہ ہے؟"

سرفراز یکایک اُٹھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ اُس کے دِل سے کئی خیال ایک ساتھ گزرے۔ "کیا مطلب ہے؟" وہ بولا، "تُم گھر نہیں جاتے؟ یا تُمہارا کوئی گھر ہی نہیں ہے؟"

"لیکن میرے گھر میں ملک کا کوئی غدار نہیں ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ صاف صاف بات کرو۔"

"میرے خیال میں تُمہیں سب علم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہُوں۔ تُم خُود ہی بتا دو۔"

"میرے پاس تُمہیں بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔" سرفراز چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جاؤ کسی اَور سے بات کرو۔ میں جنرل ایڈووکیٹ کو خط بھیجنے کا حق ڈیمانڈ کرتا ہُوں۔"

"تمہارے بھائی کے قبضے میں آرمی کا ایک ٹاپ کلاسیفائیڈ ڈاکومنٹ آیا ہے، جو اُس نے پبلک میں نشر کیا ہے۔"

سرفراز اچنبھے کی حالت میں نواز کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دستاویز کیا آرمی کی تھی جو اعجاز کے پاس تھی؟ کیا اسی وجہ سے اعجاز اُسے دکھانے سے اِنکار کرتا رہا تھا؟

سرفراز کو پہلی مرتبہ شدید عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ "مجھے کسی ڈاکومنٹ کا علم

نہیں،" اُس نے کہا۔ "صرف یہ پتا ہے کہ میرے بھائی کو کچھ لوگ پکڑ کر لے گئے تھے اور انٹیروگیٹ کرنے کے بہانے اُس پہ تشدد کرتے رہے، مگر کوئی ثبوت نہ ملنے پر چند روز کے بعد ناکام ہو گئے تھے۔ میرا بھائی گھر واپس آ گیا ہے۔"

"اُس کو یہ ڈاکومنٹ کس نے مہیا کیا ہے؟" نواز نے کہا جیسے کہ اُس نے سرفراز کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"مجھے کسی ڈاکومنٹ کا کوئی علم نہیں،" سرفراز نے دُہرا کر کہا۔

"یہ ڈاکومنٹ اُسے صرف تمہارے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔"

"میری آواز تمھیں سنائی نہیں دے رہی؟" سرفراز غصے سے بولا "میں نہیں جانتا تم کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔"

"تم نے کس ذریعے سے یہ اہم دستاویز چرا کر اپنے بھائی کے حوالے کی؟"

اب سرفراز اپنے آپ پہ قابو نہ رکھ سکا۔ نواز کا مقصد بھی یہی تھا۔ سرفراز دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکا اور چیخ کر بولا "میں نے کوئی دستاویز نہیں چرائی۔ میں نے اِس ملک کے دِفاع کے لِئے زخم کھائے ہیں۔ یہ دیکھ،" اُس نے قمیض کے بٹن کھول کر کندھا ننگا کیا جہاں شانے سے لے کر کہنی تک ایک لمبا، بدنما داغ تھا۔ "تم نے کیا کیا ہے؟ ایسی غداری صرف تُم جیسے---- تُم جیسے----" سرفراز بولتے بولتے رُکا، جیسے مناسب لفظ کی تلاش میں ہو، "صرف تُم جیسے بدقماش لوگ ہی کر سکتے ہیں۔"

نواز کھوکھر کا رنگ اچانک سرخ اور پھر زرد پڑ گیا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر ایک طمانچہ سرفراز کے مُنہ پہ دے مارا۔ ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر سرفراز نے نواز کے فربہ گال پہ ایک زوردار جوابی چپت جڑ دیا۔ نواز لڑکھڑا گیا، پھر سنبھل کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا کمرے سے نِکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد فوراً ہی سرفراز کو صورتِ حال کی خرابی کا احساس ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ نواز اُس کے ضبط کو توڑ کر آخر اپنی چال میں کامیاب ہو گیا تھا، اور اب معاملات سرفراز کے ہاتھ سے نِکل گئے تھے۔ اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ نواز اب ٹلنے والا نہیں، اور جوابی حملے کے لِئے سرفراز کو تیار رہنا چاہئے۔ اُسے علم تھا کہ عملی طور پہ وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ اُس کے پاس دفاع کا ایک ہی حربہ تھا، کہ اپنے ضبط کو ہاتھ میں

رکھے۔ نواز نے زیادہ دیر نہ لگائی۔ جب وہ کمرے میں لوٹا تو اُس کے ساتھ اُس کے عملے کے چار آدمی تھے، جن کے ہاتھوں میں رسے تھے۔ نواز کے اِشارے پر اُنھوں نے آگے بڑھ کر سختی سے سرفراز کو پکڑا اور ایک ہی داؤ میں اُسے پیٹ کے بل زمین پہ لٹا دیا۔ پھر اُنھوں نے اِنتہائی تیزی کے ساتھ پہلے اُس کے ٹخنے سمیٹ کر دونوں پیر رسے سے کس کر باندھ دیئے، پھر ہاتھوں کو الگ الگ باندھنا شروع کیا۔ کلائیوں کے گرد بل دے کر رسوں کے دُوسرے سروں کو چارپائی کے دو پایوں کے ساتھ گانٹھ دے دی گئی۔ اس کے بعد دو آدمی چارپائی پہ بیٹھ گئے تاکہ وہ کھسکنے نہ پائے۔ اب سرفراز سیدھی ٹانگوں اور پھیلے ہُوئے بازوؤں کے ساتھ بندھا بندھایا اوندھے مُنہ زمین پہ پڑا تھا اور اُس کے کپڑے کھینچ کر ساری پیٹھ کو ننگا کر دیا گیا تھا۔ اِس ساری کاروائی کے دوران سرفراز کی جانب سے کوئی مزاحمت نہ ہُوئی تھی۔ اِرادے کی اِنتہائی قوت کے زور پہ وہ اپنے آپ کو اِس کیفیت تک لے آیا تھا کہ جیسے یہ کارگزاری اُس کے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ پیش آ رہی ہو۔ وہ ایک گال سیمنٹ کے فرش پہ رکھے دیوار کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے دِل میں ایک عجیب سی ٹھہری ہوئی فضا تھی، جیسے کہ وہ ایک عرصے سے اِس سزا اور لمحے کا منتظر ہو اور وہ وقت اب آخر آ پہنچا ہو۔ پھر ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ سامنے والی دیوار اُس کے آنکھوں کے عین قریب آ کھڑی ہوئی اور اُس پہ مختلف نقش و نگار اُبھرنے لگے۔ سرفراز کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ایک مدت سے اُسے یہ علم تھا کہ اُس کی نظر کی یہ قوت، جو بچپن سے اُس کے اختیار میں تھی، کھو چکی تھی۔ کسی مقام پہ پہنچ کر یہ قوت زائل ہونا شرُوع ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ اُس کے ہاتھ سے نِکل گئی تھی۔ آج اتنے عرصے کے بعد سرفراز نے اپنے اندر اُسے واپس لوٹتے ہُوئے محسوس کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس دیوار پہ لمبے چوڑے سرخ نشان نمایاں ہونے لگے، جیسے کہ ضربیں اُس کی جلد پہ نہیں بلکہ دیوار پہ پڑ رہی ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ، درد کی جو لہریں اُٹھ رہی تھیں وہ باہر نِکل کر اُس کے لبوں تک آنے کی بجائے اندر ہی اندر کہیں جذب ہوتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ ایک موقع پر پہنچ کر سرفراز نے سوچنا شرُوع کیا کہ وہ غالباً فی الحقیقت اِس سزا کا حقدار تھا، کہ ہر ضرب اُس کے بدن کو اُس زہر سے جو اس کے اندر پھیل چکا تھا پاک کرتی جا رہی تھی، اور ہر ضرب اُس کی بے صوت و حرکت مزاحمت کے سامنے کڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اِس سے آگے

مختصر سے عرصے کے لیے ایک اَور موقعہ آیا جب سرفراز نے محسوس کیا کہ ہر ضرب اُسے واقعتاً لطف پہنچا رہی تھی۔

پھر اچانک یہ ساری کاروائی رُک گئی۔ باہر ایک جیپ کے آ کر رُکنے کی آواز آئی۔ نواز نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اَور پلٹ کر آدمیوں کو ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ چاروں آدمیوں نے جلد جلد سرفراز کے رسے کھولے، اُنھیں اپنی قمیضوں اَور جیبوں میں ٹھونسا اَور سرفراز کو اُٹھا کر چارپائی پہ پھینکا۔ پھر وہ نواز کے پیچھے پیچھے کمرے سے نِکل گئے۔ جب سرفراز ہوش میں آیا تو اُس کا دایاں ہاتھ سوجا ہوا تھا اَور کلائی سے خُون بہہ رہا تھا۔ اُسے اندازہ ہوا کہ ضربوں کی شدت کے درمیان وہ غیرارادی طور پہ بندھے ہوئے ہاتھ کو کھینچ کھینچ کر زور مارتا رہا تھا، جس سے کھردرے رسے نے جلد کو کاٹ دیا تھا۔ اس کی ساری پیٹھ سے اب اصل درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُس نے بائیں ہاتھ اَور دانتوں کی مدد سے قمیص کے کنارے سے ایک پٹی پھاڑ کر کلائی پہ باندھی۔ پھر وہ پیٹھ کو آرام دینے کی غرض سے چارپائی پہ اُلٹا ہو کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے غنودگی نے آ لیا۔

رات کا کھانا پہلے کی مانند میس سے لگ کر آیا۔ اُس کی بھوک لوٹ آئی تھی، مگر اُس سے کرسی پہ بیٹھا نہ جاتا تھا۔ کھڑے کھڑے اُس نے کھانا ختم کیا اَور دوبارہ چارپائی پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ وہ اِس بات پہ متعجب تھا کہ اِس کے دِل میں نہ کوئی رنج تھا نہ غصہ، بلکہ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے اُسے دنیا جہان سے چھٹکارا حاصل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد سرفراز نے نواز کھوکھر کی شکل نہ دیکھی۔ اگلے روز صبح سویرے اُسے اپنے کوارٹرز میں منتقل کر دیا گیا۔ اُس کا رینک اُس کے پاس رہنے دیا گیا، مگر اِس کے علاوہ یونٹ کا سارا کام اُس کے نمبر ٹو کو سونپ دیا گیا۔ چند روز کے بعد سرفراز نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا میس کی لائبریری سے کتابیں منگوا کر پڑھتا رہتا۔ میس میں جانے کی اُسے آزادی تھی، مگر وہاں پہ لوگ اُس کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کرنے سے کتراتے تھے۔ سب کو علم تھا کہ کیا کاروائی ہو رہی تھی۔ انکوائری جاری تھی، جس کے بعد فیصلہ کیا جانا تھا کہ اُسے "وہائیٹ" قرار دے کر بحالی میں لایا جائے، "بلیک" کر کے کورٹ مارشل منعقد کیا جائے، یا "گرے" سمجھ کر کوئی ایڈمنسٹریٹو ایکشن لیا جائے۔

تین چار روز تک سرفراز ایسی حالت میں رہا کہ ہاتھ کا زخم دِکھانے پر جی کو مائل نہ

کر سکا، وہی میلے سے کھیس کے کنارے سے پھاڑی ہُوئی پٹی باندھ کر پھرتا رہا۔ ہاتھ بتدریج سوجتا چلا گیا۔ آخر جب درد حد سے بڑھ گیا، تو وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے پٹی کھول کر دیکھا تو زخم کی حالت بگڑ چکی تھی۔ اِنفیکشن کو روکنے کے لیئے ڈاکٹر نے پنسلین کے ٹیکوں کا کورس تجویز کیا اَور گلے میں سلنگ ڈال کر ہاتھ اُس میں لٹکا دیا۔ ہسپتال میں روزانہ ڈریسنگ ہوتی اَور ٹیکہ لگتا۔ زخم خشک ہونے لگا تھا، مگر ہاتھ کی سوجن کم نہ ہو رہی تھی اَور درد میں بہت آہستہ آہستہ کمی آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ زخم کو مکمل طور پر دُرست ہونے میں چند ہفتے لگیں گے، اَور سوجن، پانی جمع ہو جانے کے سبب، شاید زیادہ عرصے تک رہے، مگر فکر کی بات نہیں، ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے ہدایت کی کہ سلنگ میں ہاتھ کو لٹکائے رکھنا ضروری تھا۔

جوں جوں دِن گزرتے جا رہے تھے، سرفراز کی بحالی یا کورٹ مارشل کے اِنتہائی اقدام کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا اَور "گرے" قرار دیئے جانے کی توقع بڑھتی جا رہی تھی۔ قریب قریب تمام افسر جو سرفراز کو جانتے تھے اَور دُوسری رجمنٹوں کے جو اس سے واقف بھی نہ تھے، اِس بات پہ خوش نظر آ رہے تھے۔ آخر اِن واقعات کے چوبیس دِن کے بعد سرفراز کو جی ایچ کیو سے خط وصول ہوا۔ خط ایڈمنسٹریشن برانچ سے آرمی چیف کے ملٹری سیکرٹری کی جانب سے تھا جس میں درج تھا کہ ایڈمنسٹریٹو ایکشن کی بنا پر میجر سرفراز کی خدمات کی ضرورت نہ رہی تھی، چنانچہ اُس کو پنشن اَور دُوسری سہولیات کے ساتھ، فوری طور پر برخاست کیا جا رہا تھا۔

اگلے روز سرفراز اپنا سامان باندھے جانے کے لیئے تیار کھڑا تھا۔ اُس نے ایک آخری نظر کمرے میں چاروں طرف دیکھا اَور باہر نکل آیا۔ جیپ اُسے ریلوے سٹیشن پہ لے جانے کے لیئے کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اُسے سلام کیا اَور کوئی بات کیئے بغیر جا کر جیپ میں اپنی سیٹ سنبھال لی۔ ایک سپاہی نے سرفراز کا سامان جیپ میں رکھا۔ سرفراز جیپ میں سوار ہو رہا تھا کہ ایک دُوسری جیپ تیزی سے آ کر رُکی۔ زمین پہ ٹائیروں کی رگڑ نے سرفراز کو متوجہ کیا۔

"ایم ایس،" شرفی نے سر نکال کر نعرہ نما آواز لگائی اَور اپنے مخصوص انداز میں چھلانگ لگا کر جیپ سے اُتر آیا۔

"ہلو شرفی،" سرفراز نے جواب دیا۔ کئی روز کے بعد اُس کے چہرے پہ مسرت کے آثار پیدا ہُوئے۔

"میں نے کئی بار میس میں فون کیا، تم نہیں ملے۔ مشکل سے ایک دِن کی چھٹی لے کر آیا ہوں،" شرفی نے سرفراز کے بائیں ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ "معلوم ہوتا ہے عین وقت پہ پہنچا ہوں۔ آئی ہرڈ آل اباؤٹ اِٹ۔ آئی ایم سوری۔" پھر اُس نے سلنگ کے اندر ڈریسنگ میں لپٹے ہُوئے سرفراز کے ہاتھ کی جانب اشارہ کرکے پُوچھا، "کیا ہوا؟؟"

"چوٹ آ گئی تھی،" سرفراز نے مختصراً کہا۔

"لک، آئی ہرڈ سم ریومرز۔ آیف آئی ٹی والی خبر دُرست تھی؟"

سرفراز نے آہستہ سے اِثبات میں سر ہلا دیا۔ شرفی کے چہرے کا رنگ بدل گیا، جیسے اچانک اُسے ساری بات کھٹک گئی ہو۔ اُس نے دوبارہ اُنگلی سے سرفراز کے سوجے ہُوئے ہاتھ کی طرف اِشارہ کرکے ہکلاتے ہُوئے پُوچھا،

"دِس؟----دِس؟؟"

سرفراز خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

"او مائی گاڈ---ڈیٹ باسٹرڈ!"

"شرفی، ڈونٹ گیٹ اِنوالوڈ اِن دِس۔ پلیز۔ اب گھر پہ ملاقات ہو گی۔ لک آفٹر یور سیلف۔"

سرفراز نے جیپ میں سوار ہو کر ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ جیپ چل پڑی۔ سرفراز نے چلتی جیپ سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔

شام کا وقت تھا۔ میس کے اندر ایک کرسی پر میجر اشرف اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے میز پہ لیمن سکواش کا بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ وقتاً فوقتاً گلاس کو اُٹھا کر وہ ایک چھوٹا سا گھونٹ لیتا اور اُسے میز پہ رکھ دیتا۔ بیرے اپنی کلف لگی وردیوں میں کھانے اور مشروبات

کے ٹرے اُٹھائے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ شرفی اپنے سامنے دیکھ رہا تھا مگر اُس کی نظروں کے کنارے نواز کھوکھر پہ مرکوز تھے جو کاؤنٹر کے ایک سٹول پہ بیٹھا پائن ایپل جوس کا گلاس ہاتھ میں تھامے، ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دُوسرے افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ شرفی کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا تھا، "ہیلو سر، ہاؤ از لائف اِن کوئٹہ؟" اور شرفی نے خوش خلقی سے اُس کا جواب دیا تھا۔ اب یہ نواز کھوکھر کا جوس کا دُوسرا گلاس تھا۔ اِسی دوران میں شرفی کا ایک سابقہ جونیئر افسر جس کی دُوسری یونٹ میں تبدیلی ہو چکی تھی، اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور شرفی سے معمول کی باتیں کرنے لگا۔ شرفی ہوں ہاں کر کے اُس کے جواب دے رہا تھا کہ اچانک اُس کا جسم تن گیا اور اُس کے بازوؤں اور کندھوں میں باریک سی، کپکپی نما لرزش دوڑ گئی، جیسے تاک میں بیٹھے کسی چیتے کا شکار اُس کی مار کے اندر آ گیا ہو۔ نواز کھوکھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹائلٹ کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ ٹائلٹ میں داخل ہوا، شرفی "ایکسکیوزمی" کہہ کر اُٹھا اور اُس کے پیچھے چل پڑا۔

ٹائلٹ کے دروازے کو اندر سے کنڈی نہ لگتی تھی۔ شرفی نے اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمبے ہینڈل والا برش جو فرش صاف کرنے کے کام آتا تھا، دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ شرفی نے وہ برش اُٹھا کر اُس کے ڈنڈے کو اندر کی جانب سے دروازے کے ہینڈل کے ساتھ یوں اُنکا دیا کہ باہر سے دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے۔ نواز کھوکھر پتلون کے بٹن کھولنے میں مصروف تھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو شرفی اُس پہ نظریں جمائے اُس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ نواز نے چونک کر ہاتھ روک لئے۔ جب اُن کے درمیان دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تو شرفی دوڑ کر اُس پر حملہ آور ہوا۔ شرفی اُسے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ نواز کا سر اِس زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا کہ اُسے چکر آ گیا۔ نواز بولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شرفی کی کلائی اُس کے نرخرے پر تھی، جسے وہ دبائے ہوئے تھا۔ دُوسرے ہاتھ سے شرفی اُسے بار بار اپنی طرف کھینچتا، پھر اپنی کلائی کے پورے زور سے اُس کا سر دیوار کے ساتھ پٹختا جا رہا تھا۔ پیچھے سے نواز کا سر دیوار کی ساتھ چوٹ کھاتا اور آگے گردن پر دباؤ سے اُس کی سانس بند ہوئی جا رہی تھی۔ ایک منٹ کے اندر نواز کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ شرفی نے اُسے چھوڑ دیا۔ نواز دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا وہیں پہ بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اپنے آگے زمین پہ رکھ کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے اچھو پہ اچھو لگ رہا تھا۔ بری

طرح کھانستے کھانستے اُس نے قے کر دی۔ شرفی تیزی سے مڑ کر چل پڑا۔ دروازے پہ پہنچ کر وہ ایک بار پلٹا۔ نواز کھوکھر زمین پہ ہاتھ رکھے جھکا ہوا، سر اُٹھا کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بے سمجھ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دروازے پر شرفی غصے سے لرزتی ہُوئی اُنگلی ہوا میں اُٹھا کر بولا، "آئی ول گیٹ یو، یو بلڈی کیٹامائیٹ۔"

نواز کھوکھر کا پیشاب اُس کی پتلون کے اندر سے رِس رِس کر فرش پہ گر رہا تھا۔ شرفی دروازے سے انکا برش ایک طرف پھینک کر باہر نکل گیا۔ میس کے اندر سے گزُر کر وہ باہر برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ اُس کے بدن میں ابھی تک ہلکی ہلکی کپکپی جاری تھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے دور اندھیرے میں دیکھتے ہُوئے اُس کی نظر دھندلا گئی۔

"گڈ بائی، ایم ایس،" اُس نے اپنے دِل میں کہا، "اینڈ گڈ لک۔"

کچھ دیر کے بعد جب اُس کا بدن ٹھہرا تو وہ میس میں پلٹ آیا اور بیرے کو کھانے کا آرڈر دے کر کرسی پہ جا بیٹھا۔

یہ کیا تھا؟ دوستی؟ یا؟ ....

باب 23

اعجاز اور سرفراز اپنے کھیتوں کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔

"تمھاری مشین میری سمجھ میں نہیں آئی لالہ،" سرفراز نے کہا۔

چلتے چلتے اعجاز نے ایک نوعمر شیشم کی ٹہنی سے بالشت بھر پتلی سی شاخ توڑی۔ چند قدم آگے جا کر وہ ایک خالی کھیت کی بنّی پر بیٹھ گیا۔

"یہ" اُس نے شاخ کی مدد سے زمین پر لکیر کھینچی، "اِس کی درمیانی شافٹ ہے۔ اِس کے نچلے سرے پر موٹر نصب ہو گی جو شافٹ کو چلائے گی۔ اگلے سرے پر وہی پہلے والا سسٹم چلے گا۔ صرف فرق یہ ہے کہ بیلنے کے رُولے اور گیئر بھاری مشینی لوہے کے بنوانے پڑیں گے تاکہ موٹر کی رفتار کو سہار سکیں۔"

"صرف؟" سرفراز مصنوعی حیرت سے بولا۔

اعجاز ہنس پڑا۔ "بھئی فرق تو ایک ہی ہے ناں کہ بیلوں کی جگہ پر موٹر چلے گی۔"

اعجاز کھیت کی مٹی میں لکیریں اور دائرے کھینچ کر مشین کا نقشہ بنانے لگا۔ سرفراز اُس کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اِس کا فائدہ کیا ہو گا" سرفراز نے پوچھا۔

"چار چھ دِن میں فصل پار ہو جائے گی۔"

"چار چھ دِن میں کٹائی ہو جائے گی؟"

"بندے بہت مِل جائیں گے،" اعجاز نے تسلی سے جواب دیا۔

"مشین لگوانے اور بڑے کڑاہ خریدنے اور کٹائی کے لیے فالتو آدمی رکھنے پر جو خرچہ آئے گا وہ کیسے پورا ہو گا؟"

"ہمارا گُڑ شکر سب سے پہلے مارکٹ میں پہنچے گا،" اعجاز نے کہا "اس کے منہ مانگے دام ملیں گے۔"

"گویا پروڈکشن نہیں بڑھے گی، صرف سپیڈ زیادہ ہو جائے گی۔"

"تُو نے تو پڑھ لکھ کے گنوا دیا ہے سرفراز،" اعجاز بولا "یہ سپیڈ کا ہی تو زمانہ

ہے۔ ورنہ موٹر گاڑیاں اور انڈسٹریاں بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ سپیڈ ہو تو سب دوسرے کام بھی چلنے لگتے ہیں۔ کماد پکتے ہی اُتر جائے گا اور زمین فارغ ہو جائے گی جس سے ہم دُوہری فصل لے سکتے ہیں۔ پروڈکشن بڑھی کہ نہیں؟"

سرفراز چند لمحے تک سوچتا رہا۔ پھر اچانک اُس کی آنکھوں میں چمک کی تیزی پیدا ہوئی، جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

"ایک بات بتاؤ، لالہ۔"

"کیا۔"

"تمہاری موٹر چلے گی کیسے؟"

"بجلی سے۔"

"بجلی بازار سے خرید کر لاؤ گے؟"

اعجاز چونکا جیسے اُس سے کوئی بھول ہو گئی ہو، پھر ہنس کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُٹھتے اُٹھتے اُس نے ٹانگ کے درد سے ہونٹ بھینچ لیے۔ چند سکینڈ تک وہ چہرے پہ ہلکے سے تشنج کے آثار لیے دُوسری ٹانگ کے وزن پہ کھڑا رہا۔ اُس کی لنگڑاہٹ قریب قریب ختم ہو چکی تھی، مگر درد کی جڑیں ابھی تک اُس کی ہڈیوں میں پیوست تھیں۔ اُس نے ران پہ دو ایک تھپڑ لگا کر درد کو ٹھہرایا۔

"بجلی بھی آ جائے گی،" وہ شیشم کی شاخ کو کھیت میں پھینک کر بولا۔ "نور پور تک تو آ گئی ہے۔"

"اسی طرح جیسے ہماری سڑک بن جائے گی؟" سرفراز نے کہا۔

"سب کام اپنے وقت پر ہو جائیں گے۔ مگر اُس وقت کے لیے پلاننگ تو ضروری ہے ناں۔"

سرفراز کی آنکھ میں شرارت قائم تھی۔ "ٹھیک ہے،" وہ بولا، "مجھے تو فکر لگ گئی تھی۔"

"کس بات کی؟"

"کہ کل ہمیں موٹر چلانی پڑ گئی تو کیا کریں گے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ساتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

واپسی پر پکی سڑک کے کنارے ایک جگہ پہ جہاں اُن کی زمین کا ایک ٹکڑا پڑتا تھا' رُک کر اعجاز نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ تیرے گھر کے لیئے رکھا ہے۔"

"میرا گھر تو موجود ہے لالہ،" سرفراز نے ہولے سے جواب دیا۔

"اب تُم فارغ ہو کر آ گئے ہو، اللہ کا فضل شاملِ حال ہے، گھر بسانے کی فکر کرو۔ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے، مگر کب تک انتظار کرے گی۔ گیارہ دِن ہو گئے ہیں تُجھے آئے ہوئے، اُس سے مِلنے تک نہیں گیا' نہ رابطہ کیا ہے۔"

"مَیں پہلے گھر آنا چاہتا تھا" سرفراز نے کہا۔

"اچھا کیا۔ دُرست بھی یہی ہے۔ اپنے گھر سے جاتا ہُوا بندہ اچھا لگتا ہے،" اعجاز بولا۔ "تیرے پیچھے آئی تھی، سب سے مِل مِلا کے گئی۔ رکھ رکھاؤ والی عورت ہے۔"

"ایک آدھ روز میں جاؤں گا" سرفراز نے مختصراً کہا۔ اُس کی آواز بیٹھتی جا رہی تھی۔

"اب جلد ہی تاریخ طے کرکے رسم پوری کر لینی چاہیے" اعجاز نے کہا۔ "ڈیرہ آباد ہو، حیثیت میں اضافہ ہو۔ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دو کُھل جاتے ہیں۔ فکر کی کیا بات ہے۔ تیری بی بی بھی بے قرار ہے۔ آج صلاح کرکے تاریخ مقرر کر آتے ہیں۔ کیوں، کیا خیال ہے؟"

"جلدی کی کیا ضرورت ہے،" سرفراز نے کہا۔ "میرا ابھی کچھ پتا نہیں، شائید شہر میں ہی جا رہوں۔ کچھ پُرانے دوست انڈسٹری وغیرہ میں ہیں، کوشش کرنے سے معقول ملازمت مِل جانے کی اُمید ہے۔ باقی رہی زمینداری، وہ تُم نے ہی بنائی ہے لالہ، تُم ہی اس کے لیئے کافی ہو۔"

"کافی تو سارے کام کے لِئے تیری بی بی ہی ہے۔ تُو نے دیکھ ہی لیا ہے کیسے اُس نے اندر باہر کا بندوبست سنبھال لیا ہے۔ مَیں بیٹھا بیٹھا تنگ آ گیا ہُوں، ٹانگ کا درد جائے تو اُٹھ کر اُس کا ہاتھ بٹاؤں۔۔۔۔"

سرفراز ہولے سے مُسکرایا۔ اُسے پتا تھا کہ اُس کا بھائی سکینہ کے انتظامات سے مطمئن تھا' اُٹھے گا تو اُس کا ہاتھ بٹانے کی بجائے کوئی نیا کام ہی شروع کر دے گا۔

"سچی بات ہے،" اعجاز نے بات جاری رکھی، "مجھے گمان نہ تھا کہ سکینہ میں اِتنی

جان ہے۔ تُو نے دیکھا ہی ہے، لڑکے ماشاء اللہ کسی سے خم نہیں کھاتے، مگر اپنی ماں کے آگے دم نہیں مارتے۔ اِسی لیے مَیں کہتا ہُوں ایک اچھی عورت زندگی کو دُوبالا کر دیتی ہے۔ اِس معاملے میں تُم بھی خوش قسمت ہو کہ ایک باشعور عورت----"

سرفراز کی سماعت رُک گئی تھی۔ جب سے سرفراز نے گھر میں قدم رکھا تھا وہ نسیمہ کے خیال سے جی چُراتا رہا تھا، جیسے اُس کے رُخ پر پردہ ڈال چکا ہو۔ صرف ایک نسرین کی شباہت تھی جو اپنے آلائش زدہ وجُود کے ساتھ سرفراز کے تصوّر میں برقرار تھی، جس نے نسیمہ کی تمامتر وزن دار ہیئت کو بے اصل بنا دیا تھا۔ نسرین کی اصلیت اُس کے جُثّہ میں نہیں، اُس کے وجود میں تھی۔ جب وہ نظر سے اُوجھل ہوتی تو پیچھے اپنی شکل کا خلاء چھوڑ جاتی تھی۔

وہ دُونوں وہیں پہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ عباس بائیسکل پہ سائیں جلّے کو اپنے پیچھے بٹھائے، آ پہنچا۔ سائیں جلّا سلام دُعا کیے بغیر کھیت کے کنارے کھڑا ہو کر لاتعلقی سے فصل کو دیکھنے لگا۔ عباس نے آتے ہی سرفراز کو، جس کے ساتھ وہ پہلے بات کر چکا تھا، آنکھ مار کر اشارہ کیا۔

"لالہ،" سرفراز نے کچھ دیر کے بعد بات چھیڑی، "چاچے کے آگے عباس کی سفارش کرانی ہے۔"

"کِس بات کی؟"

"اِس کے بیاہ کی،" سرفراز نے کہا۔

"یہ بدمعاشیاں نہ کرتا پھرتا تو دس سال پیچھے اس کا بیاہ ہو گیا ہوتا۔"

"ایک غلطی ہو گئی بچارے سے لالہ،" سرفراز نے بولا۔ "اب سیدھے رستے پر آ گیا ہے۔"

"ایک غلطی؟" اعجاز غصّے سے بولا۔ "ایسی ایسی غلطی ایک ہی کافی ہوتی ہے۔"

"سبق بھی تو اسے خُوب مِل چکا ہے۔ کم عمری میں آدمی سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

"پُورے اٹھارہ سال کا تھا جب اِس نے بدبخت کمہاری کے ساتھ سانجھ کا ڈول ڈالا تھا۔ اٹھارہ سال کی عُمر کم ہوتی ہے؟ مَیں نے اٹھارہ سال میں تعلیم چھوڑ کر نوکری اختیار کر

لی تھی۔ تُو اٹھارہ سال کی عمر میں ۔۔۔۔" اعجاز بولتے بولتے یکبارگی ٹھٹک کر رُک گیا۔ پھر ایک لحظہ ٹھہر کر بولا۔ "تو فوج میں چلا گیا تھا۔ رینک حاصل کر لیا ہے' وہ تو تُم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ پنشن لگ گئی ہے' واپسی پہ رقم مِل گئی' عزت بن گئی ہے' اور آدمی کو کیا چاہیئے۔ اِس نامُراد نے اٹھارہ سال کی عمر میں کیا تیر مارا؟ کمہاری کے گھر ڈیرا ڈال دیا۔ دس سال سے اُوپر ہو گئے ہیں' اِسے نہ اپنی دیا' نہ کسی دُوسرے کی۔"

"لالہ" عباس بولا "دو سال ہو گئے ہیں' مَیں نے اس کا مُنہ نہیں دیکھا۔"

"مُنہ نہیں دیکھا؟" اعجاز بھڑک کر بولا۔ "وہ جو تیری شکل صُورت والے دو تین کٹورے پھر رہے ہیں وہ کدھر سے آئے ہیں؟ ایک تو ابھی گود میں چڑھا ہے۔ دو سال سے تو نے شکل نہیں دیکھی تو وہ کہاں سے برآمد ہوا ہے؟"

سرفراز ہنس پڑا۔

"ہنسنے کی بات نہیں سرفراز" اعجاز بولا۔ "اِس نے ساری برادری کا نام ڈبو کے رکھ دیا ہے۔"

"لالہ" عباس دوبارہ بول اُٹھا "ہاتھ لمبے کر کر کے تان لگاتی تھی کہ کوئی مرد ہے تو آئے۔ آخر مرد کی غیرت بھی کوئی چیز ہے۔"

"تیری ماں کی عمر والی اُس عورت کے لئے تیری ہی غیرت جاگی تھی؟ گاؤں کے دُوسرے مرد کیا بھیڑ بکریوں سے دِل بہلا رہے تھے؟" اعجاز نے کہا۔ "یہ گدھے ہانکنے والے لوگ ہیں۔ آدمی ناکارہ ہے' بیوی زور آور ہو گئی ہے۔ مگر تُو تو راٹھوروں کا بیٹا ہے' تیری عقل پر پتھر کہاں سے آ گرے؟ تیرا باپ کِتنے گھروں میں غرض لے کر گیا ہے' ہر طرف سے اُسے جواب مِل گیا۔ کوئی عزت دار تجھے اپنی بیٹی دینے کو تیار نہیں ہے۔"

"نہیں لالہ" عباس بولا "کریم راٹھور کے گھر رشتہ ہے۔"

"کریم کی لڑکی تو نِکل گئی تھی" اعجاز نے اِستفسار کیا۔

"وہ نہیں۔ اُس سے چھوٹی گھر میں ہے۔"

"وہ جو بچہ سی ہے؟"

"لالہ' سولہ سال کی ہے۔" عباس نے زور دے کر کہا۔

اعجاز ایک منٹ تک سوچتا رہا۔ پھر بولا' "وہ دے گا؟"

"ہاں لالہ۔"

"کیسے پتا ہے؟"

"اُس کے بیٹے پر قتل کا مقدمہ بنا ہوا ہے۔ مَیں اُس کی شہادتیں بٹھا رہا ہوں۔ بری ہو جائے گا۔ میرا اُن کے اُوپر احسان ہے۔"

"پھر چاچے سے کہو جا کر بات کرے۔"

"یہی تو سارا بکھیڑا ہے۔ ابا نہیں مانتا۔"

"کیوں؟"

"ضد میں آگیا ہے۔"

"کوئی نہ کوئی قِصّہ تو ہوگا۔"

"دس سال پہلے کریم راٹھور کے ساتھ چھوٹی سی بات پر اُس کا جھگڑا ہو گیا تھا، ابھی تک اُسے پکڑ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے ساتھ بھی خفا ہوتا ہے، کہتا ہے گواہیاں نہ بٹھاؤ، لڑکے کو پھاہ لگنے دو۔"

"پھر تو معاملہ ٹیڑھا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "مَیں کیا کر سکتا ہوں۔"

"اب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے لالہ،" عباس سراپا التجابن کر بولا۔

"نادانوں والی بات کرتے ہو۔ چاچے نے کبھی کسی کی بات مانی ہے؟"

"ابے کو چھوڑو لالہ، خود کریم راٹھور سے بات کرو۔"

"چاچے کی طرح مجھے بھی بے عزت کرانے کی صلاح ہے؟"

"لالہ، مَیں بتا رہا ہوں، اُس کے بیٹے کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے، کبھی انکاری نہ ہوگا۔ ہُوا تو مَیں لفظ دیتا ہوں، یہ بات پھر کبھی میری زبان پر نہ آئے گی۔"

اعجاز خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

"بی بی بھی اتفاق کرتی ہے،" عباس بولا۔

"مجھ سے اُس نے ذکر نہیں کیا،" اعجاز نے کہا۔

"کہتی تھی پہلے لالے سے بات کرو۔ ذمہ داری نہیں اُٹھاتی، ابے سے ڈرتی ہے۔"

اعجاز نے سرفراز کی جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اثبات کی جھلک دیکھ کر اعجاز

نے عباس سے کہا "چل گھر جا۔ میں بھی آتا ہوں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

عباس بائیسکل پر سوار ہو کر چل دیا۔ اعجاز نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ دُور زمین میں گڑا ہوا ایک پرانا پتھر تھا۔ اعجاز بھاری قدموں سے چلتا ہُوا جا کر اُس پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے بیٹھتے اعجاز کے چہرے کی رگیں پھر کھنچ گئیں۔ بیٹھ کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے ران کو پکڑا اور آہستہ آہستہ اُسے دبانے لگا۔ پھر دو ایک بار ٹانگ کو سیدھا اکڑایا اور ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"اُٹھنے، بیٹھنے میں تکلیف دیتی ہے،" اعجاز نے کہا۔

پتھر اِتنا چوڑا تھا کہ دو آدمی باسانی اُس پہ بیٹھ سکتے تھے۔ چند لمحوں تک دونوں بھائی ساتھ ساتھ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اعجاز تھکے ہوئے لہجے میں بولا،

"باسے کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"ہاں لالہ،" سرفراز نے کہا۔ "بچارے کو کافی سزا مل چکی ہے۔"

"تو اپنے بیاہ کی بات تو کرتا نہیں،" اعجاز بولا، "اور باسے کی فکر کر رہا ہے۔"

سرفراز آہستہ سے ہنس کر چُپ ہو رہا۔

"سائیں،" اعجاز نے آواز دی۔ "سرفراز کے کوٹھے کے واسطے یہ ٹکڑا کیسا ہے؟"

"سائیں جلا جو برابر اُن کی طرف پُشت کئے، ایک ہاتھ کمر پہ رکھے، دُوسرے میں عصاء تھامے، اپنے آگے چارے کے کھیت پر نظریں جمائے خیال میں محو کھڑا تھا، مُڑے بغیر بولا، "یہ ٹکڑا؟"

"نہیں،" اعجاز نے کہا۔ "کیکر والا۔"

سائیں نے دائیں جانب گردن موڑ کر خالی کھیت پر نظر دوڑائی جس کے عین وسط میں کیکر کا درخت کھڑا تھا۔ پھر وہ پلٹ کر اعجاز اور سرفراز کے پاس آ کھڑا ہُوا۔

"اب اِدھر ہی ٹھہرے گا؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں" سرفراز کی بجائے اعجاز نے جواب دیا۔

"نمبر ایک ٹکڑا ہے،" سائیں بولا۔ وہ سرفراز سے مخاطب ہُوا۔ "تو نے اپنی ڈیٹی پُوری کر لی ہے۔ اب اپنی زمین پر آ کر کھڑا ہو۔ یہ،" وہ اپنا عصاء زمین پہ ٹھونک کر بولا، "تیری ماں ہے۔ تجھے رزق دے گی۔"

اپنے بھاری ڈنڈے کو دو ایک بار مزید زور زور سے زمین پر مار کر سائیں ہلا

خاموشی سے گاؤں کی جانب چل دیا۔

اعجاز آہستہ سے ہنسا۔ "سائیں بوڑھا ہو گیا ہے۔" وہ دھیمی چال سے چلتے ہوئے سائیں کو دیکھ کر بولا، "دو تین مہینے سے اپنے چکر پر بھی نہیں نکلا۔ تجھے پتا ہے، آج میں نے پہلی بار اِسے سائیکل کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ میلوں میل پیدل چلا کرتا تھا۔"

مگر سائیں کے ڈنڈے کی دھمک گویا زمین پر نہیں بلکہ سرفراز کے دِل پہ ضرب لگا گئی تھی۔ وہ زمین پہ نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔ اعجاز نے دوبارہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹانگ کو دبانا شروع کر دیا تھا۔ موسم بہار کی آمد تھی۔ رُت بدلنے کے نشان ہوا کے نیم گرم بگولوں کی شکل میں زمین سے اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

"لالہ،" کچھ دیر بعد سرفراز بولا۔ "ایک بات پُوچھوں؟"

"پُوچھو۔"

"تُمہارے ساتھ جو واقعہ ہوا تھا، ایک دستاویز کے بارے میں تھا نا،"

اعجاز نے اپنی ٹانگ دبانی بند کر دی۔ "ہاں" وہ بولا۔

"وہ کیا چیز تھی؟"

"چیز سے کیا مطلب؟" اعجاز ہنس کر بولا۔

"کیسا ڈاکومنٹ تھا؟"

"کسی کی لکھی ہوئی ایک تحریر تھی۔"

"کِس قسم کی تحریر تھی؟ قصہ کیا تھا؟"

"جو بھی تھا، تُمہارے ساتھ اس کا تعلق نہیں تھا۔"

"ساری دُنیا کے ساتھ اِس کا تعلق تھا مگر صرف میرے ساتھ نہیں تھا؟"

"ساری دُنیا کے ساتھ بھی اس کا تعلق نہیں تھا۔"

"تُم تو اخبار میں چھپوانے کے لِئے داستان لکھ رہے تھے۔"

"وہ اَور بات ہے۔ اوّل تو چھپے گی نہیں، چھپ گئی تو تُجھے پتا چل جائے گا۔"

"یعنی اخبار سے پتا چلے تو چل جائے، مگر تُم نہیں بتاؤ گے،" سرفراز کے لہجے میں شکائیت تھی۔

اعجاز خاموش بیٹھا دوبارہ ایک ہاتھ سے اپنی ران کو ہولے ہولے دبانے لگا، جیسے

بے خیالی کی حالت میں ہو۔ کچھ دیر تک دونوں بات کئے بغیر ساتھ ساتھ پتھر پر بیٹھے رہے۔
پھر اعجاز سر اُٹھا کر بولا۔ "تجھے گھر لوٹے ہوئے آج کتنے روز ہو گئے ہیں؟"

سرفراز نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا کیونکہ اعجاز کو اچھی طرح علم تھا کہ سرفراز کو گھر واپس آئے ہوئے کتنے دِن ہوئے تھے۔ "گیارہ دِن" سرفراز نے جواب دیا۔

"اِن گیارہ دِنوں میں مَیں نے نہیں پُوچھا کہ تُو نے فوج سے استعفٰے کیوں دیا ہے۔"

سرفراز نے بولنے لئے بے اختیار مُنہ کھولا، مگر فوراً ہی بند کر لیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اُس نے گھر واپس آنے پر جھوٹ بولا تھا، کہ اُس نے استعفٰے نہیں دیا، وہ یہ بات اعجاز کے آگے کھول کر رکھ دینا چاہتا تھا، سارا واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا کہ اُس کے ہاتھ کا زخم کیونکر آیا تھا، اپنا راز کھولنا اور اعجاز کا راز جاننا چاہتا تھا۔ مگر اعجاز کی بات کے آگے اُس کا منہ نہ کُھل سکا۔

"دیکھ سرفراز" اعجاز بولا، "تیرا اَور میرا خون کا بندھن ہے، ہم ایک ہی ماں اور باپ کی نشانیاں ہیں، مگر اپنے اپنے کاموں میں ہم مرضی کے مالک ہیں اور نتیجوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ایک کا بوجھ دُوسرے پر نہیں ڈال سکتے۔ ہمارا کام ایک دُوسرے کو سہارا دینے کا ہے، حالات جو بھی پیش آئیں، تیرے پیچھے مَیں اور میرے پیچھے تو کھڑا ہوگا۔ صِرف یہ اعتماد ہی زندگی گزارنے کے لئے بہت ہے۔" اعجاز ہنس کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "چل اب گھر چلیں۔ دِن ڈھلنے میں ایک پہر بھی نہیں رہا۔"

"تُم چلو لالہ" سرفراز آہستہ سے بولا۔ "مَیں تھوڑی دیر میں آتا ہُوں۔"

"کل کی طرح دیر نہ کرنا" اعجاز جاتے جاتے بولا، "کھانے پر سب انتظار کرتے ہیں۔"

سرفراز کچھ دیر تک چُپ چاپ پتھر پہ بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر اُٹھ کر ایک طرف کو چل دیا۔ وہ کِس طرف کو اَور کہاں جا رہا تھا، اِس رُخ کا اُس کے ذہن میں کوئی تعین نہ تھا۔ اُس کا جی صرف یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اِس زمین پر چلتا جائے، یہاں تک کہ اُس کی نظر کا رستہ رُک جائے اَور صرف پاؤں کا سفر جاری رہے، تاکہ وہ زمین کے لمس کو اپنے تلووں میں محسوس کر سکے۔ وہ مُنہ اُٹھا کر چلتا گیا۔ سُورج آسمان کے دامن کی جانب

لٹکا ہُوا تھا اَور نارنجی دُھوپ میں سرفراز کی نظریں آس پاس کے منظر کے اُوپر اُوپر پھسل رہی تھی۔ دِن ختم ہو رہا تھا مگر ملکوں کے بھٹے کے آگے پتھیرے اپنی دِہاڑی پوری کرنے کو بدستُور کام میں جُتے تھے۔ ملک حمید کے قتل اَور ملک لطیف کی گرفتاری کے بعد چند ہفتے تک بھٹہ سرد رہا تھا۔ پھر ایک ہفتے تک متواتر وہاں پہ ختم قرآن کرائے جاتے اَور چاولوں کی دیگیں غُرباء میں تقسیم کی جاتی رہیں، بلال پور شریف سے ملکوں کے مُرشد پیر حمید الدین، بلال شاہ تشریف لائے، جِن کی سرکردگی میں اعوان برادری اَور بھٹہ مزدوروں کے لشکر نے آدھے دِن تک رو رو کر دُعا مانگی، اور آخر جب پیر صاحب نے بھٹے کو قتل کے بُرے اثرات سے پاک قرار دے دیا تو اگلے ہی روز دُوسرے بھائیوں کی نگرانی میں بھٹے کا کام زور شور سے شروع ہوگیا۔ اب نقصان پُورا کرنے کو بارہ کی بجائے سولہ گھنٹے روزانہ کی شفٹ، اَور اینٹوں کی تعداد فی نفر اُونچی مقرر کر دی گئی تھی۔ سات روز تک تسلی سے بیٹھ کر مُفت کے چاول کھانے سے اُن کے چہروں پہ جو تازگی کی جھلک آگئی تھی، اُسی سُرعت سے غائب ہو چکی تھی اور اُن کے بدنوں پہ قدیم عُسرت کے نشان دوبارہ ایک لیبل کی مانند چسپاں ہو گئے تھے۔ اب یہ سیاہ جسموں والے خاندان غُربت کی بے خبری میں سر جُھکائے مشقت میں لگے تھے۔ پتھیرے لوہے کے دابڑوں میں گیلی مٹی لا لا کر ڈھیر کرتے، جِسے اُن کی عورتیں اَور بچے مُٹھیوں میں بھر بھر کر سانچوں میں بھرتے جا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں سانس لینے کو رُک کر وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے اَور میلے چیتھڑوں سے اُبھری ہوئی نسوں والے ننگے بدنوں کا پسینہ پونچھتے جا رہے تھے۔ سرفراز اُنہیں دیکھتا ہوا گزُر گیا۔ آگے ایک کھیت کے اندر کسان اَور مزدُور جھونا تیار کر رہے تھے۔ بڑے بڑے کڑاہ آگ پہ چڑھے تھے اَور اُن کے اُبلتے ہُوئے پانی میں نئی فصل کے چاول دو چار پَل کو ڈال کر زمین پہ بچھی ہُوئی موٹی چادروں پر پھیلائے جا رہے تھے۔ کھیت کی زمین ایسی چادروں سے ڈھکی پڑی تھی جن پہ نیم زرد رنگ کے ادھ پکے چاول سُورج کی آخری کرنوں میں جھلملا رہے تھے۔ کڑاہوں کے نیچے آگ بجھائی جا رہی تھی۔ دِن کے آخری پُور اُتارے جا چکے تھے۔ مگر ابھی بہُت سا کام باقی پڑا تھا۔ عورتیں اَور مرد زمین پہ جُھکتے، اُٹھتے، کمر سیدھی کرتے، دو قدم آگے جا کر پھر جُھکتے، چاولوں کی چادروں پہ منڈلاتے ہُوئے یُوں اپنی دُھن میں لگے تھے کہ جیسے دِن گزُرنے کا اُنہیں کوئی غم نہ ہو۔ سرفراز نے چند لمحے کو رُک کر اُنہیں دیکھا

اَور اُسے محسُوس ہُوا کہ بھٹی کے پتھیروں اَور بھونا بنانے والوں کی اِس دُھن میں ایک ناچ کی سی کیفیت تھی جِس کی مُستقِل رواں دواں تال اُن کی زندگیوں کو جوڑتی تھی اَور جو زمین کی مُسلسل دھڑکن کی ہمنوا تھی۔ تھرک تھرک تھرک تھرک تھرک تھرک----
جیسے ایک ہموار لہر سطحِ زمین پہ سفر کر رہی ہو اَور جِس کے اندر ہمیشہ جاری رہنے کی پوشیدہ قوت ہو۔ سرفراز وہاں سے آگے چل پڑا۔ آبادیوں سے دُور نِکل کر ایک مقام پر وہ پگڈنڈی چھوڑ کر چارے کے سبز کھیت میں داخل ہوگیا۔ کھیت کے وسط میں ایک مُستطیل سی جگہ پہ سبز چارہ زمین کے ساتھ ہموار تھا، جیسے وہاں پہ کوئی انسان یا حیوان لیٹا رہا ہو۔ سرفراز جا کر اُس جگہ پہ بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اُس نے جُوتے اُتار دیئے اَور پَیر سبز ریشمیں چارے کے پتوں پہ رگڑنے لگا۔ اُسے یُوں لگا جیسے پہلی بار وہ اپنے تلوے زمین کے ساتھ مَس کر رہا ہو۔ اپنی جلد پہ زمین کے لمس کو سرکتے ہُوئے پا کر سرفراز کی آنکھوں سے آنسُو بہنے لگے۔ اٹھائیس برس، اُس نے سوچا!
اٹھائیس برس تک اُس نے اپنی ماں کو یاد تک نہ کیا تھا، کیونکہ یاد کرنے کو اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، نہ کوئی شکل نہ صُورت، نہ بُوباس نہ آواز، اَور آج ایک نیم مجذوب شخص نے چار لفظ بول کر اُس خلاء کا مُنہ کھول دیا تھا جو اُس کے اندر دفن تھا مگر جِس میں اُس کا گزر نہ ہو سکا تھا۔ مُحبت اَور غم کے ایک ڈھیر کی شکل سرفراز کے دِل کے اندر اُبھر کے آئی، جیسے زیریں تہوں میں رہنے والا کوئی مہیب اَور کہنہ ذی رُوح سمندر کی سطح توڑ کر اپنا سَر اٹھاتا ہے، اَور اٹھائیس سالہ عُمر میں پہلی بار بے اِختیار اُس کے مُنہ سے نِکلا، 'ماں'۔
دیر تک وہ وہیں پہ بیٹھا آہستہ آہستہ پاؤں رگڑتا رہا اَور آنسُو بہہ بہہ کر اُس کی ٹھوڑی کو تَر کرتے رہے، حتیٰ کہ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ پھر وہ اُٹھ کر ایک طرف کو چل پڑا۔ کھیتوں کھیت چلتا ہُوا وہ ایک نامعلوم سمت میں سفر کرتا رہا۔ اُس نے محسُوس نہ کیا کہ وہ اپنے جوتے پیچھے ایک کھیت میں چھوڑ آیا تھا۔ اسی بے خیالی میں چلتے چلتے ایک جگہ پہ اُس نے بازُو سے سلنگ کی پٹی اُتار کر پھینک دی۔ اُس کے کپڑوں پر جگہ جگہ مٹی کے داغ تھے۔ وہ کھیتوں کی تنگ بنیوں پہ قدم دھرتا چلا جا رہا تھا اَور ایک چہرے کی صُورت تھی جو اُس کے دِل سے نہ اُترتی تھی----

اُس ماں

پیچھے گھر کے اندر اعجاز، سکینہ، حسن، حسین، عباس اور سائیں جلا انتظار کر کے کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد تک عباس کے بیاہ کی بات جاری رہی۔ آخر سب نے مِل کر اعجاز کو راضی کر لیا کہ وہ کریم راٹھور سے جا کر بات کرے گا۔

"اب سرفراز کی بات بھی چلاؤ" سکینہ نے کہا۔

"یہاں ہوتا تو سُن کر خوش ہوتا، تُو نے آج اُس کا نام سیدھا لیا ہے۔"

"اُس سے پوچھو کہ کیا صلاح ہے" سکینہ اعجاز کی بات نظر انداز کر کے بولی، "اُسے تو اپنی فکر ہی نہیں۔"

"پُوچھا ہے" اعجاز نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟"

"ہُوں ہاں کر کے جواب دیتا ہے۔ میرا خیال ہے ابھی چُپ رہتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہو گا کہ اُس کا پروگرام کیا ہے۔"

"خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے" سکینہ نے کہا۔ "کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں۔ ہر وقت خیال دوڑاتا رہتا ہے۔"

"ہاں" اعجاز نے کہا اور چارپائی پہ لیٹ گیا۔

"ابا" حسین بولا، "ہم جا کر چاچے کو بُلا لائیں؟"

"چل اوئے" سکینہ جھڑک کر بولی، "چُپ کر کے لیٹ جا۔ آدھی رات ہو رہی ہے۔ چاچا آ جائے گا۔ وہ کوئی بچہ ہے جو گھر کا رستہ بھول جائے گا؟"

"اوئے حسنے" اعجاز نے آواز دے کر بلایا، "آ میری ٹانگ دبا۔"

"ابا آ ۔۔۔۔" حسن شکایتی لہجے میں بولا۔ "کل بھی مَیں نے دبائی تھی، پرسوں بھی۔"

"اوئے میری ٹانگ دُکھی ہے" اعجاز بولا، "حُسینے کے ہاتھوں میں تو پتھر لگے ہیں۔ تیرا ہاتھ نرم ہے۔ آ جا۔ تُو تو میرا لاڈلا پتّر ہے نا۔ آ جا آ جا۔"

حسن سُست انداز میں اُٹھ کر اعجاز کی چارپائی پہ جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ اُس کی

ٹانگ دبانے لگا۔

"باسے، اِدھر آ،" سکینہ نے بلایا۔

عباس اُٹھ کر چارپائی پہ جا بیٹھا جہاں سکینہ لیٹی تھی۔ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ اعجاز آنکھیں کھولے آسمان کو تک رہا تھا۔ اُس کے دِل کو سرفراز کی فکر لگی تھی۔

1996ء 1989ء

جون ۱۹۸۹ء ---- جون ۱۹۹۶ء

7 سال

حصہ نہم

We remember the Past, but why do we not remember the future?

We remember the Past, but why do we not remember the future?

A Child's question to
Stephen Hawking :
"A Brief History of Time."

A Brief History of Time.

(جاری ہے۔)
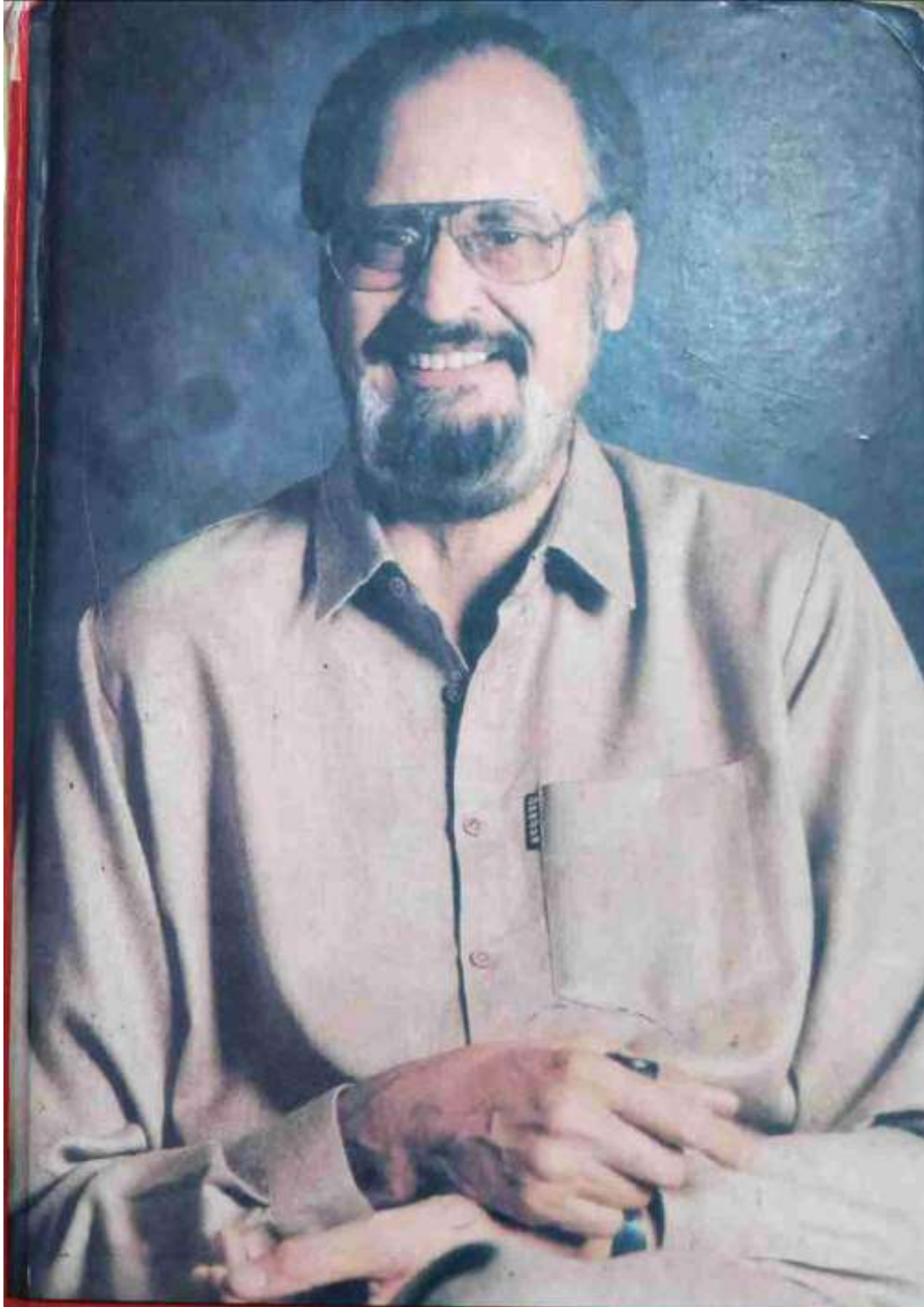
Rs. 1800.00

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-0670-7
ISBN-13 978-969-35-0670-9
9789693506709